شورش کاشمیری

احوال و آثار

تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی

۱۹۸۶ء

مقالہ نگار
سردار علی
لیکچرر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج آف سائنس فیصل آباد

نگران
ڈاکٹر عبید اللہ خان
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اردو
یونیورسٹی اورینٹل کالج۔ لاہور۔

اس مقالے کی منظوری رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی لاہور سے بروئے مراسلہ نمبر جی۔ایم/۱۳۳، مورخہ ۸ر فروری ۱۹۸۱ء سنہ لی جا چکی ہے

شورش کاشمیری

(احوال و آثار)

فہرست عنوانات

دوسرا باب

صفحہ نمبر ۱۰۲ تا ۲۲۷

تحریکیں اور ماحول

ادبی تحریکیں! تحریکِ سرسید۔ انجمنِ پنجاب۔ رومانوی تحریک

غزل گو شعراء! حسرت موہانی۔ اصغر۔ فانی۔ جگر۔ ترقی پسند تحریک۔ اثرات۔

سیاسی تحریکیں! ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی۔ کانگریس کا قیام۔ تقسیم بنگال۔ رولٹ بل۔ جلیانوالہ باغ۔ تحریکِ خلافت۔ شدھی اور سنگٹھن۔ کانگریس، مسلم لیگ اور مجلسِ احرار۔ ہندوستان چھوڑ دو۔ مجلسِ احرار کی خدمات۔ میکلیگن کالج سٹرائیک۔ تحریکِ کشمیر۔ قادیانی اور مجلسِ احرار۔ مسجدِ شہید گنج اور احرار۔

صحافت! ظفر علی خان۔ مولانا محمد علی جوہر۔ ابوالکلام آزاد۔ الہلال۔ اثرات۔ شورش کی شخصیت۔

تیسرا باب

صفحہ نمبر ۲۲۸ تا ۳۹۲

تصانیف

سوانح عمری۔ خاکے۔ مرزائیت۔ متفرق۔ اقتباسات۔ سفرنامے۔ خطوط۔ شعری مجموعے۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل (سوانح و افکار)۔ پسِ دیوارِ زنداں۔ تمغۂ خدمت۔ موت سے واپسی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ موازنہ نیا ایڈیشن و پرانا ایڈیشن۔

ظفر علی خان ۔ قیدِ فرنگ ۔ نورتن (چراغ حسن حسرت، مہاشہ کرشن، سید حبیب، قاضی احمد میکش، اظہر امرتسری، ابوصالح اصلاحی)۔ حمید نظامی۔ حسین شہید سہروردی ۔ میاں افتخار الدین چہرے ۔ تحریکِ ختمِ نبوت ۔ اسلام کے غدار ۔ عجمی اسرائیل ۔ مرزائیل ۔ اقبال اور قادیانیت ۔ اُس بازار میں ۔ دہلی چلو۔ فنِ خطابت ۔ فیضانِ اقبال ۔ اقبال مجرم؟ شب جائے کہ من بودم، یورپ میں چار ہفتے ۔ شورش بنام عبداللہ ملک ۔ جذباتِ شورش۔ گفتنی و ناگفتنی ۔ الجہاد والجہاد ۔ چہ قلندرانہ گفتم ۔ خطباتِ احرار۔ میرا فسانہ ۔ اقبال (پیامبرِ انقلاب) ۔ خطباتِ ابوالکلام ۔ ہاتھ کی لکیریں ۔ سرمایہ داری ۔ غیر مطبوعہ کتابیں ابوالکلام آزاد (سوانح وافکار) اسلام کی سرگذشت ۔ نثر ماگو شوارہ ۔

چوتھا باب

شورش کاشمیری بطور شاعر

صفحہ نمبر ۲۳۴ تا ۴۷۲

حمد و نعت ۔ سیاسی شاعری ۔ طنزیہ شاعری ۔ مرزائیت ۔ جعلی پیر اور علمائے سوء ۔ دانشور، ادیب اور شاعر ۔ مشاہیر پرستی ۔ اقبال ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ مولانا ظفر علی خان ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری بر ثیے۔ مرثیے اور قصیدے ۔ نغمیہ شاعری ۔ احساسِ انا ۔ خطیبانہ لہجہ ۔ ذوقِ عمل ۔ جذباتی رنگ ۔ رجائی لہجہ ۔ آغا شورش کی غزل ۔ بندشِ الفاظ ۔ تراکیب سازی ۔ رواں بحریں ۔ موسیقی ۔ پسندیدہ الفاظ ۔ باغی شاعر۔

پانچواں باب

صفحہ نمبر ۵۷۲ تا ۶۲۹

شورش بحیثیت نثر نگار

آپ بیتی کا فن ۔ سوانح نگاری ۔ تاریخی پہلو ۔ نفسیاتی پہلو ۔ اخلاقی پہلو ۔ جمالیاتی پہلو ۔ سوانح نگاری کا مقصد ۔ سوانح نگاری کے امکانات ۔ اردو سوانح نگاری ۔ شورش بحیثیت خود نوشت سوانح نگار ۔ سوانح نگاری اور شورش ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۔ مرقع نگاری ۔ تاریخ نویسی ۔ شورش کی نثر ۔ شورش کا اسلوبِ نگارش ۔ شاعرانہ نثر ۔ اشعار کا استعمال ۔ قافیہ پیمائی ۔ تشبیہ و استعارہ ۔ خطیبانہ آہنگ ۔ سوز و گداز ۔ رومانیت ۔ طنز ۔ ایجاز و اختصار ۔ لفظی تصویر کشی ۔ خاص الفاظ ۔

چھٹا باب

صفحہ نمبر ۶۵۰ تا ۷۳۳

صحافت

صحافت اور ادب ۔ شورش بحیثیت صحافی ۔ شورش کی شخصی صحافت ۔ شورش کی صحافت کا فنی جائزہ ۔ شورش کا صحافتی رنگ ۔ ادبی رنگ ۔ خطیبانہ انداز ۔ جذباتیت ۔ طنز و تبصرہ ۔ ہفت روزہ چٹان کی پالیسی ۔ چٹان اور اس کی مقبولیت ۔ چٹان کی بندش ۔ شورش اور ہفت روزہ صحافت ۔ شورش کا جوش و جذبہ ۔ شورش کی صحافتی زبان ۔ شورش کی حقیقت پسندی ۔ صحافت کی آزادی اور شورش

حرفِ آخر

صفحہ نمبر ۷۳۲ تا ۷۴۴

سیاست۔ شاعری۔ نثر نگاری۔ صحافت

ضمیمہ

صفحہ نمبر ۷۴۵ تا ۷۶۳

- آغا صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مختلف تحریروں کا عکس
- "چٹان" کی باقاعدہ اشاعت کے پہلے شمارے کا عکس
- "چٹان" کے پہلے سال کا خاص نمبر "اقبال نمبر" کا عکس
- "چٹان" کی بندش کے بعد ہفت روزہ "عادل" کے پہلے اور آخری شمارے کا عکس

کتابیات

مقالے (پی۔ ایچ۔ ڈی)

کُتب حوالہ

رسائل و اخبارات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ تشکر

میں دو جہانوں کے پالنے والے خالق حقیقی اللہ رب العزت کا سجدہ شکر بجالاتا ہوں کہ اس ذات اکبر کے کرم سے میرا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ بعنوان "شورش کاشمیری - احوال و آثار" تکمیل پذیر ہوا۔ اور مجھ ناچیز کی پانچ برس کی محنت شاقہ بار آور ہوئی۔ آغا شورش کاشمیریؒ تحریک آزادی کے نامور مجاہد، ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔ ان کی تنہا ذات میں ایک بیباک صحافی، ایک صاحب طرز ادیب، ایک بدیہہ گو رجز بیان شاعر، ایک محب وطن سیاستدان اور ایک شعلہ نوا خطیب اکٹھے ہوگئے تھے۔ ان کی صحافت، جسارت، صداقت اور عفت قلم کا آمیختہ تھی۔ یہ آمیختہ وہ اپنے قارئین کے دل و دماغ کی نشوونما کے لئے بحیثیت بانی مدیر ہفت روزہ "چٹان" اس کے اجرا کے یوم اول سے لے کر اپنے دم آخر تک تیار کرتے رہے۔ ان کا ادب منفرد طرز نگارش کا وہ معیاری سرمایہ ہے۔ جس میں رشحات قلم جگ بیتی سےلیکر آپ بیتی جیسی تحریروں کی شریانوں میں گرم و تازہ لہو بن کر دوڑ رہے ہیں۔ برجستہ گوئی میں وہ مولانا ظفر علی خان ایسے بدیہہ گو شعرا کی صف میں شمار ہوتے ہیں۔ بحیثیت سیاستدان وہ ایک پختہ ذہن، صاف ضمیر، حوصلہ مند انسان تھے۔ جنہوں نے برصغیر کی آزادی کی خاطر دس برس استبداد فرنگ کی قید میں بسر کئے۔ لیکن اپنے موقف سے سرِ مو انحراف نہ کیا۔ وطن عزیز کے قیام کے بعد وہ زبان و قلم سے ملکی استحکام و سالمیت کے لئے کام کرتے رہے۔ اور ایک خطیب کے طور پر وہ لبقیۃ السلف تھے۔ اردو زبان میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد شورش کاشمیری سے بڑا عوامی خطیب پیدا نہیں ہوا۔ اور خود ان کی اپنی زندگی اور شخصیت پر خطابت اس طرح چھائی ہوئی تھی جس طرح کسی بہتے ہوئے دریا پر بادل چھائے ہوں۔

آغا شورش کاشمیری کے احوال و آثار پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا یہ مقالہ ۲ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں آغا صاحب کے حالات زندگی قلمبند ہوئے ہیں۔ اور ان کی خطابت کا فنی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرا باب معاصر تحریکوں کا ہے جس میں سیاسی اور ادبی تحریکوں کے ساتھ ساتھ معاصر صحافت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ تیسرا باب آغا صاحب کی تصنیفات

پر تبصرے کا ہے۔ چوتھے باب میں ان کی شاعری اور پانچویں باب میں ان کی نثر نگاری کا بیان ہے۔ چھٹا باب آغا صاحب کی صحافت سے متعلق ہے۔ اور آخر میں "حرف آخر" کے عنوان سے آغا صاحب کا مقام و مرتبہ متعین کیا گیا ہے۔

آغا صاحب پر پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ لکھنا آسان بھی تھا اور دشوار بھی ؎

اور دشوار تو یہی تھا کہ دشوار بھی نہیں

آسانی یہ تھی کہ آغا صاحب مرحوم کے احوال و آثار بیشتر حد تک ان کی ذاتی سوانحِ عمری "بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل" اور داستانِ قید و بند "پسِ دیوارِ زنداں" میں مل جاتے ہیں۔ اور مشکل یہ تھی کہ آغا صاحب سے تمام تر ذہنی عقیدت و محبت کے باوجود میں نے ان کی ہر بات کو عقیدت کے طور پر حرفِ آخر نہیں مان لیا۔ بلکہ ان کی متنوع صفات کے اعتراف کے باوجود یہ بات ذہن میں رکھی ہے کہ ان کا قلم صاحب طرز ادیب کا قلم ہونے کے باوصف مورخ کا قلم نہیں۔ اور ادیبانہ اسلوب کے تقاضے واقعات کے نگینوں کی اس طرح تراش خراش کرتے ہیں کہ ان کی چکاچوند میں خود شخصیت کی انگشتری کے ملمع یا کندن ہونے کی پرکھ مشکل ہو جاتی ہے۔ اور یہ مشکل ایسی ہے جو بڑی دشواری سے آسان ہوتی ہے۔ اپنی پسندیدہ شخصیت کے احوال و آثار کو اس کے دورِ حیات کے تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات و واقعات اور قرائن و شواہد کی روشنی میں عقیدت و احترام کی رنگین عینک اتار کر دیکھنا آسان بات نہیں۔ آغا صاحب کی زندگی کے متعلق ان کی اپنی کتابوں کے علاوہ انور عارف کی "شورش کاشمیری" کے مختصر کتابچہ کے سوا اور کوئی کتاب ضبطِ تحریر میں نہیں آئی۔ ایسے حالات میں مجھے آغا صاحب کے احوال و آثار کی تصدیق و تردید کے لئے ان کے بارے میں اخبار و رسائل میں لکھے گئے منتشر مضامین اور دیگر کتابوں میں طویل صفحات پڑھنے کے بعد آغا صاحب سے متعلق ایک ایک جملہ تلاش کرنا پڑا۔ اور پھر قرائن و شواہد سے یہ دیکھا کہ کہاں آغا صاحب درست ہیں اور کہاں دوسرے صحیح ہیں۔ میں نے صحتِ واقعات کے حوالے سے جہاں آغا صاحب کو درست نہیں پایا وہاں یہ نہیں کہا کہ دوسرے غلط ہیں۔ اس لئے کہ یہ بات علمی دیانت کے خلاف ہے اور ایک تحقیقی مقالے کی شان کے منافی ہے۔

مثلاً مجھے آغا صاحب کی شاعری کی اولین کتاب "جذباتِ شورش" کے بارے میں پتہ چلا تو میں بعد از سعی بسیار اس کتاب کا نسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ملتان کے جناب خواجہ ابوالکلام کے پاس یہ نسخہ موجود تھا۔ خود ان کا پتہ لگانا بھی تحقیق و جستجو کا حصہ تھا۔ "جذباتِ شورش" ایک ایسی کتاب ہے جس کا ذکر آغا صاحب کی تحریروں میں نہیں

آیا۔ اور جس کے بارے میں آغا صاحب کے فرزند ارجمند مسعود شورش اور ان کے وفادار رفیق کار صلاح الدین خود بے خبر تھے اگرچہ میں جب بھی دفتر چٹان پہنچا جناب مسعود شورش نے مجھے مکمل تعاون کا یقین دلایا اور صلاح الدین صاحب نے مجھے آغا صاحب کی تحریروں، چٹان کے اولین شمارہ، اقبال نمبر اور ادل کی فوٹو کاپیاں مہیا کیں۔

تحقیقی مقالہ لکھتے وقت جو دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اس میں جو دشواری سی دشواری ہے وہ ہے اپنی غلطیاں درست کرنا اور اپنے لکھے کو کاٹ دینا۔ میں اس راہ خطا سے کبھی سلامت نہ گزر پاتا اگر مجھے محترم و مکرم پروفیسر ڈاکٹر عبید اللہ خان کی رہنمائی نصیب نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب اس مقالے کی تکمیل کے دوران میں جس طرح مقالے کے ہر باب کا لفظ لفظ پڑھتے، اور میری خامیوں، کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کی نشاندہی کرتے اور غیر جانبدارانہ طرز نگارش کی تلقین فرماتے رہے وہ ان کے استادانہ کمال اور میری خوش قسمتی کا حصہ ہے۔ اس مقالے کی نگارش کے سلسلے میں جہاں میرے مطالعہ میں اضافہ ہوا وہاں اپنی پانچ سالہ محنت کا بہترین صلہ یہ سمجھتا ہوں کہ میں پروفیسر ڈاکٹر عبید اللہ خان ایسے شفیق استاد، صاحب کردار و ایمان اور عالم و فاضل شخصیت سے ذاتی طور پر متعارف ہوا ہوں۔ مقالے کے تیسرے اور چوتھے ابواب کی گمشدگی پر تین چار روز تک وہ جس طرح پریشان رہے اور پھر ان کی بازیابی پر جیسے انہوں نے سو نفل شکرانے کے ادا کئے ان سے ان کی بے پناہ شخصیت کی بے شمار شفقتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی جرأت علم کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے اپنی رہنمائی میں مولانا ابوالکلام آزاد پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ مکمل کروایا تھا۔ پروفیسر صاحب مولانا کے تبحر علمی کے قائل اور ان کی عظیم الشان شخصیت کے گھائل ہیں۔ مولانا کی انشا پردازی کا اثر جتنا شورش کاشمیری نے قبول کیا ہے۔ اتنا جناب شورش کے معاصر ادیبوں نے کم ہی کیا ہے۔ اس اعتبار سے بھی مقالہ ہذا پر ڈاکٹر عبید اللہ خان سے بہتر رہنمائی اور کون کر سکتا تھا۔

لکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت لازمی ہوتی ہے کوئی شخص روشنی کے بغیر نہیں لکھ سکتا۔ روشنی خود نظر نہیں آتی لیکن لکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس مقالے کے راقم کے پیچھے ایک ایسی ہی روشنی ہے جس کی وجہ سے یہ مقالہ موجودہ صورت میں نظر آ رہا ہے۔ لیکن وہ روشنی خود نظر نہیں آتی۔ وہ روشنی ہے جناب پروفیسر عبدالرحمان شاکر ـــــ رحمان کے اس نیک دل بندے کا تخلص تو شاکر ہے لیکن وہ میرے اور میرے جیسے کئی تحقیقی مقالے لکھنے والوں کے مشکور رہیں۔ اس مقالے کے دامان آغاز سے لے کر کف انجام تک جن کی ہمدردیوں اور مہربانیوں کے سینکڑوں عنوان بکھرے پڑے ہیں۔ میں ان عبدالرحمان شاکر صاحب کا ہزار شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

ادا نہیں کر سکتا۔ ان کے علاوہ میرے دوستوں اور مہربانوں میں ایسے نام ہیں۔ جن کی مہربانیاں اتنی لطیف اور ان سے محبتوں کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ میں ان کا شکریہ ادا کر کے دوستی کے آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگانا چاہتا۔ لیکن ان کے نام نوکِ قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

پروفیسر سید زاہد حسین زیدی نے اس مقالے کی کتابت کے سلسلے میں میری مدد کی۔ پروفیسر ضرار اختر اعوان اور پروفیسر محمد اشرف خان شرف اور عزیزم محمد عرفان نے کتابت شدہ مسودہ کی غلطیاں درست کرنے میں ہاتھ بٹایا اور ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں ان احباب کا ممنون ہوں۔

جناب افتخار فیروز ایڈووکیٹ نے میرے لئے اس مقالے کا عنوان انتخاب کیا۔ اور اس مقالے کے لئے ضروری بہت سی کتابیں مستعار اور بطور تحفہ عنایت فرمائیں۔ اور جن کی باز پرس اس مقالے کی تکمیل کا باعث ہوئی۔

میں شکریہ ادا کرتا ہوں جناب اقبال فیروز صاحب سابق مدیر معاون ہفت روزہ چٹان کا جن سے آغا صاحب کی زندگی کے غیر مطبوعہ دلچسپ واقعات اور لطائف و مطائبات سن سن کر میرے مقالے میں توازن آتا رہا۔

یہ یقیناً زیادتی ہوگی اگر اس موقع پر میں دو اشخاص کا ذکر نہ کروں۔ پروفیسر خالد شبیر احمد اور اکرام محی الدین صاحب۔ اول الذکر کا اور میرا اشتراکِ عقیدت کا رشتہ ہے کہ وہ بھی معتقدِ شورش ہیں۔ وہ میرا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ثانی الذکر اپنی خوش گفتاری سے مجھے گھنٹوں سنجیدگی سے لکھنے کے لئے تازہ دم کرتے رہے۔

یہ مقالہ کبھی وقت پر پیش نہ کیا جا سکتا اگر میرے محترم و شفیق جناب ڈاکٹر شبیر احمد قریشی، پرنسپل گورنمنٹ کالج آف سائنس فیصل آباد اپنی خاص نوازشوں سے مجھے میری تدریسی مصروفیات سے فرصت مہیا نہ کرتے۔

(سردار علی)

لیکچرر شعبۂ اردو
گورنمنٹ کالج آف سائنس فیصل آباد

۲۲ فروری ۱۹۸۶ء

باب ۱

سوانح۔ مہد سے لحد تک

خاندان

آغا شورش کاشمیری کے خاندانی اور سوانحی حالات کا ایک بڑا ماخذ اُن کے خود نوشتہ حالات ہیں۔ اُن کی سوانح عمری "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب کا وطن کشمیر اور گوت ڈار[1] ہے۔ جو کشمیری برہمنوں کی ایک شاخ ہے۔ آغا صاحب نے اپنی سوانح حیات میں بتایا ہے کہ اُن کی چھٹی پشت میں کسی بزرگ نے اسلام قبول کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا حتیٰ کہ گلاب سنگھ کا زمانہ آگیا۔ گلاب سنگھ کا زمانہ کشمیری مسلمانوں کے لئے بڑے مصائب و مشکلات کا زمانہ تھا۔ جس کی تصدیق تاریخی شواہد سے بھی ہوتی ہے کہ

> گلاب سنگھ کی حکومت اگرچہ مستحکم تھی لیکن اس کے زمانے میں مسلمانوں کا سیاسی اور معاشی استحصال بری طرح کیا گیا۔ ریاست کے تمام چھوٹے بڑے عہدے ڈوگرا خاندان یا کشمیری پنڈتوں کے پاس تھے مسلمان کاشتکاروں کے لئے مالیہ کی شرح ناقابلِ برداشت تھی۔ مسلمانوں پر ظالمانہ ٹیکس لگائے جاتے تھے۔[2]

ان حالات میں آغا صاحب کے خاندان کا کشمیر میں رہنا اور بھی محال ہو گیا۔ لہٰذا دوسرے لوگوں کی طرح یہ خاندان بھی کشمیر کو چھوڑ کر پنجاب میں آگیا۔ آغا صاحب کے پردادا سری نگر سے امرتسر آگئے۔ پردادا کی وفات کے بعد آغا صاحب کے دادا تنہا رہ گئے۔ لہٰذا لاہور چلے آئے۔

---

[1] ڈار وادیٔ کشمیر کے قدیمی باشندوں کے ایک فرقے کی ذات ہے جس کو صدیوں قبل ڈامر کہا کرتے تھے اور جس کا کلہن پنڈت جوزاج بری اور پراجیہ بٹ نے اپنی اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے بحوالہ شاعر انسانیت عبدالاحد ڈار آزاد کشمیری پریم ناتھ بزاز ص نمبر ۱۸

آغا صاحب کے قول کے مطابق "ڈار" دراصل در ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ڈار راجپوتوں کا ایک قبیلہ ہے۔ (بوئے گل ص نمبر ۱۹)

[2] اردو دائرہ معارف اسلامیہ ص نمبر ۲۹۰

اُن کا نام امیر بخش[1] تھا۔ انہوں نے ایک روڈ پر ایک تنور لگایا۔ اور گزر بسر ہونے لگی۔ امیر بخش کے دو بیٹے تھے۔ ایک آغا صاحب کے تایا دوسرے آغا صاحب کے والد جن کا نام نظام الدین تھا۔ جوٹین کے کارخانے میں ملازم تھے۔ نظام الدین کا قیام امرتسر میں تھا۔ اور اُن کی شادی بھی امرتسر ہی میں ہوئی[2]۔

آغا صاحب کے ننھیال کی دو شاخیں تھیں ایک گھرانہ امرتسر میں تھا ایک انبالہ میں۔ دونوں خاندان شال اور پشمینہ کے تاجر تھے۔ آغا صاحب کے نانا سب سے پہلے کشمیر سے آئے تھے۔ آغا صاحب کی نانی برہمن تھی۔ جن کے والد نے اسلام قبول کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ابتلا کا دور شروع ہوا لہٰذا وہ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ پہنچے سیالکوٹ سے ایک شاخ امرتسر میں رہ گئی اور دوسری شاخ انبالہ میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہو گئی۔

آغا صاحب سات آٹھ برس کے تھے کہ والدہ نے انتقال کیا۔ آغا صاحب کے والد نے دوسری شادی آغا صاحب کی خالہ سے کی۔ لیکن شادی کا بندھن دو چار سال ہی میں ٹوٹ گیا[3]۔ آغا صاحب کی پرورش اُن کی دادی جان نے کی۔

۱؎ مرزا ادیب نے امیر بخش کو آغا صاحب کا نانا بنایا ہے۔
چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء جلد نمبر ۲۹ شمارہ نمبر ۴۳-۴۴ شورش کاشمیری نمبر مضمون مرزا ادیب ص نمبر ۱۹۸
جب کہ امیر بخش آغا صاحب کے دادا تھے۔ (جہانِ دانش ص نمبر ۲۲۱) مرزا صاحب نے شاید سہواً دادا کو نانا لکھ دیا ہے۔

۲؎-۳؎ بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۱۰/۱۱

ولادت

آغا صاحب کا یوم پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء ہے [1]۔ لیکن آغا صاحب نے اپنی سوانح حیات میں یہ نہیں بتایا کہ وہ کس شہر میں پیدا ہوئے۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگ لاہور اور کچھ امرتسر کو آغا صاحب کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔ اردو انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے۔ "نام عبد الکریم۔ امرتسر میں پیدا ہوئے" [2]۔ روزنامہ امروز نے اپنی ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں آغا صاحب کا جو سوانحی خاکہ دیا ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ

"شورش کی پیدائش لاہور میں ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو ہوئی ہے" [3]

جب کہ حافظ محمد ابراہیم بندھانی تحریر کرتے ہیں کہ

۱۴ اگست ۱۹۱۷ء میں جب پہلی جنگ عظیم اپنے پورے عنفوانِ شباب پر تھی تو ہندوستان کے شہر امرتسر میں ایک غریب کشمیری گھرانے میں لڑکے کی ولادت ہوئی والدین نے اپنے بیٹے کا نام عبد الکریم تجویز کیا۔ [4]

اور مولانا کوثر نیازی لکھتے ہیں

وہ امرتسر کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ لاہور کے پیسہ اخبار میں رہے [5]

---

[1] بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۱۲

[2] اردو انسائیکلو پیڈیا نیا ایڈیشن ص نمبر ۹۰۵ میسرز فیروز سنز لمیٹڈ

[3] روزنامہ امروز ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۱ء

[4] روزنامہ جنگ لاہور ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۲ء

[5] روزنامہ جنگ لاہور ۱۲ نومبر ۱۹۸۲ء

مرزا جانباز نے لکھا ہے کہ

"شورش ۱۴ اگست کو لاہور کے محلہ پیسہ اخبار میں نظام الدین کے ہاں پیدا ہوا"[۱]

ان تمام شواہد سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آغا صاحب ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ مگر ان کی پیدائش لاہور میں ہوئی یا امرتسر میں قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لہٰذا آغا صاحب کے اس بیان سے یہ بات قیاس کی جاتی ہے کہ وہ امرتسر ہی میں پیدا ہوئے۔ آغا صاحب اپنی سوانح حیات میں اپنے والد کے حالات کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"گھر بار، خویش و اقارب سب امرتسر میں تھے۔ امرتسر ہی میں ان کی شادی ہوئی"[۲]

نام

آغا شورش کاشمیری کا اصلی نام عبدالکریم[۳] تھا۔ شروع شروع میں وہ "الف" تخلص کیا کرتے تھے۔ بعد میں ان کا تخلص "شورش" ہو گیا۔ اور یہ تخلص اتنا مشہور ہوا کہ ان کے اصلی نام کی بجائے لوگ انہیں "شورش" ہی کے نام سے پکارنے لگے۔ نام کے ساتھ لفظ "آغا" کا اضافہ دوستوں کا رہین منت ہے۔ اس امر کی نشاندہی کرتے ہوئے شورش کاشمیری خود لکھتے ہیں۔

"میرے نام کے ساتھ آغا کا استعمال بھی دوستانہ تعلقات خاطر کا نتیجہ ہے۔ ہمارے ایک دوست چونی لال کاوش تھے۔ مذہباً ہندو لیکن تہذیباً مسلمان۔ سب سے پہلے آغا شورش کاشمیری زندہ باد کا نعرہ اسی نے لگایا تھا۔ تب "سیاست" میں مقبول انور داؤدی نے آغا شورش کاشمیری لکھنا شروع کیا۔ نتیجتہً میں تمام اخباروں میں شورش کاشمیری ہو گیا"[۴]

---

۱ کاروانِ احرار ص نمبر ۲۸۵ از جانباز مرزا

۲ بوئے گل صفحہ نمبر ۱۰۔ اس سلسلے میں جب آغا صاحب کے فرزند آغا مسعود شورش سے رابطہ قائم کیا گیا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی کہ آغا صاحب واقعی امرتسر میں پیدا ہوئے تھے۔

۳ بحوالہ بوئے گل ص نمبر 19

۴ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل شورش کاشمیری ص نمبر 121

آغا صاحب کے تخلص الفت کے متعلق مرزا ادیب کی روائت یہ ہے کہ دوستوں کی ایک محفل میں چونی لال کاوش نے تخلص الفت تجویز کیا تھا اور دوسرے دوستوں نے اس کی تائید کی تھی جن میں علاؤ الدین اختر، حکیم بدر محی الدین، یزدانی جالندھری اور چونی لال کاوش شامل تھے۔[۱]

لیکن اس کے بعد آغا صاحب کا تخلص الفت سے شورش ہو گیا۔ اس ضمن میں چونی لال کاوش کا کہنا ہے کہ

" عبدالکریم سے شورش کب ہو گئے یہ کوئی نہیں جانتا۔ یہ تخلص مولانا تاجور نے اُس کو دیا تھا۔ کیونکہ عبدالکریم الفت ادبی ہنگاموں کو ہوا دیتا تھا۔[۲]"

مگر احسان دانش کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے آغا صاحب کا تخلص الفت کی بجائے شورش کر دیا تھا[۳]

اسی طرح وقار انبالوی صاحب نے "شورش" کے تخلص کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی عطا بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ "تقریر کے خاتمے پر شاہ صاحب نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ میں جیل سے مسلمانوں کے لئے ایک تحفہ لے کر آیا ہوں۔ تحفہ بھی معمولی نہیں چھ فٹ قد کا ہے۔ اور پھر شورش مرحوم کا ہاتھ پکڑ کر اونچا کر دیا۔ یہ وہ تحفہ "شورش کاشمیری" اس دن سے عبدالکریم الفت کا نام شاہ صاحب کے بخشے ہوئے خطاب یا تخلص میں گم ہو گیا۔ اور وہ آغا شورش کے نام سے روشناسِ خلق ہوئے۔[۴]

یہاں وقار صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ کسی جلسے میں شاہ صاحب نے اس انداز میں شورش کاشمیری کا تعارف ضرور کروایا ہوگا۔ مگر انہیں شورش کا تخلص عطا نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ آغا عبدالکریم کا نام شاہ صاحب کے اس تخلص سے پہلے شورش کاشمیری میں بدل چکا تھا۔

---

۱ ؎ بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء جلد نمبر ۲۹ شمارہ نمبر ۴۳ ۔ ۴۴ شورش نمبر مضمون مرزا ادیب صفحہ نمبر ۱۹۸

۲ ؎ چٹان شورش نمبر صفحہ نمبر ۳۲۳ یکم نومبر ۱۹۷۶ء

۳ ؎ بحوالہ جہانِ دانش احسان دانش صفحہ نمبر ۲۲۲

۴ ؎ بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر مضمون وقار انبالوی صفحہ نمبر ۱۵۳

شورش کاشمیری کے بقول ۱۷ر جولائی ۱۹۳۵ء کو انھوں نے جس جلسے میں اپنی پہلی تقریر کی اس کی صدارت بھی کی۔ حافظ معراج دین نے نعرۂ تکبیر کے بعد کہا

"حضرات میں اس جلسہ کی صدارت کے لئے پنجاب کے مشہور ادیب حضرت شورش کاشمیری کا نام پیش کرتا ہوں۔" [1]

یہ زمانہ آغا صاحب کا "اتحادِ ملت" کا زمانہ تھا۔ اور احرار میں وہ اس سے کہیں بعد میں شامل ہوئے۔ آغا صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"مولانا ظفر علی خاں رہا ہو کر آئے تو انہیں یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ شورش کاشمیری میں ہوں وہ مجھے صرف عبدالکریم الفت کے نام سے جانتے تھے۔" [2]

ویسے بھی احرار نے شہید گنج کی تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا مگر آغا صاحب تحریکِ شہید گنج کے دنوں ہی میں شورش کاشمیری ہو گئے تھے۔ لہٰذا یہ بات کسی طرح بھی پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی کہ کسی جلسہ میں شاہ صاحب نے آغا صاحب کو پہلی بار شورش کاشمیری کہا ہو۔ جیسا کہ وقار انبالوی صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ بلکہ اصل بات وہی ہے کہ احسان دانش نے آغا صاحب کا تخلص الفت سے شورش کر دیا تھا۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ احسان دانش نے آغا صاحب کو الفت سے شورش بنایا تو اس کی تقلید میں آغا صاحب کے بھائی اقبال نے اپنا تخلص یورش رکھا۔ اور چھوٹی لال نے کاوش اور یہ تمام تخلص اہتماماً دانش کے ہم قافیہ رکھے گئے۔ شورش کاشمیری کا ایک قلمی نام "اسرار البصری" بھی تھا۔ جسے وہ عام طور پر صحافتی تحریروں کے لئے استعمال کرتے تھے۔ عام بول چال میں شورش کا لفظ اس کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا تھا۔ کہ یہی ان کا نام بن گیا تھا۔ اور رہی تخلص یہ لفظ شورش کاشمیری کے مزاج اور افتادِ طبع

---

[1] بحوالہ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل شورش کاشمیری

[2] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل شورش کاشمیری صفحہ نمبر ۱۲۱

کے اتنا قریب تھا۔ کہ اس کی موجودگی میں انہیں کسی دوسرے نام سے پکارنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ بقول چوہدری افضل حق "شورش"، اسم بامسمےٰ ہیں[1]

بچپن

آغا صاحب نے اپنی سوانح عمری "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" میں اپنی ابتدائی زندگی کے متعلق بہت کم لکھا ہے۔ تاہم اُن کے بچپن کے متعلق جو باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ آغا صاحب شروع میں ایک کم آمیز اور رشرمیلے طالب علم تھے۔ آٹھویں اور نویں جماعت تک اُن کے صرف ایک دو دوست تھے۔ سکول میں دوستوں کے ساتھ کھیلنے یا گھومنے پھرنے کا موقع بھی آغا صاحب کو نہیں ملا۔

آغا صاحب سائیکل چلانا بھی صرف اس وجہ سے نہ سیکھ سکے کہ سائیکل سیکھنے کے لیے کسی دوست کی معاونت ضروری تھی۔ جو آغا صاحب کو میسر نہ تھی۔ آغا صاحب اگرچہ ایک محنتی اور اچھے طالب علم تھے۔ لیکن سکول کی ہم نصابی سرگرمیوں میں حصہ نہ لیتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ہاکی ضرور کھیلا کرتے تھے۔ سکول کے باہر بھی آغا صاحب نے کبھی کسی کھیل میں حصہ نہیں لیا۔ اُن کا بیان ہے۔

> آوارہ کھیلوں سے جی چراتا۔ مجھے لڑکوں کے ساتھ پھرنے۔ گلی ڈنڈا کھیلنے۔
> تاش کی بازی لگانے۔ پتنگ اُڑانے وغیرہ سے طبعی نفرت تھی۔[2]

آغا صاحب اپنے لڑکپن میں قدرے شوخ ہو گئے تھے۔ مگر کھیل تماشوں سے انہیں کبھی بھی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی مرزا ادیب، آغا صاحب کے بچپن کے دوستوں میں سے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ دوست حکیم بدر محی الدین کے مکان پر تاش کی بازی لگایا کرتے تھے اور آغا صاحب بھی اس محفل میں جایا کرتے تھے۔ مرزا ادیب صاحب کے الفاظ ہیں

---

[1] بحوالہ تاریخ احرار چوہدری افضل حق صفحہ نمبر ۲۶۷

[2] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل شورش کاشمیری ص نمبر ۱۹

"ہم یہاں تاش بڑے شوق سے کھیلتے رہتے تھے۔ اور اس کھیل میں چار چار پانچ پانچ گھنٹے گزار دیا کرتے تھے۔ عبدالکریم الفت بھی وہاں پہنچ جاتا تھا ــــ مگر اسے تاش سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ہم اسے کھیل میں شریک کرنے سے بالعموم احتراز کرتے تھے۔ مگر جب چار ساتھی موجود نہیں ہوتے تھے تو اُسے مجبوراً شامل کرنا پڑتا تھا۔ اس سے یہ وعدہ ضرور لیتے تھے۔ کہ سنجیدگی سے کھیلے گا اور خرمستی نہیں دکھلائے گا۔ وہ وعدہ کر لیتا کہ تاش کھیلنے میں کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا۔ دو تین بازیاں تو پُرامن فضا میں ہو جاتی تھیں۔ لیکن اس کے بعد عبدالکریم الفت کے اندر سوئی ہوئی خرمستی اچانک جاگ اُٹھتی تھی۔ پہلے وہ مولانا ظفر علی خان یا کسی اور شاعر کے شعر گنگنانے لگتا تھا۔ پھر کہنیوں کے سہارے بیٹھ جاتا تھا۔ اور دوسروں کے پتّے دیکھنے کی کوشش کرنے لگتا تھا معاملہ یہاں تک محدود نہیں رہتا تھا۔ پتّا فرش پر اس زور سے پھینکتا تھا کہ کہیں کا کہیں جا پڑتا تھا"[1]

اسی محفل کا ایک واقعہ مرزا ادیب نے لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن آغا صاحب تاش کے کھیل کو بُری طرح خراب کر رہے تھے کہ دوستوں نے مل کر انہیں پکڑ لیا اور ایک دوسرے کمرے میں بند کر دیا۔ اور بھول گئے کہ اسی کمرے میں "پوریاں" بھی منگوا کر رکھی ہیں۔ آغا صاحب "پوریاں" چٹ کر گئے اور اس وعدے پر کمرے کی قید سے رہائی پائی کہ آئندہ وہ کھیل کو خراب نہیں کریں گے۔ رہائی کے بعد آغا صاحب چپکے سے غائب ہو گئے۔ دوستوں کو جب "پوریوں" کا خیال آیا تو انہیں اپنی حماقت کا احساس ہُوا کہ انہوں نے "پوریوں" والے کمرے میں آغا صاحب کو کیوں قید کیا۔[2]

---

[1] چٹان، یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر مضمون مرزا ادیب ص نمبر ۱۹۹

[2] بحوالہ چٹان شورش نمبر، یکم نومبر ۱۹۷۶ء مضمون مرزا ادیب ص نمبر ۲۰۱

اب دوستوں نے جوابی کارروائی کی اور آغا صاحب کو کہلا بھیجا کہ وہ سب دوستوں کو پوریاں کھلائیں ورنہ وہ ان کا بائیکاٹ کریں گے۔ آغا صاحب نے جواباً کہلا بھیجا کہ وہ ان سب کو اس شرط پر "پوریاں" کھلائیں گے کہ وہ انکے گھر آکر کھائیں۔ لہٰذا تمام دوست ان کے گھر پہنچ گئے۔ بعد میں کیا ہوا۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں کہ۔

جب سب دوست آغا صاحب کے گھر کے پھاٹک میں داخل ہوئے، عبدالکریم چارپائی پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی ہیئت دیکھ کر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ "ارے کیا ہوا تجھے عبدل۔ کریمے!" حکیم صاحب بولے۔۔ عبدالکریم خاموش۔۔ "تجھ پر خدا کی مار کیا ہوا تجھے" چونی لال کاوش نے پوچھا۔ کوئی جواب نہیں۔۔ "بے چارہ مر تو نہیں گیا" اختر نے اپنی طرف سے بڑے افسوسناک لہجے میں کہا۔۔۔ "مرے تو۔ میں کیوں مروں؟" عبدالکریم بول پڑا۔۔۔ "شکر ہے زندہ ہے" حکیم صاحب نے ہم سب کی ترجمانی کی۔۔۔ ہم سب چارپائی پر بیٹھ گئے۔۔۔ "پوریوں کی ٹوکری کہاں ہے؟" ۔۔۔ "پوریوں کی ٹوکری کیسی۔ تم لوگوں نے مجھے چیلنج دیا تھا۔ میں چیلنج کا جواب چیلنج سے دے سکتا ہوں"۔۔۔ عبدالکریم چارپائی سے اٹھ کر دور جا کھڑا ہوا اور ہاتھ ہلا ہلا کا ہم سے تقریر کرنے لگا۔۔ "تم نے سمجھا تھا میں ڈر جاؤں گا۔ میں ڈرنے والا نہیں ہوں۔ ویسے کہو ایک ٹوکری نہیں بیس ٹوکریاں ابھی حاضر کر دیتا ہوں"۔۔۔ یہ سنتے ہی ہمارے تن بدن میں آگ لگ گئی۔۔۔ "چلو چلیں اور آئندہ ادھر کوئی شخص نہ آئے" حکیم صاحب بولے۔۔۔ "حقہ پانی بند" کاوش نے بلند آواز میں کہا۔۔۔ "حقہ پانی کیا، روٹی اور کپڑا بھی بند" عبدالکریم نے آگ پر تیل چھڑک دیا۔

ہم بھنا کر گلی میں باہر نکل آئے۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے عبدالکریم بازو پھیلائے سڑک پر کھڑا ہے۔۔۔۔ "یارو واپس چلو، پوریاں انتظار کر رہی ہیں" وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔ واپس جانے کے لئے ہم تیار نہیں تھے۔ اس نے بار بار راستہ روکا تو لوٹ گئے۔

پھاٹک کے اندر چارپائی پر ایک ٹوکری پڑی تھی۔

"یہ کہاں سے آگئی؟" اختر نے پوچھا۔

"تم سب اندھے ہو۔۔۔ چارپائی کے نیچے پڑی تھی"۔ [۱]

---

[۱] چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء "شورش نمبر" مضمون مرزا ادیب ص ۲۰۱ - ۲۰۲

تعلیم

آغا صاحب کو سب سے پہلے دیو سماج اسکول لاہور میں داخل کرایا گیا۔ یہ اسکول انارکلی میں ایک ست گھرے میں واقع تھا وہاں کے ہیڈ ماسٹر سلام کی بجائے "ست دیو کی جے" کہا کرتے تھے اور یہی جملہ آغا صاحب کی زبان پر چڑھ گیا۔ جب یہ جملہ آغا صاحب کے دادا جان نے سنا تو انہوں نے آغا صاحب کو اس اسکول سے دوسرے اسکول میں داخل کروا دیا۔ مگر ایک دفعہ بلاوجہ پیٹے جانے پر آغا صاحب کے دادا جان آغا صاحب کو دوبارہ دیو سماج اسکول میں واپس لے آئے۔ کیونکہ "ست دیو کی جے" کہنے والے ہیڈ ماسٹر کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ آغا صاحب ایک اچھے طالب علم تھے۔ چوتھی جماعت ہی سے زمیندار پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ آغا صاحب کی دادی اماں پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ وہ آغا صاحب کو زمیندار پڑھ کر سنایا کرتی تھیں۔ آغا صاحب کو زمیندار پڑھنے کے لئے دیتیں اور اگر کوئی غلطی ہو جاتی تو وہ درست کر دیا کرتیں۔ آٹھویں جماعت تک آغا صاحب ایک شرمیلے طالب علم تھے۔ آغا صاحب نے میٹرک کا امتحان ۱۹۳۴ء میں پاس کیا۔

میٹرک کے بعد آغا صاحب کے مالی حالات زیادہ دگرگوں ہو گئے لہٰذا وہ کالج میں داخلہ نہ لے سکے۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنا مطالعہ جاری رکھا میٹرک کے بعد وہ بالکل بیکار تھے۔ فراغت کا یہ وقت وہ سارا دن پنجاب پبلک لائبریری میں گزارا کرتے۔ یہ دور تقریباً اڑھائی سال تک رہا آغا صاحب اپنی سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

> "ان اڑھائی سالوں میں ایک چیز فطرت کا جزو غیر منفک ہو گئی اور وہ کتب بینی کا والہانہ ذوق تھا صبح و شام پڑھتا اور بہت کچھ پڑھتا۔ شعر و ادب کا چسکا لگ چکا تھا شاعری کے سبھی دیوان کھنگال ڈالے۔ افسانہ و ناول سے تو کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا لیکن نثر کا بہت بڑا ذخیرہ حافظہ میں اُترتا رہا[1]۔"

آغا صاحب کا خاندان معاشی بحران کا شکار ہو چکا تھا اور والدین میں مزید تعلیم دلانے کی ہمت نہ تھی اگرچہ آغا صاحب مزید

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۶۲

تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ موقع انہیں نہ مل سکا۔ البتہ ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔ جو ان کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں معاون ہوا۔ اور یہ موقع تھا جیل کی تنہائی۔ لہٰذا آغا صاحب نے اپنی زیادہ تر تعلیم مدرسہ کی بجائے "جیل" میں حاصل کی۔ اور یہ جیل خانہ بھی انگریزی عہد کا جیل خانہ تھا۔ جس کے متعلق آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"یہاں شریف عیبی، عیبی مجرم اور مجرم عادی مجرم ہو جاتا ہے[1]۔"

لیکن آغا صاحب نے "جیل خانہ" کو "جامعہ" سمجھا اور اپنی تعلیم پر پوری توجہ دی۔ اور مطالعہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا۔ آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"میری زندگی کو سنوارنے میں قید کا بڑا حصہ ہے۔ لاہور میں جتنے برس گزرے ان کے شب و روز عظیم تھے۔ بہتر لوگوں کا ساتھ رہا۔ ان میں عالم، دانشور، سیاست دان، مدبر، معلم، مصنف، تاریخ ساز اور تاریخ دان سبھی قسم کے لوگ تھے۔ مجھے نہ صرف ملک کی پچاس سالہ تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ بلکہ اس کے احوال و آثار اور نتائج و مظاہر سے کاملاً واقف ہو گیا۔ کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو پوشیدہ ہو اور کوئی سیاسی راز نہ تھا جو ہم اہوں کے سینہ میں ہو اور میرے علم میں نہ آیا ہو[2]۔"

آغا صاحب اس قید کے دوران میں بھی پنجاب پبلک لائبریری کے ممبر رہے اور انہوں نے اس عرصۂ قید میں لائبریری کے اردو حصہ کی بیشتر کتابیں پڑھ ڈالیں۔ جس میں نظم، ادب، تاریخ، فلسفہ، مذہب، جغرافیہ، سیرت، تذکرے، علم نجوم اور علم ہیئت کی کتابیں شامل تھیں۔ انگریزی صرف دسویں جماعت تک پڑھی تھی

1۔ پس دیوار ص نمبر ۸۶

2۔ بوئے گل ص نمبر ۲۳۶

لکھنے اور بولنے کی مہارت نہ تھی البتہ انگریزی پڑھنے کی خاصی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ جیل ہی میں پروفیسر تلک راج چڈھا سے مارکسزم، سوشلزم اور کمیونزم بھی پڑھا۔

آغا صاحب کا خاص مضمون اسلامیات تھا۔ انہوں نے جیل ہی میں مولانا محمد گل شیر سے قرآن اور ترجمہ پڑھا۔ سیرت اور تاریخ کا مطالعہ خود ہی کیا کرتے تھے۔ تیسری مرتبہ جب آغا صاحب کو ایک سال قید کی سزا ہوئی تو وہ امرتسر سے لاہور سنٹرل جیل آگئے اور انہوں نے سب سے پہلے جیلر سے جیل کی لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت مل جانے پر آغا صاحب نے دو ماہ کے عرصہ میں یہ مختصر لائبریری ساری پڑھ ڈالی جس میں

"سو سے کچھ کم انگریزی اور اتنی ہی اُردو کی کتابیں تھیں۔ سو پچاس اردو کے ماہ نامے بھی تھے لیکن دقیع "ادبی دنیا" ہی تھا۔"[1]

جیل ہی میں آغا صاحب نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا اور الہلال کا فائل بھی جیل ہی میں پڑھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی سیاسی کتابیں نظر سے گزریں۔ آغا صاحب لکھتے ہیں۔

انہی دنوں ارمغانِ حجاز کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو میاں قمرالدین (رئیس اچھرہ) نے بھجوا دیا۔ کلام اقبال کے دوسرے مجموعے بھی خرید کئے۔ ترجمان القرآن منگوایا مکتوبات امام ربانی ہاتھ آگئے الہلال کا فائل مل گیا۔ بعض تاریخی اور سیاسی کتابیں آگئیں۔ غرض پانچ سالہ قید کا بھلا وا جمع کرتا رہا۔[2]

تشکیک

جیل میں مطالعہ کے دوران ایک مقام ایسا بھی آیا کہ آغا صاحب خدا کی ہستی کے بارے میں مشکوک ہو گئے۔ مگر اسلام کی گرفت آغا صاحب پر شروع ہی سے مضبوط تھی لہٰذا جلد ہی سنبھل گئے اور یقین

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۲۳۶

[2] پسِ دیوار ص نمبر ۸۲

میں پختگی کا وہ مرحلہ طے کر لیا جس کو ایمان کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آغا صاحب اپنی سوانح حیات بوئے گل میں لکھتے ہیں۔

> "مارکسزم نے میرے دماغ کو ہلا ڈالا۔ اس کی منطق کے سامنے فکر و نظر سپر انداز ہو گئے۔ یہاں تک کہ میں خدا کی نفی پر کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کا ہمنوا ہو گیا۔ لیکن سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ پر ایک چھوٹی سی کتاب "خطبات مدراس" مجھے دوبارہ مسلمان بنانے کا باعث ہو گئی"[۱]

دورِ تشکیک کے خاتمے کے بعد آغا صاحب نے ترجمان القرآن کا مطالعہ کیا۔ الہلال کے فائل پڑھے۔ کلامِ اقبال کے مطالعے نے آغا صاحب میں اسلام کے لئے جو عصبیت پیدا کی وہ پختہ تر ہوتی گئی۔ غرض آغا صاحب نے علم و دانش کی جو وادیاں جیل خانے میں قطع کی تھیں، انہوں نے تدبر و حکمت میں اس قدر اضافہ کیا کہ وہ اپنے ہم عصر پڑھے لکھے لوگوں میں زیادہ صاحب بصیرت اور صاحب علم مانے جاتے تھے۔ جیل میں کتابوں کی تشنگی ہمیشہ رہی مگر تقسیم ہند کے بعد آغا صاحب کو کتابوں کے معاملے میں کبھی کوئی شکایت نہ رہی۔ ان کی ذاتی لائبریری میں چھ ہزار سے زائد منتخب کتب موجود تھیں۔ جن میں سے بہت سی نادر اور نایاب ہیں۔ رسائل اور جرائد کا کوئی شمار نہیں، محترمہ صوفیہ شورش نے اپنے والد کی لائبریری میں مختلف موضوعات پر اہم کتابوں کی مندرجہ ذیل تفصیل بتائی ہے[۲] جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا صاحب کے محبوب موضوعات کون کون سے ہیں نیز

---

[۱] بوئے گل ص نمبر ۲۳۶

موضوع	تعداد کتب
قرآن مجید (تفاسیر و مباحث)	۱۵۰
اسلام (تعلیمات و مباحث)	۲۰۰

یہ کہ ان کے زیر مطالعہ کس قسم کی کتابیں رہی ہیں۔ جن سے انہوں نے استفادہ کیا۔

بقیہ حاشیہ

موضوع	تعداد کتب
سیرت نبوی ؐ	۱۵۰
اقبالیات	۲۴۰
مولانا ابوالکلام آزاد	۱۱۵
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	۲۰۰
سوانح	۴۷۰
نعت	۶۰
مکتوبات	۳۵
سفر نامے	۳۰
تذکرے	۵۰
تاریخ	۲۷۰
احرار	۱۵
شاعری	۴۰۰
ادب و تنقید	۲۲۵
غالب	۳۵
قادیانیت	۱۲۰
سیاسیات	۱۶۰
منتخب ناول	۳۴۰
سوشلزم اور مارکس ازم	۱۴۰

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

آغا صاحب کو مطالعے کی اس عادت نے بڑا فائدہ پہنچایا۔ جو زندگی کے آخری دم تک برقرار رہی۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"شورش صاحب کو ابتدائی عمر میں تعلیم کی تکمیل کا موقع نہ ملا۔ لیکن انہوں نے مسلسل مطالعہ کیا۔ جس کے آثار ان کی کتابوں میں بڑی کثرت سے ملتے ہیں۔ اور عمر کے آخری حصے میں تو یوں محسوس ہوتا تھا۔ کہ وہ ادیب ہونے کے علاوہ اچھے خاصے عالم بھی ہیں۔ ان کی نظر مشرق و مغرب کے ادب پر یکساں تھی۔"[1]

مولانا تاج محمود لکھتے ہیں۔

"کسی دارالعلوم، کالج، یونیورسٹی سے اکتساب نہ کیا تھا۔ لیکن بڑے بڑے فاضل اور پی ایچ۔ ڈی ان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے تھے۔"[2]

حافظہ

آغا صاحب کو بلا کا حافظہ ودیعت ہوا تھا۔ جس کی بنا پر انہیں بے شمار اشعار ازبر تھے۔ خود کہتے ہیں۔

"شاید ہی کوئی دیوان ہو جو میں نے ان دنوں نہ پڑھا ہو۔ یہی میرے حافظہ کا سنِ آغاز

بقیہ حاشیہ علاوہ ازیں تصوف، صحافت، سائنس، اقتصادیات، تعلیم، نفسیات، فن خطابت اور دیگر متعدد موضوعات پر سینکڑوں کتابیں ہیں۔ چٹان کے مکمل فائل، الہلال کے فائل، زمیندار کے کچھ فائل اور بعض دیگر اہم اخبارات اور جرائد کے فائل بھی موجود ہیں۔ پانچ سو کے لگ بھگ کتابیں انگریزی میں ہیں۔

شورش نمبر ص نمبر ۱۴۰ مضمون صوفیہ شورش

[1] چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء "شورش نمبر" ص نمبر ۱۰۶ مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ

[2] چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء "شورش نمبر" ص نمبر ۱۴۹ مضمون مولانا تاج محمود

ہے میرا حافظہ اشعار کے اعتبار سے گنج قاروں ہو گیا[۱]۔"

مرزا ادیب، شورش نمبر میں آغا صاحب کے بچپن کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"حافظے کا یہ عالم تھا کہ مولانا ظفر علی خاں کی بے شمار پوری کی پوری نظمیں اُسے یاد تھیں اور جب یہ نظمیں سنانے پر تل جاتا تو کیا مجال ایک لمحے کے لئے بھی رک جائے۔ اسے ابوالکلام آزاد کے لاتعداد فقرے یاد تھے[۲]۔"

مرزا ادیب کے ان الفاظ کی تصدیق خود آغا صاحب کے ان الفاظ سے ہوتی ہے جو اُنہوں نے مولانا ظفر علی خاں سے کہے۔

"عرض کیا مجھے جسیات کا اسی فی صد اور آپ کے باقی کلام کا ستر فی صد حصہ زبانی یاد ہے[۳]"

چونی لال کا بیان ہے کہ

اُردو ڈکشنری اُسے ازبر تھی۔ عربی اور فارسی سے اُس کو شوق تھا اور پھر انگریزی میں بھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی[۴]۔

جیل میں پروفیسر تلک راج چڈھا سے آغا صاحب مارکسزم پڑھا کرتے تھے۔ ان کے پاس مارکسزم پر ایک کتاب تھی "ہینڈ بک آف مارکسزم" آغا صاحب کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ کتاب اس طرح ہضم کی کہ پوری کتاب ازبر ہو گئی[۵]۔

۱۔ پس دیوار زنداں ص نمبر ۱۱۲

۲۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۲۰۲ مضمون مرزا ادیب

۳۔ قید فرنگ ص نمبر ۲۵ شورش کاشمیری

۴۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۴۳ مضمون سی۔ایل۔کاوش

۵۔ بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۲۴۶

شاعری

"ذوقِ شعر کی ابتدا مدرسہ کے استاد مولوی نیاز محمد نعمانی سے ہوئی جو خود ایک نغز گو شاعر تھے۔"[۱]

اس وقت آغا صاحب کی عمر چودہ سال تھی۔ اس سے پہلے وہ صرف زمیندار پڑھا کرتے تھے پھر مولانا ظفر علی خاں سے اتنے متاثر ہوئے کہ ان کی بے شمار نظمیں زبانی یاد کر لی تھیں۔ ایک بزمِ ادب بنا رکھی تھی[۲]۔ جس میں مرزا ادیب۔ بدر محی الدین، شمس ملک اور حفیظ قندھاری نمایاں حصہ لینے والے تھے۔ اس بزمِ ادب میں آغا صاحب کے ذوقِ شاعری نے انگڑائی لی۔ آغا صاحب کو چونکہ اساتذہ کے بے شمار اشعار یاد تھے۔ اس لئے ان اشعار نے بنیاد کا کام کیا۔ احسان دانش، آغا صاحب کے استاد تھے ان دنوں ابھی احسان دانش کی شاعری کا آغاز تھا ترنم سے پڑھتے تھے۔ استاد کا ترنم اور شاعری آغا صاحب کے شعور میں رنگ بھرنے لگی[۳] اور پھر شعر کی صورت میں تصور کی دھندلی سی تصویر بننے لگی۔ ابتدا غزل سے کی جو معمولی نوعیت کی تھیں۔ آغا صاحب کا ابتدائی کلام اُن کے مجموعہ کلام "جذباتِ شورش" میں موجود ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۴۱ء میں چھپ چکا ہے۔ آغا صاحب نے پہلے پہل احسان دانش سے اصلاح لی۔ پھر مرزا ادیب کی معرفت اختر شیرانی سے نیاز حاصل کیا۔ اختر شیرانی سے بھی ایک آدھ رومانی نظم پر اصلاح لی۔ علامہ تاجور سے بھی رجوع کیا لیکن ان سے فیض حاصل نہ کر سکے[۴]۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے آغا صاحب کی طبیعت پر زیادہ تر "زمیندار" اور مولانا ظفر علی خاں کا اثر تھا لہٰذا انہوں نے شاعری میں مولانا ظفر علی خاں کی پیروی کی۔ وہ کچھ مدت تک اُن سے اصلاح بھی لیتے رہے۔ اس سلسلہ میں انور عارف کے انٹرویو میں آغا صاحب کہتے ہیں۔

۱۔ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف صفحہ نمبر ۹۴

۲۔ بحوالہ بوئے گل صفحہ نمبر ۹۷

۳۔ بحوالہ شورش کاشمیری انور عارف ص نمبر ۹۳

۴۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۹۴ از انور عارف

"شعور سے بلوغ تک مولانا کا اندازِ نظم گوئی طبیعت میں رچتا بستا رہا - انہی کے تتبع میں سیاسی، اخباری،
اسلامی اور فکاہی نظمیں کہنے لگا - اس سے مولانا ظفر علی خاں سے بھی اصلاح لی لیکن
اصلاح کا یہ دور مختصر رہا[۱]"

حیرت شاہ جالندھری جب لاہور میں آئے تو آغا صاحب سے اُن کے تعلقات استوار ہوئے - اور جب ان کے مرشد حضرت بیدم وارثی لاہور میں تشریف لائے تو آغا صاحب نے ایک غزل پر تبرکاً اُن سے بھی اصلاح لی[۲] - مگر زیادہ تر احسان دانش ہی سے فیض حاصل کیا - علامہ تاجور - احسان دانش اور اختر شیرانی شروع ہی سے آغا صاحب کے اندر ایک بڑے شاعر اور بڑے ادیب کی نشانیاں دیکھ رہے تھے[۳] - آخر یہ صلاحیتیں نشو و نما پاکر شباب کو پہنچیں اور آغا صاحب ایک بڑے شاعر بنے - قید و بند کے زمانہ میں شاعری کا سلسلہ تقریباً منقطع رہا جو تقریباً دس سال پر محیط ہے - یکم جنوری ۱۹۴۹ء جب "چٹان" نکالا تو پھر سے شاعری شروع کی اور کمال حاصل کیا شاعری کے سلسلہ میں آغا صاحب نیاز احمد نعمانی - مولانا ظفر علی خاں - مولانا عبد المجید سالک اور علامہ تاجور نجیب آبادی سے اصلاح لیتے رہے[۴] - لیکن آغا صاحب نے صرف احسان دانش کو اپنا استاد تسلیم کیا ہے - وہ کہتے ہیں -

"چٹان نکالا تو شاعری باقاعدہ ہو گئی پھر کبھی کسی لفظ میں کوتاہی محسوس کی تو احسان صاحب
سے مشورہ کر لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ عروض اور فنی اعتبار
سے مَیں نے احسان صاحب سے بڑا فیض پایا ہے - وہ اس لحاظ سے میرے استاد ہیں -"

---

۱ شورش کاشمیری ص نمبر ۱۹ انور عارف

۲-۳ بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۷۲ / ۲۱۱

۴ بحوالہ دیباچہ گفتنی ناگفتنی ص نمبر ۲۴

اور مجھے اس کا اعتراف کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے[۱]"

احسان دانش نے بھی اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ

" اپنے علمی، ادبی سفر میں وہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا ہے۔ لیکن شاعری کے معاملے میں وہ اب تک مجھ سے مشورہ کرتا ہے۔ شروع سے اب تک اس کی نظر میں میرا جو احترام ہے وہ اس دور میں مشکل ہی سے کسی اصیل شاگرد میں ملے گا[۲]۔"

آغا صاحب نے کبھی کسی مشاعرے میں اپنا کلام نہیں سنایا اور کبھی بطور شاعر کسی مشاعرے میں شامل نہیں ہوئے۔ زندگی میں صرف ایک بار بمبئی کے جلسۂ عام میں یورپ کی جنگ پر ایک معرکتہ الآرا نظم پڑھی[۳]۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

" یورپ کی فضاؤں میں قضا جاگ اٹھی ہے
اب جنگ کفن چور لیڈروں میں ٹھنی ہے[۴]"

عشق

آغا صاحب کے عشق کی کہانی ریل سے شروع ہوتی ہے اور جیل میں ختم ہو جاتی ہے۔ یہ ۱۹۳۶ء کا واقعہ ہے کہ آغا صاحب گجرات کی عدالت سے ایک سال قید بامشقت کا حکم سن کر لاہور آرہے تھے[۵]۔ پولیس کی حراست میں آغا صاحب ریل کے تھرڈ کلاس ڈبہ میں بیٹھے تھے کہ دو نوجوان لڑکیاں اپنی ماں کے ہمراہ اس ڈبے میں بیٹھ گئیں۔ پولیس کی کوشش کے باوجود وہ اس ڈبے سے جانے پر رضامند نہ ہوئیں[۶]۔ جب گاڑی

۱۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۹۴ انٹرویو انور عارف

۲۔ جہان دانش ص نمبر ۲۲۳

۳۔ بحوالہ پس دیوار زنداں ص نمبر ۱۵۶

۴۔ بحوالہ چٹان "شورش نمبر" یکم نومبر ۱۹۷۶ء صفحہ نمبر ۳۶

۵-۶۔ بحوالہ پس دیوار زنداں ص نمبر ۱۱۲-۱۱۴

گجرات سے لاہور کی طرف روانہ ہوئی تو ان دونوں لڑکیوں میں سے بڑی لڑکی جس کا نام خورشید تھا[۱] آغا صاحب کے دل کے ساتھ لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتر گئی ۔

مگر اس ایک سال قید کے دوران میں وہ آغا صاحب کو مسلسل خط لکھتی رہی[۲]۔ آخر جدائی کی گھڑیاں ختم ہوئیں ۔ ۱۹۳۹ء کے آغاز میں آغا صاحب رہا ہوئے اور مارچ ۱۹۳۹ء کے آخری دنوں میں لاہور شملہ پہاڑی پر ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی[۳]۔ تو پتہ چلا کہ خورشید کا تعلق کشمیر نسل کے وائیں خاندان سے ہے ۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے ۔ اپنی والدہ اور چھوٹی بہن ثریا کے ساتھ لاہور رہتی میں مقیم ہے[۴]۔ آغا صاحب نے اپنی کتاب پسِ دیوارِ زنداں میں خورشید کی تصویر بنائی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ حسنِ صورت کے ساتھ ساتھ حسنِ سیرت کی بھی مالک تھی ۔ ایک ادیب یا شاعر کے جملہ اوصاف کا عکس اس میں موجود تھا ۔ اساتذہ کے تیر و نشتر ازبر تھے خطوط لکھنے میں یگانہ تھی ۔ گویا کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک فاضلہ اور ادبی و شاعرانہ ذوق کی تصویر تھی ۔

"کسی عورت میں شعر و شاعری کے اعتبار سے اتنا بلند ذوق اور اتنا مضبوط حافظہ میں نے نہیں پایا فی الجملہ اس کا وجود ادبی دلآویزیوں کا مجموعہ تھا اپنے خطوط میں شعر کو اس حسن خوبی سے کھپاتی جیسے کسی انگوٹھی میں نگینے جڑے ہوں[۵]"

جلد ہی آغا صاحب اُن کے گھر بے تکلف آنے جانے لگے ۔ خورشید کی والدہ آغا صاحب کو بیٹا اور چھوٹی بہن بھیا کہتی تھی اور خود خورشید، شورش کاشمیری کو آغا جی کے نام سے پکارنے لگی ۔ حجاب اور تکلف جاتا رہا ۔ خورشید اور اس کی والدہ رضامند تھیں کہ شادی ہو جائے ۔ مگر آغا صاحب ستمبر ۱۹۳۹ء میں گرفتار ہوئے اور جیل چلے گئے ۔ جب آغا صاحب جیل سے رہا ہو کر واپس آئے تو خورشید آغا صاحب کی رہائی سے ایک سال قبل ہی تپ دق کے مرض مبتلا رہ کر زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی[۶]۔ آغا صاحب اس کی قبر پر بھی نہ جا سکے ۔ کیونکہ قبرستان آپ کی

۱-۴ بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں ص ۱۱۲/۱۱۲/۱۷۵/۱۷۵
۵ بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۱۷۶
۶ بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۳۹۹

نظربندی کی حدود سے باہر تھا۔ آغا صاحب کے عشق کی مدت چند دنوں سے زیادہ نہیں جو انہوں نے خورشید کے ساتھ گزارے کیونکہ آغا صاحب نے پہلی دفعہ مارچ ۱۹۳۹ء کے آخری دنوں میں خورشید سے شملہ پہاڑی پر ملاقات کی۔[۱]

اپریل ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مجلس احرار کے سالانہ اجلاس منعقدہ پشاور میں شرکت کے لئے پشاور گئے اور اس اجلاس سے خطاب کیا۔[۲] پشاور سے واپسی پر لاہور سے بمبئی میں احرار کانفرنس میں شرکت کے لئے چلے گئے۔[۳] بمبئی سے آگرہ۔ آگرہ سے دہلی۔ دہلی سے انبالہ میں چند روز قیام کے بعد واپس لاہور آئے۔[۴] مئی سے اگست تک آغا صاحب نے مختلف مقامات پر تقریریں کیں۔[۵] واپس آئے تو دفعہ ۱۲۴ الف کے وارنٹ پیچھا کر رہے تھے۔[۶] آخر ستمبر ۱۹۳۹ء میں آپ کو پانچ سال قید ہو گئی۔ اور جیل چلے گئے۔ یعنی مارچ ۱۹۳۹ء کے اواخر میں ملاقات ہوئی۔ اپریل ۱۹۳۹ء سے لے کر ستمبر تک مختلف سیاسی مصروفیات میں الجھے رہے۔ تا آنکہ ستمبر میں پھر قید ہو گئے۔ مارچ ۱۹۳۹ء کے اواخر سے لے کر اپریل ۱۹۳۹ء تک آغا صاحب کے عشق کا عرصہ ایک ماہ سے بھی کم بنتا ہے۔ جس میں آغا صاحب کو ملاقات کے مواقع میسر آئے۔

عشق کے سلسلہ میں آغا صاحب کی شاعری میں ربیعہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ جو کہ محض ایک تخیلی پیکر ہے۔ جسے آغا صاحب نے اپنے شاعرانہ ذوق کو سہارا دینے کے لئے وضع کیا تھا۔[۷]

شادی

بقول چونی لال کاوش "شورش کے دماغ میں شادی کا خیال سب سے پہلے میں نے پیدا کیا کیوں کہ میری شادی میرے گھر والوں نے جیل سے نکلتے ہی کروادی تھی۔ ہم نے سوچا یہ بھی آزاد کیوں رہے۔"[۸] لیکن آغا صاحب

۱۔ بحوالہ پس دیوار زنداں ص نمبر ۱۷۵

۲-۵۔ بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۱۵۵/۱۵۶/۱۵۷/۱۵۷

۶۔ بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۲۲

۷۔ بحوالہ شورش کاشمیری ص نمبر ۹۶ از انور عارف

۸۔ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش کاشمیری نمبر صفحہ نمبر ۳۸

کا بیان ہے ۔"مولانا مظہر علی اظہر کی تحریک والد کے اصرار اور بہنوں[۱] کی خواہش پر مجھے سر جھکانا پڑا"۔لیکن آغا صاحب کے مالی حالات اچھے نہ تھے لہٰذا اخراجات پورے کرنے کا وعدہ بھی مولانا مظہر علی اظہر نے فرمایا تھا اور اخراجات کا انتظام مستری شمس الدین کے سپرد تھا۔ آغا صاحب کا خیال تھا کہ روپیہ مظہر علی اظہر دے رہے ہیں ۔مگر بعد کو پتہ چلا کہ انھوں نے مختلف دوستوں سے چندہ لیا ہے[۲] ۔ اور ان چندہ دینے والوں میں ملک محمد امین بیرسٹر اور میاں قمرالدین رئیس اچھرہ سر فہرست ہیں ۔میاں صاحب نے ۵۰۰/- روپے اور بیرسٹر صاحب نے ۱۰۰/- روپیہ دیا[۳] ۔ بہرحال اخراجات کا حساب مستری شمس الدین کے پاس تھا۔ آغا صاحب کو اس کی کوئی خبر نہ تھی ۔

۱۹۴۵ء تک شورش کاشمیری ایک معروف آدمی تھے ۔ اسی شہرت کی بنا پر بہت سے لوگ رشتہ دینے پر تیار تھے مگر آغا صاحب کی بہنوں کا رجحان اپنے ماموں کی طرف تھا[۴] ۔ لہٰذا آغا صاحب کی شادی اُن کے ماموں کے گھر انبالہ میں طے ہو گئی اور ۲۷ مئی ۱۹۴۵ء شادی کی تاریخ مقرر ہوئی[۵] ۔ اور آغا صاحب شادی کے لئے دوستوں، عزیزوں، ادیبوں، شاعروں اور سیاست دانوں کے ساتھ ہوڑہ ایکسپریس سے انبالہ کے لئے روانہ ہوئے ۔خواجہ صادق کاشمیری نے ایک مشاعرہ کا بھی انتظام کر رکھا تھا ۔ لہٰذا بارات میں شامل تمام شعراء نے مشاعرہ میں حصہ بھی لیا اس طرح آغا صاحب اپنی بیوی خورشید کو لے کر لاہور آ گئے ۔ آغا صاحب لکھتے ہیں ۔

مولانا ظفر علی خاں ولیمہ پر تشریف لائے میری بیوی کو دعائیں دیں ۔ ارتجالاً فرمایا۔

گجردم لے کے قاصد یہ مسرت زا پیام آیا
کہ انبالے سے شورش ایک پھندنا سی دلھن لایا
میرے دل سے دعا نکلی کہ اس جوڑے کے سر پر ہو
نبیؐ کی رحمتوں کا اور خدا کے فضل کا سایا

۱-۲ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل صفحہ نمبر ۲۳۰، ۲
۳-۵ بحوالہ بوئے گل صفحہ نمبر ۲۳۰، ۲۳۱/۲۵۱، ۲۴۸

12042

پربودھ جی کی سالی سوراج کماری پہلی دفعہ ہمارے کلبۂ احزان میں آئیں ۔ بیوی کو ملیں بہت خوش ہوئیں مجھے مبارک باد دی کہنے لگیں ۔

آپ چاند کو دکھی دھرتی پہ اتار لائے ہیں[1]۔

آغا صاحب کی شادی اُن کے حق میں بڑی مبارک ثابت ہُوئی ۔ اب آغا صاحب مسوّدوں کی تصحیح ۔ کتابوں کی ترتیب اور تحریروں کی نوک پلک درست کر کے چار پانچ سو روپیہ کما لیتے تھے ۔ پربودھ، آغا صاحب کے دوست جو ہندوستان میں وزیر بھی رہے کے ساتھ مل کر آغا صاحب نے ایک پبلشنگ ہاؤس قائم کیا ۔ آغا صاحب اِس ادارہ میں مدیر کے فرائض انجام دیتے تھے ۔ آغا صاحب کی تنخواہ عام مراعات کے علاوہ پانچ سو روپے تھی ۔ اس طرح آغا صاحب کے حالات بدلنا شروع ہُوئے ۔ آغا صاحب خود لکھتے ہیں ۔

"غرض میرے لئے شادی ایک نیا عہد اور ایک نیا دور لے کر آئی اس میں شک نہیں
کہ زندگی کے آنگن میں صدموں کا ایک انبار لگا ہُوا تھا لیکن اب یہ محسوس ہو رہا
تھا کہ مصیبت کے تیرہ سال ہوا ہو گئے اور ان کی جگہ فصلِ گل آ گئی[2]۔"

آغا صاحب کی ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار تھی ۔ بیگم آغا شورش ایک پڑھی لکھی اور بہادر خاتون ہیں ۔ اگرچہ ایک عرصہ سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہیں مگر پھر بھی اپنے خاندان کا نظام بڑے سلیقہ سے چلا رہی ہیں ۔ یہاں تک کہ چٹان کا تنقیدی جائزہ بھی لیتی ہیں[3]۔ شادی کے بعد آغا صاحب کبھی جیل نہ گئے تھے ۔ جب ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو آغا صاحب کو گرفتار کیا گیا تو بیگم شورش اور ان کی بچیوں پر اس افتاد کا اثر تو ضرور ہُوا[4]۔ مگر ان کی بیگم نے بڑے ہی حوصلے کا ثبوت دیا اور ہر مصیبت کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کیا ۔ اپنی بیگم کے رویہ کی تعریف کرتے ہُوئے آغا صاحب لکھتے ہیں ۔

[1،2] بوئے گل ص نمبر ۲۵۱/۲۴۹/۲۴۹

[3] بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر ص نمبر ۲۲ انٹرویو بیگم شورش

[4] بحوالہ تمغۂ خدمت صفحہ نمبر ۱۱

بحمد اللہ وہ ایک کشمیری ہے گو ایک عرصہ سے دماغی عارضہ کی مریض ہے لیکن اُس نے بڑا حوصلہ دکھایا۔[1]

اولاد[2]

آغا صاحب کے کل گیارہ بچے ہیں۔ جن میں سات لڑکیاں اور چار لڑکے ہیں۔ سب سے بڑے بیٹے کا نام آغا مسعود شورش ہے جنہوں نے صحافت میں ایم۔ اے کیا اور آج کل ہفت روزہ چٹان کے ایڈیٹر ہیں۔ آغا مسعود شورش کے دوسرے بھائی کا نام محمود اختر شورش ہے۔ جنہوں نے مسعود پرنٹنگ پریس کا کام سنبھالا ہوا ہے۔ مشہود شورش ڈسٹرکٹ انفرمیشن آفیسر ہیں۔ ان کی شادی ہو چکی ہے۔ اور دو بچیاں ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی کا نام مبشر شورش ہے جن کی تعلیم بی۔ اے ہے۔ وہ بھی محمود اختر شورش کے ساتھ مسعود پرنٹنگ پریس ہی میں کام کرتے ہیں۔

آغا صاحب شورش کاشمیری کی بڑی صاحبزادی کا نام شائستہ شورش ہے۔ ان کی شادی نصرت پراچہ صاحب سے ہوئی جو سرگودھا میں یونائیٹڈ بنک کے مینیجر ہیں۔ ان سے چھوٹی بیٹی کا نام شاہدہ شورش ہے۔ صوفیہ[3] شورش ان سے چھوٹی ہیں۔ اور ان کی شادی ظہیر اختر صاحب سے ہوئی جو کراچی میں ایڈمنسٹریشن اینڈ پرسنل عوامی آٹوز کے مینیجر ہیں۔

آغا صاحب کی چوتھی بیٹی کا نام توصیف شورش ہے۔ ان کی شادی صغیر حسین صاحب سے ہو چکی ہے۔ جو پی۔ آئی اے لاہور میں سیلز سپروائزر ہیں۔ نائلہ شورش جنہیں آغا صاحب پیار سے نیلو کہا کرتے تھے۔ ایف۔ اے کی طالبہ ہے۔ امبرین شورش جنہیں گھر والے رومی کے نام سے بھی پکارتے ہیں۔ کالج میں سال اوّل کی طالبہ ہیں۔ اسی طرح ریبنو جن کا اصل نام عائکہ شورش ہے بھی کالج میں سال اوّل کی طالبہ ہیں۔

---

۱ تمغۂ خدمت ص نمبر ۸۰

۲ بروایت آغا مسعود شورش ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان

۳ صوفیہ شورش صاحبہ ۱۱ مئی ۱۹۸۵ء کی شب کراچی کے ایک ہسپتال میں ۴۴ سال کی عمر میں وفات پا گئیں۔ بحوالہ ہفت روزہ چٹان ۱۳ مئی ۱۹۸۵ء

سیاست

آغا صاحب نے اپنی کتاب "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" میں اپنے آغازِ سیاست کے بارے میں جن واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اُن کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے۔

سائمن کمشن جب لاہور آیا اُس وقت آغا شورش پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ سائمن کمشن کے بائیکاٹ کے نتیجہ میں لالہ لاجپت رائے پولیس کی لاٹھیاں کھا کر بری طرح مجروح ہوئے اور چند دن بعد سورگباش ہوگئے۔ اِن کے سوگ میں لاہور کے تقریباً سبھی سکول اور کالج بند ہوگئے۔ مگر دیو سماج سکول جہاں آغا شورش زیرِ تعلیم تھے۔ کھلا رہا اور سکول انتظامیہ نے سکول بند کرنے سے انکار کر دیا طلباء نے خود سکول بند کرنے کا فیصلہ کر لیا آغا صاحب نے چھٹی کی گھنٹی بجائی۔ کچھ طلباء انتظامیہ کے کہنے پر واپس آگئے مگر بہت سے طلباء نے واپس آنے سے انکار کر دیا جس میں آغا صاحب بھی شامل تھے۔ سیکنڈ ہیڈ ماسٹر نے آغا شورش کو سرغنہ قرار دے کر اُن کے ہاتھ پر دس بید لگائے اور پانچ روپے جرمانہ کیا۔ آغا صاحب نے بید بھی کھائے اور جرمانہ بھی ادا کیا۔ انہوں نے اپنے ایک دوست اوم پرکاش کے ساتھ مل کر اٹھارہ برس سے کم عمر کے لڑکوں کی ایک جماعت بنائی جس کا نام "بال بھارت سبھا" رکھا آغا صاحب اس جماعت کے سیکرٹری اور اوم پرکاش صدر تھے۔ ابتداء میں کل چھ لڑکے تھے۔ تین ہندو اور تین مسلمان چند ہی دنوں میں ممبروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ ہندو لڑکیاں بھی اس جماعت میں شریک ہوگئیں۔ اس جماعت کا کام ہر روز جلسے کرنا اور جلوس نکالنا تھا۔

یہ ان معنٰی میں سیاسی جماعت ضرور تھی کہ یہ کم عمر کے لڑکے بھی اپنے اندر آزادی کی اُمنگ رکھتے تھے۔ ورنہ اس کا کوئی سیاسی منشور یا دفتر وغیرہ نہیں تھا صرف موری دروازہ کے باہر بابا کمدن شاہ کے مزار سے ملحق سبزے میں ایک کیمپ لگا دیا گیا۔ جہاں پر نوجوان جمع ہو کر آزادی کے خواب دیکھتے اور حکومت کے خلاف جلوس نکالتے آخر ان سرگرمیوں کا نوٹس لیا گیا۔ پہلے نوٹس پر تعمیل کرائی گئی کہ کیمپ اٹھا لیا جائے جس پر آغا صاحب نے بطور سیکرٹری دستخط کر دیئے[1]۔ لیکن بعد کو "بال بھارت سبھا" نے فیصلہ کیا کہ کیمپ نہ اُٹھایا جائے۔ دو دن کے بعد پولیس

---

[1] بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۳۳

نے چھاپہ مارا۔ جو نوجوان رضاکار موجود تھے ان میں سے کچھ کو گرفتار کر لیا گیا اور کچھ نوجوانوں کو پولیس اٹھا کر لے گئی لیکن کیمپ اگلے روز پھر لگا دیا گیا۔ دوبارہ چھاپا مارا گیا اور جو رضاکار وہاں پولیس کے ہاتھ لگے۔ پولیس والوں نے اپنی لوٹ کا مال سمجھ کر جنسی اور جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا۔ اسی تشدد کی وجہ سے راجپال اور اوم پرکاش کی موت واقع ہوگئی۔ دوسرے لڑکوں کے والدین کو طرح طرح سے تنگ کیا گیا۔ آغا صاحب کو بھی ان کے والد سے پٹوایا گیا۔[۱]

"بال بھارت سبھا" تو بچوں کا کھیل تھا۔ جسے کھیل کر آغا صاحب کھلاڑی بنے۔ اور ایک سیاسی جماعت نیلی پوش یا اتحاد ملت میں شامل ہوگئے۔ جس کا قیام ۱۹۳۵ء میں معرض وجود میں آیا۔[۲] "مجلس اتحاد ملت" یا "نیلی پوش"

---

[۱] بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۲۳

[۲] اتحاد ملت کے قیام کے بارے میں عاشق حسین بٹالوی کا یہ بیان کہ

"فروری ۱۹۳۶ء میں مسٹر جناح کی کوشش سے یہ رہا ہوئے (مراد ہے ظفر علی خان اور ان کے ساتھی) اور انہوں نے مجلس اتحاد ملت بنا ڈالی"

اقبال کے آخری دو سال صفحہ نمبر ۳۰۲

درست نہیں بلکہ

"فروری ۱۹۳۶ء میں تو مجلس اتحاد ملت کی تشکیل نو کی گئی تھی۔ جن میں آغا صاحب بھی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے"

پس دیوار ص نمبر ۵۹

مجلس اتحاد ملت جیسا کہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تحریر فرماتے ہیں کہ

"۱۹۳۵ء میں مسئلہ شہید گنج پر ظفر علی خان کا مجلس احرار سے سخت اختلاف ہوا۔ انہوں نے مجلس اتحاد ملت بنائی"

ظفر علی خان ادیب و شاعر ص نمبر ۱۰۳

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

کا قیام مولانا ظفر علی خان کی کوششوں کا رہین منت ہے۔

بقیہ حاشیہ

مجلس اتحاد ملت درحقیقت مولانا ظفر علی خان کے مجلس احرار سے اختلاف ہی کا نتیجہ تھا۔ اس بات کی تصدیق چوہدری افضل حق اس طرح کرتے ہیں۔

"خدا خوش رکھے ظفر علی خان بھی عجیب بزرگ ہیں۔ آپ جالندھر میں ان دنوں وارد ہوئے جب تحریک بڑھ رہی تھی۔ (تحریک کپورتھلہ مراد ہے) آپ نے سرخ پوشوں کی بجائے نیلی پوش بننے کی لوگوں کو تلقین شروع کی۔ کچھ وکلا کے گروہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مولانا کی سرکردگی میں کچھ وکلا ہمیں ناکام بنانے کے لئے آمادہ ہو گئے۔" تاریخ احرار صفحہ نمبر ۱۶۸

کپورتھلہ کی تحریک کا زمانہ ۳۴-۱۹۳۳ء کا ہے۔ جب کہ شہید گنج کی تحریک ۱۹۳۵ء میں چلی جب مسجد کا انہدام ہوا اس وقت مجلس اتحاد ملت موجود تھی۔ عنایت اللہ نسیم سوہدروی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ

"جب مسلمانوں کا ہجوم، حصول مقصد کے لئے دیوانہ وار مسجد شہید گنج کی طرف بڑھنے لگا اور مسلمان لیڈر اپنی مصلحتوں کی خاطر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ تو ایک نئی جماعت نیلی پوش کے نام سے ابھری۔"

ظفر علی خان اور ان کا عہد ص نمبر ۲۲۵

اور نیلی پوش سر دھڑ کی بازی لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔ لہٰذا یہ واقعہ ۱۹۳۵ء کا ہے۔ ۱۹۳۶ء کا نہیں۔ جیسا کہ عاشق حسین بٹالوی تحریر فرماتے ہیں۔

مولانا مظہر علی اظہر مسئلہ شہید گنج میں لکھتے ہیں کہ

"مسجد شہید گنج کے ابتدائی انہدام سے جو ۲۸ جون ۱۹۳۵ء کو عمل میں آیا۔ کچھ عرصہ پہلے مولانا ظفر علی خان صاحب اس بات کا فیصلہ کر چکے تھے۔ کہ مجلس احرار کے مقابلے میں ایک اور انجمن کا قیام عمل میں لایا جائے۔"

مسجد شہید گنج ص نمبر ۳۵

شہید گنج اور اتحاد ملت

یہ عہد آغا صاحب کی سیاسی زندگی کا ایسا موڑ ہے جس کی وجہ سے آغا صاحب نے سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اور مجلس احرار میں شامل ہوئے۔ ان کی کتاب "بوئے گل" سے پتہ چلتا ہے کہ جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید گنج کا تنازعہ شروع ہوا۔ تو مسلمانوں کے جذبات بھڑک اٹھے۔ لوگوں کو مجلس احرار سے توقع تھی کہ وہ اس سلسلے میں موثر ثابت ہوگی۔ مگر مجلس احرار نے تحریک شہید گنج میں حصہ نہ لیا تو اتحاد ملت والے آگے بڑھے۔ مولانا ظفر علی خان اور دوسرے راہنماؤں کو جلد گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح قائدین کا فقدان ہو گیا۔ اس وقت تحریک شہید گنج کو ایسے جیالوں کی ضرورت تھی جو تحریک کو آگے بڑھائیں اور یہ فرض نوجوان قیادت نے بھرپور طریقے پر ادا کیا۔ اس تحریک میں آغا صاحب کی شمولیت اتفاقی تھی۔ وہ بزمِ ادب کے اجلاس سے فارغ ہوئے تو حافظ معراج دین انہیں شاہی مسجد میں لے گئے۔ وہاں آغا صاحب نے جلسے کی صدارت کے ساتھ تقریر بھی کی۔ جس کی وجہ سے جیل چلے گئے۔ جب آغا صاحب رہا ہوئے تو مولانا ظفر علی خان نے اتحاد ملت کی تشکیل نو کی۔ جس میں مولانا ظفر علی خان صدر منتخب ہوئے۔ ملک لال خان جنرل سیکرٹری بنائے گئے۔ ایک ورکنگ کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔ جس میں شورش کاشمیری، چوہدری غلام حیدر۔ مولانا اختر علی خان۔ اظہر امرتسری میاں فیروز الدین۔ یعسوب الحسن اور ابوسعید انور کو شامل کیا گیا۔ نوجوان قائدین تحریک شہید گنج کو آگے بڑھانے اور مسجد کو حاصل کرنے کے تمنائی تھے۔ مگر سیاست دانوں کے پیشِ نظر مسجد سے زیادہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کامیابی کا حصول تھا۔ جس نے آغا صاحب کو بددل کر دیا۔ آغا صاحب کی عقیدتوں کے آبگینے انتخابات کی آندھی میں مکدر ہو گئے۔ اور ایک ایک کر کے ٹوٹتے رہے۔ انسانوں کی فطری کمزوریاں اور کوتاہیاں آغا صاحب پر آشکار ہوئیں۔ اور جب انہوں نے سیاستدانوں کو اپنے اصل روپ میں دیکھا تو سیاست دانوں کے متعلق آغا صاحب کا تصور بالکل بدل گیا۔

یہ دور در حقیقت احرار اور اتحادِ ملت کی چپقلش کا دور تھا۔

آخر انتخابات ہو گئے وزارتیں بن گئیں تو اب مجلسِ احرار کو موقع مل گیا کہ اپنا قرض چکائیں مجلسِ احرار نے شہید گنج کی تحریک میں حصہ نہ لے کر اپنی رسوائی کے سامان پیدا کر لئے تھے۔ اور اتحادِ ملت والے احرار کو کسی موقع پر بھی معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔

اسی زمانے میں مسلم لیگ کا اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا جس میں پنجاب کے وزیرِ اعظم سر سکندر حیات نے شرکت کی اور اجلاس میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کی قرارداد منظور کی گئی۔

مولانا مظہر علی اظہر نے اسی قرارداد کی بنیاد پر سول نافرمانی کا پروگرام بنایا کہ اب پنجاب کے وزیرِ اعظم اس بات کے پابند ہیں کہ مسجد واپس دلائیں۔ ورنہ اُن کی حکومت کے خلاف سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جائے گی۔ ان دنوں میں وزیر خاں کی مسجد میں چوہدری افضل حق کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا۔ آغا صاحب نے لوگوں کے اصرار پر اس جلسے میں تقریر کی آغا صاحب کی احرار کے جلسہ میں یہ پہلی تقریر تھی اپنی تقریر میں انہوں نے یہ اعلان کیا کہ اگر پنجاب کے وزیرِ اعظم مسجد کی بازیابی کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے تو وہ عید الاضحیٰ کو سکندر حیات کی کوٹھی پر رضاکاروں کا جتھہ لے کر جائیں گے۔

اس اعلان سے عوام میں اشتعال اور سرکاری حلقوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ آغا صاحب کو اس کام سے باز رکھنے کے لئے مختلف طریقے آزمائے گئے۔ نواب صاحب ممدوٹ نے خریدنا چاہا۔ سکندر حیات وظیفہ لگانے پر تیار ہو گئے۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل (سی۔آئی۔ڈی) نے اسسٹنٹ سب انسپکٹر بنانا چاہا۔ آغا صاحب کو دولت لالچ اور سازش سے رام کرنے کی کوشش کی گئی۔ غرض ہزار دام پھیلائے گئے مگر آغا صاحب نصب العین کی صداقت کی ایک ہی جنبش سے صاف بچ نکلے اور اپنے وعدہ کے مطابق عید الاضحیٰ کے دن سو رضاکاروں کا جتھہ لے کر روانہ ہوئے اور قید کر دیئے گئے۔

شہید گنج کی تحریک نے آغا صاحب کا راستہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متعین کر دیا۔ انہوں نے اتحادِ ملت سے قطع تعلق کر لیا اور ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء کو آغا صاحب مجلسِ احرار میں شامل ہو گئے۔ احرار میں شمولیت کے بعد

آغا صاحب نے احرار کے جلسوں میں شہید گنج پر تقریریں کیں اور تحریک کے مخفی گوشوں پر روشنی ڈالتے رہے۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی۔ اور نئی صورت حال پر غور کرنے کے لئے چوہدری افضل حق نے امرتسر میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی بجائے شیخ حسام الدین کو صدر چنا گیا اور چوہدری افضل حق کی تحریک پر آغا صاحب کو مجلسِ احرار کا جنرل سیکرٹری بنایا گیا۔

حکومت نے آرمی بل کے ذریعے فوجی بھرتی کی مخالفت پر ایک سال کی قید کا قانون بنایا۔ احرار نے مخالفت کی ٹھانی اور آغا صاحب نے مختلف جگہوں پر تقریریں کیں اور آرمی بل کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت پیدا کی اسی جرم میں انہیں قید کر دیا۔

رہائی کے بعد آغا صاحب دہلی چلے گئے [۱ے]۔ وہاں گاندھی جی۔ سردار پٹیل۔ بابو راجندر پرشاد۔ سر مرزا اسمٰعیل آصف علی۔ حسن نظامی۔ جواہر لال نہرو۔ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقاتیں کیں [۲ے]۔

اسی دوران میں کلکتہ اور نواکھلی کے فسادات شروع ہو گئے تو آغا صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے کہنے پر پٹنہ چلے گئے۔ تاکہ فسادات کی صورت حال معلوم کی جا سکے [۳ے]۔ پٹنہ سے دہلی واپسی پر آغا صاحب نے اپنی رپورٹ مولانا آزاد کو پیش کی۔ جس میں فسادات کی وجوہ و واقعات درج تھے [۴ے]۔ مولانا نے اس رپورٹ کے انگریزی ترجمے کی کاپیاں کانگرس کی ہائی کمان اور گاندھی جی کو بھجوائیں [۵ے]۔

اس کے بعد آغا صاحب لاہور واپس آ گئے اور لاہور کے فسادات میں متاثرین کی امداد میں بھرپور حصہ لیا۔ قیام پاکستان کے بعد آغا صاحب عملی سیاست سے کنارہ کش ہو گئے [۶ے]۔ لیکن ایک دفعہ پھر وہ حمید نظامی کی خواہش اور اصرار پر سہروردی کی جناح عوامی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے [۷ے]۔ جناح عوامی مسلم لیگ سے علیحدگی

۵-۱ے بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۳۴۷/۳۸۱/۳۳۱/۱۵۴/۵۵۴

۶ے بحوالہ مضمون ایک جامع الصفات شخصیت ملک شیر محمد اعوان چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۹

۷ے بحوالہ حسین شہید سہروردی ص نمبر ۶۴ از شورش

کے بعد آغا صاحب کبھی کسی سیاسی جماعت میں شامل نہ ہوئے اگرچہ نہ صرف سیاسی جماعتیں بلکہ خود حکومتیں آغا صاحب کی ہم نوائی کی متمنی رہتی تھیں۔

قید و بند

شورش کاشمیری کی زندگی کی داستان ان کی گرفتاریوں، جیل کے حالات، مقدمات اور ظلم و تشدد جو ان پر کئے گئے کے بغیر ادھوری رہے گی۔ اس لئے ان واقعات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ ان کی زندگی کا ایک بڑا اور اہم حصہ جیل میں گزرا اور اسیری کے حالات و واقعات نے اُن کے مزاج، کردار اور تحریروں پر بڑے اثر ڈالے۔ شورش صاحب کے سوانحی حالات کا مطالعہ اس تناظر میں کیا جائے تو شورش کے مزاج اور کردار کی تشکیل میں جو عناصر کارفرما رہے۔ انھیں سمجھنے کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ اس ضمن میں مناسب ہے کہ اُس زمانے کے جیل خانے، ماحول اور اسیریٔ فرنگ کے محرکات، پس منظر، احوال اور نتائج و اثرات کا سرسری ذکر کیا جائے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں سیاسی لیڈروں، کارکنوں اور عوام کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگوں نے حصہ لیا اور ہر طرح کی قربانیاں دیں۔ لوگ گولی کا نشانہ بنائے گئے۔ زخمی ہوئے۔ جیلوں میں بند کئے گئے اور وہاں اُن سے ناروا سلوک ہوا تشدد کا نشانہ بنائے گئے مگر اُن کے جذبۂ آزادی میں کسی طرح بھی کمی نہ آئی۔ ایک انگریز صحیفہ نویس مسٹر بیورلی نکلس اپنی کتاب میں ان جیل جانے والے حریت پسندوں کے محرکات اور اس زمانے کی جیل کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

> جیل خانوں میں آنے والوں کی بڑی تعداد کا تعلق ایسے طبقوں سے ہے جو فاقہ زدہ اور مفلوک الحال ہیں۔ اور ان کے لئے جیل خانہ کی زندگی نسبتہً بڑے آرام کی زندگی ہے سیاسی روابط ان پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔ گاندھی۔ جناح اور نہرو اُن کے لئے بے معنی الفاظ ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جیل خانہ میں صحت بخش کھانا اور صاف ستھرے بستر ہیں اور وہاں کل کی کوئی فکر نہیں۔[1]

---

[1] فیصلۂ ہندوستان (ورڈکٹ آن انڈیا) مصنف بیورلی نکلس اردو ترجمہ عبدالقدوس ہاشمی حیدرآباد دکن نومبر ۱۹۴۶ء ص نمبر ۲۵۱

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر بیورلی نکلس نے کبھی ہندوستان کے جیل خانے نہیں دیکھے۔ اور یہ عبارت لکھتے وقت انگلستان کے جیل خانوں کی سنی سنائی باتوں پر انحصار کیا گیا ہے یہاں پر زندگی آرام سے بسر ہوتی ہوگی صحت مند کھانا ملتا ہوگا اور سونے کے لئے صاف ستھرے بستر مہیا کئے جاتے ہوں گے جس کے فسانے عام سننے میں آتے ہیں۔ مگر ہندوستانی جیل کا نقشہ بقول پنڈت نہرو یہ ہے۔

> میں اپنی کوٹھڑی میں تنہا نہیں تھا اس لئے کہ یہاں ہر قسم کے زہریلے کیڑے مکوڑوں اور بھڑوں نے اپنی نو آبادیاں قائم کر رکھی تھیں [۱]

بیورلی نکلس نے جیل کے صاف ستھرے بستروں کا ذکر کر دیا مگر ان کچھوؤں کا ذکر نہیں کیا جو ان بستروں پر موجود ہوتے تھے [۲] اور جیل کے کھانے کا اندازہ شیخ حسام الدین کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ

> جتنی سزائیں جیل مینوئل میں مرقوم تھیں سب کی سب سیاسی قیدیوں پر آزمائی گئیں اور محض اس جرم پر کہ جیل کی وہ خوراک جسے جانور تک منہ لگانے کو تیار نہ تھے اسے ہم لوگ کیوں نہیں کھاتے" [۳]

اور جہاں تک فاقہ زدہ اور مفلوک الحال طبقہ کا تعلق ہے۔ اگر وہ لوگ بھوک مٹانے کے لئے جیل جاتے تھے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جیل میں بھوک ہڑتال کیوں کی جاتی تھی؟ اور اگر ان کی اس بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے تو ہندوستان کی ۹۴٪ آبادی جیل میں ہونی چاہئے تھی کیونکہ

> ہندوستان بھر میں زیادہ سے زیادہ چھ فی صدی ایسے لوگ ہیں جنہیں اطمینان سے روٹی ملتی ہے [۴]

۱-۲ میری کہانی ص نمبر ۱۳۲/۱۳۱

۳ مضمون پہلی قید از شیخ حسام الدین روزنامہ آزاد۔ قیدی نمبر ۴، اگست ۱۹۴۷ء

۴ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص نمبر ۵۶۶

لہٰذا اُن کے اس بیان کو قوم پرستی کی بجائے تاریخی بد دیانتی سمجھنا چاہئیے اور یہ حقیقت اس طرح بھی سامنے آتی ہے کہ آزادی کے بعد اب بھی انگریزی حکومت کے بنائے ہوئے جیل خانے موجود ہیں۔ جن میں بڑی حد تک اصلاح ہو چکی ہے۔ مگر ابھی تک وہ بات پیدا نہیں ہوئی جس کا ذکر مسٹر بیورلی نکلس نے کیا ہے۔ بلکہ بقول شورش صاحب

"انگریز نے جیل خانے نہیں بوچڑ خانے بنائے یا قصاص خانے"[1]

یہاں قیدیوں سے اہانت کا سلوک۔ ظالمانہ برتاؤ، سخت لہجہ اور تذلیل آمیز رویہ اختیار کیا جاتا تھا۔ حریت پسند نوجوانوں کو بطور خاص تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا تاکہ ان میں بزدلی پیدا کر دی جائے اور جب باہر جا کر قید کی سختیوں کا ذکر عوام میں کریں تو جیل کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے اور قانون شکنی اور انگریز دشمنی سے باز رہیں اور یہ کام باقاعدہ حکومت کی ہدایات پہ کیا جاتا تھا مگر یہ حریت پسند نوجوان اپنی ہمت اور حوصلہ کی بنا پر قید میں بھی آزادی کے خواہاں تھے جسے جیل کے حکام اور حکومت کسی طرح برداشت نہیں کرتی تھی۔ لہٰذا ان کے ساتھ ظلم و بربریت کا سلوک کیا جاتا تھا۔ کہ انسان اُس کے تصور سے کانپ جاتا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے بالکل درست کہا ہے کہ

جیل کی اکثر سزائیں لڑکوں اور نوجوانوں کے حصہ میں آتی تھیں اس لئے کہ وہ بے جا سختیوں پر بے زاری کا اظہار کرتے تھے یہ بڑے اچھے بہادر لڑکے تھے جن میں خودداری تیزی طراری، من چلا پن کوٹ کوٹ کر بھرا تھا"[2]

اور جس ماحول میں ان نوجوان حریت پسندوں کو رکھا جاتا تھا پنڈت جواہر لال نہرو ہی کے الفاظ میں یہ تھا۔

وہاں کی ساری فضا تشدد۔ کمینہ پن۔ رشوت اور جھوٹ سے ناپاک تھی۔[3]

یہاں پر یہ بات یاد رکھنی چاہئیے کہ پنڈت جواہر لال نہرو بہتر کلاس کے قیدی رہے لہٰذا یہ حالت بہتر کلاس کی ہے

---

[1] پسِ دیوارِ زنداں — ص نمبر ۸۶

[2] میری کہانی — ص نمبر ۱۰۷

[3] میری کہانی — ص نمبر ۱۱۴

تو عام سی کلاس وارڈ کا ماحول کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں ۔ مگر عام قیدیوں کے مقابلہ میں سیاسی قیدیوں میں یہ احساسِ تفاخر ہمیشہ موجود رہا کہ وہ آزادی کے علم بردار ہیں مجرم نہیں لہٰذا یہی احساس اُن میں استقامت ۔ استقلال ۔جرأت اور حوصلہ پیدا کر دیتا تھا اور وہ ہر آزمائش اور ابتلا کو خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہتے مگر اپنے اصولوں پر آنچ نہ آنے دیتے تھے ۔

آغا صاحب کی زندگی کا یہ ایک خاص پہلو ہے کہ انہوں نے زندگی کے ہر میدان میں بڑی جرأت استقامت اور بہادری کا عملی مظاہرہ کیا اور زندگی کے اس پہلو کی تعمیر جیل خانے میں ہوئی ۔

مصائب، آلام اور تشدد

آغا صاحب پر کتنے مقدمات قائم ہوئے ۔ کتنی مرتبہ گرفتار ہو کر سزا یاب ہوئے کتنی سزائیں کاٹیں اس عرصہ میں جیل میں ان پر کس قدر تشدد اور ظلم وستم روا رکھا گیا اس کی ساری تفصیل اُن کی کتاب "پسِ دیوارِ زنداں" میں موجود ہے ۔جیل کی زندگی سے متعلق ہمارا بڑا ماخذ ان کی کتاب "پسِ دیوارِ زنداں" ہی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب پہلی دفعہ تحریک شہید گنج کے دنوں میں آغا صاحب قید ہوئے تو انہوں نے جیل سے ایک بزرگ خط سید عنایت شاہ ایڈیٹر سیاست کے بھائی کے نام لکھا جو پکڑا گیا ۔جیل والے چاہتے تھے کہ آغا صاحب اُس آدمی کا نام بتائیں جو یہ خط لے کر باہر گیا ۔ مگر آغا صاحب نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ۔ جس پر آغا صاحب کو قصوری لائن بورسٹل جیل میں بھیج دیا ۔ اور وہاں اُن کے ساتھ یہ سلوک ہوا کہ دو پاگل قیدیوں نے جن سے جیل والے کام ہی مار پیٹ کا لیا کرتے تھے آغا صاحب کو طمانچوں گھونسوں اور جوتوں سے پیٹ پیٹ کر ہلکان کر دیا ۔ مگر آغا صاحب نے اس شخص کا نام نہیں بتایا ۔ جیل کے حکام ہی کو ہار ماننا پڑی ۔ اسی طرح شاہی قلعہ میں بغیر کسی گناہ کے چھیانوے گھنٹے تک تشدد کا نشانہ بنایا گیا ۔

آغا صاحب کے اپنے الفاظ میں

"پہلی رات تو یہ کیا گیا کہ مجھے مُرغن غذائیں کھلائی گئیں جب نیند نے گھیرا تو کھڑی ہتھکڑی

ل پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۹۴-۹۵

لگا کر لٹکا دیا گیا۔ دو پچھتے دار کنسٹیبلوں نے گھونسے مار مار کر میرا منہ سُجا دیا کوئی وجہ
بتائی ہوتی، کوئی سوال کیا ہوتا! معلوم ہوتا تھا نیند اُڑانے کا نسخہ استعمال ہو رہا تھا۔
ستم یا کرم کہہ لیجئے کہ لٹکانے کے بعد دو بڑے بڑے بلب روشن کر دیئے آناً فاناً پتنگوں
کا لشکرِ جرار ٹوٹ پڑا۔ آدھ آدھ گھنٹوں بعد گھونسوں اور طمانچوں کا لاوا پھوٹتا رہا۔

آغا صاحب ایک ایسے سیاسی کارکن تھے۔ جو نہ صرف بہادر تھے بلکہ غیور بھی اور جو ہر وقت اپنی عزتِ نفس پر جان دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ جیل کے کارندے اور حکام اپنے معمول اور ماحول کے زیرِ اثر تبدیلیوں سے انتہائی ذلت آمیز سلوک کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ خاص طور پر سی کلاس کے قیدی جن کا کوئی پرسانِ حال نہ ہو۔ آغا صاحب کے ساتھ تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ سی۔ آئی۔ ڈی والے پرخاش رکھتے تھے کہ اپنی تقریروں میں اُن کی خبر لیتے تھے۔ صوبائی حکومت کے لئے بھی آغا صاحب ایک مصیبت سے کم نہ تھے لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ آغا صاحب کو سبق سکھایا جائے۔ رہی پولیس اور انگریز تو وہ ہمیشہ ہی آغا صاحب کے ذاتی دشمن رہے۔ ایسے ماحول میں جب آغا صاحب جیل جاتے تھے تو انہیں باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبوں کے تحت تنگ کیا جاتا تھا۔ اِس قسم کے کئی حربے آزمائے گئے مگر آغا صاحب کبھی سپر انداز نہ ہوئے۔ ایک دفعہ ایک قیدی نے دو تین سیر اُبلتا ہوا دودھ آغا صاحب پر گرا دیا۔ جس سے آغا صاحب کی پیٹھ کا حصہ نیچے تک جل گیا۔ ڈاکٹر کو کئی بار بلایا گیا مگر وہ دانستہ نہ آیا۔ اِسی دوران پیشاب بند ہونے کی تکلیف اور بڑھ گئی مگر ڈاکٹر اغماض برتتا رہا۔ اور جب اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رام لال کپور خود جا کر ڈاکٹر کو ساتھ لایا تو آغا صاحب زخموں سے چور اور غصہ میں بھرے بیٹھے تھے۔ جونہی وہ آیا آغا صاحب نے اس زور سے لات رسید کی کہ ڈاکٹر کولھوں کے بل گرا۔ اس کے بعد آغا صاحب نے اس ڈاکٹر سے علاج کروانے سے انکار کر دیا۔ آخر سول سرجن کو بلایا گیا۔ جس نے آغا صاحب کی دیکھ بھال کی۔ اور زخموں پر پٹی کر دی اس طرح انہیں نیند آ گئی مگر تھوڑی دیر کے بعد ہی ایک قیدی نے آغا صاحب کے سر پر اسٹول دے مارا جس سے ان کے ماتھے پر زخم آئے۔ غرض مختلف حربوں سے آغا صاحب کو زیر کرنے کی کوشش کی گئی مگر انہوں نے ہر حربہ کا مقابلہ بڑی ہمت اور بہادری سے کیا۔

ستمبر ۱۹۳۹ء میں جب آغا صاحب قید ہوئے تو انہیں ڈسٹرکٹ جیل منٹگمری میں رکھا گیا۔ وہاں جاتے ہی اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ

شیر سنگھ سے ٹھن گئی۔ جس کی وجہ شیر سنگھ کا ناروا اور تحقیر آمیز سلوک تھا جو وہ سیاسی قیدیوں سے روا رکھتا تھا۔ ان قیدیوں میں مولانا گل شیر۔ مولانا احسن عثمانی۔ صوفی عنایت محمد پسروری۔ حکیم غوث محمد۔ سیتارام۔ بندے ماترم۔ کامریڈ نظام۔ کامریڈ راجندر سنگھ ہنس اور میر داد خاں ایسے انقلابی اور محترم سیاسی کارکن شامل تھے۔ شیر سنگھ ان کی ہر روز تلاشی لیتا تھا۔ تمام لوگ چکی پیستے تھے۔ صرف ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کو کھولا جاتا تھا۔ آغا صاحب یہ تذلیل برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے تمام ساتھیوں سمیت سخت سردی کے موسم میں بستر چھوڑ ہڑتال کر دی۔ آخر سپرنٹنڈنٹ جیل نے آپ کے تمام مطالبے مان لئے۔ مگر شیر سنگھ نے مختلف طریقوں سے تنگ کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ آغا صاحب بطور خاص نشانہ تھے۔ آخر آغا صاحب کو ساتھیوں سے علیحدہ کر دیا اور نمبردار قیدیوں کے ایک جتھے نے آغا صاحب پر کمبل ڈال کر "گدڑ کٹ"[1] شروع کر دی اسی مار پیٹ کے بعد جب شیر سنگھ آیا تو آغا صاحب نے پانی کا جھجرا اٹھا کر آہنی دروازے پر دے مارا شیر سنگھ بھاگ نکلا سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ دوبارہ آیا تو آغا صاحب نے چکی کا پاٹ اٹھا لیا آخر سپرنٹنڈنٹ نے منت سماجت کی۔ معافیاں مانگیں۔ مگر شیر سنگھ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔ آخر آغا صاحب نے پہلے تین دن تک علامتی بھوک ہڑتال کر دی جب حکام نے کوئی نوٹس نہ لیا تو چوتھے دن میر داد خاں۔ احسن عثمانی۔ پرمانند۔ عبدالعزیز۔ غوث محمد اور سیتارام بندے ماترم بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے۔ پندرہ دن تک بھوک ہڑتال جاری رہی جیل کے حکام سپرانداز ہو گئے۔ اور قیدیوں کو سہولتیں مل گئیں۔ مگر شیر سنگھ اپنے رویہ سے باز نہ آیا۔ ایک دن اس نے آغا صاحب کو گالی دی آغا صاحب نے تھپڑ دے مارا۔ اب مار پیٹ اور تشدد کا نیا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ "معافی مانگو گھر جاؤ"۔

معافی مانگنے پر مجبور کرنے کے لئے بقول آغا صاحب یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔

میرے دونوں ہاتھ باندھ کر مجھے جنگلے سے لٹکا دیا پاؤں تلے گڑ کا پانی ڈال کر کیڑے مکوڑے

---

[1] "گدڑ کٹ" پنجاب کے جیلوں کی اصطلاح میں اُس ظالم مار کو کہتے ہیں جو کسی جماعت یا خود سر قیدی کو پڑتی ہے۔

چھوڑ دیئے یوں "فرمانِ خسروی" تھا کہ معافی مانگو اور گھر جاؤ۔ چیف شیر سنگھ کو دوٹوک کہا تمہیں جس نے یہ کہا ہے اس سے کہہ دو۔ شورش کی لاش یہاں سے نکلے گی معافی نہیں مانگے گا۔ ٹکا سا جواب پاکر واپس چلا گیا۔[1]"

مگر سختی اور بڑھ گئی۔ گوبر اور براز لپیٹ کر آغا صاحب کے منہ پر توبڑا باندھ دیا گیا۔ کھڑی ہتھکڑی لگائی گئی۔ مگر آغا صاحب کسی طرح بھی زیر نہ ہوئے۔ آخر یہ خبر باہر نکل گئی۔ اخباروں میں چرچا ہونے لگا۔ مجلسِ احرار نے قراردادیں، شروع کیں سوشلسٹوں نے بھی احتجاج کیا۔ مشہور صحافی مہاشہ کرشن نے حکومتِ وقت کی توجہ مبذول کرائی "سکندر حیات خدا سے ڈرو" کے عنوان سے بڑا ہی مؤثر شذرہ تحریر کیا۔ آخر ۵۶ دن بھوک ہڑتال کے بعد صوبائی گورنمنٹ کی ہدایت پر جیل حکام سپر انداز ہو گئے۔

مقدمات

مقدمہ نمبر ۱ یوں تو آغا صاحب پر بہت سے مقدمے بنائے گئے مگر ذیل میں صرف ان مقدمات کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں انہیں سزا ہوئی اور انہوں نے یہ سزا کاٹی۔

آغا صاحب کی پہلی گرفتاری ۱۹۳۵ء میں ان تقریروں کی وجہ سے عمل میں آئی جو انہوں نے بادشاہی مسجد میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لئے کی تھیں۔ گرفتاری کے بعد آغا صاحب کو سٹی کوتوالی میں رکھا گیا۔ گرفتاری کے پندرہ دن بعد سنٹرل جیل کے کورٹ روم میں مقدمہ کی سماعت ہوئی۔ ایک اینگلو انڈین مجسٹریٹ مسٹر ٹبل نے سرسری سماعت کے بعد اُن لوگوں کو جو آغا صاحب کے ساتھ ہی پکڑے گئے تھے۔ ایک ایک سال قید بامشقت اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپے جرمانہ کیا مگر آغا صاحب کو ۲ سال قید سخت اور تین سو روپے جرمانہ عدم ادائیگی کی صورت میں مزید چھ ماہ قید کا حکم دیا۔[2] جسے سن کر انقلاب زندہ باد۔ اللہ اکبر اور پنجاب پولیس مردہ باد کے نعرے لگائے۔

---

[1] پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۲۲۲

[2] بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں شورش ص نمبر ۸۰

شہید گنج ڈیفنس کمیٹی نے اس سزا کے خلاف اپیل کی۔ مسٹر کارنیلیس سیشن جج لاہور نے جرمانہ معاف کر دیا اور سزا کم کر کے تین ماہ کر دی مگر آغا صاحب کا دوسرا مقدمہ چل رہا تھا کہ مسٹر کارنیلیس کی جگہ ایک دوسرے جج مسٹر اونکا ناتھ زتشی آ گئے۔ انہوں نے آغا صاحب کو بری کر دیا۔ آغا صاحب نے ایک ماہ کا عرصہ حوالات میں گزارا اور تین ماہ جیل خانے میں رہے۔[1]

مقدمہ نمبر ۲ ۔ ۱۹۳۶ء میں آغا صاحب کو ایک اور مقدمہ میں گرفتار کیا گیا۔[2] اس دفعہ اُن پر الزام تھا کہ انہوں نے اپنی تقریر میں لوگوں کو جلال الدین ورزی مالک روزنامہ نیرنگ کے قتل پر اُبھارا ہے۔[3] مقدمہ دفعہ ۱۱۷/۳۰۲ تعزیرات ہند کے تحت درج کیا گیا۔[4]

---

[1] بحوالہ بوئے گل   شورش   ص نمبر ۱۰۰

اس مقدمہ میں "اردو انسائیکلو پیڈیا" کا یہ لکھنا کہ
"تحریک شہید گنج میں اڑھائی سال قید کی سزا ہوئی"۔ ص نمبر ۹۰۵ نیا ایڈیشن مطبوعہ فیروز سنز
اور انور عارف کا اپنی کتاب "شورش کاشمیری" میں آغا صاحب کے انٹرویو کے حوالے سے یہ لکھنا کہ
"میں پہلی بار ڈھائی سال قید ہو گیا"   شورش کاشمیری از انور عارف ص نمبر ۵۹
درست نہیں ہے آغا صاحب اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں۔
"ٹیل (اینگلو انڈین مجسٹریٹ جس نے اس مقدمہ کی سماعت کی) نے مجھے دو سال قید اور تین سو روپیہ جرمانہ کا حکم سنایا"   بوئے گل   ص نمبر ۹۶
اور پسِ دیوارِ زنداں میں اِس سزا کو اس طرح لکھا گیا ہے۔ "مجھے دو سال قید سخت اور تین سو روپے جرمانہ (بصورت عدم ادائیگی مزید چھ ماہ قید) کا حکم سنایا گیا"   پسِ دیوارِ زنداں   ص نمبر ۴۰
آغا صاحب کی ان دو تحریروں سے ثابت ہوتا ہے کہ انہیں دو سال کی سزا ہوئی اڑھائی سال کی نہیں
مصنف اردو انسائیکلو پیڈیا نے اور انور عارف نے غالباً بصورت عدم ادائیگی جرمانہ والے چھ ماہ
بھی شامل کر لئے ہیں اور اس طرح اس سزا کو اڑھائی سال لکھ دیا ہے۔

۲-۴   بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں   ص نمبر ۶۳ - ۶۶

دیوان برہم ناتھ مجسٹریٹ تھے انھوں نے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۵۶۲ کے تحت ایک سال کے لئے دو ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا۔[1] اس دفعہ آغا صاحب تقریباً تین ماہ حوالات میں رہے۔[2]

مقدمہ نمبر۵ ۱۹۳۷ء میں سکندر وزارت کی تشکیل کے فوراً بعد آغا صاحب پر جنڈیالہ گورو کی ایک تقریر پر دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا۔ الزام یہ تھا کہ انھوں نے حکومت کے خلاف لوگوں کو تشدد پر اُبھارا ہے۔ آغا صاحب کو گرفتاری کے بعد دس بارہ روز تک امرتسر جیل میں رکھا گیا۔ آخر پنڈت وشنو بھگوان اے۔ڈی۔ایم نے دو ہزار روپے کی ضمانت پر رہا کر دیا۔ مگر تین دن تک جیل ہی میں رہے کہ ضمانت دینے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر چوتھے روز شیخ غلام محی الدین امرتسری نے ضمانت دی اور رہا ہوئے۔ یہ مقدمہ چار ماہ تک چلا۔ آخر وشنو بھگوان نے آپ کو ایک سال قید بامشقت کی سزا دی۔[3] اس مقدمہ کی پیروی ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے کی اور اس سزا کے بعد ہائی کورٹ میں اپیل بھی کر دی۔ جسٹس سکیمپ اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے تعلقات بڑے خوشگوار تھے جو آغا صاحب کی رہائی میں کام آئے۔

---

[1] بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۴۳-۴۴

[2] بحوالہ شورش کاشمیری از انور عارف ص نمبر ۵۹

[3] پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۴۷

اردو انسائیکلو پیڈیا نے اس مقدمہ کی سزا کو اس طرح لکھا ہے۔

"سولہ برس کی عمر میں بجرم بغاوت دو بارہ ۲ سال قید کی سزا ہوئی"

پہلی بات تو یہ کہ آغا صاحب کی عمر اُس وقت سولہ برس نہیں تھی کیونکہ آغا صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء ہے اور یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کا ہے۔

دوسری بات یہ کہ دو سال قید کی سزا نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک سال تھی۔ آغا صاحب نے اپنی کتاب پسِ دیوارِ زنداں میں اس مقدمہ کا عنوان ہی "ایک سال قید" لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

"پھر چار بجے شام عدالت میں بلا کر ایک سال بامشقت قید کا حکم سنا دیا"

اس دفعہ آغا صاحب نے ایک ہفتہ کم چار ماہ قید کاٹی۔[1]

مقدمہ نمبر ۴ اور ۵

سنہ ۱۹۳۸ء میں آغا صاحب نے تحریک شہید گنج کے سلسلہ میں یہ اعلان کیا کہ اگر پنجاب کی حکومت نے مفاہمت کے لئے کچھ نہ کیا تو وہ عید الاضحیٰ کے دن سکندر حیات کی کوٹھی پر ایک جتھہ لے کر جائیں گے چنانچہ عید الاضحیٰ کے دن آغا صاحب حسبِ وعدہ ایک سو رضا کاروں کا ایک جتھہ لے کر سکندر حیات کی کوٹھی کی طرف بڑھے مگر راستے ہی میں روک لئے گئے اور دفعہ ۱۴۴ ض۔ف کے تحت گرفتار ہو گئے۔ دفعہ ۱۴۴ ض۔ف توڑنے کا مقدمہ چلا۔ رضا کاروں کو دو دو ماہ اور آغا صاحب کو ۴ ماہ قید سخت کا حکم سنایا گیا۔[2]

اس سے دو تین دن بعد ہی گجرات میں ایک تقریر کی بنا پر دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند کے وارنٹ وصول ہوئے اس مقدمہ میں گجرات کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ لالہ لکھمی چند نے آغا صاحب کو ایک سال قید سخت کی سزا دی۔[3] اس طرح آغا صاحب ایک سال چار ماہ کے لئے قید ہوئے۔[4] وہ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۳۸ء کو قید ہوئے اور ۲۷ فروری سنہ ۱۹۳۹ء کو رہا ہو گئے۔ اس طرح اس قید کا عرصہ ایک سال ۱۷ دن بنتا ہے۔ ایک سال ۴ ماہ نہیں کیونکہ

۱؎ بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۱۵۲-۱۵۸ ۳، ۴؎ بحوالہ بوئے گل شورش ص نمبر ۱۸۵-۱۸۶

۲؎ جانباز مرزا اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ

"۱۱ فروری سنہ ۱۹۳۸ء کو شورش دفتر احرار سے چالیس رضا کاروں کی قیادت کرتا ہوا پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات کی قیام گاہ پر حصول مسجد کا مطالبہ لے کر روانہ ہوا کہ گرفتار کر لیا گیا۔ اور یکم مارچ کو اس جرم میں ایک سال قید کی سزا سنا دی گئی۔ دیگر رضا کاروں کو دو دو ماہ قید کا حکم ہوا۔"

کاروان احرار تیسری جلد ص نمبر ۲۸

لیکن آغا صاحب کہتے ہیں کہ

بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر

۱۱ تا ۲۷ فروری کا درمیانی عرصہ ایک سال[41] ۱۷ دن ہے۔

بقیہ حاشیہ

"عید الاضحیٰ آگئی ہیں حسبِ اعلان سو رضا کاروں کا جتھہ لے کر روانہ ہوگیا۔" بوئے گل ص نمبر ۱۸۲

لیکن آغا صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ

مجسٹریٹ نے رضا کاروں کو دو دو ماہ قید سخت اور مجھے چار ماہ قید سخت کا حکم سنایا۔ بوئے گل ص نمبر ۱۸۵

اپنی کتاب پسِ دیوارِ زنداں میں لکھتے ہیں۔

میرے ساتھی رضا کاروں کو دو دو ماہ اور مجھے چار ماہ قید کا حکم ہوا۔ پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۱۰۲

جانباز مرزا نے یہ بھی لکھا ہے کہ

اُسے مال روڈ سے گرفتار کر لیا گیا تھا عدالت نے انہیں ایک سال کی سزائے قید دی تھی۔

۲۹ اپریل کو لاہور سیشن جج نے اِن کی اپیل کا فیصلہ سناتے ہوئے انہیں بری کر دیا۔

کاروانِ احرار جلد سوم ص نمبر ۳۲۵

آغا صاحب نے بری ہو جانے کا ذکر نہیں کیا بلکہ یہ لکھا ہے کہ

ہمارے خلاف دفعہ ۱۴۴ توڑنے کا مقدمہ چلا تو مجسٹریٹ نے رضا کاروں کو دو دو ماہ قید سخت
اور مجھے چار ماہ قید سخت کا حکم سنایا۔ - - - - - - - - - - ۔دوسرے تیسرے
روز گجرات سے میرے خلاف دفعہ ۱۲۴ الف کے وارنٹ آگئے لاہور سے اٹھا کر مجھے
گجرات چالان کر دیا وہاں لالہ مکھی چند ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں
مقدمہ چلتا رہا اور ایک سال قید سخت کی سزا ہوگئی۔ میں سزا پا کر لاہور
سنٹرل جیل واپس آ گیا۔ بوئے گل ص نمبر ۱۸۵

یعنی ابھی ایک قید جاری تھی کہ مزید ایک سال کیلئے مقید ہو گئے۔

یہاں پر شاید مرزا صاحب سے سہو ہوا ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مرزا صاحب نے گجرات والی ایک سال کی قید کو سکندر حیات کی کوٹھی پر جتھہ لے کر جانے والی قید سے خلط ملط کر دیا ہے۔ جہاں تک ۱۱ فروری سنہ ۱۹۳۹ء کو گرفتار ہونے، یکم مارچ کو سزا ہونے اور ۲۹ اپریل کو رہا ہونے کا تعلق ہے۔ یہ ممکن ہے کہ آغا صاحب کو ۲۹ اپریل کو اس مقدمہ میں

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

مقدمہ نمبر ۶ - ۷

ستمبر ۱۹۳۹ء میں آغا صاحب پر دو مقدمے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت ایک ملتان اور دوسرا لائل پور (اب فیصل آباد) میں تقریروں کی بنا پر قائم ہوئے۔

لائل پور کے مقدمے میں آغا صاحب کو دو سال اور ملتان کے مقدمے میں تین سال قید ہوئی۔ اور اس طرح آغا صاحب پانچ سال کے لئے قید ہوگئے۔ اور رہائی کے بعد دو سال تک تھانہ انارکلی لاہور کی حدود میں نظر بند رہے۔[1]

بقیہ حاشیہ

بری کر دیا ہو مگر رہا نہیں ہوئے تھے۔ کیونکہ گجرات والی ایک سال قید ہو چکی تھی۔ آغا صاحب اس دفعہ ایک سال چار ماہ کیلئے قید ہوئے۔ وہ ۱۱ فروری ۱۹۳۸ء کو گرفتار ہوئے یعنی عید الاضحیٰ کو اور ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء کو رہا ہوئے۔

"چنانچہ رہا ہوتے ہی میں نے اعلان کر دیا کہ میں احرار کے ساتھ ہوں .... ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء پہلا دن تھا کہ میں نے احرار میں شمول کا اعلان کیا" بوئے گل ص نمبر ۱۸۶

گرفتاری (عید الاضحیٰ) ۱۱ فروری ۱۹۳۸ء

رہائی ۲۷ فروری ۱۹۳۹ء

[1] اس سلسلے میں اردو انسائیکلو پیڈیا میں جو یہ لکھا ہے کہ

"دوسری جنگ عظیم چھڑتے ہی ایک باغیانہ تقریر کے الزام میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت گرفتار ہوئے اور سات سال قید ہوئی۔ رہا ہونے کے بعد لاہور میں نظر بند رہے۔ ملک کی آزادی سے پہلے یہ پابندیاں واپس لے لی گئیں۔

نیا ایڈیشن ص نمبر ۹۰۵

درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح سات سال قید اور دو سال نظر بندی کی مدت بنتی ہے۔ اسی طرح عزیز انصاری صاحب اپنے مضمون "کوئی کہاں سے تمہارا جواب لائے گا" چٹان شورش نمبر میں رقمطراز ہیں کہ

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

لیکن نظر بندی کو قید کی مدت میں شامل نہیں کرنا چاہیے کیونکہ نظر بندی قید کا حصہ نہیں

بقیہ حاشیہ "قیام پاکستان سے قبل آخری بار شورش مرحوم باغیانہ تقریر کے الزام میں سات سال قید ہوئے۔

۱۹۴۴ء کے آخر میں رہا کر دیئے گئے اور بعد میں ان کو محدود علاقے میں پابندی اور زبان بندی

پر حکماً مجبور کر دیا گیا"

شورش نمبر ص نمبر ۲۱۳

درست نہیں۔ بلکہ ۱۹۴۴ء میں آغا صاحب قید سے رہائی کے علاوہ نظر بندی کی مدت بھی پوری کر چکے تھے اور نظر بندی کی پابندیاں واپس ہو گئی تھیں۔

آغا صاحب لکھتے ہیں کہ

"ستمبر ۱۹۳۹ء میں سات برس کے لئے قید ہو گیا اور آخر ۱۹۴۴ء میں رہا ہوا۔"

بوئے گل ص نمبر ۲۲۸

۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۴ء تک پانچ سال قید بنتی ہے سات سال نہیں اس کی تصدیق اس طرح سے بھی ہوتی ہے کہ آغا صاحب نے پسِ دیوارِ زنداں میں لکھا ہے کہ

"بیان ختم ہو چکا تو مسٹر مینی نے تین سال قید بامشقت کا حکم سنایا۔ دو سال کی سزا لائل پور سے ہو چکی تھی کل پانچ سال"۔

پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۱۸۳

اس قید سے رہائی کے بعد آغا صاحب کو انار کلی تھانہ کی حدود میں نظر بند کر دیا گیا تھا اور یہ نظر بندی دو سال ہے۔ اس طرح اگر اس نظر بندی کو بھی قید میں شمار کر لیا جائے جو یقیناً آغا صاحب نے عرصہ قید میں شامل کی تو کل مدت پانچ سال بنتی ہے۔ سات سال نہیں۔ تین سال اور دو سال کی یہ سزا چونکہ ایک ساتھ شروع ہو گئیں لہٰذا یہ عرصہ تقریباً تین سال ہے اور نظر بندی دو سال۔ اس طرح سے کل عرصہ پانچ سال بنتا ہے۔ یہ بات اس طرح زیادہ واضح ہوتی ہے جیسا کہ عبداللہ ملک اپنی کتاب "شورش بنام عبداللہ ملک" میں لکھتے ہیں۔

"یہ درست ہے کہ جب ۱۹۴۳ء میں وہ جیل سے رہا ہو کر آیا تو اس وقت میرے اور

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

ہوتی۔ نظربندی اور قید میں قانونی طور پر بھی فرق کیا جاتا ہے۔

بقیہ حاشیہ

اُس کے سیاسی نظریات میں دوری پیدا ہو گئی تھی۔ - - - - - - - - - - - -

- - - ۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں جب وہ پیسہ اخبار کی حدود میں نظر بند تھا تو وہ خاص طور پر اجازت ۔

لے کر میری برات (شادی) میں شریک ہوا۔"

شورش بنام عبداللہ ملک   ص نمبر ۲۵ دیباچہ

عبداللہ ملک کے اس بیان کی تصدیق آغا صاحب اِس طرح کرتے ہیں۔

" ان ہی دنوں عبداللہ ملک کی شادی قرار پائی۔ - - - - - - - - - میں نے

قاعدہ کے مطابق ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی کہ مجھے اپنے اس عزیز دوست کی شادی پر امرتسر

جانا ہے خود میرا گھر وہاں ہے اجازت دی جائے اجازت ہو گئی۔"

پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۴۰۷

آغا صاحب ۱۹۴۴ء کو قید کے علاوہ نظر بندی سے بھی رہا ہو چکے تھے۔ یہ بات اس طرح بھی پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ

جس دن آغا صاحب کے بھائی یورش کا انتقال ہوا وہ تاریخ ۱۷ دسمبر ۱۹۴۴ء ہے۔

آخر یورش کا آخری وقت آ گیا ۱۷ دسمبر ۱۹۴۴ء اس کی زندگی کا آخری دن تھا۔

پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۴۱۲

اور اسی دن نظر بندی کے احکام واپس ہو گئے

لوگ میت دفنا کر گھر پہنچے تو پیسہ اخبار پولیس اسٹیشن کا سب انسپکٹر دروازہ پر کھڑا تھا اس

کے ہاتھ میں ہوم سیکرٹری کا دستخطی حکم نامہ تھا۔ گورنر پنجاب بڑی مسرت کے ساتھ

شورش کاشمیری پر عائد کردہ اُن پابندیوں کو واپس لینے کے احکام صادر کرتے ہیں

جس کی رو سے وہ اب تک انارکلی پولیس کے علاقہ میں نظر بند ہے۔

پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۴۱۳

مندرجہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ آغا صاحب ۱۹۴۲ء میں رہا ہو چکے تھے اور نظر بندی ۱۹۴۳ء ہی سے شروع ہوئی

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

مقدمہ نمبر ۸

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۲ء میں پہلی دفعہ آغا صاحب دولتانہ وزارت کے زمانے میں ایک تقریر کی بنا پر گرفتار ہوئے اور چند دن جیل میں رہے۔ حسین شہید سہروردی وکیل تھے۔ مسٹر سیشن جج لاہور نے ان کے دلائل سن کر ضمانت پر رہا کر دیا۔ بعد کو یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔[۱]

مقدمہ نمبر ۹

اس مقدمے کی ساری روداد آغا صاحب کی کتاب تمغۂ خدمت میں درج ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ۵ ستمبر ۱۹۶۶ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۳۲۔بی کے تحت منٹگمری سنٹرل جیل میں چھ ماہ کیلئے اے کلاس میں نظر بند کر دیا۔ مگر ۱۰۴ دن[۲] کے بعد رہا ہو گئے۔ ان ۱۰۴ دنوں میں چالیس دن آغا صاحب کو منٹگمری سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ باقی ۶۴ دن لاہور میو ہسپتال میں رہے۔

مقدمہ نمبر ۱۰

یہ مقدمہ آغا صاحب کا بڑا ہی مشہور مقدمہ ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ حکومتیں سیاسی تیدیوں سے انتقام لینے کے لئے اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کا کتنا احترام کرتی ہیں۔ اور قانون کی بڑی بڑی عدالتوں میں غیر قانونی

بقیہ حاشیہ

جو اواخر ۱۹۴۴ء میں ختم ہو گئی۔ مگر اس طرح آغا صاحب کی قید کی مدت سات سال نہیں بلکہ پانچ سال بھی نہیں بنتی۔ البتہ اگر نظر بندی کی مدت اس میں شامل کر لی جائے تو تقریباً پانچ سال بن سکتے ہیں۔ رہائی کے دن ہی آغا صاحب کو تھانہ انارکلی کی حدود میں نظر بند کر دیا گیا۔ آغا صاحب کو پانچ یا پانچ سے زیادہ لوگوں میں بیٹھنے۔ تقریر کرنے اور لکھنے پر پابندی تھی۔ ہر اتوار کو صبح تھانہ میں حاضری کی رپورٹ دینا ہوتی تھی۔ بوئے گل ص نمبر ۲۲۸

یہ نظر بندی دو سال قائم رہی۔ شورش کاشمیری از انور عارف ص نمبر ۵۹

[۱] بحوالہ تمغۂ خدمت شورش ص نمبر ۱

[۲] انور عارف نے اپنی کتاب شورش کاشمیری میں لکھا ہے کہ "ستمبر ۱۹۶۶ء میں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت دھر لیا گیا۔ ساڑھے چار ماہ قید رہ کر رہا ہو گیا"۔ ۱۰۴ دن کی مدت ساڑھے تین ماہ بنتی ہے، ساڑھے چار ماہ نہیں۔

اعتراض و مقاصد کی تکمیل کن حربوں سے کرائی جاتی ہے اِس مقدمہ کی تفصیلات اُن کی کتاب "موت سے واپسی" میں ملتی ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۲۲-اپریل ۱۹۶۸ء کو آغا صاحب بیمار ہو کر میو ہسپتال لاہور کے فیملی وارڈ میں داخل ہو گئے۔ اِس دن آغا صاحب کو یہ احکامات ملے کہ ۲۷-اپریل کا شمارہ ضبط کر لیا گیا۔ ۲۵ اپریل ۱۹۶۸ء کو چٹان کا ڈیکلریشن بھی منسوخ ہو گیا اور پریس ضبط کر کے سر بمہر کر دیا گیا۔ ۵ رمئی ۱۹۶۸ء کو جمیعت العلمائے اسلام کے آخری اجلاس میں آغا صاحب نے حکومت کے خلاف ایک زبردست تقریر کی اور ۷ رمئی ۱۹۶۸ء کو ۳۲ ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ جرم یہ تھا کہ انہوں نے ایک شذرہ "الحمدللہ" کے عنوان سے تحریر کیا ہے جو مسلمانوں کے فرقوں میں تفریق کا باعث ہو سکتا ہے۔ دراصل یہ شذرہ مرزائیوں کے خلاف تھا۔ آغا صاحب نے اپنی تقریر میں اور بھی جارحانہ رویہ اختیار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ قادیانی مسلمان نہیں ہیں۔ لہٰذا آغا صاحب کو اِسی جرم کی بنیاد پر گرفتار کر کے ڈیرہ اسماعیل خاں کی جیل میں بھیج دیا گیا اور سی(C) کلاس میں رکھا گیا۔ آغا صاحب نے سی کلاس کے خلاف بھوک ہڑتال کر دی۔ ساتویں روز کمشنر ڈیرہ اسماعیل خاں (آغا صاحب سے ملے اور اے کلاس کے احکامات لکھے۔ اس کے بعد آغا صاحب کو سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ کیونکہ عدالت نے آغا صاحب کا مقدمہ کراچی میں سننے کا فیصلہ کیا تھا۔ حکومت کا خیال تھا کہ آغا صاحب کو پنجاب اور سرحد میں رکھنے سے کوئی تحریک چل سکتی ہے اور امن عامہ کی خرابی کا باعث ہو سکتی ہے۔ حکومت نے اِس مقدمہ کو روکنے کے لئے مختلف حربے استعمال کئے۔ چار دفعہ سپریم کورٹ سے رجوع کیا۔ حکومت چیف جسٹس تک پہنچی۔ ججوں پر اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ حکومت نے ہائی کورٹ کے ایک سابق جج مسٹر اے۔ آر۔ چنگیز کی خدمات حاصل کیں۔ اٹارنی جنرل شریف الدین پیرزادہ اور مسٹر اسرار الحق ایڈووکیٹ (جو مشرقی پاکستان سے بلائے گئے تھے) نے حکومت کا موقف پیش کیا۔ اسی دوران میں آغا صاحب نے حکومت کے معاندانہ رویہ اور اپنے مطالبات کے حق میں بھوک ہڑتال کا سلسلہ شروع کر دیا۔

پہلے انہوں نے ۲۶-اگست کو بھوک ہڑتال شروع کی اور ۶-ستمبر کو مطالبات منظور ہونے کے بعد ختم کر دی یعنی کل بارہ دن بھوک ہڑتال کی۔ ۱۳ ستمبر کو دوبارہ بھوک ہڑتال کی۔ حکومت نے ۲۲ دن کے بعد آغا صاحب کے مطالبات تسلیم کر لئے اور بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

۱۶ دسمبر کو آغا صاحب سندھ ہائی کورٹ میں اپنے مقدمہ کے سلسلہ میں پیش ہوئے۔ کارروائی کے دوران حکومت کے ایڈووکیٹ جنرل راجہ سید اکبر توہینِ عدالت کے مرتکب ہوئے اور عدالت اس مقدمہ کی سماعت سے دستبردار ہوگئی آغا صاحب نے اسی وقت بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس دفعہ آٹھ دن تک بھوک ہڑتال جاری رہی آخر جب حالت زیادہ خراب ہوگئی تو آپ کو رہا کر دیا گیا۔ بھوک ہڑتال حکومت کے خلاف ایک بہت بڑا حربہ ہے۔ مگر حکومتیں انہیں افراد کے اس حربے سے مرعوب ہوتی ہیں۔ جو عوام میں اثر رکھتے ہوں۔ ورنہ عام بھوک ہڑتال کے قیدی لاوارث قرار دے کر دفن کر دیئے جاتے ہیں آغا صاحب کی بھوک ہڑتال اور نازک حالت کی خبر جب عوام تک پہنچی تو لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا ہر جگہ حکومت کی مذمت اور آغا صاحب کی رہائی کا مطالبہ ہونے لگا۔ خاص طور پر لائل پور۔ لاہور۔ سرگودھا۔ چنیوٹ۔ جھنگ راولپنڈی اور گوجرانوالہ میں جلسے کئے گئے۔ سندھ اور سرحد میں بھی بعض مقامات پر احتجاج ہوا۔ اور حکومت نے اپنی بدنامی کے خوف سے لوگوں کے دباؤ کو محسوس کرتے ہوئے آغا صاحب کو رہا کر دیا۔ اس طرح آغا صاحب ۷ مئی ۱۹۶۸ء سے لے کر ۲۵ دسمبر ۱۹۶۸ء تک ۲۳۲ دن نظر بند رہے۔ جن میں ۵۲ دن تک بھوک ہڑتال کی۔

مقدمہ نمبر ۱۱ - ۷/اگست ۱۹۷۲ء کو یہ مقدمہ بھی آغا صاحب کی ایک تقریر کی وجہ سے قائم ہوا۔ اس کے علاوہ لائل پور (اب فیصل آباد) میں تقریر ہی کے جرم میں زیر دفعات ۱۲۴/الف ۱۵۳/الف تعزیراتِ پاکستان اور ۱۶ پبلک سیفٹی آرڈیننس کے تحت دو مقدمے قائم ہوئے ان ہی دفعات کے تحت تین مقدمے لاہور کی تقریروں کی بنا پر۔ ایک تقریر موچی دروازہ کے جلسہ میں ہوئی اور دو تقریریں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں ہوئیں[1]۔ یہ مقدمے ۷۔ اگست ۱۹۷۲ء کو لاہور میں اور ۷۔ اگست ۱۹۷۲ء کو لائل پور میں درج کرائے گئے[2]۔

ایک اور مقدمہ اگست ۱۹۷۲ء کے دوسرے عشرہ میں لیاقت باغ راولپنڈی کے جلسۂ عام کی تقریر کے سلسلہ میں درج کیا گیا[3]۔

۱۷۔ اگست ۱۹۷۲ء کو پونے دو بجے دوپہر کے قریب لاہور کے ہوائی اڈہ سے آغا صاحب کو اس وقت گرفتار کر

---

1. چٹان ۱۸ ستمبر ۱۹۷۲ء ص نمبر ۵
2. چٹان ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء ص نمبر ۴
3. چٹان ۲/اکتوبر ۱۹۷۲ء ص نمبر ...

کیا گیا جب وہ ملتان میں ایک جلسہ سے خطاب کرنے جا رہے تھے۔[1]
۱۳ر اگست سنہ ۱۹۷۲ء کو آغا صاحب کو لاہور ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا۔ سماعت سے قبل آغا صاحب نے عدالت کو بتایا کہ بی کلاس کے احکامات کے باوجود جیل میں ان سے ناروا سلوک ہوا ہے لہٰذا انہوں نے حکام کے اس رویہ کے خلاف ۹ دن بھوک ہڑتال کی ہے۔ اور ۲۸ر اگست سنہ ۱۹۷۲ء کو انہیں بی کلاس میں منتقل کر دیا گیا ہے[2]

۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء کو آغا صاحب کی بیگم کی طرف سے دائر کردہ درخواست کی سماعت ہوئی۔
لاہور ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے آغا صاحب کی نظر بندی کو خلاف قانون قرار دیا اور رہا ہو گئے۔ دوسرے مقدمات میں بھی ضمانت ہو گئی اور آغا صاحب گھر واپس آ گئے مگر اسی دن مرکزی حکومت نے آغا صاحب کی گرفتاری کے نئے احکامات جاری کر دیئے[3]۔ پولیس آغا صاحب کی گرفتاری کے لئے سر توڑ کوشش کرتی رہی مگر ناکام رہی آخر آغا صاحب خود ہی ۲۲ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء کو لاہور ہائیکورٹ میں پیش ہو گئے[4] اور گرفتار کر لئے گئے اسی رات انہیں میانوالی جیل میں بھیج دیا گیا۔ آغا صاحب نے بھوک ہڑتال کر دی تیسرے دن انہیں بہتر کلاس دے دی گئی۔ چوتھے روز آغا صاحب کو پیشی کے لئے لاہور لایا گیا اور سول لائنز میں رکھے جانے کے احکامات صادر ہوئے۔ آخر آغا صاحب کی بیگم کی درخواست پر اور سرکاری ڈاکٹروں کی رپورٹ پر بیماری کی وجہ سے آغا صاحب کو ۳۰ ستمبر سنہ ۱۹۷۲ء کو میو ہسپتال بھیج دیا گیا[5]۔ آغا صاحب کی نظر بندی کی مدت ۱۱ دسمبر کو ختم ہو رہی تھی مگر حکومت نے تیسری دفعہ نظر بندی کی میعاد میں تین ماہ کی توسیع کر دی۔ اسی دن آغا صاحب نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ یہ بھوک ہڑتال ۲۶ روز تک جاری رہی آخر ۱۶ر جنوری سنہ ۱۹۷۳ء کو رہا ہو گئے[6]۔

---

۱ — چٹان — ۲۱ر اگست — سنہ ۱۹۷۲ء

۲ — چٹان — ۴ ستمبر — سنہ ۱۹۷۲ء — ص نمبر ۳

۳-۴ — چٹان — ۲۵ ستمبر — سنہ ۱۹۷۲ء — جلد نمبر ۲۵ — شمارہ نمبر ۳۹ — ص نمبر ۴

۵ — چٹان — ۲۶ فروری — سنہ ۱۹۷۳ء — جلد نمبر ۲۶ — شمارہ نمبر ۴ — ص نمبر ۵

۶ — بحوالہ شورش کاشمیری — ص نمبر ۵۹ — مرتبہ انور عارف

مقدمہ نمبر ۱۲

۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کی ریشہ دوانیاں بہت بڑھ گئیں آغا صاحب نے اُن کا محاسبہ کیا اور ہر محاذ پر مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔

"۲۹ مئی ۱۹۷۴ء کو نشتر میڈیکل کالج ملتان کے ایک سو طلبا کی ایک جماعت برائے سیاحت پشاور جا رہی تھی کہ طلبا نے ربوہ سٹیشن پر ختمِ نبوت زندہ باد کے نعرے لگائے۔ جب طلباء کی یہ جماعت واپس ملتان آرہی تھی۔ تو ربوہ میں قادیانیوں نے ان طلبہ کو گاڑی سے اتار کر زدوکوب کیا[1]"

اگلے دن اس واقعہ کی خبر سارے ملک میں بے چینی اور بے قراری کا سبب بن چکی تھی اور مرزائیوں کے خلاف سارے ملک میں ہنگامے شروع ہو گئے۔ آغا صاحب نے اس تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ اور اپنی تحریر و تقریر سے اس تحریک کو پروان چڑھایا

---

[1] چٹان جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۲۲ ۳ جون ۱۹۷۴ء ص نمبر ۵

وہ ٹرین جب واپسی میں فیصل آباد (تب لائل پور) پہنچی تو اِن زخمی طلباء نے فیصل آباد سٹیشن پر عوام کو ان واقعات سے آگاہ کیا جسے سن کر وہاں موجود لوگوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ طالب علم رہنماؤں نے مختلف کالجوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور وہ زخمی حالت میں مقامی کالجوں میں گئے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پلیٹ فارم پر شہریوں اور مختلف کالجوں کے طالب علموں کی کثیر تعداد جمع ہو گئی۔ ٹرین رُک گئی تھی اور پلیٹ فارم پر جلسے کا سماں بن گیا تھا۔ مقامی انتظامیہ اور رہنماؤں نے طالب علموں کو دلاسہ دیا اور مناسب ردِ عمل کے اظہار کے لئے ہنگامی اجلاس کے لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ یہاں مولانا تاج محمود (جو سٹیشن کالونی کی مسجد کے خطیب تھے) نے بھی عوام سے خطاب کیا۔

قریباً ۳ گھنٹے کی تاخیر کے بعد گاڑی اپنے سفر پر روانہ ہوئی۔ فیصل آباد سٹیشن پر طلبہ اور شہریوں کا یہ ہجوم اور ولولہ اس تحریک کا نقطہ آغاز تھا۔

"۱۰ جون ۱۹۷۴ء کو لاہور کی مسجد وزیر خاں میں ایک جلسہ کے انعقاد کا اعلان کیا گیا لیکن اس سے پہلے ہی حکومت نے شورش کاشمیری کے علاوہ نوابزادہ نصراللہ خاں چوہدری غلام جیلانی ۔ ملک محمد قاسم ۔ سید محمود احمد رضوی ۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر اور سید مظفر علی شمسی کو گرفتار کر لیا مگر اسی دن رات کو رہا کر دیا۔[1]"

اس دوران میں آغا صاحب نے مرزائیوں کا محاسبہ جاری رکھا آخر

۷ جولائی ۱۹۷۴ء کو شورش کاشمیری کو حکومت پنجاب نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر لیا۔ آغا صاحب چونکہ بیمار تھے لہٰذا انہیں میو ہسپتال کے البرٹ وکٹر بلاک میں نظر بند کر دیا گیا۔ نیز چٹان کا ڈکلریشن منسوخ کر دیا گیا۔ چٹان پریس اور مسعود پرنٹرز پریس بھی ضبط کر لیا گیا۔[2]

یہ اقدام اس لئے کیا گیا کہ آغا صاحب اس تحریک کے روحِ رواں تھے۔ ایک طرف مرزائیوں کے خلاف تحریک بڑھ رہی تھی اور دوسری طرف جسٹس کے ایم صمدانی کی عدالت میں اس مسئلہ کا تفصیلی جائزہ لیا جا رہا تھا۔ آغا صاحب ۲۵ جولائی کو جسٹس صمدانی کی عدالت میں قادیانی امت کے خلاف پولیس کی حراست اور بیماری کی حالت میں شہادت کے لئے پیش ہوئے اور شہادت قلمبند کرائی۔[3]

۲۷ جولائی کو آغا صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ حکومت نے چٹان پریس کی ضبطی کے احکامات واپس لے لئے۔[4] اس کے ساتھ ہی ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو قادیانیوں کی دونوں شاخوں کو اقلیت قرار دے دیا گیا۔[5]

---

۱ تا ۵ بحوالہ تحریک ختم نبوت ص نمبر ۲۳۹/۲۴۴/۲۴۶/۲۴۶/۲۵۱

مقدمات	قید جو سنائی گئی (سال)	قید جو سنائی گئی (ماہ)	قید جو سنائی گئی (دن)	قید جو کاٹی (سال)	قید جو کاٹی (ماہ)	قید جو کاٹی (دن)	کیفیت
مقدمہ نمبر ۱	۲	–	–	–	۴	–	اپیل میں بری ہوئے۔ ایک ماہ حوالات اور تین ماہ جیل میں گزارے
مقدمہ نمبر ۲	–	۳	–	–	۳	–	تین ماہ مقدمہ چلتا رہا اور بعد ازاں ضمانت پر رہا ہوئے
مقدمہ نمبر ۳	۱	–	–	–	۳	۲۳	اپیل میں بری ہوئے۔
مقدمہ نمبر ۴-۵	۱	۴	–	۱	–	۱۷	
مقدمہ نمبر ۶-۷	۵ ۲ سال نظر بندی	–	–	۵	۳	–	اس عرصہ قید میں دو سال کی وہ مدت بھی شامل ہے جبکہ آغا صاحب علاقہ پابند رہے اگرچہ اصطلاح میں اس عرصہ کو قید نہیں کہا جا سکتا۔
مقدمہ نمبر ۸	–	–	۸	–	–	۸	چند دن لکھا ہے ۸ دن شمار کئے گئے
مقدمہ نمبر ۹	–	۳	۱۴	–	۳	۱۴	۴ دن جیل میں رہے اور ۱۰ دن ہسپتال میں
مقدمہ نمبر ۱۰	–	۷	۱۹	–	۷	۱۹	ڈیرہ اسماعیل خاں جیل اور سنٹرل کراچی میں نظر بند رہے
مقدمہ نمبر ۱۱	–	۴	۲۸	–	۴	۲۸	میانوالی جیل اور میو ہسپتال میں نظر بند رہے
مقدمہ نمبر ۱۲	–	–	۲۱	–	–	۲۱	میو ہسپتال میں نظر بند رہے
میزان	۱۳	–	–	۸	۷	۱۰	ایک دو دفعہ ایک آدھ دن کے لئے پکڑے گئے اور جیل یا حراست میں رہے۔ یہ عرصہ اس میں شامل نہیں ہے۔

شورش کی خطابت

آغا شورش کاشمیری کی شخصیت کی ایک بڑی خصوصیت اُن کی خطابت ہے ۔ علمی وادبی حلقوں کے علاوہ برصغیر کے عوام میں آغا صاحب کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ اُن کی خطابت تھی ۔ برصغیر کے عوام نے جہاں اپنے سیاستدانوں سے عقیدت و احترام اور داد و تحسین میں بڑی ہی فیاضی کا مظاہرہ کیا وہاں الزام تراشی اور بہتان سازی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ۔ معاصرین اور مخالفین کے علاوہ بھی ایک سرکاری حلقہ (سی ۔ آئی ۔ ڈی) اس سلسلہ میں بڑا فعال رہا تاکہ حریت پسندوں کو بدنام اور رسوا کیا جائے ۔ ہندوستان کا شاید ہی کوئی لیڈر ہوگا جس پر معاصرین اور مخالفین کے علاوہ اس سرکاری حلقہ نے الزام تراشی نہ کی ہو ۔ آغا صاحب پر بھی مختلف قسم کے الزامات لگائے گئے وہ ایسے مواقع پر عوام میں جاتے ، جلسے کرتے ، اپنی خطابت کے ذریعہ لوگوں کو حقیقت کا آئینہ دکھاتے الزامات کا غبار دور کر دیتے لوگ مطمئن ہو جاتے اور شورش زندہ باد رہتا ۔ غرض آغا صاحب کی خطابت نے اُن کے کردار اور سیرت کو کبھی داغدار نہیں ہونے دیا ۔ آغا صاحب پر الزام لگانے کی بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ مخالفین اُن کی خطابت کو بے اثر کرنا چاہتے تھے مگر مخالفین کو کبھی کامیابی نہیں ہوئی ۔ آغا صاحب نہ صرف ایک عہد آفرین خطیب تھے بلکہ فن خطابت کے اسرار و رموز پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ۔ آغا صاحب کی شخصیت کے اس پہلو کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے ۔ کہ اُن کی خطابت کو فنِ خطابت کی روشنی میں دیکھا جائے ۔

خطابت ایک ایسا فن ہے جس میں زبان کو اس طرح سے استعمال کیا جاتا ہے کہ سننے اور پڑھنے والے پر مطلوبہ اثر پڑے ۔ یونان میں خطابت بطور ایک فن کے سب سے پہلے سوفسٹس SOPHISTS نے اختیار کی ۔ خطابت کی قوت قدیم ترین یونانی تحریروں میں تسلیم کی جاتی ہے ۔ لیکن کوریکس COREX نامی شخص جو کہ سائرےکیوز SYRACUSE کا رہنے والا تھا خطابت کے فن کا بانی قرار دیا جاتا ہے ۔[1]

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ص نمبر ۵ لم ۲

لیکن آغا صاحب کے نزدیک خطابت کی عمر اس سے کہیں لمبی ہے وہ کہتے ہیں

> پہلے خطیب خدا کے پیغمبر تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فلاح کے لئے مبعوث کیا۔ تمام خدائی کتابیں جو پیغمبروں پر نازل ہوئیں ان کا سراپا خطیبانہ ہے ۔ اُن کے لب ولہجہ میں ایک خطیب کی گونج اور گرج ہے[1]۔

اِس طرح پہلے خطیب حضرت آدمؑ قرار پاتے ہیں اور خطابت کی عمر کا سلسلہ یونان سے آگے بڑھ کر ابتدائے آفرینش تک پہنچ جاتا ہے ۔ لیکن اُردو میں خطابت کی عمر بڑی مختصر ہے ۔ شورش صاحب کے بقول

> ایک دور وہ تھا جب سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے جہاد کے موضوع پر خطابت کی شمعیں روشن کیں پھر ۱۸۵۷ء کے لیل ونہار کا دور تھا۔ اس کے بعد علماء صادق پور کا زمانہ آیا پھر اسی دوران میں اور اس کے بعد علی گڑھ کے مدرسہ فکر اور دارالعلوم دیوبند کے چراغ روشن ہوئے سر سید احمد خاں نے قلم وزبان کا دھارا موڑ دیا ۔ مسلم ایجوکیشن کانفرنس نے تو ید خطابت کے تیور بدل ڈالے ۔ انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی گئی تو خطابت کا جدید سفر شروع ہوا ۔ پھر مسلم لیگ کے ساتھ خطابت کا رنگ بدلا ۔ ادھر مسلمانوں کے بعض تعلیمی اداروں نے خطابت کو جلا بخشی ۔ ڈپٹی نذیر احمد نے تحریری تقریروں میں نام پیدا کیا ۔ علامہ شبلی نعمانی نے رنگ جمایا اور ندوہ کی معرفت عمدہ مقرر پیدا کئے ۔ یہ ایک ایسا دور تھا کہ خطابت کی جدید شاخیں سرسبز ہو رہی تھیں اس کے بعد تحریک خلافت اور ترک موالات کا زمانہ آیا تو ڈھاکہ سے خیبر تک اور سری نگر سے سرنگاپٹم تک پورے ملک میں خطیبوں اور مقرروں کی ڈار پیدا ہو گئی ۔ ان سب کے نام گنوانا تو مشکل ہے ۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد مولانا محمد علی جوہر ۔ مولانا ظفر علی خاں ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو

---

[1] فن خطابت — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۵

لالہ لاجپت رائے ۔ پنڈت موتی لال نہرو ۔ مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا حبیب الرحمٰن[۱] لدھیانوی سرفہرست مقرر تھے ۔ ان میں دو چار بڑے پائے کے عصری خطیب تھے ۔ - - - - - - - - - - - - - - - اس کے علاوہ برعظیم کی آزادی تک مقرروں کی نوجوان کھیپ پیدا ہوتی گئی اور کئی علمی شخصیتوں نے خطابت میں نام پیدا کیا - - - - - - - - - - - - ان میں پنڈت جواہر لال نہرو ۔ نواب بہادر یار جنگ ۔ سردار عبدالرب نشتر ۔ ڈاکٹر اشرف ۔ منشی احمد دین ۔ اور مولانا حفیظ الرحمٰن سیوہاروی وغیرہم ۔ عوام کے دلوں میں اتر جانے کی خصوصیت رکھتے تھے ۔[۱]

آغا صاحب بھی مندرجہ بالا آخری دور کے نامور خطیب تھے اور ان میں خطابت کا یہ ملکہ عطیہ الٰہی ہے ۔[۲]

---

۱ ۔ فن خطابت شورش ص نمبر ۲۷

۲ ۔ اس سلسلہ میں ڈیل کارنیگی کی اس رائے کو درست نہیں کہا جا سکتا

"یہ سعادت پروردگار نے فقط چند نادر اور یکتا افراد کو نہیں بخشی یہ بھی گالف کھیلنے کی قابلیت ہی کی طرح ہے ۔ اگر کسی شخص میں اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کی تمنا ہے تو وہ ایسا کر سکتا ہے "۔

گفتگو اور تقریر کا فن از ڈیل کارنیگی ص نمبر ۱۰۱

یہ بیان مقرر، واعظ اور ذاکر کی حد تک تو درست ہے لیکن خطیب کے سلسلہ میں درست نہیں کیونکہ

"خطیب اور واعظ میں یہ فرق ہے کہ خطیب بعض خاص مواقع پر زور خطابت دکھاتا ہے اور واعظ کسی خاص واقعہ یا خاص محل کا پابند نہیں دونوں کے مقصد اور نصب العین میں بھی فرق ہے "۔

اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد نمبر ۸ ص نمبر ۹۷۱

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

بقیہ حاشیہ
آغا صاحب نے اس فرق کو اس طرح بیان کیا ہے

"مقرر وہ ہے جو مافی الضمیر کے اجتماعی اظہار پر قدرت رکھتا ہے یعنی جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ سکتا ہے تاثر و تجربہ اس کے بیان و زبان کا حسن ہوتے ہیں۔ خطیب، مقرر کی معراج کمال ہے جس کے بیان و زبان میں سحر و حسن دونوں ہوتے ہیں اور جو خطابت میں تخلیقی جوہر رکھتا ہے جس کی ہر بات نئی معلوم ہوتی اور گمان ہوتا ہے کہ تقریر نہیں کر رہا۔ الفاظ و مطالب سے جادو جگا رہا ہے مقرر کا ملکہ محض اکتسابی ہوتا ہے لیکن خطیب کا ملکہ وہبی زیادہ اور اکتسابی کم ہوتا ہے۔ اس کا اکتسابی حسن بھی وہبی محسوس ہوتا ہے۔

شورش کاشمیری ص نمبر ۸۲
مرتبہ انور عارف

یہ بات کہ خطابت کا ملکہ فطری ہوتا ہے مندرجہ ذیل آراء سے بھی ثابت ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ، وحید الحسن ہاشمی ایم۔ اے کی کتاب "مباحثے" کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

"دوسری چیز مباحثہ کرنے والے کی قوتِ خطابت اور وہ قدرتی ملکہ جس کی مدد سے مباحثہ کرنے والا لفظوں کے ساتھ ساتھ اپنے دست و ابرو کے اشارات سے بھی کام لیتا ہے۔"

اس کے علاوہ اِسی کتاب کے تعارف میں علامہ علاؤالدین صدیقی لکھتے ہیں کہ

"خطابت خداداد جوہر ہے۔"

اور سید احتشام حسین کے مطابق

خطابت اپنی اصل میں انسانی جذبات کا فطری اظہار ہے جس کا ذریعہ زبان ہے۔ اسے فنون لطیفہ میں شمار نہیں کیا گیا ہے لیکن یہ بھی رقص۔ موسیقی اور شاعری کی طرح ایک فطری اور قدیم فن ہے۔

مباحثے۔ وحید الحسن ہاشمی۔ تعارف

اس سے دراصل آغا صاحب کی مراد مولانا ابوالکلام آزاد[56] سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خاں ہیں جو

بقیہ حاشیہ

بقول آغا صاحب

اگر واقعی میری تقریر میں کوئی کمال ہے تو یہ قدرت کا عطیہ ہے ۔ خطابت بھی شاعری کی طرح وہبی ہوتی ہے ۔

(شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۸۰)

لیکن اس سلسلہ میں مشق اور ریاضت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

مولانا کوثر نیازی نے آغا صاحب کو مقرروں میں جگہ دی ہے ۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں ۔

"وہ صرف مقرر ہی نہیں بلکہ شعر و ادب اور صحافت میں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں"

انداز بیاں ص نمبر ۸۲

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آغا صاحب مقرر تھے خطیب نہ تھے بلکہ مولانا کوثر نیازی نے اپنی کتاب "انداز بیاں" میں خطیب اور مقرر کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا وہ مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق لکھتے ہیں ۔

وہ بہت بڑے خطیب ہونے کے باوجود اہل علم کے طبقے سے نکل کر عوام میں مقبول نہیں ہو سکے ۔

انداز بیاں ص نمبر ۷۹

پھر اسی صفحہ پر لکھتے ہیں ۔

"ابوالکلام آزاد کی طرح مولانا محمد علی جوہر بھی ایک بہت بڑے صحافی ۔ سیاستدان انشاپرداز اور مقرر تھے ۔"

نہ صرف یہ کہ مولانا کوثر نیازی نے خطیب اور مقرر میں فرق ملحوظ نہیں رکھا بلکہ ذاکروں اور واعظوں کے لئے بھی وہ خطیب ہی کا لفظ استعمال کرتے ہیں مثلاً

اس وقت شیعہ خطیبوں میں مظفر علی شمسی اور سید اظہر حسین زیدی علامہ نصیر الاجتہادی علامہ ابن حسن نجفی اور علامہ عقیل ترابی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔

انداز بیاں مولانا کوثر نیازی ص نمبر ۸۶

فنی نقطہ نظر سے مقرر نہ تھے بلکہ خطیب تھے اور آغا صاحب نے ان ہی لوگوں سے فیضان حاصل کیا تھا۔ [56]

بقیہ حاشیہ

حالانکہ بقول آغا صاحب

"جو لوگ مذہب پر بولتے ہیں انہیں واعظ کہتے ہیں جو ذاکری کرتے ہیں انہیں ذاکر کہتے ہیں۔ بعض رعایتوں سے انہیں خطیب بھی کہا جاتا ہے مثلاً خطیب اسلام ۔خطیبِ اہلِ بیت وغیرہ لیکن ان کے لئے واعظ و ذاکر ہی کے لفظ جامع و موزوں ہیں ۔ان کا سرمایہ گفتار خطیبانہ خصوصیتوں کی بعض اداؤں کے ساتھ اکتسابی ہوتا ہے ۔وہ کتابوں کی زبان میں کتابوں سے بولتے ہیں ۔"

بحوالہ فنِ خطابت شورش ص نمبر ۲۲

اس تقسیم کے لحاظ سے آغا صاحب خطیب تھے مقرر نہیں۔

گویا خطیب عطیۂ الہٰی ہوتے ہیں جب کہ مقرر ۔واعظ اور ذاکر مشق اور ریاضت کے ذریعہ تقریر کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں اور یہ سب کے لئے ضروری ہے ۔اِس ملکہ کی مثال اُس ہیرے کی سی ہے جسے جب تک تراشا نہ جائے آنکھوں کو متاثر نہیں کرتا۔

جارج جیکب اِس ملکہ کے متعلق کہتے ہیں۔

"خطابت وہ ہیرا ہے جسے اگر تراشا نہ جائے تو آنکھوں کو متاثر نہیں کرتا۔"

"Rhetoric to a Diamond which is of small use until it is cut and polished, when its angles send forth flashes of light which arrest and delight every eye"

Public Speaking and Debate

by George Jacob

Chapter III Page No. 6

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

آغا صاحب میں تقریر کی رغبت مولانا ظفر علی خاں کی تقریریں سننے سے پیدا ہوئی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی رفاقت اور ابوالکلام کی نگارشات ان کو خطیب بنانے میں معاون ہوئیں[۱]۔ اس کے علاوہ آغا صاحب کی سیاست۔ ادب اور صحافت سے دلچسپی۔ مطالعے کی وسعت اور محنت و مشق نے بھی خطابت کے اس فطری ملکہ کو سنوارنے اور نکھارنے میں بڑا کردار ادا کیا ہے۔ آغا صاحب نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ماحول اور زمانہ خطیبوں اور مقرروں، تقریروں اور جلسے جلوسوں کا زمانہ تھا۔ جس سیاسی جماعت میں شمولیت اختیار کی اس میں بلاشبہ اس وقت کے نامور خطیب اور مقرر شامل تھے۔ جو انگریزی استبداد کا مقابلہ بڑی پامردی سے کر رہے تھے اور جنہوں نے اپنی خطابت سے انگریزی حکومت کے خوف اور وقار کو خاک میں ملا دیا تھا اور ان خطیبوں اور مقرروں کی آتشبازیوں کی حرارت آج تک لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے۔ آغا صاحب ان ہی خطیبوں اور مقرروں میں رہ کر ایک منفرد اور بے عدیل خطیب بنے۔

آغا صاحب کی ابتدائی تقریروں میں سے ایک تقریر مولانا ابوالکلام آزاد کی موجودگی میں بھی ہوئی تھی۔ اس وقت آغا صاحب کی عمر اٹھائیس سال تھی۔[۲] مولانا نے آغا صاحب کے متعلق یہ پیش گوئی کی تھی۔

"اس نوجوان کی تقریر سنی، زبان ہی سے نہیں دل سے دعا نکلتی ہے۔ اس کی طبیعت کا رخ نہایت خوشگوار ہے۔ اس قدرتی ملکہ کی اس نے علم و مطالعہ کی وسعت سے حفاظت کی تو اردو زبان ایک ایسے مقرر سے محروم نہیں رہے گی جس کی فی زمانہ اس کو ضرورت ہے۔[۳]"

مولانا ابوالکلام آزاد کی پیش گوئی بہت جلد پوری ہو گئی اور اردو زبان کو ایک بے مثال خطیب مل گیا جس کے متعلق سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے نامور خطیب فرماتے ہیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حلق میں گراریاں لگی ہوئی ہیں۔ خدا کا شکر ہے آواز میں غنا نہیں ورنہ ہم لوگ جو کرتی بھول جاتے .... بحمد اللہ مطمئن ہوں کہ بڑھاپا جوان ہو گیا۔

بقیہ حاشیہ مندرجہ ذیل تشبیہ سے اس فرق کو اور بھی نمایاں اور واضح کیا جا سکتا ہے۔

مثلاً اگر خطیب کی مثال ہیرے کی سی ہے جو تھوڑی سی تراش خراش کے بعد بے بہا اور گرانمایہ ہو جاتا ہے تو مقرر، واعظ اور ذاکر وغیرہ کی مثال لوہے کی سی ہے۔ جسے صیقل کرنے کیلئے بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوہے میں محنت سے چمک دمک تو پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی یہ چمک دمک ہیرے کی تابانی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

۱۔۲۔۳ بحوالہ شورش کاشمیری انور عارف ص نمبر ۷۹ / ۲۷ / ۲۷

بس برگد کا درخت نہیں کہ اس کے نیچے دوسرا پودا اُگ نہیں سکتا شورش میری مراد ہے[1]۔

آغا صاحب نے اپنی پہلی پانچ چھ تقریروں میں چند ابتدائی جملے ضرور لکھے اور یاد کئے[2]۔ مگر اس کے بعد کبھی ضرورت پیش نہیں آئی جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنی تقریروں میں جو کچھ کہتے تھے وہ اُن کے ذاتی تجربات ہوتے تھے یا اپنے اردگرد کے ماحول کی عکاسی جو ایک سچے خطیب کا خاص وصف ہے۔ ڈیل کارنیگی نے درست کہا ہے کہ

> آپ کے خیالات اور اعتقادات میں باہم ربط ہو۔ یہ خیالات اور اعتقادات آپ کے ذاتی ہوں اُن کا دخل آپ کی روزمرہ زندگی میں ہو۔ آپ کے خوابوں میں بھی اُن کی جھلک نظر آئے[3]۔

گویا خطیب جو کچھ کہنا چاہتا ہے اُس سلسلہ میں صاحب حال ہو۔ صاحب قال اِس وادی کے راہرو نہیں ہو سکتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری۔ مولانا محمد علی جوہر۔ مولانا ظفر علی خاں۔ نواب بہادر یار جنگ جو میدان خطابت کے شہسوار ہیں سب کے سب صاحبِ حال تھے؛ انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے اپنے آپ کو وقف کر رکھا تھا۔ قید و بند اور مشکلات و مصائب اُن کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ آزادی کی تحریکوں کے علمبردار بھی تھے اور تحریک ساز بھی۔ یہ لوگ صرف تقریریں ہی نہیں کیا کرتے تھے بلکہ اپنی تقریروں میں اُن ہی باتوں کے کرنے کی ترغیب اور تعلیم دیتے تھے جس پر وہ خود بھی عمل پیرا تھے۔ آغا صاحب بھی اسی قافلہ میں شامل تھے اور ان کی زندگی کے تابناک پہلو بھی دعوت عمل ہی کے نمونے ہیں۔

اپنی ابتدائی زندگی میں آغا صاحب شکل و صورت کے اعتبار سے ایک خطیب کے طور پر جچتے نہیں تھے لیکن جب بولنا شروع کر دیتے تو مجمع ششدر رہ جاتا[4]۔ بعد کو جب ان میں شخصی وجاہت پیدا ہو گئی تو سٹیج پر کھڑے ہوئے

۱	شورش کاشمیری	انور عارف	ص نمبر ۲۷، ۲۸
۲	فن خطابت	شورش	ص نمبر ۵۵
۳	گفتگو اور تقریر کا فن		ص نمبر ۳۸
۴	بحوالہ شورش کاشمیری	انور عارف	ص نمبر ۲۶

ایک جرنیل معلوم ہوتے تھے۔ جو اپنے سپاہیوں کو جنگ کے اسرار و رموز بتا رہا ہو۔ اس دور میں آغا صاحب شاعری پر زیادہ انحصار کیا کرتے تھے۔ ان کی تقریر کا ایک تہائی حصہ صرف شاعری ہوتا تھا۔[1]

لیکن آہستہ آہستہ خطابت میں اُن کا اپنا ایک اسلوب پیدا ہو گیا اور خطابت کے سارے لوازمات مثلاً

"سلاست، متانت، اشارات، ظرافت، تمثیلات، استدلال اور انفرادیت پیدا ہو گئے۔"[2]

آغا صاحب نے خطابت ۱۹۳۵ء سے شروع کی۔ اس کے ساتھ ہی قید و بند کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ۱۹۴۴ء تک جاری رہا۔ آغا صاحب کی ابتدائی تقریریں جو انی کا جوش لئے ہوئے تھیں اور اکثر تقریر ہی کی وجہ سے قید ہوئے۔ ۱۹۴۴ء تک ایک مختصر عرصہ کے لئے آپ جیل سے باہر رہے اور ہر دفعہ تقریر کی اور اس مختصر عرصہ ہی میں ایک مایۂ ناز خطیب کے طور پر نام پیدا کر لیا

آغا صاحب کی اُس زمانے کی خطابت کے متعلق ابو یوسف قاسمی لکھتے ہیں۔

"آپ کے رنگِ خطابت کی دلکشی کا راز ادبی شوخی میں مضمر ہے۔ زبان میں حلاوت ہے۔ اسلوب میں جدت۔ خیالات میں وسعت۔ لب و لہجہ میں سلاست۔ حاضر جواب ہیں اور اس میدان میں اُڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں۔ اعتراض کیجئے تو رنگِ تقریر نکھر آتا ہے بولئے" ہیں تو مزاح کا پہلو باعتبار تناسب مدہم ہوتا ہے لیکن چھیڑ دیجئے" تو پھبتیوں کی باڑھ باندھ دیتے ہیں۔ آپ کی خطابت کا بیشتر حصہ یہی ہوتا ہے۔ الفاظ میں تناؤ ہے جھکاؤ نہیں۔ آبشار کی طرح بہتے جاتے ہیں ہمیشہ وقف، سکوت اور موڑ کا سہارا لئے بغیر بے تکان بولتے ہیں۔ اور الفاظ اپنے نشیب و فراز کے ساتھ ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہوتے ہیں جیسے گلاب کی پنکھڑیاں۔ جو خوبی آپ کو ساتھیوں میں ممتاز کرتی ہے وہ ادب و سیاست کا امتزاج ہے گویا نکہت و نور کی موج۔ آپ نے عموماً دیکھا ہوگا کہ شگفتہ چہروں پر کبھی کبھار غم کی

---

[1] بحوالہ شورش کاشمیری — انور عارف — ص نمبر ۲۶

[2] بحوالہ فنِ خطابت — شورش — ص نمبر ۱۳/۹۱

نمکینی بھی ہوتی ہے۔ شورش کی خطابت میں یہ رنگ اکثر دیکھا گیا ہے[۱]۔"

انور صابری نے "آغا صاحب شورش کاشمیری کی خطابت" کے عنوان سے انہیں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

"شورش کی خطابت پر کیا رائے کروں ظاہر
اُٹھتی ہوئی موجیں ہیں بہتا ہوا پانی ہے
الفاظ کا زیر و بم فطرت کے حسین نغمے
فقروں کے رگ و پے میں شعلوں کی روانی ہے
ہونٹوں کی ہر اک جنبش دیپک کی بھڑکتی لو
تقریر کا ہر پہلو اک برقِ لسانی ہے
گرجے ہوئے بادل کی تصویر، لب و لہجہ
خورشیدِ قیامت کی پُر سوز کہانی ہے
ہنستے ہوئے تیور میں غمناک سے افسانے
غنچوں کے تبسم میں شبنم کی کہانی ہے
بپھرے ہوئے تیور میں شیروں کا جنوں پنہاں
برہم نگہ فطرت آشفتہ بیانی ہے
پُر درد ترنم کے پردوں میں غرض انورؔ
مفلس کا بڑھاپا ہے بیوہ کی جوانی ہے[۲]"

خطابت میں آغاز اوربت کا درجہ رکھتی ہے۔ آغا صاحب کی آواز گرجدار تھی اور اس میں ایک خاص قسم کی کھنک ہوتی تھی۔

۱۔ روزنامہ آزاد آزادی نمبر ۲۶ جنوری ۱۹۷۰ء ص نمبر ۱۷

۲۔ روزنامہ آزاد آزادی نمبر ۲۶ فروری ۱۹۷۰ء ص نمبر ۱۵

جوان کی آواز کو ترتیب و دبدبہ عطا کرتی تھی۔ آغا صاحب لب و لہجہ سے الفاظ کے معنیٰ کی عکاسی کرتے تھے۔ یعنی الفاظ کی ادائیگی سے سامعین کو مطلب سمجھا جاتے۔ مضمون کے نشیب و فراز کے ساتھ آواز میں زیر و بم پیدا ہوتا چلا جاتا تھا۔ عام طور پر انداز گفتگو کا ہوتا مگر جب للکار اور پکار کی کیفیت پیدا ہوتی تو آغا صاحب چہرے کے تاثرات کو جذبات کی شدت کا رنگ عطا کر دیتے اور اُن کے جسم کی ایک ایک ادا جذبات کی شدت کی ترجمان بن جاتی تھی۔ اچانک کسی شعر کے برمحل استعمال سے ناگفتنی کو گفتنی بنا دیتے۔ اگر کوئی ایسی بات کہنا مقصود ہوتی جو سامعین کے لئے مشکل کا درجہ رکھتی ہو تو آغا صاحب احسن کی تشریح کرتے ہوئے مترادفات کے ڈھیر لگا دیتے تھے اور ایسے ہی موقعوں پر لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ آدمی تو لغت کا حافظ ہے۔ مخالفین یا معترضین کی موجودگی میں آغا صاحب کے جوہر کھلتے تھے وہ ہمیشہ معترضین کا خیر مقدم کرتے تھے اور اعتراضات کا جواب برجستہ دیتے تھے۔[۱]

بعض اوقات لوگوں میں تقریر سے زیادہ برجستہ گوئیوں کا تذکرہ رہتا۔ وہ سلاست اور روانی سے بولتے چلے جاتے اچانک کسی طنز یا مزاح سے کام لیتے تو مجمع کو ہنساتے تھے اور جب اپنی روانی اور سلاست سے جذبات میں آگ لگا دیتے تو لوگ رونے لگتے۔ آغا صاحب اپنی تقریر میں کئی قسم کی باتیں کرتے تھے مگر کبھی موضوع کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ اس سلسلہ میں وہ تکرار سے کام لیتے اور موضوع کے مختلف پہلوؤں کو تقریر میں سمو دیتے تھے۔ بعض اوقات منتظمین جلسہ حکومت سے اجازت کسی اور عنوان سے لیتے اور آغا صاحب کو تقریر کی دعوت کسی اور عنوان پر دیتے اور جب تقریر ہوتی لوگ سمجھتے آغا صاحب موضوع سے ہٹ کر بولے۔ مثلاً عام سیاسی جلسوں کی ممانعت ہے لیکن یوم حمید نظامی یا یوم ظفر علی خاں کے نام پر اجازت حاصل کر لی گئی اور آغا صاحب کو حالات حاضرہ پر تبصرہ کے لئے کہہ دیا گیا۔ لہٰذا آغا صاحب حمید نظامی یا ظفر علی خاں کو خراج تحسین ضرور پیش کرتے مگر زیادہ زور حکومت وقت یا عوامی مسائل پر صرف کرتے اور لوگ سمجھتے کہ آغا صاحب نے موضوع سے ہٹ کر تقریر کی ہے۔ آغا صاحب کی مذہبی تقریریں عام مذہبی روائتی تقریروں سے مختلف ہوتی تھیں[۲]۔ خاص طور پر سیرت النبیؐ کے جلسوں میں جب

---

[۱] بحوالہ شورش کاشمیری انور عارف ص نمبر ۸۵

[۲] بحوالہ شورش کاشمیری انور عارف ص نمبر ۸۱

آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کرتے تو الفاظ کی زیبائی اور رعنائی کو قائم رکھتے ہوئے محتاط ہو جاتے ہر جملہ احتیاط کے ترازو میں تلا اور ہر فقرہ پھول کی طرح چنا ہوا ہوتا۔ مقامِ رسالت کا بیان اِس خلوص و عقیدت سے کرتے اور ایسا سماں باندھ دیتے کہ اس کیفیت میں بیٹھے ہوئے سامعین کے چہرے مقدس اور تصویریں معلوم ہوتے تھے۔

حکیم احمد شجاع نے، آغا صاحب کی خطابت کے متعلق لکھا ہے۔

میں نے پچھلے ساٹھ ستر برس میں نامور خطیبوں کی تقریریں سنی ہیں ....

.... اور بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ شورش کی خطابت میں ابوالکلام کی خطابت کا رنگ منعکس پایا۔ ان کے الفاظ میں ظفر علی خاں کی طنز کو جھلکتے دیکھا اور ان کے جذبات میں اقبال کے اسلامی تصورات کا پرتو پوری آب و تاب سے چمکتے پایا[1]

مولانا ابوالکلام آزاد۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ ظفر علی خاں اور علامہ اقبال سے اکتسابِ فیض کا ذکر آغا صاحب نے اپنی تحریروں میں اکثر کیا ہے۔ جس کا مختصر ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ مگر اِس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ خطابت میں آغا صاحب کا اپنا کوئی اسلوب نہ تھا بلکہ آغا صاحب نے اِس اکتساب کے بعد اپنا ایک خاص اسلوب پیدا کر لیا تھا جو منفرد اور یگانہ تھا۔ اِس سلسلہ میں ڈاکٹر سید عبد اللہ نے درست لکھا ہے کہ

"آغا صاحب کا تعلق اپنے قریبی رہنماؤں میں سے مولانا ابوالکلام آزاد۔ علی برادران اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے تھا۔ یوں تو تحریک خلافت و احرار کے سبھی بزرگ اسی خاندانِ خطابت سے متعلق ہیں۔ مگر آغا صاحب نے سب کے خصائص کو جمع کر لیا اور اپنی فطری قابلیت اور استعدادِ وہبی سے اپنا ایسا رنگ پیدا کر لیا جو سب سے ممتاز تھا۔[2]"

---

[1] الجہاد و الجہاد شورش .تعارف حکیم احمد شجاع ص نمبر ۱۸

[2] مضمون ڈاکٹر سید عبد اللہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر ص نمبر ۱۱۱

اور اس رنگ میں لفظ "شورش" کی ساری حشر سامانیاں اپنی جولانیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب کی خطابت بغاوت کی کھلی دعوت ہوا کرتی تھی۔ وہ زنجیر پا مجبوں کو آزادی کا مفہوم سمجھانے کی کوشش نہ کرتے بلکہ اس زنجیر کو توڑنے کی ترغیب دیتے جس سے اُن کے پاؤں بندھے ہوئے ہوتے۔

قیام پاکستان سے پہلے اُن کی تقریروں کا یہی رنگ اُن کی قید و بند کا باعث بنا۔ قیام پاکستان کے بعد حکومتوں کی تبدیلی میں جہاں اور بہت سے عوامل کارفرما ہیں وہاں آغا صاحب کی خطابت کا حصہ بھی ہے۔ سکندر مرزا۔ ایوب خان اور بھٹو کے دورِ اقتدار میں وہ جس تحریک میں بھی شامل ہوئے انہوں نے اپنی شعلہ آفریں پکار سے حکومت کی بداعمالیوں کو بغاوت کا جواز بنا ڈالا اور لوگوں کی نفرتوں میں اس درجہ اشتعال پیدا کیا کہ ان کی بنیادیں ہل گیئں۔ آغا صاحب حکومتوں سے کبھی خم نہ کھاتے تھے جس کی وجہ یہ تھی کہ کبھی کسی حکومت سے کوئی غرض پوری نہیں کی بلکہ پیش کشوں کو ٹھکرا دیا کرتے تھے۔ کردار اور سیرت کی یہی خوبی تھی جس کی وجہ سے لوگ اُن کی تقریروں کے مشتاق رہتے تھے۔ اور اسی وصف نے اُن کی تقریروں میں وہ جذب و اثر پیدا کر دیا تھا جس سے حکومت خائف اور حکام سہمے ہوئے رہتے تھے۔ اس نکتہ سے آغا صاحب اچھی طرح واقف تھے وہ خود کہتے ہیں۔

"اگر ایک خطیب یا مقرر داغدار سیرت رکھتا ہے اور اخلاق سے معریٰ ہے تو وہ کامیاب مقرر نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی طاقت لسانی عوام میں وہ اثر پیدا کر سکتی ہے۔ جو فن کی طلب یا تاثیر ہے[1]"

آغا صاحب کی تقریریں جذبات کی حامل ہوا کرتی تھیں اُن کی اسی جذباتی کیفیت کے تحرک اور تموّج کو سحر یا جادو سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد پاکستان میں شورش کاشمیری واحد خطیب تھے۔ جن کی تقلید کی کوشش ہر مقرر نے کی خاص طور پر نوجوان نسل میں آغا صاحب کے طرزِ تخاطب کو اپنانے کی خواہش ایک تحریک بن گئی۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بین الکلیاتی مباحثوں میں طلبا شورش کاشمیری کے جملے۔ فقرے اور الفاظ اُسی انداز میں ادا کرنے کی کوشش کرتے اور یہ مباحثے اکثر شورش کی تقریروں کی بازگشت ہوتے۔ طلبا نے اگر اس روش کو اپنانے میں سعیت ممنت کی ہوتی تو شاید

---

[1] فنِ خطابت شورش ص نمبر ۱۳

آغا صاحب کے بعد یہ خلا کسی حد تک پُر ہو جاتا مگر طلباء نے سہل انگاری سے کام لیا۔ اور چند پیرے مرصع الفاظ میں روانی کے ساتھ یاد کر لئے اور ہر مباحثہ میں یہی پیرے موقع بے موقع استعمال کر کے مقرر بننے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ طلباء یونہی کالجوں اور یونیورسٹیوں سے باہر آئے اُن کی حیثیت بطور مقرر ختم ہو گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ آغا صاحب کی تقریروں کے اثرات ہمہ گیر تھے۔ راقم الحروف کو عوامی حکومت کے دور میں قومی اسمبلی کی تقاریر سننے کا موقع ملا وہاں بھی اکثر مقررین وہی اندازِ خطابت اپنانے کی کوشش کرتے نظر آئے جو شورش صاحب کا طرۂ امتیاز تھا۔ عام مذہبی اور سیاسی مقررین نے بھی اسی لب و لہجہ کو اپنانے کی کوشش کی اپریل ۱۹۸۴ء میں جو ختم نبوت کانفرنسیں پاکستان کے مختلف شہروں میں منعقد ہوئیں فیصل آباد میں راقم الحروف نے خود اکثر مقررین کو آغا صاحب کی اصطلاحات جو انہوں نے مرزائیوں کے لئے وضع کی تھیں استعمال کرتے ہوئے سنا۔ اکثر جملے اور فقرے آغا صاحب کی کتابوں سے مستعار تھے۔ ہمارے ہاں اچھے اچھے مقررین کا سرمایۂ خطابت چند تقاریر سے آگے نہیں بڑھا۔ وہی خیالات۔ وہی لطیفے۔ وہی واقعات۔ وہی آیات و روایات اور وہی فقرے وہی اشعار اور الفاظ جس پر وہ حاوی ہوتے ہیں۔ اپنی ہر تقریر میں استعمال کرتے ہیں۔ بلکہ سیاسی مقررین نے جب کبھی اپنا طوفانی دورہ شروع کیا تو خیبر سے لے کر کراچی تک ایک ہی تقریر کرتے چلے گئے اور ان تقریروں میں انیس بیس کا فرق بھی روا نہ رکھا گیا یہی حال مذہبی مقررین کا ہے۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ شورش کاشمیری کے مخصوص انقلابی اور جذباتی اندازِ خطابت نے فنِ خطابت کے ارتقا میں رکاوٹ پیدا کی۔ اس میں شک نہیں کہ جمہوریت کی استواری اور سیاسی شعور اچھے پارلیمانی مقرر پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ جس کے مواقع ملک میں جمہوریت نہ ہونے کی وجہ سے کم ملے اور خطابت میں ترقی نہ ہوئی۔ مگر شورش کے اندازِ خطابت کی تقلید بھی ایک بڑی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں اچھے پارلیمانی مقررین پیدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ اُن کے سامنے خطابت کا وہ نمونہ تھا جس کی تقلید آسان نہ تھی اور ان کا انداز پارلیمانی تقریر کا انداز نہ تھا بلکہ انقلابی اور جذباتی انداز تھا۔ اسی طرح مذہبی مقررین نے استدلال اور منطقیت کو ہاتھ نہ لگایا کہ مذہبی تقاریر میں اس کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ لہجہ کی ملائمت اور دینی تقدس کی پاسداری بھی ضروری ہے مگر انہوں نے وہی ہنگامی اور انقلابی طرزِ تخاطب اپنایا جس سے اختلاف کم ہونے کی بجائے زیادہ ہوئے اور اصلاح و تبدیلی کا وہ مقصد حاصل نہ ہو سکا جس کیلئے

تقاریر سنی اور کی جاتی ہیں۔

شورش کاشمیری کی نظم و نثر کا بڑا اثاثہ اُن کی تصنیفات ہیں لیکن تقاریر کی صورت میں انہوں نے مختلف موقعوں اور مقامات پر جو کچھ کہا اگر جمع ہو جاتا تو اس اثاثے سے یقیناً زبردست فائدہ ہوتا۔

خطابت کے معرکے

شورش کاشمیری نے اپنی زندگی میں بے شمار تقریریں کیں ان سب کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے تاہم ذیل میں اُن چیدہ چیدہ تقریروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو انہوں نے مختلف موقعوں پر کیں اور جن سے شورش کی خطابت کے بارے میں کوئی رائے قائم ہو سکتی ہے۔ شورش کاشمیری نے اپنی پہلی تقریر ۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء کو بادشاہی مسجد کے منبر سے کی[۱]۔ اس سے پہلے آغا صاحب نے کبھی تقریر نہ کی تھی[۲]۔ آغا صاحب نے اِس تقریر میں کہا۔

---

[۱] بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۷۹

[۲] ناز انصاری اپنے مضمون چٹان کے شورش نمبر کے صفحہ نمبر ۳۱۴ پر تحریر فرماتے ہیں

"جب نوجوان شورش نے موچی دروازہ کے جلسہ میں مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لئے اپنی مشعلہ بار تقریر کی تو سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں اس کی دھوم مچ گئی"

آغا صاحب نے اپنی پہلی تقریر شاہی مسجد میں کی تھی موچی دروازہ کے جلسہ میں نہیں۔ اسی طرح سی۔ ایل۔ کاوش اپنے مضمون چٹان کے شورش نمبر کے صفحہ نمبر ۳۵ پر لکھتے ہیں۔

"ایک شام کو ہم شاہی مسجد کے قریب بزم ادب کے جلسہ میں تھے۔ شورش کاشمیری کو ایک صاحب بلا کر لے گئے پھر حفیظ قندھاری غائب ہو گئے ہم منہ اندھیرے گھر کو لوٹ گئے۔ مدن ہاف ٹون کمپنی میں شورش نے مجھے فون پر کہا کہ یار میں تو مسجد شہید گنج کا ڈکٹیٹر بنایا جا رہا ہوں کل شاہی مسجد میں میری تقریر ہے۔ شورش نے اس وقت تک کسی جلسہ میں تقریر نہ کی تھی"

یہ درست نہیں ہے۔ قصہ درحقیقت یہ ہے کہ جب آغا صاحب بزم ادب کے اجلاس میں موجود تھے تو اُن کو بلا کر لے جانے والا

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

"مسجد شہید گنج میں انشاءاللہ تکبیریں بھی بلند ہونگی اور بارگاہِ ایزدی میں سجدے بھی کئے جائیں گے۔

آج نہیں تو کل۔ لیکن وہ دن بھی قریب آ رہا ہے جب دہلی کے لال قلعہ پر اسلامی پرچم لہرائے گا

اُس کی سرخ دیواریں ہمارے لہو کا انتظار کر رہی ہیں[۱]

اس جلسہ کے صدر آغا صاحب ہی تھے۔ یہ صدارت اور تقریر آغا صاحب کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا۔ پولیس آغا صاحب کی تلاش میں تھی مگر وہ بچ کر نکل گئے۔ دوسرے دن پھر آغا صاحب نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"حکومت کو راستے سے ہٹ جانا چاہئے ہم سکھوں سے فیصلہ کریں گے کہ مسجد پر کس کا حق ہے۔[۲]"

مگر اس روز پولیس سے بچ نہ سکے اور گرفتار کر لئے گئے۔ آغا صاحب کی رہائی کے بعد مسجد شہید گنج کا مقدمہ بھی خارج ہو گیا مسلمانوں نے اس سلسلہ میں مسجد وزیر خاں میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس کی صدارت چودھری افضل حق نے کی آغا صاحب نے اِس جلسہ میں پہلی دفعہ کسی احرار راہنما کی صدارت میں تقریر کی[۳]۔ اور فرمایا کہ

"پنجاب کی وزارت نے کوئی مفاہمتی قدم نہ اُٹھایا تو میں عیدالاضحیٰ کو شہید گنج کے بجائے سکندر حیات

کی کوٹھی پر جتھہ لے کر جاؤں گا۔[۴]"

یہ وہی تقریر ہے جس کے بعد چوہدری افضل حق آغا صاحب کو علامہ اقبال کی کوٹھی پر لے گئے اور ان سے کہا

"یہ ہے شورش کاشمیری"

شورش کاشمیری! حضرت علامہ کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا فرمایا

"سکندر کی کوٹھی پر جتھہ لے کر جا رہے ہو؟"

بقیہ حاشیہ

شخص انجمن فرزندانِ توحید کا جنرل سیکرٹری حافظ معراج دین تھا۔ جنہوں نے آغا صاحب کو جلسہ کا صدر بنایا اور آغا صاحب نے اپنی پہلی تقریر کی پھر دوسرے دن جو تقریر ہوئی۔ اس کی اطلاع مدن ہاف ٹون کمپنی میں سی۔ ایل۔ کاوش کو دی گئی۔ لہٰذا یہ آغا صاحب کی زندگی کی دوسری تقریر تھی پہلی نہیں۔

[۱] بوئے گل ص نمبر ۸۱/۸۴/۱۶۵/۱۶۵

جی ہاں! چوہدری صاحب نے جواب دیا۔

"جوانوں میں جرأت اور حرارت ہونی چاہیئے۔"[۱]

اس کے بعد جلسے ہوتے رہے اور آغا صاحب اپنا یہ دعویٰ ہر تقریر میں دہراتے رہے کہ سکندر حیات کی کوٹھی پر جبقہ لے کر جائیں گے۔

ایک دن آغا صاحب کے اس دعوے کی کہ وہ سکندر حیات کی کوٹھی پر جبقہ لے کر جائیں گے۔ "زمیندار" اخبار میں آغا صاحب سے پوچھے بغیر تردید چھپ گئی۔ لوگوں نے مذاق اڑایا۔ اس تردید کا جواب دینے کے لئے شاہی مسجد میں جلسۂ عام ہوا۔ آغا صاحب نے معرکۃ الآرا تقریر کرتے ہوئے "زمیندار" کے اعلان کی مذمت کی۔ اس تقریر سے متاثر ہو کر سندھ کے ڈپٹی انسپکٹر جنرل خان ضیاء الدین خان نے اپنا خان بہادری کا خطاب واپس کر دیا۔ خان ضیاء الدین خان نے فرمایا۔

"اس نوجوان کی تقریر نے اتنا متاثر کیا ہے کہ میں خان بہادری کا خطاب ترک کرتا ہوں۔"[۲]

پھر جب آغا صاحب مجلس احرار میں شامل ہو گئے تو انہوں نے اپریل ۱۹۳۹ء کے آل انڈیا مجلس احرار کے سالانہ اجلاس پشاور میں خطاب کیا۔[۳] بمبئی میں احرار کانفرنس میں خطاب کیا۔[۴] بمبئی سے واپسی پر یعنی مئی سے اگست تک آغا صاحب نے بیسیوں مقامات پر تقریریں کیں۔[۵] جنگ عظیم کے دنوں میں آغا صاحب مجلس احرار کے سیکرٹری جنرل تھے۔ آرمی بل کی مخالفت میں امرتسر کے گلوالی دروازہ کے میدان میں ایک بہت بڑا جلسہ ہوا۔ جس کے متعلق آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"مجھے اس تقریر پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ مجمع میری مٹھی میں تھا۔ میں الفاظ سے گویا انسانی عقلوں کو شکار کر رہا تھا۔ جانے کیا جذبہ تھا جس نے انسانوں کو مسحور کر لیا تھا۔ میں عوام کو بہالئے

---

۱ پس دیوار زنداں ص نمبر ۹۸

۲ بوئے گل ص نمبر ۱۷۹

۳-۴-۵ بحوالہ پس دیوار زنداں ص نمبر ۱۵۵/۱۶۵/۱۵۷

لئے جا رہا تھا اور لوگ بہتے چلے جا رہے تھے ۔ لوگ اتنے غضب آلود ہو گئے کہ پورا امرتسر ہل سکتا تھا
میں خطابت کے سحر میں ڈوبا ہوا تھا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی فوراً کرسی سے اُٹھے شانہ پر ہاتھ رکھ
دیا فرمایا رک جاؤ یہی وہ جادو ہے جس سے عقلیں شکار ہو جاتی ہیں ۔ قرآن نے اس کو سحر کہا ہے
لوگوں سے کہا بس گھروں کو چلے جاؤ جلسہ برخاست کیا جاتا ہے [1]

ازمی یل ہی کی مخالفت میں آغا صاحب نے گوجرانوالہ ۔ لائل پور (اب فیصل آباد) اور ملتان میں تقریریں کیں [2] ۔ سنہ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں آغا صاحب نے بہار اور یوپی کے قصبات اور دیہات کا دورہ کیا ۔ لکھنؤ ۔ پٹنہ ۔ بہرائچ ۔ نانپارہ ۔ کانپور ۔ فرخ آباد ۔ قنوج اور سہارن پور بھی گئے اور بعض جگہ پر تقریریں کیں [3] ۔

قیام پاکستان کے بعد دولتانہ وزارت کے دنوں میں آغا صاحب نے آٹے کی گرانی پر تقریر کی ۔ جناح عوامی مسلم لیگ کے پہلے جلسہ میں آغا صاحب نے خطاب کیا اور متواتر چار گھنٹے تک تقریر جاری رہی [4] اس تقریر سے متاثر ہو کر جناح عوامی مسلم لیگ کے زعماء نے آغا صاحب کو مجبور کر دیا کہ وہ ان کے ساتھ کام کریں ۔ اس طرح آغا صاحب جناح عوامی مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اس کے بعد آغا صاحب نے ان انتخابات میں معرکتہ الآرا تقریریں کیں ۔

لاہور کے بعد دوسرا جلسہ سیالکوٹ میں ہوا ۔ جس میں آغا صاحب نے دو گھنٹے تک تقریر کی [5] ۔ اس کے بعد لائل پور (اب فیصل آباد) میں جلسہ ہوا ۔ بارش ہو گئی مگر لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا ۔ اس طرح آغا صاحب نے بارش کے دوران آدھ گھنٹہ تقریر کی ۔ سہروردی آغا صاحب کی تقریروں سے اتنے متاثر تھے کہ وہ آغا صاحب کو "جادوگر" کہنے لگے [6] ۔ سہروردی پر آغا صاحب کی اس تقریر کا بڑا اثر تھا جو انہوں نے گوجرانوالہ میں کی تھی یہ جلسہ ختم نبوت کی تحریک کے بعد ہوا تھا لہٰذا لوگ سہروردی کی تقریر

[1-3]	بحوالہ بوئے گل	ص نمبر ۲۲۳/۲۲۴/۲۹۵
[4]	حسین شہید سہروردی	ص نمبر ۴۶
[5]	حسین شہید سہروردی	ص نمبر ۴۷
[6]	حسین شہید سہروردی	ص نمبر ۴۷

نہیں سننا چاہتے تھے - جب آغا صاحب جلسہ میں پہنچے تو بقول آغا صاحب

طوفان برپا ہے - نوجوان بھنگڑا ڈال رہے ہیں - مَیں نے فوراً ہی سٹیج کا رخ کیا لیکن لوگ بپھر گئے - گالیوں پہ گالیاں - بولیوں پہ بولیاں - پھبتیوں پہ پھبتیاں - ہم نہیں سنتے چلے جاؤ تم سب غدار ہو - ختم نبوت کے شہداء کا قصاص دو - ان کے خون کا ذمہ دار کون ہے؟ - - - - - - - مردہ باد کے نعرے ہمارے کانوں کو پھاڑ رہے تھے - پتھراؤ بھی شروع ہو گیا - سہروردی صاحب کرسئ صدارت پر ڈٹ کر بیٹھے میں سٹیج پر کھڑا رہا - میں نے اعلان کیا کہ جس وقت تک آپ تقریر نہیں سنیں گے اُس وقت تک جلسہ برخاست نہ ہوگا اور نہ ہم لوگ جائیں گے - جس ختم المرسلینؐ کے نام پر شہید ہونے والوں کے خون کا قصاص قاتلوں کی بجائے آپ ہم سے مانگ رہے ہیں ہم بھی اُسی ختم المرسلینؐ کی سنت میں آپ کے پتھر کھائیں گے اور اگر آپ کے ہاتھ موت آگئی تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا خون آپ کو معاف ہے - اس کا کوئی قصاص نہیں - بپھرا ہوا مجمع قادرے ٹھہر گیا[۱]

اس کے بعد آغا صاحب نے پندرہ منٹ تک تقریر کی تھی کہ لوگ سہروردی مردہ باد کی بجائے سہروردی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے اور اس تقریر کے بعد سہروردی نے آغا صاحب سے کہا تھا کہ

تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے[۲]

اس کے بعد آغا صاحب نے لاہور میں ایک اور معرکتہ الآرا تقریر اس وقت کی جب سہروردی نے استعفیٰ دے دیا تھا - اس وقت لوگ سکندر مرزا سے خوف کھاتے تھے اور کوئی بھی سکندر مرزا کے خلاف بات کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا تھا - موچی دروازہ کے باہر جلسہ تھا اور عوامی لیگ والے سکندر مرزا پہ ہلکی پھلکی تنقید کر رہے تھے[۳] - مگر آغا صاحب لکھتے ہیں -

مَیں نے پبلک کو اس کی بدعنوانیوں سے آگاہ کرتے ہوئے سخت تنقید کی اور مطالبہ کیا

۱-۲-۳ حسین شہید سہروردی ص نمبر ۷۳/۷۲/۱۰۱

کہ مرزا کی (IMPEACHMENT) ہونی چاہئے لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر قومی اسمبلی میں اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی تائید کی - چاروں طرف ایک جوش پیدا ہو گیا کہ کسی شخص نے تو اس باؤلے کے گریبان میں ہاتھ ڈالا ہے؟ مَیں نے لوگوں کے حوصلے کو اور بالا کرنے کے لئے کہا کہ اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں - ابھی جلوس نکالا جائے جو اسمبلی ہال پر جا کر ختم ہو - اور اس میں سکندر مرزا پر مقدمہ چلائے جانے کا اعادہ کیا جائے - زبردست جلوس نکلا افسروں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں وہ بھاگم بھاگ صوبائی اسمبلی تک پہنچے - سارا لاہور "سکندر مرزا مردہ باد" "سکندر مرزا کے خلاف مقدمہ چلاؤ" "سکندر مرزا انگریز کا جاسوس ہے" کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا"[۱]

اس کے بعد آغا صاحب نے ملک کے مفاد کی خاطر سکندر مرزا کے خوف اور دبدبے کو توڑنا اپنا موقف بنا لیا اور اعلان کیا کہ مقدمہ چلانے کا مطالبہ سارے ملک میں کیا جائے گا - حکومت نے جلسے خراب کرنے کی کوشش کی مگر آغا صاحب نے کراچی سے لے کر لاہور اور لاہور سے لے کر پشاور تک بے شمار جلسوں سے خطاب کیا۔[۲]

۱۹۶۲ء میں مسئلہ تکفیر پر بریلوی علماء سے شدید اختلاف پیدا ہو گیا - علمائے بریلی نے اپنے مقتدیوں سے حلف لیا کہ وہ "چٹان" نہیں پڑھیں گے - آغا صاحب کو کافر اور مرتد قرار دیا - پوسٹر بازی شروع ہو گئی اور آغا صاحب کے خلاف اشتہارات دیواروں پر چسپاں کئے گئے - علمائے بریلی کی طرف سے صاحب زادہ فیض الحسن - مولانا محمد عمر اچھروی - مولانا محمد حسین نعیمی - مولانا عبد الغفور ہزاروی - مولانا ابو البرکات - مولانا احمد سعید کاظمی اور مولانا عبد الحامد بدایونی نے آغا صاحب کی زبردست مخالفت کی[۳] اس سلسلہ میں علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث نے آغا صاحب کا ساتھ دیا - مگر جہاں تک

۱	حسین شہید سہروردی	ص نمبر ۱۰۲
۲	حسین شہید سہروردی	ص نمبر ۱۰۵
۳	بحوالہ چٹان	۲۶ نومبر ۱۹۶۲ء

تقریر کا تعلق ہے یہ معرکہ آغا صاحب نے اکیلے ہی سر کیا۔ سب سے بڑا معرکہ لاہور میں ہوا۔ انہی دنوں اہل حدیث کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی اور آغا صاحب نے اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں ایک معرکتہ الآرا تقریر کی۔ لوگ گوجرانوالہ۔ وزیر آباد۔ سیالکوٹ۔ لائل پور (اب فیصل آباد)۔ شیخوپورہ۔ گجرات اور ان اضلاع کے قریبی علاقوں سے تقریر سننے پہنچے تھے۔ پچاس ہزار کا مجمع تھا اور صدارت مولانا داؤد غزنوی کر رہے تھے۔ موضوع تھا توحید و شرک۔ بریلوی مکتبۂ فکر کے حامی جلسہ الٹنے کی فکر میں تھے اور اہل کانفرنس جلسہ کے متعلق فکر مند کہ آغا شورش تقریر کرنے کھڑے ہوئے اور بقول بشیر اختر علیگ جنہوں نے اس جلسہ کی روداد چٹان میں لکھی ہے۔

"ابھی اس نے تمہید کے دو چار ادیبانہ بول اٹھائے تھے کہ موچی دروازہ کی ایک سمت سے کچھ اینٹیں آئیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک نوجوان کا سر پھٹ گیا لیکن شورش نے کہا کوئی شخص اپنی جگہ سے ہلے نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پھر جس تمکنت کے ساتھ شورش نے مجمع کو خطاب کیا لوگوں سے اعتماد کے ہاتھ اٹھوائے فسادیوں کو تنبیہ کی۔ پولیس کو روکا۔ گویہ سب کچھ آنکھ کی جھپکی میں ہو گیا۔ مگر اُس نے ایک ایسا سناٹا پیدا کر دیا کہ جیسے لوگوں پر جادو کر دیا ہو۔ عامتہ الناس پونے گیارہ بجے سے لیکر سوا ایک بجے شب تک اِس شخص کا شکار ہو کر رہ گئے۔[1]"

اسی طرح سیالکوٹ میں ۱۲ نومبر ۱۹۶۲ء کی رات کو ایک لاکھ کے مجمع سے خطاب کیا اور کہا کہ

"علماء سو کی بدولت نئی نسل اسلام سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ شر کی بنیاد پر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔"

آغا صاحب نے یہ بات زور دے کر کہی کہ

اِس وقت فلسفہ، سائنس اور مذہب میں نزاع ہے یقیناً مذہب ہی ایک طاقت ہے جو انسانیت عظمیٰ کی راہنما ثابت ہو سکتی ہے لیکن ہمارے علماء سو نے جو مذہب اختیار کیا ہے اُس کا نتیجہ ہے کہ نئی پود مذہب سے بیزار ہوتی جا رہی ہے۔ اور ان بدبختوں کی بدولت لہو و لعب کے بازار میں تماشا بن گیا ہے۔[2]"

---

[1] چٹان ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۴۲ ص نمبر ۲۵
[2] چٹان ۱۹ نومبر ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۴۷ ص نمبر ۲۵

اِس کے علاوہ بھی آغا صاحب نے بہت سی تقاریر اِس مسئلہ پر مختلف مقامات پر کیں۔ سنہ ۱۹۶۴ء کے انتخابات میں شیخ خورشید احمد وزیرِ قانون جو کہ آغا صاحب کے ذاتی دوست تھے انہیں ایوب خاں کے انتخابی جلسہ میں لے گئے۔ آغا صاحب کہتے ہیں کہ

"مجھے اِس جلسہ میں حاضری کا اتنا ملال تھا کہ ہفتوں میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا۔"[۱]

اس سلسلے میں مجید نظامی اپنے ایک مضمون "عجب آزاد مرد تھا" میں تحریر فرماتے ہیں۔

لیکن خورشید مرحوم سے آغا صاحب کو آخری دم تک ایک گلہ رہا۔ مرحوم، آغا صاحب کو مادرِ ملت مرحومہ کے ایوب خاں کو چیلنج کے دور میں فیلڈ مارشل کے موچی دروازہ والے جلسہ میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جلسہ کے بعد وہ کئی روز خاموش رہے وہ کہا کرتے تھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا جوان بچہ مرگیا ہے۔ مجھے یقین ہے آغا صاحب خُلد میں بھی شیخ صاحب سے گلہ کر رہے ہوں گے اور نظامی صاحب اِن دونوں میں صُلح کرا رہے ہوں گے۔[۲]

سنہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بھی آغا صاحب نے صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں تقریریں کیں[۳] جنگ کے دوران میں آغا صاحب کی تقریریں ریڈیو پاکستان سے بھی نشر ہوئیں۔ ان تقریروں کا عوام میں جوش و جذبہ پیدا کرنے میں بڑا حصہ ہے۔ اگلے سال یعنی ۱۸ ستمبر سنہ ۱۹۶۶ء کو آغا صاحب گرفتار کر لئے گئے۔ رہائی کے بعد آغا صاحب نے ایوب کی حکومت کے خلاف اپنی جنگ جاری رکھی۔ پہلے آغا صاحب سیاسی جلسوں میں حصہ نہ لیتے تھے۔ مگر اب وہ اپوزیشن کے جلسوں میں حصہ لینے لگے۔[۴] ۳۰ اپریل سنہ ۱۹۶۷ء کو آغا صاحب نے چنیوٹ میں ایک زبردست تقریر کی جو کہ قادیانیوں کے خلاف تھی اور یہ تقریر اتنی طولانی اور طوفانی تھی کہ بعد کو کچھ نوجوانوں نے اِس تقریر کو "مرزائیل"، نامی کتابچہ کی صورت میں شائع کیا۔[۵]

۱۔ موت سے واپسی ص نمبر ۵۰

۲۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر سنہ ۱۹۷۶ء تحریر مجید نظامی مضمون عجیب آزاد مرد تھا ص نمبر ۱۴۵

۳۔ بحوالہ تمغۂ خدمت دیباچہ

۴۔۵۔ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۳۱/۶۵

۲۵ اپریل ۱۹۶۸ء کو چٹان کا ڈکلریشن منسوخ کر دیا گیا اور پریس ضبط ہو گیا۔[1]

۵ مئی ۱۹۶۸ء کو آغا صاحب نے جمعیت العلمائے اسلام کے آخری اجلاس میں ایک پُرجوش تقریر کی تقریر کے اہم نکات اُن کی کتاب "موت سے واپسی" میں درج ہیں آغا صاحب اس تقریر کے متعلق کہتے ہیں۔

> جو تقریر میں نے کی وہ بلاشبہ حکومت کے لیے پریشان کن تھی۔ میں نے جو کچھ کہا اس کی صحت پر مجھے ہمیشہ اصرار رہے گا۔[2]

انہوں نے اس تقریر میں جنرل ایوب خاں۔ جنرل موسیٰ خاں اور الطاف گوہر پر کڑی تنقید کی یہ تقریر ڈھائی گھنٹے تک جاری رہی۔[3] ۲۷ مئی ۱۹۷۲ء حیدرآباد سندھ میں تیس برس بعد آن کا پہلا دورہ تھا۔ سیرت النبیؐ کانفرنس حیدرآباد میں تقریر کی۔[4] ۲۸ مئی کو کراچی کے فیڈرل ایریا میں ایک جلسہ عام سے خطاب کیا چالیس پینتالیس ہزار کا مجمع تھا۔[5] ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء کو کراچی یونیورسٹی میں انجمن طلباء کی بزم ثقافت کے زیر اہتمام ایک بھرپور مذاکرہ سے خطاب کیا۔[6] ۲۹ مئی ۱۹۷۲ء کی شام کو آغا صاحب نے پختون سٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام ایک تقریب میں شرکت کی اور خطاب کیا۔[7] کراچی سے واپسی پر شورش کاشمیری نے ۲۲ جولائی ۱۹۷۲ء[8] کو موچی دروازہ میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے اُس وقت کے گورنر مصطفٰے کھر پر کڑی تنقید کی یہ تقریر اتنی پُرجوش تھی کہ لوگوں کو بہا کر لے گئی لہٰذا حکومت نے اس کی تردید ضروری سمجھی اور اس کا جواب دینے کے لئے ۲۹ جولائی ۱۹۷۲ء کو کھر صاحب نے بھی جلسہ عام کیا اور آغا صاحب کو دھمکی دی کہ انہیں جیل بھیج دیا جائے گا۔ اسی تقریر کی وجہ سے ۲ اگست ۱۹۷۲ء کو جب کہ آغا صاحب ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن لاہور سے خطاب کرنے کے لئے گئے۔ تو ان پر قاتلانہ حملہ ہوا مگر آغا صاحب بچ گئے۔[9] آغا صاحب نے اپنی تقریروں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۵ اگست ۱۹۷۲ء کو انہوں نے لاہور میں موچی دروازہ میں تقریر کی۔ ۶ اگست کو صبح وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں اور ۶ اگست کی رات کو لائل پور

۱-۲-۳ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۷۵/۹۵/۹۸

۴-۵-۶-۷ بحوالہ چٹان ۱۲ جون ۱۹۷۲ء جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۲۴ رپورٹ جلیس سلاسل

۸-۹ بحوالہ چٹان ۷ اگست ۱۹۷۲ء ص نمبر ۳-۵

داب فیصل آباد) کے جلسہ عام میں خطاب کیا۔ ۱۳ اگست کو راولپنڈی میں اور ۱۴ اگست کو جہلم کے جلسوں میں تقریر کی[۱]

۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو موچی دروازہ کے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کیا یہ جلسہ آغا صاحب پر قاتلانہ حملہ کی مذمت کے لئے منعقد کیا گیا تھا۔ جس میں آغا صاحب کے علاوہ نوابزادہ نصر اللہ خاں۔ میجر جنرل سرفراز۔ علامہ احسان الٰہی ظہیر۔ میاں منظر بشیر۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی۔ اور راجہ خورشید عالم نے بھی تقاریر کیں[۲]

آغا صاحب نے اس جلسہ میں اُس وقت کے گورنر پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا

کوئی وزیر زعم اقتدار میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مجھے قتل کرنا آسان نہیں۔ کھر صاحب محترم مجھ سے الجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ جس دن مجھے قید کیا گیا صوبہ کا امن تباہ ہو جائے گا۔ لوگو! تم گواہ رہنا میں کسی کے بچے کو اپنے لئے قربان نہیں کراؤں گا۔ افتخار تاری[۳] اور اس کے غنڈے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میرا رب میرا محافظ ہے۔ یہاں اخبارات کے نمائندے اور بڑے بڑے پولیس آفیسر موجود ہیں وہ سن لیں کہ جس دن شورش کاشمیری قتل ہو گیا۔ افتخار تاری کا خاندان میرے خون کی قیمت ادا کرے گا۔" شورش کاشمیری" ڈاکٹر نذیر نہیں کہ قتل

۱۔ بحوالہ چٹان ۱۱ ستمبر ۱۹۷۲ء ص نمبر ۷

۲۔ بحوالہ چٹان ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۳۳

۳۔ میاں تاری اپنے کو بری الذمہ ٹھہراتے ہوئے یہ الزام دوسروں کے سر دیتے ہیں لیکن اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ حکومت نے شورش پر قاتلانہ حملہ کروایا تھا۔

مرحوم شورش کاشمیری کو ڈسٹرکٹ بار کی طرف سے خطاب کی دعوت ملی۔ پی۔ پی۔ پی کی حکومت کو پریشانی لاحق ہوئی۔ گورنر کی طرف سے شیخ جاوید الرحمٰن کے ذریعہ حمید سردار ایڈووکیٹ کو ہدایات ملیں کہ یہ خطاب نہیں ہونا چاہئے۔ لہٰذا پی پی پی کے حامی وکلاء کے ذریعے یہ تقریب درہم برہم ہو گئی باہر کے کچھ لوگوں نے غنڈہ گردی کی۔ روایت میاں افتخار احمد تاری۔ تحریر ارشاد احمد عارف روزنامہ جنگ " جمعہ میگزین ص نمبر ۱ مورخہ ۵ تا ۱۱ اگست ۱۹۸۳ء

ہو جائے تو اس کے وارث معاملہ خدا کے سپرد کر کے بیٹھ جائیں گے۔

کوئی صاحب مجھ سے نہ الجھیں۔ ورنہ مجھے بہت کچھ کہنا اور بتانا پڑے گا۔ بتایئے۔ اقلیم اختر رانی کی بھانجی کہاں بیاہی ہوئی ہے۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ اقلیم اختر رانی کیوں پکڑی گئی؟ کیا راجہ منور۔ ایم۔ پی۔ اے سے نیل کنول رضا صعہ کے جھگڑے کا انتقام نہیں۔ آپ کہتے ہیں شورش کو جیل بھیج دوں گا۔ شورش نہ ہوا۔ بہار ایکٹرس کا دوپٹہ ہو گیا۔ تحقیقات کروایئے۔ وہ ۷۵ عورتیں بھی شہادت دیں گی جو بروایت زخم خوردہ ہیں۔

آپ کہتے ہیں ہے جاں دے پانیاں تو کچھ بیو پنجاب وفادار ہے۔ جناب کھر۔ اگر بھٹو مہینوال ہے تو یہ بھی بتا دیجئے کہ سوہنی کون ہے۔

لیکن نہیں بہر حال

ے ستم گر تجھ سے امیدِ کرم ہوگی جنہیں ہوگی
ہمیں تو دیکھنا یہ ہے کہ تو ظالم کہاں تک ہے

شورش قتل ہو گیا تو

؏ دنیا کہے گی داستان اس کی

اسے جیل بھیج دیا گیا تو یہ اس کے لئے نئی بات نہ ہوگی۔"[۱]

جلسے کے آخر میں آغا صاحب نے سامعین سے کہا اسی وقت گورنر ہاؤس چلو گے اور ہزاروں افراد نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہا۔ ابھی چلو مگر آغا صاحب نے فرمایا نہیں اس وقت نہیں پھر سہی۔ آخر حکومت کو ان کی تقریریں بند کرنے کے لئے آغا صاحب کو نظر بند کرنا پڑا۔ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۳ء کو مجلسِ تحفظ ختم نبوت کانفرنس چنیوٹ میں منعقد ہوئی۔ آخری اجلاس کی صدارت مولانا عبدالستار خاں نیازی نے کی۔ آغا صاحب کے علاوہ مولانا مفتی محمود۔ مولانا عبداللہ درخواستی۔ مولانا تاج محمود

---

[۱] چٹان ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۳۳

اور سردار عبدالقیوم صدر آزاد کشمیر نے خطاب کیا۔ آغا صاحب نے مرزائی امت کا تجزیہ بڑے سخت اور تیکھے انداز میں کیا اور کہا

اگر یہ اہلِ بیت ہیں تو میں ان کے لئے کربلا پیدا کرونگا۔[1]

مارچ۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں آغا صاحب کی تقریروں کا یہ پروگرام تھا۔

۲۹ مارچ	سانگلہ ہل
۳۰ مارچ	ساہیوال
۴/ اپریل	میر پور آزاد کشمیر
۱۹/ اپریل	کیمبل پور
۲۱/ اپریل	یوم اقبال لاہور[2]

۵/ جنوری ۱۹۷۵ء کو وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں شیعہ پولیٹیکل پارٹیز کے اجلاس میں آغا صاحب نے پرزور تقریر کی۔[3]

۲۳/ مارچ ۱۹۷۵ء کو حیدر آباد سندھ میں لطیف آباد کے پنڈال میں سیرت کانفرنس سے خطاب کیا۔[4]

مئی ۱۹۷۵ء کو دارالعلوم اشاعت التوحید۔ کیمبل پور کے سالانہ اجلاس میں تقریر کی۔[5]

۲۹/ جون ۱۹۷۵ء لاہور میں صدیق اکبرؓ کانفرنس میں شریک ہوئے اور اپنی بیماری کے باوجود خطاب کیا۔[6]

ان چیدہ چیدہ تقریروں کے علاوہ آغا صاحب مرکزی مجلسِ اقبال کے زیر اہتمام یوم اقبال۔ یوم حمید نظامی۔ یوم ظفر علی خاں

۱	بحوالہ چٹان	۷ جنوری ۱۹۷۴ء	جلد نمبر ۲۷	شمارہ نمبر ۱	
۲	بحوالہ چٹان	۲۵ مارچ ۱۹۷۴ء	جلد نمبر ۲۷	شمارہ نمبر ۱۲	
۳	بحوالہ چٹان	۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء	جلد نمبر ۲۸	شمارہ نمبر ۲	تحریر رحمت علی رانا
۴	بحوالہ چٹان	۷ اپریل ۱۹۷۵ء	جلد نمبر ۲۸	شمارہ نمبر ۱۴	رپورٹ مختار الحسن
۵	بحوالہ چٹان	۱۷ مئی ۱۹۷۵ء	جلد نمبر ۲۸	شمارہ نمبر ۱۹	
۶	بحوالہ چٹان	۷ جولائی ۱۹۷۵ء	جلد نمبر ۲۸	شمارہ نمبر ۲۷	رپورٹ سعید کاشمیری

اور چنیوٹ میں ختم نبوت کانفرنس میں بہ التزام شریک ہوتے اور خطاب کرتے۔ طلباء کی انجمنوں خاص طور پر پنجاب یونیورسٹی۔ انجینئرنگ یونیورسٹی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں بھی اکثر جاتے اور خطاب کرتے۔ تقریر کے سلسلہ میں صرف طلباء کا طبقہ ایسا تھا جنہیں آغا صاحب انکار نہیں کرتے تھے۔ جب کہ عام سیاسی و سماجی۔ ادبی۔ ریڈیو اور ثقافتی تقاریب میں بہت کم تقریر کرتے تھے۔

دور آخر۔ آغا شورش کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۹۱۷ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک ہے۔ جب وہ ایک غریب مگر ذہین طالب علم کے طور پر زندگی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں۔ غربت و افلاس کی رکاوٹ کے باوجود تحصیل علم کے لئے کوشش کرتے ہیں اور زندگی کی آسائشوں سے محرومی کے باوجود حالات و واقعات کا مقابلہ ایک غیور انسان کی طرح کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ تعلیم کے قطع ہو جانے اور بے روزگاری کے دور میں بھی کتابوں کو نہیں چھوڑتے۔ ملک کے سیاسی حالات انہیں زندگی میں کامیابی کا پہلا موقع مہیا کرتے ہیں اور وہ ملک کی آزادی کیلئے جدوجہد میں شریک ہو جاتے ہیں دوسرا دور ۱۹۳۵ء سے لیکر ۱۹۴۹ء تک ہے۔ اس دور میں وہ قید و بند کی بھٹی میں تپتے اور کندن بنتے ہیں۔ سیاست کے طوفان میں قطرے سے گہر بننے کی منازل طے کرتے ہیں۔ علم و آگہی کی وادیاں جیل خانے کی تنہائی میں قطع ہوتی ہیں۔ جو ان کی شہرت اور مقبولیت کا باعث بن جاتی ہیں۔

تیسرا دور ۱۹۴۹ء سے لیکر تا دمِ آخر ہے۔ جس میں اُن کی حیثیت ایک شخص سے شخصیت کی ہو جاتی ہے۔ اُن کی شخصیت کی تکمیل کا یہی دور ہے۔ یہی وہ دور ہے جب وہ حکومتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب انہیں قید کرنا آسان نہ رہا۔ جب بڑے بڑے علمی مجلسوں و ادبی حلقوں میں ان کی شرکت مجلسوں اور حلقوں کی شہرت کا باعث ہوئی۔ جب ملک کے لیڈرانِ کرام اور محترم سیاستدان ملک و قوم کی خدمت کے نام پر خطابت کی بھیک مانگنے آئے۔ جب چٹان کے اداریہ کو مسائل کا حل سمجھا جاتا تھا۔ اور وہ بطور صحافی ملک کی سب سے بڑی طاقت سمجھے جاتے تھے۔ یہ ان کی صحافت کا دور ہے اور اس دور کے نظریات و خیالات اُن کی گہری سوچ طویل تجربے اور عمل و فعل کی پختگی کا عکس ہیں۔ ان افکار و خیالات کا عکس ہم تک ان کے جریدے "چٹان" کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ یہ وہ مستقل نظریات اور خیالات ہیں جنہیں شورش کاشمیری کے عقیدے کا حصہ کہا جا سکتا ہے اور جن میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ چونکہ یہ خیالات و افکار آغا صاحب کی زندگی

کا اہم حصہ ہیں لہٰذا ان کی زندگی کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُن کا تذکرہ کیا جائے۔ چٹان کی فائل دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان خیالات و افکار پر آغا صاحب نے بہ تکرار لکھا ہے۔ جن میں جدوجہد آزادی کے متعلق ان کا نظریہ۔ مشاہیر سے اُن کی محبت وطن پرستی۔ افکار اقبال کی تشہیر اور قلابازیوں کا محاسبہ شورش کی صحافتی زندگی کے نمایاں موضوعات ہیں۔

جدوجہد آزادی ● ابتدا میں جب چٹان کا اجرا ہوا پاکستان میں مسلم لیگ کی حکومت تھی۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلم لیگ مسلمانوں کی سب سے بڑی اور مضبوط ترین سیاسی تحریک تھی جس کے پس منظر میں اسلام کی روح، آزادی کی تڑپ اور حب الوطنی کا جذبہ موجزن تھا۔ جب تک قائداعظم حیات تھے مسلم لیگ نے لوگوں کی مشکلات کو دور کرنے اور ایک نئے ملک کو سنوارنے کی بڑی مخلصانہ کوششیں کیں۔ یہاں تک مسلم لیگ کا کردار ایک تحریک کا کردار ہے سیاسی پارٹی کا نہیں مگر قائداعظم کی وفات کے بعد مسلم لیگ ایک سیاسی پارٹی بن گئی۔ جس کا مقصد اقتدار وحکومت کا حصول تھا لہٰذا مسلم لیگ نے اپنے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز پر پاکستان کے غدار کا لیبل چسپاں کر دیا۔ اس سلسلہ میں آغا صاحب چٹان میں "غدار — ایک بے معنی لفظ" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"لیگ کے قابلِ احترام زعماء بھی اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ انہوں نے اپنے مخالفوں کے خلاف سیاسیات میں جس لفظ کو سب سے زیادہ رواج دیا وہ غدار کا ہے[1]"

مسلم لیگ کے اس طرزِ عمل کی زد بطور خاص اُن لوگوں پر پڑتی تھی جو قیام پاکستان کے مطالبہ میں شریک نہ تھے مگر انہوں نے انگریزی ظلم واستبداد کا مقابلہ کرتے ہوئے ہندوستان میں آزادی کی شمع کو روشن رکھا تھا۔ آغا صاحب نے مسلم لیگ کے اس طرزِ عمل پر سخت تنقید کی اور چٹان میں ان لوگوں کا دفاع کیا جنہیں "غدار" ملک دشمن اور پاکستان کے مخالف یا کانگرس نواز کہا جاتا تھا۔ بقول آغا صاحب

جن لوگوں نے برٹش امپریلزم کے خلاف جنگ لڑی اور جو آزادی کے بعد پاکستان مسلم لیگ کے غوغائیوں کی طعنہ آرائی اور نشتر زنی کے باعث سر چھپائے پھر رہے تھے یا منقارِ زیرپر ہو گئے تھے۔

---

[1] چٹان ۳۰ جولائی ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۳۰ (تلخ نوائی سے معاف)

یا جبر کا شکار بنائے جا رہے تھے یا پھر انہیں جیلوں میں ٹھونسا جا رہا تھا محض تائیدِ ایزدی سے "چٹان" اُن کی بے غرضی ۔ بے نفسی ۔ بے گناہی اور قربانی و ایثار کے تذکروں کا محافظ و منادی ہو گیا۔[1]"

چٹان نے نہ صرف مسلم لیگ کے اِس طرزِ عمل پر تنقید کی بلکہ اُن لوگوں کا محاسبہ بھی کیا جو مسلم لیگ کے ساتھ اقتدار کی وجہ سے شریک تھے ۔ ورنہ اس سے پہلے وہ کبھی مسلم لیگ کے ہم نوا تھے نہ آزادی کی جنگ میں شریک انہوں نے مسلم لیگ کے اس نعرہ کو کہ پاکستان انہوں نے بنایا ہے اور ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا محبِ وطن نہیں ، زیادہ زور سے بلند کیا تاکہ خود اُن کا اپنا تحفظ ہو سکے ۔ آغا صاحب کے نزدیک مسلم لیگ کا یہ طرزِ عمل پاکستان سے دشمنی کے مترادف تھا جس کا اعلان انہوں نے چٹان کے صفحات پر برملا کیا وہ کہتے ہیں ۔

"جن لوگوں کے دماغوں یہ بات سمائی ہوئی ہے کہ جو لوگ مسلم لیگ سے ہمسفری کے باعث ملائکہ مقربین کی صف میں چلے گئے ہیں ۔ اور جو لوگ مسلم لیگ کے ساتھ نہیں تھے سبھی غدار ہیں ۔ یا انہیں پاکستان کی سیاسیات میں حصہ لینے کا کوئی حق نہیں اور جب تک پاکستان کے ارکانِ اربعہ پر ایمان نہ لایا جائے کوئی شخص پاکستانی کہلانے کا دعویدار نہیں ہو سکتا یہ ایسی سوچ ہے کہ "عادی فن کاروں" سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس زہر کو پھیلا کر پاکستان کا حق دوستی ادا نہیں کر رہے پاکستان سے دشمنی کا ثبوت دے رہے ہیں ۔ شعوری نہ سہی غیر شعوری۔[2]"

اور حقیقت یہ ہے کہ اس طرزِ عمل کے نتائج پاکستان کے حق میں واقعی اچھے برآمد نہیں ہوئے ۔ صوبائی عصبیت کو تقویت ملی ۔ علیحدگی کے احساس کو پروان چڑھایا ۔ لوگ امریکہ نواز ۔ روس پسند ۔ چین دوست تو بن گئے مگر پاکستانی ہوتے

---

[1] چٹان یکم اکتوبر ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۴۰ ص نمبر ۷

[2] چٹان جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۱۳ یکم اپریل ۱۹۶۳ء ص نمبر ۹ (گرنو برانچ ملتان) امرار لیبری

ہوئے بھی پاکستانی نہ بن سکے۔ لوگوں کی وفاداریوں پر شک کرنے سے اُن میں بددلی پیدا ہوئی کیونکہ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی پاکستانی نہیں تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ خود مسلم لیگی راہنما دو دھڑوں میں بٹ گئے اور دونوں نے ایک دوسرے کو غدار کہنا شروع کر دیا اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آغا صاحب چٹان میں لکھتے ہیں۔

> "قائداعظم علیہ الرحمتہ کے یوم پیدائش پر ری پبلکن اور لیگ نے دو مختلف جلسے منعقد کئے ان میں ایک دوسرے کو معتوب گردانتے ہوئے طعن و تضحیک کا جو لہجہ اختیار کیا گیا اس میں غدار کا لفظ بھی استعمال کیا گیا ہم اس اندازِ خطابت کے شروع سے خلاف ہیں۔ دلچسپ تماشا یہ ہے کہ لیگ کے پرانے سیانے راہنما ہی دو مختلف دھڑوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے پر انہیں کا استعمال کر رہے ہیں [۱]"

اور حقیقت یہ ہے کہ یہاں مسلم لیگ کے رہنما پارٹیاں۔ وفاداریاں اور نظریات بدل رہے تھے وہاں آغا صاحب ان رہنماؤں کو نظریۂ پاکستان اور اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کا درس دے رہے تھے جو کہ خود مسلم لیگ والوں کا وظیفہ تھا۔ آغا صاحب نے اِس موضوع پر چٹان میں بہت کچھ لکھا ہے [۲] وہ سمجھتے تھے کہ اگر مسلم لیگ کے ایک خاص گروہ کا نقطۂ نظر محدود نہ ہوتا تو پاکستان میں سیاسی انتشار کا مرض عام نہ ہوتا اور پاکستان کے حالات مختلف ہوتے۔ [۳]

---

۱ چٹان جلد نمبر ۱۰ شمارہ نمبر ۳۷ ۱۹ ستمبر ۱۹۵۶ء

۲ تفصیل کے لئے دیکھئے

چٹان ۱۳ مئی ۱۹۶۳ء جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۱۹ ص نمبر ۳

چٹان ۲۳ جولائی ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۳۰ ص نمبر ۵، ۲۸

چٹان ۱۰ اگست ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۳۲ ص نمبر ۴

چٹان ۲۹ اکتوبر ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۴۴ ص نمبر ۵

۳ بحوالہ چٹان ۴ فروری ۱۹۶۳ء جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۵

تحریک آزادی کے متعلق آغا صاحب کا یہ نظریہ ہمیشہ رہا کہ مسلم لیگ کی قیادت کے علاوہ بھی پاکستان بنانے میں کچھ لوگوں کا حصہ ہے جب کہ مسلم لیگ اپنے کو پاکستان کا وارث قرار دیتی تھی بقول آغا صاحب

"پاکستان میں یہ کہنا مشکل ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی آزادی میں مسلم لیگ کے علاوہ کسی اور کا بھی حصہ ہے اور اس کو تاریخی حقائق سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم حقیقت یہی ہے کہ اس برعظیم کو جو آزادی ملی۔ ہندوستان آزاد ہوا یا پاکستان بنا اس میں اولاً ہندوستان کی تمام قوموں کی جدوجہد شامل ہے۔ ثانیاً ان جانبازوں کی شجاعت اور قربانی کو دخل ہے جنہوں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر اس معرکہ کو سر کیا اور خود فنا ہو گئے۔ ثالثاً ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کی اسلامی ہندوستان کی وہ تحریکیں ہیں جو مختلف عنوانوں سے سرفروشی کا سفر طے کرتی رہی ہیں۔ جمعیتہ العلماء ہند کے اکابرین کا ایثار تھا۔ احرار کی بے جگری تھی۔ خاکساروں کا معرکہ رستاخیز تھا۔ سرخپوشوں کا خون گرم تھا اور حروں کے خون کی ارزانی تھی۔ لیکن اس سے یہ بات کم نہیں ہوتی کہ پاکستان قائد اعظم کی استقامت اور مسلم لیگ کی سیادت کے سانچے میں ڈھلا اور بنا ہے۔[1]"

مشاہیر پرستی۔ مگر آغا صاحب کے اس نظریہ کی ہمیشہ مخالفت ہوئی۔ مخالفین نے تحریک پاکستان کے پس منظر میں آزادی کے اکابرین کو تنقید کا نشانہ بنایا اور آغا صاحب نے ان کا دفاع اپنے پر فرض کر لیا اور اس آواز کا جواب دیا جو ان کے خلاف اٹھی یہاں تک کہ چٹان کے آغاز کے ساتھ ہی خود آغا صاحب پر بھی یہ الزام عائد کیا گیا کہ انہوں نے مسلم لیگ کی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ بقول آغا صاحب

"مجھے اس الزام کی قطعاً پروا نہیں اور نہ میں اپنے ماضی پر شرمندہ ہوں بلکہ مجھے عظیم فخر ہے کہ میں نے انگریزوں کی حکومت کے خلاف حصول آزادی کی تحریک میں جان ہتھیلی پر رکھ کر حصہ لیا چٹان کے فائل گواہ ہیں اس نے اپنے اس کروفر کو کبھی ترک نہیں کیا۔[2]"

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۲۰۹

[2] چٹان ۸ اپریل ۱۹۶۳ء جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۱۴

لیکن اعتراض کرنے والے ہمیشہ اعتراض کرتے رہے اُن کیلئے کوئی دلیل بھی اِس بات کا جواب نہ تھی کہ پاکستان مسلم لیگ نے بنایا ہے۔ اور وہ اس کے وارث ہیں۔ اس سلسلہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کو بطور خاص اور دیگر علماء دیوبند کو عام طور پر سب وشتم کا نشانہ بنایا گیا۔ مگر آغا صاحب نے ہر معترض کا جواب دیا خاص طور پر مولانا ابوالکلام پر جب اعتراض کیا گیا آغا صاحب نے بڑے زوردار شذرات لکھے اور علمی وعقلی دلائل دیئے بعض اوقات ان کا قلم غضب آلودہ ہو جاتا تھا کہ معترض کو سوائے چپ کے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ آغا صاحب جب تک زندہ رہے انہوں نے مولانا ابوالکلام کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز کا جواب دیا مگر اُن کے انتقال کے بعد بے شمار اعتراضات اُٹھائے گئے۔ بلکہ ان کے کردار تک کو نشانہ بنایا گیا مگر کہیں سے کوئی اور زوردار آواز اُن کے حق میں نہ اُٹھ سکی۔ آغا صاحب کے کئی قلمی معرکے ہوئے۔ جن میں زیادہ تر کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا حسین احمد مدنی پر اعتراض تھا۔ ۱۹۶۳ء میں محمد شفیع مدیر "اقدام" اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے جو بحث چلی اُس کی وجہ بھی مسلم لیگ کی مدح سرائی اور مولانا ابوالکلام کی ہرزہ سرائی تھا۔[له] اِس سلسلہ میں آغا صاحب جماعت اور فرد کے امتیاز کے بغیر جس شخص یا جماعت کو برحق سمجھتے ہیں اُس کی تائید وحمایت کرتے ہیں یہ آغا صاحب کی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ شخصیتوں کے اختلاف کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اُن کے افکار کی صداقت کے پرستار ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے آغا صاحب کی محبت جنون کی حد کو چھوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور یہی حال علامہ اقبال سے اُن کی محبت کا ہے اور دونوں کا ذکر چٹان کے شماروں میں بے شمار ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال

له چٹان کے مندرجہ ذیل شماروں میں اس کی بحث کی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔

چٹان	۸ر اپریل ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۱۶	شمارہ نمبر ۱۴	ص نمبر ۴
چٹان	۲۷ مئی ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۱۶	شمارہ نمبر ۲۱	ص نمبر ۴
چٹان	۱۷ جون ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۱۶	شمارہ نمبر ۲۸	
چٹان	۲۴ جون ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۱۶	شمارہ نمبر ۲۹	
چٹان	۴-۱۰ اگست ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۱۶	شمارہ نمبر ۳۳	
چٹان	۱۹ اگست ۱۹۶۳ء	جلد نمبر ۱۶	شمارہ نمبر ۳۴	

اور مولانا ابوالکلام میں اختلاف تھا مگر یہ اختلافات کسی ایک سے آغا صاحب کی عقیدت میں کمی نہ کر سکے۔ یہی حال سید عطا اللہ شاہ بخاریؒ اور ظفر علی خاں کا ہے مگر آغا صاحب دونوں کے مداح ہیں۔ اسی طرح علماء دیوبند اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی صلاحیتوں اور خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔ حالانکہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور علماء دیوبند میں اختلافات آج تک موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی آغا صاحب مسلم لیگ کے اکابرین کو بھی خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ پر بہت سی نظمیں لکھیں[۱]۔ خان لیاقت علی خان کو "قائد ملت" کا خطاب بھی چٹان ہی نے دیا[۲]۔ سردار عبدالرب نشتر کے بڑے مداح تھے۔

حُبّ الوطنی ۔ غرض یہ کہ آغا شورش نے مسلم لیگ کے رہنماؤں کی یہ بات ماننے سے ہمیشہ انکار کیا کہ پاکستان کی سیاست پر اور پاکستان پر صرف اُسی کا حق ہے۔ لیکن جہاں تک پاکستان سے محبت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں اُن کا عقیدہ پاکستان اوّل۔ پاکستان آخر ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"پاکستان اوّل اور پاکستان آخر کا نصب العین ہی آج قوم کی سب سے بڑی میراث ہے۔ اس میراث سے وہی شخص دغا کر سکتا ہے جس کے خون میں ملاوٹ ہو[۳]"

پاکستان بن جانے کے بعد آغا صاحب نے عملی طور پر یہ کوشش کی کہ پاکستان کی سیاست اس کی بنیاد و اساس کے مطابق ہو۔ وہ ہمیشہ غیر اسلامی افکار کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اور اسلامی اقدار کے فروغ کیلئے نہ صرف چٹان میں لکھتے رہے بلکہ اپنی خطابت سے بھی لوگوں کو اس امر کی طرف مائل کیا کہ اسلام اور نظریہ پاکستان کی وابستگی ہی اُن کی مشکلات کا حل ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح کو قوم کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور ان کے بنائے ہوئے اصولوں کو مشعلِ راہ سمجھتے ہیں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ

آیئے مل جل کر پاکستان کے لئے کام کریں۔ ایک مسئلہ تھا حل ہو گیا۔ جو لوگ اس سے عناد رکھتے ہیں بہرحال گردن زدنی ہیں۔ قائد اعظم پوری قوم کے محسن ہیں[۴]

۱،۲ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۹۰/۹۱

۳ چٹان یکم جنوری ۱۹۶۱ء جلد نمبر ۱۲ شمارہ نمبر ۱

۴ چٹان ۱۳ مئی ۱۹۶۳ء جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۱۹

حکمرانوں پر تنقید کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ جس سے اُن کا مراد یہ تھی کہ اقتدار کو بے لگام ہونے سے بچایا جائے۔ مگر ملک کی حکومت کے دشمنوں کو ہمیشہ اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کا قلم بڑا ہی بیباک ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

"ہمیں سیاسی طور پر اپنی رائے رکھنے کا اور اس پر غور و فکر کی دعوت دینے بلکہ تبدیلی کا یہ مطالبہ کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے لیکن ہمارے اختلاف سے اگر کوئی غیر ملکی طاقت یہ محسوس کرے کہ وہ اپنے دست و بازو پھیلا سکتی ہے یا اس کو اپنے بال و پر کشادہ کرنے کا حق حاصل ہو سکتا ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہے اس قسم کی ہر مشکل کے وقت ہم اپنی حکومت کے ساتھ ہیں۔[۱]"

اس کا عملی مظاہرہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ہوا۔ آغا صاحب حکومت کے سخت مخالف تھے لیکن جب انہیں حکومت کی طرف سے یہ پیغام ملا کہ حکومت اس وقت اُس سے کام لینا چاہتی ہے تو وہ پیغام ملتے ہی راولپنڈی جانے کے لئے تیار ہو گئے۔[۲] اس طرح آغا صاحب واحد مقرر تھے جنہوں نے صوبہ کے مختلف علاقوں میں لوگوں کو خطاب کیا اور محاذوں پر جا کر افواج کا حوصلہ بڑھایا۔[۳] بہت سے مقالے۔ نظمیں اور ترانے لکھے۔ بقول احسان دانش

شورش سے زیادہ اس جنگ کے متعلق لاہور کے کسی شاعر نے نہیں لکھا۔[۴]

اسی طرح ۱۹۷۱ء کی جنگ میں بھی آغا صاحب نے حکومت سے بھرپور تعاون کیا۔ اس کے علاوہ آغا صاحب قیام پاکستان کے بعد سے پاکستان کے استحکام اور ترقی و خوشحالی، اسلامی اقدار کے تحفظ اور فروغ، معاشرہ کی اصلاح و تطہیر، اسلام اور آزادی کی حفاظت کرتے رہے۔ آغا صاحب کی اسی روش سے متاثر ہو کر معروف مسلم لیگی رہنما میاں امیر الدین لکھتے ہیں کہ

"وہ مسلم لیگ سے دور رہے مگر حقیقت یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جس خلوص، محبت اور جان سوزی

۱؎ چٹان ۱۳ فروری ۱۹۶۷ء جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۷

۲؎ بحوالہ چٹان شورش نمبر ص نمبر ۸۰ مضمون خواجہ تصور علی حیدر

۳؎ بحوالہ تمغۂ خدمت شورش ص نمبر ۵۳

۴؎ چٹان ۷ فروری ۱۹۶۶ء

سے حضرت قائدِ اعظم محمد علی جناح اور پاکستان سے عقیدت و ارادت کا اظہار کیا بلکہ عملی اظہار شورش صاحب نے کیا ہے۔ اس کی مثال کوئی بڑے سے بڑا مسلم لیگی رہنما بھی پیش نہیں کر سکتا۔ ان کا جذبہ حب الوطنی اٹل تھا۔

انہوں نے اپنے دل کی گہرائیوں سے یہ کہا تھا کہ

"میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے[۱]"

اس سلسلہ میں جناب مجید نظامی تحریر کرتے ہیں۔

"بانیِ پاکستان بابائے قوم کو اپنے مرشد بخاری مرحوم کی ہدایت کے مطابق قائدِ اعظم مانتے تھے قوم پرست ماضی کے باوجود کٹر پاکستانی اور نظریہ پاکستان کے دل سے قائل تھے۔[۲]"

افکارِ اقبال کی تشہیر۔ تعمیر پاکستان کی اس دعوت میں آغا صاحب نے اسلام کے قوانین اور علامہ اقبال کے افکار کی خاص طور پر تشہیر کی۔ اقبال کے افکار کو عام کرنے اور علامہ کی دعوت پر عمل کرنے کی جتنی تلقین چٹان کے صفحات پر ملتی ہے اس کا کوئی دوسرا جریدہ تصور بھی نہیں کر سکتا بقول شورش کاشمیری

چٹان تو اقبالیات کا زبردست داعی ہے اور اس نے معاندین اقبال حتیٰ کہ عیب بینانِ اقبال اور نکتہ چینانِ اقبال کی جو خبر لی ہے آج بھی اس کے جرائم میں شمار ہوتی ہے[۳]

علامہ اقبال سے آغا صاحب کو گہری عقیدت تھی اور ان کو اپنا ذہنی مرشد مانتے تھے۔ آغا صاحب ۱۹۵۰ء میں مرکزیہ مجلسِ اقبال کے سیکرٹری مقرر ہوئے[۴]۔ اور آخری وقت تک اس عہدہ پر فائز رہے۔ پاکستان میں یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ جو آغا صاحب کے حصہ

۱؎ شورش نمبر چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۵ مضمون: شبنم اور آگ میاں امیر الدین

۲؎ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۵، ۱۴ مضمون: عجب آزاد مرد تھا۔ مجید نظامی

۳؎ چٹان ۶ مئی ۱۹۶۳ء

۴؎ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۷۰

میں آیا۔ آغا صاحب کو اس عہدہ سے علیحدہ کرنے کیلئے کئی دفعہ حکومت کی طرف سے اشارہ کیا گیا۔ مجلس کے چند حکومت نواز چاہتے بھی تھے کہ آغا صاحب کو اس عہدہ سے الگ کر دیا جائے۔ مگر پہلے خواجہ عبدالرحیم۔ حمید نظامی مرحوم نے پھر میاں امیرالدین اور مجید نظامی نے ان سازشوں کو ناکام بنا دیا۔[1] آغا صاحب کو ہمیشہ یہ گلہ رہا کہ پاکستان میں اقبالیوں نے اقبال پہ کوئی کام نہیں کیا بلکہ افکارِ اقبال کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتے رہے۔ چٹان میں اُن کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ اسلامی اقدار کی ترقی ہو۔ اس مقصد کیلئے اقبال کے افکار سے زیادہ مؤثر کوئی چیز نہ تھی لہٰذا آغا صاحب نے اقبال کے افکار سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اقبال پہ نکتہ چینی کرنے والوں اور تنقید نگاروں کا محاسبہ کیا اور کوشش کی کہ اقبال کو ان کی صحیح فکر کی روشنی میں دیکھا جائے۔

پاکستان کی سرزمین میں اقبال کی شخصیت اتنی عظیم اور جامع ہے کہ دوسرا کوئی شخص اُن کے پاسنگ بھی نہیں اور ان کے افکار اتنے منفرد اور رنگارنگ ہیں کہ جس کا احاطہ ابھی تک کوشش کے باوجود مکمل طور پہ نہیں ہو سکا۔

آغا شورش کاشمیری کی کوشش یہ رہی کہ فکرِ اقبال کو کوئی فرد ـــــ جماعت یا حلقہ اپنے اغراض و مقاصد کو حاصل کرنے کا وسیلہ نہ بنائے۔ اُن کے کلام کو غلط معنی پہنا کر اسلام کے علاوہ کسی اور نظام یا نظریہ کیلئے استعمال نہ کیا جائے کیونکہ علامہ کی فکر کی صحیح اساس اسلامی اور قرآنی ہے۔ جس میں اجتماعیت بھی ہے اور آفاقیت بھی۔ شورش کاشمیری یہ چاہتے تھے کہ پاکستان میں علماء خاص طور پر اور نوجوان عام طور پہ اقبال کی فکر کا عکس ہوں اور وہ نظام ہائے سیاست اور طرز ہائے زندگی جو جدیدیت اور انسان دوستی کے نام پہ الحاد و گمراہی کا باعث بن رہے ہیں اُن کا قلع قمع کیا جائے اسی لئے انہوں نے اقبال کے افکار کی تشہیر پہ اپنا پورا زورِ قلم صرف کیا ان کے نزدیک ایسے الحاد اور گمراہی کا توڑ افکارِ اقبال سے بڑھ کر کوئی نہ تھا اور یہ جہاد انہوں نے مسلسل کیا بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

''شورش کم و بیش بیس برس سے اقبال کی عظمتوں کو نمایاں کرنے کے لئے اسی جذبے سے کام کر رہا ہے۔''[2]

---

[1] بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر ص نمبر ۱۵ میاں امیرالدین

[2] فیضان اقبال ص نمبر ۱۵ تعارف ڈاکٹر سید عبداللہ

قادیانیوں کا محاسبہ

قادیانیوں کے محاسبے کا آغاز ۱۸۸۵ء سے ہوتا ہے۔ جب شاہ عبدالقادر لدھیانوی کے بیٹوں مولانا محمد عبداللہ لدھیانوی اور مولانا عبدالعزیز لدھیانوی نے مرزا غلام احمد کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا[1]۔ اس کے بعد ہر دور میں قادیانیوں کا محاسبہ جاری رہا۔ ابتداء سے لیکر اب تک بے شمار علمائے حق اور اکابرین اسلام نے قادیانیوں کے محاسبے میں حصہ لیا بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہر مسلمان نے مرزائیت سے جو نفرت کی وہ بھی ردِ مرزائیت میں شامل ہے لیکن اس سلسلے میں مولانا محمد حسین بٹالوی۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری پیر مہر علی شاہ صاحب۔ مولانا انور شاہ کاشمیری۔ حضرت علامہ اقبال۔ مولانا ظفر علی خاں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور شورش کاشمیری محاسبہ مرزائیت کے نام نمایاں ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس سلسلے میں اپنے زبان و قلم کی تمام توانائیاں صرف کر دیں اور مولانا کی اِس محنت سے مرزائیت کا مسئلہ ایک عوامی تحریک بن گیا۔ علامہ اقبال کے افکار نے مرزائیت کو اقلیت قرار دینے کے مطالبہ کو پروان چڑھایا[2]۔ قادیانیوں کے محاسبہ میں مجلس احرار کا کردار نمایاں ترین ہے۔ مجلس احرار نے اپنے قیام کے فوراً بعد ہی سے مرزائیوں کا محاسبہ شروع کر دیا تھا۔ اور تحریک کشمیر کے معرکہ کے بعد احرار نے مرزائیوں کی مخالفت ہر محاذ پر کی۔ قیام پاکستان کے سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاء کار نے ۱۹۵۳ء میں مرزائیوں کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کی۔ بلاشبہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوتؐ اس سلسلے کی سب سے بڑی تحریک تھی جسے مارشل لا کے ذریعے وقتی طور پر دبا دیا گیا مگر ختم نہ ہو سکی۔ جسٹس منیر نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ میں مسلمانوں کے ان مطالبات پر مندرجہ ذیل تبصرہ کیا ہے

۱۔ مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت

۲۔ احمدیوں کو اقلیت قرار دینے کا اعلان

۳۔ چوہدری ظفر اللہ کی موقوفی

پہلے مطالبے کے متعلق تحقیقاتی رپورٹ فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء جسے عرف عام میں منیر انکوائری رپورٹ بھی کہا جاتا ہے میں تحریر ہے کہ

۱؎	بحوالہ تاریخ محاسبہ قادیانیت	ص نمبر ۱۲۶	خالد شبیر احمد
۲؎	بحوالہ تحریک ختم نبوتؐ	ص نمبر ۲۷	شورش کاشمیری

"اس مطالبے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں جسے احرار اور بعض دوسرے مسلمان ردِ مرزائیت کہتے ہیں۔۔۔۔

کہ ہمارے ملک کے باشندوں کی ایک قلیل سی جماعت کو جسمانی یا مذہبی اعتبار سے نابود کر دیا جائے۔

احمدیوں کی جماعت مسلّمہ عقائد پر قائم ہے اور غیر احمدیوں کے عقائد رنگا رنگ ہیں[1]۔"

دوسرے مطالبے کے متعلق مرکزی حکومت کو مشورہ دیا گیا ہے کہ

اگر حکومت مرکزی کے ارکان محسوس کرتے ہیں کہ یہ مطالبہ قرینِ انصاف ہے اور ان اصولوں کے مطابق ہے جو اس ملک کی آئندہ تقدیر کے متعلق اُن کے دماغوں میں موجود ہے تو ان کو یہ بلا تامل منظور کر لینا چاہیے۔ اور اگر اس کے برعکس وہ اس مطالبے کو بیہودہ سمجھتے ہیں۔ تو انہیں نہایت واضح الفاظ میں ایک مختارانہ بیان جاری کر دینا چاہیے، ارکانِ مرکز کو اس بات کا فیصلہ کرنا چاہیے کہ احرار جو آخری دم تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے اب پاکستان کو ختم کرنے کیلئے جو دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے۔ آیا وہ اس سے مغلوب ہو جائیں گے؟[2]

اس طرح تیسرے مطالبے کے متعلق بھی کہا گیا ہے کہ حکومت چونکہ ظفر اللہ خاں پر اعتماد رکھتی ہے لہٰذا اس کا اعلان کر دینا چاہیے۔ منیر انکوائری رپورٹ دراصل قانون دانوں کی غیر قانونی دستاویز ہے۔ جسمیں احرار کی مرزائیت دشمنی سے فائدہ اٹھا کر اس مسئلے کو احراری اور احمدی نزاع کا نام دیا گیا اور اصل مسئلہ سے چشم پوشی اختیار کی گئی لیکن منیر انکوائری رپورٹ کی اس رائے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس وقت پاکستان میں مرزائیوں کو کتنا تحفظ حاصل تھا۔ ارکان حکومت کے نزدیک اس مسئلے کی اہمیت کیا تھی۔ اور ان مطالبات کو کس نظر سے دیکھا جاتا تھا اِن اثرات کو ختم کرنے کے لئے کس قدر محنت درکار تھی۔ اور مسئلہ ختم نبوت کی تبلیغ و اشاعت کس قدر مشکل کام تھا۔ جسے شورش کاشمیری نے انجام دیا۔ انہوں نے علامہ اقبال کی فکر کی اساس پر اس مسئلے کو عام کیا اور مرزائیت کے تعاقب میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے بقول شورش صاحب

---

[1] تحقیقاتی رپورٹ عدالت فسادات پنجاب سنہ ۱۹۵۴ء ص نمبر ۲۰۷

[2] رپورٹ تحقیقاتی عدالت ص نمبر ۳۰۷

"راقم نے اقبال کے افکار کی اساس پر مرزائیت کی سیاسی تاریخ کا استعماری کردار پیش کیا اور اس سلسلہ کے اُن تمام حقائق کو بے نقاب کیا جو قوم کے سامنے نہیں تھے۔"[1]

مرزائیوں کے محاسبہ کی پوری تاریخ جس میں شورش کاشمیری نے نمایاں حصہ لیا شورش کی کتاب "تحریک ختم نبوت"، میں دیکھی جا سکتی ہے اور محاسبہ قادیانیت پر لکھی جانی والی کوئی کتاب شورش کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی ۔ اس سلسلے میں شورش کے ہفت روزہ چٹان" نے اہم کردار ادا کیا اور ایک نئی تحریک کا آغاز کیا جو قادیانیوں کے محاسبے میں بڑی فعال ثابت ہوئی ۔ مرزائیوں کی پوری جماعت اُن کی کردار کشی پر لگی رہتی تھی مگر انہوں نے کبھی اس کی پرواہ نہ کی اور اپنے مقصد کیلئے کام کرتے رہے ۔ شورش کاشمیری قادیانیت کے بارے میں بڑے سخت تھے اُن کا خیال تھا کہ علماء کو مذہبی طور پر اُن کا محاسبہ ضرور کرنا چاہیئے تاکہ سادہ دل عوام گمراہ نہ ہوں مگر وہ اِسے ایک سیاسی تحریک سمجھتے تھے اور انہوں نے قادیانیوں کے محاسبے میں سیاسی طور پر زیادہ کام کیا وہ کہا کرتے تھے

یہ ایک صیہونی تحریک ہے جب تک صیہونی تحریک کے پس منظر میں قادیانی تحریک کا جائزہ نہ لیا جائے
---- اس وقت تک ان کا تعاقب اور استحصال ناممکن ہے[2]

ختم نبوت کا مسئلہ شورش کاشمیری کی زندگی کا مقصد تھا اور یہ مقصد ان کی زندگی میں پورا بھی ہو گیا بلکہ اپریل ۱۹۸۴ء میں مرزائیت کی تبلیغ پر پوری طرح پابندی عائد کر دی گئی اور قادیانیوں کو مسلمانوں کے مذہبی اصطلاحات استعمال کرنے سے روک دیا گیا۔ جس کا مطالبہ اکثر آغا صاحب کیا کرتے تھے ۔ غرض اپریل ۱۹۸۴ء کا یہ آرڈی ننس آغا صاحب کی روح کی تسکین کا باعث ہو گا ۔ بقول مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی ۔

قادیان کے متنبی کاذب اور اُن کی امت کے خلاف شورش مرحوم ایک شمشیر برہنہ تھے اور اپنی عمر کے آخری لمحات تک وہ اِس گروہ کے خلاف برسرِ پیکار اور معروف جہاد رہے ۔ اِس سازشی ٹولے کی ریشہ دوانیوں اور ان کے سیاسی عزائم پر وہ کڑی نظر رکھتے تھے اور انہیں ہمیشہ آشکارا کرتے رہتے تھے ۔ ۔ ۔

۱	تحریک ختم نبوت	ص نمبر ۱۷۰	شورش
۲	شورش کاشمیری	انور عارف	ص نمبر ۱۳۰

۔۔۔۔۔اس جھوٹی نبوت کے خلاف اُن کا یہ مسلسل اور پیہم مجاہدہ انشاءاللہ اُن کے حق میں بہترین توشۂ آخرت ہے[۱]

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت شورش صاحب کی زندگی کا درخشاں پہلو ہے یہی وہ جذبہ ہے جس کے تحت وہ نہ صرف مرزائیوں کے محاسبے میں سرگرم عمل رہے بلکہ اسلام کی سربلندی، اسلامی اقدار کی پاسداری، غیر ملکی نظام ہائے سیاست سے بیزاری اور حق و باطل کے فرق کو نمایاں کرکے باطل کی قوتوں کا قلع قمع کرتے رہے۔ وہ کوئی بڑے عالم دین نہیں تھے لیکن جذبۂ عشق رسولؐ کی وجہ سے علماء اور دینی حلقوں میں قدر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ بقول حضرت دین پوری

"میری نظر میں اُن کا جو بلند مقام تھا وہ جذبۂ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تھا۔ وہ ایک سچے، کھرے اور صحیح عاشق رسول تھے[۲]"

عادات و خصائل

شورش کاشمیری انتہائی جذباتی اور پرجوش انسان تھے۔ جناب احسان دانش نے آغا صاحب کے مزاج کی عکاسی مغلوب الغضب[۳] شدید الاحساس اور مغضوب الغضب[۴] وغیرہ الفاظ سے کی ہے اور جسٹس جاوید اقبال نے کہا ہے کہ

شعلے کا مزاج پایا تھا۔ اپکنے سے باز نہ رہ سکتے تھے۔[۶]

اسی طرح میاں امیر الدین کہتے ہیں۔

شبنم اور آگ کے اس امتزاج کا نام شورش کاشمیری تھا۔[۷]

۱۔ چٹان شورش کاشمیری نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۰ سید مودودی

۲۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۲۴۲ حضرت دین پوری

۳-۵۔ جہان دانش ص نمبر ۲۲۳/۲۲۴/۲۲۶

۶۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۱ جسٹس جاوید اقبال

۷۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۵ میاں امیر الدین

یہ سارے الفاظ بلا شبہ آغا صاحب کی طبیعت اور مزاج کی کچھ نہ کچھ عکاسی ضرور کرتے ہیں لیکن اگر اس کیفیت کو کسی جامع لفظ سے پکارا جا سکتا ہے۔ تو وہ لفظ "برق خو" ہے۔ کیونکہ

"سائنس دانوں نے برقیات کے متعلق ایک اصول وضع کیا ہے جس کو "اصول عدم تعین" کہا جاتا ہے۔ اس اصول کی رُو سے ایک برقیے کی جگہ اور معیار حرکت دونوں کا ٹھیک طور پر تعین نہیں کیا جا سکتا۔[1]"

بالکل یہی حال شورش کاشمیری کے مزاج کا ہے۔ اور اس کی تصدیق مرزا ادیب نے ان الفاظ میں کی ہے۔

"عبدالکریم الفت کی یہ عادت تھی کہ ایک دم شعلہ جوالہ بن جاتا تھا اور پھر نارمل بھی ہو جاتا تھا۔ وہ کب خفا ہو گا یہ بات کوئی نہیں جانتا تھا اور کبھی صلح بھی کرے گا اس امر کا یقین بھی کوئی شخص نہیں دلا سکتا تھا۔[2]"

شورش کاشمیری جامع الصفات انسان تھے انور عارف نے اپنی کتاب شورش کاشمیری میں تحریر کیا ہے کہ

"آغا صاحب خاصی اختلافی شخصیت ہونے کے باوجود جامع الصفات اور مجموعہ اضداد ہیں[3]"

اُن کے نزدیک

"بڑے آدمیوں میں جب بہت سی خوبیاں ایک ہی وقت میں جمع ہو جائیں تو انہیں مجموعہ صفات یا جامع الصفات کہا جاتا ہے۔ یہی خوبیاں جب کسی دوسرے آدمی میں آجائیں اور اس کی شخصیت ذرا اختلافی ہو تو وہ مجموعہ اضداد کہلاتا ہے[4]"

آغا صاحب کے متعلق انور صاحب کا یہ بیان تضاد کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ "بڑے آدمیوں میں بہت سی خوبیاں

---

[1]	فلسفہ کے بنیادی مسائل	ص نمبر ۲۱	اے۔ سی۔ ایونگ
[2]	چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء	ص نمبر ۲۰۲	مرزا ادیب
[3،4]	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۱	انور عارف

ایک ہی وقت میں جمع ہو جائیں تو مجموعہ صفات یا جامع الصفات کہا جاتا ہے ۔ دراصل جب بہت سی خوبیاں کسی عام آدمی میں پیدا ہوتی ہیں تو وہ شخص جامع الصفات کہلائے گا۔ کیونکہ یہ خوبیاں بڑے آدمی کو بڑا نہیں بلکہ چھوٹے آدمی کو بڑا بناتی ہیں۔ ان کی دوسری بات یہ ہے کہ "یہی خوبیاں جب کسی دوسرے آدمی میں آجائیں اور اس کی شخصیت ذرا اختلافی ہو تو مجموعہ اضداد کہلاتا ہے" حالانکہ ہر بڑا آدمی اختلافی شخصیت ہوتا ہے۔ لہذا ثابت ہوا کہ شخصیت کا اختلافی ہونا اضداد کی وجہ نہیں بلکہ جب کسی عام آدمی میں بہتر صفات پیدا ہوں گی تو وہ بڑا آدمی ہوگا۔ اور اس کی شخصیت اختلافی ہوگی ۔ اس کے ثبوت میں ہمعصر رجال کی فہرست پیش کی جاسکتی ہے ۔ لہذا یہ کہنا کہ آغا شورش کاشمیری مجموعہ اضداد تھے درست نہیں بلکہ وہ جامع الصفات تھے اور دنیا کے بڑے انسانوں کی طرح چھوٹے سے بڑے بنے ۔ جہاں تک ان کی صفات کا تعلق ہے۔ ان میں ان کی سیاست، خطابت ۔ صحافت اور شعر و ادب شامل ہیں۔ ان صفات میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے ۔ بلکہ ان سب صفات کو ایک درخت کی شاخیں کہا جاسکتا ہے ۔ جس کا بیج اردو زبان نے مہیا کیا ۔ اور ان کی سیاست، خطابت اور صحافت میں ادب کا رنگ نمایاں ہے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے تو گالی کو بھی ادب کا رنگ دے دیا تھا۔ اس لئے ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان کو "ادبی دشنام کا بادشاہ"[1] کہا ہے ۔ طبیعت کی تیزی[2] اور جذباتیت بہرحال آغا صاحب میں موجود تھی ۔ مگر اسے بھی اضداد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہی تو اصل شورش کاشمیری ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ شورش کاشمیری کے خیالات ، افکار اور نظریات ایسے ہیں جو ان کی شخصیت میں بنیادی حیثیت کے حامل ہیں ۔ مثلاً مرزائیوں کا محاسبہ ، مشاہیر سے ان کی محبت ، آزادی کی جدوجہد اور اسلامی اقدار کی بلندی وغیرہم ۔ جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے ایسے نظریات اور خیالات ہیں جن میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا ۔ باقی رہا بعض افراد اور حالات کا تعلق تو بطور صحافی وہ انہیں ایک خاص پس منظر میں دیکھنے کے عادی تھے

---

[1] چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۰۶ ڈاکٹر سید عبداللہ

[2] انور عارف نے آغا صاحب کے مزاج کی تیزی کی وجہ ذیابیطس کی بیماری بتائی ہے ۔ وہ کہتے ہیں " شورش کے مزاج میں تیزی نہ ہوتی تو وہ جہاں اب ہیں اس سے بہت آگے ہوتے لیکن ان کے مزاج میں جہاں خوبیاں ہیں تو یہ ذیابیطس کی وجہ سے یہ چیزیں آگئی ہیں کہ جلد گرم ہو جاتے ہیں لیکن نرم ہوتے انہیں دیر نہیں لگتی " شورش کاشمیری ص نمبر ۴۷

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

جو کہ وقتی اور عارضی ہوتا تھا۔ جس میں حالات و واقعات کے ساتھ رائے کا تبدیل ہونا فطری بات ہے۔ جسے تضاد کا نام نہیں دیا جاسکتا کیونکہ صحافت وقتی اور عارضی ہی ہوتی ہے اور پھر شورش کاشمیری کے اختلافات نظریاتی اختلافات ہوتے تھے ذاتی نہیں شورش صاحب نے فیلڈ مارشل ایوب خاں، گورنر موسیٰ خاں ۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ۔ گورنر کھر۔ وزیر اطلاعات احمد سعید کرمانی اور مولانا کوثر نیازی سے اختلاف کیا مگر یہ اختلاف اس وقت تھا جب تک یہ حضرات اقتدار میں رہے ۔ اقتدار کے خاتمے پر اگر آغا صاحب چاہتے تو چٹان کے ذریعے بہت کچھ کہہ سکتے تھے ۔ مگر انہوں نے کبھی کسی کے متعلق کوئی بات نہیں لکھی جو اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔ جس کی تصدیق احسان دانش کے بیان کردہ اس واقعے کے خلاصے سے ہوتی ہے کہ لوگوں نے شورش کو اس وقت الطاف حسین

حاشیہ

انور صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ آغا صاحب ذیابیطس کی وجہ سے جلد گرم ہو جاتے اور نرم ہوتے انہیں دیر نہ لگتی تھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آغا صاحب ذیابیطس کے پیدائشی مریض نہ تھے یہ بیماری انہیں بعد کو لگی اور مزاج کی تیزی شروع ہی سے موجود تھی ۔ اور یہی تیزی اور جذبانیت دراصل اصلی شورش کاشمیری ہے ۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر مزاج میں تیزی نہ ہوتی تو وہ جہاں ہیں اس سے بہت آگے ہوتے یہ ایک مفروضہ یا قیاس ہے ۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں دیا جاسکتا۔ البتہ اس کے یہ معنے ضرور ہیں کہ اگر شورش کاشمیری کے مزاج میں تیزی نہ ہوتی تو وہ شورش نہ ہوتے اور اگر شورش نہ ہوتے تو کہیں بھی نہ ہوتے

جہاں تک شورش صاحب کی شہرت اور مقبولیت کا تعلق ہے وہ بطور شورش اُن کو کم نہیں ملی ۔ بلکہ بڑے لوگوں میں بہت کم لوگ ایسے ملتے ہیں، جو کسی جماعت، کسی حلقہ، کسی گروہ اور کسی معاونت کے بغیر اتنا اثر رکھتے ہوں جتنا اکیلا شورش کاشمیری رکھتا تھا۔ ان کی شہرت کا اندازہ فرید احمد صاحب کے اس بیان سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ لاہور کے علاوہ، کیونکہ لاہور تو آغا صاحب کا گھر ہے ۔ پاکستان کے دوسرے شہروں میں ۔

سو گز کا فاصلہ اگر اُن کو پیدل طے کرنا ہوتا تھا تو کم از کم ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔

یعنی آغا صاحب کے اجنبی عقیدت مند اتنے زیادہ تھے کہ انہیں پیدل سفر کرنا مشکل تھا

چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء ص نمبر ۶۸

قریشی اور مولانا کوثر نیازی کے خلاف چٹان میں لکھنے کو کہا جب قریشی صاحب اپنی بعض تحریروں کے انجام سے گھبرائے ہوئے تھے اور مولانا کوثر نیازی جیل میں تھے انہوں نے دونوں کے خلاف لکھنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ کسی مصیبت زدہ انسان کی مصیبت میں اضافہ کرنا میرا شعار نہیں۔ اب اگر موقع ملا تو میں اُن کی مدد کرونگا۔ اس واقعے کے بعد احسان صاحب نے لکھا ہے۔

"کہیں کہیں تو وہ اُن درویشوں کے اخلاق و محاسن کا حامل ملتا ہے جن کا وجود دنیا کے لئے باعث رحمت خیال کیا جاتا ہے[1]۔"

اسی سلسلے میں میاں امیر الدین کہتے ہیں

وہ بغض اور کینہ سے پاک تھے۔ دشمن بھی اگر سامنے آجاتا اور دستِ تعاون دراز کرتا تو سب کچھ بھول کر اُسے معاف کر دیتے یہ شورش کاشمیری کی بڑی خوبی تھی[2]۔

لہٰذا انور صاحب کا یہ بیان درست ہے کہ وہ اپنے دوستوں کو بھی بہت جلد معاف کر دیتا ہے[3]۔ دوستوں کے معاملے میں آغا صاحب بڑے فیاض تھے اس سلسلہ میں پروانے۔ بکھیرا اور بھنورا صفت لوگوں کو دوست نہیں سمجھتے تھے بلکہ مخلصانہ اشتراک و تعاون اُن کے نزدیک اصل دوستی تھی[4]۔ آغا صاحب کے دوستوں میں حمید نظامی مرحوم، حسین شہید سہروردی اور سردار عبدالرب نشتر ایسے انسان شامل ہیں۔ جن سے آغا صاحب کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ لوگ آغا صاحب کی دوستی کے حلقے میں رہتے جنہیں وہ ہمیشہ اچھے نام سے یاد کرتے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب دوستوں کے معاملے میں بڑے ہی فراخ دل تھے۔ بقول پروفیسر مرزا محمد منور صاحب

آغا صاحب کسی کی تعریف کرتے تو پھر اُدھار کچھ نہیں رکھتے تھے عرش تک پہنچا کر چھوڑتے تھے[5]۔

---

[1] جہانِ دانش — ص نمبر ۲۲۷

[2] چٹان شورش نمبر یکم نومبر سنہ ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۵ — میاں امیر الدین

[3-4] بحوالہ شورش کاشمیری — ص نمبر ۴۰/۴۱

[5] چٹان شورش نمبر یکم نومبر سنہ ۱۹۷۶ء ص نمبر ۱۶۲

مگر یہ طرزِ عمل سب کے ساتھ نہیں بلکہ صرف ان کے ساتھ تھا جنہیں وہ دوست سمجھتے تھے ورنہ بقول احسان دانش

"شورش جسے اچھا سمجھتا ہے اُس کی عزت کرتا ہے اور اُسے جسے بُرا سمجھتا ہے اُسے نظر انداز کر دینا ہی سب سے بڑی سزا گردانتا ہے[1]"

آغا صاحب کے رعب اور دبدبے کی وجہ سے عام آدمی کے ذہن میں اُن کے متعلق جو کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ غصے سختی اور جلال کی کیفیت ہے۔ لیکن حقیقت میں ایک نرم دل اور حساس انسان تھے جو دوسروں کا دکھ نہ دیکھ سکتے تھے اور انسانوں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد بنا لیتے تھے۔ مظلوم کی حمایت اور دادرسی کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ اس میں چھوٹے بڑے کی قید نہ تھی۔ وہ جہاں سیاستدانوں پر کئے جانے والے ظلم پر بیزاری کا اظہار کرتے ہیں وہاں عام ستم رسیدہ افلاس زدہ غریبوں اور بے نواؤں کی نوا بن جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے افراد شورش کو اپنا محسن اور رہنما سمجھتے تھے اور ان کا احترام کرتے تھے۔ عوام میں اُن کی شہرت اور مقبولیت کی بڑی وجہ ان کا یہ طرزِ عمل بھی تھا کہ وہ غریبوں اور حاجتمندوں کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے اور ہر اُس مستحق انسان کی مدد کرتے جس کے متعلق انہیں پتہ چلتا کہ مصیبت زدہ ہے۔ اور واقعی امداد کا مستحق ہے بقول احسان دانش

"اپنی خوش فہمی کے تحت میرے پاس جب کوئی غریب۔ مفلس۔ مصیبت زدہ یا طالب علم پریشانی میں امداد طلبی کی غرض سے آجاتا تو میں رقعہ دے کر شورش کے پاس چلتا کر دیتا تھا۔ وہ صرف میرے دستخط دیکھ کر غریب اور مستحق لوگوں کی خاطر خواہ مدد کر دیا کرتا تھا[2]"

شورش کاشمیری بڑے ملنسار۔ خندہ جبیں۔ ہمدرد اور درویش منش اور نہایت ہی سادہ قسم کے انسان تھے تعیش پسندی۔ تکلف۔ بناوٹ اور آرائش و زیبائش سے بالکل مبرا۔ ساری زندگی سادگی میں بسر کی۔ ابتداء ہی سے غربت و افلاس کا شکار ہو گئے۔ عمر کا بہترین حصہ جیل کی وردی میں گزارا پھر کھدر پوش ہو گئے۔ جیل میں جو کچھ اور جیسا کچھ ملتا تھا کھا لیتے تھے لہٰذا کوئی

---

[1] جہانِ دانش ص نمبر ۲۲۵

[2] جہانِ دانش ص نمبر ۲۲۳

مستقل عادت راہ نہ پا سکی اور جب جیل سے باہر آئے تو آرائش و زیبائش یا تعیش و راحت کا دور ہی گزر چکا تھا۔ لہٰذا جیل کی زبوں حالی کی جگہ سادگی نے لے لی۔ جہاں تک کھانے پینے کا تعلق ہے ہر قسم کی خوراک گوارا تھی۔ کھانے پینے کے معاملے میں پرہیز نہ کرتے تھے وہ ذیابیطس کے مریض تھے اور جانتے تھے کہ میٹھا اُن کے لئے مُضر ہے مگر بعض اوقات کسی محفل میں یا کسی دعوت میں اگر کسی دوست یا عقیدت مند نے میٹھی چیز پیش کر دی تو آغا صاحب نے بغیر کسی عذر کے وہ چیز کھالی دعوتوں میں جو چیز سامنے ہوتی شروع کر دیتے کم کھاتے تھے۔ مگر کھانا خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو تعریف زیادہ کیا کرتے تھے۔ البتہ کھانے کے معاملے میں چاول اور شلجم۔ نہاری۔ کباب۔ سری پائے اور شب دیگ شوق سے کھاتے تھے[۱] ہر حال میں مست اور صابر و شاکر رہتے۔ ہر قسم کے نشے۔ انگریز۔ سی۔ آئی۔ ڈی اور مرزائیوں سے سخت نفرت تھی۔ اچھی کتاب۔ اچھی گھڑی اور اچھے قلم سے محبت تھی۔[۲] آغا صاحب ایک عوامی رہنما تھے لہٰذا ان کے دفتر میں ہر قسم کے لوگ آتے تھے۔ جن میں زیادہ تر طلباء۔ علماء۔ سیاستدان۔ صحافی اور ادیب و شاعر ہوتے۔ کسی کے لئے وقت کی کوئی قید نہ تھی لیکن آغا صاحب مرتبہ و حیثیت کے مطابق ہر آدمی کے ساتھ خوش اسلوبی سے پیش آتے، آنے والے کی خاطر مدارات کرتے۔ اِس قسم کے ہنگاموں سے بے زاری کا اظہار کبھی نہ کرتے تھے۔ گفتگو کا اسلوب بدلتا رہتا۔ کبھی عالمانہ باتیں ہوتیں تو کبھی طنز و مزاح سے کام لیتے۔ لطیفے سناتے قہقہے لگاتے۔ شعر و شاعری ہوتی سیاست و نقد و نظر کا سلسلہ چلتا۔ غرض محفل کو باغ و بہار رکھتے۔ دوستوں کی محفلوں میں بھی جاتے اکثر ہوٹلوں میں نشستیں ہوتیں جو ان کی رات کی سیر کا حصہ ہوتیں۔ آغا شورش کاشمیری کی گھریلو زندگی بڑی خوشگوار تھی۔ بیگم شورش صاحبہ کے انٹرویو[۳] سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والے شوہر اور شفیق باپ تھے۔ آغا صاحب کی سات بیٹیاں اور چار بیٹے تھے مگر وہ لڑکیوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ لڑکے کی بجائے لڑکی کی پیدائش پر زیادہ خوش ہوتے تھے۔ گھر میں اگر لڑائی جھگڑا ہوتا تو اس غصے کی عمر صرف چند منٹ ہوتی تھی۔ آغا صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی کبھی باہر جاتے تو گھر والوں کیلئے کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لاتے۔ آغا صاحب کے گھر کا ماحول خالصتاً مشرقی تھا۔ تاہم آغا صاحب بچیوں کی تعلیم کے حق میں تھے۔ وہ اپنے بچوں کی ہر قسم کی فرمائش پوری نہیں کرتے تھے لیکن جائز اور معقول فرمائش

۲ـــ شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۴۵/۱۴۳

۳ـــ چٹان شورش نمبر انٹرویو بیگم شورش صاحبہ — یکم نومبر ۱۹۷۶ء

کو پورا کرنے میں دیر بھی نہیں کرتے تھے ۔ بعض اوقات بچوں کیلئے خریداری خود کرتے ۔ ہر بچہ اپنی ضرورت کی فہرست دے دیتا اور وہ سب کو مطلوبہ اشیاء لا دیتے تھے ۔ بچوں کو بطور خاص سیر و تفریح کیلئے بہت کم لے جاتے تھے ۔ البتہ اگر کسی دوسرے شہر میں جانا ہوتا تو کسی نہ کسی کو باری باری اپنے ساتھ لے جاتے ۔ آغا صاحب بڑے مصروف آدمی تھے گھر والوں کو بھی انتظار کرنا پڑتا تھا کہ فرصت ہو تو بات کریں ۔ گھریلو معاملات میں اُن کی توجہ کم تھی اور یہ سارے معاملات بیگم شورش صاحبہ کے سپرد تھے مگر بچوں کی تعلیم کا خاص خیال رکھتے تھے ۔ اس سلسلہ میں اکثر بچوں سے باز پرس بھی کیا کرتے تھے ۔

علالت اور وفات

آغا شورش کاشمیری کی صحت فیلڈ مارشل ایوب خاں کے دور میں زیادہ متاثر ہوئی جب انہوں نے تامرگ بھوک ہڑتال کی اور سوائے ڈاکٹر افتخار احمد صاحب کے دوسرے ڈاکٹروں سے علاج کرانے سے انکار کر دیا ۔ اس زمانے میں بقول ڈاکٹر افتخار احمد ۔

> آغا صاحب بیک وقت شوگر ۔ بلڈ پریشر ۔ پتے کی پتھری ۔ گردے کی خرابی اور پٹھوں کی کمزوری کے مریض تھے ۔[۱]

رہائی کے بعد اُن کی صحت پوری طرح بحال نہ ہو سکی اس دوران میں گرفتاریوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور خرابیٔ صحت کی بنا پر ہسپتال ہی میں رکھے گئے ۔ ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۵ء بروز بدھ کو آغا صاحب کی طبیعت کچھ خراب تھی لہذا حکیم آفتاب احمد قرشی کو بلایا گیا حکیم صاحب نے علاج شروع کیا[۲] مگر اسی دوران انہیں دل کا دورہ پڑا لہذا ڈاکٹر افتخار احمد کو بلایا گیا اور آغا صاحب گھر سے میو ہسپتال منتقل ہو گئے ۔ بدھ کی رات تک اُن کی حالت تسلی بخش تھی[۳] ۔ پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد صاحب کا بیان ہے کہ آغا صاحب نے اپنے آخری دور میں یہ بات انہیں بار بار کہی کہ میرے دو مشن تھے ۔ ایک یہ کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور دوسرا یہ کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے ۔ میرے یہ دونوں مشن پورے ہو گئے ہیں ۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ آپ میرے جنازے کو کندھا

۱۔ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد ص نمبر ۲۱۹

۲۔۳۔ بحوالہ حکیم آفتاب احمد قرشی شورش نمبر ص نمبر ۲۵

دیں گے اور میری قبر پر مٹی ڈالیں گے۔[1]

مشہور صحافی جناب زیڈ۔ اے سلہری آخری رات جب آغا صاحب کو دیکھنے گئے تو آغا صاحب نے انہیں وصیت کی کہ

" سلہری صاحب آپ گواہی دینا کہ میں مسلمان ہوں۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ اور میں رسول اللہ صلعم کا عاشق ہوں۔[2] "

اور سلہری صاحب نے یہ وصیت اپنے مضمون "میں گواہی دیتا ہوں کہ" کے عنوان سے لوگوں تک پہنچائی۔

جمعہ کی سہ پہر کو دوبارہ دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹروں کی بھرپور کوشش کے باوجود آغا صاحب جمعہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۷۵ء رات بارہ بج کر انتیس منٹ[3] پر خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

تعزیتی پیغامات

شورش کاشمیری کی وفات ایک قومی سانحہ تھا۔ اس سانحہ کو عوام الناس سے لے کر مختلف شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے یکساں طور پر محسوس کیا یہی وجہ ہے کہ اُن کی وفات پر نہ صرف سیاسی و صحافتی۔ بلکہ ادبی و شعری حلقوں کی طرف سے بھی گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ قومی اخبارات نے اُن کی وفات کی خبروں کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا شورش کاشمیری کی خدمات اور مقام کے بارے میں اداریئے اور شذرے لکھے۔ سیاسی رہنماؤں، ادبی شخصیات اور حلقوں نے تعزیتی قرارداد منظور کیں۔ شعراء نے منظومات میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ یوں شورش کاشمیری کی وفات پر تعزیتی تاثرات کا ایک بہت بڑا اثاثہ جمع ہو گیا۔ جس کا بنظرِ غائر مطالعہ شورش کی زندگی کو سمجھنے کا ایک اہم حوالہ ہے ان تعزیت پاروں کے پیچھے جو جذبہ کارفرما ہے وہ رسمی نہیں حقیقی ہے۔ جس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شورش کی وفات نے واقعی اپنے عہد کے ادبی، سیاسی، صحافتی اور شعری ماحول میں ایک بہت بڑا خلا پیدا کیا ان تعزیت ناموں کو درج ذیل عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ بحوالہ چٹان شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء پروفیسر ڈاکٹر افتخار احمد ص نمبر ۲۲۰

۲۔ نوائے وقت ۳۰ر اکتوبر ۱۹۷۵ء زیڈ۔ اے سلہری

۳۔ بحوالہ شورش نمبر یکم نومبر ۱۹۷۶ء مضمون آفتاب احمد قریشی صفحہ نمبر ۵۴

۱۔ قومی اخبارات کے اداریے، شذرے

۲۔ سیاسی شخصیات، قومی رہنماؤں اور ادبی مشاہیر کے تعزیتی پیغامات

۳۔ سیاسی جماعتوں اور ادبی حلقوں اور مذہبی و معاشرتی تنظیموں کی تعزیتی قرار دادیں

۴۔ شعراء کا منظوم خراجِ عقیدت

۱قومی اخبارات۔ آغا صاحب کی وفات پر جن اخبارات نے اداریے اور شذرے لکھے اُن کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

روزنامہ جنگ کراچی[1]۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور[2]۔ روزنامہ اعلان[3]۔ روزنامہ امروز[4]۔ اور انہی دنوں کے مساوات۔ مشرق۔ حریت وغیرہ روزنامے شامل ہیں۔

۲۔ آغا صاحب کی وفات پر جن سیاسی شخصیات، قومی رہنماؤں اور ادبی مشاہیر نے تعزیتی پیغامات بھجوائے اُن میں

چوہدری فضل الٰہی صدرِ پاکستان[5]۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو وزیرِاعظم پاکستان[6]۔ ابوالاعلیٰ مودودی[7]۔ صاحبزادہ فاروق علی سپیکر قومی اسمبلی[8]۔ بیگم اشرف عباسی ڈپٹی سپیکر قومی اسمبلی[9]۔ نواب محمد عباس عباسی گورنر پنجاب[10]۔ نواب صادق حسین قریشی وزیرِاعلیٰ پنجاب[11]۔ عبدالحمید خاں وزیرِاعظم آزاد کشمیر[12]۔ جناب ریاض الخطیب سفیر سعودی عرب پاکستان[13]۔ بیگم اختر سلیمان[14] بیگم جہاں آرا شاہنواز[15]۔ سید اصغر علی شاہ[16]۔ جناب ناصر علی رضوی ایم این اے[17]۔ جناب یوسف بچ[18] ڈاکٹر غلام جیلانی برق[19]۔ خواجہ محمد صفدر[20]۔ میاں خورشید انور ایم پی اے[21]۔ اور اے۔ کے سومار کراچی[22] خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

۳۔ جن سیاسی جماعتوں۔ ادبی حلقوں اور مذہبی و معاشرتی تنظیموں نے تعزیتی قرار دادیں منظور کیں ان میں مرکزیہ مجلس اقبال لاہور[23]۔ لائل پور یونین آف جرنلسٹس اور کونسل آف لائل پور ایڈیٹرز[24]۔ متحدہ جمہوری محاذ پاکستان لاہور[25]۔ جماعت اسلامی کراچی[26]۔ انجمن اہلِ پنجاب کراچی[27]۔ انجمن تحفظِ شہری حقوق و آزادی سانگلہ ہل[28]۔ ورکنگ جرنلسٹس ایسوسی ایشن گوجرانوالہ[29]۔ اخبار فروش یونین سیالکوٹ[30]۔ بار ایسوسی ایشن لائل پور (فیصل آباد)[31] پاکستان ینگ سٹوڈنٹس کونسل فیصل آباد[32]۔ تحریک طلبائے اسلام سیالکوٹ[33]۔ مجلس احرار اسلام بہاولپور[34]۔ خاکسار تحریک لاہور[35]۔ کے نام شامل ہیں۔

---

۱ سے ۴ بحوالہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۵ء۔ ۲۶ اکتوبر ۱۹۷۵ء۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۵ء۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۷۵ء

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

۴۔ جن شعراء نے انکا صاحب کو منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا اُن کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔
احسان دانش۔ آل احمد سرور۔ اشرف صبوحی۔ نعیم صدیقی۔ حبیب جالب۔ وقار انبالوی۔ قاضی محمد اسحاق حافظ سہارنپوری۔
نصرت پراچہ۔ اختر سدیدی۔ عافل کرنالی۔ احسان رانا۔ غلام رسول ازہر۔ علی جواد زیدی۔ اور حکیم سرو سہارنپوری۔

۵-۲۲ بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر
۲۳-۲۵ بحوالہ روزنامہ نوائے وقت ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۷۵ء
۲۹-۳۶ بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر

باب ۲

معاصرِ تحریکیں

انسانی شخصیت کی تعمیر میں ماحول اور توارث دو بنیادی عنصر ہیں۔ جن کے مطالعہ کے بغیر کسی شخصیت سے کامل آگاہی ناممکن ہے۔ جہاں تک توارث کا تعلق ہے۔ جس کا ذکر حالات زندگی میں آچکا ہے۔ یہاں ہمیں اُس ماحول کا جائزہ لینا ہے جس میں اُن کی ادبی۔ سیاسی اور صحافتی زندگی کی نشوونما ہوئی۔ ادب۔ سیاست اور صحافت میں جو تحریکیں چلیں اور اُن کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ آغا صاحب کی شخصیت کی تعمیر کا لازمی حصہ ہیں جنہیں تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ادبی تحریکیں

۲۔ سیاسی تحریکیں

۳۔ صحافت

ادبی تحریکیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد ہندوستان میں انگریزی تسلط قائم ہو جانے کی وجہ سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوا۔ اور ہندوستان کی سیاسی، سماجی۔ تہذیبی اور ادبی زندگی میں مغربی افکار و تعلیم اور مغربی تہذیب و تمدن کی بالادستی قائم ہوئی۔ علی گڑھ تحریک نے ان بدلتے ہوئے حالات کو اپنی قومی اور ملی فلاح کیلئے استعمال کیا۔ سر سید احمد خاں نے اپنی بصیرت سے یہ درست اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستانی اُس وقت تک ترقی نہیں کر سکتے جب تک کہ اُن کی اقتصادی اور تعلیمی حالت بدل نہیں جاتی۔ اُن کے نزدیک ہندوستانیوں کی پسماندگی کی وجہ اُن کی جہالت تھی۔ جس کے لئے ایک جامع تعلیمی منصوبہ بنایا گیا اور انہوں نے انگریز کے ساتھ تعاون۔ انگریزی تعلیم کے حصول اور انگریزی تہذیب و تمدن کو شرفِ قبولیت بخشا اور اس طرح جدید افکار و خیالات کیلئے ایک نئی اُمنگ اور نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اور ہندوستانیوں کے طرزِ فکر و عمل میں ایک انقلاب برپا ہوا۔ ادبی نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک ایک بہت بڑی تبدیلی تھی جس نے جدید خیالات کو ادب میں رواج دینے کیلئے شعوری کوششیں کیں جو قابلِ قدر ہیں۔

تحریکِ سرسید

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سرسید نے جس تحریک کی بنیاد رکھی اُسے عام طور پر عقل پسندی کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس سے مراد حقیقت تک پہنچنے کے لئے عقل کی راہنمائی ہے۔ یہ تصور سراسر مادی زندگی کا تصور تھا۔ کیونکہ ہندوستان کے سیاسی پس منظر میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل تھی کہ مسلمانوں کی مادی زندگی بہتر ہو۔ سرسید کی انگریزوں سے تعاون کی پالیسی بھی درحقیقت اسی نکتہ کی تفسیر ہے کہ انگریزوں سے زیادہ سے زیادہ فائدے اٹھا کر ہندوستان کے مسلمان اپنی اقتصادی

زندگی کو بہتر بنائیں ۔ یورپ میں عقل پسندی اُس زمانے کی خاص چیز تھی جس کو سرسید نے اپنی قوم کی فلاح کے خیال سے اپنایا ۔ اس طرح سے زندگی کی مادی قدروں کو ترقی دی اور زندگی کا مادی تصور روحانیت پر غالب آگیا ۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں ۔

"علی گڑھ کی تحریک ایک انقلابی تحریک تھی یہ ترقی پسند تحریک تھی ۔ یہ بادشاہت کے نشے کو اتار کر حقیقت کی تصویر دکھانا چاہتی تھی ۔ مذہب میں اقلیت ۔ سماجی زندگی میں رسم و رواج سے بیزاری ۔ تعلیم و تہذیب میں مغربیت اور اجتماعی اخلاق کی تلقین کے ذریعے سے اس نے انقلابی خدمات سرانجام دیں۔[۱]"

سرسید اور اُن کے رفقاءِ کار کے خلوص اور نیک نیتی میں کوئی [illegible] نہیں انہوں نے جس طرح سے قوم کی اصلاح اور تعمیر کرنی چاہی وہ بڑا ہی قابلِ قدر اور عظیم کارنامہ ہے لیکن جب اس تحریک کی

"مغرب دوستی انگریز پرستی بننے لگی[۲]"

تو اس تحریک کی مخالفت بھی شروع ہوگئی ۔ کیونکہ اِس تحریک کا مقصد مغربی تعلیم حاصل کرنے سے یہ ہرگز نہیں تھا کہ محض ڈپٹی کلکٹری حاصل کی جائے[۳] بلکہ تلاش و تحقیق کے ساتھ ساتھ قوم کے اخلاق کی اصلاح بھی تھا[۴]۔ مگر انگریزی تہذیب و تعلیم کی ملمع کاری نے تعلیم یافتہ طبقے کو مشرقی اقدار و مذہب سے دور کرنا شروع کر دیا جو صحت مند عمل نہ تھا جس کے خلاف شبلی اور رفقائے شبلی نے اس غیر صحت مندانہ عمل سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور مشرقی اقدار و مذہب کے احیاء کیلئے کوششیں شروع کیں جسے علی گڑھ تحریک کی مخالفت کا نام دیا جاتا ہے مگر بقول جناب عبدالقادر سروری

"شبلی علی گڑھ کالج کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ اس [illegible] کو ناپسند کرتے تھے جن پر یہاں کی تعلیم کا دار و مدار تھا ان کی رائے میں اس تبدیلی کا باعث نئے تعلیم یافتہ گروہ کے خیالات و مذہب اور روایات سے اسکی بیگانہ روی تھی[۵]"

۱ے مولانا شبلی کا درجہ اردو ادب میں ۔ عبداللطیف اعظمی مقدمہ آل احمد سرور ص نمبر ۱ شبلی اکادمی نئی دہلی

۲ے بحوالہ تنقیدی نقوش ۔ ڈاکٹر عبدالقیوم ص نمبر ۵۰ مشتاق بک ڈپو کراچی

۳ے بحوالہ تنقیدی نقوش ڈاکٹر عبدالقیوم ص نمبر ۵۰ مشتاق بک ڈپو کراچی

۵ے جدید اردو شاعری از عبدالقادر سروری ص نمبر ۱۴۳ کتب خانہ عزیزیہ حیدرآباد دکن

تاہم جہاں تک اِس تحریک کے ادبی پہلو کا تعلق ہے ۔ اُردو ادب پر اس کے اثرات نمایاں ہیں۔ تحریک سرسید سے پہلے اُردو زبان میں عبارت آرائی پر زیادہ توجہ دی جاتی تھی ۔ مگر تحریک سرسید کا مقصد چونکہ اصلاحی تھا اور وہ اپنا پیغام عوام تک پہنچانا چاہتے تھے لہٰذا انہوں نے اپنے پیغام کی روح کو سادہ اور عام زبان کے ذریعے لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کی اِس طرح اُردو ادب میں وہ سادگی اور سلاست پیدا ہوئی جسے بعد کو اردو زبان کا حسن کہا جانے لگا ۔ سرسید اور رفقائے سرسید کے پیشِ نظر زندگی کا مادی پہلو بھی رہا اور عقلیت کا غلبہ بھی انہوں نے زندگی کی تفسیر ایک خاص نقطۂ نظر سے کی اور ہر چیز کو عقلیت کی روشنی میں پرکھنے کی اس کوشش میں ٹھوس علمی مسائل اور اعلیٰ علمی و ادبی خیالات موضوع بنے مگر جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے ۔ اُسے آسان اور سادہ بنانے کی شعوری کوشش کی گئی ۔ اس طرح بقول سید عبداللہ

"سرسید اور ان کی جماعت کے لوگوں نے اردو زبان کو جو علمی اعتبار سے اس وقت ایک بے مایہ زبان تھی تھوڑے ہی عرصے میں اعلیٰ علمی جواہر ریزوں سے مالا مال کردیا۔[۱]"

انجمنِ پنجاب ۔ اس انجمن کے مشاعروں کی بنیاد مولانا محمد حسین آزاد نے ڈائریکٹر تعلیمات کے ایما پر ۱۸۷۴ء میں رکھی[۲] ۔ اس انجمن نے جس مشاعرے کی طرح ڈالی اس میں مصرعِ طرح کی بجائے کوئی موضوع دیا جاتا تھا جس پر شعراء طبع آزمائی کرتے اور غزل کی بجائے نظم مسلسل کہتے ۔ جن میں مولانا حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ کے نام خاص طور پر نمایاں ہیں ۔ اس انجمن نے پرانی شاعری میں جو خرابیاں تھیں انہیں دور کرنے کا تہیہ کیا ۔ نئے نئے خیالات ، نئے نئے مضامین اور نئی نئی ہیئتیں اپنانے پر زور دیا ۔ اظہار کی سادگی ۔ اصلیت ، صاف بیانیہ انداز اور مغربی وسعتِ نظر کو اپنا مقصد قرار دیا ۔ بقول مولانا حالیؔ

"اس مشاعرے کا مقصد یہ تھا کہ ایشیائی شاعری جو کہ درولستِ عشق اور مبالغے کی جاگیر ہو گئی ہے ۔ اس کو جہاں تک ممکن ہو وسعت دی جائے اور اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر رکھی جائے ۔[۳]"

غرض اس انجمن کے ارکان نے نیچر کی شاعری کی بنیاد رکھی جس میں مناظرِ فطرت کی تصویر کشی کی جاتی تھی ۔ نیچر کی شاعری میں انگریزی ادب

۱؎ سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقاء کی اُردو نثر کا فنی اور فکری جائزہ ص نمبر ۵ ڈاکٹر سید عبداللہ مکتبۂ کارواں لاہور

۲؎ بحوالہ تاریخِ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند جلد چہارم اردو ادب ص نمبر ۵۲

۳؎ کلیاتِ نظمِ حالیؔ ۔ مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ۔ دیباچہ نظم حالی از مولانا حالی ص نمبر ۱۵ مجلسِ ترقیِ ادب لاہور

کے اثرات کو دخل تھا۔ مگر اردو ادب میں بھی پہلے ہی سے ایسی طرز موجود تھی جو نئی شاعری کیلئے اپنائی گئی اگرچہ پرانے ادب میں بھی کوئی منظم کوشش نہ تھی۔ انیس کے مراثی اور نظیر اکبر آبادی کی اُن نظموں میں جنہیں عام طور پر عامیانہ کہا جاتا تھا۔ فطرت کی یہ عکاسی جو نئی شاعری کا طرۂ امتیاز تھا صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے بلکہ قصیدے کی تشبیب اور پرانی مثنویوں میں بھی اس قسم کے مناظر کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں بہر حال یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ نظم خیالات کے اظہار کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں بڑی وسعت ہے اور فنِ شعر کی پابندیاں بھی اتنی کڑی نہیں جس کی وجہ سے خیالات کو یکساں مہارت کے ساتھ مسلسل اور مربوط طریقہ سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ انجمن پنجاب کے یہ مشاعرے صرف دس مہینے تک جاری رہ سکے[1] اس کے بعد یہ مشاعرے بند ہو گئے۔ مگر ان دس مہینوں میں اس انجمن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور نیچرل شاعری کو قبولِ عام کا درجہ مل گیا۔ شاعروں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کئے اور انگریزی نظم کی تقلید بھی کی۔ مولانا محمد حسین آزاد تو بہر حال اِس نیچرل شاعری کے بانی تھے[2] مگر مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی نظموں سے جو انہوں نے اِس مشاعرے میں پڑھیں۔ نئی شاعری کو وہ مضبوط بنیادیں فراہم کر دیں جس کی پیروی میں آئندہ جدید نظم کی عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ

"وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر اور نظمِ جدید کے پیشوا تھے۔"[3]

مولانا حالی انجمنِ پنجاب کے صرف چار مشاعروں میں شریک ہوئے اور ان میں صرف چار نظمیں برکھا رت۔ نشاطِ امید۔ حُبِ وطن۔ اور مناظرۂ رحم و انصاف پڑھیں۔ لیکن اس کے بعد مولانا حالی نے جو کچھ لکھا وہ نظمِ جدید کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے خاص طور پر اُن کی مشہور مثنوی مسدسِ حالی اُردو ادب میں اب بھی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

"مسدس حالی سے بلاشبہ اُردو شاعری کی تاریخ میں قومی شاعری کی تحریک کو بڑی تقویت پہنچی۔"[4]

۱۔ بحوالہ مقالاتِ آزاد مرتبہ محمد باقر ص نمبر ۴۳ مجلس ترقی ادب لاہور

۲۔ بحوالہ مقالاتِ آزاد مرتبہ محمد باقر ص نمبر ۳۰۴ مجلس ترقی ادب لاہور

۳۔ کلیاتِ نظم حالی دیباچہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی ص نمبر ۲۵

۴۔ آج کا اردو ادب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص نمبر ۶۱/۶۲

اس کے مقابلے میں مولانا محمد حسین آزاد جو کہ جدید شاعری کے معمار ہیں جدید شاعری میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جو مقام مولانا حالی کا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جو رائے قائم کی ہے وہ بڑی دقیع معلوم ہوتی ہے کہ

"اُن کی نثر نگاری کی شہرت اور اُن کی بعض نثری تصانیف کی مقبولیت اور اہمیت نے ان کی شاعری کو نمایاں نہیں ہونے دیا ایک خیال یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری دراصل ان کی نثر کے مقابلہ میں روکھی پھیکی اور کمتر درجہ کی ہے۔"[1]

اس کے باوجود مولانا محمد حسین آزاد کا اردو ادب میں یہ اعزاز ہمیشہ برقرار رہے گا کہ انہوں نے انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کی طرح ڈالی اور شاعری کو ایک نئے آہنگ اور نئی روش سے روشناس کرایا۔ انجمنِ پنجاب کے مشاعروں کی بنیاد کا خیال مولانا محمد حسین آزاد کی جودتِ طبع کا نتیجہ تھا لیکن کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب کی تائید بھی اس میں شامل تھی۔[2] انجمنِ پنجاب کی تحریک انگریز کے مخصوص مقاصد کی ترجمانی کیلئے وجود میں آئی تھی بعد کو مولانا محمد حسین آزاد کی تحریک پر اس کے ادبی مقاصد بھی قرار پائے جو ظاہر ہے انگریز کے بنیادی مقاصد سے متصادم نہیں ہو سکتے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر انوارالدین سدید صاحب اپنے مقالہ میں فرماتے ہیں کہ

"آزاد کی زندگی میں سیاست کا عمل دخل تو موجود ہے اور وسطِ ایشیا کا جان گسل سفر کسی سیاسی نصب العین کی تکمیل کیلئے ہی اختیار کیا تھا۔ تاہم ان کی ادبی تحریک کے پسِ پشت کوئی مقصد پوشیدہ نظر نہیں آتا۔ للہٰذا یہ کہنا درست ہے کہ آزاد نے انگریزی سے استفادہ کی تحریک کی تو اس کا مقصد خالصتاً ادب کی تعلیم اور اردو کو نئے خیالات کی انجمن مہیا کرنا تھا۔"[3]

ڈاکٹر انوارالدین سدید صاحب کی اس رائے کو درست تسلیم کرنے سے پہلے ہمیں انجمنِ پنجاب کے سیاسی اور ادبی پس منظر کا جائزہ لینا ہوگا۔ بقول آغا محمد باقر

---

[1] آج کا اردو ادب — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — ص نمبر ۷۶

[2] بحوالہ کلیاتِ نظمِ حالی — دیباچہ از مولانا حالی — ص نمبر ۵۱

[3] مقالہ اردو ادب کی تحریکیں — از محمد انوارالدین سدید — ص نمبر ۴۱۶

"دارالسلطنت پنجاب یعنی لاہور میں ۲۱ فروری ۱۸۶۵ء کو سکشا بھا کے مکان (راجہ دھیان سنگھ کی حویلی)
میں ایک تاریخی جلسہ ہوا۔ لاہور کے علم دوست حضرات اور رؤسا نئی نئی امیدیں اپنے دلوں میں
لے کر بڑے شوق سے اس میں شریک ہوئے ظاہر ہے یہ جلسہ سرکار انگریزیہ کے ایما سے منعقد ہوا تھا۔[۱]"

لاہور کیلئے یہ انجمن جس کا نام پنڈت من پھول اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر نے انجمن مطالب مفیدۂ پنجاب رکھا تھا[۲]۔ انگریز کا کوئی خاص تحفہ نہ تھا بلکہ اس قسم کی انجمنیں قائم کرنا حکومت کی پالیسی کا حصہ تھا۔ اور یہ کام ایک تحریک کی صورت شروع کیا گیا[۳]۔ انگریز کی نظر میں اس انجمن کی کیا اہمیت تھی اس کا اندازہ آغا محمد باقر کے ان الفاظ سے لگایا جا سکتا ہے۔

"گورنمنٹ جو قانون نافذ کرنا چاہتی، انجمن کے ممبروں سے اس کے متعلق رائے لی جاتی یوں سمجھ لیجئے
کہ انجمنِ پنجاب آج کل کی قومی اسمبلی تھی۔[۴]"

ڈاکٹر لائٹنر نے ۷۔اپریل ۱۸۶۵ء کو انجمنِ پنجاب کے جلسہ میں اس انجمن کے اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"مطلب اِس انجمن کا صرف رفاہ و فلاحِ خاص و عام و سرکارِ انگریزی ہے۔[۵]"

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات تو ثابت ہے کہ اِس انجمن کی بنیادیں سیاسی تھیں۔ اب سوال یہ ہے کہ انجمن پنجاب کے مشاعرے جن کا آغاز ۱۸۷۴ء میں کیا گیا تھا کیا مقاصد رکھتے تھے جس کو سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ بقول فتح محمد ملک

"اِس زمانے میں انگریز کی سیاسی مصلحت یہ تھی کہ اردو شاعر اور اس کا قاری اہم عصر زندگی کو بے نقاب
نہ دیکھ پائے اگر شاعر اہم عصر زندگی سے موضوعات چننے گا تو تباہی، ذلت اور بے اطمینانی کے مظاہر
اس کی توجہ کا مرکز بنیں گے۔[۶]"

۱۔ مقالات آزاد — آغا محمد باقر — دیباچہ — ص نمبر ۱۱

۲و۳۔ بحوالہ مقالات آزاد — آغا محمد باقر — دیباچہ — ص نمبر ۱۲

۴۔ مقالات آزاد — آغا محمد باقر — ص نمبر ۱۳

۵۔ مقالات آزاد — آغا محمد باقر — ص نمبر ۹۷

۶۔ مجلہ فنون اپریل ۱۹۶۳ء نئی اور جدید شاعری — فتح محمد ملک — ص نمبر ۵۵

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی ادیب یا شاعر اپنے ماحول سے دامن نہیں بچا سکتا وہ تشبیہات و استعارات فارسی کے استعمال کرے یا بھاشا کے انگریزی تراکیب ہوں یا ہندی کے محاورے۔ وہ غزل کہے یا نظم۔ کہانی سنائے یا افسانہ وہ اپنے گرد و پیش کی کیفیت و ماحول سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کوئی نہ کوئی اشارہ غیر شعوری طور پر ہی سہی ایسا ضرور آجائے گا جو اُس کے ماحول کو بے نقاب کردے گا یوں محسوس ہوتا ہے کہ انجمنِ پنجاب کے پیشِ نظر یہی بات تھی کہ شعر و ادب میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ہندوستان میں انگریز کی کارگزاریوں کی عکاسی نہ ہونے پائے۔ لہٰذا اس کے لئے ایک شعوری اور منظم کوشش کی گئی کہ شعراء صرف مناظرِ فطرت کو اپنا موضوع بنائیں۔ جسے نیچری شاعری کے نام سے پکارا جائے۔ انگریزی ادب میں مناظرِ فطرت کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے جو ہندوستان کے انسانوں کیلئے بھی اتنا ہی مفید ہو سکتا ہے، جتنا انگلستان کے لوگوں کیلئے مگر اُس کی تقلید کی دعوت نہیں دی گئی اگر ترغیب دی گئی تو صرف مناظرِ فطرت کی عکاسی کی کہ بے ضرر تھی۔ ورنہ انسانی زندگی کی تفسیر و تعبیر انسان کے لئے مناظرِ فطرت سے بڑی حقیقتیں ہیں جس میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ مولانا حالی اور محمد حسین آزاد سے زیادہ اِس حقیقت سے کون آشنا ہوگا مگر ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ اپنے عہد کے مزاج کے ترجمان تھے۔ انگریزی حکومت سے تعاون اور وفاداری اُس زمانے کے تقاضے تھے۔ جنہیں بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ محمد حسین آزاد کا یہ خیال کہ انگریزی سے نئے نئے خیالات حاصل کئے جائیں، انگریزی ادب کی تقلید کی طرف ایک قدم تھا اپنی تقلید کسے پسند نہیں ہوتی لہٰذا اس انجمن کے مشاعرے شروع کرنے میں اگر یہ بنیادی بات پیشِ نظر نہ ہوتی تو انگریز کبھی بھی سرکاری طور پر ان مشاعروں کی سرپرستی نہ کرتا۔ اور پھر ان خیالات و مضامین کی نشر و اشاعت ایک مؤثر سرکاری رسالہ کے ذریعے کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ انگریزی حکومت ان خیالات و اشعار کو اپنے اور اپنی حکومت کیلئے مفید سمجھتی تھی جس کا اظہار اس انجمن کے جلسوں اور مشاعروں میں ہوتا تھا۔ اور بڑے بڑے سرکاری عہدیداران اور امراء و رؤسا انگریز کی خوشنودی کے لئے اس انجمن سے تعاون کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں ہندوستان میں یہ طبقہ سمجھتا تھا کہ انگریز سے تعاون اور تقلید ہی تمام مسائل کا حل ہے۔ وہ انگریزی تعلیم، تہذیب و معاشرت سب کی برتری کا قائل تھا۔ اور اس تعلیم کو اپنی قومی اور ملی فلاح کا وسیلہ سمجھتا تھا جب کہ انگریز کا سیاسی مقصد صرف یہ تھا کہ اس تعلیم سے ایسے ہندوستانی پیدا کئے جائیں جو ذہنی اور فکری طور انگریز کے ہمنوا ہوں۔ اور یہ مقصد اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک کہ مشرقی روایات اور تہذیب و ثقافت کے خلاف خود ہندوستان میں ایسا ذہن پیدا نہیں ہو جاتا جو ان اقدار کو کمتر سمجھے اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے لہٰذا اسی مقصد کے حصول کیلئے اس قسم کی انجمنیں قائم ہوئیں۔ جن کے مقاصد سیاسی تھے مگر

انہوں نے اصلاحِ معاشرہ۔ فلاحِ عامہ اور ادب و ثقافت کے فروغ کا نقاب اوڑھ رکھا تھا۔ ڈاکٹر شمیم حنفی اپنے مقالے "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" میں اس حقیقت کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں کہ

"انجمنِ پنجاب فی الاصل ایک سیاسی اور سماجی تنظیم تھی اور مناظمے اس کے سماجی پروگرام کا ایک جزو۔ اسی لئے حالی اور آزاد جدید شاعری کے اصول و معیار کے قیام میں انجمن کے بنیادی مقاصد کی گرفت سے چھٹکارا نہیں پا سکے۔ اور اپنی خارجیت کے سبب یہ مقاصد حالی اور آزاد کی نظموں میں ان کی سالمیت کا حصہ بھی نہیں بن سکے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بیشتر نظمیں نہ تو مغربی ادب کے معیار کی تشفی کرتی ہیں نہ مشرقی شاعری کی شرائط پوری کرتی ہیں کہ حالی اور آزاد دانستہ طور پر انہیں مشرقی شاعری کی مروجہ روایات سے الگ کرنا چاہتے تھے[1]"

لہٰذا ڈاکٹر انوار الدین سدید کی یہ رائے قبول نہیں کی جا سکتی کہ اس تحریک کا مقصد خالصتاً ادب کی تغلیب تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز نے اپنے سیاسی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے ایک ادبی انجمن قائم کی جسکی وجہ سے آگے چل کر اُردو ادب کو فائدہ پہنچا بالکل اسی طرح جس طرح فورٹ ولیم کالج کے اردو ادب پر مفید اثرات پڑے تھے انجمن پنجاب کے یہ مناظمے اگرچہ جلد ختم ہو گئے مگر اردو ادب پر اس کے اثرات بڑے دیرپا ثابت ہوئے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے نظمِ جدید کی جو بنیاد رکھی تھی۔ انہوں نے اس انجمن میں اُس کے عملی نمونے بھی پیش کئے تھے۔ اسی طرح مولانا الطاف حسین حالی نے بھی اپنی نظموں کے ذریعے سے اس نئی شاعری میں عمدہ مثالیں قائم کر دی تھیں حالی اور آزاد کی نظمیں جو ان مشاعروں میں پڑھی گئیں زیادہ تر مناظرِ فطرت کے موضوع سے متعلق ہیں۔ گویا اس نئی شاعری میں داخلیت کی بجائے خارجیت پر زور دیا گیا ہے۔ اور فطرت کے حسین مناظر کی عکاسی سادگی اور اصلیت کو برقرار رکھتے ہوئے کی گئی۔ اور کچھ انگریزی کی نظموں کے تراجم بھی ہوئے جو اگرچہ وقیع نہیں مگر اردو ادب میں ایک نئی چیز ضرور ہیں۔ نیچری شاعری کی یہ روش اگرچہ تا دیر نہ چل سکی تاہم جدید نظم نے جو پیرایۂ اظہار اردو ادب کو دیا تھا وہ بہت مقبول ہوا۔ انگریزی خیالات کے استفادے سے زبان و ادب میں وسعت اور رنگا رنگی پیدا ہوا، نیچرل مضامین کی بجائے موضوعات میں تنوع پیدا ہوا اور ہر موضوع پر نظمیں کہی

---

[1] جدیدیت کی فلسفیانہ اساس۔ ڈاکٹر شمیم حنفی ص نمبر ۵۱۔ ۷۴ مکتبہ جامعہ نئی دہلی

جانے لگیں۔ تحریک علی گڑھ کے زیر اثر انجمنِ پنجاب کے اس زمانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زندگی کی مادی حقیقتوں کو ہی زندگی کا حاصل سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی حقیقت کے پیشِ نظر زندگی کی اخلاقی، سیاسی، تہذیبی، سماجی اور مذہبی اقدار کو عقل کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جذبہ کی بجائے عقل کی حکمرانی تسلیم کی گئی۔ اور فرد کی انفرادیت کی بجائے اجتماعیت کا رخ کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں اس زمانے کے ادب میں عقل کا غلبہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اور جذبے کی بھٹی اگر سرد نہیں ہوئی تو دھواں دیتی ہوئی ضرور نظر آتی ہے۔ اور نظم کے ساتھ غزل میں بھی تبدیلی پیدا ہو گئی۔ کیونکہ غزل جس سے جذبات کی عکاسی کا کام لیا جاتا تھا۔ اب نئے نئے موضوعات کی ترجمانی کے لئے بھی استعمال ہونے لگی۔ جس میں جذبات سے زیادہ عقل کا عمل دخل تھا۔ اور یہ کام مولانا حالی نے خاص طور پر سرانجام دیا۔ بقول ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

"حالی کی غزل ذاتی معاملات اور شخصی واردات سے آگے بڑھ کر انسانیت۔ مسائلِ حیات۔ سماجی اصلاح، سیاسی و تاریخی و قومی مسائل اور فلاحِ ملت کے موضوعات سے متعلق ہو گئی [۱]"

انجمنِ پنجاب کے مناظمے جو ۱۸۷۴ء میں شروع ہوئے وہ تقریباً ایک سال کے اندر اندر ختم ہو گئے۔ مگر اس انجمن کے جلسوں میں جو ادبی، اصلاحی اور تہذیبی مضامین پڑھے جاتے تھے ان کا سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ جس کا آغاز انجمن کے قیام کے ساتھ ہی ۱۸۶۵ء سے شروع ہو گیا تھا۔ مولانا محمد حسین کے یہ مضامین آغا محمد باقر کے مرتبہ مقالات آزاد میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے علاوہ بھی بہت سے لوگوں نے ان مجالس میں مختلف قسم کے مضامین پڑھے جس کی نشر و اشاعت کا سرکاری طور پر معقول انتظام تھا۔ بقول آغا محمد باقر

"یہ مضامین اس قدر مقبول ہوا کرتے تھے کہ ملک کے اکثر رسالوں میں انہیں نقل کیا جاتا تھا [۲]"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد ایک صاحبِ طرز ادیب تھے۔ اور اردو ادب میں ان کا بلند مقام اُن کی نثر نگاری

---

[۱] تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ جلد نمبر ۱۔ اردو ادب شمس الدین صدیقی ص نمبر ۵۸

[۲] مقالاتِ آزاد دیباچہ آغا محمد باقر ص نمبر ۱۶/۱۷

کی وجہ سے ہے۔ مگر آغا محمد باقر نے جن مضامین کا ذکر کیا ہے۔ اُن میں وہ ادبی شان نہیں ہے۔ جو بعد کی تصانیف میں نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محمد صادق ان مضامین کو کوئی ادبی مقام نہیں دیتے۔[1] شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اِس نثر کا تعلق محمد حسین آزاد کے ابتدائی دور سے ہے۔ اس دور میں انہوں نے زیادہ تر توجہ نصابی کتب کی تیاری پر صرف کی۔ جو اُن کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تاہم اِس دور میں اور اس سے پہلے علی گڑھ تحریک کے زیر اثر نثر نے بھی ترقی کی طرف قدم بڑھایا۔ خاص طور پر مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی علمی اور ادبی نثر میں جو سادہ اسلوب اختیار کیا۔ اس کے اثرات بڑے دور رس تھے اور بعد میں آنے والے نثر نگاروں کے لئے مشعلِ راہ بھی علی گڑھ تحریک اور انجمنِ پنجاب کی خاص عقلی تحریک کو اگرچہ قدر کی نظر سے دیکھا گیا مگر مقبولیت کے ساتھ ساتھ اِس کی مخالفت بھی ہوتی رہی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد سر سید احمد خاں نے انگریزی حکومت سے تعاون، قوم کی مادی فلاح، اخلاقی اصلاح اور روشن خیالی کی جو روش اختیار کی تھی وہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی جس سے بڑے فائدے حاصل ہوئے۔ زندگی کو عمل کا نام دیا گیا اور زندگی کے ہر شعبہ میں عقل و فکر کو معیار بنایا گیا اور ادب میں بھی عقل و دانش نے غلبہ پایا۔ جس کے خلاف ردِ عمل کے طور پر رومانوی تحریک معرضِ وجود میں آئی۔

رومانوی تحریک رومان کی اصطلاح کوئی واضح اور متعین مفہوم نہیں رکھتی اور نہ ہی اس کی کوئی تعریف ممکن ہے پروفیسر علی عباس جلالپوری کے مطابق

> "رومیوں کے دورِ تسلط میں فرانس میں جو ملکی زبان ظہور پذیر ہوئی اُسے "رومانا لنگوا" کا نام دیا گیا یہ عوام کی بولی تھی۔ اس میں جو قصے لکھے گئے وہ رومان کہلائے۔[2]"

ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق "رومان کا لفظ رومانس سے نکلا ہے۔ جو عشق و محبت کی اُن کہانیوں کیلئے استعمال ہوتا تھا۔ جو دورِ وسطیٰ کے نوجوانوں کی مہمات کے متعلق ہوتی تھیں۔"[3] اسی بنا پر ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے اس لفظ کے تین مفہوم بتائے ہیں۔

---

1. بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند۔ ڈاکٹر محمد صادق۔ ص نمبر ۳۴۴
2. کلاسیکیت اور رومانیت مرتبہ یوسف زاہد۔ پروفیسر علی عباس جلال پوری ص نمبر ۸۳
3. بحوالہ کلاسیکیت اور رومانیت مرتبہ یوسف زاہد ڈاکٹر محمد حسن ص نمبر ۹۷ خلوت کدہ لاہور

"۱۔عشق و محبت سے متعلق تمام چیزوں کو رومانوی کہا جانے لگا۔

۲۔غیر معمولی آراستگی۔شان و شکوہ۔آرائش۔فراوانی اور محاکاتی تفصیل پسندی کو رومانوی کہنے لگے۔

۳۔عہد وسطیٰ سے وابستہ تمام چیزوں کو قدامت پسندی اور ماضی پرستی کو رومانوی کا لقب دیا گیا۔"[1]

مندرجہ بالا مفاہیم کی رو سے رومانیت کے اجزا عشق و محبت، شان و شکوہ اور ماضی پرستی ہیں مگر ڈاکٹر سید عبداللہ نے رومانیت میں مندرجہ ذیل اجزاء کا اضافہ کیا ہے۔اُن کے نزدیک

"۱۔رومانیت کلاسیکیت اور حقیقت پسندی کی ضد ہے۔

۲۔رومانیت میں جذبے اور وجدان کو اوّلیت حاصل ہے۔

۳۔رومانیت روایت کی پیروی سے زیادہ بغاوت اور جدّت کا رجحان رکھتی ہے۔

۴۔رومانی ادب میں حقائق واقعی کی بجائے خوش آئند تخیّلات اور طلسمی ماحول کی عکاسی ہوتی ہے۔

۵۔طبیعت کی بے قراری اور ذوق شوق کی شدت رومانی مزاج کی خصوصیت ہے۔

۶۔انانیت کا اظہار بھی رومانیت کی ایک علامت ہے۔"[2]

ڈاکٹر محمد حسن اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے رومانیت کے جن اجزاء کا ذکر کیا ہے۔یہ درحقیقت رومانی ادب کی خصوصیات ہیں لہٰذا جس فن پارے میں مندرجہ بالا خصوصیات زیادہ ہوں ہم اُسے رومانی ادب کہہ سکتے ہیں۔اگرچہ رومانیت کے یہ اجزا حتمی نہیں مگر عام طور پر رومانیت سے جو مراد لی جاتی ہے وہ اس سے باہر نہیں ہوتی۔رومانیت اُردو ادب میں ایک مخصوص زاویۂ نظر ہے۔جسے مغربی رومانیت کے ساتھ نہیں ملانا چاہیئے۔مغربی رومانیت کے اجزائے ترکیبی اردو ادب کی رومانیت سے ملتے ہوئے بھی مختلف ہیں کہ ان کا استعمال ایک خاص اعتدال اور توازن سے ہوا ہے۔جس کی ایک طویل روایت پہلے سے مشرقی ادب میں موجود تھی۔لہٰذا ڈاکٹر محمد حسن صاحب کا یہ کہنا درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] کلاسیکیت اور رومانیت مرتبہ یوسف زاہد ڈاکٹر محمد حسن ص نمبر ۹۷، ۹۸

[2] بحوالہ مباحث ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۲۰۰ مجلس ترقی ادب لاہور

"روسو۔ شیلے اور ورڈز ورتھ اور دستاوسکی کی یہ روایت اُردو ادب میں مغربی اثرات کی بنا پر شروع ہوئی۔"[1]

بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں

"رومانیت کی بنا اسلام کے وقت سے پڑی جو کلاسیکی تہذیب کے خلاف زبردست ردِ عمل تھا۔ ازمنہ وسطیٰ میں یہ اسلامی اثر مختلف رویّوں سے اہل یورپ کی زندگی کو متاثر کرتا رہا۔ اصلاح مذہب کی تحریک پر تو اس کا اثر خود یورپ کے محقق بھی مانتے ہیں اسلام انسان کی آزادی کا پیغام تھا جس کا اظہار یورپ میں مختلف صورتوں سے ہوا۔"[2]

لہٰذا مغربی رومانیت کو اگر مشرقی معیار پر پرکھا جائے تو اس میں بے اعتدالی اور کج روی نظر نہیں آتی۔ پروفیسر علی عباس جلال پوری نے اپنے ایک مضمون میں مغربی دانشوروں کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں جو مغربی رومانیت پر کڑی تنقید کا درجہ رکھتے ہیں جس کا خلاصہ پروفیسر صاحب کے الفاظ میں یہ ہے۔

"رومانی نظریۂ حیات انسان کی انا پرستی کی تخلیق ہے۔ جو ادب میں کج روی۔ فلسفے میں خرد دشمنی عمران میں نرگسیت۔ سیاسیات میں استبداد اور مذہب میں تشبیہ کی تقویت کا باعث ہوتا ہے۔"[3]

پروفیسر علی عباس جلال پوری نے جن مفکرین کے اقوال سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ ان کے پیش نظر مغربی ادبیات اور مغرب کے رومانیت پسند ایسے ادیب تھے۔ جنہوں نے یقیناً ادب میں کج روی سے کام لیا ہوگا۔ لیکن اردو ادب میں رومانی ادیب اور شاعر بڑا ہی راست رو نظر آتا ہے۔ جس کی ایک بڑی خصوصیت بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں یہ ہے کہ

"وہ جذبات و تخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتا ہے وہ اپنے اندرونی ترنم کی ساری صلاحیتوں کو اپنی روح کے گرد مرکوز کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس میں ایک طرح کی انفرادیت پسندی

---

1. تنقیدی مقالات مرتبہ مرزا ادیب ڈاکٹر محمد حسن ص نمبر ۱۱۹
2. روحِ اقبال۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص نمبر ۸۷ آئینہ ادب لاہور
3. کلاسیکیت اور رومانیت مرتبہ یوسف زاہد علی عباس جلال پوری ص نمبر ۹۴

اور دروں بینی کا پیدا ہونا لازمی ہے وہ اپنے دل کی امنگوں اور حوصلوں کو دبا تا نہیں اس کی بے چین طبیعت
اکتا دینے والے موجود پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں اپنی منشا کے مطابق تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے اس
کی آرزؤں اور ارمانوں کی کوئی حد نہیں۔ یہی رومانیت کی بنیاد ہے جس پر سارا رومانی آرٹ مبنی ہے۔
لیکن اس کے معنی حقیقت سے گریز نہیں بلکہ اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی خواہش کے ہیں۔[1]

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں اردو ادب میں جب یہ تحریک شروع ہوئی۔ اُس وقت ادب پر حقیقت پسندی، مادہ پرستی اور عقل و خرد کا غلبہ تھا۔ سیاسی طور پر حالات اس بات کے متقاضی تھے کہ مغربی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون سے نئی روشنی حاصل کی جائے۔ جس میں قوم کی فلاح اور اس کی اصلاح کا پہلو مضمر تھا۔ لہٰذا جب کچھ عرصے کے بعد رومانیت پرستوں پر یہ بات کھلی کہ قوم و ملک کی فلاح و اصلاح کا عمل سست ہے تو انھوں نے فراریت کی بجائے اس میں تبدیلی کی خواہش کی جسے عام طور پر تحریک سرسید کا ردِعمل کہا جاتا ہے۔ ملک و قوم کی فلاح اور آزادی کے حصول کیلئے جو نیا زاویہ نظر اپنایا گیا۔ اسے رومانیت کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ اور رومانیت کا یہ دور ۱۹۰۰ء سے لیکر ۱۹۳۵ء تک پھیلا ہوا ہے[2]۔ اس دور کا آغاز شیخ عبدالقادر کے ادبی مجلہ مخزن سے ہوتا ہے۔ جس میں لکھنے والوں نے پہلی مرتبہ یہ محسوس کیا کہ انسان صرف گوشت پوست کا مجسمہ نہیں بلکہ لطیف و نازک احساسات کا مجموعہ بھی ہے جس طرح اُسے اپنے مادی وجود کی آسائش کیلئے مادی چیزوں کی ضرورت ہے اُسی طرح اُس کے لطیف اور نازک جذبات کی آسودگی کیلئے بھی سامان ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ مخزن میں لکھنے والوں نے سرسید دور کی مادیت پرستی اور خالص فکری روش میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا اضافہ کردیا۔ مخزن میں لکھنے والے ادیبوں کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ نے بالکل درست لکھا ہے کہ

"یہ ایک انسانیاتی تحریک تھی جس نے عقل اور جذبے کی مفاہمت کے نئے موقعے پیدا کئے۔"[3]

تحریک سرسید کے خلاف ردِعمل میں بلاشبہ اودھ پنچ[4] اور اکبر الہ آبادی کے نام بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ جنھوں نے طنز کے مخصوص

---

[1] روحِ اقبال — ڈاکٹر یوسف حسین خان — ص نمبر ۸۱

[2] بحوالہ مباحث — ڈاکٹر سید عبداللہ — ص نمبر ۲۸۹

[3] مباحث — ڈاکٹر سید عبداللہ — ص نمبر ۲۸۹

[4] منشی سجاد حسین مرحوم نے لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ نکال کر ہندوستانی اخبار نویسی اور ادب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

لہجہ میں اپنا رنگ خوب جمایا مگر اس دور کے اہم ترین نام علامہ اقبالؔ ۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ اور مولانا ظفر علی خاں کے ہیں ۔ جن کے اثرات اس دور کے شعر و ادب میں نمایاں ہیں اور نہیں معلوم کہ یہ اثرات کب تک باقی رہیں ۔ علامہ اقبالؔ ۔ مولانا ابوالکلام آزادؔ اور مولانا ظفر علی خاں کے افکار و ادب کی ایک مشترک خصوصیت ماضی سے وابستگی اور اس کا احیاء ہے ۔ جو روحانیت پسندوں کی ایک خصوصیت بھی ہے ۔ جس کی بنا پر انہیں رومانوی ادب میں جگہ دی جاتی ہے ۔ لیکن ان ادیبوں اور شاعروں نے ماضی سے دلبستگی کی خصوصیت کا استعمال ایک خاص مقصد کیلئے اور خاص ماحول کے زیر اثر کیا ہے ۔ عام طور پر ماضی پرستی انفعالی کیفیت اور فراریت کی نشانی سمجھی جاتی ہے ۔ مگر ان ادیبوں کے ہاں سماں ہی اور ہے ۔ انہوں نے اگر اپنے ماضی کے شاندار کارناموں پر فخر کیا ہے تو قوم کو یہ بتانے کے لئے کہ جدوجہد ' عمل اور کوشش سے وہ سنہری زمانہ پھر واپس آ سکتا ہے ۔ درحقیقت جب وہ گزرے ہوئے زمانے کے نوحہ خواں نظر آتے ہیں ۔ تو انہی نوحوں میں ٹیپ کا بند مستقبل کے طربیہ کا سراغ بھی دیتا ہے ۔ لہٰذا ان تینوں راہنماؤں کا مقصد ماضی پرستی نہیں بلکہ ماضی سے عبرت حاصل کر کے مستقبل کی تعمیر کے لئے جدوجہد اور کوشش کرنا ہے ۔ جو ایک فعال روش اور مثبت اندازِ فکر ہے ۔ شیخ محمد اکرم نے اپنی کتاب موجِ کوثر میں مولانا ابوالکلام آزادؔ ' علامہ اقبالؔ ' مولانا ظفر علی اور محمد علی کو بھی اس کیلئے موردِ الزام ٹھہرایا ہے کہ

"جو بزرگ رہتے تھے بیسویں صدی کے جدید ہندوستان میں اور خواب دیکھتے تھے قرونِ وسطیٰ کے ' اور کہتے تھے کہ صرف روحانی ' اخلاقی اور مذہبی اصولوں میں ہی نہیں بلکہ علمی ' درسی اور معاشرتی جزئیات میں بھی قرونِ اولیٰ کی پیروی کی جائے ۔"[1]

اس اقتباس میں آدھی صداقت ہے مگر وہ بھی اس اضافے کے ساتھ کہ یہ بزرگ روحانی ۔ اخلاقی اور مذہبی اصولوں کو اپنی بیسویں صدی میں تیرہ سو سالہ پرانی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے ۔ کیونکہ مسلمانوں کے یہ اصول بدلے نہیں جا سکتے ۔ جہاں تک ان کے قول کے دوسرے حصے کا تعلق ہے کہ یہ بزرگ علمی ' درسی اور معاشرتی جزئیات میں بھی قرونِ اولیٰ کی پیروی چاہتے تھے تو اس میں کوئی صداقت

بقیہ حاشیہ — اردو پر احسانِ عظیم کیا نثر کی ایک خاص شان پیدا کی ۔ مذاق و ظرافت جس سے اب تک ہمارا ادب خالی تھا ' داخلِ نثر ہوئے ۔ — تاریخِ ادبِ اُردو ۔ رام بابو سکسینہ ۔ ص نمبر ۱۷

[1] موجِ کوثر — شیخ محمد اکرام — ص نمبر ۲۹۳

نہیں بلکہ شیخ صاحب خود ہی اپنی اس کتاب میں اس کی تردید فرماتے ہیں۔

"اقبال کورانہ تقلید کا مخالف ہے۔ اس کے علاوہ ا۔۔ مغربی تمدن میں ایسے عناصر نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اس کی قدر و قیمت کم کر دی ہے۔ لیکن وہ تہذیبِ مغرب اور مادی ترقیوں کے خلاف نہیں بلکہ اس کا تو کہنا ہے کہ ہمیں اپنی قومی روایات اور روحانی سرمایہ کو محفوظ کرتے ہوئے مادی دنیا کو تسخیر کرنا چاہیئے۔ وہ نہ مغرب کا پجاری ہے اور نہ مغرب کا مخالف۔ اس کی آنکھیں تو مغرب سے پرے لگی ہوئی ہیں۔ جہاں فقط مادی آرام اور سہولتیں نہ ہوں گی۔ بلکہ روحانی تسکین اور ترقی بھی ہے۔"[۱]

مندرجہ بالا اقتباس سے انہوں نے جو تردید کی اس میں ادھوری صداقت بھی شامل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اقبال قومی اور روحانی سرمایہ کی حفاظت کرتے ہوئے مادی دنیا کی تسخیر چاہتے ہیں۔ جس کے ۔۔ ضروری ہے کہ اسلامی اصولوں کی پیروی کی جائے جس کا تعلق قرونِ اولیٰ سے ہے۔ جہاں تک علمی اور درسی اور معاشرتی جزئیات میں قرونِ اولیٰ کا تعلق ہے یہ بھی درست نہیں یہ تینوں راہنما کسی طرح بھی جدید علمی، درسی اور معاشرتی جزئیات کے مخالف نہیں بلکہ وہ ۔۔س مقصد کیلئے کوشاں رہے بقول اجمل خاں

"مولانا ابوالکلام آزاد بار بار جدید علوم و فنون کے حصول اور انگریزی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دیتے تھے۔"[۲]

یہی حال مولانا ظفر علی خاں کا بھی ہے جو انگریز سے ضرور نفرت کرتے تھے مگر انگریزی سے نہیں بقول جیلانی کامران

"ظفر علی خاں نے مغربی علوم سے باخبر ہوتے ہوئے بھی خود کو مغرب کی علمی برتری سے متاثر نہیں ہونے دیا۔ لیکن ان کا ایسا طرزِ عمل تعصب کے باعث نہ تھا کیونکہ وہ اس امر سے بخوبی آشنا تھے کہ اہلِ مغرب کی برتری دراصل "زنگدار" قوموں کی غلامی کا سبب ہے۔"[۳]

دراصل شیخ محمد اکرام صاحب چونکہ سرسید کے ردِعمل کے دور کا ذ۔۔تے ہوئے یہ بات کرتے ہیں لہٰذا فرض کر لیتے ہیں کہ ردِعمل میں علمی

۱۔ موجِ کوثر شیخ محمد اکرام ص نمبر ۳۲

۲۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جواباتِ آزاد۔ مرتبہ محمد اجمل خان پیش لفظ ص نمبر ۵ سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی نمبر ۶

۳۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ دیگر ۔۔ ۔ جیلانی کامران ص نمبر ۹۳

درسی اور معاشرتی قدروں کا انکار بھی کیا گیا ہے حالانکہ وہ خود لکھ چکے ہیں کہ سرسید کی تعلیمی پالیسی کی مخالفت کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم دینا چاہتے ہیں بلکہ شیخ صاحب نے برتحقیق ثابت کیا ہے کہ علماء کرام نے تو فتویٰ دیا تھا کہ انگریزی تعلیم حاصل کرنا ہر طرح سے جائز ہے[۱]" لہٰذا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جدید علمی ' درسی اور معاشرتی جذبات کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ بلکہ وہ تو روشن خیالی کے دور کے سرخیل ہیں علامہ اقبال کی فکر کے جدید ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن انہوں نے ماضی سے بھی اپنا تعلق بہر حال جوڑے رکھا اور حقیقت یہ ہے کہ اقبال اور ظفر علی خاں نے اپنی شاعری اور ابوالکلام آزاد نے اپنی نثر کے ذریعے سے جو شعور قوم کو عطا کیا۔ اُس میں ایک فعال قوت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اپنے ماضی کے عظیم کارناموں کا تذکرہ کرنے کے بعد ویسی ہی عظمت و سطوت موجودہ زمانے میں حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا کرتے ہوئے جذبات اور تخیل کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ مگر عقل سے بالکل ہی پہلو تہی نہیں کرتے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ رومانیت پسند ادیبوں اور شاعروں کے ہاں جذبہ و تخیل کی فراوانی ہوتی ہے جس کی بنا پر حقیقت سے زیادہ افسانہ کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔ مگر علامہ اقبال ' ظفر علی خاں اور ابوالکلام کے ہاں جذبہ کی شدت اگرچہ زیادہ ہے۔ مگر عقل وجدان اور دلیل و براہین کی بھی کمی نہیں۔ شاعری میں جذبہ اور تخیل کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن مولانا ظفر علی خاں ' ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال نے خاص طور پر عقل اور جذبہ کا امتزاج اس خوبصورتی سے کیا ہے۔ کہ جذبے کی پر اسرار کیفیت کے حصول کو دو آتشہ کر دیا ہے۔ انہوں نے سرسید کے دور کی عقلیت اور منطقیت کو صرف مادیت کیلئے استعمال نہیں کیا۔ بلکہ جذبے کے تابع بنا کر ان روایات کو زندہ کرنے کی کوشش کی جس سے ایک صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔ جس سے کوشش اور عمل کا درس بھی ملتا ہے اور زندگی میں یقین بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال کا مقام بہت بلند ہے۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"ادب اردو کی گزشتہ ڈیڑھ صدی میں اہل فکر و ادب کی کسی جماعت نے مشترکہ طور پر بھی زندگی میں اتنا یقین پیدا نہیں کیا جتنا تنہا اقبال کی شاعری نے پیدا کیا[۲]"

مولانا ابوالکلام نے یہی کام نثر سے لیا ہے۔ اُن کے ہاں بھی جذبات کا ایک الاؤ ہے۔ جو عقل کی سرد بھٹی میں جذبے کی آگ لگا دیتا ہے

---

۱ بحوالہ موج کوثر شیخ محمد اکرام ص نمبر ۹۰

۲ مباحث سید عبداللہ ص نمبر ۲۹۷

ان کے ہاں اتحاد و تعاون ۔ تقلید و پیروی ۔ مصلحت کوشی ۔ انکساری اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی پالیسی کی کوئی گنجائش نہیں ۔ اُن کا خطیبانہ جوش و خروش ایسی احتیاطوں کو خس و خاشاک کی طرح بہائے جاتا ہے ۔ اور وہ سرکشی اور بغاوت کا وہ سماں پیدا کر دیتا ہے کہ جب انسان سب کچھ کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے ۔ مولانا ظفر علی خاں نے بھی اسی جوش و خروش سے بڑی بڑی سیاسی تحریکوں میں جان ڈالنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے یہ جذبے ہی کی معجز نمایاں اور اثر آفرینیاں ہیں کہ ہمیں علامہ اقبال ۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام کے شعر و ادب میں ایک بے پناہ قوت اور توانائی ملتی ہے ۔ جو قومی تعمیر میں بڑی معاون ثابت ہوئی ۔ بڑی شخصیتوں میں انانیت کا عنصر اُن کی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ اپنی عظمت اور انفرادی حسن کے اظہار کیلئے "میں" کا لفظ بولتے ہیں تو اس میں بڑی جاذبیت اور دلکشی ہوتی ہے کیونکہ اس لفظ کے پس منظر میں درحقیقت اُس بڑی شخصیت کا وقار اور دبدبہ اپنی ساری قوت اور اثر آفرینی کے ساتھ موجود ہوتا ہے ۔ لہٰذا جب کوئی بڑی شخصیت اپنی انانیت کا اظہار کرتی ہے تو اس میں دوسروں کو مرعوب و متاثر کرنے کی بے پناہ قوت موجود ہوتی ہے ۔ علامہ اقبال اور ظفر علی خاں نے اپنی اس شخصی عظمت اور بڑائی سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے ۔ ان کی شاعری میں انا کا اظہار اگرچہ اس شدت کے ساتھ موجود نہیں جس شدت کے ساتھ مولانا ابوالکلام کی نثر میں موجود ہے ۔ تاہم اُن کے اشعار میں انانیت کا یہ عنصر بڑا اثر آفریں اور مرعوب کر دینے والا ہے ۔ لیکن ابوالکلام کی نثر میں انانیت اُن کے اندازِ نگارش کا ایک حصہ ہے ۔ اور یہی اندازِ نگارش ان کی شخصیت ہے ۔ بقول رشید احمد صدیقی

> "مولانا نے لکھنے کا انداز، لب و لہجہ اور مزاج کلامِ پاک سے لیا جو اُن کے مزاج کے مطابق تھا مولانا پہلے اور آخری شخص تھے جنہوں نے براہِ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا ۔ وہی اندازِ بیان اور زورِ کلام اور وعید و تہدید کا انداز یا نے جن کے بارے میں کہا گیا ہے ۔ کہ پہاڑوں پر رعشہ سیماب طاری کر دیتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا کے خطاب کرنے کا انداز پیغمبر یا انسان کے طرزِ خطاب سے جدا گانہ ہوتا ہے ۔ یہاں پہنچ کر یہ بھید کھلنے لگتا ہے کہ مولانا کی تحریروں میں انانیتی رنگ اور خطابت کا غلبہ کہاں سے آیا[1] "

---

[1] آئینہ ابوالکلام مرتبہ عتیق صدیقی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ۔ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۶۸

یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے سارے افکار قرآنی - دینی اور اسلامی تعلیمات سے متاثر ہیں - تذکرے اور بعض خطبات و مقالات میں تو یہ رنگ بہت ہی غالب ہے - اس کے ساتھ ساتھ عربی - فارسی اور اردو کی شعری روایت اور تصوف کی بوقلمونی نے ان کے افکار کو حسین تر بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے جس سے ان کی نثر میں ایک خاص قسم کا حسن اور رعنائی پیدا ہوگئی مگر مولانا ابوالکلام کی نثر میں اثر آفرینی اُن کے خطیبانہ لہجے - جوش و خروش کی کیفیت اور انانیت کے شدید اظہار نے پیدا کی ہے ابوالکلام کی نثر نے بھی لوگوں کو اسی شدت سے متاثر کیا جس شدت سے اقبال اور ظفر علی خان کی شاعری نے متاثر کیا -

حسن و عشق رومانیت کا ایک خاص وصف ہے لیکن علامہ اقبال ، ظفر علی خان کی شاعری اور ابوالکلام کی نثر میں یہ خاص وصف ہمیں مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے - جس کی اعلیٰ ترین صورت عشق رسولؐ ہے - مولانا ظفر علی خان کے ہاں یہ عشق ہمیں نعت گوئی کی صورت میں نظر آتا ہے - جب کہ علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے افکار کا مرکز ی نقطہ ہی عشق رسولؐ ہے - یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے مردِ مومن کے تصور کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں دیکھا ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اسوہ حسنہ کی پیروی میں انسانیت کی تکمیل کی نشاندہی کی ہے - اسی لیے علامہ اقبال اور ابوالکلام پہلے فرد کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک فرد میں بے پناہ امکانات پوشیدہ ہیں - اس کے بعد قوم کی تعمیر چاہتے ہیں یعنی انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف رجوع کرتے ہیں - علامہ اقبال - مولانا ظفر علی خان اور ابوالکلام آزاد کا عشق اُن کے دین کا حصہ ہے - جس نے اس عہد کے لوگوں میں دینی حمیت اور اسلامی اقدار کی پاسداری کا وہ شعور پیدا کیا جو قوموں کی تعمیر میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے - ڈاکٹر سید عبداللہ ، مولانا ابوالکلام کے متعلق تحریر کرتے ہیں کہ

"ابوالکلام نے دین میں عشق کا عنصر داخل کرکے دین کو جذباتی زندگی کا جزو بنا دیا ہے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے"[۱]

بہر حال رومانیت کے جن بڑے بڑے عناصر کی اب تک نشاندہی کی گئی ہے - ان کے علاوہ اور بھی رومانیت کی خصوصیات ہیں جو ہمیں علامہ اقبال ، مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام کے ہاں مل جاتی ہیں - جن میں فطرت کی عکاسی - محاکات نگاری پیکر تراشی اور شاعرانہ مصوری شامل ہیں - لیکن اس سلسلے میں اس بات کو ضرور پیش نظر رکھنا چاہیے کہ یہ دور درحقیقت سر سید احمد خان کی تحریک کا ردِ عمل تھا جسے خالص رومانیت کا دور نہیں سمجھنا چاہیے - اس دور کو جس کے نمایاں ترین نمائندے علامہ اقبال - مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خان ہیں -

---

۱ - آئینہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عتیق صدیقی - ڈاکٹر سید عبداللہ - ابوالکلام امام عشق و جنوں - ص نمبر ۲۹
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

اگر سیاسی پس منظر میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے ۔کہ جس طرح سرسید دور کی مادیت اور عقلیت وقت کا تقاضا تھا ۔اسی طرح نیا طرزِ عمل بھی نئے حالات میں وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھا ۔پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان میں دوسری تبدیلیوں کے علاوہ ایک تبدیلی یہ بھی تھی کہ انگریز سے ترکِ تعاون کرکے آزادی کی بات کی جائے ۔ظاہر ہے کہ آزادی کی جنگ قربانی، ایثار، بے غرضی، حوصلہ، جرأت اور جذبے کے بغیر نہیں لڑی جا سکتی تھی ۔ لہٰذا قوم میں ان صفات کو پیدا کرنے کیلئے جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا وہ حالات کے عین مطابق تھا ۔علامہ اقبالؔ ۔مولانا ظفر علی خاں اور ابوالکلام آزادؔ صرف شاعر اور نثر نگار نہیں تھے کہ انہوں نے مسلمانوں کی قیادت اور راہنمائی کے فرائض ہی انجام دیئے ۔بلکہ سیاسیات میں اُن کی بصیرت اور قومی تعمیر میں اُن کی ژرف نگاہی نے قوم کی ضرورتوں کا اندازہ کرتے ہوئے ہی یہ نیا اندازِ فکر اختیار کیا ۔تاکہ قومی تعمیر کے ساتھ ساتھ انگریز کی غلامی سے نجات بھی حاصل کی جائے اور یہ مقصد بالآخر حاصل کر لیا گیا ۔ علامہ اقبالؔ ۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزادؔ کی نگارشات میں اگرچہ رومانیت کے عنصر موجود ہیں لیکن اِس میں اجتماعیت کی جو شدید اور کرخت آواز سنائی دیتی ہے اُس[1]

اس نے رومانیت کے حسین تصور کو مجروح کیا لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں خاص رومانیت کی دھن پر گائے ہوئے نغمے بھی ملتے ہیں جن میں انسان کی انفرادی کیف و مستی کیلئے جاذبیت ہے ۔ اور انسان کے اندرونی کرب اور بیماری کیلئے بڑی ہی راحتیں اور مسرتیں موجود ہیں ۔ اس خالص رومانی دور کے نمائندہ شاعر اخترؔ شیرانی ۔حفیظؔ جالندھری اور جوشؔ ہیں ۔لیکن اس کے بعد بھی بہت سے شاعروں نے اس تحریک میں حصہ لیا ۔ مثلاً ساغرؔ نظامی ۔روشؔ صدیقی ۔اخترؔ انصاری ۔فراقؔ گورکھپوری ۔احسان دانش وغیرہ ۔ بقول سید احتشام حسین

"مشکل ہی سے بیسویں صدی کا کوئی شاعر ہو گا جو رومانیت کے افسوں کا شکار نہ ہوا ہو"[2]

اِس خالص رومانوی شاعری میں ان شعراء نے جو نظمیں کہیں اُن میں غالب رنگ حسن و عشق کا ہے ۔ اور محبت کا محور بھی عورت ہے مگر ایسی عورت نہیں جو چلمن سے باہر نہ آسکے ۔ اور نہ ہی وہ ایسی عورت ہے جو اپنے کو اس لئے چھپاتی ہو کر چھپائے نہ بنے بلکہ یہ عورت ہمیں اپنا تمام تر رعنائیوں اور زیبائیوں میں بے نقاب اور بے حجاب نظر آتی ہے ۔اُسکی نگاہیں نیچی نہیں بلکہ آنکھ ملا کر بات کرنے کا سلیقہ جانتی ہے ۔ جس کی وجہ سے قدرے بے باک معلوم ہوتی ہے ۔یہ عورت ہمیں اسی دنیا کی معلوم ہوتی ہے ۔مگر کبھی کبھی وہ ایسی عورت بھی بن جاتی ہے ۔

---

[1] مباحث ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۲۹۵

[2] نگار ۔ سالنامہ ۱۹۶۵ء نظم اور جدید نظم پر چند اصولی باتیں ۔سید احتشام حسین ص نمبر ۵۵

جس کا وجود صرف تخیل کی حسین وادیوں میں ہی دیکھا جا سکتا ہے اور یہی تخیل پرستی ان شعرا کو رومانیت پسندوں کی صف میں شامل کرتی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں ایک صحت مند محبت کا احساس ملتا ہے۔ بلکہ اختر شیرانی نے تو بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے اس عورت کو سلمیٰ۔ ریحانہ اور عذرا کا نام بھی دے دیا۔[1] اس دور کے شعرا اپنے سیاسی پس منظر میں آزادی اور ملک و قوم کی تعمیر کا گہرا احساس رکھتے تھے۔ سید احتشام حسین نے آزادی کو اس کے شاعروں کا آدرش[2] قرار دیا ہے۔ اس احساس کے ساتھ اس دور کے شعرا نے آزادی کے نغمے ایک بڑے ہی لطیف اور دلکش لَے میں گائے ہیں ان کی آواز نے حقیقت اور جنون کی کیفیت کو ملا کر ایک سحر آفریں کیفیت پیدا کی ہے۔ یہ نغمے حسن و عشق کے علاوہ آزادی جشنِ فطرت۔ وطن دوستی اور ایک حسین دنیا کی تعمیر کی تعریف میں گائے گئے ہیں۔ وہ ان نغموں سے اپنی بے قراری کو تسکین دیتے ہیں۔ ان نغموں کی آواز ہمیں جمود کو توڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ سید احتشام حسین نے اختر شیرانی کی رومانیت پر بحث کرتے ہوئے اختر کی رومانیت میں حسن۔ سچائی۔ توانائی۔ لطافت اور لذت کی نشاندہی کی ہے۔[3] جو ہمیں اس دور کے تقریباً سبھی شاعروں میں کم و بیش مل جاتی ہے۔ اس دور کی نظموں میں ہیت کے اعتبار سے نئے نئے تجربے کئے گئے۔ انگریزی کی نظموں کے تراجم بھی ہوئے۔ بحروں اور اوزان کے استعمال میں خاص التزام کیا جانے لگا۔ الفاظ کے استعمال میں خاص احتیاط کی گئی۔ اس دور کی نظموں میں خوبصورت۔ سبک اور ملائم الفاظ کے استعمال پر توجہ دی گئی۔ تاکہ شعر کا ترنم برقرار رکھا جائے۔ شعر میں ترنم کے عنصر کو داخل کرنے کیلئے مترنم بحروں کا انتخاب کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ رومان پرستی کے اس دور میں ہمیں موضوع کے حسن کے ساتھ ساتھ ہیت اسلوب اور اظہار و ابلاغ کا انداز بھی حسین نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور کی نظم میں ہمیں بڑی جدت اور ندرت ملتی ہے۔ مگر اس کے باوجود نظم کا رشتہ روایت سے منقطع نہیں ہوا تھا۔ انگریزی ادب کے واضح اثرات جدید نظم پر مرتب ہوئے۔ اختر شیرانی کی سانیٹ بطور خاص مغرب کی چیز تھی۔ انگریزی نظموں کے تراجم نے فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کی۔ جو بعد کو نظم آزاد اور نظم معرا کی صورت اختیار کر گئی۔

---

۱ سید احتشام حسین کے مطابق اختر شیرانی نے یہ روش کہ اپنی محبوبہ کا نام کھلے بندوں اشعار میں لیا جائے عربی شاعری سے اختیار کی۔ (۱۹۳۸ء بہترین ادب۔ اختر شیرانی کی رومانیت۔ ص نمبر ۲۲)

۲ نگار سالنامہ ۱۹۶۵ء۔ نظم اور جدید نظم پر چند اصولی باتیں ص نمبر ۵۵

۳ ۱۹۳۸ء بہترین ادب۔ اختر شیرانی کی رومانیت احتشام حسین ص نمبر ۲۴

غزل گو شعراء

انجمنِ پنجاب اور رومانیت کی تحریک کے زیرِ اثر شاعری کا رجحان زیادہ تر جدید نظم کی طرف رہا۔ اردو ادب میں تنقید کے فروغ نے غزل کے معائب دل کھول کر بیان کیے۔ حالی سے لیکر کلیم الدین احمد تک بطورِ خاص اور اس کے بعد بھی غزل پر تنقید کے تیر و نشتر چلتے رہے۔ جس سے وہ مجروح تو ہوئی مگر مر نہ سکی بلکہ اسے ایسے ایسے مسیحا ملے جن کی مسیحائیوں اور چارہ سازیوں نے اسے نہ صرف صحت سے ہمکنار کیا بلکہ ایک نئی طاقت اور توانائی بھی بخشی۔ جدید نظم کے مقابلے میں جن شعراء نے غزل کی آبرو بڑھائی ان میں حسرت۔ اصغر۔ فانی۔ اور جگر مراد آبادی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ غزل اپنے وسیع تر مفہوم میں بڑی وسعتیں اور امکانات رکھتی ہے۔ مگر اس کا بنیادی وصف وارداتِ حسن و عشق کا بیان ہے۔ وہ تاثیرِ حسن ہو یا متعلقاتِ حسن۔ تعبیرِ عشق ہو یا لوازماتِ عشق۔ حسن و عشق بہر حال اس کا بنیادی موضوع ہے جس کو غزل سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ وہی شعر حاصلِ غزل ہوتا ہے جس میں تغزل کا عنصر پایا جائے۔ بقول سید وقار عظیم

"غزل محبوب اور محبوبی کی باتیں ہیں اور تغزل وہ مجموعی کیفیت ہے جو محبوب کے ذکر اور محبوبی کی باتوں سے پیدا ہوتی ہے[1]"

ڈاکٹر سید عبداللہ نے تغزل کی بحث میں بہت سے دوسرے اجزاء کو بھی شامل کیا ہے[2]۔ مگر انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا ہے کہ تغزل کی صحیح روح وارداتِ حسن و عشق ہی ہے۔ سید صاحب کے اصل لفظ یہ ہیں

"تغزل کی صحیح روح عشق و محبت کے مضامین میں جلوہ گری ہوتی ہے[3]۔"

گویا وارداتِ حسن و عشق غزل کی بنیاد ہے اگر حسن و عشق کو غزل سے الگ کر دیا جائے تو غزل، غزل نہیں بلکہ کوئی اور چیز ہو گی یہی وجہ ہے کہ

"گذشتہ دو سو برس میں میر صاحب کے زمانہ سے لیکر حسرت و جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں لیکن اسکی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوا[4]"

---

۱ اقبال مجلہ بزم اقبال۔ اقبال کی نظموں میں رنگِ تغزل۔ سید وقار عظیم اپریل ۱۹۵۳ء ص نمبر ۹۵/۹۶

۲ بحوالہ مباحث ص نمبر ۵۲۸

۳ مباحث ص نمبر ۵۲۹

۴ اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص نمبر ۵ حیدر آباد دکن

لیکن جدید غزل میں اسلوب کی تبدیلی نے بڑی جدت اور ندرت پیدا کی ۔ جس کا آغاز مولانا حسرت موہانی نے کیا ۔

حسرت موہانی حسرت اپنی طبیعت کے لحاظ سے بڑے سر[illegible] اور درویش منش انسان تھے ۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ ذوق کے ساتھ سیاسی، سماجی اور علمی زندگی میں بھرپور حصہ لیا ۔ وہ زندگی کے حقائق اور زندگی کے نفسیاتی عوامل کا گہرا شعور رکھتے تھے ۔ جس نے ان کی شاعری میں جدت پیدا کی ۔ حسرت غزل کی پرانی روایات اور سرمائے پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ جو اُن کی شاعری کی بنیاد ہے ۔ مگر زندگی کے نئے تقاضے، حالات و واقعات کی تبدیلی اور اس کی اہمیت، نیا شعور اور آگہی ایسی باتیں تھیں جس سے حسرت جیسا باشعور شاعر آنکھیں بند نہیں کر سکتا تھا لہٰذا حسرت نے ان نئے تقاضوں کو نئے اسلوب کے ساتھ اس طرح پورا کیا ہے کہ وہ ہمیں روایت سے بغاوت کرتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ زندگی کو جیسا پاتے ہیں بے نقاب کر دیتے ہیں[1] ۔ حسرت کی شاعری خالص عاشقانہ شاعری ہے ۔ عشق کا فطری جذبہ بڑا ہی قوی اور توانا ہے جو ہر انسان کے دل کی گہرائیوں میں طوفان و تلاطم کی صورت میں موجود رہتا ہے ۔ فکر و عمل کی جتنی وسعتیں اس جذبہ عشق میں موجود ہیں ۔ اس کی ہمسری کسی دوسرے جذبے کیلئے ممکن نہیں یہی وجہ ہے کہ یہ جذبہ اُردو شاعری میں بہت پرانا ہونے کے باوجود بہت نیا ہے ۔ کیونکہ شاعر جب اِسکی وسعتوں کی تلاش میں نکلتا ہے تو اِس کا کوئی نہ کوئی نیا پہلو کوئی نہ کوئی نیا گوشہ ضرور دریافت کر لیتا ہے ۔ مگر اس تلاش و جستجو کے عمل میں فکر و نظر کی مہارت ضروری ہے ۔ کیونکہ فکر و نظر کی مہارت ہی جذبہ کے منشور سے نکلتی ہوئی شعاعوں کا ادراک کر سکتی ہے اور حسرت میں فکر و نظر کی یہ [illegible]رت بدرجہ اتم موجود تھی ۔ انہوں نے تلاش و جستجو کا یہ عمل انسانی محبت کے نئے گوشوں اور نئے پہلوؤں کی تلاش کے لئے جاری رکھا جسے فکر و نظر کی مہارت نے نئے زاویوں سے دیکھ کر نئے انداز میں جذبہ عشق کی لطافتوں کو شعر کا قالب عطا کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ہمیں آفاق کی وسعتوں کی گہرائی نظر نہیں آتی بلکہ ارضی حقیقتوں کی نقاب کشائی ملتی ہے جسے ہم عشق مجازی بھی کہہ سکتے ہیں ۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں

"وہ جس چیز کو عشق کہتے ہیں وہ خالص انسانی چیز ہے اس کی شدت اور حرکت کے ہر راز سے خوبی واقف ہیں ۔"[2]

حسرت نے اپنے کلام میں انسانی محبت کے نفسیاتی اسرار و رموز سے پردہ اٹھایا ہے ۔ غزل چونکہ اشاروں اور کنایوں میں بات کرتی ہے ۔

---

[1] بحوالہ آتش گل   دیباچہ آل احمد سرور   ص نمبر ۱۴   فیروز پرنٹنگ پریس ۔ لاہور

[2] اُردو غزل   ڈاکٹر یوسف حسین خاں   ص نمبر ۷۶

لہٰذا حسرت نے اِس رمزیت اور ابہام سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ جس نے تغزل کے رنگ کو نکھارنے میں مدد کی ہے۔ حسرت کے ہاں چونکہ صحت مند عشق کی واردات ہیں لہٰذا حسرت کا محبوب ہمیں ہندوستان کے مہذب گھرانوں میں مل جاتا ہے۔ اس کی تلاش کیلئے تخیل کے پروں سے اُڑنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بقول رشید احمد صدیقی صاحب

"حسرت کا عشق گھریلو ہے بازاری نہیں انسانی ہے خانقاہی نہیں مجازی ہے ماورائی نہیں۔[1]"

بلکہ حسرت کا محبوب خالص مشرقی انداز کا پاسدار ہے جس کے پردے کا کونہ اگر اچانک کھینچ لیا جائے تو وہ اپنے منہ کو دوپٹے سے چھپا لیتا ہے۔ اور اسی طرح عاشق میں بھی خواہش کی بیباکی پر قابو پالینے کی قدرت موجود ہے۔ خواہش اُسے گدگداتی ضرور ہے مگر ارتکاب سے روکتی ہے جس نے حسرت کے کلام کو شوخ تو ضرور کر دیا ہے مگر فاسق ہونے سے بچالیا ہے۔ اِس شوخی کی بنا پر حسرت دہلی سے زیادہ دبستان لکھنؤ کے قریب ہیں۔[2] اِس میں کوئی شک نہیں کہ غزل کا فن داخلیت یا دروں بینی کا عکاس ہے۔ حسرت بھی غزل گو شاعر ہیں اُن کے ہاں بھی جذبہ کی شدت اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ موجود ہے۔ مگر حسرت جس دنیا میں رہتے ہیں اُس دنیا میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات سے آنکھیں بند نہیں کر لیتے بلکہ عمیق مشاہدے سے کام لیتے ہیں۔ اور جو تجربات انہیں اِس مشاہدے سے حاصل ہوتے ہیں انہیں تجربات کو جذبات بنا کر شعر کا روپ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسرت کے ہاں جو داخلیت ہے۔ اُس میں انفعالی کیفیت کی بجائے ایک توانائی کا احساس ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر آل احمد سرور نے بجا طور پر کہا ہے کہ

"حسرت نے حقیقت میں رومان تلاش کیا۔[3]"

غرض حسرت کی غزل اپنے اندر عشق و عاشقی اور طرزِ بیاں سپاری کے سارے لوازم رکھتی ہے۔ ڈاکٹر ابو للیث صدیقی نے حسرت کی غزل میں اُن عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ اُن کے مطابق

"سوز و گداز، درد و غم، شیرینیٔ گفتار اور رنگینیٔ بیانی کے عناصر سے اُن کی غزل کا حسین پیکر وجود میں آتا ہے۔[4]"

---

[1] نقش ہائے رنگ رنگ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۸۶ کاروانِ ادب ملتان صدر

[2] بحوالہ نقش ہائے رنگ رنگ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۸۱

[3] آتشِ گل دیباچہ آل احمد سرور ص نمبر ۱۳

[4] آج کا اردو ادب ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ص نمبر ۱۵۷

حسرت کی سیاسی زندگی بھی اُن کی غزل پر اثر انداز ہوئی ہے اور حسرت کی غزل میں سیاست کا عنصر اُن کی ذاتی زندگی کا حصہ ہے۔ حسرت پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزل میں سیاست کو رواج بنایا[1]۔ وہ سیاست میں بھی تہذیب و شائستگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ جو اُن کی غزل میں احساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور یہی تہذیب و شائستگی غزل پر ہونے والے عامیانہ پن کے اعتراض کا جواب بھی تھا۔ جس نے نظم کے مقابلے میں غزل کو دوبارہ زندگی بخشی۔

اصغر

اصغر جدید شاعری میں عشقِ حقیقی کے ترجمان ہیں جسے عام طور متصوفانہ شاعری کا نام بھی دیا جاتا ہے۔

"تصوف وجد شاعرانہ کی ایک آئینی شکل ہے اور شاعری ذوقِ صوفیانہ کی ایک والہانہ صورت کہی جاسکتی ہے ہر صوفی ذوق شعر سے اور ہر شاعر تصوف سے فطری لگاؤ رکھتا ہے[2]۔"

اُردو شاعری میں تصوف کی روایت بہت پرانی ہے۔ فارسی شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس کی عمر اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اردو شاعری میں تصوف پر کہنے والے صاحبِ حال بھی گزرے ہیں اور صاحبِ قال بھی لیکن تصوف کا مزاج چونکہ شاعری سے ہم آہنگ ہے لہٰذا تصوف کے اسرار و رموز نے بھی اُردو شاعری میں ایک قسم کا روحانی اور اخلاقی ترفّع پیدا کیا ہے۔ جو تصوف کے اس خاص پہلو یعنی تزکیۂ نفس کی دین معلوم ہوتا ہے۔ تصوف اور شاعری کا تعلق ہمیشہ سے رہا ہے بقول پروفیسر حیدر دانش

"ہر صوفی ذوقِ شعر سے اور ہر شاعر تصوف سے فطری لگاؤ رکھتا ہے[3]۔"

اِس قول سے اگر فطری کا لفظ نکال دیا جائے تو یہ کہنے میں کچھ حرج نہیں کہ صوفی کچھ نہ کچھ شاعرانہ اور شاعر کچھ نہ کچھ صوفیانہ ذوق ضرور رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ پرانی شاعری میں کم و بیش ہر شاعر کے ہاں تصوف کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔ جدید اُردو غزل میں تصوف کی پاسداری کرنے والے شاعر اصغر ہیں۔ اصغر خود بھی صوفی منش بزرگ تھے[4]۔ اُن کا مرزا مظہر جانِ جاناں سے روحانی تعلق بھی تھا۔[5] گویا کہا جاسکتا ہے کہ مقامات سیر و سلوک کی لذت سے آشنا تھے۔ اسی لیے ڈاکٹر محی الدین قادری نے لکھا ہے کہ

---

1. بحوالہ نقش ہائے رنگ رنگ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۸۵
2. تصوف اور اُردو شاعری۔ پروفیسر صفی حیدر دانش ص نمبر ۲ سندھ ساگر اکادمی لاہور
3. تصوف اور اُردو شاعری۔ پروفیسر صفی حیدر دانش ص نمبر ۲۱/۲
4-5. بحوالہ چند شخصیتیں چند تاثرات۔ ڈاکٹر محی الدین قادری ص نمبر ۳۳/۳۲

"ان کا کلام ان کی زندگی کا بعینہ عکس ہے[1]۔"

لیکن تصوف اصغر کے یہاں اُن کی شاعری کی بنیاد نہیں بلکہ شاعری میں حُسن آفرینی کیلئے تصوف کو استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک تصوف کے مضامین کا تعلق ہے۔ وہ سارے مضامین یکسانیت کے ساتھ اردو شاعری میں استعمال ہوئے ہیں مگر اصغر کے یہاں ہمیں ان مضامین میں طرزِ ادا کی جدت ملتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں پاکیزگی اور لطافت پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہ عارفانہ مضامین بھی نئے اور نرالے معلوم ہوتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

"تصوف کے ان موضوعات اور مضامین میں تصوف کی افسردگی، پژمردگی، اضمحلال اور یاس و حسرت کی جگہ رقص، کیف اور وجد کی کیفیت پائی جاتی ہے[2]۔"

اصغر کی شاعری میں تخیل کی زیادتی اور جذبے کی کمی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف میں محبوب تک رسائی تخیل کے وسیلے ہی سے ممکن ہے۔ کیونکہ صوفی کے حسن کا تصور ارضی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے۔ اور اُسے حسنِ حقیقی کا پرتو کائنات کی ہر چیز میں نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے مجرد حسن کی تلاش کیلئے تخیل ہی بہترین ذریعہ ہوسکتا ہے۔ تصوف کو اصغر نے اپنی شاعری کو سنوارنے اور دلکش بنانے کے لئے استعمال کیا ہے[3]۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اصغر طبعاً صوفی سے زیادہ شاعر ہیں[4]۔ اصغر کے شعر کی دلآویزی میں اُن کے تخیل کی شائستہ رنگینی[5] کو خاص دخل ہے جس کی وجہ سے اُن کی شاعری میں وہ حسن پیدا ہوا جو جدید اردو غزل میں صرف اصغر کا حصہ ہے۔ اصغر کے کلام کی یہ بھی بڑی خصوصیت ہے کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ سراپا انتخاب ہے۔

فانی — فانی کی شاعری غم کی شاعری ہے۔ اور زمانے میں غموں کی کمی نہیں بلکہ غم تو نام ہے عدم تکمیلِ آرزو کا۔ لہٰذا جتنی آرزوئیں اور تمنائیں ناکام اور تشنۂ کام ہوں گی۔ اتنا ہی غم بھی پیدا ہوگا۔ اور اس کا سلسلہ موت سے پہلے ختم ہونے کا نہیں دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں جس کے دل میں کوئی ملال نہ ہو۔ اور یہ ایک آفاقی قدر ہے۔ جو مختلف رنگوں میں انسان کے دل میں موجود

---

۱ چند شخصیتیں چند تاثرات ۔ ڈاکٹر محی الدین قادری — ص نمبر ۲۶/۲۷

۲ آج کا اردو ادب ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی — ص نمبر ۱۵۷/۱۵۸

۳-۵ بحوالہ نقش ہائے رنگ رنگ ۔ رشید احمد صدیقی — ص نمبر ۱۱۱

رہتی ہے ۔ اردو شاعری میں میر تقی میر کو غم کا شاعر کہا گیا ہے ۔ لیکن میر کا غم انفرادی تجربہ تھے[۴]۔ جسے وہ نہایت سادگی کے ساتھ اشعار میں سمو دیتے ہیں ۔ لیکن فانی کے یہاں یہ غم ایک جمالیاتی قدر کا درجہ رکھتا ہے[۵]۔ جسے فانی نے فلسفیانہ رنگ میں پیش کیا ہے[۶] ۔ اور شاعری میں مرزا غالب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے شاعری میں فکر کا عنصر شامل کیا ۔ جناب آل احمد سرور کے مطابق فانی کے اسلوب فکر پر بھی غالب ہی کا اثر ہے[۷] لیکن فانی کا اصل رنگ وہی ہے جو فانی نے اظہار غم کے لئے میر سے لیا[۸]۔ فانی کے کلام میں پہلے پہل لکھنوی شاعری کا اثر نمایاں ہے کیونکہ انہوں نے اپنی شاعری کا ابتدائی زمانہ لکھنؤ میں بسر کیا[۹]۔ اردو شاعری میں اظہار غم کی کمی نہیں ۔ دوسرے شعراء نے جن علامتوں سے غم کا اظہار کیا ہے فانی نے انہیں بدلا نہیں[۸] ۔ لیکن انہوں نے ان علامتوں کو بڑی صداقت[۸] اور سچائی کے ساتھ استعمال کیا کہ یہ اُن کی زندگی کا حصہ معلوم ہوتی ہیں[۹]۔ یہی وہ سچائی ہے جس سے المیہ میں تاثیر اور رفعت پیدا ہوتی ہے ۔ ڈرامے میں المیہ کا اصول یہی ہے کہ انسان کے خوف اور رحم کے جذبات کو ابھارا جائے ۔ جس کے نتیجہ میں جذبات میں ترفع پیدا ہوگا جس سے آدمی کو ایک سکون حاصل ہوگا ۔

فانی نے بھی غم کا بیان ایسے ہی فن کارانہ طور پر کیا ہے ۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں

"فانی نے غم کے ذریعہ تہذیب جذبات کا کام لیا ہے جو یقیناً ایک کارنامہ ہے[۱۰]"

فانی کی شاعری میں غم اور موت کا تصور ایک حقیقت کا تصور رہے ۔ یہ محض خیال آفرینی یا تخیل کی سحر کاری نہیں اور فانی اس حقیقت کا مقابلہ مردانہ وار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور غم کی اس حقیقت سے پہلو نہیں بچاتے ۔ اسی لئے رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ

"فانی کے یہاں آلام حیات کی تفسیر ہے[۱۱]"

فانی کی شاعری میں غم کے علاوہ بھی واردات حسن و عشق کا بیان ہے ۔ جسے انہوں نے بڑی ندرت اور جدت کے ساتھ اپنی غزل میں سمو یا ہے

۴-۵-۶ بحوالہ اردو غزل ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص نمبر ۸۸

۷-۸ بحوالہ تنقیدی اشارے ۔ آل احمد سرور ص نمبر ۱۳۶

۷-۸-۹ بحوالہ تنقیدی اشارے ۔ آل احمد سرور ص نمبر ۱۳۱/۱۳۵ سرفراز پریس لکھنؤ

۱۰ اردو غزل ۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص نمبر ۸۹

۱۱ نقش ہائے رنگ رنگ ۔ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۱۱۲

جس کی بنیاد مضامینِ غم کی طرح خلوص اور صداقت پر قائم ہے جس نے ان کی شاعری کو آپ بیتی بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے کفن اور جنازہ کے مضامین کو کہیں کہیں ناگوار قرار دیا ہے تاہم مجموعی طور پر فانی کی شاعری کے متعلق اُن کا تاثر ہے کہ

"فانی کے ہاں غم کے متعلق بے نظیر اشعار ملتے ہیں جو غزل میں اچھی طرح کھپتے ہیں۔ ۔۔۔۔۔ ان اشعار پر ہمارا ادب جتنا ناز کرے کم ہے۔[۱]"

جگر مراد آبادی

جدید اردو غزل میں جگر، حسرت کے بعد سب سے ممتاز ہیں۔ وہ اس لحاظ سے حسرت کے بڑے قریب ہیں کہ انہوں نے بھی حسرت کی طرح حسن و عشق ہی کو موضوع بنایا ہے جو غزل کی جان ہے۔ لیکن جگر اور حسرت میں فرق یہ ہے کہ

"جگر محبت کے شاعر ہیں اور حسرت محبوب کے۔[۲]"

جس کا مطلب یہ ہے کہ جگر عشق و محبت کے شاعر ہیں محبوب کے شاعر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں جگر کے ہاں محبوب سے جدائی اور فراق کی کیفیت زیادہ ملتی ہے۔ جگر کی غزل میں ہمیں محبوب کے جذبات و احساس کی ترجمانی بھی ملتی ہے[۳]۔ اردو شاعری میں عاشق کے جذبات کی عکاسی اور مصوری پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ لیکن جگر نے اپنی غزل میں یہ جدت کی کہ نہ صرف عاشق کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی بلکہ محبوب کے جذبات و احساسات کو غزل میں جگہ دی۔ یہ اردو ادب کا وہ نیا زاویہ ہے[۴]۔ جو اردو ادب میں جگر کی دین ہے۔ جگر نے خود بھی محبت کی ہے۔ اور انہیں اپنے محبوب کے وقار اور عزت کا بڑا خیال رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کے کلام میں دلکشی کے ساتھ ساتھ ایک پاکیزگی اور تہذیب کا احساس نمایاں ہے۔ جگر کی پہلے دور کی شاعری میں جب کہ وہ شاہد و شراب کے قائل تھے۔ ہمیں مومن اور داغ کا سا تغزل ملتا ہے۔ جگر۔ میر۔ درد۔ غالب۔ مومن۔ داغ اور اقبال سے بھی متاثر تھے[۵]۔ مگر میر کی سادگی اور پرکاری کے علاوہ

۱۔ اُردو غزل۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ص نمبر ۹

۲۔ آتشِ گل۔ دیباچہ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۲۳

۳۔۴۔ بحوالہ آتشِ گل۔ دیباچہ رشید احمد صدیقی ص نمبر ۲۵

۵۔۶۔ بحوالہ چند شخصیتیں چند تاثرات۔ ڈاکٹر محی الدین قادری ص نمبر ۱۲۰

داغ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ لیکن جگر نے داغ کے اس رنگ کو زیادہ مہذب بنا دیا۔ بقول آل احمد سرور

"جگر، داغ و حسرت دونوں سے زیادہ مہذب اور لطیف تغزل رکھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جگر کے یہاں محبت کا ایک پاکیزہ اور لطیف تصور ہے۔ مگر وہ [illegible]ور زندگی سے دور نہیں لے جاتا زندگی کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے[1]"

محبت کی یہی پاکیزگی اور لطافت دراصل جدید غزل گوئی میں جگر کا رنگ، خاص ہے۔ اس کے بعد جگر کی شاعری کا وہ دور آتا ہے۔ جب وہ شراب اور اس کی مستی سے توبہ کر لیتے ہیں۔ تو ان کے کلام میں ہمیں عارفانہ اور صوفیانہ مضامین کی آمد ملتی ہے۔ اس طرح جب شراب کی مستی کی جگہ تصوف کی کیف و مستی نے لے لی تو ان کے کلام میں

"میر درد کا سوز اور اقبال کی بالغ نظری نمایاں ہو گئی[2]"

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں جگر کی شاعری میں اُس عہد کے سیاسی حالات کی جھلک بھی ملتی ہے۔ جن حالات میں انہوں نے زندگی بسر کی جگر کی زندگی کا یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے بڑا طوفانی اور انقلاب آفرین تھا۔ انہوں نے اپنی غزلوں میں اس ماحول کی ترجمانی بڑے خوبصورت اور موثر انداز میں کی ہے۔ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد یہ اثر ان کے کلام میں اور بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

ترقی پسند تحریک

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آزادی کی تحریکوں میں شدت آگئی۔ ملک میں غربت اور افلاس کا اضافہ ہوا۔ اقتصادی بے چینی کی وجہ سے انگریزی حکومت سے لوگوں کی نفرت شدید ہو گئی۔ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات نے مغرب کی ہر چیز سے نفرت کرنا سکھایا اور لوگ مشرقی اقدار کے پاسدار اور عظمت و وقار کے ترجمان بن گئے۔ تحریک ہجرت کی وجہ سے لوگ روس کے اشتراکی خیالات سے واقف ہوئے۔ ہندوستان کے سیاسی حالات میں برطانیہ اور برطانوی نظام سے جتنی نفرت اس وقت پیدا ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ ایسے حالات میں اشتراکیت کی حمایت انگریز دشمنی کی بنا پر کی گئی۔ چونکہ حالات

---

[1] آتش گل دیباچہ آل احمد سرور ص نمبر ۷م

[2] چند شخصیتیں چند تاثرات۔ ڈاکٹر محی الدین قادری ص نمبر ۱۲۱

سازگار تھے لہٰذا بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"ملک کے اندر کسانوں اور مزدوروں میں ایک خاص احساس ترقی پذیر ہوا جس کی وسعت اور شدت یہاں تک پہنچی کہ ۱۹۳۵ء میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے اشتراکی اصولوں کی تبلیغ کی آواز اٹھی [1]"

علی سردار جعفری نے بھی اپنی کتاب ترقی پسند ادب کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ

"ہندوستان کی تمام اہم سیاسی جماعتیں کانگرس، کمیونسٹ پارٹی اور پرجا سوشلسٹ پارٹی اشتراکیت کو کسی نہ کسی شکل میں اپنا نصب العین قرار دے چکی ہیں [2]"

جہاں تک کمیونسٹ اور سوشلسٹ پارٹی کا تعلق ہے - یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہیں - بے شبہ ان کا نصب العین اشتراکیت ہی ہے - لیکن ان پارٹیوں کو اہم سیاسی پارٹیاں قرار نہیں دیا جا سکتا - یہ دونوں سیاسی پارٹیاں ہندوستان میں بمشکل دوسرے درجے کی پارٹیاں کہی جا سکتی ہیں - ورنہ ہندوستان میں صرف دو اہم سیاسی پارٹیاں تھیں اور ان کے نام مسلم لیگ اور کانگریس ہیں - اور کانگریس نے کسی طرح بھی اشتراکیت کو اپنا نصب العین قرار نہیں دیا -

۱۹۳۵ء تک اشتراکیت کو جو فروغ حاصل ہوا اس کی وجہ صرف اور صرف انگریز کے خلاف لوگوں کا ردِ عمل تھا - جہاں تک کانگریس کا تعلق ہے کہ اس نے اشتراکی اصولوں کی آواز بلند کی وہ صرف اس حد تک ہے کہ لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں اور انہیں ملکی آزادی کیلئے کام میں لایا جائے ورنہ کانگریس والوں کے نزدیک اشتراکیت کا مطلب کیا تھا - اس کا اندازہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو انہوں نے گاندھی جی کے متعلق کہے ہیں -

"کبھی کبھی وہ (گاندھی جی) اپنے آپ کو اشتراکی کہتے ہیں - لیکن وہ اس لفظ کو ایک خاص معنی میں استعمال کرتے ہیں - جو انہیں کے ذہن میں ہیں - اور ان کی اشتراکیت کو سوسائٹی

---

[1] اردو ادب جنگ عظیم کے بعد - ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۱/۱۲

[2] ترقی پسند ادب علی سردار جعفری ص نمبر ۱۲

کے اس معاشرتی نظام سے کوئی تعلق نہیں جو بالعموم اشتراکیت کے نام سے مشہور ہے۔ ان کی تقلید

میں بہت سے ممتاز کانگریسیوں نے بھی اس لفظ کا استعمال شروع کر دیا اور اس سے اُن کی

مراد ایک قسم کی انسانی ہمدردی ہے۔[۱]"

ظاہر ہے کہ جب گاندھی جی اور دوسرے ممتاز کانگریسی اشتراکیت کو ایک "معاشی نظام" کے طور پر قبول نہیں کرتے تو عام لوگ اس فکر سے "معاشی نظام" کے طور پر کیسے متاثر ہو سکتے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اشتراکیت کے اثرات بھی انگریز دشمنی کا نتیجہ تھے کیونکہ اشتراکی ادیب اور شاعر انگریز کے خلاف لکھتے تھے لہٰذا

"سیاست کا ہر پلیٹ فارم ان کے لئے کھل گیا۔[۲]"

اس بات کی تصدیق پنڈت نہرو کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو ہندوستان میں ترقی پسندی کیلئے بڑے مشہور ہیں۔

"اگرچہ لوگوں کی ایک روز افزوں تعداد اشتراکیت کی طرف مائل تھی مگر اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ

ہندوستان کے لوگوں میں اشتراکیت کے اصول مقبول ہو گئے تھے۔[۳]"

ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا قیام لکھنؤ میں ۱۹۳۶ء[۴] کو عمل میں آیا۔ جس کی صدارت پریم چند نے کی۔ اس وقت اس انجمن کا مقصد قرار پایا کہ

"ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔[۵]"

۱۔ میری کہانی۔ جلد دوم۔ پنڈت جواہر لال نہرو ص نمبر ۴۰۶

۲۔ پاکستان میں ذہنی رجحانات۔ عبید اللہ قدسی ص نمبر ۲۴ انٹرنیشنل پریس کراچی

۳۔ تلاشِ ہند جلد دوم پنڈت نہرو ص نمبر ۲۷۵

۴۔ بحوالہ نگار جدید شاعری نمبر سالنامہ ۱۹۶۸ء ترقی پسند تحریک ایک جائزہ پروفیسر غلام سرور ص نمبر ۱۶۱

۵۔ ترقی پسند ادب۔ سردار جعفری۔ ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ ص نمبر ۲۱۴۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

ہندوستان میں بھوک افلاس سماجی پستی اور غلامی کے مسائل نئے نہ تھے۔ ہندوستان کے سیاسی راہنما کھلے بندوں آزادی کا اعلان کر رہے تھے اور لوگوں کو ترغیب دی جاتی تھی کہ آزادی کیلئے قومی جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔ بھوک افلاس اور سماجی پستی کو آزادی کی راہیں ہموار کرنے کا ذریعہ بنایا جا رہا تھا۔ خاص طور پر ہندوؤں کی اقتصادی بالادستی اور مسلمانوں کی پسماندگی کے موضوعات بے شمار طریقوں سے سامنے آ رہے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ مسائل بڑے ہی سنگین اور تکلیف دہ تھے۔ لہٰذا وقت کی نبض کو پہچانتے ہوئے انجمنِ ترقی پسند مصنفین نے اگر ادب کو ان مسائل کے حل کرنے کی دعوت دی تو یہ بڑا ہی احسن قدم تھا جسکی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ چونکہ لوگ ان مسائل سے پریشان تھے۔ لہٰذا جب اِس انجمن کی شاخیں قائم ہوئیں تو ہندوستان کے سبھی قسم کے ادیبوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اس طرح اِس انجمن کی آواز سارے ہندوستان میں سنی جانے لگی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اس تحریک کو خالص ادبی تحریک قرار دیا لیکن اشتراکیت کے سیاسی نظریے پر پردہ ڈال دیا گیا۔ کیونکہ انگریزی اقتدار میں اِس کی گنجائش کم تھی اور ہندوستان پر مذہب کی گرفت بڑی مضبوط تھی۔ جو اشتراکی نظریات کیلئے چنداں مفید نہ تھی لہٰذا ادبی تحریک کو اشتراکی نظریات کے لئے استعمال کرنیکی تدبیر کی گئی۔ جناب شمیم حنفی نے اس حقیقت کی نشان دہی اس طرح کی ہے۔ کہ

> "ترقی پسند تحریک کے شارحوں نے علی الخصوص اردو شعر و ادب کی روایت میں اِسے ایک خاص ادبی نظریئے سے تعبیر کیا اور اس اعتراف میں جھجکتے رہے ہیں کہ ترقی پسند ادب کے لئے باقاعدہ اشتراکی ہونا ضروری ہے۔ لیکن حقائق اس کی تردید کرتے ہیں۔ اس تحریک کے ادبی معیار اور اقدار کا رشتہ اشتراکی حقیقت نگاری ہی سے نہیں اشتراکیت کے سیاسی اور سماجی نظریئے سے بھی بہت گہرا اور مضبوط ہے[۱]۔"

لہٰذا اس تحریک کے نوجوانوں نے جو اشتراکی نظریات سے متاثر تھے۔ جب ادب کے پردے میں اشتراکیت کے لئے کام شروع کیا تو انھوں نے بے جا جوش۔ انتہا پسندی اور شدید جذباتیت سے کام لیکر غیر اشتراکی ادیب یا ایسے ادیب جو دیانت داری سے یہ سمجھتے تھے ادب کو زندگی کا ترجمان ہونا چاہئے اور ان مسائل کو ادب کا موضوع ہونا چاہئے جو ملک کو درپیش ہیں۔ خاص طور پر آزادی

---

۱ جدیدیت کی فلسفیانہ اساس۔ شمیم حنفی ص نمبر ۱۰۴

کا مسئلہ جس کے حل کے بغیر دوسرے مسائل کا حل مشکل تھا کو ناراض کر دیا۔ نتیجے کے طور پر بہت سے ادیبوں نے اس انجمن کو یا تو خود چھوڑ دیا یا انجمن نے انہیں نکال باہر کیا[۴] اور انجمن میں کمیونسٹوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ اور شاعروں ادیبوں کی تعداد کم سے کم ہوتی گئی[۵]۔ آخر ۱۹۴۹ء بمبئی کی کانفرنس میں روس کے ساتھ رفاقت کا اعلان کیا گیا[۶]۔ اس طرح وہ ادبی جانب داری کھل کر سامنے آگئی جس پہ پہلے ہندوستان میں آزادی، بھوک اور افلاس کا پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ بمبئی والی کانفرنس سے پہلے لکھنؤ اور حیدر آباد میں جو کانفرنسیں ہوئی تھیں ان میں اس قسم کا کوئی واضح اعلان نہیں ملتا[۷]۔ ترقی پسند تحریک کا آغاز ادبی نقطہ نظر سے زیادہ اچھا نہیں تھا۔ اس کی ادبی کاوشوں میں جن ادیبوں نے بطور خاص ترقی پسندی کا ثبوت فراہم کیا اُن میں احمد علی، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، رشید جہاں، اختر رائے پوری اور حیات اللہ انصاری قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر غلام سرور علیگ ان ادیبوں کی ترقی پسندانہ کاوشوں کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"پہلا دور عام طور پر بحران، رد عمل، جھلاہٹ اور چڑچڑے پن کا دور ہے جذباتیت ہر جگہ غالب ہے۔ مطالعہ کی مکاری نمایاں ہے۔ خیالات میں وسعت کی بجائے تنگی ہے اور اشاریت (نا خوشگوار حد تک) اور پھر جنسی کجروی[۸]"

یہ دور "انگارے" والا دور ہے۔ اس پہلے دور کے بعد ترقی پسند ادب جن منازل سے گزرا اس کے متعلق ڈاکٹر عبد القیوم رقم طراز ہیں۔

"۱۹۳۶ء سے اس تحریک نے نشیب و فراز کی بہت سی منزلیں طے کی ہیں اس عرصہ میں کبھی اس نے اپنے کو محض اشتراکیت کے پرچار تک محدود رکھا۔ کبھی جنسی رجحانات کا غلبہ ہوا اور کسی دور میں ماضی سے نفرت اور بزرگوں کے ورثہ سے انحراف کیا کبھی اقتصادی الجھنوں میں ہی الجھ کر رہ گئی[۹]"

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک میں زیادہ تر لکھنے والے نوجوان تھے۔ جہاں تک پریم چند، جوش، فراق، ساغر، قاضی عبد الغفار، مجنوں گورکھپوری اور ڈاکٹر تاثیر وغیرہ کا تعلق ہے چونکہ یہ لوگ انجمن کے قیام سے پہلے ہی لکھ رہے تھے۔ لہٰذا ان کی تخلیقات نوجوان طبقے سے بہتر ہیں۔ یہ نوجوان لکھنے والے چونکہ اشتراکی زیادہ اور ادیب و شاعر کم تھے لہٰذا انہوں نے جوانی، ناتجربہ کاری اور جوش

---

۴ بحوالہ نگار۔ سالنامہ ۱۹۴۵ء جدید شاعری نمبر۔ ترقی پسند تحریک ایک جائزہ۔ پروفیسر محمد سرور ص نمبر ۶۱/۶۲

۵ نگار سالنامہ ۱۹۴۵ء ص نمبر ۸۱

۶ تنقیدی نقوش ڈاکٹر عبد القیوم ص نمبر ۱۰۵ مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۳ء

۷-۸ بحوالہ نگار سالنامہ ۱۹۴۵ء پروفیسر غلام سرور ص نمبر ۶۸

کا بے جا استعمال کیا۔ جو ان کی تخلیقات میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جس نے ترقی پسند تحریک پر بُرا اثر ڈالا۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ حضرات نے اپنی نظریاتی تبلیغ کیلئے تعلیمی اداروں کو منتخب کیا[۱] اس بات کا اقرار سردار جعفری نے بھی کیا ہے۔

"نئے نئے لکھنے والے اس تحریک سے اثر قبول کر رہے ہیں کیونکہ آج کالجوں اور اسکولوں میں ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جا رہی ہیں[۲]"

اشتراکی نظریات کیلئے اسکولوں اور کالجوں کے انتخاب میں یہ مصلحت تھی کہ نوجوانوں سے زیادہ فعال طبقہ کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ سکول اور کالجوں میں اس تحریک کا مقصد شعر و شاعری یا افسانہ نگاری اور ادب نویسی سکھانا نہیں بلکہ اشتراکی نظریات کا پرچار تھا۔ لہٰذا ان اداروں سے آنے والے نوجوان ادیب و شاعر کم اور اشتراکی زیادہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں ترقی پسند تحریک کا ادبی پہلو کمزور اور سیاسی پہلو زیادہ طاقتور ہے۔ یہ نوجوان جنہوں نے اس تحریک میں حصہ لیا۔ ایک مخصوص نظریئے کے زیر اثر تھے۔ جو زندگی کے بے شمار رنگوں میں سے صرف سرخ رنگ کی پہچان رکھتے تھے۔ اور زندگی کے دوسرے رنگوں سے یا تو آنکھیں بند کر لیتے تھے یا ان میں دوسرے رنگ دیکھنے کی صلاحیت اور تاب نہ تھی۔ جس کی وجہ سے ان کی شخصیت کی بہتر تعمیر نہ ہو سکی۔ تنگ نظری۔ تعصب اور جانب داری نے اُن صلاحیتوں کو پائمال کیا جس کی بنا پر شخصیت میں حسن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں ہمیں کوئی بڑی ادبی شخصیت نہیں ملتی جیسی کہ علی گڑھ تحریک اور تحریکِ رومانیت میں ملتی ہیں۔

علی سردار جعفری نے کرشن چندر، مجازؔ، جاں نثار اختر، اوپیندر ناتھ اشکؔ، سبط حسن، جذبیؔ، احمد عباس، اختر رائے پوری، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احتشام حسین، مخدوم محی الدین، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، سعود اختر جمال، سلام مچھلی شہری، سجاد ظہیر، رشید جہاں، فیض، ڈاکٹر تاثیر، ڈاکٹر علیم اور اختر انصاری وغیرہ کے متعلق لکھا ہے کہ ان میں زیادہ تر طالب علم تھے اور باقی اپنی تعلیم ختم کر چکے تھے[۳] اور یہ کہ ان میں سماجی ذمہ داریوں کا احساس تھا[۴]۔ سیاسی شعور موجود تھا[۵]۔ مزدوروں۔ کسانوں اور طالب علموں کی مختلف تحریکوں میں کام بھی کر رہے تھے[۶]۔ اگرچہ ان کی فکر اور تجربے الگ الگ تھے۔

---

۱ بحوالہ ردِ نیچریت سید جمال الدین افغانی ص نمبر ۱۵۲۔ مکتبہ شعر و ادب لاہور

۲ ترقی پسند ادب علی سردار جعفری ص نمبر ۱۷۔

۳ تا ۶ بحوالہ ترقی پسند ادب علی سردار جعفری ص نمبر ۱۸۴/۱۸۵

مگر جو چیز ان سب میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ وہ سب پرانے طریقوں اور اخلاق کی رسمی پابندیوں سے اکتائے ہوئے تھے[۱]۔ اور ملک کی غلامی کا احساس رکھتے تھے[۲]۔ گویا یہ تمام نوجوان فکر اور تجر... الگ الگ رکھنے کے باوجود چونکہ ترقی پسند تحریک کے تمام لوازم پر متفق تھے لہٰذا یہی گروہ آگے چل کر ترقی پسند ادب کا علمبردار بنا۔ اور ادب کو جذباتی نعروں کے ذریعے سے آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ حقیقت نگاری اور واقعیت پسندی کے نام پر ناگفتنی کو گفتنی بنا ڈالا۔ اور ان میں سے اکثر ادیب و شاعر اپنے محبوب موضوع یعنی امیر۔ غریب۔ مزدور۔ کسان اور بھوک و افلاس کی دنیا کا حقیقی علم نہ رکھتے تھے۔ بقول ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی

"ان میں سے بہتوں کی یہ مزعومہ واقعیت پسندی محض خیالی اور رسمی ہے۔ یعنی جس طرح پرانے دور کے شاعر بغیر عاشق ہوئے عاشقانہ شعر کہتے تھے اس طرح بہت سے ترقی پسند ادیب بغیر کسانوں اور مزدوروں کی دنیا اور ان کی زندگی سے واقف ہوئے۔ کسانوں اور مزدوروں کی رسمی شاعری کر رہے ہیں[۳]"

اس ابتدائی دور کا عرصہ تقریباً پانچ سال ہے۔ اس کے بعد ترقی پسند تحریک کا وہ دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں کچھ اعتدال کا پہلو نمایاں ہے۔ اس دور کا ادب

"ترقی پسند بھی تھا اور ادب بھی[۴]"

اس دور کے نمایاں شاعر جوش۔ احسان دانش۔ فیض۔ راشد۔ مجاز۔ احمد ندیم قاسمی۔ جاں نثار اختر۔ اختر الایمان ہیں۔ جنہیں ترقی پسند ادب میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے[۵]۔ نثر نگاری میں کرشن چندر۔ بیدی۔ منٹو۔ عصمت۔ احمد عباس۔ سہیل۔ اختر انصاری علی عباس حسینی۔ ممتاز مفتی۔ احمد ندیم قاسمی۔ بلونت سنگھ اور [illegible] وغیرہ کے افسانے ادب میں قابلِ قدر اضافے ہیں۔ اس کے بعد

۱-۲ بحوالہ ترقی پسند ادب - سردار جعفری ص نمبر ۱۸۵

۳ ادب کا مقصد ڈاکٹر سید نورالحسن ص نمبر ۲۲ سرفراز قومی پریس

۴ نگار - سالنامہ ۱۹۶۵ء پروفیسر غلام سرور ص نمبر ۶۸

۵ بحوالہ نگار - سالنامہ ۱۹۶۵ء پروفیسر غلام سرور ص نمبر ۶۹

ترقی پسند تحریک کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں تنقید پر زیادہ توجہ دی گئی۔ اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کم

"جھلاہٹ اور بوکھلاہٹ کی ملی جلی کیفیت ہر جگہ نمایاں ہے[۱]۔"

چونکہ یہ انتہا پسندی کا دور تھا لہٰذا تحریک انتشار کا شکار ہوگئی۔ بہت سے لکھنے والوں نے انجمن کو چھوڑ دیا اور کچھ نکال دیئے گئے اور کچھ زیر عتاب آ گئے۔ ان ادیبوں اور شاعروں میں۔ احمد علی۔ اختر رائے پوری۔ عزیز احمد۔ جوش۔ ساغر۔ احمد عباس۔ سہیل عظیم آبادی۔ علی عباس حسینی۔ فیض احمد فیض۔ بیدی۔ منٹو۔ اشک۔ بلونت سنگھ۔ جذبی۔ تاثیر۔ میراجی۔ راشد وغیرہ شامل ہیں[۲]۔ اس دوران میں دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ بہت سے ترقی پسند قلمکار انگریز کی نوکری میں چلے گئے۔ اور ترقی پسندی کا نعرۂ آزادی، برطانوی سامراج زندہ باد کی آواز میں بدل گیا۔ عبید اللہ قدسی اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب اشتراکی روس اتحادیوں میں شامل ہوگیا تو ترقی پسند ادیبوں نے بھی اپنی خدمات برطانیہ کے سپرد کر دیں۔ اب مخالف کا نعرہ لگانے والے روٹی اور بھوک کا نام لے کر کچلی ہوئی انسانیت کو سہارا دینے والے مزدوروں اور کسانوں کی آڑ لے کر انقلاب پیدا کرنے والے ادیب روس کی شرکت کا اعلان ہوتے ہی مخالف کیمپ کے حلیف ہو گئے۔ ان ادیبوں کی ٹولیاں اطلاعات و نشریات، تعلقاتِ عامہ قسم کے محکموں میں ملازم ہوگئیں ان کے تیز خوں فشاں قلم آگ اور انگارے لکھنے والے باغی ادیب اب انگریز کے علمبردار اور پروپگنڈا کرنے والے تھے[۳]۔"

ترقی پسند تحریک کے ادیبوں کے اس طرزِ عمل نے بھی ترقی پسند تحریک کو خاصا نقصان پہنچایا۔ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے ترقی پسندوں نے اپنی تحریک کے منشور میں اپنے سیاسی نظریات کو چھپایا تھا۔ اور انسان دوستی اور قومی مسائل کی بنیادوں پر مختلف خیال

۱	نگار سالنامہ ۱۹۶۵ء پروفیسر غلام سرور	ص نمبر ۴۹
۲	بحوالہ نگار سالنامہ پروفیسر غلام سرور	ص نمبر ۴۹
۳	پاکستان میں ذہنی رجحانات ۔ عبید اللہ قدسی	ص نمبر ۴۲

رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کو اس تحریک میں جمع کر لیا تھا مگر جوں ہی ان کے سیاسی عزائم بے نقاب ہوئے تو ان قلمکاروں میں شدید اختلاف پیدا ہو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد یہ تحریک قائم رہی مگر اس کے اثرات زیادہ نہ تھے۔ بہرحال ترقی پسند تحریک گروہوں میں بٹ گئی۔ سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری انجمن ترقی پسند مصنفین کے بااثر رکن تھے اور کسی شاعر یا ادیب کو ترقی پسند کہنا یا رجعت پسندی کا سراغ لگانا انہیں بااثر ارکان کا کام تھا۔ گویا انجمن ترقی پسند مصنفین میں سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری جیسے لوگوں کی آمریت قائم تھی انہوں نے اپنے گرد ایسے لوگوں کا حلقہ بنا لیا جو ترقی پسند تو تھے مگر شاعر اور ادیب نہ تھے جس کی وجہ سے ترقی پسند شاعر اور ادیب ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اختر الایمان نے اپنے ایک اخباری انٹرویو میں یہ بات کھل کر کہی ہے کہ سجاد ظہیر اور علی سردار جعفری نے تحریک کو اپنی ذاتی تحریک کیلئے استعمال کیا۔[۱] اور یہ بھی بتایا ہے کہ تحریک کے چلانے والوں میں دیانت کی کمی تھی۔[۲] ترقی پسند تحریک میں انتہا پسند زیادہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔[۳] جو اعتدال کے ساتھ لکھتے اور ادب کی بنیادی قدروں کا لحاظ رکھتے تھے۔ اس طرح ادب میں مختلف قسم کی گروہ بندیاں وجود میں آئیں۔ اور ایک دوسرے پر جو اعتراضات کئے گئے۔ وہ ترقی پسندوں کے باہمی اختلاف کا نتیجہ تھے

اثرات۔

ترقی پسند تحریک کے سرسری جائزے سے یہ بات عیاں ہوتی ہے۔ کہ اردو ادب پر اس کے اثرات کچھ زیادہ نہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک میں کوئی عظیم ادبی شخصیت پیدا نہیں ہوئی۔ جو بڑی شخصیتیں اس تحریک میں نظر آتی ہیں وہ کبھی اپنی گروہ بندیوں کی وجہ سے دب گئیں تو کبھی ایک ہی موضوع کی تکرار سے چھوٹی نظر آنے لگیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سارے دور پر علامہ اقبالؔ کی عظیم ادبی شخصیت چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔ ترقی پسندوں نے اس عظیم شخصیت کا طلسم توڑنے کی بڑی کوشش کی۔ ناکام رہے تو انہیں ترقی پسند کہنے لگے۔ مگر علامہ کے آفاقی نظریات، جلدید اور عالمگیر فکر اور ان کے فلسفیانہ افکار کی وسعت ترقی پسندی کے محدود دائرہ میں نہ آسکی۔ علامہ اقبال کی شاعری اور افکار کے اثرات اردو ادب پر اتنے زیادہ ہیں کہ بعد کو آنے والے ادیب اور شاعر بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ لہٰذا ترقی پسند تحریک کی ناکامی کی وجہ جہاں اُن کی آپس کی گروہ بندیاں ہیں وہاں اُن میں کسی عظیم شخصیت کا نہ ہونا بھی ہے۔ اقبال کے بعد

۱۔ بحوالہ نوائے وقت میگزین - انٹرویو اختر الایمان ۹ مارچ ۱۹۸۵ء

کا شعری افق ہمیں اقبال ہی کے فکر سے منور نظر آتا ہے ۔ جس پر ترقی پسندوں کی سرخی نمایاں نہیں ۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ عرصے تک ترقی پسندوں کا یہ نظریہ رہا کہ

"۱۔ انگریز نے نفرت کا بیج بو یا ۔

۲۔ تقسیم بڑی غلطی ہے ۔

۳۔ فسادات میں ہندوؤں سکھوں اور مسلمانوں نے برابر کا حصہ لیا ۔

۴۔ آخر لوگ یہ محسوس کریں گے کہ یہ ہندو ہیں نہ مسلمان بلکہ انسان ایک نیا انسان جنم لے گا گویا سب کمیونسٹ ہوں گے[۱] "

چونکہ اس قسم کے نظریات سے لوگوں کے اس نصب العین کی توہین ہوتی تھی جس کے لئے انہوں نے اپنا سب کچھ لٹا دیا تھا ۔ لہٰذا ترقی پسند عوامی تحریکوں میں مقبول نہ رہے ۔

ترقی پسندوں میں ادب سے کم اور سیاست سے لگاؤ زیادہ ہے ۔ ان کے ہاں سیاسی نظریات کو اولیت دی جاتی ہے ۔ اور ادب انکے نظریات کا خادم نظر آتا ہے ۔ جس کی وجہ سے ادب میں ادبی شان کم اور سیاسی عظمت زیادہ ہے بقول ڈاکٹر انوار الدین سدید

" ترقی پسند تحریک نے ادب میں سیاست کا نقطۂ نظر آزمانے کی جو کوشش کی اُس نے اس تحریک کا دائرہ تخلیق محدود کر دیا تھا[۲] "

قیام پاکستان کے بعد جب ترقی یافتہ ممالک کے ساتھ رابطہ بڑھا ذرائع ابلاغ اور نشر و اشاعت کی گرم بازاری میں اشتراکیت اپنی اصلی صورت میں سامنے آئی تو اس کی کشش میں اضافے کی بجائے کمی آگئی ۔ اب اشتراکی نظریات کوئی نئی چیز نہ تھے بلکہ مختلف نظام ہائے فکر کی تنقید اور پروپیگنڈا نے اشتراکیت کے اُن پہلوؤں کو نمایاں کیا جو زیادہ حسین نہ تھے ۔ لہٰذا انسان دوستی مزدور پروری اور کسان نوازی کا مطلب ترقی پسندی کی بجائے اشتراکیت سمجھا جانے لگا جس کی وجہ ادب میں بھی اس کو

۱۔ پاکستان میں ذہنی رجحانات ۔ عبید اللہ قدسی ص نمبر ۱۴

۲۔ مقالہ اردو کی ادبی تحریکیں ۔ انوار الدین سدید ص نمبر ۵۵۸

شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

لیکن ترقی پسند تحریک کا اپنے آغاز میں ایک مؤثر ترین پہلو یہ تھا کہ

"ترقی پسند تحریک ایک بین الاقوامی رشتہ بھی ہے جو قومی حدود اور جغرافیائی سرحدوں کو توڑ دیتا ہے اور انسانیت کا تصور پیش کرتا ہے۔ جو انصاف۔ محبت اور آزادی کے جذبے سے سرشار ہے اور ایک قوم یا دوسری کی برتری کا قائل نہیں ہے[1]"

اور یہی وہ اوصاف ہیں کہ اگر کوئی تحریک یا گروہ ان کے حامل ہونے کا دعویٰ کرے تو درد مند اور حساس اشخاص کیلئے اس میں بڑی جاذبیت نظر آنے لگتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ساتھ ہمیں ادب میں اور بھی تحریکیں نظر آتی ہیں جو تحلیلِ نفسی۔ ماورائیت واقعیت تاثریت اور اظہاریت ہیں[2]۔ یہ تحریکیں دراصل مغربی ادب کا پرتو ہیں اور کچھ تحریکیں ترقی پسند ادب کا ردِ عمل ہیں[3]۔ جس میں مختلف قسم کے تجربات ہو رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک اُن تحریکوں نے کوئی واضح صورت اختیار نہیں کی۔

---

1. ترقی پسند ادب — علی سردار جعفری — ص نمبر ۱۸
2-3. بحوالہ مباحث — ڈاکٹر سید عبداللہ — ص نمبر ۲۰۵/۲۰۴

سیاسی تحریکیں

برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے لیکر اگست ۱۹۴۷ء تک آزادی کی جدوجہد مختلف طریقوں سے جاری رہی آزادی کی اس جدوجہد میں مسلمانوں کا من حیث القوم جتنا حصہ ہے بلاشبہ ہندو برصغیر پاک و ہند کی اکثریت والی قوم تھی ۔ مگر آزادی کی جدوجہد میں اس کا حصہ اس اعتبار سے کم ہے ۔ انگریز کی آمد سے پہلے مسلمان بااقتدار تھے ۔ اس لحاظ سے اُن میں احساس تفاخر کا پیدا ہو جانا یقینی تھا ۔ مسلمانوں کا اقتدار بڑی تیزی سے روبہ زوال تھا مگر اپنی عظمت اور برتری کا احساس ابھی موجود تھا ۔ انگریز نے جن حربوں سے ہندوستان پر قبضہ کیا تھا اس کی بنا پر اُس وقت کے مسلمان انگریزوں سے شدید نفرت کرتے تھے بقول مولانا غلام رسول مہر

"ابتدا میں انہیں (انگریزوں کو) مختلف دیسی حکمرانوں کے کارندے ، ایجنٹ اور مختار سمجھ کر قبول کیا گیا جب معلوم ہوا کہ انہوں نے چالاکی اور عیاری سے سب کچھ سنبھال لیا تو ان کے خلاف ہمہ گیر نفرت کی لہر دوڑ گئی ۔"[1]

مسلمانوں کیلئے انگریز سے نفرت کا صرف یہی سبب کافی تھا کہ سوّر کھانے والی قوم ہے ۔ مگر انہوں نے تو مسلمانوں سے اقتدار چھینا تھا لہٰذا مسلمانوں کے لئے یہ بڑا ہی کٹھن مرحلہ تھا کہ کل کے تاجروں کو آج کے حکمران تسلیم کر لیا جائے ۔ انہوں نے انگریز سے نفرت کے ساتھ ساتھ ان سے نجات حاصل کرنے کیلئے مختلف طریقے اختیار کئے ۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی خوئے غلامی مسلمانوں کے طویل دورِ اقتدار کی وجہ سے پختہ تر ہو چکی تھی ۔ جس کی بنا پر انہوں نے نئے آنے والے آقاؤں کو خوش آمدید کہا ان کیلئے غلامی کی اس نئی زنجیر میں بڑی چمک تھی لہٰذا انہوں نے اطاعت و وفا شعاری کی وہ ساری رسومات ادا کیں جو بتوں کو خدا بنا دیتی ہیں ۔ انہوں نے اپنی ساری خدمت گزاریاں اپنے نئے آقاؤں کیلئے وقف کر دیں ۔ جس کی وجہ سے وہ انگریز کے محبوب نظر ٹھہرے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

"بنگال پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط اور اس کے ساتھ ہندوؤں کے اشتراک نے مسلمانوں کے تمام طبقات کو متاثر کیا ان دونوں نے تجارت میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کیا تھا اور تجارت سے مسلمانوں کو یا تو بالکل دستبردار کر دیا یا اپنی اجارہ داری قائم کر کے انہیں بے بس کر دیا"[2]

---

[1] غلام رسول مہر ۱۸۵۷ء صفحہ نمبر ۲۲

[2] تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ڈاکٹر معین الدین عقیل صفحہ نمبر ۷۴ انجمن ترقی اردو کراچی

صرف تجارت بلکہ زراعت اور مال گزاری جمع کرنے کے اختیارات بھی مسلمانوں سے چھین لئے اور بندوبست دوامی کے ذریعہ مسلمانوں کی زمینیں بھی ہندوؤں کے قبضے میں چلی گئیں[۱]۔ اس طرح پرانے زمینداروں کی جگہ جو مسلمان تھے نئے زمیندار بنائے گئے جو ہندو تھے۔ بقول پنڈت جواہر لال نہرو

"نتیجہ یہ ہوا کہ بعض صوبوں میں خصوصاً بنگال میں پرانے زمیندار ختم ہوگئے اور نئے لوگوں نے جو تجارت پیشہ اور دولت مند طبقوں سے تعلق رکھتے تھے انکی جگہ لے لی اس طرح بنگال ایک صوبہ بن گیا جس میں زمیندار اکثر ہندو تھے۔ اور کاشتکار زیادہ تر مسلمان[۲]۔"

اس طرح یہ ابتدائی دور مسلمانوں کی تباہی کا باعث بنا جس میں انگریز کے ساتھ ہندو بھی شریک تھے۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو آگے بڑھاکر مسلمانوں کو کمزور کر دینے کے عمل کی ابتدا اسی عہد میں کی طفیل منگلوری کمپنی کے اس عہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مختصر یہ کہ کمپنی نے اپنی تجارت اور حکومت کے مخلوط عہد میں حکومت کے پردہ میں خوب زرکشی کی ہندوستان کی صنعت و حرفت اور تجارت کو برباد کیا انہیں بڑے عہدوں سے خارج کیا۔ عدالتوں کو ذریعہ آمدنی قرار دینے کے ساتھ ہندوستانیوں سے تحقیر کا برتاؤ کیا[۳]۔"

ہندوستانیوں میں صرف مسلمان ہی وہ طبقہ تھا جس کے پاس حکومت و اقتدار کے ساتھ ساتھ دولت و ثروت کی بھی کمی نہ تھی لہٰذا انگریز نے ہندوستان کی دولت کو انگلستان منتقل کرنے کے جو ناجائز ذرائع استعمال کئے[۴]۔ انہیں بنگال کی لوٹ کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی زد بطور خاص مسلمانوں پر پڑی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی دولت جب انگلستان پہنچی تو وہاں صنعتی انقلاب برپا ہوگیا۔ بقول پنڈت نہرو

۱۔ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ڈاکٹر معین الدین عقیل ص نمبر ۱۷ انجمن ترقی اردو کراچی

۲۔ تلاش ہند جواہر لال نہرو ص نمبر ۴۰ جلد دوم مکتبہ جامعہ دہلی

۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل طفیل منگلوری ص نمبر ۱۰۲ حماد الکتبی شیش محل روڈ لاہور

۴۔ بحوالہ تلاش ہند نہرو ص نمبر ۲۷ جلد دوم

"بنگال آج اس بات پر فخر کرے جو بے جا نہ ہوگا کہ انگلستان میں صنعتی انقلاب پیدا کرنے کا باعث بڑی حد تک وہی ہے[1]"

یہ صورت حال بنگال ہی تک محدود نہ تھی بلکہ جہاں جہاں بھی انگریزی اقتدار قائم ہوتا گیا مسلمانوں کا افلاس بڑھتا چلا گیا۔کیوں کہ انگریز کی ہوسِ زر ہندوستان میں کبھی کم نہیں ہوئی یہ ہوس کسی فردِ واحد کی ہوس نہ تھی کہ پوری ہو جاتی بلکہ اس کا تعلق پوری انگریز قوم اور ہندوؤں کی کمیشن سے تھا۔جسے پورا کرنا اکیلے مسلمانوں کے بس کی بات نہ تھی پنڈت جواہر لال لکھتے ہیں کہ

"ہندوستان کے جو حصے برطانوی حکومت کے زیر سایہ سب سے زیادہ عرصہ تک رہے وہی آج سب سے زیادہ غریب ہیں۔ درحقیقت ایک نقشہ تیار کیا جا سکتا ہے۔جس میں برطانوی حکومت کی مدت اور افلاس کی زیادتی کا تناسب دکھایا جا سکے[2]۔"

اور اسی نقشے سے یہ بات بھی بہ آسانی واضح ہو سکتی ہے کہ ہندوستانی باشندوں میں اِس افلاس کا شکار ہونے والے زیادہ تر مسلمان تھے۔ یہ بات اِس طرح بھی ثابت کی جا سکتی ہے۔کہ انگریز کی حکمت عملی یہ تھی کہ جو علاقے انگریز کے قبضے میں آتے وہ ان علاقوں کی حکمران قوت کو خاص طور پر توڑ دیتے تھے۔ جس سے وہ علاقہ چھینا گیا ہوتا تھا ظاہر ہے ہندوستان میں مسلمانوں کا طبقہ خاص طور پر حکمران طبقہ تھا۔جس کی طاقت کو توڑنے کیلئے انگریز نے بھرپور کوشش کی اور ہندوؤں نے اس کوشش میں اُن کا ہاتھ بٹایا۔ اس طرح ہندوؤں کی حالت مسلمانوں سے بہتر ہو گئی۔مسلمانوں میں متاعِ کارواں سے زیادہ احساسِ زیاں موجزن تھا لہٰذا انہوں نے اپنے اقتدار مال و دولت اور عزت و افلاس کی پروا نہیں کی بلکہ اپنی اقتصادی، تعلیمی اور سماجی پسماندگی کا علاج اپنے دین میں دیکھا اور دین کی طرف رجوع کیا۔ ان کے نزدیک مذہبی اصلاح ہی سے اُن کا گزرا ہوا زمانہ واپس آ سکتا تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں مذہبی تحریکوں میں سیاسی شعور کی بھی کمی نہیں۔ سب سے پہلے بنگال کا علاقہ انگریز کے قبضہ میں آیا اور مسلمانوں نے اسلام کے احیاء کیلئے اپنا اصلاحی کام بھی یہیں سے شروع کیا۔ سب سے پہلے مولوی شریعت اللہ نے

---

[1] تلاش ہند جواہر لال نہرو ص نمبر ۲۷-۲۵ جلد دوم

[2] بحوالہ تلاش ہند جواہر لال نہرو ص نمبر ۲۴ جلد دوم

نے جو بہادر پور ضلع فرید پور کے رہنے والے تھے بنگال میں ۱۸۰۴ء میں "فرائضی"[1] کے نام سے ایک جماعت قائم کی اور یہ تحریک "فرائضی تحریک" کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس کا مقصد رسوم و عقائد کی اصلاح تھا۔[2] جس نے بہت جلد بنگال میں اپنا ایک بڑا حلقہ اثر پیدا کر لیا۔ بعد کو اس میں ایسی تعلیمات بھی شامل ہو گئیں جس سے اس کے سیاسی ہونے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مثلاً حاجی شریعت اللہ کا یہ فتویٰ کہ بنگال اب دارالاسلام نہیں رہا۔[3] دوسری تحریک "تیتو میر کی تحریک" تھی۔ اس کا مقصد بھی فرائضی تحریک کی طرح اصلاح مذہب ہی تھا مگر بعد کو عوامی اور سیاسی رنگ اختیار کر گئی۔[4] تیتو میر نے انگریزی اقتدار کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کیلئے زبردست کوشش کی مگر انگریزوں کی منظم طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے لہٰذا ناکام ہوئے۔[5] اس سلسلے کی ایک اور کڑی تحریک مجاہدین تھی۔ سید احمد شہید اور ان کے رفقاء نے بظاہر سکھوں کے خلاف جہاد میں حصہ لیا مگر درحقیقت وہ سکھوں کو شکست دیکر اپنی ایک آزاد حکومت قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ انگریز کے خلاف جہاد کیا جا سکے۔[6] اس تحریک کے متعلق ڈاکٹر معین الدین عقیل تحریر فرماتے ہیں کہ

> اس تحریک کے ساعی۔ مقاصد اور جدوجہد اس کو برعظیم کی واحد اور منفرد تحریک ثابت کرتے ہیں جو عام مسلمانوں کے احساس اور ارادے سے پیدا ہوئی اور اس کی قیادت بھی ان ہی کے ہاتھ میں رہی جو عوام میں سے تھے۔ یہ تحریک اور اس کا طویل جہاد اس وقت کے سارے ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری اور آزادی کی خواہش کے بین ثبوت کو پیش کرتا ہے۔[7]

بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

> اسلامی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو اس ملک میں اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ سب سے زیادہ درخشاں ہے۔[8]

لیکن مسلمانوں کی ساری جدوجہد اپنے ماضی کے حصول کے لئے تھی۔ جب کہ ہندوؤں کے پیش نظر مستقبل تھا۔[9] لہٰذا انہوں نے

۱-۶ بحوالہ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص نمبر ۴۵/۴۶/۴۷/۵۱/۵۲

۷ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص نمبر ۵۳/۵۴

۸ شاہ اسماعیل شہید مرتبہ عبداللہ بٹ دیباچہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ص نمبر ۱۸ یکم اکتوبر ۱۹۴۳ء

۹ تحریک آزادی میں اردو کا حصہ ص نمبر ۷

انگریزوں سے تعاون کیا اور مختلف اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ اپنی قوم کو منظم کیا اور انگریز کی مدد سے مسلمانوں کے آگے نکل گئے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوؤں نے مسلمانوں کا ساتھ اُسی حد تک دیا جہاں تک اُن کے مفادات کا تقاضا تھا۔ ورنہ آزادی کی اِس جنگ اور اس کے نتائج کے واحد ذمہ دار صرف مسلمان تھے بقول مولانا غلام رسول مہر

> آپ ۱۸۵۷ء کی سرگزشت سرسری نظر سے بھی دیکھ جائیں گے تو واضح ہو گا کہ اس جہاد میں سب سے بڑھ کر حصہ مسلمانوں نے لیا۔ ملک میں قلت کے باوجود سب جماعتوں اور گروہوں سے منزلوں آگے نکل گئے۔[۱]

سرسید احمد خاں نے رسالہ اسباب بغاوت ہند میں جنگ آزادی کی مندرجہ ذیل وجوہات بیان کی ہیں۔

۱۔ غلط فہمی رعایا

۲۔ ایسے آئین وضوابط اور طریقہ حکومت کا رواج جو اس ملک کی حکومت اور ہندوستانیوں کے عادات کے مناسب نہ تھے۔

۳۔ گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار و عادات اور اُن مصائب سے جو اُن پر گزرتی تھیں ناواقف رہنا۔

۴۔ گورنمنٹ کی طرف سے اُن امور کا ترک ہونا جن کا بجالانا حکومت پر واجب تھا۔

۵۔ بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔[۲]

سرسید چونکہ مسلمان قوم کا دفاع چاہتے تھے للذا انہوں نے ان وجوہات کا سہارا لیا ورنہ بقول مولانا غلام رسول مہر

> جنگ آزادی کا بنیادی اور اساسی سبب ایک اور صرف ایک تھا اور وہ یہ کہ انگریزی حکومت اجنبیوں کی حکومت تھی۔[۳]

۱۔ ۱۸۵۷ء غلام رسول مہر مقدمہ ص نمبر ۵ کتاب منزل لاہور

۲۔ اسباب بغاوت ہند۔ سرسید احمد خاں ص نمبر ۱۱۸ کراچی

۳۔ ۱۸۵۷ء غلام رسول مہر ص نمبر ۲۱

مولانا ابوالکلام آزاد نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈز کمیشن میسور کے اجلاس منعقدہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء میں اپنے صدارتی خطبے میں ایک دستاویزی شہادت کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ

ہندوستانیوں کو یہ احساس اور یہ شعور ہو چلا تھا کہ ایک بیرونی نسل نے ان کے ملک میں غلبہ و اقتدار حاصل کر لیا ہے۔ جب عوام پر یہ احساس غالب ہو گیا تو اس نے سرکشی اور بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔[1]

یعنی مسلمانوں نے ایک دفعہ پھر انگریزی حکومت سے نجات حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر ناکام رہے۔ ۱۸۵۷ء کی اس جنگ آزادی کی ناکامی کے ساتھ ہی ہندوستان مکمل طور پر سلطنت برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ اور مسلمانوں کی عظیم سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو گیا۔ مسلمان قوم کی بہادری۔ جرأت اور جوش و جذبہ سے انگریز اچھی طرح واقف تھے۔ سراج الدولہ۔ حیدر علی۔ سلطان ٹیپو اور مجاہدین بالاکوٹ کی جان فروشیوں اور قربانیوں کی یاد ابھی تازہ تھی۔ انگریز یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ اس جنگ آزادی کو دبانے میں اس نے کیسی چالبازی۔ حیلہ سازی اور دھوکہ دہی سے کام لیا۔ وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھا کہ انگریز قوم مسلمانوں کے مقابلے میں کتنی بہادر ہے۔ اس جنگ آزادی میں فوج کے علاوہ عام مسلمانوں نے بہادری اور استقامت کے جو درخشاں کارنامے انجام دیئے۔ انہوں نے انگریزوں کے حوصلوں کو پست کر دیا۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہندوستان میں نہتے مگر بہادر اور جاں فروش مسلمانوں سے ہمیشہ خوف کھاتی رہی۔ اس بات کا اعتراف ایک انگریز مصنف نے اس طرح کیا ہے۔

ہندوستان میں یورپین قوم غدر کے بعد اس درجہ خائف ہو گئی کہ نہایت معمولی سے اشتعال انگیز واقعہ سے بھی بھڑک اٹھتی ہے۔ چنانچہ اس کے دوربین اور محتاط افراد فی الفور مارشل لاء کے نفاذ کی ضرورت پر اعلانیہ زور دینا شروع کر دیتے ہیں۔[2]

انہوں نے مسلمانوں کو سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جنگ آزادی کا مجرم قرار دے کر ظلم و تشدد کا بطور خاص نشانہ بنایا۔ دہلی میں فسادات کی ایک جھلک مولانا فضل حق خیر آبادی کے ان الفاظ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

---

1. آزاد کی تقریریں۔ ابوالکلام آزاد۔ مرتبہ انور عارف ص نمبر ۲۰۴ مکتبہ ماحول کراچی۔ بار اول ۱۹۶۱ء
2. انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ص نمبر ۱۳۱

ہزاروں بھاگنے والوں میں تھوڑے ہی بچے باقی پکڑے گئے۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ چاندی، سونا نکلتا پہلے تو وہ چھین لیتے پھر چادر، تہبند، قمیض، پاجامہ جو کچھ ہاتھ لگتا نہ چھوڑتے۔ اس کے بعد افسروں کے پاس پہنچا دیتے وہ ان کیلئے قتل یا پھانسی کی سزا کا فیصلہ کرتے جوان، بوڑھا، شریف اور رذیل سب کے ساتھ یہی سلوک ہوتا۔ اس طرح پھانسی پانے والوں اور قتل ہونے والوں کی تعداد ہزار ہا تک پہنچ گئی، ظالموں کے ظلم کا شکار اکثر و بیشتر مسلمان تھے۔[1]

مولانا فضل حق خیرآبادی کے بیان کی تصدیق مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ

"کوپر (Cooper) ڈپٹی کمشنر امرتسر غدر کے شروع ایام میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے جس پر اس نے خود بھی سختی سے عمل کیا تھا فخریہ طور پر اس طرح بیان کرتا ہے کہ پنجاب کے حکام نے تو اس اصول پر عمل کیا کہ ایسے حالات میں ابتدا ہی میں اس قسم کی وحشیانہ سختی سے جواب دیا جائے کہ انتقام کا تصور بھی فریق مخالف کو لرزہ براندام کر دے۔[2]

اور بقول شمس الدین صدیقی "وہی قتل عام، وہی لوٹ مار، وہی موت اور کالے پانی کی سزائیں تنوع اگر نظر آتا تھا تو تفاوت اور شقی القلبی کے نئے نئے طریقوں میں ہیں۔[3] "

غرض اس انتقام کے بعد انگریز کی حکمت عملی اس اصول پر چلی کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کو زیادہ کمزور، ناکارہ اور محتاج بنا دیا جائے۔[4] کیونکہ انگریز اچھی طرح جانتا تھا کہ اس تحریک آزادی کو کچلنے میں خود ہندوستانیوں کا بھی حصہ ہے جس نے اسکی بنیادیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔[5]

---

[1] مولانا فضل حق خیرآبادی - باغی ہندوستان ص نمبر ۲۶۹ - ۲۷۰ مترجم عبدالشاہد خاں شیروانی

[2] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ - مسٹر ایڈورڈ ٹامسن - ترجمہ شیخ حسام الدین ص نمبر ۱۸ اردو اکیڈمی لاہور

[3] تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاکستان و ہند - نویں جلد ص نمبر ۲ سیاسی - فکری - معاشرتی اور تہذیبی پس منظر - ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

[4] بحوالہ " " " " " " " ص نمبر ۲

[5] بحوالہ تلاشِ ہند نہرو ص نمبر ۴۷

انگریز کے اِس طرزِ عمل کی وجہ یہ بنیادی خوف تھا کہ مسلمان ایک بہادر اور باحوصلہ قوم ہے۔

"کہیں حکمران بننے کے بجائے کچھ لوگ کچھ گرفتار نہ کریں[1]"

لہٰذا ان کے مقابلے میں ہندوؤں کی حالت بہتر بنائی گئی تاکہ انگریزی اقتدار کے لئے مقامی باشندوں کا تعاون حاصل کیا جا سکے۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو گئی جس کا اعتراف خود انگریزوں کو بھی تھا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب "ہمارے ہندوستانی مسلمان" اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

ایسی حالت میں مسلمان قوم کو بے شمار مسائل درپیش تھے۔ بقول شیخ اکرام

مسلمانوں کے مصائب اگر تمام تر اقتصادی ہوتے تب بھی ان کا حل آسان نہ تھا لیکن اس زمانے میں انہیں جو نئے مسائل پیش آ رہے تھے وہ زندگی کے ہر شعبے کے متعلق تھے۔[2]

ان مسائل کا تعلق تعلیم۔ سیاست۔ مذہب۔ تمدن اور ادب سے تھا۔ اور انہیں مسائل کے حل کیلئے مسلمان قوم ۱۸۵۷ء کے بعد حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے دو علیحدہ علیحدہ گروہوں میں بٹ گئی۔ ایک گروہ نے مصلحت کوشی اور دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے ایک منظم منصوبے کے تحت انگریز کے ساتھ تعاون کی پالیسی اختیار کی[3] تاکہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کر کے حکومت میں عہدے حاصل کر سکیں۔ تاکہ ان کی اقتصادی اور معاشرتی زندگی بہتر ہو۔ اور وہ آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کے لئے صحیح معنوں میں قابل ہو جائیں۔ اس تحریک کو علی گڑھ تحریک کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرے گروہ نے اپنا پرانا طرزِ عمل ترک نہ کیا۔ انہوں نے قطعی طور پر انگریزوں سے تعاون نہ کیا بلکہ انگریز دشمنی کی پرانی روش پر چلتے رہے اور احیائے اسلام کیلئے ملک گیر تحریک شروع کرنے کا شعار اپنائے رکھا بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل

"اس تحریک نے پہلے دیوبند اور بعد ندوہ جیسی جماعتی شکلیں اختیار کیں۔ اور ان کے زیرِ اثر ملک کے گوشے گوشے میں مختلف مکاتب، مدارس، انجمنیں اور ادارے قائم ہوئے یہ ایک ایسا جرأت مندانہ اور حوصلہ افزا اقدام تھا کہ اس سے قوم میں آزادی اور سربلندی کا احساس و جذبہ کم نہیں ہوا۔[4]"

---

۱ تلاش ہند — نہرو — ص نمبر ۶۷

۲ موجِ کوثر — شیخ اکرام — ص نمبر ۷ — فیروز سنز لمیٹڈ لاہور

۳ جنگ آزادی میں اردو کا حصہ — ص نمبر ۸۴ عقیل

۴ جنگ آزادی میں اردو کا حصہ — ص نمبر ۸۴-۸۵ — معین الدین عقیل

ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ان دونوں گروہوں کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھا ہے

"دوسرے گروہ نے پہلے گروہ کے مقابلے میں مراجعت پسندی اور روایت پرستی
کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی کو زیادہ اہمیت دی ہے"[1]

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو احیاء اسلام کا طرفدار تھا ماضی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ یہ زمانہ ماضی قریب کا زمانہ ہے۔ گویا کل کی بات ہے۔ جب ہندوستان پر مسلمانوں کا اقتدار عروج پر تھا۔ جب کہ حال اور مستقبل میں اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا لہذا یہ گروہ روایت پرستی کے پردے میں اقتدار پرستی کا نظریہ رکھتا تھا تاکہ انگریز کی غلامی سے نجات مل سکے اور ان کی حکومت قائم ہو۔ اس کیلئے انہوں نے کوششیں بھی کیں۔ شیخ اکرام نے "موج کوثر" میں سید سلیمان ندوی کے حوالے سے علامہ شبلی کا ایک بیان نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں ۔

"دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں اور مسلمانوں کی ترقی یہ
ہے کہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ صحابہؓ کی صف میں جا کر مل جائیں"[2]

اس گروہ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور لکھتے ہیں کہ

"اگر علامہ (سلیمان ندوی) کا ترقی سے مفہوم فقط اخلاقی۔ مذہبی اور روحانی ترقی ہے تو ہمیں
اس سے پورا اتفاق ہے۔ لیکن اگر علامہ کا ترقی سے منشا ہر قسم کی دینی دنیوی ترقی ہے (اور
بادی النظر میں یہی ان کا مفہوم ہے) اور ان کا خیال ہے کہ مسلمان ان تمام علمی۔ صنعتی۔ فنی
اور اقتصادی ترقیوں سے محروم رہ کر وہ جو عہد صحابہؓ کے بعد بنی نوع انسان نے حاصل کی
ہیں۔ دنیوی ترقی میں بھی دوسری قوموں سے بڑھ سکتے ہیں تو یہ فقط ان کی خوش فہمی ہے"[2]

شیخ اکرام صاحب نے ایک مذہبی عالم کے قول کو انگریزی کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے نتائج درست نہیں سب سے پہلی بات یہ کہ سید سلیمان ندوی کا ترقی سے مفہوم اسلامی ترقی ہے۔ جس میں دین اور دنیا دونوں کی فلاح مضمر ہے۔ جسے اخلاقی مذہبی اور روحانی حلقوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ کہ عہد صحابہ میں بنی نوع انسان نے جو ترقی کی تھی اس

---

[1] جنگ آزادی میں اردو کا حصہ — معین الدین عقیل — ص نمبر ۸۴/ ۸۵

[2] موج کوثر — شیخ محمد اکرام — ص نمبر ۲۸۲

وقت کے مسلمان ان تمام علمی، صنعتی، فنی اور اقتصادی ترقیوں سے محروم ہیں تو امر دور صحابہؓ میں واپسی سے مراد موجودہ دور کو دورِ صحابہؓ بنانا ہے۔ تا کہ اس دور میں بھی مسلمان ویسی ہی زندگی بسر کریں جیسے صحابہؓ کیا کرتے تھے۔ جس طرح صحابہؓ نے اپنے دور میں ہر طرح کی ترقی کی تھی۔ مسلمان اس دور میں کر سکیں۔ اس لئے کہ شیخ صاحب کی بیان کردہ یہ علمی۔ صنعتی۔ فنی اور اقتصادی ترقیاں اسلامی نظام کا حصہ ہیں جسے الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ گروہ جب ترقی کی بات کرتا ہے تو وہ احیاء اسلام کی بات کرتا ہے۔ جس میں ترقی کے مندرجہ بالا تمام مفاہیم مضمر ہوتے ہیں۔ بقول علامہؒ اقبال

"اسلام کا مذہبی نصب العین اِس کے معاشرتی نظام سے جو خود اس کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں ہے دونوں ایک دوسرے کیلئے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔[1]"

اِس کے علاوہ علامہ اقبال کی ساری کاوشیں ماضی کی روشنی سے حال کو منور کرنے کیلئے ہیں۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی صرف اور صرف قرونِ اولیٰ کے اسلام سے وابستہ ہے۔ اس کے علاوہ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا کی کوئی قوم اپنے ماضی سے استفادہ کئے بغیر ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ ترقی کی بنیادیں ہمیشہ ماضی کی مستحکم اقدار پر استوار ہوتی ہیں اور انہی بنیادوں پر ترقی کے محل تعمیر ہوتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی

"دنیا جہاں کی تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کر ڈالئے زندگی کے ہر شعبے کی تاریخ پر نظر دوڑائیے آپ کو ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی جہاں نئے لوگوں نے اپنے ماضی سے مدد نہ لی ہو۔[2]"

کانگریس کا قیام

مسلمانوں کی حالت ابھی کچھ زیادہ نہیں سنبھلی تھی کہ ہندوستان میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا قیام مسٹر ہیوم ایک برطانوی عہدہ دار کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ اس تنظیم کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے خیالات سے

---

[1] خطباتِ اقبال مرتبہ رضیہ فرحت بانو ص نمبر ۳۲ حالی پبلشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی۔ بار اوّل سنہ ۱۹۴۷

[2] بہترین مقالات جلد اوّل مرتبہ اختر جعفری۔ مضمون روایت کی اہمیت۔ ص نمبر ۱۰۴/۱۰۵
ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ مکتبہ اردو۔ لاہور

حکومت برطانیہ آگاہ رہے اور ہندوستانیوں کی طرف سے کسی شورش یا بغاوت کا پہلے ہی سے سدباب ہوتا رہے نیز حکومت کو ہندوستانیوں کا تعاون ملتا رہے۔ مسٹر ہیوم نے پہلے اپنی تجویز کی منظوری وائسرائے سے لی۔ اس کے بعد انہوں نے انگلستان میں لارڈ رپن۔ لارڈ ڈلہوزی۔ سرجیمس کیرڈ۔ جان برائٹ۔ مسٹر ریڈ۔ مسٹر سلیگ اور دوسرے انگریز مدبرین سے مشورہ کے بعد اس کو عملی شکل دی[1]۔ کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء بمبئی میں منعقد ہوا[2]۔ کانگریس پورے ہندوستان کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ جس میں کچھ انگریز۔ پارسی اور مسلمان بھی شریک تھے مگر اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ سنہ ۱۹۱۶ء تک کانگریس کے ۳۲ اجلاس ہو چکے تھے اور ان ۳۲ سالانہ اجلاسوں کی صدارت ۵ دفعہ انگریز ۴ دفعہ پارسی اور ۳ دفعہ مسلمانوں کے حصہ میں آئی[3]۔ اور باقی اجلاسوں کی صدارت ہندوؤں نے کی۔ کانگریس چونکہ انگریزوں کی ساختہ پرداختہ تھی لہٰذا حکومت کی وفاداری، تعاون اور ہندوؤں کیلئے مراعات حاصل کرنا اس کا شعار رہا۔ ہندو قومیت کی ترویج میں کانگریس کا خاص حصہ تھا۔ عبدالوحید خاں لکھتے ہیں۔

"سنہ ۱۹۲۰ء تک کانگریس کی یہ حالت تھی کہ ہر اجلاس میں سب سے پہلا ریزولیشن بادشاہ سلامت کی وفاداری کا ہوتا تھا۔ جس کو تمام مندوبین کھڑے ہو کر منظور کرتے تھے۔ اور اجلاس میں سب سے اوپر یونین جیک لہرایا جاتا تھا[4]۔"

ڈاکٹر عابد حسین کے قول کے مطابق

کانگریس کی نشوونما سنہ ۱۹۱۹ء تک۔ ۔ ۔ ۔ کوئی بیس سال کی عمر تک کانگریس گویا انگریزوں کے دامنِ تربیت میں پلی[5]۔

اس تمام عرصہ میں کانگریس کا مقصد کبھی بھی ہندوستان کی آزادی نہیں تھا بلکہ ہندوؤں کے مخصوص مفادات کا تحفظ رہا۔ کانگریس کو ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی تنظیموں کا تعاون بھی حاصل رہا۔ جو انہوں نے عیسائی

۱-۲ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا۔ حسن ریاض۔ ص نمبر ۳۳-۳۲ کراچی یونیورسٹی کراچی

۳ بحوالہ تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت ص نمبر ۵۲۱ ہاشمی فرید آبادی

۴ تقسیم ہند - عبدالوحید خاں ص نمبر ۹۲

۵ قومی تہذیب کا مسئلہ ڈاکٹر عابد حسین خاں۔ ص نمبر ۲۰۱ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

مشنریوں سے ہندو مذہب کو بچانے اور ہندو مذہب کی اصلاح کیلئے شروع کی تھیں مثلاً برہمو سماج جسے بابو رام موہن رائے نے قائم کیا اور کیشب چندر رائے[1] اس کی ترویج کی[2] - پونا میں پرارتھنا سماج جس کے بانی ایم - جی - رانا ڈے تھے[3] - شمالی ہند میں آریہ سماج[4] - مدراس میں تھیوسوفیکل سوسائٹی وغیرہ[5] -

تقسیم بنگال

اسی عرصہ میں لارڈ کرزن نے بنگال کو تقسیم کر دیا اور اس تقسیم سے جو کہ انتظامی امور کے تحت عمل میں آئی تھی[6] مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا تھا لہٰذا ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف تحریک شروع کر دی - بقول محمد مرزا دہلوی

کانگریس نے اس مقامی سوال کو آل انڈیا سوال بنا دیا سارے ہندوستان میں جگہ جگہ ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف احتجاجی جلسے کئے - اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا[7] -

---

[4] پاکستان ناگزیر تھا حسن ریاض ص نمبر ۴۱

[5] اس سلسلہ میں عبدالوحید خان نے اپنی کتاب تقسیم ہند میں لکھا ہے کہ

۱۹۰۵ء میں حکومت برطانیہ نے مسلمانوں کا ایک مطالبہ تسلیم کیا اور بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کیا تاکہ مشرقی بنگال میں مسلمان اکثریت میں ہو جائیں اور کچھ مراعات حاصل کر سکیں

(تقسیم ہند ص نمبر ۹۲)

یہ غلط فہمی لارڈ کرزن کے اس بیان سے پیدا ہوئی جو انہوں نے تقسیم بنگال کا اعلان کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس تقسیم سے بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی مقصود ہے -

(مسلمانان ہند کی حیات سیاسی - ص نمبر ۶۰ - محمد مرزا دہلوی)

جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں - مصنف انسائیکلوپیڈیا امریکانا نے درست لکھا ہے کہ

" His Partition of Bangal into two prouinces, in the intrest of bureaci -

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

کانگریس کا یہی طرزِ عمل اس بات کو ثابت کر دیتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی - کیونکہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا - اِن حالات میں جب کہ تمام ہندوستان کی نمائندہ جماعت کانگریس صرف ہندوؤں کی ترجمان بن گئی تو مسلمانوں پر اس حقیقت کا منکشف ہو جانا ایک فطری بات تھی کہ اُن کی کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو کانگریس کی اس ناانصافی کو حکومت کے گوش گزار کر سکے - لہٰذا مسلمانوں کے سرکردہ افراد نے غور و فکر کے بعد اپنی ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا - تقسیم بنگال سے انگریز نے مسلمانوں کے جائز حقوق کو بھی اس لئے پامال کیا کہ انہیں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں سے

بقیہ حاشیہ

Cratic efficiency."

THE ENCYCLOPEDIA AMERICANA Page No. 953.

یعنی تقسیم بنگال انتظامی معاملہ تھا - مسلمانوں کو بطور خاص کوئی مراعات دینا مقصود نہ تھا - یہ الگ بات کہ یہ تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید تھی - اور حقیقت یہ ہے کہ

تقسیم بنگالہ کا اعلان مسلمانوں کی درخواست پر نہیں ہوا تھا بلکہ خود بنگال کے اکثر مسلمان اِس کے خلاف تھے -

(مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی - ص نمبر ۴۳ - محمد مرزا دہلوی)

بقیہ حاشیہ ۴ مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی ص نمبر ۴۳

نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا بلکہ بنگالی تشدد پر اتر آئے -

ہمدردی تھی جو ہندوستان میں اس کے اقتدار کے معاون تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ منٹو مارلے سکیم اصلاحات کے ذریعہ سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق مل گیا[۱]۔ جسے کانگریس پسند نہ کرتی تھی مگر پھر بھی کانگریس کے ارکان حکومت برطانیہ کی تعریف و ستائش کرتے رہے اور فیصلہ کیا گیا کہ گورنر جنرل کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جائے۔ جس میں اس کا شکریہ ادا ہو[۲]۔ اگلے سال یعنی دسمبر ۱۹۱۱ء میں خود شاہِ انگلستان نے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا[۳]۔ کیونکہ انگریز ہندوؤں کو ناراض کرنا نہیں چاہتے تھے۔ مسلمانوں سے تو انگریز خود ناراض تھے۔ جس کی بنا پر مسلمانوں کا ایک گروہ مسلسل کوشش کر رہا تھا کہ انگریز کی غلط فہمی دور کر سکے۔ مگر اب اس کی پالیسی بھی یہ قرار پائی کہ کانگریس کی طرح گورنمنٹ پر بھی بھروسہ نہ کیا جائے[۴]۔ لہٰذا کچھ دیر مسلم سیاست اسی ڈگر پر چلی اور حالات و واقعات نے کچھ اس طرح کروٹ بدلی کہ مسلمان ہندوستان کی سیاست کے ساتھ خارجی سیاست کی لپیٹ میں آگئے۔ سید جمال الدین افغانی نے جو اتحاد اسلامی کی روح مسلمان ممالک میں پیدا کر دی تھی۔ اس کے زیر اثر مسلمان ممالک اپنی عزت اور آزادی کی بقا کیلئے منظم اور بیدار ہو رہے تھے[۵]۔ ہندوستان کے مسلم راہنما خاص طور پر مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان اتحادِ اسلامی کے داعی تھے[۶]۔ لہٰذا جب جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کی وجہ سے سلطنت عثمانیہ پر زد پڑی تو ہندوستان کے مسلمان بے قرار ہو گئے وہ جانتے تھے کہ سلطنت برطانیہ بھی ان سازشوں میں شریک ہے۔ جس کا مقصد ترکیہ اور اسلام کو یورپ میں ختم کرنا تھا[۷]۔ جس کی بنا پر مسلمان انگریز سے اور بھی بدظن ہو گئے۔ اور انہوں نے اپنے ترک بھائیوں کی ہر ممکن امداد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ابھی یہ کام جاری تھا کہ ۳۔ اگست ۱۹۱۳ء کو کانپور کی مسجد مچھلی بازار کا حادثہ پیش آیا[۸]۔ پولیس نے دس پندرہ ہزار کے مسلمان مجمع پر دس منٹ تک گولی چلائی[۹]۔ جو مسجد کے گرائے گئے حصہ کو دوبارہ

۱-۲-۳ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا حسن ریاض ص نمبر ۵۹-۵۹-۶۰

۴ موجِ کوثر۔ شیخ اکرام ص نمبر ۱۳۵ فیروز سنز ۱۹۶۳ء پانچویں بار

۵-۶ ظفر علی خان ادیب اور شاعر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص نمبر ۳۸

۷ پاکستان ناگزیر تھا حسن ریاض ص نمبر ۶۲

۸ بحوالہ ظفر علی خان ادیب و شاعر ص نمبر [illegible]

۹ بحوالہ تحریک آزادی ابوالکلام آزاد ص نمبر ۲۹ مکتبہ ماحول مکتبہ انور عارف

تعمیر کرنا چاہتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اُس وقت کے داخلی اور خارجی حالات کا نقشہ اِس طرح کھینچا ہے

"کانپور کا واقعہ کانپور کا نہیں رہا۔ بلکہ وہ دنیائے اسلام کا واقعہ ہے۔ مسلمانانِ عالم نے ہر گوشہ سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کے آغشتہ خوں اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا ہم شرمندہ تھے کہ ہمارے پاس ان کے تحفہ کیلئے جو سامان تھا ان میں خون کے قطرے نہ تھے۔ اب ہم شرمندہ نہیں رہے۔ مسلمانانِ عالم ہمارے بہے ہوئے خوں، کٹی ہوئی رگوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا ہدیہ قبول کریں۔"[۱]

مولانا کے بیان سے تحریک اتحادِ اسلامی کی روح اور مسلمانانِ ہند کے طرز عمل کی عکاسی ہوتی ہے۔ کہ اس دور میں مسلم سیاست صرف ہندوستان کی آزادی تک محدود نہیں تھی بلکہ دیگر اسلامی ممالک کے سیاسی اثرات نے بھی ان میں ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ ابھی یہ ہیجان خیز کیفیت برقرار تھی کہ ۴ اگست ۱۹۱۴ء[۲] کو پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی اور جب ترکی اس جنگ میں شریک ہو گیا تو ہندوستان کے مسلمانوں کی بے قراری میں اور بھی اضافہ ہو گیا اگرچہ وائسرائے نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ اُن کے مقدس مقامات کی حفاظت کی جائے گی[۳]۔ لیکن اس کے باوجود مسلمانانِ ہند بے چین اور بے قرار تھے کہ حکومت کی پابندیوں کے باعث اپنے مسلمان بھائیوں کی امداد نہ کر سکتے تھے[۴]۔ ابھی مسلمان خارجی سیاست میں الجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی اپنی سیاست نے پلٹا کھایا اور ہندو مسلم اتحاد کی تحریک شروع ہوئی ۱۹۱۴ء کو جنگ عظیم کی وجہ سے ایک دفعہ پھر یہ احساس پیدا ہوا کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب تمام ہندوستانی متحد ہو کر انگریز کا مقابلہ کریں۔ مسلمان تو یہ بات ایک عرصہ سے محسوس کر رہے تھے مگر ہندو چونکہ آزادی سے زیادہ مراعات کے قائل تھے لہٰذا اس طرف مائل نہ تھے چنانچہ جب ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت محسوس ہوئی تو مسلمانوں نے اس میں خاص دلچسپی لی۔ قائد اعظم محمد علی جناح جنہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر بھی کہا جاتا تھا[۵] کی کوششوں سے میثاق لکھنؤ ۱۹۱۶ء معرض وجود میں آیا اس معاہدے

۱۔ تحریک آزادی ابوالکلام آزاد ص نمبر ۳۱
۲۔ پاکستان ناگزیر تھا - حسن ریاض ص نمبر ۶۴
۳۔۴۔ پاکستان ناگزیر تھا حسن ریاض ص نمبر ۶۴-۶۵
۵۔ ظہور پاکستان ص نمبر ۲۷

میں مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کا حق مانا گیا اور صوبائی خود مختاری اور دیگر شرائط طے ہوگئیں۔[1] لیکن اس معاہدے کے باوجود ہندو اپنی پرانی روش پر قائم رہے اور مسلمانوں نے اس معاہدہ کا احترام کیا لیکن ہندو مہاسبھا نے[2] بطور خاص اس معاہدے کو ناپسند کیا اور اس سبھا کے ذمہ دار لیڈروں نے اس معاہدے کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کیں۔[3] جس کی وجہ سے کرتارپور[4] میں ایک بڑا فساد بھی ہوا مگر مسلمانوں نے اتحاد کی اس فضا کو برقرار رکھنے کی پوری کوشش کی جبکہ ہندو اس فضا کو خراب کرنے کی بار بار کوشش کرتے تھے۔[5] مسلمانوں کے اس صبر و تحمل کی ایک وجہ یہ تھی کہ اُن کی نگاہیں ترکی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ جنگ عظیم اوّل کے خاتمہ کے ساتھ ہی انگریز نے ہندوستان میں نئے قوانین نافذ کرنا چاہے جن کو رولٹ بل کا نام دیا جاتا ہے۔

رولٹ بل۔ رولٹ بل دراصل ایک مسودۂ قانون تھا جس کا مقصد ہندوستان میں سیاسی سرگرمیوں کو ختم کرنا تھا۔ اس قانون کے ذریعہ ججوں کو بغیر جیوری کے سیاسی ملزموں کے مقدمات سننے کا اختیار دیا گیا نیز پریس پر مزید پابندیاں بھی لگائی گئیں۔[6] حکومت نے ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو جسٹس سڈنی رولٹ کی صدارت میں ایک کمیٹی قائم کی جس کا مقصد ایسے قوانین بنانا تھا۔ جس سے انقلابی تحریکوں کو روکا جا سکے۔[7] حکومت نے رولٹ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں مجلس قانون ساز سے رجوع کیا۔ بقول مسٹر منورن جن جھا

> ”فروری ۱۹۱۹ء میں اس مقصد کے لئے دو بل اعلیٰ مجلس قانون ساز میں پیش کئے گئے انڈین کرمنل لا امینڈمینٹ بل اور کرمنل لا (امرجینسی پاور) بل جو عام طور سے رولٹ بل کہلاتے تھے“[8]

مجلس قانون ساز میں ان بلوں کی سخت مخالفت ہوئی۔ مجلس قانون ساز میں اس بل کی جو مخالفت ہوئی اور اس بل کی مخالفت میں

---

[1] ظہور پاکستان ص نمبر ۲۸

[2-5] مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی۔ محمد مرزا دہلوی ص نمبر ۷۷-۷۸-۷۹

[6] بحوالہ تاریخ دستوریہ ہند مولفہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں ڈی لٹ۔ پیرس۔ انجمن ترقی اردو ہند دہلی ص نمبر ۱۴۷ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ء

[7] بحوالہ جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول ص نمبر ۳۰۔ منورن جن جھا۔ مترجم غلام ربانی تاباں۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی

[8] جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول ص نمبر ۳۱ 〃 〃 〃 〃 〃

ارکان مجلس نے جو لب و لہجہ اختیار کیا تھا مسٹر منورن جن جھا نے اس کی تصویر کشی کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان بلوں کی مخالفت میں جس شخص نے سب سے زیادہ سخت لب و لہجہ اختیار کیا اور حکومت وقت پر سخت تنقید کی وہ قائداعظم محمد علی جناح تھے۔ جب مجلس قانون ساز کی اس مخالفت کے باوجود یہ بل منظور ہوئے تو قائداعظم نے نہ صرف یہ کہ وائسرائے کو ایک خط لکھا جس میں حکومت کے رویہ کی مذمت کی بلکہ مجلس قانون ساز ہی سے استعفیٰ دے دیا[1]۔ رولٹ بل کے پاس ہوتے ہی تمام ہندوستان میں اس کی مخالفت ہوئی۔ اور ہر شہر میں جلسے منعقد ہوئے اور جلوس نکالے گئے۔ انگریز نے اس صورت حال سے نپٹنے کیلئے تشدد سے کام لیا۔ جس کے نتیجہ میں جلیانوالہ باغ کا خونیں واقعہ پیش آیا۔

جلیانوالہ باغ۔ ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر میں جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ کے مظاہرین پر بغیر کسی تنبیہ کے گولی چلادی۔ سرکاری رپورٹ کے مطابق ۳۷۹ آدمی مارے گئے۔ اس سے تین گنا زخمی ہوئے کل ۱۶۵۰ راؤنڈ چلائے گئے[2]۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب میں لکھا ہے

"پندرہ منٹ کے اندر اندر جلیانوالہ باغ میں پندرہ سو (۱۵۰۰) انسانوں کو ختم کر دیا گیا۔ حالانکہ ہندوستانی تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مقتولین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی مگر یہ وہ تعداد ہے جسے سرکاری طور پر پبلک تحقیقات کے وقت تسلیم کیا گیا[3]"

کیونکہ گولی چلنے کے فوراً بعد ہی شہر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا لہٰذا لاشوں کو اٹھانے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کیلئے نہ لوگ وہاں پہنچے نہ حکومت نے ایسا کرنے کی تکلیف گوارہ کی رولٹ بل کے خلاف پورے ملک میں مظاہرے ہوئے تھے اور ہر جگہ لوگوں پر سختی کی گئی تھی مگر جتنا ظلم و تشدد جلیانوالہ باغ میں ہوا وہ ہندوستان میں انگریز کے غیر مہذب ہونے کا واضح ثبوت ہے۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے جنرل ڈائر کی سفاکی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ جنرل ڈائر

"اس وقت تک گولی چلاتا رہا جب تک کہ بارود ختم نہیں ہو گیا[4]۔"

---

1. بحوالہ جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول ص نمبر ۱۷۱-۱۷۲ منورن جن جھا۔ مترجم غلام ربانی تاباں۔ نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی
2. Disorders Inquiry Committee. ص نمبر ۵۴ کلکتہ سنہ ۱۹۲۰ء
3. انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ترجمہ شیخ حسام الدین ص نمبر ۱۲۵/۱۲۴

اس اعتراف کے بعد مصنف نے مظاہرین پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ

"انہوں نے عیسائی لڑکیوں کے سکول کو آگ لگا دی مگر اتفاق سے غریب بچیوں کی جانیں آگ کی نذر نہ ہو سکیں [۱]"

اس کے بعد مسٹر ایڈورڈ لکھتے ہیں۔

"مردوں کے بیدردانہ قتل کے علاوہ ایک ایسی انگریز عورت پر بھی حملہ کیا گیا جس نے اپنی زندگی ہندوستانی مستورات کی فلاح و بہبود کیلئے وقف کی ہوئی تھی ایسے اشتہارات چسپاں کئے گئے جن میں انگریز عورتوں کو بے عزت کرنے کی ترغیب دی گئی تھی [۲]"

اس کے بعد مصنف نے اس کی اصل وجہ بیان کی ہے اور اس کے نزدیک جس طرح ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں یہ بے بنیاد خبر مشہور ہو گئی تھی کہ کانپور میں انگریز عورتوں کے ساتھ زیادتی کی گئی تھی۔ اسی طرح انگریزوں کو اس واقعے کے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی جس کی بنیاد پر جنرل ڈائر نے نہتے ہندوستانی باشندوں سے انتقام لیا بقول ایڈورڈ ٹامسن

"جو کاروائی ہم نے جلیانوالہ باغ میں کی یا اس کے بعد جو شور و ہنگامہ انگریزوں نے برپا کیا اس کی تہہ میں وہی جذبۂ انتقام نظر آتا ہے اور ہمارے دماغوں پر وہی بحث طاری ہے جو حادثۂ کانپور کی خبر سننے کے بعد یا باغیوں کے ہاتھوں انگریز مستورات کی بے حرمتی کی بے بنیاد اطلاعات پہنچنے کے بعد ہوئی تھی [۳]"

فاضل مصنف نے اپنے طور پر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کئے گئے ظلم و تشدد اور جلیانوالہ باغ کی وحشت و بربریت کو غلط فہمی کا نام دیکر انگریزوں کے دامن سے بے گناہ ہندوستانیوں کے خون کو دھونے کی کوشش کی ہے مگر انگریزوں کی ہندوستانی تاریخ کا یہ سیاہ حاشیہ اپنی بدصورتی کو خوبصورت الفاظ میں نہیں چھپا سکتا۔ مسٹر ایڈورڈ ٹامسن نے اس حقیقت کو خود ہی تسلیم کر لیا ہے

۱۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ۔ ترجمہ شیخ حسام الدین ص نمبر ۱۶۱

۲۔۳۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ ص نمبر ۱۶۳ - ۱۶۵

کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں انگریز خواتین کی بے حرمتی کی خبریں بے بنیاد ہیں ۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کانپور میں نانا صاحب نے ۱۲۵ انگریز عورتوں اور بچوں کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ رکھا[۱] اور واپس کر دیا ۔ تو انگریز کو پتہ نہ چل سکا کہ عورتوں کی بے حرمتی کے قصے[۲] بے بنیاد ہیں ۔ ہندوستانی باشندوں کا قتل عام اور سزائیں دینے کا سلسلہ تو ملکہ وکٹوریہ کے اس اعلان کے بعد بھی کہ بے گناہ مجاہدین آزادی کو معاف کر دیا گیا ہے ۔ جاری رہا[۳] جس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جو مظالم ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی باشندوں کے ساتھ روا رکھے گئے وہ کسی غلط فہمی کا نتیجہ نہ تھے اور نہ ہی کسی قانون کی بے حرمتی کا جذبۂ انتقام تھے بلکہ ہندوستان پر حکومت اور اس کی دولت کی ہوس تھی۔ جس کی تکمیل کے لئے انگریز نے ہندوستانیوں پر ہمیشہ ظلم و ستم روا رکھا ۔ اسی طرح جلیانوالہ باغ کا قتل عام کسی غلط فہمی یا بے بنیاد خبر کا نتیجہ نہ تھا بلکہ حکومت کے سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تھا ۔ جہاں تک عیسائی لڑکیوں کے سکول کو آگ لگانے کا تعلق ہے ۔ مصنف نے خود تسلیم کیا ہے کہ کوئی نقصان نہ ہوا تھا ۔ جہاں تک اس انگریز عورت پر حملے کا تعلق ہے کہ جس نے اپنی زندگی ہندوستانی عورتوں کی فلاح و بہبود کیلئے وقف کر رکھی تھی ۔ یہ خاتون ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر مس شروڈ تھیں[۳] ۔ جو سائیکل پر جا رہی تھیں کہ مشتعل ہجوم کی زد میں آگئیں ہجوم میں سے کسی نے اُن کے ڈنڈا دے مارا وہ ایک گلی میں بھاگ گئیں اور بے ہوش ہوگئیں اہل محلہ اُسے ہوش میں لائے اور ہسپتال میں چھوڑ آئے[۴] ۔ اور جن مردوں کے بھروسہ پر قتل عام کا ذکر مصنف نے کیا ہے وہ کل پانچ انگریز تھے جو اس وقت امرتسر میں مارے گئے[۵] کیا ہندوستان میں قتل ۔ مار پیٹ اور ہنگامہ آرائی کیلئے کوئی قانون نہ تھا جس کے تحت اِن جرائم کے مرتکب افراد کو سزا دی جا سکتی ۔ کیا مس شروڈ کا چوٹ سے بے ہوش ہو جانا ۔ سکول کی عمارت کو آگ لگانے کی کوشش اور مشتعل ہجوم کا مقابلہ کرتے ہوئے پانچ انگریزوں کا قتل ہونا ۔ انگریزی قانون میں اتنا بڑا جرم تھا ۔ جس کی سزا جلیانوالہ کے مقتولین کو دی گئی ۔ کیا انگلستان میں ہنگاموں کے دوران مارے جانے والوں کا انتقام کبھی اِس صورت میں لیا گیا؟

کیا ہندوستان میں رہنے والے انگریز خود اپنے بنائے ہوئے قانون کے پابند نہ تھے ۔ کیا مس شروڈ نے ہسپتال جا کر یہ نہ بتایا ہوگا کہ اس کے

---

۱ ۔ بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص نمبر ۱۱۷ طفیل منگلوری

۲ ۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند نویں جلد ص نمبر ۳

۳ ، ۴ ، ۵ ۔ مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۱۶ سید نور احمد

ساتھ کوئی غیر اخلاقی حرکت نہیں ہوئی جسے اس کی بے حرمتی تصور کیا جائے۔ واقعہ دو دن پہلے ہوا۔ کیا انگریز اقتدار اور طاقت کے بغیر بھی اتنا ہی غیرت مند ہے جتنا کہ اقتدار اور طاقت رکھتے ہوئے۔ کیا اس کے مذہب و معاشرہ میں عورت کا یہی مقام ہے جو ہندوستان میں اُسے دیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے مسٹر ایڈورڈ ٹامسن کی ساری داستان صرف ہندوستانیوں کے جذبات و احساس کی ترجمانی ہے۔ انگریزوں کی نہیں۔ مصنف نے بڑی ذہانت سے ہندوستانیوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ہے۔ وہ جن باتوں کو بہت بُرا سمجھتے ہیں اور اتنے غیرت مند ہیں کہ کسی عورت کی بے عزتی یا بچے کے قتل کا "تصور" بھی نہیں کر سکتے۔ ان ہی باتوں کو اُن سے منسوب کر دیا گیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جلیانوالہ باغ کا واقعہ جنرل ڈائر کا انفرادی فعل نہ تھا اور نہ ہی قانون کی بالادستی کی حفاظت جیسا کہ ۱۹۱۹ء کی ہنٹر رپورٹ سے تاثر ملتا ہے۔ بلکہ یہ حکومت کی اُس حکمت عملی کا نتیجہ تھا جس کے ذریعہ وہ ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ بقول چوہدری محمد علی

"ڈائر کا مقصد طاقت کے ظالمانہ مظاہرے سے لوگوں کو دہشت زدہ کرنا تھا۔[1]"

انگریز ہندوستان میں یہ خوف وہراس اس لئے پیدا کرنا چاہتا تھا کہ دوسری جنگ عظیم اپنی تمام ہولناکیوں کے باوجود آزادی کی تاریخ میں ایک نئے شعور و آگاہی کا نقطہ آغاز تھا۔ اس جنگ کے اثرات مختلف جگہوں پر مختلف ہوئے مگر ہندوستان میں قومی بیداری اور حصول آزادی کی تڑپ شدید تر ہوگئی۔ جنگ کے خاتمہ کے ساتھ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ بھی ختم ہو رہا تھا۔[2] لہٰذا ایک ایسے قانون کی ضرورت محسوس ہوئی جو آزادی کی تڑپ اور جدوجہد کو ناکام بنانے میں کارگر ہو۔ اس لئے رولٹ کمیٹی کی رپورٹ پر یہ طریقہ سوچا گیا کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے وسیع اختیارات ملک کے معمولی قوانین میں شامل کر دئے جائیں۔[3] مگر جب اس قانون کی مخالفت کی گئی تو انگریز نے ابتداء ہی میں طاقت کا بھرپور مظاہرہ کر کے آزادی کی اس تڑپ کو دبانا چاہا مگر نتیجہ برعکس نکلا۔ مسلمان جو ترکی کے معاملہ میں انگریز کی کھلی وعدہ خلافی سے پیچ و تاب کھا رہے تھے میدان میں آئے اور انہوں نے انگریز کے خلاف تحریک خلافت اور ترک موالات کی زبردست تحریک شروع کر دی۔

---

۱ ظہور پاکستان - چوہدری محمد علی مترجم : بشیر احمد ارشد ص نمبر ۲۹ مکتبہ کارواں لاہور

۲-۳ بحوالہ جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول ص نمبر ۲۲-۳۰

تحریکِ خلافت

۱۹۱۸ء میں جرمنی کی شکست کے ساتھ اُس کے اتحادیوں کو بھی شکست ہو گئی۔ انگریز اپنے وعدوں سے انحراف کر گئے اور حکومت برطانیہ ترکی تقسیم میں اتحادیوں کی حصے دار بن گئی۔ ایسی صورت میں نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں میں پریشانی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے جگہ جگہ جلسے کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ مسلمانوں نے ہندوستان میں ترکوں کی حمایت کیلئے جو جلسے کئے اُن میں سے ۲۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی کا جلسہ خاص اہمیت کا حامل ہے جو اُنریبل مسٹر فضل الحق (کلکتہ) کی صدارت میں ہوا۔ اس جلسہ میں مسلمانوں کی ایک نئی تنظیم خلافت کانفرنس کے نام سے مستقل طور پر قائم ہو گئی اور مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

"الف۔ بوجہ اس کے کہ ایران و ترکی کے مقدس مقامات میں زیادتیاں کی گئی ہیں مسلمانانِ ہند جشنِ صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے کریں۔

ب۔ مسلمان حکومت سے ترکِ موالات کریں۔

ج۔ اگر حسبِ منشا فیصلہ نہ ہو تو ولائتی مال کا مقاطعہ کیا جائے۔

د۔ مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندوؤں کا جو ترکِ خلافت میں شریک ہوئے شکریہ ادا کیا جائے"[1]

خلافت کانفرنس نہ صرف ترکوں کیلئے کام کر رہی تھی بلکہ ہندوستان کی داخلی سیاست پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ جس سے انگریزی حکومت ہندوستان میں بے بس تھی کیونکہ رولٹ بل کی مخالفت میں جو ہنگامے ہوئے ان میں انگریز نے اپنی طاقت کے بھرپور استعمال کی مایہ ناز حکمتِ عملی پر عمل کر دیکھا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا وحشیانہ قتلِ عام لوگوں کے دلوں میں وہ خوف پیدا نہ کر سکا جس کی انگریز توقع رکھتے تھے۔ خاص طور پر مسلمانوں پر اس کا کوئی اثر نہ تھا بلکہ وہ اپنے پورے مذہبی جوش و خروش کے ساتھ انگریز کی مخالفت اور ترکی کی حمایت کیلئے مردانہ وار میدانِ عمل میں آئے تو مسلمانوں کا جوش و خروش جتنا انگریز کیلئے پریشان کن تھا اتنا ہی ہندوؤں کیلئے بھی، کیونکہ دونوں جانتے تھے کہ مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش کے آگے بند باندھنا ممکن نہیں لہٰذا گاندھی جی نے مسلمانوں کو غیر مشروط حمایت کا یقین دلا دیا[2]۔ مسلمانوں نے بھی اپنی روایتی فراخدلی اور مذہبی

---

[1] مسلمانوں کا روشن مستقبل — طفیل منگلوری — ص نمبر ۲۹۵

[2] بحوالہ مارشل لاء سے مارشل لاء تک — سید نور احمد — ص نمبر ۲۵

رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے گاندھی جی کو اس تحریک کا لیڈر بنا دیا ۔ لہذا پنڈت جواہر لال کا یہ کہنا غلط ہے کہ

" گاندھی جی ۔۔۔۔۔۔ اکثر مسلم لیڈروں کو ۔۔۔۔ اور مسلمانوں کو بالعموم تحریک ترکِ موالات میں اپنے

ساتھ گھسیٹ لے گئے اور ان لوگوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک تمام واقعات میں بہت نمایاں حصہ لیا۔[1] "

پنڈت جواہر لال کی اس غلط بیانی سے یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلمان لیڈر اور عوام اپنی مرضی سے نہیں بلکہ گاندھی جی کے مجبور کرنے پر اس تحریک میں

شامل ہوئے حالانکہ شواہد اس کے خلاف ہیں کیونکہ

" تحریک خلافت کی مبادیات جنگ طرابلس کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھیں[2] "

مسلمان اس تحریک کیلئے پوری طرح تیار ہو چکے تھے ۔ انہوں نے کلکتہ کے اجلاس میں ہی ترکِ موالات کی قرارداد پاس کر دی تھی بقول مولانا طفیل منگلوری

" یکم جنوری ۱۹۲۰ء کو مولانا ابوالکلام آزاد طویل نظر بندی سے رہا ہو کر خلافت کے جلسوں میں شریک

ہوئے اور پراونشل کانفرنس کے جلسہ کی جو ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا صدارت فرمائی ۔

اور ترکِ موالات کا شرعی پروگرام سب سے پہلی بار جناب موصوف نے پیش کیا اس تجویز نے ہندوؤں

کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ۔[3] "

سید حسن ریاض کا کہنا ہے کہ

" عدم تعاون کا پروگرام خلافت کمیٹی نے پہلے منظور کیا اور کانگریس نے بعد میں[4] "

حقیقت یہ ہے کہ ترکِ موالات مسلمانوں کیلئے ایک شرعی اصطلاح تھی[5] اور مولانا ابوالکلام آزاد نے گاندھی جی کو یہ بھی بتایا کہ وہ الہلال

میں اس سے کافی عرصہ پہلے ترک موالات کے عنوان سے ایک مضمون لکھ چکے ہیں[6] ۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی نے

---

[1] میری کہانی — نہرو — ص نمبر ۳۲۵

[2] پاکستان ناگزیر تھا — ص نمبر ۱۳۷

[3] مسلمانوں کا روشن مستقبل — طفیل منگلوری — ص نمبر ۴۹۷

[4] پاکستان ناگزیر تھا — ص نمبر ۱۴۶

[5-6] بحوالہ سرگزشت — عبدالمجید سالک — ص نمبر ۱۲۱ — قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور ۔ بار دوم ۱۹۶۶ء

نے ایک سب کمیٹی میں اپنا اپنا پروگرام پیش کیا جو ایک ہی تھا۔[1] فرق صرف یہ تھا کہ گاندھی جی نے مولانا ابوالکلام کے پروگرام کا انگریزی نام نان کوآپریشن رکھ دیا تھا۔ ان تمام باتوں کی تصدیق مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

" سب سے پہلے ترک موالات کا اعلان کلکتہ کے اس اجلاس میں ہوا جو فروری ۱۹۲۰ء کو ٹاؤن ہال میں ہوا تھا۔ اور میں اس کا صدر تھا سب سے پہلے اس کی تحریک وہاں کے خطبۂ صدارت میں کی گئی تھی اس کے بعد دہلی میں دوسری مرتبہ سربرآوردہ ہندو مسلمانوں کا اجتماع ہوا کہ اس مسئلے کو بحیثیت قوم کے ہم اختیار کر سکتے ہیں اُس سب کمیٹی میں بھی جس میں مہاتما گاندھی۔ حکیم اجمل خاں اور میں تھا یہ طے پایا تھا۔ کمیٹی سے میں نے کہا کہ بحث کی ضرورت نہیں سب کو معلوم ہے کہ یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے تیرہ سو سال سے موجود ہے۔ - - - - - اس وقت اس مسئلے کے عمل میں اگرچہ خلافت کمیٹی کے ارکان شریک تھے۔ مسلم علماء کی جماعت شریک تھی لیکن یہ واقعہ آپ کو یاد ہوگا یہ مسئلہ چونکہ نہایت پیچیدہ شکل میں ملک کے سامنے آیا تھا۔ اس لئے ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت انڈین نیشنل کانگریس نے اس میں شرکت نہیں کی تھی۔[2] "

یہ بھی حقیقت ہے کہ کلکتہ میں عدم تعاون کی قرارداد پاس تو ضرور ہو گئی تھی مگر ابھی تک کانگریس کا بڑا حصہ اس تحریک کو پسند نہیں کرتا تھا۔[3] ناگپور کے اجلاس میں سی۔ آر۔ داس کلکتہ والے اجلاس کے فیصلے کو بدلنے کیلئے ۲۵۰ ڈیلیگیٹ ساتھ لائے تھے اور ان کے اخراجات خود برداشت کئے تھے۔ مگر مولانا محمد علی کی کوششوں سے ان کی رائے تبدیل ہو گئی۔[4] اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ تحریک خلافت کے ساتھ ساتھ ترک موالات اور ہجرت کی تحریکیں بھی مسلمانوں کی تحریکیں تھیں جسے گاندھی جی نے اپنایا اور کانگریس کو بھی اس میں شمولیت پر مجبور کیا۔ خلافت کا مسئلہ مسلمانوں کا ایک دینی مسئلہ تھا لہٰذا یوں بھی اس کی شرعی حیثیت

۱؎ بحوالہ سرگزشت۔ عبدالمجید سالک۔ ص نمبر ۱۲۱۔ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور۔ بار دوم ۱۹۶۶ء

۲؎ مولانا ابوالکلام آزاد۔ آزادی کی تقریریں مرتبہ انور عارف۔ ص نمبر ۱۲۴۔ ۱۲۵۔ مکتبہ ماحول کراچی۔ بار اول ۱۹۶۱ء

۳-۴؎ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۰۴۔ ۱۰۵۔

سامنے آئی اور خلافت کمیٹی بنی تو اس کی تنظیم ہر چھوٹے بڑے شہر۔ قصبے۔ گاؤں گلی محلے اور مکان تک پھیل گئی۔ خلافت کا کام کرنا چونکہ ایک مذہبی فریضہ تھا لہٰذا کوئی مسلمان گھرانہ ایسا نہ تھا جس کا کوئی نہ کوئی فرد خلافت کمیٹی کا رضاکار نہ ہو۔ غرض ایسی بے نظیر اور بے مثال تنظیم معرضِ وجود میں آئی کہ اس سے پہلے ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں کبھی نہ تھی۔

بقول سید حسن ریاض

"کانگریس بڑی تنظیم اور بہت قدیم رہی ہو لیکن عوامی پیمانے پر تنظیم کے اعتبار سے خلافت کمیٹی کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہ تھی"[۱]

غرض گاندھی جی نے جب خلافت کمیٹی کی مقبولیت اور عام مسلمانوں کا جوش و ولولہ دیکھا تو ساتھ ہو گئے۔ اس سلسلہ میں رئیس احمد جعفری کا یہ کہنا درست نہیں کہ

"مسلمان کفن باندھ کر میدان میں اتر چکے تھے صرف کسی سپہ سالار کی ضرورت تھی۔ ان حالات میں گاندھی جی مرکزِ امید بن کر مطلعِ سیاست پر نمودار ہوئے۔ وہ جنوبی افریقہ میں غیر معمولی کامیابی حاصل کر چکے تھے اور رولٹ ایکٹ کے سلسلہ میں اپنے جوہر دکھا چکے تھے وہ چمپارن کی ستیہ گرہ کی کامیاب راہنمائی کر چکے تھے مسلمانوں کی نظریں اُن پر پڑیں اور انہوں نے بے تامل گاندھی جی کو اپنا رہنما بنا لیا۔ اصل بات یہ تھی کہ مسلمان خود مشترک پلیٹ فارم کے جویا تھے"[۲]

رئیس احمد جعفری نے اپنی اس بات کی تردید خود ہی کر دی ہے انہوں نے اس سلسلے میں پہلے مولانا محمد علی کی ۲۵ دسمبر ۱۹۲۷ء[۳] کی پشاور میں کی گئی ایک تقریر کا طویل اقتباس نقل کیا پھر ڈاکٹر امبیدکر کی کتاب "پاکستان کے بارے میں چند خیالات" سے ایک اقتباس[۴] دیا ہے اور خود یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

۱۔ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۰۰

۲۔ قائد اعظم اور اُن کا عہد سید رئیس احمد جعفری ص نمبر ۹۵ مقبول اکیڈمی لاہور

۳-۴۔ بحوالہ " " " ص نمبر ۱۰۰ / ۱۰۱

"محمد علی اور امبیڈکر کی ان تصریحات سے معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی کو مہاتما کانگریس خلافت کمیٹی اور علی برادران نے بنایا۔[1]"

لہٰذا انہوں نے یہ خود ہی ثابت کر دیا کہ گاندھی جی کو قیادت اس وجہ سے نہیں دی گئی کہ مسلمانوں کے پاس کوئی لیڈر نہ تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کی نظریں گاندھی جی کو ڈھونڈ لائیں۔ یا گاندھی جی بہت بڑے لیڈر تھے۔ بلکہ گاندھی جی کو لیڈر تو علی برادران اور خلافت کمیٹی نے بنایا۔ گاندھی جی تو ہندوستانی سیاست میں ابھی نو وارد تھے خلافت کمیٹی کے پاس محمد علی۔ شوکت علی۔ ابوالکلام آزاد اور دوسرے بہت سے راہنما موجود تھے جن سے خود گاندھی جی نے تحریکیں چلانے کا سلیقہ سیکھا۔ گاندھی جی کو لیڈر صرف اس لئے بنایا گیا تھا کہ

"ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سنہ ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ پیکٹ کی بنیاد پر اتحاد قائم ہو چکا تھا اور پیکٹ کے باعث بڑی حد تک جناح تھے۔[2]"

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے گاندھی جی نے خلافت کے مسئلے میں غیر مشروط تعاون کا یقین دلایا تھا جس کی وجہ سے انہیں لیڈر بنایا گیا۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مسلمان خود مشترکہ پلیٹ فارم چاہتے تھے اس کی حیثیت اس لئے کچھ نہیں کہ اگر ہندو ساتھ شامل نہ ہوتے تو کیا مسلمان تحریک خلافت نہ چلاتے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کیلئے یہ شرعی مسئلہ تھا اور اس کے پس منظر میں اتحادِ عالم اسلامی کی قوت کارفرما تھی جسے سید جمال الدین افغانی کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت علامہ اقبال نے عام کرنے میں بڑا حصہ لیا تھا۔

چونکہ ہندوؤں کو مسئلہ خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا کانگریس نے اپنے ناگپور کے اجلاس ہی میں عدم تعاون کے ساتھ سوراج کو بھی شامل کر لیا[3] جسے مسلمانوں نے کھلے دل سے قبول کیا۔ اس طرح کانگریس اور خلافت کا پروگرام ایک ہو گیا۔ لہٰذا خلافت کانفرنس اور کانگریس کے اشتراک عمل سے جو ترکِ موالات کی تحریک چلی اس میں عدم تعاون کیلئے عملی پروگرام دیا تھا

---

[1] قائداعظم اور ان کا عہد ص نمبر ۱۰۱

[2] پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۰۱

[3] بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۰۶

۱۔ ترکِ خطابات اور حکومت کے تعلیمی اداروں اور عدالتوں کا مقاطعہ

۲۔ اس کے بعد پولیس اور فوج کے علاوہ ملازمت کے باقی تمام محکموں سے استعفیٰ

۳۔ پھر پولیس اور فوج سے علیحدگی اور

۴۔ سب سے آخر میں ٹیکس دینے سے انکار اور ان تمام مرحلوں میں پورا ضبط اور قومی اتحاد اور عدم تشدد کے اصول کی پابندی[۱]۔

اس پروگرام کے پس منظر میں یہ حکمت کارفرما تھی کہ عوام کے دلوں میں سرکاری خطاب اور مراعات یافتہ افراد کا بڑا احترام تھا جو حکومت سے تعاون کرتے تھے اور یہ افراد ہندوستان میں انگریز حکومت کا بڑا سہارا تھے۔ ہندوؤں کی ہمیشہ سے یہ پالیسی رہی تھی کہ زیادہ سے زیادہ مراعات اور سرکاری نوکریاں حاصل کر کے اپنی حالت بہتر بنائی جائے۔ اب مسلمانوں نے بھی اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ تعلیم اور سرکاری نوکریاں ان کی حالت بہتر بنا سکتی ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اس طرف مائل ہو گئے تھے۔ انگریز اس کمزوری سے اچھی طرح آگاہ تھا اور سرکاری نوکریوں کو ایک حربے کے طور پر استعمال کرتا اور ہندوستانیوں کی اس کمزوری سے ناجائز فائدے حاصل کرتا تھا۔ اسی طرح فوج اور پولیس بھی انگریزی حکومت کے ستون تھے۔ جنہیں ہلائے بغیر منہدم نہیں کیا جا سکتا تھا اور قانون کے نام پر نیز عدالتوں کے ذریعے سے چونکہ ہندوستانیوں سے ناانصافیاں کی جاتی تھیں لہٰذا اس کا بائیکاٹ ضروری تھا۔ اسی طرح غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ تھا تاکہ انگلستان کی صنعت پر زد پڑے۔ لہٰذا جب یہ تحریک چلی تو خلافت کے رہنما کاروں نے جیلوں کو بھر دیا۔ جیل جانے والوں کی تعداد چند ماہ میں تیس ہزار تک پہنچ گئی[۲] اور جیل جانے والوں نے اپنے مقدمات کی پیروی ترک کر دی بہت سے لوگوں نے کچہریوں کی ملازمت ترک کر دی مسلمان بیرسٹروں اور وکلاء نے اپنا پیشہ چھوڑ دیا کیونکہ اسے حرام قرار دیا گیا تھا[۳]۔ مسلمان علماء نے چونکہ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا تھا لہٰذا اٹھارہ ہزار مسلمانوں نے ہجرت کے نام پر اپنے گھر بار چھوڑے۔

۱۔ مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص نمبر ۲۷

۲۔ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۱۷

۳۔ بحوالہ مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی ص نمبر ۹۰

جنہیں افغانستان کی سرحد بند ہو جانے پر بڑے مصائب اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت سے طلباء نے اپنی تعلیم چھوڑ کر قومی تحریک میں شمولیت اختیار کی صرف کلکتہ میں تین ہزار طلباء نے اپنے کالج چھوڑ دیئے جس کیلئے کلکتہ میں نیشنل کالج اور باقی مقامات پر بھی قومی درسگاہیں قائم کرنی پڑیں۔[۳] ولائتی کپڑا جلایا گیا یا سمرنا کے مظلومین کو بھیجا گیا۔[۴] سرکاری خطابات ذلت کا نشان بن گئے۔ جیل جانا اور گولی کھانا ذلت اور خوف کی بجائے فخر اور بہادری کی علامت بن گئی۔ اس طرح اس تحریک کے ذریعہ نہ صرف انگریزی اقتدار و حکومت سے نفرت کا اظہار کیا گیا بلکہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"مغربی تہذیب۔ مغربی وضع۔ مغربی تراش خراش۔ مغربی علوم۔ مغربی نظریات و تصورات سب کی مخالفت ہوئی۔[۵]"

لوگوں نے انگریزی لباس۔ طور طریقے اور آداب ترک کر دیئے۔ دیسی لباس باعث افتخار سمجھا جانے لگا۔ غرض انگریز جو اپنے کو برتر قوم سمجھتے تھے ہندوستان میں بے توقیر ہو گئے۔ انگریزی تہذیب کی ملمع کاری اتر گئی۔ انگریزی تہذیب کے دلدادہ بھی اس سے نفرت کرنے لگے۔ ہندوستان میں اگرچہ انگریزی حکومت تھی مگر ان کی تہذیب و معاشرتی غرور و تمکنت۔ قومی برتری۔ سیاسی بالادستی اور قانون کی پابندی خود ان کا منہ چڑانے لگی اور ہندوستانی ہونے پر فخر کیا جانے لگا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

"ترکِ موالات کے زمانے میں مغرب اور مغربیت کے خلاف جو زبردست نفرت پیدا ہو گئی تھی اس سے مشرقیت کی تحریک کو کسی قدر فروغ ہوا۔[۶]"

لیکن جب تحریکِ ترکِ موالات اپنے پورے شباب پر تھی کہ اچانک گاندھی جی نے اسے بند کر دیا۔ جس کی وجہ چورا

---

[۳] بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۰۳-۱۰۶

[۴] بحوالہ تلاش ہند نہرو ص نمبر ۱۵۱

[۵] اردو ادب جنگ عظیم کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۲ اردو اکیڈمی لاہور

[۶] 〃 〃 〃 ص نمبر ۱۳

چوری کا واقعہ بنائی گئی۔ یہ واقعہ ۵ر فروری سنہ ۱۹۲۲ء[۱] کو چوراچوری (ضلع گورکھپور) میں اُس وقت پیش آیا جب پولیس اور مظاہرین میں تصادم ہوگیا۔ پولیس نے گولی چلائی مگر ہنگامہ فرو نہ ہوا۔ پولیس والوں کو جان بچانے کیلئے ایک تھانے میں پناہ لینا پڑی مگر اس بپھرے ہوئے ہجوم نے پولیس کا پیچھا کیا اور تھانے کو آگ لگادی۔ اٹھ[۲] سپاہی زندہ جل کر مرگئے۔ سید نور احمد نے اس سلسلہ میں لکھا ہے

"مہاتما گاندھی کے ذہن پر صرف چوراچوری کے واقعہ کا اثر ہوا تھا؟ یا انہیں سوراج کو خلافت کے ساتھ نتھی کرنے کا تجربہ بنیادی طور پر غلط معلوم ہونے لگا تھا وہ حالات پر ازسرِنو غور کرنا چاہتے تھے؟ ان سوالوں کے متعلق مختلف رائیں ہوسکتی ہیں۔[۳]"

عین ممکن ہے کہ تحریک خلافت کے فوراً یا کچھ عرصہ بعد تک گاندھی جی کے طرزِ عمل کے متعلق مختلف آراہوں اور تحریک خلافت کو فوراً بند کرنے کی وجوہات سمجھ میں نہ آتی ہوں کیونکہ اُس زمانے میں گاندھی جی ہندوستانی سیاست میں نئے نئے آئے تھے۔ لہٰذا لوگوں کی مختلف آراہوسکتی تھیں بلکہ اس میں غلطی کا احتمال ہوسکتا تھا مگر اب تو یہ بات نکھر کر سامنے آگئی ہے کہ گاندھی جی کا تحریک کو فوراً بند کردینا صرف اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنی ساری خصوصیات میں "ہندو" تھے۔ بقول بیورلی نکلس

"گاندھی جی مسلّمہ طور پر ایک ممتاز ہندو ہیں۔ ایسے لاکھوں ہندو بازاروں۔ مندروں اور دھان کے کھیتوں میں پڑے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ گاندھی جی کو لین دین کے معاملہ میں بلا کا کمال حاصل ہے اور دوسروں کو نہیں۔[۴]"

اور یہ تحریک مسلمانوں کی تھی۔ جس کی کامیابی مسلمانوں کی کامیابی ہوتی اور یہ ایک ہندو کیلئے ممکن نہ تھا کہ وہ اس سودے میں نقصان اٹھائے۔ برطانیہ جنگ ضرور جیت گیا تھا مگر ابھی تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے اور ہندوستان میں کسی بڑی

۱-۲ مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۳۲

۳ مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۳۲-۳۳

۴ ورڈکٹ آن انڈیا ص نمبر ۷۹

شورش سے متحمل نہ ہو سکتے تھے لہٰذا چاہتے تھے کہ صلح کی کوئی صورت پیدا ہو[1] تاکہ مسلمانوں کی ناراضگی دور ہو سکے[2]۔ اور وہ ایسی صورت میں ممکن تھا کہ مسلمانوں کو زیادہ مراعات ملیں[3]۔ اور ان کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی جاتی۔ ایک ہندو کو یہ منظور نہیں ہو سکتا تھا اور گاندھی جی "ہندو" تھے۔ گاندھی جی نے یہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ تحریک کون چلاتا ہے اور وہ ہندوؤں اور کانگریس کی حقیقت سے بھی اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ اُن کی حقیقت کیا ہے اس کا اعتراف پنڈت جواہر لال کو بھی ہے جو مسلمانوں کے متعلق سیدھی بات کو بھی الجھا کر بیان کرتا ہے اس دور کے متعلق کہتے ہیں۔

"اسی سال کے اندر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمان کانگریس سے بھی دو قدم آگے نکل جائیں گے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ کانگریس کی راہنمائی کرنے لگے۔[4]"

نہ صرف یہ بلکہ عبدالوحید خاں نے یہ بھی درست لکھا ہے کہ

"مسلمانوں ہی نے کانگریس کو ایک جنگ جو ادارہ بنایا اور کروڑوں روپے اس کو چندہ دیئے۔[5]"

اور دوسری طرف بقول ہاشمی فرید آبادی حکومت کی یہ حالت تھی۔

"تقریباً تین سال تک خلافت اور سوراج کی [illegible] شدت سے جاری رہی۔ ۔ ۔ ۔ انگریزوں سے مخالفت کا زور لامحالہ بڑھتا رہا اور یہ کہنا ذرا مبالغہ نہیں کہ حکومت کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔[6]"

بہرحال گاندھی جی کے اس اقدام کا مسلمانوں پر بہت زیادہ اثر ہوا۔ اور رہی سہی کمی خود ترکی والوں نے خلافت کا منصب توڑ کر پوری کر دی۔ مسلمانوں کے یاس و حرماں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ خلافت کمیٹی نے اجلاس منعقد کیے۔ اظہار افسوس کیا گیا مگر عوام کی افسردگی اور مایوسی میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بلاشبہ مسلمانوں نے اس تحریک میں بڑی مصیبتیں جھیلی تھیں بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں بڑے جوش و جذبے اور جرأت و ہمت

۱،۲،۳ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۵۲-۱۵۳

۴ میری کہانی جلد دوم ص نمبر ۲۰

۵ تقسیم ہند عبدالوحید خاں ص نمبر ۹۶

۶ تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت ۔۔ ہاشمی فرید آبادی ص نمبر ۵۵۳

کا ثبوت دیا تھا۔ گھر بار چھوڑ کر ہجرت اختیار کی اور یہ قربانیاں اور ... کاریاں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ اس کے خوشگوار اثرات مسلمانوں کی سیاسی اور قومی زندگی میں رونما ہوئے۔ بقول سید حسن ریاض

"گذشتہ دو صدی کے اندر ہندوستان کے مسلمانوں نے اگر کوئی بڑا کام کیا تو وہ تحریک خلافت تھی اور اس سے ان کو بڑے فوائد حاصل ہوئے[1]"

انگریز حکومت کے رعب اور دبدبے کو ختم کر دیا[2]۔ فوج اور پولیس بے وقعت ہو کر رہ گئی[3]۔ مسلمانوں میں آزادی کی تڑپ تیز ہو گئی[4]۔ لوگ ہندوستانی ہونے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ ذہنی پستی ختم ہو گئی۔ ہندو ذہنیت کے تلخ تجربے نے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق مستحکم کر دیا۔ مسلمانوں کے تعلقات دوسرے ملکوں سے بڑھے[5]۔ مسلمانوں میں سیاسی اور مذہبی فکر نے ترقی کی[6]۔ اور اس تحریک کا سب سے بڑا فائدہ بقول سید حسن ریاض

"وہ جو قائد اعظم کی ایک آواز پر پوری مسلم قوم ہر معرکے کیلئے تیار ہو گئی۔ تحریک خلافت ہی کی تیاری کا نتیجہ تھا[7]" اور حقیقت یہ ہے کہ

"تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی جدوجہد آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوئی[8]"

اس تحریک کا فوری اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کا جوش و خروش دیکھ کر پوری ہندو قوم کے حوصلے پست ہو گئے۔ اگرچہ پہلے بھی مسلمان ہندوستان کی سب سے زیادہ بہادر قوم تسلیم کی جاتی تھی۔ بستیاں اس طرح بسائی جاتی تھیں کہ ہندوؤں کے گھر درمیان میں ہوتے اور مسلمان ان کے گھروں کے ارد گرد تاکہ بستی بیرونی خطرات سے محفوظ رہ سکے[9]۔ اور اگر ضرورت پڑے تو مسلمان دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ اس سے

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۶۳

[2-3-4] بحوالہ ظہور پاکستان - چوہدری محمد علی ص نمبر ۳۲

[5-6] بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۶۴، ۱۶۲

[7] پاکستان ناگزیر تھا ص نمبر ۱۶۴

[8] جدوجہد آزادی میں اردو کا حصہ ص نمبر ۹۵/۹۶

[9] بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص نمبر ۱۷۰

یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ہندوؤں میں تو اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ اپنے گھر کی حفاظت کر سکیں۔ اِس تحریک نے ان کو بہت زیادہ خوف زدہ کر دیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ تو پہلے سے ہی یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ مسلمانوں کے تعلقات افغانستان سے ہیں۔ جو دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ مل کر ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے۔ ان حالات میں ہندوؤں نے انگریزوں سے ساز باز کر کے اپنی قوم کا خوف دور کرنے اور انہیں بہادر بنانے کیلئے شدھی اور سنگھٹن کا پروگرام وضع کیا۔ ایک ہندو کے لفظوں میں

"اپریل ۱۹۲۵ء میں مہاسبھا کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا اس کی صدارت کرتے ہوئے لالہ لاجپت رائے نے اعلان کیا کہ تمام سیاسی نزاعی مسئلوں میں سبھا ہندوؤں کے فرقہ وارانہ مفاد کا تحفظ کرے گی انہوں نے مزید کہا کہ سبھا کے مقاصد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ ان لوگوں کی شدھی کی جائے جو بالجبر اسلام قبول کرنے پر مجبور کئے گئے ہیں یہیں سے شدھی کی تحریک کا آغاز ہوا۔"[۲]

شدھی اور سنگھٹن

اس تحریک والوں کے مطابق ہندوستان کے مسلمان درحقیقت "محمدی ہندو" تھے اور لفظ ہندو سے ان کی مراد یہ تھی کہ یہ لفظ قومیت ظاہر کرتا ہے۔ عقائد سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ عقائد خواہ کچھ بھی ہوں مگر اس کیلئے ہندوستانی ہونا کافی ہے۔ اس عجیب و غریب منطق کا حربہ اس لیے اختیار کیا گیا تاکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو شدھی کرنے کا جواز مل سکے۔ اسی طرح سنگھٹن کی تحریک تھی جس کے ذریعہ عام ہندوؤں کو قواعد پریڈ۔ لکڑی اور تلوار وغیرہ کی تربیت دی جاتی تھی۔

۱۔ مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ — عبدالوحید خاں — ص نمبر ۳۰۳ — مکتبہ کارواں لاہور

۲۔ جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول — ص نمبر ۱۰۰

سہیل ۵ — بحوالہ کربلائے پنجاب — مشتاق احمد قریشی — ص نمبر ۱۱۹

۵۔ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا — ص نمبر ۱۵۰

تاکہ وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکیں۔ سوامی شردھانند اِس تحریک کے سب سے زیادہ سرگرم راہنما تھے۔ تحریک کے آغاز سے قبل سوامی شردھانند کو جیل سے بُلوا کر وائسرائے نے گفتگو کی۔ اُس کے بعد اُسے مدت اسیری سے پہلے رہا کیا گیا اور اس نے شدھی کی تحریک کو بڑے جارحانہ انداز سے شروع کیا۔ سوامی شردھانند کو جیل سے بلا کر وائسرائے کا گفتگو کرنا اور وقت سے پہلے رہائی پانا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ انگریز بھی مسلمانوں سے خائف تھے۔ لہٰذا انہوں نے ایک ہندو کو آلہ کار بنا کر مسلمانوں کو دبانے کی کوشش کی اور مہاتما گاندھی جیسا ہندو بھی جس کی امن پسندی اور انسان دوستی کی بڑی دھوم تھی اسی دور میں مسلمانوں کو "غنڈہ" اور ہندوؤں کو بزدل کہتا ہے اور ہندوؤں کو مشورہ دیتا ہوا نظر آتا ہے کہ بزدلی چھوڑ دیں۔

ل سوامی شردھانند کے متعلق یہ عام غلط فہمی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کی اجازت سے تحریک خلافت کے زمانے میں جامع مسجد دہلی کے منبر سے تقریر کی

اُس نے جامع مسجد کے منبر سے کھڑے ہو کر تقریر کی (ماڈرن ہسٹری آف انڈیا از آر۔ سی مجمدار صفحہ نمبر ۸۲)

عارضی اتحاد حاصل کرنے کیلئے جامع مسجد کے منبر پر شردھانند سے تقریریں کرائی گئیں

مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ صفحہ نمبر ۱۲۹

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب جامع الشواہد میں اس مسئلے کی وضاحت فرمائی اور بتایا ہے کہ جامع مسجد کے جلسے کی نسبت کہا گیا ہے کہ سوامی شردھانند نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور منبر کو لوگوں نے منبر جمعہ سمجھ لیا جو مسجدوں کے ہاں ہوتا ہے۔ حالانکہ منبر سے مقصود وہ مکبر تھا یعنی وہ چبوترہ جو صحن مسجد میں ہے اور اس پر منبر مصطلحہ مساجد کا اطلاق کسی طرح درست نہیں یہ چبوترہ بڑی بڑی مساجد میں بنایا جاتا ہے تاکہ تکبیر کو ایک بلند مقام سے دہرایا جاسکے پھر اُس چبوترہ پر ایک غیر مسلم دوست نے مسلمانوں کی اجازت سے کھڑے ہو کر تقریر کی تو کیا قباحت لازم آئی۔ اسکے بعد مولانا نے ثابت کیا ہے کہ یہ کوئی ناجائز فعل نہ تھا۔ (جامع الشواہد صفحہ نمبر ۱۲-۱۳)

ے بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ نمبر ۵ الف - ۱۱۲ تا

سوم ه جدوجہد آزادی میں اردو کا حصہ صفحہ نمبر ۹۶

مسلمانوں نے جب ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل دیکھا تو انہوں نے بھی "تبلیغ" اور "تنظیم" کی صورت میں ان تحریکوں کا جواب دیا۔ لہٰذا ہندو مسلم بلووں کا دور شروع ہو گیا۔ اور یہی انگریز کی وہ مایہ ناز حکمتِ عملی تھی[1] جو انہوں نے رومیوں سے سیکھا کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔ جس کا استعمال وہ ہندوستان میں اکثر کیا کرتے تھے۔ مگر ہندوؤں کے قومی نقطہ نظر سے چونکہ فائدہ مند تھا لہٰذا وہ خوشی انگریزوں کا آلہ کار بنے رہے۔ اور ملک میں عام بلوے شروع ہوئے اور فرقہ وارانہ کشیدگی سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ بہت سے شہروں میں معرکے ہوئے۔ بہت سے شہروں میں بلوے ہوئے۔ شدھی اور تبلیغ کی تحریکیں تقریباً دو سال تک چلتی رہیں[2]۔ مگر فسادات بند نہ ہوئے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کی طرف سے بھی کوششیں ہوئیں۔ اسمبلی میں ایک قانون بنایا گیا جس میں مذہبی جذبات کو مجروح کرنے پر دو سال تک سزا دی جا سکتی تھی مگر یہ بھی بے نتیجہ ثابت ہوا[3] بلکہ ۱۹۲۷ء کے چند مہینوں میں ۵۱ مقامات پر فسادات ہوئے[4]۔ لیکن پیدائشی بزدلی۔ فطری بہادری پر قابو نہ پا سکی۔ مسلمان اگرچہ تعداد میں کم تھے۔ مگر انہوں نے ہندوؤں کی زیادہ تعداد کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ویسے بھی مسلمانوں نے انگریزوں کے ساتھ لڑائی اور جنگ و تاز میں بڑی مہارت حاصل کر لی تھی۔ جب کہ ہندوؤں نے انگریزوں کے زیرِ سایہ کاسہ لیسی اور آرام کی زندگی بسر کرنا شروع کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ مسلمانوں کا مقابلہ کرنے میں ناکام رہے۔ ابھی شدھی اور سنگھٹن کے ہنگامے جاری تھے کہ لاہور میں سائمن کمیشن کی آمد پر لالہ لاجپت رائے پولیس تصادم میں زخمی ہوئے۔ مگر جانبر نہ ہو سکے اس واقع میں ایک پولیس آفیسر مسٹر سکاٹ کی غلطی تھی جسے حکومت نے معمول کے مطابق تحفظ دیا۔ اس پر پنجاب کی دہشت پسند خفیہ پارٹی نے خود مسٹر سکاٹ کو سزا دینے کا فیصلہ کیا[5]۔ مگر دہشت پسندوں نے سکاٹ کے مغالطے میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرس کو قتل کر دیا۔ حکومت اپنی پوری مستعدی کے باوجود ان نوجوانوں کو گرفتار نہ کر سکی۔ مسٹر سانڈرس کے ان مبینہ قاتلوں یعنی بھگت سنگھ اور بی۔کے دت[6] نے مرکزی اسمبلی میں بم پھینک کر پورے ملک میں دہشت پھیلا دی۔ بھگت سنگھ اور دت گرفتار ہو گئے۔ سید نور احمد نے اپنی کتاب

---

[1] یہ رومیوں کا پرانا حربہ تھا "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"

Muslim League Yesterday and Today By. R-B-Rajput. Page No 14.

[2-3-4] بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل ص نمبر ۴۱۶-۴۲۰

[5-6] بحوالہ مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۹۹-۱۰۰

"مارشل لاء سے مارشل لاء تک" میں اُن الزامات کی تفصیل درج کی ہے۔ جس کی بنیاد پر ان دہشت پسند نوجوانوں پر مقدمات چلائے گئے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے[1]۔ یہ مقدمہ کل بتیس افراد پر قائم ہوا ان میں سے نو کو مفرور اور سات کو سلطانی گواہ قرار دیا گیا باقی سولہ افراد پر حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کا الزام لگایا کہ وہ ۱۹۲۴ء سے ان سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ان افراد پر الزام تھا کہ انہوں نے بم بنانے، مسٹر سانڈرس کو قتل کیا۔ یو۔ پی۔ سی۔ آئی۔ ڈی کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ بنرجی پر قاتلانہ حملہ کیا۔ اُس ٹرین کو بم سے اُڑانے کا منصوبہ بنایا جس میں سائمن کمیشن کے ارکان سفر کر رہے تھے۔ یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا ابھی اس مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ کہ دہشت پسندوں نے ایک اور گاڑی کو بم سے اڑانے کی کوشش کی جس میں وائسرائے سفر کر رہے تھے مگر بال بال بچ گئے۔ اس مقدمہ میں ملزموں کو مختلف سزائیں ہوئیں۔ لیکن پنجاب میں بطور خاص اور ہندوستان میں ہر طرف خوف وہراس پھیل گیا۔ انگریز اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگے۔ لوگوں میں آزادی حاصل کرنے کا ایک نیا حربہ اور نیا جذبہ پیدا ہو گیا۔ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی بہادری اور جوانمردی کے قصوں نے ہندوستان کے بچے بچے کے دل میں حرارت وجرأت پیدا کردی اور وہ انگریزوں کے خلاف زیادہ نفرت اور بیزاری کا اظہار کرنے لگے۔ جس دن بھگت سنگھ نے اسمبلی پر بم پھینکا اس سے اگلے دن یعنی ۹ر اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور میں غازی علم الدین شہید نے ایک ہندو ناشر راجپال کو قتل کر دیا[2]۔ جس نے ایک کتاب میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ناروا حملے کئے تھے۔ علم الدین کے خنجر کی کاٹ نے پوری ہندو قوم کو بے قرار کر دیا۔ اور مسلمان بھی مقابلہ کیلئے دیوار بن گئے۔ قانون وسیاست کا ڈرامہ کھیلا گیا۔ اور علم الدین سیاست وقانون کی درماندگیوں پر مسکراتا ہوا پھانسی کا پھندا چوم گیا۔ لاہور اور بیرون لاہور کے مسلمانوں نے علم الدین کے جنازے میں شرکت کی۔ جتنا اس واقعہ نے ہندوستان کے مسلمانوں کو بے چین وبے قرار کیا اتنا ہی متحد اور منظم بھی کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے ہندو مسلم کشیدگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔

مسلمانوں کی سیاست میں یہ نکتہ بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے اور مسلمانوں کے چند راہنما بھی سمجھتے تھے کہ مسلمان چونکہ

---

[1] بحوالہ مارشل لاء سے مارشل لاء تک — ص نمبر ۱۱۸

[2] مارشل لاء سے مارشل لاء تک — ص نمبر ۱۱۱

بہادر قوم ہے لہٰذا اُسے ہندوؤں سے ڈرنے اور کسی قسم کا تحفظ حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے اُن کے نزدیک نو کروڑ مسلمان ۔ تیس کروڑ ہندوؤں پر بھاری تھے[1] ۔ مگر قائداعظم وہ راہنما تھے جو مسلمانوں کی بہادری کے معترف ہونے کے باوجود اس حقیقت کو سمجھتے تھے کہ لڑائی جھگڑے یا بلوے فساد میں ممکن ہے کہ مسلمان ہندوؤں پر غلبہ پالیں مگر لڑائی ۔ جھگڑے ۔ بلوے ۔ فساد تو وقتی چیزیں ہیں جنہیں بہرحال ختم ہونا ہے ۔ اصل چیز تو برطانوی جمہوریت تھی جو بزدل اور بہادر کا ایک ووٹ تسلیم کرتی تھی اور ہندوؤں کے پاس ووٹ زیادہ تھے ۔ اس لئے آئینی اور قانونی تقاضوں کے پیش نظر یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کا تحفظ کیا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ہر مرحلہ پر مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کو پیشِ نظر رکھا ۔ جس سے ہندوؤں کی تعدادی برتری کا ازالہ ممکن تھا ۔ مگر یہی مسئلہ ہندوؤں کیلئے ہمیشہ تکلیف کا باعث رہا اور اکثر فرقہ وارانہ فسادات کا موجب ہوا کیونکہ ہندو بظاہر اتحاد و تعاون ۔ امن و سلامتی کی باتیں کرتے تھے مگر درحقیقت وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں اختیارات ہندوؤں کو ملیں علامہ اقبال اپنے معروف خطبہ صدارت جو دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد کے مقام پر دیا گیا اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

> یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں سب ناکام ہوئی ہیں ۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم غلبہ و اقتدار کے خواہش مند ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے[2] ۔

اور اسی خطبے میں حضرت علامہ اقبال نے اس مسئلے کا حل ایک اسلامی ریاست کے قیام کی صورت میں پیش کر دیا تھا ۔

---

[1] مسلمانانِ ہند کی حیاتِ سیاسی   صفحہ نمبر ۱۰۸

[2] خطباتِ اقبال ۔ مرتبہ رضیہ فرحت بانو   صفحہ نمبر ۲۳، ۲۴   حالی پبلی کیشنگ ہاؤس کتاب گھر دہلی
بار اوّل ۱۵ ۔ اپریل ۱۹۴۶ء

کانگریس، مسلم لیگ اور مجلسِ احرار

آزادی کیلئے چلنے والی تحریکوں میں زیادہ تر حصہ کانگریس، مسلم لیگ اور احرار کا ہے ان تینوں جماعتوں کی حیثیت بذاتِ خود تحریکوں کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جدوجہد آزادی میں ان تینوں جماعتوں کے طرزِ عمل کا جائزہ لیا جائے۔

مجلسِ احرار نچلے طبقے کے لوگوں کی جماعت تھی۔ اس کی عمر دونوں دوسری جماعتوں سے بہت کم تھی اگرچہ مجلسِ احرار کے کچھ رہنما کانگریس میں بھی رہے اور خلافت کمیٹی میں بھی کام کیا۔ لیکن جب ان لوگوں نے خلافت کمیٹی سے علیحدگی اختیار کی اور ایک الگ سیاسی جماعت بنائی تو اس وقت اُن کے پاس اپنا ایک الگ سیاسی پروگرام تھا۔ جسے انہوں نے عملی جامہ پہنانے کیلئے جدوجہد شروع کی تو بہت کم مدت میں اُسکی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی لیکن اس جماعت کا زیادہ تر اثر پنجاب میں تھا۔ مجلسِ احرار جن اوصاف کی حامل جماعت تھی۔ ہندوستان کی دوسری جماعتیں، یہاں تک کہ کانگریس اور مسلم لیگ بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھیں لیکن اس کے باوجود اگر اس کا اثر کم تھا۔ تو اس کی اصل وجہ وسائل کی کمی تھی ورنہ جدوجہد آزادی میں مجلسِ احرار ایک انقلابی، ترقی پسند اور انگریز دشمن جماعت تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"ہندوؤں کی خالص فرقہ پرست جماعت ہندو مہاسبھا ہے یہ جماعت گویا مسلمانوں کا جواب ہے لیکن اس کی اہمیت نسبتاً بہت کم ہے یہ جماعت بھی مسلم لیگ کی طرح شدید قسم کی فرقہ پرست جماعت ہے لیکن اپنی اس انتہائی تنگ نظری کو مبہم قسم کے قوم پرستانہ الفاظ کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے حالانکہ حقیقت میں اس کا رجحان قدامت پسندانہ ہے ترقی پسندانہ نہیں[1]"

اسی طرح ایک اور جگہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ہندو مہاسبھا کا دفاع اس طرح کیا ہے۔

"ہندو مہاسبھا جب کبھی مسلمانوں کی فرقہ پرستی پر نکتہ چینی کرتی ہے تو اپنی اس خالص وطنیت کا ادعا بھی کرتی ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ یہ بات کہ مسلم انجمنوں نے اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر فرقہ پرست ظاہر کیا ہے۔ ہر شخص پر عیاں ہے۔ ہندو مہاسبھا کی فرقہ پرستی اتنی آشکارا نہیں ہے اسلئے کہ وہ وطنیت کی چادر اوڑھے ہے[2]"

---

[1] تلاشِ ہند پنڈت جواہر لال نہرو ص نمبر ۲۱۰ جلد نمبر ۲

[2] میری کہانی پنڈت جواہر لال نہرو ص نمبر ۳۷۷ جلد دوم

منذرجہ بالا اقتباسات میں پنڈت نہرو نے مسلم انجمنوں کا حوالہ دے کر مسلمان قوم کو بحیثیت مجموعی فرقہ پرست قرار دیا ہے حالانکہ کانگریس میں بھی مسلمانوں کی خاصی تعداد موجود تھی جو ہندوستان کی آزادی کی صدقِ خاطر سے خواہاں تھی۔ اگر وہ ہندوؤں کی طرح کسی تعصب کا مظاہرہ کرتی تو کانگریس کو کبھی قبول نہ کرتی وہ تو اپنی بے تعصبی کی وجہ سے کانگریس میں رہ کر متعصب ہندوؤں کو برداشت کرتی رہی۔ اگرچہ ہندوؤں کے انتہائی تعصب کی وجہ سے بعض مسلمان سیاسی جماعتیں وجود میں آئیں۔ جن میں مسلم لیگ اور احرار کے نام نمایاں ہیں۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے فرقہ پرستی کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ فرقہ پرستی بقول علامہ اقبال

"یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے کسی تنگ نظر فرقہ پرستی پر مبنی نہیں۔ فرقہ داری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں جو فرقہ واری دوسری قوموں سے نفرت اور انکی بدخواہی کی تعلیم دے انکے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں[1]۔"

علامہ اقبال کے اس قول کی روشنی میں اگر پنڈت جواہر لال نہرو کے بیان کو پرکھا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مسلمانوں کا کانگریس میں شامل ہونا ہندوؤں سے تعاون کرنا اور مسلم انجمنوں کا ہندوؤں سے تعاون کرنا جن میں احرار اور مسلم لیگ بھی شامل ہے۔ انکی بے تعصبی کی دلیل ہے۔ جسے کسی طرح بھی فرقہ پرستی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ اس میں کسی دوسری قوم کی بدخواہی شامل نہیں ہے بلکہ یہ تعاون وطن کی آزادی کیلئے ہے۔ لہٰذا مسلمانوں اور مسلم انجمنوں کو فرقہ پرستی کا الزام دینا درست نہیں اسی طرح پنڈت جواہر لال کے نزدیک فرقہ پرستی رجعت پسندی ہے اور کہیں کہیں انھوں نے یہ اصطلاح مروجہ اشتراکی مفہوم میں بھی استعمال کی ہے[2]

اس کے علاوہ قدامت پسندی اور حکومت سے تعاون کو بھی پنڈت جی رجعت پسندی کہتے ہیں[3]۔

---

1. خطباتِ اقبال — مرتبہ رضیہ فرحت بانو — صفحہ نمبر ۲۴۴ — حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی
2-3. بحوالہ میری کہانی — پنڈت جواہر لال نہرو — صفحہ نمبر ۲۲۶۔۔۲۲۸ جلد دوم

ہر حال یہ بات تو قرینِ قیاس نہیں کہ پنڈت جواہر لال جیسا فاضل مصنف رجعت پسندی کے معنی سے نا آشنا ہو۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو نے جان بوجھ کر یہ روش اختیار کی ہے تاکہ کانگریس کو ترقی پسند، آزادی خواہ اور انگریز دشمن جماعت ثابت کیا جاسکے۔ اور مسلم انجمنوں کو بدنام کر کے کانگریس کے اصل خدوخال کو چھپایا جاسکے۔ جہاں تک انگریز دشمنی کا تعلق ہے کانگریس کا پہلی دفعہ انگریز کی پالیسی سے اختلاف ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی وجہ سے ہوا۔ لیکن انگریز نے تقسیم بنگال منسوخ کر کے کانگریس کو دوبارہ منالیا۔ خود پنڈت جواہر لال اقرار کرتے ہیں کہ

"گاندھی جی پہلی مرتبہ کانگریس میں شامل ہوئے اور داخل ہوتے ہی انہوں نے اس کی ہیئت کو بدل ڈالا۔ اسے عوام کی جمہوری جماعت بنا دیا۔ یوں تو اس سے پہلے بھی جمہوری جماعت تھی لیکن اس کی جمہوریت صرف اونچے طبقے تک محدود تھی"[1]

قطع نظر اس کے کہ جمہوریت بھی اونچے اور نچلے درجے کی ہوتی ہے۔ بقول چوہدری محمد علی

"گاندھی ۱۹۱۵ء میں ہندوستان میں واپس آیا۔ اسی زمانے میں گوکھلے کا پیروکار تھا اور کسی لحاظ سے بھی انتہا پسند نہ تھا۔ اس نے پہلی جنگ عظیم میں برطانیہ کی جنگی مساعی کی پوری حمایت کی اور کچھ عرصہ کیلئے افواج میں بھرتی کیلئے ایجنٹ کے طور پر کام کیا"[2]

اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ۱۹۱۹ء تک کانگریس کسی طرح بھی انگریز کی مخالف جماعت نہ تھی اور نہ ہی ترقی پسند تھی کیونکہ اس میں اونچے درجے کی جمہوریت تھی۔ ڈاکٹر عابد حسین صاحب بالکل درست کہتے ہیں کہ کانگریس بیس سال تک انگریزوں کے دامن میں پلتی رہی۔ اس کے بعد کانگریس کا وہ دور شروع ہوتا ہے جس کا سہرا پنڈت نہرو نے گاندھی جی کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی کانگریس اونچے درجے سے نچلے درجے کی جمہوریت بن جاتی ہے۔ یہ بات تحریکِ خلافت کے ضمن میں آچکی ہے کہ

---

1. تلاشِ ہند — پنڈت جواہر لال نہرو — ص نمبر ۱۲۹
2. ظہورِ پاکستان — چوہدری محمد علی — ص نمبر ۳۰
3. بحوالہ قومی تہذیب کا مسئلہ — ڈاکٹر عابد حسین — ص نمبر ۲۰۱ — انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

کو کانگریس کو کانگریس مسلمانوں نے بنایا۔ خود پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ اعتراف بھی ہے کہ مسلمان کانگریس کی رہنمائی کرنے لگے تھے۔ گویا اس میں گاندھی جی کا کمال نہ تھا۔ یہ سب مسلمانوں ہی کا رہینِ منت ہے۔

اب رہا یہ بات کہ مسلم انجمنیں رجعت پسند ہیں کیونکہ فرقہ پرست ہیں اور کانگریس ترقی پسند ہے کیونکہ فرقہ پرست نہیں۔

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے۔ اسے اشتراکی مفہوم میں بلاشبہ ترقی پسند نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ رئیس احمد جعفری کے قول کے مطابق مسلم لیگ کی حالت اپنے ابتدائی دور میں یہ تھی کہ

"اب وہ سروں اور خان بہادروں کی کنیز نہیں بنتی تھی۔ ۔ ۔ ابھی تک وہ خواص کی مجلسِ مباحثہ تھی اب اسے عوام کا مرکزِ عمل بننا تھا۔ اب تک لوگوں نے اسے آلۂ کار بنا رکھا تھا۔[1]"

گویا مسلم لیگ بھی کانگریس ہی کی طرح اونچے درجے کی مجلسِ مباحثہ تھی۔ صرف احرار ہی ایک ایسی جماعت تھی جو صحیح معنوں میں عوامی انقلابی اور ترقی پسند جماعت تھی کیونکہ اس کا اپنا ایک معاشی پروگرام بھی تھا جو اس نے اسلامی نظامِ حیات سے لیا تھا اور اس میں نہ اونچے درجے کی جمہوریت تھی اور نہ خواص کی مجلسِ مباحثہ۔

کانگریس، مسلم لیگ اور احرار کے طرزِ عمل سے قطع نظر کر کے اگر حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان کا سب سے پیچیدہ اور لاینحل مسئلہ فرقہ پرستی یا ہندو مسلم آویزش ہی تھا۔ جسے حل کرنے کیلئے راہنمایانِ جدوجہدِ آزادی نے ہر دو اطراف سے بھرپور کوششیں کیں لیکن ناکام رہے۔ اس مسئلے کو ہوا دینے میں سب سے زیادہ حصہ ہندو مہاسبھا کا ہے جو خالص ہندوؤں کی جماعت تھی۔ لیکن اس کے ممبر کانگریس کے ممبر بھی تھے۔ ہندو مسلم فسادات شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے زمانے میں شباب پر تھے۔ بقول طفیل احمد منگلوری

شدھی اور سنگھٹن چونکہ کانگریسی لیڈروں کے ہاتھوں شروع ہوئیں اس لئے ملک میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں اور بدگمانیاں ہونے لگیں۔[2]

---

[1] قائدِ اعظم اور ان کا عہد — رئیس احمد جعفری — صفحہ نمبر ۲۱۲

[2] مسلمانوں کا روشن مستقبل — طفیل احمد منگلوری — صفحہ نمبر ۱۸۱

"اسی طرح جو لیڈر کانگریس میں تھے قریب قریب وہ سب ہندو مہا سبھائی تھے۔" [1]

سوامی شردھانند ہندو سیاست میں فرقہ ورانہ فسادات کا سرغنہ مانا جاتا ہے۔ جب ایک مسلمان نے شردھانند کو قتل کر دیا تو اُس کی یادگار قائم کرنے کے لئے گاندھی جی نے دس لاکھ روپوؤں کی اپیل کی۔ [2] سوامی شردھانند کانگریس میں بھی شامل تھا۔ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل

"اس زمانے میں بعض با اثر ہندوؤں شردھانند اور ڈاکٹر مونجے نے شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع کیں یہ لوگ کانگریسی تھے۔ انہوں نے اعلانیہ بلا کسی تردد مسلمانوں کو ہندو بنانے کا اظہار کیا۔" [3]

اسی طرح عبدالوحید خاں ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ "کانگریس عمومی طور سے اس قدر مہاسبھائی ہو چکی تھی کہ اس کا ہر لیڈر بھائی پرمانند سے زیادہ کٹر فرقہ پرست بنا ہوا تھا۔" [4]

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہندو مسلم آویزش میں ہندو مہاسبھا کے ساتھ ساتھ کانگریس کا بھی ہاتھ ہے۔ جس کی وجہ سے شدھی اور سنگھٹن جیسی تحریکیں معرض وجود میں آئیں۔ اور مسلمانوں نے اپنے دفاع کے لئے مناسب طریقے اختیار کئے۔

ہندو مسلم آویزش کے اس مسئلے کو ہوا دینے میں کانگریسی وزارتوں کا بھی ہاتھ ہے۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد جب کانگریس کی وزارتیں بنیں اور انہیں ملک کا نظم و نسق چلانے کا موقع ملا تو انہوں نے ایسی حکمتِ عملی اختیار کی جس سے مسلمانوں کے حقوق پر زد پڑتی تھی۔ نتیجے کے طور پر مسلمان نہ صرف کانگریس سے بلکہ ہندو قوم سے بدظن ہو گئے اور

---

[1] پاکستان ناگزیر تھا — سید حسن ریاض — صفحہ نمبر ۱۹۳
[2] مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ — عبدالوحید خاں — صفحہ نمبر ۱۵۴
[3] تاریخ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ — ڈاکٹر معین الدین عقیل — صفحہ نمبر ۹۵
[4] مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ — عبدالوحید خاں — صفحہ نمبر ۵۴

اور پہلے سے زیادہ منظم طریقے سے اپنی انجمنوں کو فعال بنانے کی کوشش کرنے لگے تاکہ ہندوؤں کا مقابلہ بہتر طور پر کیا جاسکے ۔ ان تمام عوامل میں ہمیں مسلمان اپنے حقوق کا دفاع کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مسلمان بحیثیت قوم ہندوؤں سے کسی طرح بھی مغلوب نہیں ۔ کانگریسی وزارتوں کے عہد میں ان مسلمانوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا گیا جو کانگریس میں شامل تھے ۔ اس سلسلے میں سی پی کے مسٹر محمد شریف[۱] بیرسٹر اور بمبے کے مسٹر نریمان[۲] کی مثالیں دی جاسکتی ہیں ۔

۱؎ مسٹر شریف بیرسٹر تشکیل وزارت کے وقت مسلم لیگ کو چھوڑ کر کانگریس میں شامل ہوئے اور وزیر بھی بنا دیئے گئے لیکن کانگریس اُسے برداشت نہ کر سکی ۔ بہانہ یہ تراشا گیا کہ مسٹر شریف نے تخفیف سزا کیلئے آنے والی رحم کی درخواستوں میں اختیارات سے تجاوز کیا ہے ۔ حالانکہ سزا میں تخفیف پانے والوں میں ہندو ۔ مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ شامل تھے ۔ اس الزام کی تحقیقات کیلئے ایک کمیشن مقرر ہوا جس کے سربراہ سر منمتھ ناتھ مکرجی سابق جج ہائی کورٹ تھے ۔ جنہوں نے الزام لگانے والے ہندوؤں کو پورا موقع دیا کہ وہ ثبوت اور شہادت پیش کریں ۔ خود سردار پٹیل نے ایک تحریر مسٹر شریف کے خلاف بھیجی مگر کمیشن نے مسٹر شریف کو حق بجانب قرار دے کر ان پر اعتماد کا ریزولیشن پاس کر دیا ۔ مگر کانگریس ہائی کمان نے ہندوؤں کی ایک ٹولی کے شور و غوغا کو کافی سمجھا اور مسٹر شریف کو وزارت سے

علیحدہ کر دیا ۔

بحوالہ قائداعظم اور ان کا عہد ۔ رئیس احمد جعفری ص نمبر ۲۴۹-۲۴۱-۲۴۷-۲۴۶

۲؎ مسٹر نریمان بمبئی پارسی جماعت کے سب سے پہلے آدمی تھے جنہوں نے کانگریس کیلئے قید و بند کی مصیبتیں اٹھانے کے ساتھ ساتھ کانگریس پارٹی کے فرائض بڑی وفاداری سے سر انجام دیئے ۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے تو وہ کانگریس صوبہ بمبئی کے صدر تھے ۔ آئین اور قانون کے مطابق گورنر نے مسٹر نریمان کو انٹرویو کیلئے طلب کیا ۔ مگر مسٹر ولبھ بھائی پٹیل نے نریمان کے مقابلہ میں ایک معمولی آدمی مسٹر کھیر کو کانگریس پارٹی کا لیڈر منتخب کرایا ۔

بحوالہ قائداعظم اور ان کا عہد ص نمبر ۲۴۵

ہندوستان چھوڑ دو

یہ تحریک کانگریس کی طرف سے شروع کی گئی جیسے ہیں کانگریس کمیٹی کا جلسہ ۸ اگست ۱۹۴۲ء کو منعقد ہوا[1] جس میں گاندھی جی کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کریں۔ اور حکومت برطانیہ سے یہ کہا جائے کہ ہندوستان کو فوری طور پر خالی کر دیں[2]۔ ۹۔ اگست ۱۹۴۲ء کو حکومت نے کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو گرفتار کر لیا[3]۔ جس کی وجہ سے تمام ہندوستان میں مظاہرے ہونے لگے توڑ پھوڑ اور تشدد کے واقعات آئے دن کا معمول ہو گئے۔ کانگریس کا یہ تحریک چلانے کا مقصد یہ تھا کہ انگریز ہندوستان کو چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اقتدار پر قبضہ کر سکیں۔ گاندھی جی عام طور پر تحریکوں میں عدم تشدد کے اصول کے حامی رہے ہیں[4]۔ لیکن یہ تحریک انگریزی حکومت کے خلاف تشدد آمیز تحریک تھی۔ کانگریس نے اس تحریک کو جس شدت کے ساتھ شروع کیا تھا۔ حکومت نے بھی اسے تشدد کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کی۔ گرفتاریوں۔ سزاؤں۔ جرمانوں کے علاوہ لاٹھی چارج اور ہوائی جہاز کے ذریعے سے گولیاں چلائی گئیں[5]۔ کانگریس نے اس تحریک کے دوران مسلمانوں کو اپنے ساتھ شامل کرنے کی پوری کوشش کی مگر مسلم لیگ نے اس میں حصہ نہیں لیا۔ حکومت نے کانگریس کے بڑے بڑے رہنما گرفتار کر لئے اور کانگریس کو کالعدم اور غیر قانونی جماعت قرار دیا۔ اس طرح آئندہ تین سال تک کانگریس کی سرگرمیاں معطل ہو گئیں اور مسلم لیگ کو یہ ایک بڑا ہی اچھا موقع مل گیا کہ وہ اپنے کام کو آگے بڑھائے۔ اور قائد اعظم نے بجا طور پر اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور انہوں نے پاکستان کا پیغام ملک کے کونے کونے میں پہنچا دیا[6]۔ مسلم لیگ نے کئی اخبارات اور جرائد نکالنے شروع کئے[7]۔ مسلم پریس کے استحکام سے عام مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہو گئی[8]۔ اور مطالبہ پاکستان ایک نئی قوت اور نئے جوش و خروش سے لوگوں میں مقبول ہوا[9]۔ غرض مسلم لیگ

۱-۲ بحوالہ قائد اعظم اور اس کا عہد رئیس احمد جعفری صفحہ نمبر ۹۴۴

۳ بحوالہ قائد اعظم اور اس کا عہد رئیس احمد جعفری صفحہ نمبر ۹۴۴

۴ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا سید حسن ریاض صفحہ نمبر ۲۴۲

۵ بحوالہ پاکستان ناگزیر تھا سید حسن ریاض صفحہ نمبر ۲۴۶

۶-۹ بحوالہ قائد اعظم حیات و خدمات ص نمبر ۱۱۲

کی تنظیم فعال ہوگئی اور اس کے مراکز دور دور تک قائم ہوگئے اور وہ ایک منظم طاقت ور اور عوامی جماعت بن گئی۔ دیہات سے لیکر مرکز تک ایک مضبوط زنجیر کی طرح پھیل گئی۔ جس کی ہر کڑی اپنے قائد کے اشارے پر متحرک ہو جاتی تھی۔ یہ اسی تنظیم اور اتحاد کا نتیجہ تھا کہ شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد قائداعظم نے عام انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا تاکہ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کرایا جا سکے۔ کانگریس کو اس بات کا علم تھا کہ وہ ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت نہیں لہٰذا اس نے انتخابات کی مخالفت کی اور نامساعد حالات کا بہانہ بنایا لیکن خود انگلستان میں انتخابات ہو چکے تھے اور حکومتِ برطانیہ کے پاس کوئی عذر نہ تھا لہٰذا ۱۹۴۶ء کے انتخابات ہونے قرار پائے۔ مسلم لیگ کیلئے یہ بڑا ہی کٹھن مرحلہ تھا۔ یہ مرحلہ درحقیقت اُس کیلئے زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ مگر قائداعظم نے اپنی سیاسی بصیرت سے درست اندازہ لگا کر ہی یہ دعویٰ کیا کہ مسلمان پاکستان کے علاوہ کسی بات پر راضی نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا انتخابات کے نتائج نے قائداعظم کے دعویٰ پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔

مجلسِ احرار کی خدمات

مجلسِ احرار کے قیام کے متعلق اُردو انسائیکلو پیڈیا میں یہ لکھا گیا ہے کہ

"برصغیر کی سیاسی اور مذہبی جماعت ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی اس کے بانی چوہدری افضل حق اور مولانا عطاءاللہ شاہ بخاری مدت تک کانگریس اور تحریک خلافت سے وابستہ رہے۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں بعض اختلافات کی بنا پر ان جماعتوں سے الگ ہو گئے اور مجلسِ احرار کے نام سے ایک نئی سیاسی اور مذہبی جماعت کی بنیاد رکھی۔"[1]

سید نور احمد نے احرار کے قیام کے متعلق تحریر کیا ہے کہ

"رسمی طور پر یہ جماعت ۱۹۳۰ء میں قائم ہوئی۔"[2]

اور مولانا مظہر علی اظہر نے بھی یہی لکھا ہے کہ

---

1. اُردو انسائیکلو پیڈیا ص نمبر ۵۵ فیروز سنز تیسرا ایڈیشن
2. مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۱۶۲

"مجلس احرار نے ۱۹۳۰ء سے اپنی علیحدہ ہستی کا قیام ضروری خیال کیا۔"[1]

اسی طرح نسیم عنایت اللہ سوہدروی لکھتے ہیں کہ

"مسلم لیڈروں کے پنجابی گروپ نے ۱۳ اپریل ۱۹۳۱ء کو ایک جماعت مجلس احرار کے نام سے تشکیل دی۔"[2]

مندرجہ بالا بیانات مجلس احرار کے قیام کے سلسلے میں درست نہیں۔ چوہدری افضل حق فرماتے ہیں کہ

"مجلس احرار کا سب سے پہلا جلسہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ہوا۔ جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے میری صدارت میں تقریر کی۔"[3]

چوہدری افضل حق صاحب کے اس بیان کی تصدیق جناب طفیل منگلوری اس طرح کرتے ہیں۔

"اس مجلس کا پہلا جلسہ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں بصدارت مولانا افضل حق منعقد ہوا اور اس کے پہلے صدر مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری منتخب ہوئے۔"[4]

ابن امیر شریعت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری نے تاریخ احرار میں کلمات کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اس میں وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"احرار کی ذہنی نقشہ کشی اور قانونی تشکیل نو ۲۷ رجب ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۹ دسمبر ۱۹۲۹ء بروز یک شنبہ (اتوار) ہی کو ہو چکی تھی۔ اسی اجلاس میں حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے زیر صدارت جداگانہ حقوق و انتخابات اور جداگانہ تنظیم کے عنوان سے عوام کو تعاون کی دعوت دی صرف اس نئے نام اور پلیٹ فارم سے عملاً معروف کار ہونے کا مرحلہ باقی تھا۔ مرحوم چوہدری

---

[1] مسئلہ شہید گنج — مولانا مظہر علی اظہر — ص نمبر ۲۳

[2] ظفر علی خاں اور ان کا عہد — عنایت اللہ نسیم سوہدروی — ص نمبر ۲۲۹

[3] تاریخ احرار — چوہدری افضل حق — ص نمبر ۷۱ — مکتبہ احرار اسلام

[4] مسلمانوں کا روشن مستقبل — ص نمبر ۵۲۸

صاحب سمیت خلافتی اکابر کے کانگریس سے استعفاء کے بعد یہ مشکل بھی قدرتی آسان ہو گئی ۔ چنانچہ تشکیل جماعت سے پونے دو سال بعد ۲۹ صفر ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۱ جولائی ۱۹۳۱ء بروز شنبہ (ہفتہ) حبیبیہ ہال لاہور میں اس نئی فعال ۔ مخلص اور انقلابی جماعت کا پہلا اہم اجتماع عام منعقد ہوا ۔ "[1]

اس سے یہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ مجلس احرار کب قائم ہوئی اس بات کی نشاندہی بھی ہو جاتی ہے ۔ کہ مجلس احرار کیوں قائم ہوئی یعنی وہ کانگریس کے مقابلہ میں جداگانہ حقوق و انتخابات کی حامی تھی ۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے مجلس احرار کے قیام کی وجہ یہ بتائی ہے ۔

" کراچی میں جو ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا ۔ اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال نہ تھا ۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بعض ممبروں کو انتخاب پر خاص طور پہ ایک مسلمان کے نام پر اعتراض تھا شاید انہیں یہ شکایت بھی تھی کہ ان کے حلقے میں سے کوئی نمائندہ نہیں لیا گیا ۔ ظاہر ہے کہ پندرہ آدمیوں کی ورکنگ کمیٹی میں ہر حلقہ کی نمائندگی ممکن نہ تھی اور اصل جھگڑا جس کا ہمیں علم نہ تھا محض ذاتی اور مقامی تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے والا گروہ آہستہ آہستہ کانگریس سے علیحدہ ہو گیا ۔ اور اس نے مجلس احرار کے نام سے اپنی ایک جماعت بنالی ۔ پنجاب کے بعض سرگرم اور معروف مسلمان کانگریسی کارکن اس جماعت میں شامل ہو گئے اور انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کو بڑی تعداد میں اپنی طرف کھینچ لیا ۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے اوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں میں بڑا اثر تھا ۔ "[2]

---

[1] تاریخ احرار ۔ افضل حق ۔ مضمون سید ابو معاویہ ابوذر بخاری صفحہ نمبر ۲۷

[2] " The Karachi election of the Working Committee led to an untoward result, which none of us anticipated then. Some Muslim members of the A. I. C. C. object- ed to this election in particular to one

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

چوہدری افضل حق نے اپنی کتاب تاریخ احرار میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ جواہر لال نہرو کا اشارہ خود چوہدری صاحب کی طرف ہے۔ جنہوں نے ڈاکٹر عالم کی نامزدگی پر اعتراض کیا تھا۔ بقول چوہدری افضل حق

"جہاں تک ورکنگ کمیٹی کی ممبری کا معرضِ وجود میں آنے کا تعلق ہے یہ تحریر ایک کھہ مکرنی ہے۔"[1]

اصل بات وہی ہے کہ مجلسِ احرار جداگانہ حقوق اور جداگانہ انتخابات میں کانگریس کی ہم نوائی کو مسلمانوں کیلئے مفید نہ سمجھتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں احرار کی ابتدائی پالیسی میں مسلم لیگ جیسا رنگ نظر آتا ہے۔ مسلم لیگ بھی مسلمانوں کے جداگانہ حقوق اور جداگانہ انتخاب کی حامی تھی۔ اسی لئے جناب رئیس احمد جعفری کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ

"شملہ کانفرنس سے پہلے مجلسِ احرار کے ارباب بست و کشاد مسلم لیگ کے سرگرم مخالفوں میں نہیں تھے۔"[2]

بقیہ حاشیہ - (Muslim) name in it. Perhaps, they also felt slighted because no one of their group had been chosen. In an all-India committee of fifteen it was manifestly impossible to have all interests represented, and the real dispute, about which we knew nothing, was an entirely local and personal one in the Punjab. The result was that the protestant group gradually drifted away from the Congress in the Punjab, and joined others in an 'Ahrar Party' or 'Majlis-e-Ahrar'. Some of the most active and popular Muslim Congress workers in the Punjab joined this, and it attracted large members of Punjab Muslims to it. It represented the chiefly lower middle class elements and it had numerous contacts with the Muslim masses.

لے تاریخ احرار صفحہ نمبر ۹۶/۱۹

۲ صفحہ نمبر ۲۴۶ JAHAWARLAL NEHRU

بلکہ پاکستان کو دبی زبان سے تائید کیا کرتے تھے۔"[1]

جناب رئیس احمد جعفری ہی نے اپنی کتاب قائداعظم اور ان کا عہد میں کانگریس پائی کمان کی رٹ مجلس احرار کے بارے میں ظاہر کرنے کیلئے پنڈت جواہرلال کی مندرجہ بالا عبارت نقل کی ہے[2]۔ اور عبداللہ ملک نے بھی اپنی کتاب پنجاب کی سیاسی تحریکیں میں اس عبارت کو نقل کیا ہے[3]۔

ملک صاحب نے تو پنڈت جواہرلال کی ہم نوائی میں احرار کی طبقاتی حیثیت کو بنیاد بنا کر مجلس احرار کی غریب دوستی کو اشتراکی پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے وہ اشتراکی فلسفہ کی مخصوص اصطلاحوں کو ہندوستان کے غریب عوام کی ترجمانی کیلئے استعمال کرتے ہوئے مجلس احرار کو اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا وہ ایک اشتراکی فلسفہ کی مؤید جماعت ہے جس نے مذہب کو استعمال کرکے غلطی کی اور وہ اثر پیدا نہ ہوسکا جو اشتراکی فلسفہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اُن کی یہ پوری کتاب اس گورکھ دھندے کا عکس ہے۔ جس میں انہوں نے مجلس احرار کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی جو خلافِ حقیقت ہے۔

چوہدری افضل حق نے اندرونِ ایشیا کے شہرۂ آفاق مصنف جان گنتھر کو جس نے مجلس احرار کو بائیں بازو کی مجموعہ اضداد جماعت قرار دیا تھا ان الفاظ میں جواب دیا ہے جس سے اس حقیقت کا پتہ چلتا ہے کہ مجلس احرار کیا تھی۔ اس کے مقاصد کیا تھے۔ اور کس قسم کا عقیدہ رکھتی تھی

وہ تحریکات عالم کو سمجھنے والا اور سب سے تو نخص مسٹر گنتھر احرار کو عجیب و غریب مجموعہ قرار دیتا ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ مغرب نے مذہب پرست لوگوں کو سیاسی انقلابی نہیں پایا نہ یورپ میں کبھی سیاسی انتہا پسند طبقہ مذہب کا علم نہایت مضبوطی کے ساتھ تھامے رہا ہے۔ یہ شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہے اور مجلس احرار موجودہ دور میں صحیح روایاتِ اسلام کی بہترین جانشین ہے۔ ہمارا عمل۔ ہمارا نظام کار اور ہماری تاریخ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ جہاں ہم مذہبی معاملات میں عوام کی راہنمائی کرتے ہیں۔ تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں

---

[1]	قائد اعظم اور اُن کا عہد	ص نمبر ۳۸۰	رئیس احمد جعفری
[2]	بحوالہ قائد اعظم اور اُن کا عہد	ص نمبر ۴۴۴/۴۴۳	رئیس احمد جعفری
[3]	بحوالہ پنجاب کی سیاسی تحریکیں	ص نمبر ۸۰/۷۹	عبداللہ ملک

اور جہاں ہمارے راہنماؤں اور رضاکاروں نے ختم نبوت - مدح صحابہ اور شاتم رسول راج پال کی تحاریک میں نمایاں اور اہم حصہ لیا ہے - وہیں ہمارے رضاکار سیاسی میدان میں بھی ملک کی کسی ترقی پسند سیاسی جماعت سے پیچھے نہیں رہے یہ چیز ایک مغربی آنکھ کیلئے یقیناً ایک عجوبہ ہو سکتی ہے مگر ہمارے لئے شرف و مباہات کا باعث ہے یہ سب کچھ اُس نبی اُمی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کا ادنیٰ کرشمہ ہے[1] - "

چوہدری افضل حق کی اس تردید سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ مجلس احرار ایک خالص اسلامی طرز عمل کی جماعت تھی جس کا سوشلزم یا کمیونزم سے کوئی تعلق نہ تھا - جب کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تو روس کے لفظ کو الٹی ترتیب سے پڑھا کرتے تھے چہ جائے کہ اس کے فلسفے کی حمایت کی جائے - چوہدری افضل حق اپنے ایک خطبے میں تحریر فرماتے ہیں

" دنیا کی اس سے بڑی خدمت کیا ہے کہ انسانوں کو اسلام کے نور کی طرف بلایا جائے - کہ لوگ ظلم سے باز آئیں اور عدل و انصاف کے آئین کو قبول کریں - انسانوں کو برابر کا بھائی سمجھیں اور لوٹ کھسوٹ کو روا نہ رکھیں - یہ ذات برادری یہ اونچ نیچ یہ نسل و قوم کی برتری کے تصورات اسلام میں داخل ہو کر خاک میں مل جاتے ہیں بس اسلام تو بین الاقوامی حیثیت ہی میں پیش کیا جا سکتا ہے - اس کی اور کوئی محدود صورت نہیں[2] - "

چوہدری افضل حق کے ان الفاظ کی تصویر احرار کی جدوجہد میں دیکھی جا سکتی ہے - غرض مجلس احرار ایک خالص اسلامی نظریہ رکھتی تھی - جس کا کسی دوسری فکر سے کوئی تعلق نہ تھا - اس میں کوئی شک نہیں کہ مجلس احرار غریبوں کی جماعت تھی اور غریبوں کے لئے کام بھی کرتی تھی - مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس جماعت میں کوئی امیر شامل ہی نہیں تھا بلکہ بعض متمول اشخاص بھی اس میں شامل تھے - مجلس احرار کے زعماء نے اپنی سیاسی بصیرت سے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کی کسی سیاسی جماعت نے ابھی پوری

---

۱ تاریخ احرار افضل حق ص نمبر ۶

۲ خطبات احرار خطبہ افضل حق مرتبہ شورش کاشمیری جلد اول ص نمبر ۷۳

طرح عوام سے رجوع نہیں کیا۔ وہ کانگرس کے ساتھ کام کر چکے تھے اور خوب جانتے تھے کہ کانگریس نے بھی زبانی دعووں کے علاوہ عوام سے زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی مسلم لیگ نے اس وقت تک عام لوگوں کی طرف توجہ کی تھی۔ مجلس احرار کے زعماء چونکہ خود عوام سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی مشکلات۔ مصیبتوں۔ دکھوں اور پریشانیوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ احرار چونکہ مسلمانوں کی جماعت تھی لہٰذا اس نے سب سے پہلے غریب مسلمان عوام کی طرف توجہ دی اس لئے بھی کہ ہندوستان میں غریب مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی جنہیں جمع کر کے نہ صرف سیاسی قوت بنایا جا سکتا تھا بلکہ اُن کی مشکلات و مصائب کا ازالہ بھی ممکن تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب مجلس احرار نے ہندوستان کے غریب مسلم عوام کیلئے کام شروع کیا تو بہت تھوڑے عرصہ میں ایک فعال۔ منظّم اور مضبوط سیاسی جماعت بن گئی۔ اس کی مقبولیت کی وجہ بقول سید نور احمد صاحب یہ تھی کہ

"مسلم حقوق کے متعلق اس کا موقف مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ سے مختلف نہ تھا لیکن اس نے مسلم عوام کو مسلم کانفرنس کے بالمقابل ایسی قیادت کی امید دلائی جو ضرورت کے وقت حکومت کے ساتھ ٹکر لے سکتی تھی۔[1] اور مجلس احرار نے اس کا ثبوت بھی بہم پہنچایا۔"

میکلیگن کالج سٹرائیک ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو میکلیگن انجینئرنگ کالج کے پرنسپل نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو طلباء نے ہڑتال کر دی۔[2] علامہ اقبال اس سلسلے میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ انہوں نے یہ ایجی ٹیشن احرار کے حوالے کر دی۔[3] لہٰذا جب احرار نے اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا تو ہر طرف ایک جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ لاٹھی چارج ہوا اور گرفتاریاں عمل میں آئیں مگر احرار نے حکومت کے کسی دباؤ میں آنے کی بجائے اس کا مقابلہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ حکومت نے جب یہ تیور دیکھے تو سختی کی بجائے معاملہ کی نزاکت کے پیشِ نظر نرمی اور صلح کی روش اختیار کی۔ کالج کے پرنسپل نے معافی مانگی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا۔ احرار نے اس کامیابی کے بعد یہ تحریک بند کر دی۔

---

[1] مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۱۶۳

[2-3] تاریخ احرار ص نمبر ۱۰۲/۱۰۵

تحریک کشمیر۔ کشمیر میں ڈوگرا راج نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم تھا۔[1] بڑے بڑے عہدے صرف ہندوؤں کیلئے مخصوص تھے۔ مذہب تبدیل کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔[2] ذبح بقر کی پاداش میں جائیدادیں ضبط کر لی جاتی تھیں۔ اور دس سال تک سزا دی جاتی تھی۔[3] اس کے علاوہ مسلمان عام طور پر مقروض تھے۔[4] اور اس طرح سے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔[5] اسی دوران میں چند ایسے واقعات رونما ہوئے۔ جس سے پوری ریاست کشمیر میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ جموں میں ایک ہندو سپاہی نے قرآن کریم کی بے حرمتی کی۔ ایک مسجد کے امام کو خطبہ دینے سے روک دیا گیا۔ اور ایک مسجد گرا دی گئی۔[6] ان واقعات کی مذمت میں عام جلسے ہوئے اور رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ ایک بہت بڑا جلسہ خانقاہ معلیٰ (سری نگر) میں منعقد ہوا جس میں صوبہ سرحد کے ایک عبد القدیر نامی شخص نے ایک پر جوش تقریر کی جس پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جب اس پر مقدمہ چلایا گیا تو مسلمانوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جیل کے باہر جمع ہو گیا۔ تاکہ مقدمہ کی کاروائی سنی جا سکے مگر ڈوگرا پولیس نے اندھا دھند گولی چلا کر بے شمار مسلمانوں کو شہید اور زخمی کر دیا۔[7] اس پر ملک کے دوسرے علاقوں میں بھی اضطراب پیدا ہوا خاص طور پر پنجاب کے مسلمان بہت بے قرار تھے کہ کشمیری مسلمانوں کی مدد کی جائے۔ یہی وہ وقت تھا جب احرار نے تحریک کشمیر چلانے کا فیصلہ کیا۔

بقول چوہدری افضل حق صاحب

وہ علامہ سر محمد اقبال کی صدارت میں محمڈن ہال میں عمائدین شہر کا جلسہ تھا جس میں کشمیر کی اوس پڑی قسمت زیر غور تھی۔ مولانا مظہر علی اظہر غالباً مولانا داؤد غزنوی بھی اور میں بھی محمڈن ہال گئے۔ خیال یہ تھا کہ کوئی تدبیر کر کے مرزا بشیر کی کشمیر کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے حق میں ان لوگوں کی تائید حاصل کی جائے۔ باقی حاضرین طبقہ اعلیٰ سے متعلق تھے وہ احرار کے نام پر حقارت سے منہ بسورتے تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے بہر حال ہم بزوری و بزاری ان کا اعلان اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہو گئے۔[8]

7۔ بحوالہ سرگزشت — مولانا عبد المجید سالک — ص نمبر ۲۹۰/۲۹۲

8۔ تاریخ احرار — چوہدری افضل حق — ص نمبر ۹۵

بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر

اِس طرح احرار نے اپنے رضاکار ریاست میں بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کیلئے سیالکوٹ ۔ جہلم اور راولپنڈی کے محاذ قائم ہوئے ۔ اکیس اکیس نوجوان احرار رضاکاروں کے جتھے رات کی تاریکی میں دشوار گزار راستوں کے ذریعے ریاست میں داخل ہونے لگے [۱] ۔ اور ریاست کے حکام نے ان کو گرفتار کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا ۔ بقول چوہدری افضل حق

"سات دن کے اندر دس ہزار شیر دل مجاہدوں نے سرحد کو عبور کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کیلئے پیش کیا [۲] "

یہاں تک کہ احرار کے رضاکاروں نے کوہالہ کے پل کو بند کر کے ریاست کشمیر کی آمد و رفت کا راستہ بند کر دیا [۳] ۔ یہ راستہ کشمیر کی تجارت کی شاہراہ تھا جس کی بندش سے تجارت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ احرار کا یہ اقدام اتنا طوفانی تھا کہ حکام ریاست کے ہر بند کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ آخر حکام سپر انداز ہو گئے اور ریاست کا انتظام والسرائے کے حوالے کر دیا گیا [۴] ۔ مگر احرار نے اپنی تحریک جاری رکھی انگریزی حکومت اپنی پوری قوت اور وسائل کے باوجود اِس تحریک پر قابو نہ پا سکی ۔ کیونکہ یہ سول نافرمانی کانگریس کی چلائی ہوئی سول نافرمانیوں کی تحریکوں سے بہت مختلف اور زیادہ انقلابی تھی ۔ اِن کی قوت کا اندازہ چوہدری افضل حق کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ

بقیہ حاشیہ جب کشمیر کمیٹی کو جس کے صدر امیر جماعت احمدیہ تھے ریاست کے اندر اپنے کارکن بھیجنے اور وہاں کے مسلمانوں کی آئینی اور قانونی امداد کرنے کا موقع ملا تو کمیٹی کے باقی ممبروں پر منکشف ہوا کہ کشمیر کمیٹی کے نام سے جو کام لیا جا رہا ہے اس کا مقصد احمدیت کی تبلیغ کے سوا کچھ نہ تھا ۔ پھر مسلمانوں نے اپنے آپ کو کشمیر سے علیحدہ کیا ۔ ان کی ترجمانی علامہ اقبال نے کی ۔ علامہ صاحب نے ایک پبلک جلسے میں تمام حالات کی وضاحت کی ۔ خود اس کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا ۔ ایک نئی کشمیر کمیٹی بنائی اور اس کا آئین مرتب کیا ۔ (مارشل لا سے مارشل لا تک ص نمبر ۱۶)

۱	تاریخ احرار	چوہدری افضل حق	ص نمبر ۱۱۰
۲	تاریخ احرار		ص نمبر ۱۱۱
۳، ۴	بحوالہ تاریخ احرار		ص نمبر ۱۱۲

"کانگریس کی کسی تحریک میں ۸۰ ہزار سے زیادہ ہندو مسلمان اور دوسری اقوام مل کر ایک ایک سال تک قید نہیں ہوئے پنجاب میں تین ماہ کے اندر احرار نے ۵۰ ہزار نفوس کو جیل بھجوایا۔"[1]

اِس تحریک میں سب سے زیادہ حصہ سیالکوٹ کے مسلمانوں کا ہے اس کے علاوہ جن مقامات سے رضاکاروں نے اس تحریک میں قربانیاں پیش کیں ان میں امرت سر۔ لاہور۔ گجرات۔ گوجرانوالہ۔ جہلم۔ جالندھر۔ لائل پور (اب فیصل آباد)۔ ملتان۔ لدھیانہ۔ راولپنڈی۔ ہوشیارپور۔ چنیوٹ۔ انبالہ۔ وزیرآباد۔ یو۔پی۔ سندھ۔ بنگال۔ بمبئے اور اجمیر کے صوبجات شامل ہیں[2]۔ جس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ احرار کا اثر تقریباً پورے ہندوستان میں تھا مگر اصل طاقت اسے پنجاب میں حاصل تھی۔ حکومت برطانیہ نے احرار کی طاقت کے پیشِ نظر مہاراجہ کشمیر پر دباؤ ڈالا اور اس مسئلے کو حل کرنے کیلئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ جسے گلینسی کمیشن کا نام دیا جاتا ہے اس کمیشن نے اپنی سفارشات ۲۲۔ مارچ ۱۹۳۲ء کو مہاراجہ کو پیش کیں[3]۔ غیر سرکاری ارکان نے اگرچہ اختلافی نوٹ لکھے تھے گلینسی کمیشن کی سفارشات احرار کیلئے بھی قابل قبول نہ تھیں۔ اس کے باوجود مہاراجہ نے ان پر عمل درآمد کرنے کے احکامات جاری کر دیئے[4-5]۔ اس طرح کشمیر کے مسلمانوں اور حکومت میں سمجھوتہ ہو گیا۔ احرار کی اس جدوجہد اور قربانی و ایثار کے نتیجہ میں کشمیر کے مسلمانوں کو مذہبی آزادی مقدس مقامات کی واپسی۔ حصولِ تعلیم کے مواقع۔ ٹیکسوں میں کمی اور سرکاری ملازمتوں میں آبادی کے تناسب کے لحاظ سے حصہ وغیرہ کے حقوق حاصل ہو گئے۔ اور یہ تحریک ختم ہو گئی۔ بقول عبداللہ ملک

"برصغیر کی ریاستوں میں جو عوامی تحریکیں منظم ہوئیں ان میں سب سے زیادہ جاندار عوامی تحریک کہیں منظم ہوئی تو وہ یہی کشمیر ریاست کی تھی۔"[6]

---

[1] تاریخ احرار ص نمبر ۱۱۹

[2] بحوالہ تاریخ احرار ص نمبر ۱۲۷

[3] پنجاب کی سیاسی تحریکیں۔ عبداللہ ملک ص نمبر ۱۷۸

[4-5] بحوالہ پنجاب کی سیاسی تحریکیں عبداللہ ملک ص نمبر ۱۷۹/۱۸۰

[6] پنجاب کی سیاسی تحریکیں عبداللہ ملک ص نمبر ۱۷۱

مگر اس تحریک کی بدولت مجلس احرار کو جو شہرت ۔ ترقی اور قوت ملی اُس نے مجلس احرار کو پنجاب میں خاص طور پر اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں عام طور پر ایک عوامی اور انقلابی جماعت بنا دیا ۔ جو نہ صرف کانگریس اور قادیانیوں کی مخالفت کرتی تھی بلکہ حکومت برطانیہ کی بھی دشمن تصور کی جاتی تھی ۔ اس شہرت کی بنا پر شیخ حسام الدین نے ۹ ۔ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۲ء کو امرتسر میں کارکنوں کا ایک اجلاس بلایا جس میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کے افراد نے شرکت کی اور اس دو روزہ اجلاس میں مجلس احرار کو آل انڈیا حیثیت دے دی گئی ۔[1]

تحریک کشمیر کے خاتمے کے ساتھ ہی ریاست کپورتھلہ میں مسلمانوں میں بھی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ۔ **اور عبد العزیز** بیگوال جو کہ احرار کے نائب صدر تھے کی راہنمائی میں تحریک کپورتھلہ شروع ہوئی ۔[2] اس تحریک کا مقصد کپورتھلہ کی مسلم عوام کی اخلاقی ۔ مذہبی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانا تھا ۔[3] جس کے لیے مجلس احرار نے سول نافرمانی کی تحریک بھی چلائی ۔ جس کے سربراہ ماسٹر تاج الدین انصاری تھے ۔[4] جس سے ریاست میں رہنے والے غریب مسلمانوں میں سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ اپنی حالت کو بدلنے میں بڑی مدد ملی ۔ اس کے علاوہ مجلس احرار نے کوئٹہ کے زلزلہ میں متاثرین کیلئے عمدہ خدمات سرانجام دیں ۔

احرار اور انگریز برصغیر پاک و ہند کے حکمران انگریزوں نے کبھی ہندوستان میں گھل مل کر رہنا پسند نہیں کیا بلکہ انہوں نے ہمیشہ ہر جگہ اور ہر کام میں اپنی انفرادیت اور ہندوستانیوں پر اپنی برتری کو قائم رکھنے کی کوشش کی ۔ ہندوستانیوں کے متعلق انگریز مورخوں اور ادیبوں نے ایک خاص قسم کا پروپیگنڈا کیا ۔ جس سے ہندوستانیوں کی تحقیر و تذلیل مقصود تھی ۔ تاکہ ہندوستانیوں میں احساس کمتری پیدا کیا جائے اور انگریز کی برتری قائم رہے ۔ انگریزوں کے ذہن میں ہندوستانیوں کی جو تصویر بٹھائی گئی تھی وہ یہ ہے ۔

> سرزمین ہند میں انگریزوں اور ہندوستانیوں کے متعلق جو نقش فارنیوں (فرنگی اقوام) نے اپنے دماغوں میں بٹھایا ہے وہ اسے بھولے نہ ہوں گے ۔ ہمارے مورخین اور افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر ایک خاص قسم کا پروپیگنڈا کیا ۔ چنانچہ عام طور پر ایک ہندوستانی کا نقشہ ان الفاظ میں

---

۱ بحوالہ کاروان احرار   جانباز مرزا   ص نمبر ۳۰   جلد اول لاہور

۲ بحوالہ تاریخ احرار   ص نمبر ۱۹۰

۳ ۔ ۴ بحوالہ تاریخ احرار   ص نمبر ۱۵۸ ، ۱۶۷

کھینچا ہے کہ نیم شیطان - نیم بچہ - ناتربیت یافتہ - قانع - کتے کی طرح وفادار اور اطاعت شعار - تصوف کا
شیدائی اور خیالستان میں محو لیکن ان اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ اُس میں ایک دغاباز - باغی اور
ایک خونخوار مذہبی کی صلاحیت موجود ہے بمقابلہ اس کے ایک انگریز کی سیرت کا فوٹو اس طرح پیش
کیا ہے - متین - قابل - انصاف کی ایک نہ ٹلنے والی چٹان اور ہر ایک کے ساتھ اُس کی حیثیت کے مطابق
سلوک کرنے والا[1]-

ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ اِس قسم کی باتیں منسوب کرنے سے انگریز کا مطلب اپنی برتری کا سکہ منوانا تھا مگر ہندوستان میں انگریزی حکومت کے کارندے اور ملازمین اپنے آپ کو انگریز اور اپنے ہم وطنوں کو انگریز کی تقلید میں ادنیٰ اور کم تر سمجھتے تھے اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر تھا کہ لوگ انگریز کے حضور اپنے کو حقیر اور کم تر سمجھنے لگے اور انگریز سے زیادہ اُس کے ہندوستانی ملازمین سے ڈرنے اور خوف کھانے لگے جو خود ان کے ہم وطن تھے - ہندوستان میں انگریز کی ذہنی غلامی پیدا کرنے میں آئی - سی - ایس کے ملازمین جنہیں پنڈت نہرو نے داشتہ سروسیں قرار دیا ہے[2] کا بڑا ہاتھ ہے اور ان کے بعد ہندوستان کے عام انگریزی ملازمین کا حصہ ہے - جنہوں نے انگریزی تحکم پسندی - ظاہری دکھاوا - آمرانہ رویے اور قانون کی پابندی کو اپنا ایمان بنالیا تھا - اور ان ہی دو طبقوں نے انگریز کی ایمانداری - دانشمندی - اصول پرستی انصاف پسندی اور نیک چلنی اور بہادری کی کہانیاں سناسنا کر عام لوگوں کو مرعوب اور کم تر بنا رکھا تھا - غرض ہندوستان کے لوگ انگریز اور انگریز پرستوں کے ہاتھوں بقول پنڈت نہرو

"ہندوستانی بہ حیثیت قوم اور بہ حیثیت افراد متواتر اور مسلسل توہین - ذلت اور حقارت آمیز برتاؤ کا
شکار ہوتے رہے[3]"

مگر یہ پروپیگنڈا اتنا منظم اور تسلسل کے ساتھ کیا گیا کہ ہندوستان کے لوگوں کی تمام صلاحیتیں اور خوبیاں ان کے جرم اور نقائص بن گئے

---

[1] انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ - ایڈورڈ ٹامس - ترجمہ شیخ حسام الدین ص نمبر ۳۶/۲۹

[2] نہرو - میری کہانی ص نمبر ۲۰۰/۱

[3] تلاش ہند نہرو ص نمبر ۸۱

یہاں تک کہ آج بھی کچھ لوگ پروپیگنڈے کے تحت سمجھتے ہیں کہ

"انگریز نہ اتنے سفاک تھے کہ خوف اور دہشت کو حکومت کا ذریعہ بناتے اور نہ اتنے کوتاہ اندیش کہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ ان کا چھوٹا سا جزیرہ چالیس کروڑ لوگوں کو غیر معین عرصہ کیلئے محکوم نہیں رکھ سکتا۔ انگریزوں کے اپنے ملک میں آزادی تقریر اور آزادی اجتماع کی بہت طویل روایات تھیں اس لئے وہ اس حد تک گرنا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ ان آزادیوں کو بالکل ہی ختم کر دیں۔ وہ پبلک جلسوں اور جلوسوں کی اجازت دے دیتے تھے اور عام طور پر ان پر پابندیاں اس وقت عائد کرتے تھے جب وہ جلسے اور جلوس بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ گاہے گاہے وہ اپنے مخالفوں کو جیل میں بھی ڈال دیتے تھے لیکن کچھ اس طرح کہ جنہیں قید کرتے وہ ہیرو بن جاتے۔[1]"

لیکن ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا سرسری مطالعہ ہی یہ بات ثابت کرتا ہے کہ انگریزی حکومت کی بنیاد ہی خوف و ہراس اور ظلم و تشدد پر تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا قتل عام اس عظیم الشان عمارت کی پہلی اینٹ تھی اور نسلی برتری کا رنگ روغن اس عمارت کے وہ نقش و نگار ہیں۔ جس کے ماند پڑتے ہی پوری عمارت منہدم ہو گئی۔ بقول مولانا ابوالکلام آزاد

"موجودہ حکومت محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے۔ وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کیلئے محض نفی ہے وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتل عام جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لئے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں۔ وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لئے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہو جانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی طرح "یونین جیک" کو سلام نہیں کرتے وہ تیس کروڑ انسانوں کو پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی وہ اپنے تمام وعدوں کے توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انصاف کی پامالی میں اس کی جرأت ان تھک اور دلیری

۱۔ ظہور پاکستان — چوہدری محمد علی — ص نمبر ۵۲

بالکل بے باک ہے اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے منہ میں کوئی لگام نہیں۔[1]"

یہی حال اس بات کا ہے کہ انگریز اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ہندوستان کو زیادہ مدت تک غلام نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ اس بات کو سمجھانے کیلئے تقریباً سو سال کا عرصہ لگا۔ انگریز نے ہندوستان کو اس لئے نہیں چھوڑا کہ وہ چالیس کروڑ انسانوں کیلئے کوئی ہمدردی رکھتا تھا بلکہ اس لئے چھوڑنے پر مجبور ہوا کہ اب چالیس کروڑ انسانوں کو غلام رکھنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اور جس آزادئ تحریر و تقریر کی لمبی روایت کا ذکر کیا گیا ہے اگر ہندوستان کی آزادئ تحریر و تقریر کا مقابلہ انگلستان کی آزادی سے کیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انگلستان کے انگریزی اخبار اور انگلستان کے عام باشندے جو باتیں اپنی حکومت کے خلاف برسرِعام کرتے اور لکھتے تھے اور آزاد بھی رہتے تھے۔ اگر وہی باتیں ہندوستان کے اخبار اور باشندے لکھتے یا کرتے تھے تو اخباروں کو بند اور لوگوں کو قید کر دیا جاتا تھا۔ انگلستان کے مقابلہ میں ہندوستان کی آزادئ تحریر و تقریر تو سرے سے آزاد ہی نہیں۔ وہ جلسے جلوسوں کی اجازت اس لئے نہیں دیا کرتے تھے کہ ان جلسے جلوسوں کے مقاصد کسی حد تک ہی سہی پورے ہو جائیں بلکہ یہ اجازت اس لئے دی جاتی تھی کہ ان جلسوں اور جلوسوں پر پابندی کا جواز پیدا ہو جائے۔ کیونکہ ان جلسوں اور جلوسوں کا مقصد آزادی تھا جو انگریز دینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ اُن کے پاس طاقت تھی۔ اسی طرح انگریز لوگوں کو گاہے گاہے نہیں بلکہ اکثر جیل میں اس لئے نہیں ڈالتا تھا کہ وہ ہیرو بن جائیں۔ بلکہ ہیرو بنانے والے ہندوستان کے وہ لوگ تھے جو آزادی چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز انہیں "باغی" اور عوام انہیں ہیرو سمجھتے تھے۔ مجلس احرار جو کہ خطیبوں اور مقرروں کی جماعت تھی اور بڑی سے بڑی تحریک چلانا جس کے خطیبوں کیلئے چھوٹی سے چھوٹی بات تھی۔ جب میدانِ عمل میں آئی تو اس نے نہ صرف انگریز بلکہ انگریز پرستوں کو عام جلسوں میں آئینہ دکھانا شروع کیا۔ تو انگریز اور انگریز پرستی کو گالی بنا دیا۔ ہندوستان کے اُس وقت کے ذرائع بلاغ عامہ پر اگر غور کیا جائے تو اس زمانے میں لوگوں سے براہ راست مخاطب ہونے کا سب سے بڑا ذریعہ الابلاغ جلسے تھے۔ اخبار، ریڈیو اور دیگر ذرائع تک عام لوگوں کی رسائی نہ تھی اور نہ ہی عام لوگ سیاست کی گتھیاں سلجھانے کی قابلیت رکھتے تھے مگر احرار کے خطیب اور مقرر مشکل سے مشکل بات کو عام لوگوں کی زبان میں زندگی کی عام حقیقتوں سے مثالیں دے کر اس طرح سمجھاتے تھے کہ باتیں سامعین کے دلوں پر نقش

---

[1] قولِ فیصل — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۱۱۲/۱۱۳

ہو جاتی تھیں۔ ان تقریروں کا اثر عام لوگوں پر زیادہ تھا۔ لہٰذا وہ لوگ جو انگریز کو آسمانی مخلوق خیال کرتے تھے۔ انسانوں سے کم تر خیال کرنے لگے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ انگریز غاصب ہے۔ اُسے ہندوستان سے واپس جانا پڑے گا۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ تحریک خلافت میں انگریز کے خلاف بڑی نفرت پیدا ہوئی تھی۔ وہ نفرت بھی درحقیقت ہندوستان کے مایہ ناز مسلمان خطیبوں اور مقرروں کی خطابت ہی کا نتیجہ تھی۔ اس میں احرار کے خطیب اور مقرر شامل تھے مگر اس نفرت او ر حقارت کی تکمیل درحقیقت اس دور میں ہوئی جب ان خطیبوں اور مقرروں نے اپنی جماعت کو مجلس احرار کا نام دیا۔ اور عام غریب مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی آواز بلند کی۔

قادیانی اور مجلس احرار۔ مجلس احرار اسلام ہندوستان کی وہ پہلی جماعت تھی جس نے انگریز کی اس سازش کو سمجھا کہ انگریز قادیانیوں کے ذریعہ وحدت اسلام کو پارہ پارہ اور اسلام کے تصور جہاد جس سے انگریز ہمیشہ خائف رہا، کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ہمیشہ قادیانی فرقہ کا محاسبہ کیا۔ بلکہ اس مسئلہ کو احرار کے منشور کی پہلی شق تصور کرنا چاہیئے۔ اگرچہ قادیانیوں کا محاسبہ اُن کی تحریک کے آغاز ہی میں شروع ہو چکا تھا مگر جس جماعت نے منظم طور پر یہ فریضہ انجام دیا وہ بلا شبہ مجلس احرار تھی۔ قیام پاکستان کے بعد اگرچہ یہ جماعت سیاسی طور پر ختم ہو گئی مگر مجلس تحفظ ختم نبوت کی صورت میں اب بھی موجود ہے۔ اس جماعت نے مرزائیت کے خلاف جو ذہن پیدا کیا بالآخر ۱۹۵۳ء میں تمام مکاتبِ فکر نے اس کا اثر قبول کیا اور مرزائیت کے خلاف ایک ملک گیر تحریک چلی جو دبا دی گئی۔ مگر ختم نہ ہو سکی یہاں تک کہ مرزائیت اپنے انجام کو پہنچی جو کا تعاقب اب بھی جاری ہے۔ مجلس احرار کا یہ واحد کارنامہ ہے جو کبھی فراموش نہیں کیا جائے گا۔

مسجد شہید گنج اور احرار۔ مسجد شہید گنج لاہور میں سرائے سلطان کے بالمقابل سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مسلمانوں کے دعویٰ کے مطابق یہ مسجد تھی جب کہ سکھوں کا دعویٰ تھا کہ یہ گوردوارہ ہے۔ بقول جانباز مرزا

"اس مسجد کا اصل نام عبداللہ کی مسجد تھا۔ سنہ ۱۰۶۲ھ میں شاہجہان کے ولی عہد دارا شکوہ کے خانساماں محمد عبداللہ نے اسے تعمیر کرایا تھا۔ مغلیہ دورِ حکومت میں باغی سکھوں کو جگہ قتل کیا گیا تھا جب مہاراجہ رنجیت سنگھ پنجاب پر قابض ہوا تو اس نے جو سکھ یہاں قتل ہوئے تھے اُن کی سمادھیاں بنوا دیں۔ اس طرح سکھوں کی زبان میں یہ گوردوارہ شہید گنج قرار دیا گیا۔"[۱]

---

[۱] کاروانِ احرار جلد دوم جانباز مرزا ص نمبر ۲۲۲

نسیم عنایت اللہ سوہدروی نے اِس کے علاوہ ایک اور روایت بیان کی ہے کہ

"مغلیہ دور کے ایک درباری فلک بیگ نے موجودہ نولکھا بازار کے کنارے ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کی جس کے ساتھ ایک باغیچہ ایک کنواں بھی تھا مسجد کا متولی دین محمد نامی ایک شخص تھا"[1]

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ یہ عمارت مسجد تھی جب کہ اِس کے قریب ہی سکھوں نے ایک فرضی قتل گاہ[2] تصور کر کے ایک گوردوارہ بھی تعمیر کیا تھا اور سکھ اپنے دورِ حکومت میں مسجد اور گوردوارہ دونوں پر قابض ہو گئے۔ انگریزی دورِ حکومت کے پچاس ساٹھ سال بعد مسلمانوں نے مسجد کی بازیابی کیلئے عدالت سے رجوع[3] کیا لیکن یہ دعویٰ سو سال کے قبضہ کی بنا پر خارج ہو گیا[4]۔ اور جب سکھ گوردوارہ ایکٹ بنا اور سکھوں کے گوردوارے گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے حوالے کئے جانے والے تھے تو گوردوارہ ایکٹ ٹربیونل میں انجمن اسلامیہ پنجاب کے سیکرٹری نے مسجد کے حصول کی پھر کوشش کی اور ہائی کورٹ سے رجوع کیا گیا[5] مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر مارچ ۱۹۳۵ء میں یہ مسجد گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دی گئی[6] اور ۲۸ جون ۱۹۳۵ء کی رات کو سکھوں نے مسجد کو شہید کرنا شروع کر دیا[7]۔ جس کی خبر پاتے ہی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مسجد کے انہدام کو روکنے کیلئے موقع پر پہنچ گئی۔ ایسے نازک مرحلہ پر مولانا ظفر علی خاں نے بڑے تدبّر اور صبر و تحمل سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں کو پرامن رہنے کی تلقین کی انہوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ گورنر سے مل کر بات کریں گے۔ جس پر مسلمانوں نے اطمینان کا اظہار کیا۔ ڈپٹی کمشنر ایس پرتاب سنگھ نے مسجد کے انہدام سے باز رہنے کا حکم دیا اور احاطے کے چاروں طرف پولیس کا پہرہ لگا دیا گیا[8]۔ مسلمان لیڈروں نے جب پنجاب کے گورنر ایمرسن سے مسجد کے متعلق بات کی تو گورنر نے یقین

1۔ ظفر علی خاں اور ان کا عہد — عنایت اللہ نسیم سوہدروی — ص نمبر ۲۳۱

2۔ بحوالہ ظفر علی خاں اور ان کا عہد — ″ ″ ″ — ص نمبر ۲۳۲

3-4۔ بحوالہ مارشل لا سے مارشل لا تک — ص نمبر ۱۶۷/۱۶۶

5۔ بحوالہ مسئلہ شہید گنج — مولانا مظہر علی اظہر — ص نمبر ۲۲ — بخاری اکیڈمی بیرون دہلی دروازہ لاہور

6۔ بحوالہ مارشل لا سے مارشل لا تک — ص نمبر ۱۶۷

دلایا کہ مسجد نہیں گرائی جائے گی[1]۔ اس عرصہ میں مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان مذاکرات بھی ہوتے رہے۔ مگر کامیابی نہ ہو سکی اور مسجد کو شہید کر دیا گیا۔ اب مسلمانوں کے پاس اس کے سوائے کوئی چارہ نہ تھا کہ ایک تحریک شروع کر کے مسجد کی بازیابی کا مطالبہ کیا جائے۔ اس سلسلہ میں مولانا ظفر علی خاں اور ان کی جماعت نیلی پوش آگے بڑھی اور مسلمانوں کے جذبات و احساسات کا ترجمانی کرتے ہوئے مسجد کی بازیابی کیلئے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ مگر مجلس احرار نے اس تحریک میں کوئی حصہ نہ لیا۔ مجلس احرار کا موقف یہ تھا کہ مسجد کا انہدام سر فضل حسین اور انگریزی حکومت کی سازش کا نتیجہ تھا جس میں مولانا ظفر علی خاں کو استعمال کیا گیا۔ کیونکہ سر فضل حسین کے ساتھ احرار کی مخالفت اس وجہ سے دشمنی میں بدل گئی کہ انہوں نے ظفر اللہ خاں قادیانی کو ایگزیکٹو کونسل کی ممبری کیلئے حکومتِ ہند سے سفارش کی تھی۔ بقول چوہدری افضل حق

"مرزائیوں کی مخالفت احرار کی تبلیغ کا اہم جزو تھا انہوں نے میاں صاحب کو للکارا اس طرح احرار نے ہندوستان کے مضبوط ترین مدبر کو اپنا بیری بنا لیا[2]"

اس کے علاوہ مجلس احرار کا موقف یہ بھی تھا کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے انتخابات میں احرار کی کامیابی یقینی تھی انگریز نہیں چاہتے تھے کہ پنجاب سر فضل حسین کی بجائے احرار جیسی انتہا پسند جماعت کے قبضہ میں چلا جائے[3]۔ بقول چوہدری افضل حق

"مسجد شہید گنج کی شہادت خوفناک سازش ہے اور اس کی ساری ذمہ داری حکومت پر ہے[4]"

سید نور احمد نے اس بیان کو کہ یہ سارا ہنگامہ احرار کے خلاف ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ہوا ایک لطیفہ[5] قرار دیا ہے۔ مگر خود انکے الفاظ میں

---

[1] بحوالہ ظفر علی خاں اور ان کا عہد — ص نمبر ۲۷۲

[2] تاریخ احرار — ص نمبر ۱۹۸

[3] بحوالہ کاروانِ احرار — ص نمبر ۲۱۲

[4] تاریخ احرار — ص نمبر ۲۰۵

[5] مجلس احرار کا یہ بیان تھا کہ سارا ہنگامہ ایکے خلاف سوچی سمجھی سازش کے مطابق ہوا جو واقعات معلوم ہیں انکی بنا پر اس کا نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے بلکہ اس روائتی لطیفے کی مانند معلوم ہوتا ہے جو ایک دیہاتی نے میلے میں چادر گم کر دینے کے بعد پیدا کیا تھا اس نے گھر والوں سے کہا تھا کہ اس میلے کا سارا ڈھونگ میری چادر ہتھیانے کیلئے رچایا گیا تھا۔ (مارشل لاء سے مارشل لاء تک ص نمبر ۱۶۱)

"ڈپٹی کمشنر دونوں فرقوں کے نمائندوں سے بات چیت کرتا رہا اسی بنیاد پر کہ تصفیہ کی کوئی صورت نکلنے تک مسجد کو منہدم

نہ ہونے دیا جائے گا۔ احاطے کے گرد پولیس کا پہرہ زیادہ سخت کر دیا گیا۔ سکھ جتھوں کی آمد پر کوئی پابندی نہ

لگائی گئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گورنر نے غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن ۸ جولائی کو آدھی رات کے وقت سکھوں

نے مسجد کو گرانا شروع کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اب گورنر کا رویہ یہ تھا کہ سکھوں نے اس کی مرضی کیخلاف

یہ اقدام کیا تب بھی وہ ان کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کو تیار نہ تھا۔"[1]

سید نور احمد کے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ ڈپٹی کمشنر اور گورنر سکھوں کے خلاف کیوں کارروائی نہیں کرتے۔ اشرف عطا صاحب اس سلسلے میں واضح طور پر لکھتے ہیں کہ

"۸ جولائی ۱۹۳۵ء کو سکھوں نے سرکاری شہ اور اشارہ پر مسجد شہید گنج کو شہید کر دیا۔ سکھوں نے مسجد شہید گنج کو پولیس اور فوج کی نگرانی میں مسٹر ایس۔ پرتاب ڈپٹی کمشنر لاہور کے روبرو شہید کرنا شروع کیا۔"[2]

آغا شورش کاشمیری تحریر فرماتے ہیں کہ

"شہید گنج ہی کے سلسلہ میں ایک مقدمہ سوشلسٹ رہنماؤں کامریڈ مبارک ساغر اور کامریڈ موہن لال کے خلاف مسٹر ایسر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں چل رہا تھا۔ میں اس میں صفائی کا گواہ تھا۔ میں نے عدالت سے کہا آپ اگر مجھے حفاظت کا یقین دلائیں تو میں ان تمام واقعات کو بلا کم و کاست عرض کرنے کو تیار ہوں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد شہید گنج حکومت نے گروائی۔ اس کے انہدام میں بعض سرکاری افسروں کا ہاتھ تھا۔"[3]

---

[1] مارشل لا سے مارشل لا تک — ص نمبر ۱۷

[2] مولانا ظفر علی خاں۔ مرتبہ اشرف عطا ص نمبر ۱۵۰۔ مکتبہ کاروان کچہری روڈ لاہور

[3] بوئے گل — ص نمبر ۱۱

آغا شورش اس تحریک میں شامل تھے وہ اس زمانے میں اپنی تقریروں میں یہ بات کہتے رہے کہ مسجد کو گرانے میں گورنر کا ہاتھ تھا[1]۔ بلکہ آغا صاحب نے یہاں تک لکھا ہے کہ

"مسجد کے گنبد پر سب سے پہلے گینتی چلانے والا سی۔ آئی۔ ڈی کا انسپکٹر بانتا سنگھ تھا"[2]

ان تمام بیانات سے یہ بات ضرور ثابت ہو جاتی ہے کہ مسجد شہید گنج کا انہدام اگر احرار کے خلاف نہ بھی ہو مگر سازش ضرور تھی۔ اور اس سلسلہ میں پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ پنجاب میں اسی کی حکومت تھی۔ اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں نے جو تحریک چلائی۔ وہ صرف اور صرف حصول مسجد کے لئے تھی کیونکہ اس تحریک میں حصہ لینے سے احرار پہلو تہی کر رہے تھے اور اتحاد ملت یا نیلی پوش جو مولانا ظفر علی خاں کی تنظیم تھی اور تحریک کپور تھلہ کے زمانے ہی میں منظم ہونا شروع ہو گئی تھی اور یہ تنظیم بلا شبہ مولانا ظفر علی خاں کی احرار سے ناراضگی کا نتیجہ تھا۔ احرار کی مخالفت میں اس میدان میں کود پڑی۔ جب احرار والوں نے یہ دیکھا کہ مولانا ظفر علی خاں نے شہید گنج کے سلسلہ میں وہ کام کیا ہے جو خود احرار کو کرنا چاہئے تھا۔ تو انہوں نے قانونی اور آئینی موشگافیوں سے اپنے کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش شروع کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ بعد کو احرار نے بھی شہید گنج کے حصول کیلئے جتھے بھیجنے شروع کئے[3]۔ مگر کوئی فائدہ نہ ہوا بلکہ مجلس احرار اور اتحاد ملت کے درمیان ایک جنگ شروع ہو گئی اور دونوں طرف سے ایک دوسرے پر سنگین الزامات عائد کئے گئے۔ جس سے دونوں گروہوں نے نقصان اٹھایا اور حکومت اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مولانا ظفر علی خاں اور دوسرے سرکردہ راہنماؤں کی گرفتاری کے بعد جب تحریک عام ہاتھوں میں پہنچی تو انہوں نے اپنے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کیا اور نام اتحاد ملت ہی کا استعمال ہوتا رہا۔ جس کی وجہ سے اتحادِ ملت اور مجلس احرار میں نفرت بڑھتی گئی۔ مولانا اختر علی خاں کے طرزِ عمل سے مولانا ظفر علی خاں کی بدنامی لازمی تھی مخالفین نے مولانا اختر علی خاں کی ذمہ داری بھی مولانا ظفر علی خاں پر ڈالی اور مولانا ظفر علی خاں طبعاً ایسے ہی معرکوں کے آدمی تھے انہوں نے مخالفین کو آڑے ہاتھوں لیا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت بچ گئی اور شہید گنج کا ملبہ احرار اور اتحاد ملت پر آپڑا۔

---

[1] بحوالہ بوئے گل — ص نمبر

[2] بوئے گل — ص نمبر ۷۵

[3] بحوالہ ظفر علی خاں — مرتبہ اشرف عطا — ص نمبر ۱۵۵

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ احرار کا تحریک شہید گنج میں حصہ نہ لینا بہت بڑی غلطی تھی جس نے مجلسِ احرار کے وقار اور شہرت کو بہت نقصان پہنچایا اور احرار بطور سیاسی جماعت اِس واقعہ کے بعد ختم ہو گئی۔ بقول اشرف عطا صاحب

"تحریک شہید گنج نے احرار کی جماعتی حیثیت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا۔"[۱]

نسیم عنایت اللہ سوہدروی کے نزدیک

"مجلس احرار عوام میں مقبول ہو رہی تھی مگر مسجد شہید گنج سے متعلق اس کا مشکوک کردار ہی اسے لے ڈوبا۔"[۲]

سید نور احمد کے خیال میں

"جہاں تک مجلس احرار کا تعلق ہے اس ہنگامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو مقبولیت اِس جماعت نے چار پانچ سال کی محنت سے حاصل کی تھی وہ چند ہی دنوں میں ختم ہو گئی۔"[۳]

مندرجہ بالا آراء میں مبالغے سے کام لیا گیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ مسجد شہید گنج کے تنازعے نے مجلس احرار کی شہرت کو نقصان پہنچایا تھا مگر کوئی جماعت بھی اِس قدر جلد ختم نہیں ہو جاتی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا آراء میں کہا گیا ہے۔ قوموں کی طرح جماعتوں پر بھی حالات و واقعات کا اثر ہوتا ہے اور اسی اثر کی بدولت عروج و زوال کے مرحلے پیش آتے ہیں۔ نہ صرف مجلس احرار بلکہ ہندوستان کی دیگر جماعتیں بھی اس نشیب و فراز سے گزری ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مجلس احرار اس واقعے کے بعد ختم ہو گئی تھی۔ قرینِ قیاس نہیں بقول چوہدری افضل حق

"شہید گنج کی ایجی ٹیشن سے پہلے ان کی محض ہوا بندھی ہوئی تھی۔ شیرازہ بندی نہ تھی اب اگرچہ ہوا خیزی ہوئی تاہم جماعت احرار حقیقی معنوں میں جماعت ہو گئی ہر جگہ دفتر کھل گئے۔ والنٹیروں کا

۱	ظفر علی خاں	ص نمبر ۱۵۷
۲	ظفر علی خاں اور اُن کا عہد	ص نمبر ۵
۳	مارشل لا سے مارشل لا تک	ص نمبر ۱۷۱

نظام مضبوط ہو گیا ہے[1]

تاہم اِس میں کوئی شک نہیں کہ احرار کی شہرت کو نقصان ضرور پہنچا تھا مگر مجلس احرار کسی لحاظ سے بھی ختم نہیں ہوئی تھی ۔ البتہ مجلس احرار کی بدنامی صرف اُس وقت واقع ہوئی ۔ جب انہوں نے پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگ کی مخالفت کی وہ حکومت الٰہیہ کا قیام کو چاہتے تھے مگر اس بات کو اہمیت نہیں دیتے کہ حکومت الٰہیہ کیلئے کوئی خطۂ زمین تو ہونا چاہیئے ۔ مجلس احرار اسلام ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد انقلابی جماعت تھی ۔ جو انگریزوں سے مرعوب ہونے کی بجائے اُس پر حملہ آور ہوتی تھی ۔ جس کے خطیبوں نے مسلم عوام میں سیاسی شعور اور بیداری پیدا کرنے کا فریضہ انجام دیا ۔ جس نے انگریز کے دیسی حاکموں اور ملازموں کو اُس کی حیثیت بتائی کہ نوکر ہیں آقا نہیں ۔ جس نے دیسی ریاستوں کے حکمرانوں اور طبقۂ امراء کو تباہ حال انسانوں سے انسانیت کا سلوک کرنے پر مجبور کیا ۔ جس کی تحریک سازی اور شعلہ نوائی کا پورے ہندوستان میں کوئی جواب نہ تھا ۔ جس کے کارکن جوشیلے ۔ حوصلہ مند اور یکتا و بے مثال ایجی ٹیٹر تھے ۔ احرار کی چلائی ہوئی تحریک کے آگے بند باندھنا انگریز جیسی طاقتور حکومت کے لئے ہمیشہ ناممکن رہا ۔ جس نے مرزائیت کی خطرناک تحریک کا بروقت محاسبہ کیا اور اس سلسلے میں کبھی کوئی کمزوری یا لغزش احرار کے ادنیٰ سے ادنیٰ کارکن کی طرف سے نہ ہوئی ۔ مجلس احرار نے جس بہادری سے آزادی کی جنگ لڑی اور اس جدوجہد میں جو قربانیاں انہوں نے دیں ۔ جتنی قید و بند کی صعوبتیں انہوں نے اٹھائیں وہ یقیناً گراں بہا ہیں لیکن برصغیر کی سیاسی تاریخ میں مجلسِ احرار اسلام وہ واحد جماعت ہے جس کی کسی قربانی ایثار ۔ خدمت اور جدوجہد آزادی کا اعتراف نہیں کیا گیا ۔ جس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ جس ماحول اور زمانے میں انہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت کی اس وقت اگرچہ پاکستان ایک منزل کا درجہ حاصل کر چکا تھا مگر ابھی معرضِ وجود میں نہ آیا تھا مگر قیام پاکستان کے بعد حالات بدل گئے لہٰذا احرار کے خطیبوں کی خطیبانہ پھبتیاں ۔ تعلیاں اور طنزیہ فقرے اُن کے خلاف فردِ جرم بن گئے ۔ اب لوگوں نے احرار کی خطابت کا وہ حصہ جو پھبتیوں ۔ تعلیوں اور طنز و مزاح پر مشتمل تھا احرار کے خلاف استعمال کیا ۔ یہاں تک کہ قانون دانوں نے بھی یہی فقرے ۔ یہی پھبتیاں اور ۔ یہی تعلیاں احرار کے خلاف شہادت کے طور پر پیش کیں ۔ تاہم مجلس احرار اگرچہ سیاسی طور پر ختم ہو گئی مگر ختم نبوت کی تحریک جو احرار نے شروع کی وہ آج بھی موجود ہے اور جب تک پاکستان میں مرزائیت موجود ہے یہ تحریک چلتی رہے گی

---

[1] تاریخ احرار ص نمبر ۱۹۳

اور جب تک پاکستان میں مرزائیت موجود ہے یہ تحریک چلتی رہے گی۔

صحافت

"موجودہ دور میں صحافت اور ادب دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ لیکن اُردو صحافت میں ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جس میں صحافت ادب ہی کی ترجمانی اور ترسیل کا فریضہ ادا کرتی رہی تھی[1]

اور اس دور میں صحافت پیشہ نہیں عبادت تھی۔ کاروبار نہیں بلکہ حصول آزادی کا مقصد تھی۔ پروپگنڈا نہیں حقیقت تھی۔ تفرقہ نہیں سیاسی شعور تھی۔ جس کے سب سے بڑے علمبردار اُردو زبان کے طرح دار ادیب وخطیب مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی تھے۔ جنہوں نے قوم کی بیداری اور ملک کی آزادی کیلئے صحافت کو ذریعہ بنایا چونکہ حالات بدل گئے تھے لہٰذا ان راہنماؤں نے انگریز دوستی۔ مغرب پرستی۔ اور محض عقل پرستی کی بجائے مشرقیت کے احیاء۔ آزادی اور مذہبی اقدار کی پاسداری کیلئے ایک عام ذہن اور شعور پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی جس کی بنا پر ان راہنماؤں کے عمل کو علی گڑھ تحریک کے رد عمل کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ شیخ محمد اکرام نے اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> دو قومی روایات کے تسلسل ٹوٹنے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتہ وار اور روزانہ اخبارات کا اثر بہت بڑھ گیا۔ علی گڑھ تحریک کے بڑے سرگروہ سرسید۔ نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک ارباب عمل تھے۔ وہ اسلامی تاریخ کے قدیمی سرگروہوں کی طرح صاحب السیف نہ تھے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ انتظامی معاملات میں گزرا تھا۔ انہیں آدمیوں اور واقعات کا گہرا ذاتی تجربہ تھا جس سے ان کے نقطہ نظر میں واقعیت پسندی غالب تھی اور ٹھوس تعمیری کام کرنے کا ملکہ بھی ان میں زیادہ تھا۔ نئے دور کے سب سے مقبول راہنما تین نوعمر اخبار نویس تھے۔ مولانا محمد علی ایڈیٹر کامریڈ و ہمدرد۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایڈیٹر الہلال اور مولانا ظفر علی خان ایڈیٹر زمیندار تینوں اسلامی ہندوستان کے سب سے بڑے جرنلسٹ تھے۔ ان کا عملی تجربہ تھوڑا تھا۔ اور

---

[1] صحافتی زبان۔ مسکین حجازی دیباچہ ڈاکٹر وحید قریشی ص نمبر ۸

واقعات سے انہیں اتنا انس نہ تھا جتنا الفاظ یا خیالات سے۔ لیکن ان کے ہاتھ میں ایک بے پناہ طاقت تھی۔ قلم۔ اور چونکہ اب قومی تاریخ کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا وہ اپنے زورِ قلم سے جس طرف چاہتے قومی خیالات کا رخ بدل دیتے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دورِ ردِ عمل میں خیال و عمل کے درمیان جو وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔ اس کی ایک بڑی وجہ وہ تھی جس کا ہم ذکر کر چکے ہیں یعنی قومی راہنمائی کی باگ کا اُن لوگوں کے ہاتھوں چلے جانا جو کہنے والے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ قرآنِ حکیم نے سورۃ الشعرا میں شعرا کی اس خصوصیت پر زور دیا ہے کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں ان پر اُن کا عمل نہیں ہوتا یہ خصوصیت فقط شعرا کی نہیں بلکہ تمام وہ انشاپرداز جن کی تحریر میں متخیلانہ رنگ غالب ہوتا ہے سورۃ الشعرا کے بلیغ اصولوں کے تحت میں آتے ہیں دورِ ردِ عمل کے تین مقبول راہنما اقبال۔ مولانا ظفر علی خاں ظفرؔ۔ مولانا محمد علی جوہرؔ۔ تو باقاعدہ شاعر تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی ابتدا بطور ایک شاعر کے کی اور الہلال میں انہوں نے جو "مخصوص طرزِ تحریر" اختیار کیا وہ نثر کی نسبت شاعری سے زیادہ قریب تھا۔

ابھی تک ہم نے جس فرق کا ذکر کیا ہے وہ زیادہ تر اس لائحۂ عمل کے متعلق ہے جو قومی راہنماؤں نے قوم کے سامنے رکھا اور قوم کی عام حالت یا عملی استعداد کے درمیان تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نمایاں اختلاف وہ تھا جو زعمائے وقت کے ارشادات اور ان کی شخصی زندگی میں تھا[1]"

شیخ محمد اکرام صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس میں سرسید کے دور اور اس کے ردِ عمل کے دور کا جو جائزہ پیش کیا ہے اس کے نمایاں پہلو یہ ہیں۔

۱۔ تحریک علی گڑھ کے بڑے بڑے لوگوں میں ٹھوس تعمیری کام کرنے کا ملکہ زیادہ تھا۔

۲۔ وہ واقعیت پسند تھے۔

---

[1] موجِ کوثر شیخ محمد اکرام ص نمبر ۲۸۹/۲۹۰/۲۹۲

۳۔ واقعات اور آدمیوں کے متعلق اُن کا گہرا تجربہ تھا۔

۴۔ اور عمر کا زیادہ حصہ انتظامی امور میں گزرا تھا۔

ردِ عمل کے دور کے ممتاز لوگ

۱۔ نوعمر اخبار نویس تھے۔ جن کو واقعات سے کم الفاظ و خیالات سے زیادہ انس تھا۔

۲۔ اُن کا تعلق کہنے والے طبقے سے تھا کرنے والے طبقے سے نہیں یعنی عمل کے آدمی نہ تھے۔

۳۔ سب شاعر تھے۔ جو نثر نگار تھے چونکہ ان کی نثر شاعری سے قریب ہے لہٰذا سب قرآن حکیم سورۃ الشعراء کے مطابق جو کچھ کہتے اُس پر عمل نہ کرتے

۴۔ شخصی زندگی میں نمایاں تضاد

۵۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ قومی تاریخ کا تسلسل ٹوٹ چکا تھا۔ ان امور پر اگر اُس زمانے کے ماحول۔ حالات اور تقاضوں کو مدِنظر رکھا جائے تو دونوں ادوار کے بزرگوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ انہوں نے اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق جو طرز عمل اختیار کیا ان میں ہر لحاظ سے حق بجانب تھے۔ جہاں تک شیخ اکرام صاحب کے بیانات کا تعلق ہے۔ اُس میں الفاظ کے بے جا استعمال کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ پہلی بات یہ کہ اِن نوعمر اخبار نویسوں کو واقعات سے زیادہ الفاظ اور خیالات سے اُنس تھا۔ درست نہیں۔ کیونکہ

"زندگی کا خام مواد ادیب اور صحافی دونوں کے لئے اہم ہے لیکن اس خام مواد میں عصری واقعات کی اہمیت اور ترسیل صحافت کا موضوع خاص ہے[1]"

گویا واقعات کی اہمیت صحافت میں زیادہ ہے۔ بلکہ صحافت میں واقعات کا درست اور ٹھیک ہونا بھی ضروری ہے[2]۔ اگر ہم مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان کی صحافت کو دیکھیں تو ہمیں ان کی صحافت میں واقعات اپنی پوری صحت کے

۱۔ صحافتی زبان۔ مسکین علی حجازی۔ دیباچہ ڈاکٹر وحید قریشی ص نمبر ۱۰

۲۔ بحوالہ صحافتی زبان۔ مسکین علی حجازی ص نمبر ۲۰/۲۱

کے ساتھ مندرج ملتے ہیں اور ان واقعات پر جن الفاظ میں اظہار خیال کیا گیا ہے وہ الفاظ لاکھ خوبصورت سہی مگر واقعات کے تابع ہیں کیونکہ اصل مقصد کسی واقعے کا بیان ہے۔ الفاظ کا لکھنا نہیں۔ شیخ صاحب نے جن خوبصورت الفاظ و خیالات سے دھوکا کھایا ہے وہ تو ان عظیم شخصیتوں کی شخصیت کا عکس ہے۔ جس کو اُن کی صحافت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ تمام اکابر شخصی صحافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور شخصی صحافت میں اگر کسی صحافی کی شخصیت کو اخبار سے الگ کر دیا جائے تو وہ اخبار بے روح ہو جائے گا۔[1] پھر کیا سرسید اور اُن کے رفقائے کار کی تحریر میں خیالات اور الفاظ کا حسن نہیں ہے؟ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ علی گڑھ تحریک میں یہ حسن و خوبی اور ردِ عمل کے دور میں خامی بن جائے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے۔ علی گڑھ تحریک کے اکابر کرنے والے اور دور ردِ عمل کے اکابر کہنے والے تھے اس کو دھوکا نہیں بلکہ تعصب پر محمول کرنا چاہئے۔ شیخ اکرام صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علی گڑھ تحریک میں حصہ لینے والے لوگ تو عملی آدمی تھے مگر ردِ عمل دور میں صرف باتیں کرنے والے۔ خدا معلوم شیخ صاحب کے ذہن میں عمل کے کیا معنی ہیں ورنہ عام طور پر کسی کام کے کرنے کو ہی عمل کہا جاتا ہے۔ جس طرح علی گڑھ کالج قائم کرنا عمل ہے۔ اسی طرح ایک پریس لگانا اور اخبار نکالنا بھی عمل ہے۔ جس طرح کالج کے لڑکوں کو لیکچر دینا ایک عمل ہے اسی طرح خطیبوں کا تقریریں کرنا بھی ایک عمل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک عمل کا دائرہ قوم کے نوجوانوں تک محدود ہے اور دوسرے عمل کا دائرہ قوم پر محیط ہے۔ عجیب بات ہے کہ سرسید اگر اخبار نکالیں تو کرنے والے اور اگر یہی کام کوئی دوسرا کرے تو کہنے والے۔

شیخ صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کو شاعری کے قریب کر کے اور مولانا محمد علی۔ مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال[2] کو شاعر کہہ کر قرآن حکیم سے ثبوت بھی دیا ہے۔ کہ شاعر جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ چونکہ قرآن حکیم کا یہ فیصلہ اُن شاعروں کے متعلق ہے جن کا عمل وہ نہیں ہوتا جو وہ کہتے ہیں۔ لہٰذا مولانا ابوالکلام آزاد جو نثر میں شاعری کرتے ہیں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان چونکہ ایسے شاعر ہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وہی کچھ وہ کرتے بھی ہیں لہٰذا قرآن حکیم کا حکم ان پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لئے جب یہ شاعر لوگوں کو آزادی کا درس دیتے ہیں۔ آزادی چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے قید و بند کی صعوبتیں اٹھاتے ہیں لوگوں کو بغاوت پر ابھارتے ہیں۔ تو خود بھی باغی قرار پاتے ہیں۔ جب وہ لوگوں کو عدم تعاون کی تعلیم دیتے ہیں

---

[1] بحوالہ صحافتی زبان مسکین علی حجازی ص نمبر ۲۱/۲۲

[2] علامہ اقبال اپنی فکر کے اعتبار سے اس دور کے بہت بڑے فلسفی اور شاعر تھے چونکہ بات صحافت کے ضمن میں ہو رہی ہے لہٰذا علامہ اقبال کا ذکر مناسب نہیں

تو خود بھی عدم تعاون کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انگریز کے خلاف اگر نفرت کا بیج بوتے تھے تو خود بھی انگریزوں سے محبت کرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ جب وہ اسلام کا احیاء چاہتے ہیں تو اس کے لئے کوشش بھی کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح تحریک علی گڑھ کے دور میں قوم کو انگریزوں سے تعاون کیلئے کہا جاتا تھا تو خود بھی اس دور کے راہنما تعاون کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اگر وہ انگریزی تہذیب و معاشرت کی تعلیم دیتے تھے تو خود بھی اُس سے پہلو تہی نہ کرتے تھے اور اگر اُن کے پیش نظر قوم کی اصلاح تھی تو وہ خود بھی یہ کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شیخ اکرام صاحب نے ردعمل کے دور کے راہنماؤں کے قول و فعل اور خیال و عمل میں تضاد دکھانے کیلئے کہا ہے۔ کہ وہ ہندوستان میں حکومت الٰہیہ کا خواب تو دیکھتے تھے مگر کاغذ کی کمیابی کے زمانے میں پچاس صفحے کا رسالہ جاری نہ رکھ سکے[۱] مسلمان راہنما دعویٰ تو کرتے تھے حریت۔ اخوت مساوات کا لیکن صوبے میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوتی وہاں حکام پرستی اور امیر نوازی اتنی ہی زیادہ ہوتی تھی[۲] جہاں تک کاغذ کی کمیابی کے باعث کسی رسالے کے بند ہو جانے کا تعلق ہے اس میں قول و فعل کے تضاد کی تو کوئی بات نہیں بلکہ استطاعت کی بات ضرور ہے۔ کیونکہ رسالے کیلئے گورنمنٹ یا کسی امیر آدمی سے مدد لینا آزادئ تحریر کیلئے مضر ہے لہٰذا جبکہ کاغذ کمیاب ہوا اور یہ استطاعت نہ رہی کہ رسالہ جاری رہے تو اسے بند کر دینا زیادہ اچھا تھا بجائے اس کے کہ اپنے قلم کا سودا کیا جاتا۔ جہاں تک مسلمانوں کی حکام پرستی اور امیر نوازی کا تعلق ہے۔ یہ بھی مسلمان راہنماؤں کے قول و فعل کا تضاد نہیں کیونکہ یہ مسلمان راہنما نہیں تھے جو حکام پرستی اور امیر نوازی کا ثبوت دیتے تھے بلکہ شیخ صاحب کے الفاظ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہوتی وہاں حکام پرستی اور امیر نوازی مسلمان کرتے تھے۔ مسلمان راہنما نہیں اور مسلمان بھی وہ جنہیں ایک عرصہ سے حکام پرستی اور امیر نوازی کی تعلیم دی گئی تھی۔ مسلمانوں میں انگریز سے نفرت اور دشمنی کسی دور میں بھی ختم نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی اس میں کمی ضرور ہوئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اس نفرت اور دشمنی میں نمایاں کمی نظر آتی ہے۔ مسلمانوں نے بدلتے ہوئے حالات میں خود اپنی بہتری کیلئے انگریز کے ساتھ تعاون کیا۔ جس میں کسی فریب یا دھوکہ کو دخل نہ تھا۔ اس سلسلہ میں مسلمانوں نے پُر خلوص کوششیں کیں۔ انگریزوں کی طرف سے اُس کا جواب زیادہ حوصلہ افزا نہ تھا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا۔ بلکہ انگریزوں نے ظلم اور ناانصافی میں دوسرے ہندوستانیوں

۱۔ بحوالہ موج کوثر شیخ اکرام سن نمبر ۲۹۱

کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیا کہ دوسری قوم کے غلط اقدامات کی سزا بھی مسلمانوں کو دی۔ انگریز کے اس غیر شریفانہ رویئے سے مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ اور انہوں نے دوبارہ اپنے کھوئے ہوئے اقتدار اور عظمتِ رفتہ کی بازیابی کیلئے کوششیں شروع کیں۔ انگریز کی بدنا انصافیاں اور زیادتیاں صرف ہندوستان کے مسلمانوں تک محدود نہ تھیں۔ بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی اس کا سلسلہ جاری تھا۔ انگریز کی اس ریشہ دوانیوں سے مسلمانوں کو نجات دلانے کیلئے جس عظیم راہنما نے اتحادِ عالم اسلامی کا تصور پیش کیا وہ جمال الدین افغانی تھے۔

"ان کا سب سے بڑا خیال اسلامی سربزی اور اتحادِ اسلام تھا اسی وہ اسلام کی ترقی اور احیاءِ عظمت کی بنیاد قرار دیتے تھے اور اسی میں وہ یورپ کے غلبہ اور تسلط سے اسلام کی نجات مضمر سمجھتے تھے۔"[۱]

مسلمانوں کو اسلامی اتحاد و اخوت کی دعوت دینا کوئی نئی بات نہیں تھی لیکن عیسائیت کے پروپیگنڈا نے پان اسلام ازم کو ایسی خوفناک تحریک کے طور پر پیش کیا کہ خود ناسمجھ مسلمان بھی اس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے۔ مگر ابوالکلام نے ہندوستان میں جس جارحانہ انداز سے پان اسلام ازم کی تبلیغ کو اپنا شعار بنایا اُس سے نہ صرف ہندوستان کے عام مسلمانوں میں بلکہ اسلامی ممالک میں بھی اس مسئلہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ انہوں نے بتایا کہ اگر یورپ کی تمام عیسائی طاقتیں متحد ہو کر مسلمانوں کو ختم کرنے کیلئے "مشرقی مسئلہ" یا "مشرق کا فیصلہ آخری" کی تحریک شروع کر سکتی ہیں تو مسلمانوں کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے تحفظ اور بقا کیلئے پان اسلام ازم کا ساتھ دیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان خیالات کا اظہار ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کلکتہ کی ایک تقریر میں کیا مولانا فرماتے ہیں

"کوئی شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ آج نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں نے ایک خاص متفقہ حکمت عملی وضع کی ہے اور اس کا نام "مشرقی مسئلہ" یا "مشرق کا فیصلہ آخری" رکھا ہے۔ مشرقی مسئلہ کی حقیقی غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام بقیہ قوائے سیاسیہ کا بتدریج خاتمہ کر دیا جائے بالفاظ صاف تر یہ کہ دنیا کے جس قدر حصے اسلام کے زیر اثر باقی رہ گئے ہیں ان کو بھی یورپ کی مسیحی حکومتیں کسی ایسی تقسیم مساوی کے ساتھ۔ جو توازن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر

---

[۱] مقام جمال الدین افغانی مضمون از ضیاء الدین برنی۔ ص نمبر ۳۲۔ نفیس اکیڈمی کراچی

موثر نہ ہو آپس میں بانٹ لیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ایک خنجر اسلام کے قلب میں پیوست کرنے کیلئے تیز کیا جا رہا ہے ۔ کیا مضائقہ اگر ہم کسی ڈھال کی تیاری میں مصروف ہوں؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یورپ جانتا ہے کہ "مسئلہ مشرق" کے حملہ کیلئے کوئی بچاؤ اگر اسلام کے پاس ہے تو صرف اسکا حقیقی اتحاد اسلامی ہے اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا اس پر متفق ہو جانا ہے کہ اپنی قدیمی سیادت اور شرف کو محفوظ رکھیں [1]۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ اتحاد اسلامی اُس وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ ہندوستان میں احیائے شریعت کی جو تحریک پیدا ہوئی یا تحریک علی گڑھ کے خلاف جو ردِ عمل پیدا ہوا اُس میں بنیادی روح اتحاد اسلامی ہی کی ہے ۔ جس کے سب سے بڑے داعی اور ان تھک مفکر علامہ اقبال اور ابو الکلام آزاد ہیں۔ جنہوں نے مسلمانوں کی مشکلات کا حل صرف اور صرف اسلام کو قرار دیا ۔ اور مسلمانوں کو حصول آزادی کیلئے عمل کی دعوت دی تاکہ یورپی استبداد کا مقابلہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ مل کر کیا جائے علامہ اقبال اور ابو الکلام آزاد نے اپنی نظم و نثر کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں جو قومی برتری اور احساسِ عظمت پیدا کیا اُس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریز سے اور بھی بدظن کر دیا ۔ اس تحریک کو فروغ دینے میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروہ نے حصہ لیا جو سب کے سب عظیم المرتبت اور قابلِ احترام بزرگ تھے ۔ مگر اس تحریک کو عوامی بنانے ۔ قوت عطا کرنے اور عملی جامہ پہنانے میں مولانا ظفر علی خاں ۔ مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا محمد علی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ہندوستان کے یہ تینوں راہنما بیک وقت صحافی ۔ ادیب ۔ خطیب ۔ سیاستدان تھے ۔

ظفر علی خاں

اردو صحافت کی تاریخ میں ظفر علی خاں کو بابائے صحافت کے لقب سے پکارا جاتا ہے ۔ ظفر علی خاں سے پہلے اردو صحافت میں صرف تین روز نامے موجود تھے ۔

"اول پیسہ اخبار ۔ دوم اودھ اخبار ۔ سوم صلح کل تینوں نرم سیاست کے قائل تھے [2]۔"

---

[1] الہلال ۔ ابو الکلام آزاد ۔ شمارہ نمبر ۱۷/۱۶ ۲۰ نومبر ۱۹۱۲ء

[2] صحافت پاکستان و ہند میں ۔ عبد السلام خورشید ص نمبر ۳۳۸ مجلس ترقی ادب لاہور

لیکن جب مولانا ظفر علی خاں نے "زمیندار" کے ذریعہ صحافت میں قدم رکھا تو انہوں نے سب سے پہلے اُردو صحافت کا مزاج بدلنے کیلئے اقدامات کئے۔ کیونکہ جس دعوتِ عمل کے وہ داعی تھے اور جن لوگوں تک اِس دعوت عمل کو پہنچانا مقصد تھا۔ اُن کو متوجہ کرنا نرم سیاست سے ممکن نہ تھا۔ اُس کیلئے جرأت۔ بیباکی۔ جوش جذبہ اور زبان کی ضرورت تھی۔ جو لوگوں کی نہ صرف سمجھ میں آئے بلکہ اُن میں جوش اور ولولہ پیدا کر دے یہی وجہ ہے کہ زمیندار ایک عوامی اخبار تھا۔ جس سے مسلمانوں میں بے پناہ جوش اور ولولہ پیدا ہوا اور اسی جوش اور ولولے سے تحریک آزادی کی آبیاری ہوئی۔ علامہ اقبال نے مغربی قومیت کے خلاف جس جہاد کا اعلان کیا تھا اور مغربی تہذیب میں روحانیت کے فقدان کی جو نشاندہی کی تھی اور جس طرح سے رجعت پسندانہ فکر میں جمود اور بے عملی کو تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ اُس نے اگرچہ ملک کے باشعور طبقے میں تحرک و تموج تو پیدا کر دیا تھا مگر ایک شاعر کی فلسفیانہ بصیرت اور شاعرانہ حسن کا ادراک عام لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔ ظفر علی خاں نے یہ کام اپنے اخبار زمیندار کے ذریعے انجام دیا۔ انہوں نے رسولؐ ہاشمیؐ کی قوم کی ترکیبِ خاص کو روز مرہ بنا دیا۔ جو بلاشبہ قوم کی ایک بڑی خدمت تھی۔ مولانا ظفر علی خاں سے پہلے صحافت پڑھے لکھے لوگوں تک محدود تھی۔ مگر مولانا ظفر علی خاں نے اردو صحافت کے دائرے کو بہت زیادہ وسیع کر دیا۔ اس کیلئے انہوں نے صحافت کے اعلیٰ اصول کی پیروی کرتے ہوئے پہلے خبر کے نظام کو بہتر بنایا۔ انگریزی اخبارات سے خبریں ترجمہ کر کے چھاپنے کی بجائے انہوں نے سب سے پہلے رائٹر اور ایسوسی ایٹیڈ پریس آف انڈیا سے خبریں حاصل کرنے کا انتظام کیا۔[1] اس کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علی خان نے دوسرے ممالک کی خبریں اور خاص طور پر اسلامی ممالک کی خبریں چھاپنے کا اہتمام کیا۔[2] اور "زمیندار" کے عملے میں نیاز فتح پوری۔ مولانا عبداللہ العمادی۔ مولانا وحید الدین سلیم اور منشی وجاہت حسین جھنجھانوی جیسے قابل اور نامور ادیب شامل تھے۔[3] اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں کے پرجوش مقالات۔ علمی مضامین۔ مولانا کی سیاسی شاعری اور مولانا کے تراجم نے زمیندار کو بہت کم عرصے میں اپنے زمانے کا سب سے بڑا اُردو اخبار بنا دیا۔ جنگ طرابلس کے آغاز کے ساتھ ہی زمیندار کو روزنامہ کر دیا گیا تھا۔ اور اس جنگ کے بارے میں ہندوستان کے مسلمان چونکہ بڑے حساس تھے لہٰذا زمیندار نے اِس موقع سے بڑا فائدہ اٹھایا۔

صحافت میں مولانا ظفر علی خاں کا سب سے بڑا کارنامہ حق گوئی اور سچائی ہے۔ اور اس زمانے میں اخبار کے ذریعے سچائی کا اعلان

۱-۳ بحوالہ صحافت پاکستان و ہند میں عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۵۰/۲۵۱

کرنا سب سے بڑا جرم تھا۔ بقول یوسف حسین خاں کہ انگریز

"ہندوستانی صحافت کو اپنی سلطنت کے لئے بڑا زبردست خطرہ سمجھتے تھے۔[1]"

اور اس خطرے سے بچاؤ کا جو طریقہ استعمال کیا گیا وہ ۱۹۱۰ء کا پریس ایکٹ تھا اور اس ایکٹ کی دفعہ ۴ اتنی موثر تھی کہ کوئی اخبار نویس بھی اس سے بچ کر نہیں نکل سکتا تھا۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اس دفعہ ۴ کا مطلب اس طرح لکھا ہے

"دفعہ ۴ کا مفہوم یہ تھا کہ اگر اخبار کے کسی مضمون سے لفظاً۔ معناً۔ کنایتاً یا اشارتاً یا کسی اور طریقے سے یہ پایا جائے کہ حکومت کے خلاف نفرت اور حقارت کے جذبات بھڑکائے گئے ہیں۔ یا اس کی کوشش کی گئی ہے یا ملک معظم کی رعایا کے دو طبقوں میں پھوٹ ڈلوائی گئی ہے۔ تو انتظامیہ ایسے اخبار سے دس دن کی معیاد کے اندر اندر ایک ہزار سے دس ہزار روپے تک ضمانت لے گی اور اگر اس کے بعد بھی اخبار میں قابل اعتراض مضمون شائع ہوا تو نہ صرف اس کی ضمانت قابل ضبطی متصور ہوگی بلکہ اس کا پریس بھی قابل ضبطی قرار دیا جائے۔[2]"

مندرجہ بالا اقتباس سے اس امر کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس دور میں اخبار نویسی کا کام کتنا مشکل تھا۔ اور اس پریس ایکٹ کے خلاف مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے علاوہ بھی بہت سے راہنماؤں نے مہم چلائی[3] جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قوانین صحافت کے لئے بڑے ہی ظالمانہ تھے۔ مگر مولانا ظفر علی نے ان قوانین کو اپنے مقصد کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننے دیا۔ عام انتظامیہ سے لے کر گورنر اوڈوائر تک مولانا ظفر علی خان کی حق گوئی۔ جرأت۔ بیباکی۔ جوش اور قلم کے زور سے حاضر تھے۔ اس لئے حکومت ضمانت ضبط کر سکتی۔ پریس ضبط کر سکتی تو یہ سب کچھ اس نے بار بار کیا مگر قوم نے مولانا ظفر علی کو یہ سب کچھ بار بار دیا۔ انگلستان میں آزادیٔ تحریر و تقریر کے علمبرداروں نے ہندوستان پابندیٔ تحریر و تقریر پہ اپنی ساری دانشمندانہ توانائیاں صرف کر کے ۱۹۱۰ء کے پریس ایکٹ کی مندرجہ بالا دفعہ نمبر ۴ ایجاد کی تھی اور سمجھتے تھے کہ اس طرح لوگوں کو حق گوئی سے

---

1. ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں) محمد عتیق صدیقی۔ پیش لفظ یوسف حسین خاں۔ ص نمبر ۱۶ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
2. صحافت پاکستان و ہند میں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۳۹۹
3. بحوالہ صحافت پاکستان و ہند میں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۹۸

باز رکھا جا سکتا ہے۔ مگر جب ظفر علی خاں کے آگے یہ دفعہ بھی بے بس ہو گئی تو حکومت کو ظفر علی خاں کے قلم سے بچنے کیلئے قید خانے کا بند و بست کرنا پڑا مگر ظفر علی خان پر یہ تمام حربے ناکام رہے اور ان کے پائے استقلال میں بھی لغزش تک نہیں آئی۔ مولانا ظفر علی خان کی طبیعت آئین و قوانین کی پابند نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ جذبات کا ایک ایسا بے پناہ سیل تھے جو بڑے بڑے پہاڑوں سے ٹکرا کر اُن کے پاؤں اُکھاڑ دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ ظفر علی خان کے پاس آئین و قوانین کے وار سے بچ نکلنے کی ایک ڈھال اُن کی سیاسی۔ طنزیہ اور ہجویہ شاعری تھی۔ جو کام اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون نہیں کر سکتا تھا وہ ظفر علی خان کی نظم کا ایک شعر کر دکھاتا تھا۔ ظفر علی خان کی نظم نے زمیندار کو صحیح معنوں میں عوام کا اخبار بنا دیا۔ ادھر زمیندار کی نظم چھپی اُدھر بچے بچے کی زبان پر رواں ہو گئی۔ لوگ ٹولیوں کی صورت میں یہ نظمیں گایا کرتے تھے[۱]۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے ایک صحافی کے اس وصف کو بڑا ضروری قرار دیا ہے کہ وہ کسی موڈ (Inspiration) کا انتظار نہ کرے بلکہ اُن میں فوری طور پر لکھنے کی صلاحیت ہونی چاہئے یعنی

"جو شخص اپنا مافی الضمیر سلیس اور سادہ زبان میں پیش کر سکے اور جو لکھنے کیلئے موڈ کا انتظار نہ کرے وہ صحافی بن سکتا ہے[۲]۔"

اور یہ وصف ظفر علی خاں میں بدرجہ اتم موجود تھا بقول شورش کاشمیری

"جہاں تک نظم کا تعلق ہے وہ خلوت اور جلوت دونوں سے بے نیاز تھے ان کے لئے دوستوں کا جمگھٹا اور فضا کا سناٹا یکساں تھے ان کیلئے شعر کہنا اتنا ہی آسان تھا جیسے گھڑی اٹھا کر وقت دیکھنا یا آواز کی سنہ پر گنگنانا[۳]۔"

غرض مولانا نے اپنی صحافتی زندگی میں بھرپور طریقے سے اس صفت سے بڑا فائدہ اٹھایا۔ وہ حقائق جس کی نثر میں ترجمانی حکومتِ برطانیہ سے بغاوت کا جرم بن سکتی تھی مولانا نے شاعرانہ طنز کے روپ میں اور ہجو کے پیرایہ میں ادا کر کے اُن حقائق کو عوام تک پہنچایا۔ جس سے عوام نے نہ

۱۔ بحوالہ ظفر علی خان ۔ شورش کاشمیری

۲۔ فن صحافت ۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ۔ ص نمبر ۲ مکتبہ کاروان لاہور

۳۔ قید فرنگ ۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۱۸

صرف سیاسی شعور حاصل کیا بلکہ ملک میں چلنے والی آزادی کی مختلف تحریکوں میں حصہ دار بنے ۔ مولانا ابوالکلام آزاد زمیندار کی اس عوامی مقبولیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"جنگ طرابلس نے قوم کے تمام طبقات کو خبر داری کا شائق بنایا اور زمیندار کی مقبولیت شروع ہو گئی اس کی اشاعت بیس بیس ہزار تک پہنچی اور اس ارزانی اور عام فہم ہونے نے اسے عام دوکانداروں اور بازار کے بیٹھنے والوں تک پہنچایا ہر شخص جو اردو عبارت پڑھ سکتا ہے علی الصبح اسی طرح زمیندار کا خواہش مند ہوتا ہے گویا یورپ اور امریکہ کا ایک تعلیم یافتہ عادتاً صبح کے وقت مطالعہ اخبار کے لئے بیقرار ہے ۔[۱]"

مولانا ابوالکلام آزاد زمیندار کے طرز تحریر اور انشا و مضامین کو پسند نہ کرتے تھے[۲] کیونکہ اس میں عوام کے مذاق کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا[۳] ۔ لیکن جہاں تک زمیندار کی حق گوئی ۔ مسلمانوں کی بیداری ۔ کوشش اور قومی جذبات و احساسات کی ترجمانی کا تعلق ہے مولانا اس کے اعتراف میں لکھتے ہیں

"زمیندار کا اشاعت و عدم اشاعت کا سوال ایک روزانہ اخبار کی موت و زندگی کا سوال نہ تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بلکہ یہ سوال تھا مسلمانان ہند کی بیداری، حس ملی، اور جوش حق پرستی کا یعنی یہ کہ آیا درحقیقت مسلمانوں میں فرض شناسی و حق پرستی کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے ؟ کیا وہ اس ہستی کیلئے کچھ کر سکتے ہیں ۔ جس کو طاقت کے عزیمت نے صرف اس لئے نیم بسمل کر دیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی حیات و افکار کی ترجمانی کی اور اس کی زبان پر حق جاری ہوا ؟ شکر ہے کہ اس کا جواب نفی میں نہیں ملا[۴] ۔"

---

۱ ۔ الہلال ۔ ابوالکلام آزاد ۔ شمارہ نمبر ۱ ۔ ۲ جنوری سنہ ۱۹۱۴ء ص نمبر ۳

۲ ۔ ۳ ۔ بحوالہ الہلال ۔ ابوالکلام آزاد ۔ شمارہ نمبر ۱ ۔ ۲ جنوری سنہ ۱۹۱۴ء ص نمبر ۳

۴ ۔ الہلال ۔ ابوالکلام آزاد ۔ شمارہ نمبر ۸ ۔ ۲۵ فروری سنہ ۱۹۱۴ء ص نمبر ۲

غرض ظفر علی خاں کی صحافت مسلمانوں کیلئے عطیہ الٰہی تھا۔ انہوں نے اپنی صحافت کے ذریعہ سے ایک بڑے ہی پر آشوب دور کی ترجمانی کی ہے۔ اب بھی اگر اُس دور کے روزانہ حالات و واقعات سے آگاہی مقصود ہو تو زمیندار میں یہ حالات و واقعات اپنی جزئیات کے ساتھ مل سکتے ہیں۔ بلکہ مولانا کی سیاسی شاعری کا ایک ایک شعر تلمیح کا کام دے سکتا ہے۔ شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ظفر علی خاں میں ایسی بہت سی نظموں کا ذکر کیا ہے جو بعض واقعات پر کہی گئی ہیں۔ اور ان واقعات کے پس منظر میں نظم کے حقیقی حسن اور اثر کا پتہ چلتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی صحافت میں خطابت کو بڑا دخل ہے۔ شاعری کے علاوہ نثر میں خطابت کے آثار نمایاں ہیں۔ ایک خطیب کے لئے جس جوش و جذبے اور بلند آہنگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ ظفر علی خاں کی صحافت میں ہر جگہ نمایاں ہے۔

مولانا ظفر علی خاں کو اُردو زبان پر بڑا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے صحافت کی زبان کو بھی ادبی بنا دیا۔ نئی نئی اصطلاحیں ایجاد کیں۔ نئے نئے محاورے وضع کئے الفاظ کے معنی میں جدتیں پیدا کیں اور نئی نئی تراکیب سے زبان کو وسعت دی۔ مولانا اپنی زبان دانی کے علاوہ بڑے مشاق مترجم بھی تھے۔ جو صحافت میں بہت بڑی بات ہے۔ شاعری میں نئے اور اچھوتے قوافی کی ایجاد میں مولانا کا کوئی ثانی نہیں بقول عبدالمجید سالک

"مولانا ظفر علی خاں پنجاب میں صحیح اور بامحاورہ اُردو لکھنے کے اعتبار سے بالکل بے مثال تھے۔"[1]

اُردو صحافت کی تاریخ میں زمیندار کا دفتر صحافیوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز تھا۔ مولانا چونکہ صحافت کا بلند پایہ مذاق رکھتے تھے لہٰذا انہوں نے ملک کے بہترین ادیبوں کو صحافیوں کو "زمیندار" کے عملہ میں شامل کیا۔[2] اور صحافت کے اپنے اعلیٰ معیار کے مطابق اُن کی تربیت کی۔ اُس دور کے تقریباً سب بڑے بڑے صحافی مولانا ظفر علی خاں سے تربیت یافتہ تھے۔ جنہوں نے اُردو صحافت کی تاریخ میں بڑا نام پیدا کیا۔ مولانا عبدالمجید سالک نے مولانا ظفر علی خاں کو بڑا صحافی کہا ہے اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں کہ

"مولانا ظفر علی خاں صحافت میں جنگجوئی اور رزم آرائی کے قائل تھے کبھی حکومت کے خلاف مصروفِ جنگ ہیں اخبار کی ضمانتیں ضبط ہو رہی ہیں۔ مقدمے چلائے جا رہے ہیں اور مولانا قید ہو رہے ہیں کبھی

---

[1] یارانِ کہن۔ عبدالمجید سالک ص نمبر ۱۹۰

[2] بحوالہ ظفر علی خاں ادیب و شاعر۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص نمبر ۳۰۷

ہندوؤں کے خلاف ہنگامہ برپا ہے اور شدھی اور سنگھٹن کے خلاف "دے رگڑے پہ رگڑا دھر رگڑا" کی قسم کی نظمیں لکھی جارہی ہیں اور سارا ہندو پریس عا[illegible]ز آکر چیخ رہا ہے کبھی صوفیوں کی شامت آرہی ہے۔ کبھی ابن سعود کی حمایت اور بدعتوں کی مخالفت میں زمین و آسمان ایک کئے جارہے ہیں۔ کبھی کانگریس کی حمایت میں مسلمانوں کی تحریک حقوق کی مخالفت کی جارہی ہے اور اس جوش میں ڈاکٹر اقبال بھی مولانا کے حملوں سے محفوظ نہیں رہتے۔ کبھی کانگریسی علماء کی دھجیاں اڑ رہی ہیں اور کبھی انہی کے حق میں مضمون پر مضمون لکھا جارہا ہے۔ اگر ان محاذوں سے کبھی فراغت ہوتی ہے تو قادیانیوں کے خلاف وہ شور و غوغا برپا کیا جاتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ احراریوں سے خوش ہیں تو ان کی شان میں قصیدے چھپ رہے ہیں ناراض ہیں تو انہی احرار لیڈروں پر نظم و نثر میں نہایت جمتی ہوئی پھبتیوں کا جھاڑ باندھا جارہا ہے[1]۔"

مولانا عبدالمجید سالک کے اس بیان سے جہاں مولانا ظفر علی خان کے مختلف معرکوں اور ہندوستان کے زود تغیر پذیر ماحول کی عکاسی ہوتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار کسی گورنمنٹ۔ گروہ۔ جماعت۔ باثر فرد یا افراد کی پالیسی کا پابند نہیں بلکہ اس سلسلے میں ظفر علی خان خود پالیسی ساز اور سیاسی راہنما تھے جو جس بات کو درست سمجھتے اسی کا اظہار کرتے اس سلسلہ میں انہوں نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ کون ناراض اور کون خوش ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے

ہندوؤں کے خلاف ہنگامہ برپا ہے اور شدھی اور سنگھٹن کے خلاف "دے رگڑے پہ رگڑا ادھر رگڑا" کی قسم کی نظمیں لکھی جا رہی ہیں اور سارا ہندو پریس عاجز آ کر چیخ رہا ہے کبھی صوفیوں کی شامت آ رہی ہے۔ کبھی ابن سعود کی حمایت اور بدعتیوں کی مخالفت میں زمین و آسمان ایک کئے جا رہے ہیں۔ کبھی کانگریس کی حمایت میں مسلمانوں کی تحریک حقوق کی مخالفت کی جا رہی ہے اور اس جوش میں ڈاکٹر اقبال بھی مولانا کے حملوں سے محفوظ نہیں رہتے۔ کبھی کانگریسی علماء کی دھجیاں اڑ رہی ہیں اور کبھی انہی کے حق میں مضمون پر مضمون لکھا جا رہا ہے۔ اگر ان محاذوں سے کبھی فراغت ہوتی ہے تو قادیانیوں کے خلاف وہ شور و غوغا برپا کیا جاتا ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ احراریوں سے خوش ہیں تو ان کی شان میں قصیدے چھپ رہے ہیں ناراض ہیں تو انہی احرار لیڈروں پر نظم و نثر میں نہایت جمتی ہوئی پھبتیوں کا جھاڑ باندھا جا رہا ہے۔[1]"

مولانا عبدالمجید سالک کے اس بیان سے جہاں مولانا ظفر علی خان کے مختلف معرکوں اور ہندوستان کے زود تغیر پذیر ماحول کی عکاسی ہوتی ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کا اخبار کسی گورنمنٹ۔ گروہ۔ جماعت۔ با اثر فرد یا افراد کی پالیسی کا پابند نہیں بلکہ اس سلسلے میں ظفر علی خان خود پالیسی ساز اور سیاسی راہنما تھے جو جس بات کو درست سمجھتے اسی کا اظہار کرتے اس سلسلہ میں انہوں نے کبھی اس بات کی پرواہ نہیں کی کہ کون ناراض اور کون خوش ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ مولانا کا قلم نرم رو نہ تھا اور شاعری میں طنز کی کاٹ سے درد کا احساس پیدا ہو جاتا تھا۔ جس نے ظفر علی خان کی شہرت کو بہت نقصان پہنچایا۔ مولانا ظفر علی خان میں یہ متضاد تبدیلیاں جن کا مندرجہ بالا اقتباس میں ذکر کیا گیا ہے۔ فوراً ادراک کے اندر سے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ خارج میں حوادث و انقلاب کا اثر ہوتی تھیں جو اس وقت کے ہندوستان میں جلدی جلدی وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔ جس کا اثر مولانا ظفر علی خاں نے اپنی جذباتی طبیعت کے مطابق قبول کیا۔ چونکہ وہ صحافی تھے اور صحافی کا روزمرہ واقعات سے اثر پذیر ہونا فن صحافت کی خوبی اور اپنے منصب سے اخلاص کا نتیجہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں پر لکھنے والے تمام مصنفین نے اس

۱۔ یاران کہن۔ عبدالمجید سالک ص نمبر ۳۷

بات کا اظہار کیا ہے کہ مولانا کے مزاج میں تلون تھا۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ مولانا کا طرزِ عمل حالات واقعات کے تحت بدل جاتا تھا۔ اکثر جماعتیں۔ تحریکیں۔ سیاسی شخصیتیں۔ مذہبی راہنما اور احباب اس تلون کا شکار ہوئے۔ تعریف و تنقیص۔ تعاون و انحراف۔ دوستی اور دشمنی۔ پیار اور نفرت زیر و زبر ہوتے رہے لیکن انگریز دشمنی اور اسلام دوستی کبھی اس تلون کا شکار نہیں ہوئی۔ اس مقصد میں وہ ایسا پہاڑ ہیں جسے کوئی ہلا نہیں سکتا اور جس پر حالات و واقعات اور دنیا کے تغیر و تبدل کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔

مولانا محمد علی جوہر

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مولانا محمد علی کا شمار ہندوستان کے عظیم ترین راہنماؤں میں ہوتا ہے۔ مولانا محمد علی نے مسلمانان ہند کی آزادی کیلئے اپنی صحافت۔ خطابت اور سیاست کو وسیلہ بنایا۔ مولانا کا شمار ہندوستان کے چند بڑے خطیبوں اور سیاست دانوں میں ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کی انگریزی صحافت میں مولانا محمد علی کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں جو انگریزی اخبار نکلتے تھے ان کے متعلق عتیق صدیقی صاحب رقم طراز ہیں

"انگریزی اخبارات رنگ ڈھنگ، مزاج و قماش اور انداز و بیاں کے اعتبار سے بھی ولائتی اخباروں کے خالص چربے ہوتے تھے ان اخباروں کے مالک اور ایڈیٹر بھی انگریز ہوتے تھے۔ چنانچہ اٹھارھویں صدی کی اخبار نویسی کو اگر ہم "ہندوستان کی بدیسی اخبار نویسی" کہیں تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔" [1]

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے لوگ اس وقت تک انگریزی زبان سے آشنا نہ تھے۔ لہٰذا ۱۵ فروری ۱۸۳۵ء کو ہندوستانی اور انگریزی اخبار نویسوں نے جو متفقہ یادداشت گورنر جنرل لارڈ بینٹنگ کو پیش کی اُس میں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے۔ کہ انگریزی اخبارات سے حکومت کو خطرہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ ہندوستان میں انگریزی جاننے والوں کی تعداد افسوسناک حد تک کم ہے [2]۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تک انگریزی اخبار نویسی کی یہی حالت رہی۔ بقول عتیق صدیقی صاحب

"بغاوت کے دنوں میں ہندوستان کے انگریزی اخبارات کا لہجہ انتہائی تلخ حد تک تند و تیز رہا

---

[1] ہندوستان کی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں۔ محمد عتیق صدیقی ص نمبر ۹۲

[2] بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی محمد عتیق صدیقی ص نمبر ۲۱۶/۲۱۷

اور بغاوت کو کچلنے میں انگریزوں کو جو قومی کامیابی حاصل ہوئی تھی اُس نے تمام انگریزوں کے ساتھ ساتھ انگریزی اخبار نویسوں کا دماغ بھی خراب کر دیا تھا۔[1]"

اِس کے بعد جب ہندوستان تاج برطانیہ کے زیر سایہ آگیا۔ تو ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ دی جانے لگی اور علی گڑھ تحریک کے زیر اثر انگریزی خواں طبقے کی تعداد بڑھی تو حالات کی تبدیلی اور نئے سیاسی شعور کے پیدا ہونے سے انگریزی اخبارات کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوا ایسے میں ایک آزاد اور قومی خیالات و احساسات کے ترجمان انگریزی اخبار کی اشد ضرورت تھی۔ اِس ضرورت کی طرف توجہ مولانا محمد علی نے کی اور ان کا معروف ہفت روزہ اخبار کامریڈ

"۱۴۔ جنوری ۱۹۱۱ء کو سینیچر کے دن کلکتہ سے جاری ہوا۔[2]"

"کامریڈ" ہر لحاظ سے ایک اچھا اخبار تھا۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے محمد علی کی انگریزی کے تو انگریز بھی معترف تھے۔ اور کالج کے طلباء اپنی استعداد بڑھانے کیلئے اِس کا مطالعہ کرتے تھے[3]۔ اِس اخبار کا معیار انگلستان کے اخباروں کے برابر تھا[4]۔ لیکن اس اخبار کے ذریعے سے مولانا محمد علی کے خیالات سے صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ ہی مستفید ہو سکتے تھے جس کا انہیں خود بھی احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے عام لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانے کیلئے روزنامہ "ہمدرد" کے نام سے ایک اردو اخبار نکالا۔ "ہمدرد" پہلے فروری ۱۹۱۳ء کو عارضی طور پر جاری ہوا۔

عارضی اخبار ۲۳ فروری سے ۱۳ مئی (نمبر ۱ تا ۷۹) یک ورقہ نکلا اور اس کے بعد سے ۱۴ مئی (نمبر ۸۵) تک دو ورقہ تھا۔[5]

یکم جون ۱۹۱۳ء سے ہمدرد باقاعدہ شروع ہوا

اور اس پر جلد ۱ ، نمبر ۱ لکھا گیا۔[6]

صحافت میں مولانا محمد علی کا مقصد اسلام اور دنیائے اسلام کی سربلندی تھا۔ اس عہد کے دوسرے مسلمان رہنماؤں کی طرح مولانا محمد علی

۱۔ ہندوستانی اخبار نویسی محمد عتیق صدیقی ص نمبر ۴۰۵

۲۔ مولانا محمد علی ایک مطالعہ ۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۔ مضمون سید غلام ربانی ص نمبر ۱۲۷

۳۔۴۔ بحوالہ مولانا محمد علی ایک مطالعہ ۔ مرتبہ عبداللطیف اعظمی ۔ مضمون سید غلام ربانی ص نمبر ۱۲۸ علمی ادارہ نئی دہلی

۵۔۶۔ مولانا محمد علی ایک مطالعہ ” ” ” ص نمبر ۱۰۴

بھی اتحادِ عالمِ اسلامی کے داعی تھے وہ انگریزی کے بہت بڑے عالم اور صحافی تھے مگر انگریز کی بدتہذیبی اور انگریزی تہذیب کی غارت گری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اگر انہوں نے اپنا ہفت روزہ انگریزی اخبار "کامریڈ" نکالا تو اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ انگریزی کے تعلیم یافتہ لوگوں میں اسلامی اور قومی خیالات کو فروغ دیا جائے۔ اور جب ہمدرد نکالا تو بھی مقصد یہی تھا کہ اردو داں طبقے کو اسلامی تعلیم کی دعوت دی جائے اس سلسلے میں مولانا محمد علی نے پٹنہ کے معروف بیرسٹر مظہر الحق جنہوں نے کامریڈ کے دوبارہ اجرا کیلئے فرمائش کی تھی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"افسوس ہے کہ جدید تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں عموماً اور مسلمان انگریزی جوانوں میں خصوصاً غلامانہ ذہنیت کی دوسری خرابیوں کی طرح یہ مرض بھی عام ہے کہ لکھیں گے تو انگریزی میں۔ بات کریں گے تو انگریزی میں سوچیں گے تو انگریزی میں اس سے بڑھ کر اور کیا غلامی ہوگی کہ باوجود اپنی شائستہ و شستہ زبان کے ایک غیر مانوس اور ثقیل زبان کو ذریعہ تکلّم اور آلہ تحریر بنایا جائے۔ شاید یہی ذہنیت اس تقاضے کا باعث ہے کہ کامریڈ کو پھر جاری کیا جائے مگر واقعہ یہ ہے کہ کامریڈ کی اشاعت سے مقصود و منشا غیر اردو دانوں تک مسلمانوں کے خیالات پہنچانا اور ان کے حسیات کی ترجمانی کرنا تھا۔۔۔۔

۔۔۔ ہمدرد کے لئے فی الواقع میں اپنا بہت کچھ وقت صرف کرتا ہوں اور اتنی محنت کرکے طول طویل مقالات افتتاحیہ لکھتا ہوں جو کبھی پہلے نہ کی تھی۔ گذشتہ اکتوبر سے اس وقت تک اہم سیاسی و مذہبی معاملات پر ایک سلسلہ مضامین ہمدرد میں شائع ہوا ہے۔ جو اس قابل ہے کہ مسلمان غور سے پڑھیں اور عمل پیرا ہوں [1]"

غرض صحافت سے مولانا کا مقصد صرف یہ تھا کہ مسلمانوں میں اسلام اور اس کی سربلندی کیلئے جوش و جذبہ پیدا کیا جائے اور ملک کو انگریز کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ مولانا محمد علی نے صحافت کو روزی کمانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک مقصد قرار دیا ہے۔ وہ مولوی محمود احمد عباسی کو ایک خط میں لکھتے ہیں

---

[1] مکتوباتِ رئیس الاحرار (سیاسی) مرتبہ ابوسلیمان شاہجہان پوری ص نمبر ۱۵۸/۱۵۹ کراچی

"دونوں اخباروں پر پانچ سو سے کر ایک ہزار بارہ سو تک خسارہ ماہواری ہو جاتا تھا اور اب جب کہ سب
خرچ ہمدرد پر پڑتا ہے۔ پندرہ سو روپیہ ماہوار کا خسارہ ہے خدا شاہد ہے کہ اس لئے ہرگز اس
کارخانے کو نہیں چلا رہا ہوں کہ اپنے اور بال بچوں کے اخراجات کے لئے رقم نکالنا مقصود رہا ہے جب سے کامریڈ
نکالنے کا خیال ہوا تھا صرف ایک غرض سامنے تھی کہ جو پیغام خدا نے مجھے پہنچایا ہے اسے دنیا تک پہنچا دوں[1]"

اور یہ پیغام اسلام کی تعلیمات کا پیغام تھا جسے مولانا نے اپنے اخباروں کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا۔ مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی تھی کہ انہوں نے اپنے اخبار کے ذریعے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں احیاء اسلام کی تحریک کو پروان چڑھایا بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی ان کے افکار کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا مولانا محمد علی کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی جرأت تھی۔ اعلانِ حق میں وہ اس قدر بیباک۔ جوشیلے اور نڈر تھے کہ حکومت برطانیہ مولانا محمد علی کے اس انداز سے ہمیشہ خوف زدہ رہی۔ اُن کی صحافت۔ خطابت اور سیاست میں یہ چیز بڑی نمایاں ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کرتے تھے۔ اور یہ عقیدہ اور اصول صرف یہ تھا کہ اسلام اور اُس کی سربلندی اس سلسلے میں محمد علی کو توڑا تو جا سکتا تھا مگر موڑا نہیں اور ان کی پوری زندگی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ سوائے خدا کے کسی اور کے سامنے نہیں جھکے[2]۔ ملکی آزادی کے سلسلے میں مولانا کا یہ خیال بھی رہا کہ ہندوستان کی آزادی کیلئے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتحاد ضروری ہے۔ کانگریس میں ان کی شمولیت اسی بنا پر تھی اور اپنی صحافت میں بھی وہ اس بات کا اعلان کرتے رہے۔ وطن کی آزادی کے سلسلے میں وہ پہلے ہندوستانی ہیں اور بعد میں بھی ہندوستانی[3]۔ لیکن جونہی انہیں ہندوؤں کے اصل عزائم کا پتہ چلا اور ہندوؤں نے نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کی بلکہ اسلام کی مخالفت شروع کر دی۔ تو مولانا یہ بات گوارا نہ کر سکے اور ہندوؤں سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ اسلامی اصولوں کے تحفظ میں مسلمان پہلے تھے اور سب کچھ بعد میں لیکن جب ہندوؤں کے طرزِ عمل سے اسلام کے اصولوں کی مخالفت ہوئی تو وہ اسے برداشت نہ کر سکے کیونکہ مولانا محمد علی اوّل بھی مسلمان اور آخر بھی مسلمان تھے[4]۔

---

[1] مکتوبات رئیس الاحرار — مرتبہ ابو سلیمان شاہجہان پوری — ص نمبر ۱۵۵

[2،3] نقوش یارانِ کہن — عبد المجید سالک — ص نمبر ۱۲/۱۲۰

[4] نقوش یارانِ کہن — عبد المجید سالک — ص نمبر ۱۲

مولانا محمد علی کی صحافت کے اثرات مسلمانوں پر بڑے نمایاں تھے ۔ صحافت میں خطابت کے عنصر نے نہ صرف ہمدرد کو مقبول بنایا بلکہ اس کی اثر پذیری میں بھی اضافہ ہوا ۔ "ہمدرد" ان معنوں میں تو عوامی اخبار نہیں تھا جیسا کہ "زمیندار" لیکن مولانا کے اعلیٰ صحافتی ذوق نے مسلمانوں کی جس طرح تربیت کی اُس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلام کیلئے ایک خاص عصبیت پیدا ہوئی ۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے دل نہ صرف اپنے ملک کے مسلمانوں کے لئے دھڑکتے تھے بلکہ عالم اسلام کے دوسرے ممالک میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے بھی تڑپتے تھے ۔ غرض ملک کی آزادی میں جس بیداری اور سیاسی شعور نے حصہ لیا اسے پیدا کرنے میں مولانا محمد علی کی صحافت کا بڑا حصہ ہے بقول مولانا عبدالمجید سالکؔ

> "وہ ان دونوں بھائیوں (محمد علی اور شوکت علی) نے برصغیر کے مسلمانوں کو جذباتِ اسلامی سے مالا مال کرنے میں جو حیرت انگیز خدمت انجام دی ہے وہی پاکستان کے قیام کی بنیاد ثابت ہوئی ۔"[۱]

احیاء اسلام کی اِس تحریک سے پہلے ہندوستان میں انگریز اور انگریزی تہذیب سے ذہنی طور پر مرعوب ہونا بڑی عام بات تھی ۔ مگر اس دور میں یہ روش اور انگریز پرستی دم توڑتی نظر آتی ہے ۔ مشرقی اقدار اور مشرقی آداب و اخلاق کی پاسداری میں جو فخر پنہاں ہے اُس کی نشوونما میں مولانا محمد علیؔ کے "ہمدرد" اور "کامریڈ" کا بھی حصہ ہے ۔ تعلیم یافتہ طبقے میں خاص پر اس گرفت کو توڑنے میں مولانا محمد علیؔ کے ہفت روزہ "کامریڈ" کا کوئی ثانی نہیں ۔ بقول مولانا شوکتؔ علی

> "میرا دعویٰ ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں پر جو احسان محمد علی کا ہے وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا اس نے قرآن پاک اور اسلامی تعلیم و تربیت کی طرف سب کو متوجہ کیا اور سب کے دلوں میں اسلام کی آگ پیدا کر دی ۔"[۲]

مولانا محمد علیؔ کے زبان و قلم اور پرجوش طرز نگارش نے مسلمان نوجوانوں میں انقلابی روح پیدا کر دی جو انگریز کے نزدیک بغاوت کا نام پاتی اور مولانا پر اس بغاوت کے کئی مقدمات قائم ہوئے ۔ سزا ہوئی، جیل گئے ۔ نظر بند کئے گئے ۔ مگر وہ بھی اس بغاوت

---

۱ یارانِ کہن عبدالمجید سالکؔ ص نمبر ۲۱

۲ مولانا محمد علی ۔ ایک مطالعہ ۔ مرتبہ لطیف اخترؔ مضمون مولانا شوکت علی ص نمبر ۱۰۹

سے باز نہ آئے۔ آزادی کی اس تحریک میں جس جوش و جذبہ۔ جرأت اور بے باکی سے مولانا محمد علی نے حصہ لیا وہ مسلمان نوجوانوں کیلئے مشعلِ راہ بن گیا۔ اور یہ مولانا محمد علی ہی کا فیضان ہے کہ آزادی کی تحریک میں ہمیں بہت سے نوجوان باغی نظر آتے ہیں غرض مولانا محمد علی نے

"صحافت میں سچائی و بے باکی کی بنیاد ڈالی اور سیاست کے اکھاڑے میں بھی اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔ افلاس کے باوجود کسی کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اپنے مسلمان ہونے اور مسلمان کہنے پر انہیں کبھی شرم نہ آئی ہو۔"[۱]

ابوالکلام آزاد

ہندوستان کی صحافت میں سب سے بڑے صحافی ہیں۔ اُن کی شخصیت کے متعلق مخالف اور موافق آرا کی کمی نہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا ابوالکلام برصغیر پاک و ہند کی سب سے بڑی متنازعہ شخصیت ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ لیکن اُن کا اسلام سے عشق۔ قرآن سے محبت تحریر کی قوت۔ تقریر کی لذت۔ ذوق کی نفاست۔ استقلال کی قوت۔ علم کی یکتائی اور لوگوں کے دلوں پر فرمانروائی سے بہت کم لوگوں کو انکار ہوگا۔ مولانا ابوالکلام نے جس وقت قوم کی تعمیر اور ملک کی آزادی کیلئے کام شروع کیا۔ اُس وقت مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب کا دھارا اتنی شدت سے بہہ رہا تھا کہ مخالف سمت تیرنے کے لئے بڑی ہی طاقت اور قوت کی ضرورت تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ قوت اور توانائی اسلام اور قرآن سے حاصل کی اور انہوں نے قوم کی اصلاح و ترقی کیلئے مغربی تعلیم کے بجائے اسلامی تعلیم کو ضروری قرار دیا اور بتایا کہ مسلمانوں کے مصائب اور مشکلات اور زوال و انحطاط کا علاج صرف یہ ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہوں اِس کے بعد وہ ویسی ہی ترقی کر سکتے ہیں جیسی ترقی مسلمانوں کے شاندار ماضی میں ہوئی تھی۔ اِس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مولانا ابوالکلام نے اپنے زبردست قلم سے مسلمانوں کے سنہری دور کی اتنی خوبصورت تصویر مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کی کہ وہ اِس تصویر کی رعنائی اور زیبائی کو زمانہ حال میں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ کام اپنی صحافت، خطابت اور سیاست کے ذریعے انجام دیا۔

الہلال

مولانا ابوالکلام آزاد الہلال کی اشاعت سے پہلے "الندوہ"۔ "دارالسلطنت" اور "وکیل" جیسے اخباروں کی ادارت کر چکے تھے۔

---

[۱] اُب جن کے دیکھنے کو ۔۔۔۔ انیس قدوائی ص نمبر ۳۰ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی

کر چکے تھے اور مختلف اخباروں میں مضامین بھی لکھ چکے تھے۔ گویا انہیں صحافت کا تجربہ پہلے سے تھا۔

مولانا آزاد نے ۱۳۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو "الہلال" کے نام سے ایک ہفت روزہ رسالہ کلکتہ سے نکالا۔ جس کے متعلق ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے

"اُردو زبان میں پہلا باتصویر سیاسی جرنل جاری کیا جو اپنی اعلیٰ ترتیب و تزئین، ٹھوس مقالوں اور تصاویر کے لحاظ سے صحافتی تکنیک میں ایک زبردست ترقی کا مظہر تھا۔ ایسا ہفت روزہ اُردو زبان میں آج تک نہیں نکلا"[1]

مولانا نے یہ رسالہ انگریزی پریس کے نمونے پر جاری کیا۔ "الہلال ٹائپ میں باتصویر چھاپا جاتا تھا"۔ الہلال کے ایک نمبر کی تصاویر پر جتنا خرچ ہوتا تھا اُس خرچ سے اُردو کا بہترین اخبار ایک ماہ تک اپنے دفتر کے مصارف پورے کر سکتا تھا[2]۔ جس قدر خرچ تصاویر پر ہوتا تھا اس سے چار گنا خرچ کاغذ اور ٹائپ کی چھپائی پر آتا تھا[3]۔ اس کے باوجود مولانا نے اس کی قیمت بہت کم رکھی یعنی آٹھ روپے سالانہ۔ جبکہ طلباء کیلئے قیمت نصف تھی۔ اور پھر نصف سے بھی نصف کر دی گئی تھی[4]۔ کیونکہ مولانا کے پیش نظر خاص طور پر نوجوان تھے جن تک وہ اپنا پیغام پہنچانا چاہتے تھے۔ اور اس پیغام کی ضرورت بھی سب سے زیادہ اسی طبقے کو تھی۔ مولانا نے "الہلال" کسی کاروباری غرض سے جاری نہیں کیا تھا بلکہ لوگوں نے اگر مولانا کی اس سلسلے میں مدد بھی کرنا چاہی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا[5]۔ صحافت میں مولانا کا عقیدہ تھا کہ

"جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لیتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اِس فن کے لئے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے[6]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد دراصل تحریکِ احیاءِ اسلام کے داعی تھے اور یہ رسالہ بھی انہوں نے اسی تحریک کی نشوونما کے لئے جاری کیا تھا مولانا نے "الہلال" کا مقصد یہ بیان کیا ہے کہ

۱؎ صحافت پاک و ہند میں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۹۶

۲؎ ۵؎ بحوالہ الہلال۔ شمارہ نمبر ۲۔ ۲۰ جولائی ۱۹۱۲ء ص نمبر ۱۴

۶؎ بحوالہ الہلال شمارہ نمبر ۳۔ ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء ص نمبر ۱

۷؎ الہلال شمارہ نمبر ۳۔ ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء ص نمبر ۲

"الہلال کا مقصد اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں خواہ تمدنی، سیاسی ہوں خواہ کچھ اور وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے[۱]۔"

مولانا نے اسی شمارے میں "الہلال" کی سیاسی تعلیم کا ذکر ایک خط جواب دیتے ہوئے اس طرح کیا ہے۔

"بس (الہلال) کی اور تمام چیزوں کی طرح پالیٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بے جا اعتماد کیجئے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس میں شریک ہو جیئے، صرف اس راہ پر چلئے جو اسلام کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم ہے[۲]۔"

ان مقاصد کے علاوہ "الہلال" کی جملہ خوبیوں کا اندازہ اس اشتہار سے کیا جا سکتا ہے جو ۲۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء کے الہلال کے شمارہ میں دیا گیا تھا

"الہلال اُردو میں پہلا ہفتہ وار رسالہ ہے جو یورپ اور ترکی کے اعلیٰ درجہ کے باتصویر، پرتکلف۔ خوشنما رسائل کے نمونے پر نکلتا ہے۔ اس کا مقصد وحید دعوت الی القرآن اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ محققانہ علمی و دینی مضامین کے لحاظ سے اس کے امتیاز و خصوصیات کا ہر موافق و مخالف نے اقرار کیا ہے۔ اس نے ہندوستان میں سب سے پہلے ترکی سے جنگ کی خبریں براہِ راست منگوائیں۔ اس کا باب شیون عثمانیہ ترکی کے حالاتِ جنگ کے واقعاتِ صحیحہ معلوم کرنے کا مخصوص ذریعہ ہے۔ نامورانِ غزوۂ طرابلس و بلقان اس کی ایک باتصویر سرخی ہے جس کے نیچے وہ عجیب و غریب مؤثر اور حیرت انگیز حالات لکھے جاتے ہیں جو اپنے مخصوص نامہ نگاروں اور خاص ذرائع معلومات سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ مقالات مذاکرۂ علمیہ حقائق و وثائق، المراسلۃ و المناظرہ اسئلۃ و اجوبتھا، اس کے دیگر ابواب و عنوان مضامین ہیں[۳]۔"

---

[۱] الہلال شمارہ نمبر ۹۔ ۸ ستمبر ۱۹۱۲ء ص نمبر ۶/۷

[۳] الہلال ۲۸۔ جولائی ۱۹۱۳ء

غرض مولانا نے احیاءِ اسلام کی جس تحریک کیلئے صحافت کو ذریعہ بنایا۔ اس تحریک کا مقصد اتنا بلند تھا کہ اُس کیلئے بڑے زبردست قلم کی ضرورت تھی عام صحافیانہ طرزِ تحریر اس مقصد کیلئے سودمند نہیں ہو سکتی تھی۔ لہٰذا قرآن کے حقائق جو مسلمانوں کیلئے نئے نہیں تھے۔ جب الہلال میں زیر بحث آئے تو مولانا آزاد کے اسلوبِ نگارش نے اُن میں وہ کشش اور کیفیت پیدا کر دی جس سے پڑھنے والے نہ صرف مرعوب اور متاثر ہوئے بلکہ اُن پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کی۔ مولانا آزاد کے طرزِ تحریر کے متعلق ریاست بھوپال کے "ایک قابل اہل قلم" نے اپنے کسی دوست کی جو مولانا کو اچھی طرح جانتے ہیں نام ظاہر کئے بغیر یہ رائے نقل کی ہے کہ

" آزاد قطب مینار پر بیٹھ کر لکھا کرتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ سچ لکھتے ہیں اور ایسے ہی لکھنے والوں کی ضرورت ہے۔ [۱] "

موصوف کی رائے میں قطب مینار پر بیٹھ کر لکھنے سے مراد مولانا کی تحریر میں خطابت کا عنصر ہے۔ جو بڑا ہی مشکل اسلوب ہے۔ خطابت کے فن میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے کہ خطاب کرنے والا کون ہے۔ خطابت میں اثر شخصیت کے پرتو کے بغیر ممکن نہیں مولانا کی تحریر میں خطابت کا عنصر اُن کی زبردست شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ عام طور پر تحریر میں عبارت آرائی سے اُس وقت کام لیا جاتا ہے۔ جب خیالات کا فقدان ہو مگر مولانا آزاد کے پاس خیالات کی کمی نہیں ہوتی۔ بلکہ جب وہ عبارت آرائی کرتے ہیں تو اس وقت اپنے خیال کو مؤثر بنا رہے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ کوئی دعویٰ کرتے ہیں تو اس کو ثابت کرنے کیلئے عبارت آرائی سے کام لیتے ہیں جو دلیل کی قائم مقام ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کی تحریروں میں یہ عبارت آرائی خامی کی بجائے ایک خوبی بن جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اُن کی تحریروں میں وہ حسن پیدا ہوا ہے جس کی آج تک تقلید نہ ہو سکی۔ مولانا کی تقلید کرنے والوں کے متعلق رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں

" خود ان کی تحریروں میں اس قسم کی خرابیاں اور لغزشیں مطلق نہیں ہوتی جو ان کے مقلدین کے یہاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ جن کی عبارتیں سوائے تسلسل الفاظ کے کوئی خوبی نہیں رکھتیں۔ [۲] "

۱؎ الہلال۔ شمارہ نمبر ۱۷/۱۶ ۱۶ نومبر ۱۹۱۲ء ص نمبر الف

۲؎ تاریخ ادب اردو۔ رام بابو سکسینہ ص نمبر ۲۵۷

شیخ اکرام صاحب نے مولانا آزاد کے طرزِ تحریر کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ

"بعض لحاظ سے اُردو نثر کو وہیں لے جاکر کھڑا کیا جہاں وہ سرسید کی اصلاح سے پہلے تھی بلکہ اُردو نثر میں تاریخ وصاف اور انوارِ سہیلی کے نمونے تمام کر دیئے۔[۱] "

اس کے بعد شیخ صاحب نے نمونے کے طور پر مولانا کی کتاب تذکرہ سے یہ ایک چھوٹا سا اقتباس بھی نقل کیا ہے کہ

"بہ غریب الدیارِ عہد ۔ و نا آشنائے عصر ۔ بیگانۂ خویش و نمک ۔ پروردۂ ریش ۔ معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے ۱۸۸۸ء مطابق ۱۳۰۵ھ میں ہستی عدم سے اس عالم ہستی نمائیں وارد ہوا اور تہمت حیات سے متہم الناس نیام اذا ماتوا انتبھوا

غنودے سنز و زر خروپ علام چشم کشوریم
دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم "

اور شیخ محمد اکرام صاحب نے مندرجہ بالا عبارت کے متعلق تحریر فرمایا ہے

"ان کے طرزِ تحریر کا ایک ایک دلچسپ نمونہ وہ صفحات ہیں جو تذکرہ کے آخر میں اپنے حالات کے متعلق انہوں نے "اپنے اندازِ خاص" میں تحریر کئے ہیں[۲] "

شیخ صاحب نے تذکرہ کی پوری کتاب نظر انداز کر کے مولانا کا "اندازِ خاص" اُن اوراقِ آخر کو قرار دیا ہے جس میں مولانا نے قصداً اپنے حالات زندگی لکھنے سے گریز کیا ہے اور صرف اشارے کئے ہیں ۔ مولانا کو اس بات کا خود بھی احساس تھا لہٰذا وہ تحریر فرماتے ہیں

"جو اشارات کئے گئے اگر تمہارے مذاقِ سخن سنجی پر گراں گذرے ہوں تو بہ نسبت انکار کے یہ بہتر ہوگا کہ ان کو اسی حالت پر قیاس کر لو ورنہ جو کچھ آنکھوں پر گذری اور جو کچھ دل کو پیش آیا خود اپنی ہی زبان و دماغ اس سے محرم نہیں دوسروں کو کیا سنایئے۔[۳] "

۱-۲ موجِ کوثر ۔ شیخ محمد اکرام ص نمبر ۲۶۸

۳ تذکرہ ابوالکلام آزاد ص نمبر ۲۹۵

شیخ محمد اکرام کی کتاب میں اس طرزِ تحریر کو الہلالی اردو کہا ہے ۔ تو چاہیے تھا کہ نمونہ الہلال سے پیش کرتے مگر اقتباس انہوں نے "تذکرہ" سے لینا مناسب سمجھا بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تحریر مولانا آزاد ابوالکلام کی ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ "تذکرہ" کے یہ آخری اوراق سارے تذکرے کے انداز سے مختلف ہیں ۔ پھر کیوں ان ہی اوراق کو مولانا ابوالکلام آزاد کا "اندازِ خاص" کہا جائے؟ اس لئے کہ نہ صرف یہ چند اوراق بلکہ "تذکرہ" بصورت پوری کتاب بھی ابوالکلام کا "انداز خاص" ہی ہے ۔ کیونکہ بقول رشید احمد صدیقی

" مولانا کے یہاں انشاپردازی کے ایک سے زیادہ اسالیب ملتے ہیں الہلال میں دعوتِ دار و رسن ہے تذکرہ میں دعوتِ دید و شنید غبارِ خاطر میں دعوت نوش و نشید تفسیر قرآن کا لب و لہجہ علمی اور عالمانہ ہے[1] ۔ "

تعجب ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب نے مولانا کے اندازِ خاص کیلئے صرف "تذکرہ" کے آخری چند اوراق کا سہارا کیوں لیا؟ جب کہ "ترجمان القرآن"۔ "مضامین الہلال" "والبلاغ" ۔ "غبارِ خاطر" اور "خطباتِ آزاد" وغیرہ میں بھی مولانا ابوالکلام کا کوئی تو "انداز خاص" موجود ہے ۔ خاص طور پر "غبارِ خاطر" اور "ترجمان القرآن" کے انداز خاص کے تو بڑے بڑے نقاد و ادیب بھی منکر نہیں ۔ پھر شیخ صاحب کی نظروں سے یہ انداز خاص کیسے اوجھل ہو گیا؟ اگر شیخ محمد اکرام صاحب کی اس رائے کو تسلیم کر لیا جائے تو خود شیخ صاحب کے اس بیان کی کیا حیثیت ہے کہ

" ان کی تحریر و تقریر میں ایک جادو تھا جس سے مسحور ہو کر ناظرین اور سامعین ان کی پیروی شروع کر دیتے خواہ عقل اور خشک منطق اس طرف رہنمائی نہ کریں[2] ۔ "

شیخ صاحب نے مولانا ابوالکلام کے جس اقتباس کو اُن کے اندازِ خاص قرار دیا ہے اُس میں یہ جادو موجود نہیں ہے ۔ جس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے ۔ کہ اگر مولانا کا انداز خاص وہی ہے جو شیخ صاحب نے قرار دیا ہے تو اس میں جادو ہونا چاہیے تھا اور اگر شیخ صاحب کا دوسرا بیان درست ہے کہ مولانا ابوالکلام کی تحریر میں جادو ہوتا ہے تو وہ مولانا کا اندازِ خاص نہیں کیونکہ اس میں جادو نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ محمد اکرام صاحب کے دونوں بیان درست نہیں ہیں کیونکہ مولانا کی تحریر و تقریر میں جس جادو کا ذکر کیا گیا ہے وہ جادو چراغ

---

[1] آئینہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عتیق صدیقی مضمون رشید احمد صدیقی ص نمبر ۱۷

[2] موجِ کوثر شیخ محمد اکرام ص نمبر ۲۶۹

الدین کا جادو نہیں ہے جو لوگوں کو پیروی کرنے پر مجبور کر دے بلکہ یہ جادو مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں کا وہ اسلوب اور لب ولہجہ ہے۔ جس کے متعلق رشید احمد صدیقی صاحب نے لکھا ہے

" مولانا نے لکھنے کا انداز۔ لب ولہجہ اور مزاج کلام پاک سے لیا جو ان کے مزاج کے مطابق تھا۔ مولانا پہلے اور آخری شخص تھے جنھوں نے براہِ راست قرآن کو اپنے اسلوب کا سرچشمہ بنایا۔ وہی انداز بیاں اور زورِ کلام اور وعید و تہدید کے تازیانے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ پہاڑوں پر رعشہ سیماب طاری کر دیتا ہے۔ "[1]

مولانا ابوالکلام آزاد کیونکہ پہلے اور آخری شخص ہیں جنھوں نے یہ اسلوب قرآن سے لیا مگر "تاریخ وصّاف" اور "انوارِ سہیلی" کا یہ انداز نہیں لہٰذا مولانا کے اندازِ نگارش کو "تاریخ وصّاف" اور "انوارِ سہیلی" کے نمونے قرار دینا درست نہیں۔ جہاں تک عقل اور خشک منطق کے راہنمائی نہ کرنے کا تعلق ہے۔ شیخ صاحب کی یہ بات بھی درست نہیں کیونکہ ابوالکلام آزاد بغیر عقل کی راہنمائی کے ایک لفظ بھی نہیں لکھتے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

" ابوالکلام کے نزدیک روح عقلی ایمان وایقان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور اس کا الگ کوئی وجود نہیں وہ عقل اور ایمان کی ثنویت (دوئی) کے معترف ہی نہیں ان کے نزدیک عقل و ایمان ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔[2]

اس بات کو اس مثال سے بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے مثلاً مولانا کی یہ عبارت ملاحظہ کریں

" انسان وہ ہے جو فرشتوں سے بہتر ہے اگر اپنی قوتوں کو امن وسلامتی کا وسیلہ بنائے اور انسان ہی ہے جو سانپ کے زہر اور بھیڑیے کے پنجے سے بھی زیادہ خونخوار ہے اگر راہ امن وسلامتی کو چھوڑ کر بہیمیت اور خونخواری پر اتر آئے۔ "

---

[1] آئینہ ابوالکلام آزاد مرتبہ عتیق صدیقی مضمون رشید احمد صدیقی ص نمبر ۶۸

[2] مباحث ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۲۹۲

اِنّا ھَدَینٰہُ السّبیل اما شاکراً و اما کفوراً (۷۶:۳)[1]

اب اعقل کا تقاضا ہے کہ فرشتے کی ماہیت کو سمجھے کہ فرشتہ کیا ہے اور پھر یہ کہ انسان سے کیا مراد ہے۔ دونوں کا مقابلہ کرے اور بتائے کہ انسان فرشتے سے بہتر ہے یا فرشتہ انسان سے۔ لیکن عقل اگر فرشتے کو سمجھنے سے قاصر ہے یا اگر عقل انسان کی پوری ماہیت کا احاطہ نہیں کر سکتی تو وہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ انسان فرشتے سے بہتر ہے۔ لیکن ہر صاحب ایمان فوراً آیت قرآنی کو پڑھ کر اور سمجھ کر پکار اُٹھے گا کہ واقعی انسان فرشتوں سے بہتر ہے اگر اپنی قوتوں کو امن وسلامتی کا وسیلہ بنائے۔ کیونکہ اُس کی عقل نے سمجھ لیا ہے کہ قرآن درست کہتا ہے تو اس جگہ عقل دراصل ایمان کا روپ دھار لیتی ہے۔ جس کی طرف ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے اشارہ کیا ہے اور یہ عقل ہمیں مولانا کی تحریروں میں عام ملتی ہے جو لوگوں کی راہنمائی کرتی ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو عمل کا وسیلہ بنائیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود بھی اِس عقل اور منطق کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل ودماغ پر چھایا رہتا تھا اب ہمارے لئے باقی نہیں رہی اب مذہب بھی ہمارے سامنے آتا ہے تو عقلیت اور منطق کی ایک سادہ اور بے رنگ چادر اوڑھ کر آتا ہے اور ہمارے دلوں سے زیادہ ہمارے دماغوں کو مخاطب کرنا چاہتا ہے تاہم اب بھی تسکین اور یقین کا مل کا سہارا مل سکتا ہے تو اسی سے مل سکتا ہے۔[2]"

اور یہی کمال ہے کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو عقل اور منطق ہی کے وسیلے سے پیش کیا جو دل و دماغ کو متاثر کرتی ہے اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اِس طرح بیان کیا ہے۔

"مذہب کی حیثیت محض احساس کی نہیں اِس میں تعقل کا ایک عنصر بھی شامل رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ مذہب کی تاریخ صوفیہ اور متکلمین الٰہی دو حریف جماعتوں کی موجودگی سے کبھی خالی نہیں

---

[1] درسِ وفا۔ ابوالکلام آزاد ص نمبر ۹ ابوالکلام اکاڈمی لاہور

[2] غبارِ خاطر مولانا ابوالکلام آزاد ص نمبر ۱۹۵

رہی جس سے اِس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ مذہب کیلئے فکر کا وجود ناگزیر ہے[1]۔"

جب مذہب کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ مذہب میں عقل کا عنصر شامل ہوتا ہے تو مولانا ابو الکلام کے مذہبی خیالات میں بھی اِس کی موجودگی ضروری ہے۔ اور یہی عقل کی موجودگی لوگوں کو مولانا کا پیغام سمجھاتی ہے تو لوگ اُن کی پیروی شروع کر دیتے ہیں۔

سید نذیر نیازی الہیات کی تعریف اِس طرح کرتے ہیں

"الہیات عقل اور ایمان کا وہ نقطۂ اتصال جس کی بنا علم پر ہے اور اسلام محسوس حقائق کی اس دنیا میں زندگی کا راستہ ہے[2]"

سید نذیر نیازی نے الہیات کو عقل اور ایمان کا وہ نقطہ اتصال کہا ہے جس کی بنیاد علم ہے اور اسلام کو محسوس حقائق کی اس دنیا میں زندگی کے راستے سے تعبیر کیا ہے[3]۔ مولانا کی تحریروں میں ہمیں ایسا ہی علم ملتا ہے جس کی بنیاد عقل اور ایمان کا امتزاج ہے۔ جس کا ذکر سید عبداللہ صاحب کے اقتباس میں بھی موجود ہے۔ اور جس میں عقل کی روشنی حقائق کو سمجھنے کا کام دیتی ہے۔ لہٰذا شیخ اکرام صاحب کا یہ اعتراض بھی درست نہیں کہ

"ان کے طرزِ تحریر میں حرارت زیادہ تھی اور روشنی کم[4]۔"

شیخ محمد اکرام صاحب نے اس کم روشنی کی وضاحت نہیں کی کہ اس سے کیا مراد ہے۔ تاہم اُن کی انتقاد طبیعت کے پیش نظر عقل کی روشنی ہی مراد لی جا سکتی ہے۔ جس کی کمی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ جس کے ثبوت میں مثالیں دی جا چکی ہیں اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ابو الکلام کی تحریروں میں عقل کی صورت کیا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ روشنی دیکھنے کے لئے بھی روشنی کی ضرورت ہوتی ہے اگر کسی آدمی کی آنکھوں پر دبیز پٹی باندھ دی جائے تو آفتاب اپنی ساری ضیا پاشیوں کے باوجود اُس تک اپنی روشنی نہیں پہنچا سکتا۔ ابو الکلام کی

---

[1] تشکیلِ جدید الہیاتِ اسلامیہ - علامہ اقبال - ترجمہ سید نذیر نیازی ص نمبر۲

[2] 〃 〃 〃 مقدمہ نذیر نیازی - ص نمبر ۱۸

[3] 〃 〃 بحوالہ

[4] موج کوثر شیخ محمد اکرام ص نمبر۲۶۹

تحریروں میں روشنی کا منبع قرآن اور اسلام ہے اور روشنی کم نہیں بلکہ بڑی تیز روشنی ہے جس میں زندگی کے سارے اسرار و رموز واضح طور پر نظر آتے ہیں مولانا نے وہ دبیز پٹی جو مغربی علوم و فنون نے آنکھوں پر باندھ دی اسے اُتارنے کی بھرپور کوشش کی اور بہت سی آنکھیں اس پٹی کے اترتے ہی روشن ہو گئیں مگر ساری نہیں۔

جب مذہب کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ مذہب میں عقل کا عنصر شامل ہوتا ہے تو مولانا ابوالکلام کے مذہبی خیالات میں بھی اس کی موجودگی ضروری ہے اور یہی عقل کی موجودگی لوگوں کو مولانا کا پیغام سمجھاتی ہے تو لوگ اُن کی پیروی شروع کر دیتے ہیں۔
عقل سے مراد اگر سرسید کی تحریک عقل بھی لی جائے تو اس کی بھی ابوالکلام کی تحریروں میں کمی نہیں ابوالکلام کی تحریروں میں جو فکر کا عنصر ملتا ہے۔ لوگ اُسی عقل کو کام میں لاتے ہیں تو ابوالکلام کی پیروی شروع کرتے ہیں۔ لہٰذا عقل کی راہنمائی نہ کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور رہی خشک منطق جس سے شیخ صاحب کی مراد مکمل منطقی دلائل ہی ہو سکتی ہے کیونکہ منطق خشک یا تر نہیں ہوتی بلکہ صرف منطق ہوتی ہے۔ اگر قرآن کی آیات میں کوئی منطق ہے تو ابوالکلام کی تحریروں میں بھی یہ منطق موجود ہے کیونکہ مولانا اپنی بات کیلئے دلیل قرآن حکیم ہی سے پیش کرتے ہیں جو ناظرین اور سامعین کو اُن کی پیروی پر مجبور کر دیتی ہے اس بات کو بھی اس مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے مولانا کی یہ تحریر ملاحظہ کیجئے۔

"شیر خونخوار ہے مگر غیروں کیلئے۔ سانپ زہریلا ہے مگر دوسروں کیلئے۔ چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کمتر جانوروں کیلئے۔ لیکن انسان دنیا کی اعلیٰ ترین خلوق خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا اور اپنے ہی ابنائے نوع کے لئے درندہ خونخوار ہے۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم ثم رددناہ اسفل سافلین۔ الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات فلہم اجر غیر ممنون" (۹۵:۶) [1]

کیا مندرجہ بالا عبارت میں شیر۔ سانپ اور چیتے کے جو اوصاف گنائے گئے ہیں وہ انسانی عقل کا مشاہدہ نہیں ہیں؟ کیا انسانی عقل نے انسان کے اندر چھپی ہوئی درندگی اور خونخواری کی نشاندہی نہیں کی؟ بلکہ عقل۔ تو انسان کو بھی حیوان کی ترقی یافتہ صورت کہا ہے تو کیا یہ محض عبارت آرائی ہے یا عقلی دلائل؟ اور آخر میں سب سے بڑی خشک منطق یا تر منطق کی دلیل یہ ہے کہ

---

[1] درسِ وفا - ابوالکلام آزاد ص نمبر ۱۱

"ہم نے انسان کو ایک طرف تو بہترین قوتوں کی ترکیب اور اعلیٰ ترین جذبات کی ساخت میں پیدا کیا - لیکن پھر دوسری طرف بھی خواہشوں اور شریر قوتوں کے لحاظ سے نہایت ہی ادنیٰ درجہ کی مخلوق تک بھی لوٹا لائے - ہاں وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ وعادلہ اختیار کئے - سو ان کے لئے بے انتہا اجر ہے کیونکہ وہ ان متضاد قوتوں کی کشاکش سے بچ نکلیں گے۔[1]"

اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں جذبہ اور جوش کا عنصر نمایاں ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لوگ صرف جذبات میں آکر مولانا کی پیروی شروع کر دیتے تھے - اس سلسلے میں ایک بات بطور خاص یاد رکھنی چاہیئے کہ ابوالکلام کے قاری عوام نہیں بلکہ خواص ہیں جن میں اتنی عقل ضرور ہوتی ہے کہ وہ عقل سے کام لے کر پیغام کو پرکھتے ہیں - اور جب پیغام کی سچائی اُن کے اندر جذبات کی ہلچل پیدا کر دیتی ہے تو عمل کی باری آتی ہے اور یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ مولانا ابوالکلام آزاد عام معنوں میں صحافی نہ تھے۔

بقول رشید احمد صدیقی صاحب

"بذات خود نہ میں مولانا کو متداول معنوں میں صحافی سمجھتا ہوں نہ الہلال اور البلاغ کو صرف اخبار۔ مولانا کسی مسئلے پر نہ سرسری غور کرتے تھے نہ اظہار خیال بلکہ اس کا التزام رکھتے تھے کہ جو بات کہی جائے وہ مسلمات کی روشنی کی تاب لا سکے کسی بڑی حقیقت سے رشتہ رکھتی ہو اور علمی اور ادبی معیار پر صحیح اترے - ادارت کے مصروف اور گریز پا لمحات میں اس التزام کا نباہنا تقریباً ناممکن ہے اردو صحافت کو مولانا نے کلاسکس کا درجہ عطا کیا۔[2]"

مولانا ابوالکلام کی یہ صحافت جس پر ادب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے - اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہوئی اور اس نے احیائے اسلام - ملکی آزادی اور قومی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا۔

---

[1] درسِ وفا - ابوالکلام آزاد ص نمبر ۱۲

[2] آئینہ ابوالکلام آزاد - مرتبہ شفیق صدیقی مضمون رشید احمد صدیقی ص نمبر ۱۷

اشرات

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال اور البلاغ کے ذریعے سے ملک میں سیاسی شعور کو عام کیا اور ملکی آزادی کی تحریک اپنی نئی توانائیوں اور پرجوش جنتر سامانیوں کے ساتھ چل نکلی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے مسلمان ہونے پر فخر کرنے لگے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں ایک عام مذہبی انقلاب کے داعی تھے اور یہ انقلاب بڑے کم عرصے میں برپا ہوا بقول فضل الدین احمد مرزا

"ہر طرف سے ہٹا کر قوم کو صرف مذہب کی سچی راہ پر لگا دیا۔ سیاست۔ معاشرت۔ تعلیم ساری باتوں کی اصل بنیاد صرف مذہب اور قرآن کی تعلیم قرار پا گئی۔[1]"

اس طرح سے مسلمانوں نے اُس پالیسی کو خیرباد کہہ دیا جس میں انگریز سے تعاون و اتحاد کی وجہ سے غلامی کی زنجیروں کو تقویت ملتی تھی۔ مسلمانوں نے نہ صرف ہندوستان کی سیاست میں بھرپور حصہ لینا شروع کیا بلکہ دوسرے اسلامی ممالک میں مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر بھی بے قرار و بے چین رہنے لگے۔ یہ اتحاد عالم اسلامی کی تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان میں ترکی کی خلافت اور ہندوستان کی آزادی کیلئے "خلافت" جیسی تحریک شروع ہوئی۔ جو ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تحریک تھی جو کبھی چلائی گئی مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کو سچائی۔ حق گوئی۔ بے باکی۔ جرأت۔ قربانی۔ حوصلے اور استقلال کا جو درس دیا تھا اُس کی عملی مثالیں مسلمانوں نے خلافت تحریک میں پیش کیں۔

مولانا ابوالکلام کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قوم کے دل سے انگریز کا خوف نکال دیا اور انگریزی قوم کا احساس برتری ہندوستان میں خاک میں ملا دیا۔ لوگوں نے مشرقی آداب و تمدن کو اپنے لئے افتخار کا باعث سمجھنا شروع کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے قوم کی زندگی کا تصور یہ دیا ہے کہ

"اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ قوموں کی زندگی کے کیا معنی ہیں تو میں کہوں گا کہ حوصلہ کی بلندی اور عزم کی پختگی۔[2]"

---

[1] تذکرہ ابوالکلام آزاد — مقدمہ فضل الدین احمد مرزا — ص نمبر ۱۱

[2] الہلال شمارہ نمبر ۸ — ۲۵ فروری ۱۹۱۳ء — ص نمبر ۳

اورہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی دعوت اسلامی میں سب سے زیادہ زور عزم کی پختگی اور حوصلے کی بلندی کیلئے صرف کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت زندگی کے ہر شعبہ میں منفرد اور یکتا نظر آتی ہے۔ مولانا اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"مذہب میں۔ ادب میں۔ سیاست میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راہ میں قدم اٹھایا۔ وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گردِ راہ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔[1]"

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تیز رفتاری نے جو گرد اڑائی تھی اُس گرد میں اعتدال پسندی، مصلحت کوشی، نرمی، مسکینی، آہستہ روی، تعاون اور اتحاد کی پرانی پالیسی دھندلا کر معدوم ہو گئی۔ مولانا تقلیدِ عامہ سے ہمیشہ پہلو بچاتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے جو نیا راستہ ہندوستان کی آزادی کیلئے منتخب کیا اُس راستے پر چلنا پہلے راستے سے زیادہ دشوار، زیادہ کٹھن، مشکل اور دشوار تھا اور ان مشکلات اور خطرات سے عہدہ برآ ہونے کیلئے قوم میں ایمان اور یقین کی قوت پیدا کی اور مسلمان اپنے شاندار ماضی کی تجدید کیلئے میدانِ عمل میں چل نکلے۔

جہاں تک احیاءِ اسلام کی اِس تحریک کا تعلق ہے مولانا ابوالکلام آزاد اِس کے سب سے بڑے داعی، مفسر اور مبلغ تھے۔ اور مولانا کی اِس فکر کے اثرات اب تک موجود ہیں[2]۔ جس کی وجہ مولانا کی فکر کا یہ خاص پہلو ہے۔ جسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس طرح لکھا ہے

"آزاد نے اجتماعی بصیرت میں یہ خاص رجحان پیدا کیا کہ سب انسان (خواہ وہ مشرق کے ہوں یا مغرب کے) برابر ہیں۔ صحیح معنوں میں انسان وہی ہے جو آزاد ہے اور آزاد ہونے کی حیثیت سے عالمگیر انسانیت کی تکمیل و ترقی میں برابر کا حصہ لیتا ہے اور یہ وہ نصب العین ہے جس کے لئے وہ عقلی۔ اخلاقی

---

[1] غبارِ خاطر — ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۱۲۵

[2] مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی حکمت عملی جو بعد کو اختیار کی گئی۔ مسلمانوں کیلئے نقصان دہ تھی جس پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اُس کا تذکرہ یہاں مقصود نہیں۔

اور روحانی اقدار جو اسلام نے دی ہیں ۔ نہ صرف کافی ہیں بلکہ وہی مناسب اور موزوں اور برمحل ہیں ۔" [1]

انسانیت کے اس عالمگیر تصور نے ہندوستان کے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ۔ مولانا کے اس اسلامی تصور نے لوگوں کو اسلام اور قرآن کی طرف راغب کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں قرآن کے مطالب و مفاہیم کو سمجھنے کی کوششیں زیادہ نظر آتی ہیں ۔

شورش کی شخصیت

مندرجہ بالا ادبی اور سیاسی تحریکوں کے تفصیلی مطالعے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پہلی جنگ عظیم اور دوسری جنگ عظیم کا درمیانی عرصہ بڑا ہی پُر آشوب اور فتنہ خیز تھا ۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے باشندوں میں سیاسی اور قومی شعور کی نشو و نما ہوئی ۔ جس کی وجہ سے انگریز کی چال بازیاں اور حکمت عملیاں بے نقاب ہو گئیں ۔ آزادی اور انسانی حقوق کی حکایتیں عام ہوئیں ۔ انگریز سے محبت نفرت میں بدل گئی ۔ انگریز سے وفاداریاں ، غداریاں بن گئیں ۔ سیاست نے انقلابی رخ اختیار کیا ۔ تحریکیں اٹھائی گئیں ۔ گولیاں چلائی گئیں اور گولیاں کھائی گئیں ۔ قید و بند میں اذیتیں دی گئیں اور قید و بند کی سختیاں جھیلی گئیں ہڑتالیں ہوتی رہیں اور انقلاب زندہ باد کے نعرے گونجتے رہے ۔ بھوکے ہندوستانی بھی بھوک ہڑتال کرتے رہے ۔ لوگ مرتے بھی رہے لیکن آگے بڑھتے رہے ۔ ادب اور صحافت میں بھی انقلابی تبدیلیاں ہوئیں ۔ ادب میں نئے نئے خیالات شامل ہوئے ۔ نئے نئے تجربات کئے گئے ۔ قومی جذبات و احساسات کو ادب کا موضوع بنایا گیا ۔ صحافت کا نصب العین حق گوئی اور بے باکی ٹھہرا ۔ غرض قربانی ۔ ایثار ۔ حوصلہ ۔ استقامت ۔ جرأت ۔ بے باکی ۔ حب الوطنی اور مشرق پرستی حریت پسندوں کی عادت ثانیہ بن گئی ۔ اس دور کی ادبی تحریکوں کے ذریعے جو ادب پیدا ہوا اور صحافت اور سیاست نے جو نیا رخ اختیار کیا ۔ اس کی نمایاں ترین خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں ۔

وفا کیشی

جفا طلبی

مصلحت سوزی

حق گوئی

---

[1] مباحث ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ، ۲۹۲ ۔

مذہب سے لگاؤ

ادب اور سیاست کا امتزاج

خطابت اور ادب کی یکجائی

جذباتیت

انتشار و انقلاب

آزادی یا موت

جوش و خروش

غرض یہی وہ ماحول ہے جس نے آغا صاحب کو شخص سے شخصیت میں بدل دیا۔ جس طرح ہر آدمی شخص تو ہوتا ہے مگر ہر شخص شخصیت نہیں ہوتی۔ اسی طرح اس ماحول کے اثرات دوسرے لوگوں پر بھی پڑے۔ مگر وہ شخص سے شخصیت نہ بن سکے جس کی وجہ یہ تھی کہ آغا صاحب اس ماحول سے براہ راست متاثر ہوئے جبکہ یہ بات عام لوگوں کے حصہ میں نہیں آئی۔ شخص سے شخصیت بن جانے کا یہ سفر درحقیقت قطرے سے گوہر ہونے والی منزل ہے۔ جس میں وہی ثابت قدم سُرخرو ہوتے ہیں جو طوفان کی موجوں سے ٹکرانے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو حالات کی سنگینی سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ جن میں یہ صلاحیت ہو۔ کہ وہ وقت کے دھارے کے خلاف سفر کر سکیں۔ آغا صاحب کی ذات میں جہاں یہ باتیں مبداء فیاض کی بخشش خاص ہیں۔ وہاں اس ماحول کی دین بھی ہیں۔ کہ جس کے بغیر ان صلاحیتوں کی نشو و نما نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ وجہ ہے کہ اس ماحول کے اثر نے آغا صاحب کو شخص سے ایک بڑی شخصیت میں تبدیل کر دیا۔ جس کے واضح اثرات اُن کی شخصیت میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

آغا صاحب جن ادیبوں اور شاعروں سے خاص طور پر متاثر ہوئے ان میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کے نام قابل ذکر ہیں اور یہ سب ادیب و شاعر رومانیت کی تحریک کے بڑے علمبردار ہیں۔ آغا صاحب کی شخصیت میں دروں بینی۔ انفرادیت یا انا کا جو عنصر شامل ہے وہ حقیقت میں اسی اثر پذیری کا نتیجہ ہے۔ آغا صاحب کی شخصیت کا رجائی پہلو جس میں اُن کی جرأت۔ حوصلہ۔ بے باکی۔ بے خوفی۔ جوش و خروش اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ شامل ہے وہ اس رومانیت کا اثر ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خان۔

"رومانیت پسند آرٹسٹ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جذبات وتخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتا ہے۔ وہ اپنے اندرونی ترنم کی ساری صلاحیتوں کو اپنی روح کے ساتھ مرکوز کر دیتا ہے۔ اسی لئے اس میں ایک طرح کی انفرادیت پسندی اور دروں بینی کا پیدا ہو جانا لازمی ہے [1]"

ادب کے علاوہ اس زمانے کی خطابت کا بھی یہی حال ہے۔ یہ زمانہ ہندوستان میں تحریک سازی اور انگریز کے ساتھ تحریکیں چلائے جانے کا ہے۔ تحریک سازی ایک بڑا خیال ہوتا ہے اور تحریک چلانا اس کو عملی صورت دینا ہے۔ اور کسی بڑے خیال کو عملی صورت دینے کے لئے ضروری ہے کہ عوام کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اور یہ کام اسی صورت میں ممکن ہے کہ اس بڑے خیال کو کسی خوبصورت اور دلکش انداز میں پیش کیا جائے۔ اس زمانے میں یہ کام خطابت اور صحافت سے لیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں جتنے بڑے خطیب اور صحافی اردو ادب میں پیدا ہوئے وہ کسی دوسرے دور میں نظر نہیں آتے۔ آغا صاحب کی شخصیت پر اس زمانے کی خطابت اور صحافت کے اثرات براہ راست پڑے۔ جس کی بدولت وہ ایک عظیم خطیب اور صحافی بن گئے۔

آغا شورش کاشمیری کوئی بڑے عالم دین نہیں تھے۔ لیکن انہیں وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبت وہم نشینی کا شرف ملا۔ جن میں اکابرین دیوبند نمایاں ہیں۔ جن کی دینی خدمات کا اعتراف کئے بغیر ہندوستان کی مذہبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور جنہوں نے اسلام اور آزادی کے لئے وہ ایثار کیا۔ جس کی مثال ہندوستان کی سیاسی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ شورش صاحب کی شخصیت میں دینی حمیت اور اسلام سے محبت انہیں اکابرین دیوبند کا فیضان ہے۔

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سیاسی جماعتوں کی کامیابی اور ناکامی کا جو معیار بھی مقرر کیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مجلس احرار اس پر پوری نہ اترے مگر نصب العین کی بلندی اور قربانی وحوصلہ مندی میں ہندوستان کی کوئی سیاسی جماعت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ پھر نصب العین کی بلندی اگر ناکام بھی رہے تو یہ ناکامی بھی اس کامیابی سے بہتر ہے۔ جس کا نصب العین بلند نہ ہو۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے کی کوشش اگر ناکام بھی رہے تو پہاڑ پر کامیابی سے چڑھ جانے کی کوشش سے یقیناً زیادہ قابل

---

[1] روح اقبال — ڈاکٹر یوسف حسین خان — ص نمبر ۸۱

[2] بحوالہ روح اقبال — ڈاکٹر یوسف حسین خان — ص نمبر ۲۸۳

ستائش ہے۔ غرض ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں مجلس احرار کی جاں نثاریوں اور حوصلہ مندیوں میں آغا صاحب کا حصہ بھی نظر آتا ہے۔ جس کا اگرچہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اعتراف نہیں کیا گیا۔ تاہم اس کو اُن شخصیت سے تو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی اِسی جادو اثر شخصیت سے پاکستان کی سیاست کو ہمیشہ متاثر کیا۔ جس میں اُن کی صحافت۔ شاعری۔ نثر نویسی اور خطابت کا بھی حصہ ہے۔

باب ۳

تصانیف

تصنیفات

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے آغا شورش کاشمیری کی ادبی زندگی کا آغاز بچپن سے ہو گیا تھا۔ لیکن حادثاتی طور پر وہ سیاست کے ہو کر رہ گئے۔ جس کی وجہ سے انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۵ء تک کا عرصہ زیادہ تر قید خانے میں بسر کیا۔ اس کے بعد ان کی ادبی اور صحافتی زندگی کا باقاعدہ دور شروع ہوا۔ جس میں انہوں نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھیں اور ان کے مضامین ملک کے معروف اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے۔ یہاں تک کہ مجلس احرار کے اخبار "آزاد" کے مدیر بن گئے۔ اور ایک پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کیا۔ اخبار "آزاد" سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنا ہفت روزہ "چٹان" جاری کیا اور اس طرح ادب اور صحافت اُن کی زندگی کا جزو بن گیا۔ آغا صاحب کی صحافتی تحریریں بے شمار ہیں۔ جن میں ادب کا رنگ بھی شامل ہے۔ ہفت روزہ "چٹان" میں ان کے اداریوں کے علاوہ مختلف ادبی موضوعات پر مضامین بھی شائع ہوتے رہے۔ اگر ان کی ان صحافتی تحریروں کو جن میں ادبی رنگ بھی موجود ہے۔ جمع کیا جائے تو ان کا یہ ادبی سرمایہ بہت ہی زیادہ ہے۔ اس سے یہ کہنا بیجا نہ ہو گا کہ اس دور کے کسی دوسرے ادیب کے پاس اتنا بڑا ادبی اثاثہ نہیں ہے تاہم اُن کا جو خالص ادبی سرمایہ کتابی صورت میں موجود ہے اس کو موضوع کے اعتبار سے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت لایا جا سکتا ہے۔

سوانح عمری

۱۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

۲۔ پسِ دیوارِ زنداں

۳۔ تمغۂ خدمت

۴۔ موت سے واپسی

۵۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری

۶۔ ظفر علی خاں

۷۔ قید فرنگ

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل آغا صاحب کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ لیکن نامکمل کیونکہ اس کتاب میں آغا صاحب نے ۱۹۱۷ء

سے ۱۹۴۷ء تک کے واقعات درج کئے ہیں ۔ وہ اس کتاب کی دوسری جلد بھی لکھنا چاہتے تھے مگر نہ لکھ سکے ۔ اس کتاب میں آغا صاحب کی زندگی کے سب واقعات درج ہیں مگر قید وبند کی کہانی بیان ہونے سے رہ گئی قید وبند کی داستان کیلئے انہوں نے ایک دوسری کتاب "پسِ دیوارِ زنداں" کے نام سے لکھی لیکن اس کتاب میں ۱۹۴۷ء تک کے قید وبند کے حالات درج ہیں ۔ اس طرح "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" اور "پسِ دیوارِ زنداں" دونوں کتابوں کو اگر یکجا کر دیا جائے تو آغا صاحب کے حالات زندگی ۱۹۴۷ء تک مکمل ہو جاتے ہیں ۱۹۴۷ء یعنی قیام پاکستان کے بعد بھی آغا صاحب کو قید وبند کا مرحلہ درپیش رہا ۔ اس دوران میں انہوں نے قید وبند سے متعلق دو اور کتابیں لکھیں یعنی "تمغۂ خدمت" اور "موت سے واپسی" ان دونوں کتابوں کو بھی "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" اور "پسِ دیوارِ زنداں" کے ساتھ شامل کر لیا جائے تب بھی آغا صاحب کی قید وبند کی زندگی کے واقعات مکمل نہیں ہوتے کیونکہ اس کے بعد بھی آغا صاحب کو دو دفعہ جیل جانا پڑا ۔ بہرحال یہ چاروں کتابیں آغا صاحب کی زندگی کے نامکمل حالات ہیں۔

اسی طرح مولانا ظفر علی خان کی سوانح عمری میں "قید فرنگ" کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ ایک مکمل سوانح عمری بن جائے گی ۔ یہی حال آغا صاحب کی کتاب "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کا ہے ۔ اس کا پہلا ایڈیشن نامکمل سوانح عمری ہے لیکن دوسری اشاعت میں یہ کتاب مکمل سوانح عمری بن گئی ہے۔

خاکے

اس عنوان کے تحت آغا صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں آتی ہیں۔

۱۔ نورتن

۲۔ حمید نظامی

۳۔ حسین شہید سہروردی

۴۔ میاں افتخار الدین

۵۔ چہرے

مرزائیت

۱۔ تحریک ختم نبوت

۲۔ اسلام کے غدار

۳۔ عجمی اسرائیل

۴۔ مرزائیل

۵۔ اقبال اور قادیانیت

متفرق

۱۔ اُس بازار میں

۲۔ مولی چلو

۳۔ فنِ خطابت

اقبالیات

۱۔ فیضانِ اقبال

۲۔ اقبالی مجرم

سفر نامے

۱۔ شب جائے کہ من بودم

۲۔ یورپ میں چار ہفتے

خطوط

۱۔ شورش بنام عبداللہ ملک

یوں تو یورپ میں چار ہفتے خطوط کی صورت میں لکھی گئی ہے لیکن اس خطوط کے مجموعہ میں تمام تر حالات و واقعات سفر یورپ سے متعلق ہیں۔ اس لئے راقم الحروف نے اسے سفر ناموں ہی میں شامل کیا ہے۔

شعری مجموعے

۱۔ جذباتِ شورش

۲۔ گفتنی و ناگفتنی

۳۔ الجہاد والجہاد

۴۔ چہ قلندرانہ گفتم

ان شعری مجموعوں کے علاوہ آغا صاحب کا کلام اُن کے جریدے ہفت روزہ "چٹان" میں مسلسل چھپتا رہا ہے۔

چٹان کے پرانے پرچے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے کلام میں نعت، غزل، نظم، گیت، ہجو، قصیدہ، مرثیہ، نوحہ اور قطعہ وغیرہ سبھی کچھ شامل ہے۔ اب درج بالا تصنیفات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

(سوانح و افکار)

جلد اوّل

شورش کاشمیری

یہ کتاب شورش کاشمیری کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ کتاب کا نام مرزا اسداللہ خاں غالب کا ایک مصرع ہے بقول شورش صاحب

میں سمجھتا ہوں غالب کے اس مصرعے میں میری ساری زندگی سمٹی ہوئی ہے میں نے اسی کی شرح کی ہے۔

بوئے گل ـــــ میرا بچپن تھا، آہوئے رمیدہ کی طرح اڑنچھو ہو گیا۔

نالۂ دل ـــــ میری جوانی تھی جو زندگی کے ترکش سے تیر کی طرح نکل گئی۔

دودِ چراغِ محفل ـــــ ان سانحات و حادثات کا نچوڑ ہے جنہیں مرحوم جوانی کے دوش پر اٹھائے

پھرتا ہوں غرض اپنی طویل تلخیوں کا نقشِ قدم چکا ہوں میں نے اپنے الفاظ میں کھینچا ہے[1]

آغا صاحب نے اپنے بچپن کو بوئے گل اور جوانی کو نالۂ دل سے تعبیر کیا ہے جس کے گزر جانے کا واقعتاً غم ہوتا ہے جہاں تک آغا صاحب

---

[1] شورش کاشمیری انور عارف ص نمبر ۴۶

کے بچپن کا تعلق ہے ہمیں اس میں کسی قسم کی رعنائی یا زیبائی نظر نہیں آتی اور نہ کوئی دلکشی اور رنگینی ہی ملتی ہے۔ گویا تشبیہ کا کوئی علاقہ نہیں جس کی بنا پر اُن کے بچپن کو بوئے گل کہا جائے سوائے اس کے کہ بچوں کو پھولوں کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر اس رعایت سے بھی دیکھا جائے تو آغا صاحب کے بچپن کو مرجھائے ہوئے یا کُملائے ہوئے پھول کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جس کی خوشبو دھوپ کی تیزی اور ہوا کی تندی چرا کر لے گئی ہو دیکھنے والی نظر اگر گلشن بداماں ہو تو الگ بات ورنہ آغا صاحب کی ابتدائی زندگی میں کانٹے ہی کانٹے نظر آتے ہیں۔ آغا صاحب نے ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ والدہ چل بسیں۔ دادی نے پرورش کی۔ بقول آغا صاحب

"والدہ واصل بحق ہوئیں تو میں سات یا آٹھ برس کا تھا۔"[1]

دادا کی

"ساری کمائی سفینۂ غزل اور صراحیٔ مئے ناب کی نذر ہو گئی۔"[2]

باپ ٹین کے کارخانے میں کام کرتے تھے۔ گھر کا نقشہ یہ تھا۔

"دو برس سے بے پناہ افلاس، ایک کلبۂ احزان۔ جس میں بمشکل تین چارپائیاں سما سکتی تھیں۔ تین چوڑائی اور ایک لمبائی کی طرف بڑی چارپائی کو اینٹوں اور مٹی کے پاٹے دے کر بالا کیا تھا۔ اس کے نیچے ایک اور چارپائی تھی جس پر دونوں بہنیں سوتی تھیں۔ میں اوپر کی چارپائی پر سوتا یہی میز، یہی کرسی، اسی پر لکھتا، یہیں پڑھتا، بے بسی کی انتہا تھی، بے کسی کا عنفوانِ شباب۔"[3]

ایسی کسمپرسی کی حالت میں دادی کا انتقال ہو گیا۔ آغا صاحب میٹرک کے طالب علم تھے وہ دادی کی قبر پر جانے کو یوں بیان کرتے ہیں

"دادو کی قبر کے آس پاس جتنی قبریں تھیں ان کے سنگی کتبوں اور تختہ حاشیوں پر عموماً سوچا کرتا، ان پر کندہ عبارتیں پڑھتا، اشعار دیکھتا، قرآن کی آیتیں، وفات کی تاریخیں، متوفیوں کے نام

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۱۱

[2] ایضاً ص نمبر ۱۰

[3] ایضاً ص نمبر ۱۴

لواحق کی عقیدتوں پر نگاہ ڈالتا اور سوچتا" کیا مَیں بھی اپنی دادی کی قبر کو پختہ بنا سکتا اور اس پر کتبہ لگا سکتا ہوں؟
پھر ایک طویل آہ بھر کر چُپ ہو رہتا" اپنی تہی دامنی پر لہو کے گھونٹ پی کر لوٹ آتا" یہ وہ دن تھے جب اُجڑا اُجڑا
گھر فاقوں کے دن گزار رہا تھا اور وہ بڑے ہی کڑے دن تھے ۔ نہ جانے رفتن نہ پائے ماندن"[۱]

آغا صاحب کے گھرانے کا سب سے بڑا سرمایہ مولانا ظفر علی خان کا اخبار "زمیندار" تھا جو گھر میں بلا ناغہ آتا تھا ۔ آغا صاحب کے دادا جان مولانا ظفر علی خان کے شیدائی اور "زمیندار" کے فدائی تھے آغا صاحب بھی اسی راستے پر چل نکلے ۔ زمیندار اور مولانا ظفر علی خاں کا نقش چھٹی جماعت سے ہی آغا صاحب کے دل پر بیٹھ چکا تھا اور اسکول کے زمانے ہی میں سیاست کا خطرناک کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا ۔ بال بھارت سبھا کے نام سے ایک انجمن بنائی ۔ اس سبھا نے جب انقلاب زندہ باد کے نعرے لگانے شروع کئے اور جلسے جلوس شروع کئے تو حکومت نے تشدّد سے کام لیا ۔ والدین کو پولیس نے بے عزت کیا اور گالیاں دیں کہ اپنے بچوں کو نہیں سنبھالتے آغا صاحب سے بھی یہی سلوک ہوا

"میرے والد نے مجھے کبھی نہیں پیٹا تھا بلکہ کبھی سخت سست الفاظ بھی نہیں کہے تھے ۔ لیکن اس دن وہ مجبور ہو گئے تھے، ایک تو اچھے دنوں کی گمشدگی کا اُنہیں شدید احساس تھا اور وہ عُسرت کے جانگسل ایام گزار رہے تھے، دوسرے جس بات کا انہیں صدمہ پہنچا وہ تھانے دار کی گالیاں تھیں ۔ ابا لہو کے گھونٹ پی کر چلے آئے تھے ۔ گھر میں بوڑھی دادی تھیں جن کی نحیف آواز میں ان وفاداروں کے لئے بد دعا کے سوا کچھ نہ تھا ۔ دادا جان مشتِ استخواں رہ گئے تھے، مَیں نے اپنے والد کو بڑی سے بڑی ابتلاء میں بھی روتے نہیں دیکھا تھا وہ بڑے دل گردے کے انسان تھے لیکن مجھے پیٹنے کے بعد ان کا جی لرز گیا، وہ اشکبار ہو گئے، دیر تک خلیہ میں لحاف لے کر روتے رہے، انہیں اپنی عُسرت کا انتہائی صدمہ تھا ۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی غریبی کے باعث ہوا ہے"[۲]

آغا صاحب نے بچپن ہی میں راجپال کو قتل ہوتے دیکھا ۔ علم دین کے جنازے میں شریک ہوئے اور عشقِ رسول کی عظمت دل پر نقش ہو گئی

---

[۱] بوئے گل ص نمبر ۱۹
[۲] بوئے گل ص نمبر ۲۶/۲۵

سائمن کمیشن کا بائیکاٹ دیکھا۔ لالہ لاجپت رائے۔ چوہدری افضل حق۔ مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قائدانہ عظمت نے آغا صاحب کے چھوٹے سے دل میں گھر بنا لیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر پہلی دفعہ سنتے ہی دل میں اتر گئی۔ بھگت سنگھ کی بہادری کے قصے سنے۔ دہشت پسندوں میں شامل ہونے کا شوق ہوا۔ والد پار کے میلہ میں بے گناہ پکڑے گئے تشدد ہوا۔ انگریز سے نفرت بڑھی اور انگریزی مخالفت کا عہد کیا۔ آغا صاحب نے میٹرک ۱۹۳۲ء میں کیا اس وقت اُن کی عمر اٹھارہ سال تھی گویا جوانی کی حدود میں داخل ہو چکے تھے مگر حالات بدستور تھے۔ میٹرک کے بعد آگے پڑھنا چاہتے تھے مگر غربت آڑے آئی۔ نوکری کے لئے ہاتھ پاؤں مارے

"بہت سے دفتروں کی خاک چھانی، طبیعت کا میلان مدرسی کی طرف تھا لیکن اپنی تعلیم ہی کیا تھی؟ کبھی کبھار ابتدائی جماعت کے بچوں کی ٹیوشن مل جاتی لیکن ان کے والدین ماہانہ دو روپے بھی نہ دے سکتے تھے قسطوں میں ادا کرتے، کبھی آٹھ آنے کبھی چار آنے اور کبھی روپیہ! خود بے پناہ شوق تھا کہ پڑھوں لیکن کہاں! اکثر ہم جماعت کالجوں میں داخل ہو گئے تھے اور اب کالجیٹ ہونے کے غرور میں تھے۔ ان پر حسرت کی نظریں ڈالتا۔ ہوسٹلوں کے چکر کاٹتا۔ ان کی کتابیں دیکھتا اور نیشنل کالج کی ماہانہ فیس تب دو روپے تھی ' چاہا "منشی فاضل" میں داخل ہو جاؤں لیکن اس سے بھی محروم رہا۔ دادی اماں زندہ تھیں تو "زمیندار" خرید کے پڑھتا" اور یہ معمول ہو گیا تھا وہ بلا ناغہ کھانے پینے کے لئے دو آنے دیتیں، میں ایک آنہ میں زمیندار خریدتا اور ایک آنہ میں صبح کا ناشتہ کرتا، اب دو آنے ایک طرف رہے دو پیسے بھی نہ تھے، ایک جوڑا تھا جسے مدتوں خود ہی دھوتا اور پہنتا رہا ؎۱"

اسی بیکاری کے عرصے میں مطالعے کا شوق بڑھا۔ شعر و ادب کی طرف توجہ ہوئی۔ نیاز مندانِ لاہور کے ادبی معرکے دیکھے۔ اخبار و رسائل سے واقفیت گہری ہوتی گئی۔ آغا صاحب کو ۱۹۳۵ء کا زمانہ اور شہید گنج کا ہنگامہ سیاست میں لے گیا۔ یہ ایک حادثہ تھا۔ کہ کچھ لوگ بزمِ ادب کے اجلاس سے شاہی مسجد میں بلا کر لے گئے۔ جلسے کا صدر بنا دیا آغا صاحب نے تقریر کر دی قید و بند کا سلسلہ شروع ہوا اور ۱۹۴۶ء تک رہا (جس کی کہانی بلبلِ دیوارِ زنداں میں بیان ہوئی ہے) جو دن جیل سے باہر گزرے ان کی داستان اس کتاب کا

؎۱ بوئے گل ص نمبر ۶۰

حصہ ہے ۔ جسے بلا شبہ نالۂ دل کا عنوان دیا جا سکتا ہے ۔ لیکن یہ دل کے نالے کم اور آزادی کے نعرے زیادہ معلوم ہوتے ہیں ۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ آزادی کے نعروں نے دل کے نالوں کا روپ اختیار کر لیا ہے ۔ وہ خورشید نامی لڑکی کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ضرور ہوئے لیکن اس قید کی مدت بڑی کم تھی جبکہ انگریز کی زنجیر زیادہ عرصہ تک پہنی ۔

آغا صاحب کا عنفوانِ شباب تھا کہ تحریکِ شہید گنج میں حصہ لیا ۔ مولانا ظفر علی خان کی عقیدت کی وجہ سے اتحادِ ملت میں چلے گئے ۔ مولانا ظفر علی خان کی محبت سے شعور نے جلا پائی ۔ صحافت کے آداب سیکھے ۔ شاعری کے گر معلوم ہوئے ۔ پھر مجلسِ احرار میں آ گئے ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور چوہدری افضل حق سے کسبِ فیض کیا ۔ ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی راہنماؤں کو قریب سے دیکھا ۔ شادی ہو گئی ۔ گھر کے حالات بہتر ہوئے ۔ انتخابات کا نظارہ کیا ۔ ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے ۔ انسانوں کی زندگیاں بچائیں ۔ حتیٰ کہ پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا ۔ مندرجہ بالا اشارات کی تفصیل ہی آغا صاحب کی زندگی کی تفسیر ہے جو "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل" میں بیان ہوئی ہے ۔

کسی سوانح عمری کی سب سے بڑی خوبی اُس کی صداقت و حقیقت ہے اور یہ صفت اس کتاب میں بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے ۔ آغا صاحب نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہیں اور آغا صاحب اس کے حصہ دار ۔ ہندوستان کی تاریخ میں تحریکِ آزادی کا عہد بڑا ہی اہم ہے ۔ نئی نسل کے لئے اس میں دلچسپی اور تجسس کا عنصر اس طرح موجود ہے کہ اس تحریکِ آزادی سے ایک نیا ملک کیسے معرضِ وجود میں آیا ؟ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے اس جدوجہد میں حصہ لیا ؟ اور انہیں یہ ملک حاصل کرنے کیلئے کن مراحل سے گزرنا پڑا ؟ پرانے لوگوں کے لئے اس کتاب میں اُن کے مشاہدات دہرائے گئے ہیں اگر ان لوگوں نے اس تحریک میں حصہ نہ بھی لیا ہو تب بھی وہ اس کے عینی شاہد ضرور ہیں ۔ جو ان واقعات کی سچائی پر شہادت دے سکتے ہیں ۔ تحریکِ آزادی کے یہ واقعات ہی آغا صاحب کو ایک تاریخی اور اہم شخصیت بناتے ہیں اور تاریخ کی یہ سچائی ہی شورش صاحب کی زندگی ہے ۔ لہٰذا واقعات کی سچائی کا عنصر اس کتاب میں پوری طرح موجود ہے ۔ بلکہ آغا صاحب کے جذبات و احساسات کا مدوجزر بھی اس کتاب میں دیکھا جا سکتا ہے اور خیالات کا تغیر و تبدل بھی ۔ آغا صاحب نے ان تاریخی واقعات کو اپنی ذات کا محور نہیں بنایا بلکہ واقعات کی اصلیت کو قائم رکھتے ہوئے ، جتنا تعلق کسی واقعے سے تھا بیان کیا ہے ۔ اگر کسی واقعے کا تعلق ان کی ذات سے نہ تھا بلکہ دوسرے رہنماؤں سے تھا تو آغا صاحب نے ایسے واقعات میں ایک مبصر کا فریضہ انجام دیا ہے جنہیں اُن کے ذاتی تاثرات کا درجہ حاصل ہے ۔ اس طرح آغا صاحب نے ہندوستان کے بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں ، جماعتوں ، کارکنوں اور افراد کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بھی ان کا ذاتی

تاثر ہے۔ لیکن جو کچھ کہا گیا ہے اُس کے وجوہ موجود ہیں۔ شخصیات میں محبوب و معتوب دونوں طرح کے لوگ ہیں۔ جن کا احترام بہرحال آغا صاحب نے ملحوظ رکھا ہے۔ بعض شخصیتوں کے بارے میں اُن کا تاثر خوشگوار نہیں جس میں اپنے اور پرائے دونوں شامل ہیں۔ مگر اس کی وجہ بھی ذاتی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ بقول اُن کے

"سیاست میں ہارنا رسوائی ہے اور جیتنا فرمانروائی۔"[1]

وہ ہمیشہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کہتے رہے۔ اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہندوستان یا پاکستان کو آزادی ملی تو یہ کسی فردِ واحد کی تنہا ہمت یا فراست کا کمال نہیں۔ یہ ملک کے اجتماعی ضمیر اور قومی انا کا صدقہ تھا۔ اس ملک کی آزادی جس سے ہم ۱۴ اگست کو متمتع ہوئے اُن نوّے سال کی جدوجہد کا ثمرہ ہے۔ محض مسلم لیگ اس برات کی دولہا نہیں۔ بے شک پاکستان کے مطالبہ پر اصرار مسلم لیگ نے کیا اور پاکستان جس شکل میں بھی ملا قائداعظم کی رہنمائی میں ملا لیکن پاکستان یا ہندوستان کی آزادی کا وارث کوئی تنہا شخص نہیں، ہم سب ہیں اور سب سے زیادہ حصہ اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے گھر بار لٹا دیا۔ جن کی گمنامی سے ہم نے نام پایا! جنہوں نے کسی شخصی خواہش کے بغیر قید و بند کو لبیک کہا، جو تختۂ ہائے دار پر لٹک گئے۔ جن کی جوانیاں قید خانوں کے لمحوں میں تحلیل ہو گئیں، جن کا لہو خنجر کی دھار پر بولتا رہا یہ غلط ہے کہ پاکستان صرف مسلم لیگ نے بنایا ہے۔ پاکستان حاصل اس نے کیا لیکن اس کی بنیاد سیّد احمد شہید نے رکھی۔"

لیگ کے عام رہنما آزادی کے ہیرو بن کر سامنے آتے ہیں تو ہنسی آتی ہے۔ حتیٰ کہ تاریخ کی فطرت بھی رہا کرتی ہے۔ ان کا ملک کی آزادی میں ہیرو بننا بالکل ایسا ہے جیسا قائداعظم کے ورثہ پر انہوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ جنہوں نے ملک معظم کی حکومت سے حلف اٹھایا تھا کہ اس کی پشتیبانی کے

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۲۰۵

لئے وہ اپنی جانیں وقف کرتے ہیں، جو آخر تک اس کی بقا اور استحکام کی خاطر ہندوستان میں ہندوستان
سے باہر لڑتے رہے۔ جن کا خمیر و ضمیر دونوں برطانیہ کیلئے گندھے ہوئے تھے۔[1]"

یہ گویا ردِعمل ہے پاکستانی حکمرانی کے طرزِ عمل کے خلاف جو انہوں نے حریت پسندوں کے خلاف اختیار کیا۔ جنہوں نے برطانوی ظلم و ستم کے خلاف ملک کی آزادی میں بھرپور حصہ لیا تھا۔ لیکن آزادی کے آخری مرحلے میں اُن سے سیاسی غلطی ہوئی جس کا انہیں خود بھی اعتراف تھا۔ لیکن آغا صاحب کے نزدیک اس سیاسی غلطی کے باوجود جہاں تک جدوجہدِ آزادی کا تعلق ہے۔ اس کا اعتراف ہونا چاہیئے نہ کہ اس جدوجہد کا سہرا ورثے میں ملے ہوئے اقتدار کی طرح اُن لوگوں کے سروں پر باندھ دیا جائے جن کا کردار اس جدوجہد میں مشکوک تھا یا جو سرے سے اس میں شامل نہیں تھے۔ اس کتاب کے لکھنے کا مقصد آغا صاحب کے نزدیک اگرچہ اپنے حالاتِ زندگی قلمبند کرنا تھا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب کی تخلیق کا محرک یہ جذبہ بھی نظر آتا ہے کہ برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے والے حریت پسندوں کے کارناموں سے دنیا کو روشناس کرایا جائے۔ جس میں آغا صاحب خود بھی شامل ہیں۔ اس سیاسی المیے سے قطع نظر آغا صاحب کے حالاتِ زندگی جن کا بیان اس کتاب میں ہوا ہے وہ بھی المیہ سے کم نہیں شورش صاحب نے اپنے حالاتِ زندگی لکھنے میں کسی بناوٹ، ملمع سازی یا رنگ آمیزی سے کام نہیں لیا بلکہ جو کچھ وہ تھے اور جو کچھ بنتے چلے گئے اور جو کچھ اُن کے ساتھ پیش آیا۔ بے تکلف لکھ دیا ہے۔ آغا صاحب نے اس کتاب میں سیاسی معاملات میں اشاروں اور کنایوں سے بھی کام لیا ہے۔ مگر جہاں تک ان کے نجی حالات کا تعلق ہے۔ اُن کو نہایت واضح اور سیدھے سادے الفاظ میں لکھ دیا ہے مثلاً وہ لاہور میں اپنے گھر کی حالت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"اپنی خانہ ویرانی پر غور کیا، عجب دن تھے جو ہم پر گزر رہے تھے، ایک ویران احاطہ اس میں سات کوٹھڑیاں۔ ان میں سے ایک کوٹھڑی چار روپے ماہانہ کرائے پر لے رکھی تھی۔ جس میں سات افراد کا کنبہ رہ رہا تھا۔ کس شاخ سے ٹوٹے اور کس ٹہنی پہ آ رہے تھے! احاطے بھر میں ایک ہی بیت الخلا تھا۔ مجھے قبض رہنے لگا اور بواسیر ہو گئی۔ ایک ہی نل تھا۔ ہینڈ پمپ کوٹھڑی

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۵۰۷/۵۰۸

میں روشندان تک نہ تھا۔ بسا اوقات دن کو بھی لیمپ جلانا پڑتا۔ اچھے دن جلد ہوا ہو جاتے ہیں۔ مصیبت کا پانچواں برس تھا۔ بہنوں کو نہانا ہوتا تو چار پائیوں پر چادریں ڈال کر غسل خانہ بناتیں۔ ہم لوگ ہر روز مسجد کے غسل خانوں میں نہاتے۔ اِسی کوٹھری میں دادی اماں نے دم توڑا۔ اتفاعزمن ع

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی[1]"

۱۹۳۷ء کے انتخابات میں آغا صاحب "اتحادِ ملت" کیلئے کام کرتے رہے تھے۔ اور خطابت کی حد تک شہرت بھی پا چکے تھے مگر جب اپنے ایک مقدمے کے سلسلے میں اتحادِ ملت کے ایک رہنما کو مقدمہ کی پیروی کرنے کیلئے کہتے تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔ حالانکہ آغا صاحب نے اِس رہنما کیلئے الیکشن میں تقاریر کی تھیں اور وہ جیت بھی گئے تھے۔ آغا صاحب نے اِس مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں اپنی بے بسی اور بیچارگی کو اِس طرح الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔

"رات بھر نیند نہ آئی، سوچتا اور کروٹیں بدلتا رہا، ننگی چارپائی، جسم پر چٹاخ پڑ گئے۔ والد میری گرفتاری اور بیکاری سے نالاں تھے، دونوں بہنیں جوان ہو چکی تھیں، اور وہ بیاہنے کی فکر میں تھے۔ دو وقت کی روٹی ملنا مشکل ہو رہا تھا، صبح اٹھا، والد سے کہا امرتسر آج مقدمہ کی تاریخ ہے، کرایہ کے چند آنے دے دیں، انہوں نے جھڑک دیا۔ دفتر زمیندار گیا، مولانا اختر علی خان سے کبھی سوال نہ کیا تھا۔ کرایہ مانگا بھیجتا ہوں، کہہ کر اُوپر چلے گئے، غالباً چائے میں اتنے مشغول رہے کہ بھول گئے، سوچا بغیر ٹکٹ کے سوار ہو جاؤں؟ حوصلہ نہ ہوا۔ اِس پریشانی اور کشمکش میں اسٹیشن کی طرف قدم اٹھائے جا رہا تھا کہ ڈاکٹر کچلو کی کار نظر پڑی۔ وہ مجھے دیکھ کر رُک گئے۔

کہاں کھڑے ہو بدمعاش؟ "بدمعاش" عزیزوں کے لئے ان کا طرز تخاطب تھا۔

میرا مقدمہ ہے امرتسر میں

تو چلو بیٹھ جاؤ، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۱۷۰

اندھے کو کیا چاہئے، دو آنکھیں؟ —— میں فوراً بیٹھ گیا، مبادا کارا گے بڑھ جائے۔

وکیل کون سا ہے؟

کوئی نہیں،

کیوں؟

اِس "کیوں" سے میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں، میرے کاندھے پر زور سے تھپکی دی، ہشش بدمعاش، گھبراؤ نہیں، تمہارا مقدمہ میں لڑونگا۔ [1]"

اِس کے علاوہ بھی کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے اُن کے اپنے اور اُن کے خاندان کے حالات کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں آغا صاحب نے جن باتوں پر فخر کیا ہے وہ اُن کی خطابت، خودداری اور بہادری ہے۔ جس کے لئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ خوبیاں تو بہرحال آغا صاحب میں موجود تھیں اور وہ ان پر جتنا فخر کریں کم ہے۔

غرض ہم اس کتاب کو شورش صاحب کی زندگی کی سچی تصویر کہہ سکتے ہیں۔ اِس کتاب کی زبان بڑی شُستہ اور فصاحت سے بھرپور ہے۔ شورش صاحب کو الفاظ کے صحیح استعمال کا بڑا ملکہ ہے۔ سیاسی موضوعات پر لکھتے ہوئے اکثر الفاظ اور معنی میں جدّت اور ندرت پیدا کرتے ہیں۔ اِس کتاب کے موضوعات میں بڑا تنوّع ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی میں مختلف واقعات اور مختلف مواقع پر مختلف کیفیات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ آغا صاحب نے ہر موضوع، ہر موقع اور کیفیت کی عکاسی کے لئے زبان کا استعمال بڑی خوبصورتی سے کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو الفاظ آغا صاحب استعمال کر رہے ہیں خاص اسی موقع کیلئے بنے تھے۔

پسِ دیوارِ زنداں

یہ کتاب پہلی مرتبہ فروری ۱۹۷۱ء میں چٹان پرنٹنگ پریس سے شائع ہوئی۔ اُسی سال اپریل اور جون میں دو ایڈیشن نکلے اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۱ پر مولانا ابوالکلام آزادؔ کے یہ الفاظ نمایاں طور پر لکھے گئے ہیں

"میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔"

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۱۵۳/۱۵۴

اس کتاب کا انتساب آغا صاحب کے الفاظ میں یہ ہے

"یہ کہانی میرے جواں سال بھائی یودرشن کاشمیری کی موت پر ختم ہوتی ہے۔ جی چاہتا تھا اس کے نام معنون کروں لیکن اس کے لئے ان اوراق میں کیا دھرا ہے۔ اس جواں مرگی کو چوتھائی صدی گزر چکی ہے وہ اپنا توشہ ساتھ لے گیا، یہ توشہ اس کے لئے بے معنی ہے۔"

معاً بعض دوستوں کے چہرے سامنے آ گئے لیکن نگہِ نارسا کے باعث ایک ایک چہرہ اوجھل ہو گیا، کئی رہنماؤں کی تصویریں اُبھریں لیکن دلِ گستاخ تیوری چڑھا کر نکل گیا۔ شاہوں کا زمانہ نہیں کہ اس نالۂ احتیاج کو ان سے منسوب کروں۔ حکمرانوں کا دور لد گیا ورنہ انہیں یہ آئینہ ضرور دکھاتا نئی پود کا دل جھریوں سے بہلانا مشکل ہے۔ بوڑھوں کے لئے عمرِ رفتہ میں کیا رکھا ہے تاہم ان اوراقِ عبرت کو ان ساتھیوں کی یاد سے منسوب کرتا ہوں جن سے کبھی قافلۂ جہاد رواں دواں تھا۔

آج ان میں سے کوئی باقی نہیں ———— جانے کب ملاقات ہو

بہ آں گروہ کہ از ساغرِ وفا مستند

سلامِ ما برسانید ہر کجا ہستند[1]

اس انتساب کے بعد صفحہ نمبر ۶ پر اقبال یودرشن کی تصویر چھپی ہے اور ص نمبر ۷ پر بڑے حروف میں غالب کا یہ مصرعہ لکھا گیا ہے

ع نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

پھر آغا صاحب کی تصویر چھپی ہے۔ اس کے بعد مختلف جیل خانوں کی چند تصاویر مختلف عنوانات کے ساتھ چھپی ہیں۔ جہاں آغا صاحب نے اسیری کی مدت بسر کی۔ اس کے بعد آغا صاحب کے قلم سے اس کتاب کی روداد درج ہے کہ یہ کتاب کیسے پایۂ تکمیل تک پہنچی۔ جس کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا اعلان ۱۹۵۲ء میں کیا گیا۔ اور انیس سال کے بعد شائع ہوئی پہلے ۱۹۳۵ء میں "قیدی کا روزنامچہ" کے نام سے جیل کی یہ روداد لکھی گئی جسے رہائی کے وقت ضبط کر لیا گیا۔ اس کے بعد جیل خانے کی

---

[1] پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۵

یادداشتیں ملک کی تقسیم کے وقت ضائع ہوگئیں۔ آخر حافظہ کے زور پر لکھنا شروع کیا تو کئی مسوّدے لکھ کر پھاڑ دیئے گئے اور کئی اسلوب ذہن میں آئے اور نکل جاتے رہے۔ ایک دفعہ پوری کتاب تیار تھی مگر تلف کر دی کیونکہ آغا صاحب خود مطمئن نہ تھے۔ آخر ۱۹ سال کی طویل مدت کے بعد یہ کتاب شائع ہوگئی۔ آغا صاحب کی اس کاوش کے ابتدائی نقوش ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے روزنامہ آزاد کے قیدی نمبر میں موجود ہیں۔ آزاد کے قیدی نمبر میں "قیدی کا روزنامچہ" کے عنوان سے اسی کہانی کا کچھ حصہ مگر الگ اسلوب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ جس میں آغا صاحب کا یہ نوٹ بطور خاص درج ہے۔

"یہ صفحات میں نے اپنی ایک غیر مطبوعہ کتاب "قیدی کا روزنامچہ" سے نقل کئے ہیں۔ جن دوستوں کا اس میں ذکر ہے ان میں سے کئی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مولانا محمد گل شیر شہید ہو گئے ــــ احسن عثمانی کو دوسری بھوک ہڑتال کا روگ اس دنیا سے اٹھا لے گیا۔ صوفی صاحب نے ابھی پچھلے دنوں داعئ اجل کو لبیک کہا اور میر داد کے بارے میں روایت ہے کہ مفرور ہو کر گولی سے ہلاک ہو گیا۔

ــــــ میرا چھوٹا بھائی یورش کاشمیری پرسال تپ دق کے موذی مرض کا شکار ہوا۔ اور ہمارے لئے اپنی نوجوانی کا ماتم چھوڑ گیا۔ "قیدی کا روزنامچہ" اسی کے نام سے منسوب ہے۔

شورش کاشمیری[1]"

اس عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب نے یہ کتاب اپنے مرحوم بھائی اقبال یورش کے نام معنون کی ہوئی تھی مگر بعد کو جو انتساب ہوا وہ پہلے نقل کیا جا چکا ہے۔ قیدی کے روزنامچہ کا انداز یہ ہے۔

"۷۔ فروری ۱۹۴۰ء - - - - - - - - - -

صبح اُٹھے، دوپہر ہوئی اور شام سے پہلے ہی فیصلہ کر لیا کہ عملی اقدام کیا جائے؟ میں بھوک ہڑتال کے حق میں تھا۔ مولانا گل شیر شرعی نقطۂ نگاہ سے اس کے مخالف اور ہمیں تنہا اجازت دینے کیلئے تیار نہ ہوتے تھے۔ آخر ہمیں نے ایک نئی راہ پیدا کی کہ سردی جوبن پر ہے اور رات

---

[1] آزاد قیدی نمبر ص نمبر ۳۴ جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۱۳۵

کی ٹھٹھرن خدا کی پناہ۔ احتجاجاً اپنے اپنے بستر کوٹھڑی سے باہر پھینک دو۔ اور صرف بدن کے کپڑوں میں رات کاٹو ——— اول تو اسی وقت راضی کر لیا جائے گا۔ نہیں تو حکام نمونیہ سے بچانے کے لئے کوئی اور راہ نکالیں گے؟ سب نے اتفاق کیا۔ دیکھتے دیکھتے آنکھوں بادل آگئے۔ رم جھم برکھا ہونے لگی۔ میں نے ساتھیوں کی ہمت بندھائی اور کہا یقین جانو معرکہ جیتا ہوا ہے۔ بند ہوتے ہی سب نے بستر باہر پھینک دیئے۔ جیل کے حکام کو فکر پڑ گئی۔ پہلے تو ذرا رعب کی باتیں۔ نرم دل ساتھیوں سے کی گئیں۔ پھر منانے لگے۔ آخر مجھے بلایا گیا۔ سکھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے داروغہ جیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ سب اسی کی شرارت ہے۔ میں نے کہا، جی ہاں یہ سب کچھ آپ ہی کا بویا ہوا ہے۔ داروغہ نے پہلے افسر بن کر اور پھر لجاجت سے کہا۔ صبح تمام باتیں طے ہو جائیں گی۔ اس وقت مان جاؤ اور بستر لے لو۔ سردی سے مرنا بیکار ہے۔ میں نے کہا۔ آپ درست فرماتے ہیں۔ لیکن یہ سردار صاحب (میں سکھوں کیلئے اس لفظ کے استعمال کو ناپسند کرتا ہوں) بری بلا ہیں۔ آپ انہیں ہماری نگرانی سے الگ کر دیجئے۔ آدھی شکایت ختم ہو جاتی ہے۔ وہاں پر سٹیج کا سوال تھا مانتے کون؟! حکام بھی تن گئے۔ ہر کوٹھڑی کے آگے لیمپ روشن کیا گیا۔ کسی قدر آگ جلائی گئی۔ ایک ایک گھنٹہ کے بعد ڈاکٹر نے پھیرا ڈالنا شروع کیا۔

اب تمام دوست سردی سے ٹھٹھرنے لگے۔ میں تو گھٹنوں میں سر دے کر لاہور کے آشنا چہروں کی خیالی تصویروں میں کھو گیا۔ لیکن صوفی عنایت محمد پسروری گنگنانے لگے۔

ہے زیبا تیری ذات کو سروری
مری بار کیوں دیر اتنی کری

میر داد کے کمرے سے ہر پندرہ منٹ کے بعد صرف اتنی آواز آتی تھی مرے کیسے ہو——؟ احسن عثمانی حافظ شیرازی کے چیدہ چیدہ شعر دہراتے رہے۔ مولانا محمد گل شیر کی قرأت نے گرد و پیش کو مسحور کر لیا۔ سیتا رام عرف بندے ماترم کے نعرے خوب گونجے۔

حکیم غوث محمد صاحب ہر دس منٹ کے بعد مجھ سے کہتے آغا صاحب آپ کی طبیعت کیسی ہے، میں
کہتا ـــــ آپ کی دُعا ہے۔"[1]

اور یہی واقعات اور اسلوب قدرے عبارت کی تبدیلی کے ساتھ پسِ دیوارِ زنداں کے صفحہ نمبر ۱۹۵/۱۹۷ پر موجود ہے۔

"ہم نے اس انتہا میں احتجاج کا طریق کار طے کر لیا میں تو بھوک ہڑتال کے حق میں تھا لیکن مولانا محمد گل شیر شرعی عذر کی بنا پر راضی نہ ہوئے طے یہ پایا کہ آج شام جب شیر سنگھ بستر وغیرہ کی تلاشی لے تو اس کے فوراً بعد بستر اٹھا کر باہر پھینک دیئے جائیں اور اعلان کر دیا جائے کہ ہم ان ٹھٹھرتی ہوئی سردیوں میں "بستر چھوڑ" ہڑتال کر رہے ہیں۔ جاڑے میں مر جانا منظور ہے لیکن روزمرہ کا یہ ہتک ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں - - - - - - - - - ہر کوٹھڑی کے سامنے لالٹین رکھی دی گئی۔ ڈاکٹروں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ رات بھر جیل کے اندر ہسپتال میں رہیں اور پہرا لگاتے رہیں افسروں نے گشت شروع کی خود سپرنٹنڈنٹ کئی دفعہ آیا۔ ساتھیوں میں ہر کوئی اپنی کھڑی پر اکڑوں بیٹھا تھا کئی رات بھر ٹہلتا رہا مولانا محمد گل شیر نے رات کا اکثر حصہ نماز میں گزارا۔ سیتا رام بندے ماترم نے خاصی رونق پیدا کی اُس نے اپنے انقلابی گیتوں سے جیل کو ہلا ڈالا۔ صوفی عنایت محمد پسروری بھی مناجات پڑھتے رہے حکیم غوث محمد نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا تو صبح ہونے تک کئی پارے پڑھ ڈالے راجندر سنگھ آتش بانی کا پاٹھ کرتا رہا میں نے سینکڑوں عنوانوں پر سوچ ڈالا۔ آنکھوں میں رات کٹ گئی کئی جمعدار اور کئی افسر آتے جاتے رہے اُن سے کیا بات کرتا میں نے ڈاکٹر کو بھی رسید نہ دی نور سے تڑکے ہمیں کھول دیا گیا۔"[2]

---

[1] آزاد قیدی نمبر — ص نمبر ۲۴۲/۲۴۳

[2] پسِ دیوارِ زنداں — ص نمبر ۱۹۷

قیدی کا روزنامچہ میں جو عبارت ۴ فروری سنہ ۱۹۴۰ء کے تحت دی گئی ہے اس کا یہ حصہ یہاں نقل کیا گیا۔ قیدی نمبر میں ۲ فروری سنہ ۱۹۴۰ء، ۴ فروری سنہ ۱۹۴۰ء، ۱۳ فروری سنہ ۱۹۴۰ء۔ ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء۔ ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء۔ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۴۰ء اور نومبر سنہ ۱۹۴۰ء کی تاریخوں کے نیچے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

اسی قیدی نمبر میں آغا صاحب کا ایک اور مضمون چھپا ہے جس کا عنوان ہے۔

کیا بیتی اور کیوں بیتی

سنہ ۱۹۳۹ء

کی گرفتاری

اس مضمون میں بھی وہی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ جو "پسِ دیوارِ زنداں" میں لکھے گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل واقعہ اس مضمون میں اس طرح لکھا گیا ہے۔

"اتنے میں ایک سی۔ آئی۔ ڈی والا آگیا ——— پہلے تو چہروں کا جائزہ لیتا رہا پھر پوچھا

آپ کہاں جا رہے ہیں؟

میرے منہ سے نکل گیا ——— "ملتان" اتفاق کہئے یا کچھ اور ملتان جانے والی گاڑی کے آنے میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔

"آپ کا شغل کیا ہے"۔ یہ اس کا دوسرا سوال تھا ——— !

میں انشورنس ایجنٹ ہوں۔ اور یہ میرے صحافی دوست ہیں۔

"کس کمپنی میں"

"مسلم انشورنس کمپنی آف انڈیا لاہور"

"آپ ملتان کہاں جا رہے ہیں"

وہاں میرے ایک دوست لفٹ[illegible] ہیں اور اُن کے بڑے بھائی جیل خانے میں سپرنٹنڈنٹ ہیں

مجھے ان کی [illegible] ہے۔

اس نے انشورنس کے متعلق کچھ سوالات پوچھے، میں نے چوکس جوابات دیئے وہ مطمئن ہو گیا، اور کہا ٹکٹ خرید لیجئے، گاڑی آنے والی ہے۔ ہم طوعاً و کرہاً ملتان روانہ ہو گئے۔[1] "

یہی واقعہ پسِ دیوار زنداں میں اس طرح بیان ہوا ہے۔

" اچانک سفید کپڑوں میں ایک کنسٹیبل آ گیا پوچھنے لگا۔

کہاں جا رہے ہیں آپ؟

" ملتان " میرے منہ سے نکل گیا۔

ملتان کی گاڑی میں دو گھنٹے اور لاہور کی گاڑی میں چار گھنٹے باقی تھے۔ ذبیح نے بعض وجوہ کی بنا پر ملتان ہی کا فیصلہ کر لیا۔ کنسٹیبل بولا۔

آپ ملتان میں رہتے ہیں؟"

جی نہیں۔ کاروبار کے لئے جا رہے ہیں۔

کیا کام کرتے ہیں آپ؟

مسلم انشورنس کمپنی میں انسپکٹر ہیں۔ وہاں ہمیں میجر عاشق حسین سے ملنا ہے۔

اسی طرح کے دو چار سوال کر کے ٹل گیا اور ہم ملتان کے لئے سوار ہو کر خانیوال چلے گئے۔[2] "

اس مضمون کے سارے واقعات مندرجہ ذیل ذیلی عنوانات کے تحت لکھے گئے ہیں۔

۱۔ امرتسر کی شب

۲۔ تاندلیانوالہ کو روانگی

۳۔ فرار کی کہانی

---

[1] روزنامہ آزاد قیدی نمبر ص نمبر ۱۶

[2] پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۱۶۲/۱۶۳

۴۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا ملازم

۵۔ گرفتاری

۶۔ حوالات میں

۷۔ عجیب اتفاق وغیرہ

جب کہ پسِ دیوارِ زنداں میں ان واقعات کا عنوان یہ ہے

۱۔ دوسری جنگ عظیم

۲۔ ملتان کا معرکہ

۳۔ بہیمانہ تشدد

۴۔ ملتان کا ضمیر

یہ سارے واقعات پسِ دیوارِ زنداں میں صفحہ نمبر ۱۵۸ تا ۱۷۱ پر موجود ہیں۔ کہیں اضافے اور کہیں اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اسلوب بھی بدلا ہوا ہے۔ غرض مندرجہ بالا حقائق سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ آغا صاحب نے اس کتاب کا اسلوب تلاش کرنے میں بڑی کاوش کی ہے۔ اور اس کتاب کا مواد اُن کی پہلی قید کے زمانے یعنی ۱۹۳۵ء ہی سے آغا صاحب کے ذہن میں پرورش پانا شروع ہو گیا تھا۔ جوں جوں قید و بند کا سلسلہ طویل ہوتا گیا اس مواد میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہ کتاب ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۷ء تک کے اُن حالات و واقعات کی کہانی ہے جو شورش صاحب کو پسِ دیوارِ زنداں میں پیش آئے۔ اور اسی نسبت سے ایام اسیری کی اس روداد کا نام "پسِ دیوارِ زنداں" رکھا گیا ہے۔ پس دیوار زنداں میں بقول شورش کاشمیری

"ایک کہانی نہیں۔ کئی کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں دار و رسن کے نوحے بھی ہیں اور شعر و سخن کے زمزمے بھی۔ قید تنہائی کا سناٹا بھی ہے زورِ قلم کا فراٹا بھی۔ آنسوؤں کی مالا بھی ہے آہوں کا ہالہ بھی۔ پچھلے پہر کی یادیں بھی ہیں دیدہ و دل کی فریادیں بھی۔ دوستوں کی باتیں بھی ہیں دشمنوں کی گھاتیں بھی۔ ہجر کی رات بھی ہے وصل کی بات بھی۔ غرض زلف و زنجیر کے رشتے اور زخم و مرہم کے ناطے

اِس کہانی کے بین السطور کی آبرو ہیں۔[۱] "

یہ چند الفاظ ۲۳۲ صفحہ کی اِس کتاب کا خلاصہ ہیں ۔ یہ کتاب صرف آغا شورش کاشمیری کی رودادِ اسیری نہیں بلکہ ان حریت پسندوں کی داستان بھی ہے جنہوں نے آزادی کیلئے اسیری پسند کی اور غلامی کی بجائے آزادی کیلئے برطانوی استعمار سے جنگ کی ۔ برطانوی عہد کے جیل خانے کیا تھے؟ ان کا ماحول کیسا تھا؟ قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا تھا؟ کون کونسی سزائیں دی جاتی تھیں؟ قیدیوں کو کس قسم کے تشدد اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا؟ جیل کے حکام کس قسم کی مخلوق تھے؟ قید کی کون کونسی قسمیں ہیں؟ جرم کے محرکات کیا کیا ہیں؟ جیل کا نظام کیسے چلتا ہے؟ جیل خانے کی زبان اور اصطلاحات کا مفہوم کیا ہے؟ جیل خانوں میں قیدیوں کی نفسیات کیا ہوتی ہے؟ اور اسی قسم کے اور بہت سے سوالوں کے جوابات اِس کتاب میں مل جاتے ہیں ۔ جس زمانے میں آزادی کی جنگ لڑی جا رہی تھی اُس زمانے میں حریت پسندوں کی پامردی، بہادری، قید و بند، ظلم و ستم، تشدد و ایذا رسانی کی داستانیں عام تھیں اور یہ کہانیاں محفلوں، انجمنوں، جلسوں، منڈیوں، گروہوں، گھروں، بازاروں اور گلی کوچوں میں فخر کے ساتھ کہی جاتی تھیں اور عقیدت کے ساتھ سنی جاتی تھیں ۔ نوجوان ان داستانوں اور کہانیوں سے حوصلہ اور عمل کی قوت حاصل کرتے اور آزادی کی جدوجہد میں شامل ہو کر خود ایک کہانی بن جاتے جو دوسروں کے لئے عمل کی دعوت ہوتی ۔

مگر قیامِ پاکستان کے بعد جب آزادی کی جنگ ختم ہوئی تو اقتدار کی جنگ شروع ہوگئی ۔ اب یہ کہانیاں بے اثر ہونے لگیں سنانے والے موجود تھے مگر کوئی کان نہ دھرتا تھا ۔ آہستہ آہستہ یہ کہانیاں سنانے والے اُٹھتے گئے ۔ اگر کبھی کوئی بھولی بسری کہانی یاد بھی آئی تو عام بدمذاقی اُسے بعید از قیاس فسانہ سمجھ کر ٹھکرا دیتی ۔ ایسے سناٹے میں اِس داستان کو چھیڑنا بڑا مشکل کام تھا مگر آغا شورش کاشمیری نے اپنی اسیری کی کہانی لکھ کر اُن تمام کہانیوں کی تجدید کر دی ہے جو کبھی نوکِ زباں تھیں انہوں نے جدوجہد آزادی میں حصہ لینے والے حریت پسندوں کے کارناموں کو تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے ۔ "پسِ دیوارِ زنداں" میں ایسے بہت سے نام ملتے ہیں جنہوں نے آزادی کی خاطر نہ صرف قید و بند کی اذیتیں برداشت کیں بلکہ آزادی کیلئے اپنی جان کا نذرانہ تک پیش کر دیا مگر ان کا نام تاریخ کے کسی گوشے میں بھی موجود نہیں ۔ آزادی کی اس تاریخی دستاویز کی

---

[۱] گرد پوش ۔ پسِ دیوارِ زنداں

سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس میں ہندو، سکھ اور مسلمان سب کے نام آتے ہیں۔ جس کا معیار صرف حوصلے کی فراوانی اور قربانی کی ارزانی ہے۔ جس نے جتنا ایثار کیا اتنا ہی محترم ٹھہرا۔ ان لوگوں میں بھیم سین اچھی اوم پرکاش اور اچپال سے کم سن لڑکے بھی ملتے ہیں۔ جو پولیس نے تشدد سے مار ڈالے۔ اور شیر زماں جیسا شیر دل نوجوان بھی ہے۔ جس نے آغا صاحب کی گرفتاری کے وقت ہنگامے میں بڑی مستعدی اور دلیری سے پولیس کا مقابلہ کیا اور مذاق اڑایا۔ اس کے علاوہ بعض معروف سیاسی آدمیوں کا ذکر بھی اس کتاب میں ہوا ہے جن میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا محمد گل شیر، صوفی عنایت محمد پسروری، کامریڈ احسان الٰہی، بھگوتی چرن، یوسف مہر علی، ڈاکٹر گوپی بھارگو، اور نکا نام نہیں ملک لال چڈھا، سحر گل، کلبیر سنگھ، پروفیسر عبدالعزیز، لدھا رام سرکاری رپورٹر اور کئی دوسرے لوگ جن کا تذکرہ بڑے خوبصورت انداز میں موجود ہے۔

آغا صاحب کی محبت کا قصہ چونکہ عہدِ اسیری ہی کا واقعہ ہے لہٰذا اسی کتاب کا حصہ ہے۔ آغا صاحب ریل سے جیل جا رہے تھے۔ کہ محبت ہو گئی۔ جیل سے رہا ہوئے تو محبت مرگئی۔ کتاب کے آخری اوراق میں خورشید، آغا صاحب کی محبوبہ اور اقبال یورش آغا صاحب کے بھائی کی موت کے واقعات بڑے دل گداز اور حسرت ناک ہیں۔ اس وقت آغا صاحب تھانہ انارکلی کی حدود میں نظر بندی کی زندگی گزار رہے تھے۔ یورش کی بیماری کے عرصہ میں آغا صاحب نے حکومت کو پابندی اٹھا لینے کیلئے لکھا تھا تاکہ یورش کے علاج کیلئے اِدھر اُدھر جا سکیں لیکن پابندی بدستور رہی اور یورش کا انتقال ہو گیا بقول شورش صاحب

"پرانی انارکلی کے آخری نکڑ یعنی جین مندر تک میری نظر بندی کے حدود تھے۔ میں اس سے آگے نہیں جا سکتا تھا سرکاری گماشتہ ہمراہ تھا میں چاہتا تو قبرستان چلا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پابندیاں توڑنے کی پاداش میں مقدمہ چلتا اور میں قید ہو جاتا لیکن دوستوں نے روک کر واپس کر دیا میں چوک میں کھڑا دور تک جنازے کو تکتا رہا ۔۔۔۔۔ ؏

اک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے

نصف فرلانگ پر قبرستان تھا لیکن قانون نے پابہ زنجیر کر دیا تھا کہ اس حد سے آگے بھائی کے جنازے کو کندھا بھی نہیں دے سکتے ہو۔ یہ ایک ایسا المیہ تھا جس کا لغت میں کوئی نام نہیں

دوستوں کے چہروں پہ زردی کا کفن تھا۔

لوگوں کی واپسی تک میں اسی چوک میں کھڑا رہا لوگ میت دفنا کر گھر پہنچے تو یہ اخبار پولیس اسٹیشن کا سب انسپکٹر دروازہ پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہوم سیکرٹری کا دستخطی حکم نامہ تھا ـــــ "گورنر پنجاب بڑی مسرت کے ساتھ شورش کاشمیری پر عائد کردہ اُن پابندیوں کو واپس لینے کے احکام صادر کرتے ہیں جن کی رو سے وہ اب تک انارکلی پولیس کے علاقہ میں نظر بند ہے یہ پابندیاں اس کے بھائی کی علالت کے پیش نظر واپس لی جاتی ہیں اس کی نقل و حرکت پر اب سے کوئی پابندی نہیں رہی ہے"!!

یہ ستم ظریفی ہمیشہ حکمرانوں کی رہی ہے اور آج بھی ہے۔ وہ شاید ایسی چالوں ہی کو اپنی وفاداری اور کارکردگی سمجھتے ہیں کہ کسی کام کا وقت گزرنے پر اور نشتر زنی کی جائے۔

تمغۂ خدمت

یہ کتاب پہلی مرتبہ اپریل ۱۹۷۰ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہو جو ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب آغا صاحب کی ۱۰۴ دن کی نظر بندی کی حکایت ہے۔ صدر ایوب کے دور حکومت میں ایوب خاں کے بیٹوں کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ آغا صاحب نے اسی سلسلے میں چٹان ۱۱ رجولائی ۱۹۶۶ء کے شمارے میں ایک طرح دار اداریہ بعنوان "صدر ایوب کیا کریں" تحریر کیا۔ جس کی بنا پر آغا صاحب کو ۶ رستمبر ۱۹۶۶ء کی رات کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ نمبر ۳۲ بی کے تحت منٹگمری سنٹرل جیل میں ۶ ماہ کیلئے اے کلاس میں نظر بند کر دیا گیا۔

آغا صاحب نے ۴۰ دن منٹگمری جیل میں گزارے پھر بیمار ہو گئے تو میو ہسپتال لاہور میں رکھا گیا۔ آخر ۲۳ ردسمبر ۱۹۶۶ء کو رہا کر دیئے گئے۔

آغا صاحب نے یہ کتاب ڈائری کی صورت میں لکھی ہے۔ اس سے پہلے آغا صاحب نے "پس دیوار زنداں" کو بھی ایک قیدی کا روزنامچہ کا نام دیا تھا۔ اور یہی طرز اپنایا تھا کہ پہلے تاریخ لکھتے اور پھر واقعات درج کرتے۔ اس بات کا ذکر "پس دیوار زنداں"

تذکرہ میں آچکا ہے اور قیدی کے روزنامچہ کا اقتباس روزنامہ آزاد کے قیدی نمبر سے نقل کیا جاچکا ہے۔ تمغۂ خدمت میں بھی بالکل وہی انداز اپنایا گیا ہے۔ جو قیدی کے روزنامچہ کا ہے۔ یعنی واقعات کا اندراج تاریخ وار ہوا ہے۔ منٹگمری جیل میں گزارے جانے والے اہم دنوں کی روداد اس کتاب کا پہلا حصہ ہے۔ پھر میو ہسپتال میں گزرنے والے دنوں کے واقعات ہیں۔ اس دفعہ آغا صاحب اے کلاس کے قیدی تھے وہ پہلے والے بے سروسامان شورش نہ تھے جنھیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ بلکہ اب ہمیں اے کلاس کے شورش کاشمیری نظر آتے ہیں جو اخلاقی تبدیلیوں پر بھی اپنی موجودگی میں ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ اور حکام بھی ان کی حیثیت اور مرتبہ کے تابع نظر آتے ہیں۔ آغا صاحب نے اِس زمانے کی منٹگمری جیل کی جو کیفیت بیان کی ہے۔ اس میں اور انگریزی حکومت کی منٹگمری سنٹرل جیل میں کوئی زیادہ فرق نہیں بلکہ ویسے ہی حالات اب بھی ہیں۔ اس کے بعد جب آغا صاحب میو ہسپتال لاہور آجاتے ہیں تو یہ نظر بندی، نظر بندی نہیں رہتی کسی قسم کی کوئی رکاوٹ یا پابندی نہ تھی سوائے اس کے کہ آغا صاحب گھر نہیں جاسکتے تھے۔ آغا صاحب نے اِس نظر بندی کو ہوسٹل کی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ آغا صاحب نے اِس کتاب میں اپنی روداد کے علاوہ اپنے ساتھی نظر بندوں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹروں اور جیل حکام پر بھی تبصرہ کیا گیا ہے۔ زبان بڑی سادہ ہے مگر کہیں کہیں حکمرانوں پر طنز کرنے میں شوخی سے بھی کام لیا ہے۔ اس کتاب کو "پس دیوارِ زنداں" کا دوسرا حصہ کہنا چاہیے لیکن یہ کتاب اپنی ساری خوبیوں کے باوجود "پس دیوارِ زنداں" کا ہم پلّہ نہیں۔ تمغۂ خدمت بقول شورش کاشمیری

"بظاہر عجیب سا نام ہے۔ لیکن یہ طنزاً رکھا گیا تھا۔ راقم نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں قلم و زبان سے جو خدمت انجام دیں ان کا اعتراف خود حکومت کے ایوانوں میں کیا گیا۔ راقم نے سب سے زیادہ نظمیں، نغمے، مقالے اور اداریے لکھے۔ صوبے کے بڑے بڑے شہروں میں تقریریں کیں انعام کیا ملا یہ کہ جنگ کی پہلی سالگرہ پر راقم کو ۲۰۰ ڈیفنس آف پاکستان رولز میں پکڑ لیا گیا"[1]

اس کتاب کا انتساب آغا صاحب نے اپنی اہلیہ کے نام کیا ہے۔ صفحہ نمبر ۵ پر آغا صاحب کا یہ شعر درج ہے کہ ؎

ہر ایک دور کے آقا غلام ابن غلام
ہر ایک عہد کی تاریخ چند سودائی

---

[1] تمغۂ خدمت ۔ جگر لخت لخت ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۵/۶

موت سے واپسی

یہ کتاب اگست ۱۹۷۲ء میں پہلی بار شائع ہوئی کتاب کے پہلے صفحہ پر نظیری کا یہ مصرع درج ہے۔

کس نه کشته که نه شد از قبیلهٔ ما نیست

یہ کتاب ۱۰۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی یہ کتاب بھی "پس دیوار زنداں" اور "تمغۂ خدمت" کی طرح قید و بند ہی کی داستان ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اُس دور کی بات ہے جب ایوب خاں صدر پاکستان تھے۔ پنجاب کے گورنر محمد موسیٰ تھے اور جناب احمد سعید کرمانی اطلاعات کے وزیر تھے۔ شورش صاحب کے بارے میں اگرچہ پاکستان کی کوئی حکومت بھی نیک ارادے نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اس حکومت کے خیالات تو آغا صاحب کے متعلق کچھ زیادہ ہی خراب تھے۔ پہلے تو اس حکومت نے آغا صاحب کو عام روایتی طریقوں سے رام کرنا چاہا پھر اس وقت کے مروجہ طریقہ ہائے خرید سے قیمت چکانا چاہی لیکن شورش صاحب جیسے کہنہ مشق سیاست داں پر اس کا کوئی اثر نہ ہو سکا۔ کیونکہ ایسے بہت سے حربے تو انگریز جیسی طاقتور حکومت نے بھی استعمال کر دیکھے تھے خود انگریزی عہد میں پنجاب کی حکومت اس کوشش میں رہی کہ شورش کاشمیری کو رام کرے مگر کسی کو بھی کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا اس عہد کا مروجہ حربہ بھی شورش صاحب پر ناکام ہوا اگرچہ حکومت کے اس نسخے سے بہت سے مریض صحت یاب ہو چکے تھے۔ شورش کاشمیری سے صدر محمد ایوب خان اور گورنر موسیٰ خان کی ناراضگی میں کوئی ذاتی عناد پوشیدہ نہ تھا بلکہ اس ناراضگی کی وجہ سیاسی اختلاف تھا۔ جس پر اس کتاب میں بہ تفصیل روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ شورش کے قلم اور زبان دونوں سے حکومت کی نیک نامی میں کمی آتی تھی لہٰذا حکومت کے سربراہ اور صوبے کے گورنر کی ناراضگی لازمی تھی۔ لیکن اس کتاب میں آغا صاحب نے جو کچھ جناب احمد سعید کرمانی کے متعلق لکھا ہے اور جناب احمد سعید کرمانی نے قومی اسمبلی کی تقریر میں آغا صاحب کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ اُس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں اصحاب میں ناراضگی نہ تھی بلکہ دشمنی تھی۔

جناب احمد سعید کرمانی نے اپنے منصب اور اقتدار کی بنا پر جب یہ دشمنی چکانے کی کوشش کی تو یہ معاملہ انفرادی نہ رہا بلکہ اجتماعی بن گیا جناب احمد سعید کرمانی چونکہ حکومت کے وزیر تھے اور ان کے طرز عمل سے صرف ان کی رسوائی نہ تھی بلکہ پوری حکومت کی بدنامی تھی، ظاہر ہے کوئی بھی حکومت اپنی بدنامی نہیں چاہتی۔ اس طرح اس قضیے میں حکومت ایک پارٹی تھی

اور آغا صاحب سے سابقہ کسی سیاسی پارٹی کا رکن نہ ہونے کے باوجود حزبِ اختلاف کے علاوہ مذہبی تنظیموں، مذہبی رہنماؤں اور عوام کی طاقت تھی۔ اور اس جنگ میں حکومت نے اپنے طرزِ عمل اور اختیارات کے غلط استعمال کی بنا پر عدلیہ کو جو حکومت ہی کا ایک حصہ تھی، ناراض کر لیا۔ جس کی وجہ سے یہ مسئلہ پیدا ہوا۔

بات دراصل یہ تھی کہ لاہور میں مجلسِ اقبال کا جلسہ تھا اور آغا صاحب ایک عرصے سے اِس کے سیکرٹری چلے آرہے تھے۔ کرمانی صاحب نے اپنے آدمی بھیج کر اس جلسے کو صرف اِس وجہ سے خراب کرنے کی کوشش کی کہ آغا صاحب اس مجلس کے سیکرٹری تھے۔ ورنہ حکومت کو یا کرمانی صاحب کو علامہ اقبال سے کیا عناد ہو سکتا تھا۔ کہ اُن کے افکار کی ترویج کو روکا جائے۔ شورش صاحب جن کا ہمیشہ یہ دعویٰ رہا کہ کسی ماں نے آج تک وہ بچہ نہیں جنا جو شورش کاشمیری کا جلسہ خراب کرے۔ انہوں نے اس جلسے کو خراب ہوتے سے بچا لیا مگر وزیر موصوف کے متعلق جو سخت الفاظ استعمال کئے انہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آغا صاحب کے ہفت روزہ "چٹان" کا ڈیکلریشن منسوخ ہو گیا اور چٹان پریس ضبط کر لیا گیا۔ اور اِس کارروائی کے جواز کیلئے چٹان کا ایک شذرہ جو "الحمد للہ" کے عنوان سے مرزائیوں کے خلاف لکھا گیا تھا کا انتخاب کیا۔ اسی دوران میں ۵ مئی کو جمعیت العلمائے اسلام کے بہت بڑے اجتماع میں آغا صاحب نے ایک زبردست تقریر کی۔ آغا صاحب نے اِس میں ایوب خان، موسیٰ خان، کرمانی صاحب اور الطاف گوہر پر سخت تنقید کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آغا صاحب کو گرفتار کر لیا گیا۔ پہلے ڈیرہ اسماعیل خان کی جیل میں رکھا گیا اور سی (C) کلاس دی گئی۔ آغا صاحب نے بھوک ہڑتال کر دی مگر حکومت نے جلد ہی ہار مان لی۔ اس کے بعد آغا صاحب کو کراچی سنٹرل جیل میں رکھا گیا۔ اس کے بعد سول ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا کیونکہ آغا صاحب بیمار تھے۔ اسی دوران میں آپ کے مقدمے کی سماعت بھی ہوتی رہی۔ حکومت کا خیال تھا کہ پنجاب یا سرحد کے کسی مقام پر آغا صاحب کو رکھنے سے انتظامی صورت حال خراب ہو گی لہٰذا اس مقصد کے لئے کراچی کا انتخاب کیا گیا۔ مقدمے کی سماعت کے دوران میں ایڈووکیٹ جنرل توہینِ عدالت کا مرتکب ہوا۔ ججوں نے مقدمہ کی سماعت کرنے سے انکار کر دیا اور آغا صاحب نے "تا مرگ بھوک ہڑتال" کا فیصلہ کر لیا۔ آغا صاحب اپنے اس فیصلے پر ضد کی حد تک چلے گئے۔ دوستوں، عزیزوں، سیاسی رہنماؤں، دینی پیشواؤں، مذہبی عالموں اور بیوی بچوں کی التجائیں بھی آغا صاحب کے فیصلے کو نہ بدل سکیں بالآخر جب عوام میں تحریک پیدا ہوئی۔ خاص طور پر پنجاب اور سرحد کے لوگوں نے شورش کی رہائی کو

اپنا مطالبہ بنالیا۔ جب آغا صاحب کی نازک حالت کی خبریں شائع ہوئیں تو کراچی بھی اس مطالبے کی لپیٹ میں آگیا کہ شورش کاشمیری کو رہا کرو۔ عوام کے اس دباؤ کے پیشِ نظر حکومت نے اس مسئلہ پہ غور کیا۔ ڈاکٹروں کے بورڈ علاج کیلئے مقرر ہوئے مگر جب حکومت کو یقین ہوگیا کہ شورش کاشمیری بھوک ہڑتال کے باعث خطرے کی حدود سے بھی آگے نکل چکے ہیں اور موت کے قریب پہنچ گئے ہیں تو انہیں رہا کردیا گیا۔

اِس طرح گویا آغا صاحب موت سے واپس آئے۔ اس کے علاوہ آغا صاحب کو مار ڈالنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ اس کتاب کے دیباچہ میں آغا صاحب نے اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

"ایامِ نظر بندی کی آخری بھوک ہڑتال میں مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ میرے معالج کو صوبہ کے ہیلتھ سیکرٹری نے مجھے غزلہ کردینے کا مشورہ دیا ہے۔[۱]"

لیکن یہ سازش کامیاب نہ ہوسکی اور آغا صاحب اس سازش سے صاف بچ نکلے۔ آغا صاحب نے اسی نسبت سے اِس کتاب کا نام "موت سے واپسی" رکھا ہے۔ یہ کتاب اِس لحاظ سے آغا صاحب کی سب کتابوں سے منفرد ہے کہ اِس کتاب میں شورش کاشمیری اپنے اصلی رنگ میں بولتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شورش صاحب کی یہ کیفیت اُس فوجی جرنیل کی سی ہے جو میدانِ جنگ میں ہر قسم کے نقصان اور گردوپیش سے بے خبر ہوکر صرف دشمن کا مورچہ توڑنا چاہتا ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنی ساری متاع اور خود اپنی زندگی بھی داؤ پر لگا دیتا ہے۔ اور ہر اُس ہتھیار کو کام میں لاتا ہے جو دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا سکے لیکن اس جنگ میں آغا صاحب کے ہتھیار اُن کی زبان اور قلم تھے۔ ہفت روزہ چٹان کی بندش اور پریس کی ضبطی کے بعد آغا صاحب نے جو تقریر کی اُس کا خلاصہ اس کتاب میں موجود ہے۔ جس سے آغا صاحب کے حملے کی شدت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس کے بعد جب آغا صاحب کو گرفتار کرکے نظر بند کردیا گیا تو انہوں نے حکومت کے خلاف قلم کی جنگ شروع کی اور اربابِ اختیار کو بہت سے شاہکار خطوط لکھے وہ اس کتاب میں نقل ہوئے ہیں۔ جنہیں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ کلمۂ حق کہنا واقعی بہت بڑا جہاد ہے۔

---

[۱] دیباچہ موت سے واپسی۔

مثلاً قاضی فضل اللہ اُس وقت کے وزیر داخلہ نے ایوانِ اسمبلی میں یہ کہا کہ آغا شورش کی حیثیت ایسی نہ تھی کہ انہیں اے کلاس دی جائے۔ نیز یہ کہ آغا صاحب نے حکومت کو بلیک میل کرنے کے لئے بھوک ہڑتال کی ہے[1]۔ آغا صاحب نے اس سلسلے میں جو خط قاضی فضل اللہ وزیر داخلہ کو لکھا وہ حسب ذیل ہے۔

"قاضی صاحب محترم!

"سلام مسنون! آپ نے اسمبلی کے ایوان میں ۱۷۔ مئی کو میرے متعلق جو الفاظ کہے ہیں وہ آپ جیسے اہلیت سے واقف سیاست دان کو زیب نہیں دیتے آپ عمر کی اس منزل میں ہیں کہ اس حکومت کا دفاع عاقبت کے بھی خلاف ہے۔ حکومت جانتی ہے کہ میں بیمار ہوں۔ اسی حکومت نے مجھے پچھلی نظربندی میں اے (A) کلاس دی تھی اور یہ میرا قانونی حق تھا میری حیثیت کا فیصلہ وہ لوگ کیسے کر سکتے ہیں۔ جو خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں ان کی حیثیتوں سے بخوبی واقف ہوں میں ایسی حکومت کے ساتھ جینا بھی نہیں چاہتا، بلیک میل کیا ہوتا ہے؟ وہ لوگ جو خود بلیک میل کی پیداوار ہیں اس قسم کے الفاظ بولتے ہوئے حیا محسوس نہیں کرتے، میں نے اپنی عزت کیلئے جان کی بازی لگائی ہے۔ روٹ پرمٹ۔ لائسنس یا اراضی لینے کے لئے نہیں۔ کہ وابستگانِ سرکار کی اکثریت کا دامن ان آلودگیوں سے داغدار ہے۔

حکومت میں جرأت ہے تو وہ اے کلاس کی رعایت واپس لے اور پھر اس کا نتیجہ بھگتے۔

شورش کاشمیری[2]"

اسی طرح صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کو احمد سعید کرمانی کے متعلق یہ خط لکھا تھا۔

"بہ ادب گزارش ہے کہ آپ نے مسٹر کرمانی کو اپنی ذرہ نوازی کے تحت وزیر بنانے کے علاوہ صوبہ

۱؎ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۱۱۵

۲؎ موت سے واپسی ص نمبر ۱۱۶

مسلم لیگ کا مدار بنا رکھا ہے، کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ وہ کوئی سہارا لینے کی بجائے پبلک میں آکر اپنے الزامات لگائیں اور مجھے موقع دیا جائے کہ میں وہیں جواب دے سکوں۔ میرا اخبار بند کرکے اس قسم کے جھوٹے الزام لگوانا یقیناً شرافت و انسانیت کے منافی ہے۔ میں جو الزام ان پر لگاتا ہوں وہ عوام کے علاوہ عدالت کے کٹہرے میں اور آپ کے سامنے ثابت کر سکتا ہوں کہ کرمانی صاحب میں بھی یہی حوصلہ ہونا چاہیئے، افسوس کرمانی صاحب میں شیوۂ مردانگی نہ پہلے کبھی تھا نہ اب ہے۔

مکرر التماس انتہائی احترام کے ساتھ کہ میری اور کرمانی صاحب کی طالب علمانہ زندگی سے لے کر آج تک کی زندگی کے بارے میں اخلاقی، سیاسی اور جنسی لحاظ سے تحقیقات کرائی جائیں میرے خلاف کوئی داغدار صفحہ یا لمحہ ثابت ہو تو مجھے قرار واقعی سزا دلوائی جائے اور اگر کرمانی صاحب مجرم ثابت ہوں تو کم از کم صوبہ کی وزارت سے انہیں ضرور خارج کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کرمانی صاحب اپنے خاص عوارض اور ذاتی عداوتوں کے باعث عوام میں حکومت کی رسوائی کا باعث ہو رہے ہیں یہ میری عقیر از درخواست ہے۔ والسلام

ادب واحترام کے ساتھ

المخلص

(شورش کاشمیری)

ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان۔ لاہور[1]"

احمد سعید کرمانی صاحب پر آغا صاحب کے طنز کے تیر بڑے زہریلے ہیں۔ آغا صاحب قصداً کرمانی صاحب کو اہمیت نہیں دیتے لیکن جہاں ان کا ذکر ناگزیر تھا وہاں پہ کوئی نہ کوئی چبھتا ہوا جملہ ضرور مل جائے گا۔ جناب احمد سعید کرمانی کی وہ تقریر جو انہوں نے اسمبلی میں آغا صاحب کے خلاف کی تھی۔ آغا صاحب نے اس کتاب میں نقل کرنے کے بعد یہ چند جملے لکھے ہیں۔

---

[1] موت سے واپسی ص نمبر ۹۳

"یہ رپورٹ صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان کے اسسٹنٹ سیکرٹری کی دستخطی ہے اور اس فائل سے حاصل کی ہے جو ہائی کورٹ میں رٹ کے ساتھ شامل کی گئی تھی - زبان و بیان کی غلطیاں اس لئے درست نہیں کی ہیں - کہ جو کچھ اس وزیر نے کہا تھا اس میں اصلاح ہو جاتی اور یہ دستاویز کے منافی ہوتا۔[1]"

کرمانی صاحب کے علاوہ دوسرے ارکان حکومت پر بھی اس قسم کے جملے ملتے ہیں جو آغا صاحب کا طنز کے سلسلے میں رنگ خاص ہے مثلاً

"جس آزادی کیلئے عمر گلا دی وہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جو کبھی ادنیٰ عہدوں پر انگریز کے نوکر تھے آج پاکستان میں عوام کے آقا ہیں۔[2]"

اس جملے کا مطلب ایک دوسری جگہ زیادہ واضح ہے -

"میں جن لوگوں کے حکم سے پکڑا گیا وہ کیا تھے؟"

"سب کچھ ہوں گے لیکن جب ملک انگریز کا غلام تھا وہ انگریزوں کے تنخواہ دار تھے"

اس کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں - صرف چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے -

"میں قانون کی کربلا میں تشنہ لب کھڑا ہوں اور حصول انصاف میرے لئے گویا فرات کا پانی ہو گیا ہے۔[3]"

"پولیس ان سے بلا وجہ اتنی گھبرائی ہوئی تھی کہ مجھے مال مسروقہ کی طرح چھپائی پھرتی۔[3]"

کراچی ہسپتال کے ایک سرجن کے متعلق کہتے ہیں

"فی الجملہ وہ ہسپتال کیلئے معمار - مریضوں کیلئے تھانیدار اور عملہ کے لئے چوبدار تھے۔[3]"

"میرے پنجاب یا سرحد میں میری منتقلی سے لا اینڈ آرڈر کی دوشیزہ کے اغوا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔[3]"

---

[1] موت سے واپسی ص نمبر ۸۷

[2] موت سے واپسی ص نمبر ۱۰۱/۱۰۶/۱۰۹

[3] موت سے واپسی ص نمبر ۱۴۴ - ۱۵۱ - ۱۸۴ - ۱۹۴

اس کے علاوہ "حماقتیں" کے عنوان سے آغا صاحب نے حکومت کی کارگزاریوں پر جو تبصرہ کیا ہے وہ اِس کتاب کا بڑا ہی زوردار حصہ ہے۔ باقی رہے ڈیرہ اسماعیل خان اور کراچی جیل کے واقعات تو یہ موضوع تو آغا صاحب کا محبوب موضوع ہے اِس پر اُن کا قلم ایسے چلتا ہے جیسے مچھلی پانی میں چلتی ہے۔ ایک ایک بات اپنی جزئیات کے ساتھ بڑی روانی اور خوبی سے بیان ہوئی ہے۔ سوانح نگاری میں ہر مصنف "میں" کا لفظ بار بار بولنے پر مجبور ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کا موضوع ہی "میں" کا محور ہوتا ہے۔ جس سے ہر مصنف کی انانیت کا اظہار ہوتا ہے لیکن ادب میں انانیت کا یہ اظہار مصنف کیلئے بڑا ہی کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اگر انانیت کا یہ اظہار مصنف کی شخصیت کے لحاظ سے موزوں نہ ہوگا تو تعلی کا رنگ پیدا ہو جائے گا۔ ہر بات اکھڑی ہوئی اور ہر واقعہ خلاف واقعہ معلوم ہوگا۔ لہٰذا انانیت کے اِس اظہار کیلئے مصنف کی شخصیت کا عظیم اور باوقار ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی بڑی شخصیت "میں" کہتی ہے تو یہ "میں" ہمیں بُری نہیں لگتی بلکہ بھلی لگتی ہے۔ کیونکہ اِس "میں" میں اُس شخصیت کا حُسن سمایا ہوا ہوتا ہے گویا "میں" کہنے کیلئے منصور ہونا بھی ضروری ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی اس کتاب میں انانیت کا یہ عنصر بڑی شدت کے ساتھ موجود ہے جو کمزور اور سطحی نہیں بلکہ توانا اور حقیقی ہے۔ بلکہ یہ کتاب ہی حکومت کی انا اور آغا صاحب کی "انا" میں ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جس کی وجہ آغا صاحب نے اِس کتاب کے دیباچہ میں یہ بتائی ہے کہ

> "جو لوگ کسی جمال و کمال کے بغیر اپنے خدا ہونے کا اصرار کریں اور خوانِ یزید کی ریزہ چینی کے باوجود اپنے تئیں اہلِ بیت کہلانے پر مصر ہوں یا انہیں گمان ہو کہ وہ بڑے آدمیوں میں سے ہیں انہیں نہ تو ذہن قبول کرتا ہے نہ دل مانتا ہے اور نہ قلم کے ہاں اُن کیلئے کوئی عزت ہے۔ مَیں نے اس قسم کے خداؤں یا انسانوں سے ہمیشہ بغاوت کی ہے۔"[1]

اس تا مرگ بھوک ہڑتال میں جہاں آغا صاحب کے حوصلے اور بہادری کو دخل ہے وہاں اس قدم کے اٹھانے میں یہ یقین بھی شامل تھا کہ لوگ اِس بھوک ہڑتال سے چپ نہ بیٹھیں گے اور حکومت کو ایک بڑی تحریک کا سامنا کرنا ہوگا۔ جس کی حکومت متحمل نہ ہو سکتی تھی گویا آغا صاحب کو اپنی عوام میں مقبولیت۔ شہرت اور نیک نامی کا پورا یقین تھا جس سے حکومت بھی آگاہ تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آغا صاحب

---

[1] دیباچہ موت سے واپسی

کو ترغیب دے کر رام کرنے کی ضرورت نہ تھی ۔ اور بھی یقین اس کتاب میں انانیت بن کر ابھرا ہے ۔ آغا صاحب کی شخصیت میں انا بنیت کا یہ عنصر یک دم پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کے پس منظر میں اُن کی قومی خدمات کا طویل فہرست ہے جس کے بتدریج ارتقا نے شورش کی انا کی تشکیل کی جو بالآخر شورش صاحب کی شخصیت کا حصہ بن گئی اور جسے اُن کی شخصیت سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ اس کے مقابلے میں اقتدار اور طاقت بھی انانیت کو جنم دیتے ہیں ۔ اس کے لیے کسی مسلسل عمل کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جس شخص کو طاقت یا اقتدار دے دیا جائے یہ عنصر اُس میں پیدا ہو جائے گا ۔ اور طاقت کے ختم یا کم ہوتے ہی انانیت کا عنصر بھی کم یا ختم ہو جاتا ہے ۔ شورش کاشمیری اور حکومت کی اس آویزش میں دونوں طرف سے انا کا ٹکراؤ تھا ۔ ارباب حکومت اس جھگڑے میں اِس لیے جُھک گئے کہ آغا صاحب کی زبردست شخصیت نے جو وار کیا تھا اُس نے ارباب اقتدار کی طاقت کے کم یا ختم ہونے کے خدشات پیدا کر دیئے تھے ۔ آغا صاحب کی اس کتاب کا لہجہ تیز ۔ تلخ اور تندی کا سا ہے ۔ جس نے کتاب کو مظلوم انسان کی فریاد کی بجائے ایک بہادر انسان کی للکار بنا دیا ہے ۔

جب تک کتاب کے آخری اوراق جنہیں تاریخی دستاویز کہنا چاہیئے نہ پڑھے جائیں اس وقت تک یقین نہیں آتا کہ کوئی حکومت اِس قسم کی گھناؤنی سازش بھی کر سکتی ہے ۔ اس کتاب میں "دستاویز" کے عنوان سے مسٹر ایس ۔ اے ۔ حق سابقہ چیف سیکرٹری مغربی پاکستان اور جسٹس شوکت علی صاحب کے خطوط اور بیانات اِس سازش پر ثقہ شہادتیں ہیں مزید یہ کہ اِس کتاب میں جن لوگوں کا ذکر ہے ۔ وہ تمام کتاب کی اشاعت کے وقت زندہ تھے ۔ اور آغا صاحب نے دیباچہ میں یہ تحریر بھی کر دیا تھا کہ

"کوئی صاحب کسی واقعہ پر معترض ہوں یا ان کے نزدیک امر واقعہ مختلف ہو تو نشان دہی فرماویں ۔"[1]

یہ بھی اس کتاب کے حقیقی ہونے کی ایک سند ہے ۔

آغا صاحب نے کتاب کے آغاز میں لکھا ہے کہ

"غم و غصہ میرے طرز تحریر میں قلم کی شوخی و رنگینی کے باوجود راہ پیدا کر لیتے ہیں ۔"[2]

اِس میں کوئی شک نہیں کہ اس کتاب میں ایک تلخی کا احساس ضرور ہوتا ہے ۔ لیکن آغا صاحب نے اس تلخی کے اظہار کیلئے جس زبان

---

[1] دیباچہ   [2] موت سے واپسی

کا سہارا لیا ہے۔ وہ کسی جگہ بھی عامیانہ یا سوقیانہ نہیں بلکہ اس غصے کی حالت میں بھی آغا صاحب نے زبان اور الفاظ کو بے توقیر نہیں ہونے دیا۔ بلکہ جس شوخی اور رنگینی کی طرف آغا صاحب نے اشارہ کیا ہے اُس نے اس کتاب کی زبان کو خوبصورت بنانے میں مدد دی ہے۔ لہٰذا یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس کتاب کی زبان ادیبانہ اور لہجہ قلندرانہ ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

شورش کاشمیری

یہ کتاب پہلی بار ستمبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی۔ جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ تھے۔ شاہ جی نے یہ کتاب پڑھ کر جو جملہ کہا وہ عام روایت کے مطابق یہ ہے کہ

"اس کتاب میں سوائے میری تصویر کے اور کیا ہے"[1]

شاہ جی کا یہ جملہ بنیادی طور پر شاہ جی کی اُس تصویر کے چھاپے جانے کے خلاف تھا جو آغا صاحب نے بڑی مشکل سے حاصل کرکے کتاب کے آغاز میں لگا دی تھی شاہ صاحب کی یہ تصویر ان کے کسی عقیدت مند نے بڑے حیلے سے حاصل کی تھی کیونکہ شاہ جی شرعاً تصویر کھچوانے کے خلاف تھے۔ آغا صاحب نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ

"جب کوئی فوٹوگرافر ان کی تصویر لینا چاہے تو چہرے پر رومال ڈال لیں یا ڈانٹ کر بٹھا دیں گے۔ کیا کرتے ہو میاں؟ میری تصویر بنا کر کیا کرو گے؟ میری تصویر میرے افکار ہیں۔ میرے خیالات کو اتار سکتے ہو تو دل میں اتار لو یہ سب سے اچھی تصویر ہو گی۔"[2]

---

[1] یہ روایت راقم الحروف کو جناب اقبال فیروز صاحب نے بتائی جو ایک عرصہ تک چٹان میں لکھتے رہے ہیں۔ اور اسی روایت کا ذکر جناب پروفیسر خالد شبیر احمد مصنف "تاریخ محاسبہ قادیانیت" نے بھی انھی الفاظ میں کیا۔

[2] سید عطاء اللہ شاہ بخاری ص نمبر ۱۹

لہذا یہ کہتے ہوئے کہ اس کتاب میں " سوائے میری تصویر کے اور کیا ہے " وہ آغا صاحب کے تصویر ساز زورِ قلم کی تعریف کر رہے تھے۔ اور اُس تصویر کو خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ جسے پڑھ لینے کے بعد شاہ جی رح کی عکسی تصویر دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاہ جی نے اپنے خطیبانہ انداز میں بے ساختہ یہ جملہ کہا کہ اس کتاب میں سوائے میری تصویر کے اور کیا ہے۔ یعنی اس کتاب کے ہوتے ہوئے کسی عکسی تصویر کی ضرورت نہیں رہتی تو کم فہم مخالفینِ شورش نے یہ مطلب نکالا کہ کتاب میں سوائے شاہ جی کے کیمرے کی تصویر کے اور کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے ایڈیشن میں آغا صاحب نے شاہ جی رح کی وہ تصویر تو رہنے دی جس کے متعلق شاہ جی نے یہ کہا تھا کہ اس کتاب میں سوائے میری تصویر کے اور کیا ہے اور کیمرے کی جس تصویر کو مخالفینِ شورش نے کتاب کا حاصل سمجھا تھا وہ شامل نہ کی۔

اس روایت کو نعیم آسی صاحب نے اس طرح نقل کیا ہے۔

" مستقبل کے مورخ اور سوانح نگار کیلئے مجھے غالباً یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ شاہ جی، آغا شورش مرحوم کی کتاب کے بارہ میں خوش رائے نہیں تھے اُن کے یہ الفاظ بڑے معنی خیز ہیں کہ " اس کتاب میں تصویر میری ہے باقی خود شورش کاشمیری ہیں۔ "[۱]

نعیم آسی صاحب نے بھی اس روایت کو غلط سمجھا ہے۔ انھوں نے بھی تصویر سے مراد کیمرے کی وہ تصویر لی ہے جو کتاب کے آغاز میں شامل ہے۔ اور جس کو شاہ جی رح شرعاً جائز نہیں سمجھتے مگر کیا کسی تصویر سے مصور کو الگ کیا جا سکتا ہے۔ مونا لیزا اگر کوئی عورت تھی تو یہ شبیہ لی ناڈو ڈیونسی نے اس کی تصویر بنائی ہے لیکن یہ شاہکار لی ناڈو ڈیونسی کا ہے۔ مونا لیزا کا نہیں اگرچہ تصویر مونا لیزا کی ہے۔ اسی طرح شاہ جی کے یہ معنی خیز الفاظ آغا صاحب کے اسلوب کا اعتراف ہیں۔ جنھوں نے شاہ جی رح کی تصویر کتاب کی صورت میں پیش کی جس پر شاہ جی رح نے تسلیم کیا کہ " اس کتاب میں تصویر میری ہے " اور " باقی شورش کاشمیری ہیں " سے مراد آغا صاحب کی فنکاری ہے جسے تصویر سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نعیم آسی صاحب ہی نے لکھا ہے کہ

" آغا مرحوم نے شاہ جی سے استفسار کیا شاہ جی نے فرمایا " میں ربیع الاول ۱۳۱۰ھ چاندرات کی پیدائش ہوں مرحوم شورش چاندرات کو چودھویں رات سمجھے اور کتاب میں تاریخ پیدائش

---

۱ مکاتیب امیر شریعت۔ نعیم آسی۔ ص نمبر ۲۰ مسلم اکادمی مجاہد روڈ سیالکوٹ

۱۴ ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ لکھ دی جب شاہ جی نے کتاب دیکھی تو فرمایا بڑا ادیب بنا پھرتا ہے۔
اتنا بھی نہیں جانتا چاند رات کسے کہتے ہیں۔ یکم ربیع الاوّل کو چودہ ربیع الاوّل لکھ دیا ہے۔" یہ
بات آغا مرحوم تک بھی پہنچی اور اگلے ایڈیشن میں انھوں نے اس کی تصحیح کر دی۔"[1]

قطع نظر اس سے کہ یہ سہو آغا صاحب سے کس طرح سرزد ہوا۔ اس سے یہ بات ضرور سامنے آجاتی ہے کہ شاہ جیؒ نے اس سہو یا غلط فہمی یا غلطی کو بُری طرح محسوس کیا۔ اور یہ الفاظ شاہ جیؒ کے غصے یا ناراضگی کی علامت ہیں کہ "بڑا ادیب بنا پھرتا ہے اتنا بھی نہیں جانتا چاند رات کسے کہتے ہیں۔" لیکن جب شاہ جی نے یہ دیکھا ہو کہ سوائے کیمرے کی تصویر کے اس کتاب میں ان کے متعلق اور کچھ بھی نہیں تو پھر ایسی حالت میں تو اس سے بڑھ کر سرزنش ہونی چاہیے تھی۔ جو نہیں ہوئی لہٰذا نعیم آسی صاحب کا یہ کہنا کہ شاہ جی اس کتاب کے بارے میں خوش رائے نہ تھے۔ شاہ جی کے خطیبانہ جملے کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ پھر اگر یہ سب کچھ شورش کاشمیری نے اپنے پاس سے لکھا ہے تو وہ تمام باتیں جو آج بھی شاہ جیؒ کو جاننے والے اور سننے والے بیان کرتے ہیں جھوٹی ہو جاتی ہیں۔ پھر کیا شورش کاشمیری نے شاہ جیؒ کو قریب سے نہیں دیکھا؟ قرابت نہیں رہی؟ فیض نہیں پایا؟ آخر کوئی وجہ تو ہونی چاہیے جس کے لئے خلاف واقعہ باتوں کے سہارے کی ضرورت ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ شاہ جیؒ کا یہ جملہ خطابت کا شاہکار ہے جسے غلط رنگ دیا گیا ہے۔ اگر اس کا مطلب وہی ہے جو نعیم آسی صاحب نے سمجھا تو پھر یہ مبالغے کی انتہا ہے کہ کیمرے کی تصویر کے سوا شاہ جی کے متعلق اور کچھ بھی نہیں حالانکہ آسی صاحب نے جو شاہ جی کا سوانحی خاکہ دیا ہے۔ اس میں انہوں نے خود شورش صاحب کی کتاب سے استفادہ کیا ہے۔ اور ایک دو جگہ اقتباس بھی نقل کئے ہیں۔ اگر یہ کتاب شاہ جی کے متعلق سند نہیں تو ایسا کرنا نعیم آسی صاحب کی بہت بڑی غلطی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ "آغا مرحوم نے شاہ جی سے استفسار کیا۔ شاہ جی نے فرمایا میں ربیع الاوّل ۱۳۱۰ھ کی پیدائش ہوں" تو آغا صاحب نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ وہ خاندانی حالات سواطع الالہام[2] کے اشارات سے فراہم کئے گئے ہیں۔ میں چاہتا تھا شاہ جی کم سے کم اس حصہ ہی کو سن کر تصحیح فرما دیتے لیکن انہوں نے گوارا نہ کیا اور میں نے بھی اصرار

---

[1] مکاتیب امیر شریعت ص نمبر ۲۹/۳۰

[2] شاہ جیؒ کا مجموعہ کلام جو ان کے فرزند سید ابوذر بخاری صاحب نے ترتیب دیا اور شائع کیا

مناسب نہ سمجھا[1]"

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ جی نے اپنی سوانح کے متعلق آغا صاحب سے کوئی تعاون نہیں کیا۔ اور اس پہلے ایڈیشن میں نہ صرف تاریخ پیدائش غلط لکھی گئی ہے بلکہ شاہ جیؒ کے خاندانی حالات مکمل طور پر قلمبند نہیں ہو سکے۔ جس کی بنا پر آغا صاحب کو لکھنا پڑا کہ

"فی الجملہ یہ کوئی مکمل سوانح عمری نہیں کچھ خاکے اور کچھ عکس ہیں[2]۔"

مگر جب یہ کتاب مئی ۱۹۷۸ء کو پھر شائع ہوئی۔ جسے آغا صاحب نے اشاعتِ جدید لکھا ہے اسی میں "نئے سرے کی بات" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

"بحمد اللہ اب کوئی خلا نہیں رہا۔ حتی الامکان سب خلا پورے ہو گئے ہیں۔ شاہ جیؒ کی دختر فرخندہ اختر نے اپنے نامہ گرامی سے خاندانی حالات کی تصحیح فرما دی۔ ان کا خط میری اہلیہ کے نام تھا۔ اب یہ محض خاکے یا عکس نہیں رہے سوانح عمری ہے[3]۔"

گویا خاندانی حالات کے ادھورا ہونے کی وجہ سے یہ سوانح عمری نہیں تھی اور جب خاندانی حالات کی تصحیح ہو گئی تو یہ کتاب سوانح عمری بن گئی۔ جس کا احساس آغا صاحب کو بخوبی تھا۔ اسی لئے انہوں نے پہلی اشاعت میں اسے محض خاکے یا عکس قرار دیا تھا۔ نیز یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ تاریخ پیدائش کی غلطی بھی شاہ جی کی دختر فرخندہ اختر کے گرامی نامہ کی وجہ سے درست ہوئی ہے۔ شاہ جیؒ کے کہنے پر نہیں۔ بہر حال اگر دونوں کتابوں میں دیئے گئے خاندانی حالات کا مقابلہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پہلی اشاعت میں خاندانی حالات کا باب کچھ سقم رکھتا ہے۔ جنہیں اشاعت جدید میں درست کر دیا گیا ہے اور بدلا بھی گیا ہے اور شاہ جی کی علالت اور وفات کا اضافہ بھی اسی باب میں ہوا ہے۔ لیکن جہاں تک کتاب کے دوسرے حصوں کا تعلق ہے حالات و واقعات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی البتہ جدید اشاعت میں زبان درست کی گئی ہے۔ کچھ فقرے چست بنا دیئے ہیں بعض الفاظ

---

[1] سید عطاء اللہ شاہ بخاری — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۱ — بار اوّل

[2] سید عطاء اللہ شاہ بخاری — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۱ — بار اوّل

[3] سید عطاء اللہ شاہ بخاری — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۱ — اشاعتِ جدید

کی جگہ نئے الفاظ رکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں کوئی جملہ کاٹ دیا ہے یا بدل دیا ہے۔ نیز شاہ جیؒ کی وفات کی وجہ سے جدید اشاعت میں ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ جبکہ پہلی اشاعت میں حال کا صیغہ استعمال ہوا تھا۔ یہ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

موازنہ نیا ایڈیشن و پرانا ایڈیشن

	نیا ایڈیشن		پرانا ایڈیشن
صفحہ نمبر ۱۱	مَیں نے ارادہ توڑ ڈالا اور قلم کی ادارتی صحبتوں میں واپس چلا گیا۔	صفحہ نمبر ۱۱	مَیں نے ارادہ توڑ ڈالا اور قلم کی انہی صحبتوں میں واپس چلا گیا جہاں زندگی گزارنے کیلئے تو ہے پر لکھنے کیلئے نہیں۔
صفحہ نمبر ۱۱	ایکا ایکی یہ تمام تقاضے پھر سامنے آ گئے۔	صفحہ نمبر ۱۱	ایکا ایکی پھر اس قسم کے تقاضے سامنے آ گئے۔
صفحہ نمبر ۱۲	جن کے فکر و نظر سے بہت سی راہیں صدیوں کی شب کاری کے باوجود روشن چلی آتی ہیں۔	صفحہ نمبر ۱۲	جن سے فکر و نظر کی بہت سی راہیں صدیوں کی کھینچا تانی کے باوجود روشن ہیں۔
صفحہ نمبر ۱۳	جن کی صورتوں سے ایک ساحرانہ شکوہ کا اظہار ہوتا ہے	صفحہ نمبر ۱۲	جن کی صورتوں سے ایک دلآویز طنطنے کا اظہار ہوتا ہے۔
صفحہ نمبر ۱۳	مشابہ تھا۔		مشابہ ہے۔
صفحہ نمبر ۱۳	اتفاق کہیئے کہ بعض داعی شخصیتیں آپس میں ایک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں مثلاً نبیشا غورث۔ کارل مارکس۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و نظر عقیدہ و ایمان اور علم و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہ تھی لیکن کچھ ایسا بانکپن ضرور تھا کہ ان کا چہرہ مہرہ ہر صفاتی بُعد کے باوجود ایک سا تھا۔ بہر حال یہ ایک شاعرانہ چیز ہے۔ ان بڑوں کی زندگی ایک خاص طرز رکھتی ہے۔	صفحہ نمبر ۱۲	سوال مماثلت کا نہیں فرق مراتب کا بھی نظر آ رہا ہے۔ لیکن ایک عجیب اتفاق ہے کہ بعض داعی شخصیتیں آپس میں ایک گونہ مماثلت ضرور رکھتی ہیں۔ مثلاً فیثا غورث۔ کارل مارکس۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور شاہ جی میں فکر و عمل کی کوئی راہ بھی مشترک نہیں۔ لیکن سنگ تراش کا ایک ایسا بانکپن ضرور ہے۔ جس سے ان کے عمومی خد و خال ہر صفاتی بُعد کے باوجود ایک سے ہیں۔ ان بڑوں کی زندگی ایک خاص چال رکھتی ہے۔
صفحہ نمبر ۱۳	یہ کسی کے نقشِ پا نہیں ڈھونڈتے بلکہ لوگ ان کے	صفحہ نمبر ۱۳	یہ کسی کے نقشِ پا کی تلاش نہیں کرتے بلکہ خود لوگ اُن کے

	نیا ایڈیشن		پرانا ایڈیشن
	نقشِ پا کی تلاش میں رہتے ہیں۔		نقشِ پا کی تلاش میں نکلتے ہیں۔
صفحہ نمبر ۱۰۱	ظاہر ہے کہ ایک روحانی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے اس میں سرے سے ادق عبارتیں ہوتی ہی نہیں۔	صفحہ نمبر ۱۰۱	ظاہر ہے کہ ایک روحانی آدمی کی زندگی کھلی کتاب ہوتی ہے۔ اس میں ادق عبارتیں سرے سے ناپید ہوتی ہیں۔
صفحہ نمبر ۱۰۱	وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا ایک یادگار دور تھا۔	صفحہ نمبر ۱۵۱	اور وہ زمانہ اپنی بوقلمونیوں کے باعث تاریخ کا یادگار حصہ تھا۔
صفحہ نمبر ۱۵۱	اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش نہ کی تھی	صفحہ نمبر ۱۵۱	اور شاہ جی نے اپنے کو دیکھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔
صفحہ نمبر ۱۵۱	مولانا کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہ کر پاتے تھے۔	صفحہ نمبر ۱۵۱	مولانا کتابوں کی رفاقت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کرتے۔
صفحہ نمبر ۱۵۱	ہر روز ایک نیا سانحہ۔	صفحہ نمبر ۱۵۱	ہر دن ایک نیا سانحہ۔
صفحہ نمبر ۱۵۱	جو منظاہرے اور مجاہرے کے تھے۔		جو منظاہرے اور مجاہرے برپا کئے تھے۔
صفحہ نمبر ۱۶۱	ان جلوسوں میں زبان طیش کی ساری خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔	صفحہ نمبر ۱۶۱	ان جلوسوں میں زبان خلق کی ساری خصوصیتیں جمع ہو گئی تھیں۔
صفحہ نمبر ۱۶۱	شورش ـــــ مجھے نظر آ رہا ہے۔	صفحہ نمبر ۱۶۱	شورش ـــــ مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔
صفحہ نمبر ۱۶۱	عقل سپر انداز ہونے سے انکار کرتی ہم کہتے شاہ جی! حالات اتنے خراب نہیں۔	صفحہ نمبر ۱۶۱	عقل سپر انداز ہونے سے انکار کرتی "جی نہیں شاہ جی حالات ابھی اتنے خراب نہیں۔
صفحہ نمبر ۱۷۱	بظاہر یہ باتیں بے وزن تھیں۔	صفحہ نمبر ۱۸۱	عام حالات میں یہ باتیں بے وزن تھیں۔
صفحہ نمبر ۱۷۱	انہوں نے سیاست میں وافر حصہ لیا۔ لیکن اپنی مرضی سے کم دوسروں کی مرضی سے زیادہ۔	صفحہ نمبر ۱۸۱	انہوں نے سیاست میں حصہ لیا۔ لیکن اپنی مرضی سے نہیں دوسروں کی مرضی سے۔
صفحہ نمبر ۱۸۱	ایسی کوئی ترغیب یا تحریص انہیں بہلا یا پھسلا نہ سکی۔	صفحہ نمبر ۱۸۱	ایسی کوئی ترغیب یا تحریص انہیں بے راہ نہیں کر سکی۔

ص نمبر	نیا ایڈیشن	ص نمبر	پرانا ایڈیشن
ص نمبر ۱۹	بیان بازی سے ہمیشہ گریز کیا۔	ص نمبر ۲۰	بیان بازی سے گریزاں ہی رہے۔
ص نمبر ۱۹	جب نامہ نگاروں نے گھیرا دامن چھڑا لیا۔ تمام عمر کسی عنوان سے اخبارات میں کوئی بیان نہ دیا۔	ص نمبر ۲۰	جب نامہ نگاروں نے گھیرا فرو ہو گئے۔ ان تیس پینتیس برس میں انہوں نے اخبارات میں کسی عنوان سے کبھی کوئی بیان نہیں دیا۔
ص نمبر ۲۰	شاہ جی کنی کترا کے نکل جاتے۔	ص نمبر ۲۰	شاہ جی دامن بچا رہے ہیں۔
ص نمبر ۲۰	اخبار نویس کہتا ہے! شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟	ص نمبر ۲۱	اخبار نویس: شاہ جی عالمی وفاق کا قیام ممکن ہے؟
ص نمبر ۲۱	عرب از خود قاہرہ ہمیشہ کیلئے اسلام کا شہر ہو گیا لیکن دہلی مسلمانوں کی طویل حکمرانی کے باوجود اس شرف سے محروم رہا۔ وہ اسلام کی اصل زبان ہی سے نا آشنا تھے فارسی کو مسلمان ہونے میں دیر لگی لیکن قبول اسلام کے باوجود اس میں عجمی رنگ برقرار رہا۔	ص نمبر ۲۱	نتیجہ معلوم کہ قاہرہ ہمیشہ کے لئے اسلام کا شہر ہو گیا اور دہلی اس شرف سے محروم ہی رہا۔ وہ اسلام کی اصل زبان سے بھی نا آشنا تھے۔ خود فارسی کو مسلمان ہونے میں دیر لگی اور قبول اسلام کے باوجود اس میں عجمی رنگ برقرار رہا۔
ص نمبر ۲۲	بس اِس پر بگڑ گئے۔	ص نمبر ۲۴	بس اس پر بگڑ بیٹھے۔
ص نمبر ۲۲	شاہ جی اِس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر نکتہ چینی کرتے۔	ص نمبر ۲۴	شاہ جی اس تحریک یا جماعت کے داعیوں پر غضب ناک ہو کر لپکتے ہیں۔
ص نمبر ۲۲	عالم اشتمالی نوجوانوں کو گمراہ مگر مخلص خیال کرتے۔	ص نمبر ۲۴	عام اشتمالی نوجوانوں کو وہ گمراہ مخلص خیال کرتے ہیں
ص نمبر ۲۳	فرماتے زمینیں خدا کی ملکیت ہیں۔	ص نمبر ۲۴	اُن کے نزدیک زمینیں خدا کی ملکیت ہیں۔

	نیا ایڈیشن		پرانا ایڈیشن
ص نمبر ۲۴	غرض شاہ جی بعض عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ تھے - ان کی باتیں اکثر و بیشتر حقائق پر منتج ہوتیں - جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوتے تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہ بیٹھتیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس طرح صورت پذیر ہوتیں کہ لوگوں کو شاہ جی کے ملہم ہونے کا گمان ہوتا - ان کی قلندرانہ شوخیاں اکثر و بیشتر حقائق پر منتج ہوتیں - یہ درویشی جس سے سیاست کو دور کی نسبت بھی نہ تھی -	ص نمبر ۲۵	شاہ صاحب عجیب و غریب خصوصیتوں کا مجموعہ ہیں ان کی باتیں جب وہ کسی تحریک کے افکار و حالات پر گفتگو کر رہے ہوں تو سیاسی ترازو میں ٹھیک نہیں بیٹھتی ہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس طرح صورت پذیر ہوتی ہیں کہ لوگوں کو ان کے ملہم ہونے کا گمان ہوتا ہے - بظاہر ان باتوں میں عقلی بندشیں سست ہوتی ہیں - لیکن قلندرانہ شوخیاں حرف حرف سے پھٹی پڑتی ہیں ان کی یہ درویشی جس سے سیاست کو دور کی نسبت بھی نہیں -
ص نمبر ۲۵	مجھے دیکھو سخن متروکہ ہو گیا ہوں -	ص نمبر ۲۶	مجھے دیکھو حرف معطل ہو گیا ہوں -
ص نمبر ۲۵	عمر بھر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے رہے لیکن ان دنوں وہ التزام بھی ٹوٹ چکا تھا -	ص نمبر ۲۶	عام طور پر ایک ہندو اور ایک مسلمان اخبار پڑھتے تھے - لیکن اب وہ التزام بھی ٹوٹ چکا ہے -
ص نمبر ۲۵	کوئی نئی کتاب ہاتھ آگئی تو جب تک پڑھ نہ لی شریک سفر رہی -	ص نمبر ۲۶	کوئی نئی کتاب مل جائے تو جب تک پڑھ نہ لیں ساتھ ہی رکھتے ہیں -
ص نمبر ۲۵	۲۵ - ۲۶ برس بعد ملے تو فرمایا -	ص نمبر ۲۷	دس بارہ برس بعد ملے تو فرمایا -
ص نمبر ۲۵	شاہ جی سنا کر آپ	ص نمبر ۲۷	شاہ جی کوئی کہہ رہا تھا -
ص نمبر ۲۶	شاہ جی نے قہقہہ لگایا مولانا نے تبسم فرمایا اور بات ہوا ہو گئی -		یہ جملے پرانے ایڈیشن میں سرے سے نہیں ہیں -
ص نمبر ۲۶	انہیں بلھے شاہ کی کافیاں اور بابا فرید کا کلام بھی	ص نمبر ۲۷	اب لے دے کے بلھے شاہ کی کافیاں یاد ہیں بابا فرید

ص نمبر	نیا ایڈیشن	ص نمبر	پرانا ایڈیشن
[illegible]	خوب یاد تھا۔ بابا فرید کی زبان دو ضلعی ہے۔	[illegible]	کا کلام اور بھی جستہ جستہ جس زبان میں بابا فرید شعر کہتے ہیں وہ دو ضلعی زبان ہے۔
ص نمبر ۲۶	ان کے ساتھ حکام اور عوام نے ایک سا برتاؤ کیا۔	ص نمبر ۲۸	ان کے ساتھ حکام اور عوام نے یکساں برتاؤ کیا۔
ص نمبر ۲۶	ان کے بھی اکبر الہ آبادی کی طرح احتجاجی لیکن منفی جذبات تھے۔	ص نمبر ۲۸	ان کے ہاں بھی اکبر الہ آبادی کے سے احتجاجی لیکن منفی جذبات ہیں۔
ص نمبر ۲۷	نتیجتہً شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ فرماتے کہ قاسم نانوتوی اور محمود الحسن رحمہم اللہ تعالیٰ نے جو راستہ دکھایا ہے۔ آخرت کی فکر میں اسی پر چل رہا ہوں۔	ص نمبر ۲۸	نتیجہ یہ نکلا کہ شاہ جی آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑے۔ ان کا کہنا ہے کہ قاسم نانوتوی اور محمود الحسن رحمہما اللہ تعالیٰ نے ایک راستہ دکھایا تھا۔ میں تو توشۂ آخرت کے لئے اسی پر چل رہا ہوں۔
ص نمبر ۲۷	ایک دوست نے دریافت کیا۔	ص نمبر ۲۹	ایک دوست نے اُن سے سوال کیا۔
ص نمبر ۲۸	اور جن میں "پیچ و تابِ رازی" اور "سوز و سازِ رومی" کی شدت پائی جاتی ہے۔	ص نمبر ۳۰	اور جن میں "پیچ و تاب رازی" کے بجائے "سوز و ساز رومی" کی شدت مضمر ہے۔
ص نمبر ۲۹	جس خیال کو شاہ جی کے ہاں قریب قریب عقیدہ کا درجہ حاصل تھا۔	ص نمبر ۳۰، ۳۱	جس خیال کو شاہ جی کے ہاں محض عقیدے کا درجہ حاصل ہے۔
ص نمبر ۲۹	کچھ اور باتیں خاص طور پر نمایاں تھیں۔	ص نمبر ۳۱	بعض دوسری باتیں خاص طور پر نمایاں ہیں۔
ص نمبر ۲۹	ان سانحات کو قرآن و حدیث کا رنگ و روغن دے کر اس طرح بیان کرتے۔	ص نمبر ۳۱	ان سانحات کو قرآن و حدیث سے اس طرح نکھارتے ہیں۔
ص نمبر ۳۰	اپنے تئیں ہر روز پڑھ لیتا ہوں۔	ص نمبر ۳۳	ہر روز اپنے کو پڑھ لیتا ہوں۔
ص نمبر ۳۰	بہرحال شاہ جی اِس طرح ایک تاریخ ہو جائے گی۔	ص نمبر ۳۳	شاہ جی اس طرح بہرحال ایک تاریخ ہو جائے گی۔

	نیا ایڈیشن		پرانا ایڈیشن
ص نمبر ۳۰	پہلے ہی لوگوں نے تاریخ سے کون سا سبق لیا ہے۔	ص نمبر ۳۴	پہلے ہی لوگوں نے تاریخ کے کس حصے سے سبق لیا ہے۔
ص نمبر ۳۱	افسوس میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں بنجر ہو چکی تھیں ——— جن کے ضمیر قتل ہو چکے تھے۔	ص نمبر ۳۴	میں نے ان لوگوں میں معروفات کا بیج بویا جن کی زمینیں ہمیشہ کے لئے بنجر ہو چکی تھیں ——— جن کے ضمیر عاجز آ چکے ہیں۔
ص نمبر ۳۲	اور اس آزردگی کے آثار آخر عمر میں ان کے چہرے پر آ گئے تھے۔	ص نمبر ۳۴	حتیٰ کہ اِس آزردگی کے آثار اب اُن کے چہرے سے بھی عیاں ہیں۔
ص نمبر ۳۲	مفلس کا چراغ ہو جانا۔	ص نمبر ۳۵	مفلس کا چراغ معلوم ہو۔
ص نمبر ۳۳	غرض ہر نگر کی بولی ٹھولی نوک زبان تھی۔	ص نمبر ۳۵	ہر ضلع کی بولی نوک زبان ہے۔
ص نمبر ۳۳	راجندر بابو نے گاندھی جی کے سوانح عمری کے دیباچے میں لکھا ہے۔	ص نمبر ۳۵	یاد نہیں رہا کون؟ لیکن ایک مصنف نے اپنے ممدوح کی سوانح عمری کے دیباچے میں لکھا ہے۔

اِس کے بعد خاندانی حالات کا باب ہے جس میں واضح تبدیلی کی گئی ہے۔ "قید و بند" کے باب میں آٹھ دس مقام پر الفاظ کا معمولی ردوبدل ہے۔ یہی حال اگلے ابواب کا بھی ہے۔ تمام کتاب میں صرف زبان کو بہتر بنایا گیا ہے۔

	نیا ایڈیشن		پرانا ایڈیشن
ص نمبر ۹۳	احرار کی تاریخ نصف رہ جاتی ہے۔	ص نمبر ۷۹	احرار اضافی ہو جاتے ہیں۔
ص نمبر ۹۴	احرار کے متعدد بڑے رہنماؤں کا نام ہندوستان کے ہر گوشہ تک پہنچا۔	ص نمبر ۸۰	احرار کے ایک دو بڑے رہنماؤں کا نام ہندوستان کے ہر گوشہ تک پہنچا۔
ص نمبر ۹۴	بد اجمان تھے۔	ص نمبر ۸۰	نظر آتے ہیں۔
ص نمبر ۹۴	صدا الصحرا تھے۔	ص نمبر ۸۰	وہ اجنبی ہی رہے۔
ص نمبر ۹۵	پنجابی عوام سے بڑے بڑے فوائد حاصل کئے۔	ص نمبر ۸۱	یہاں کے لوگوں سے بڑے بڑے فوائد حاصل کئے۔

ص نمبر	نیا ایڈیشن	ص نمبر	پرانا ایڈیشن
ص نمبر ۹۴،۹۵	غرض برطانوی ہندوستان کی غلامی کو برقرار رکھنے کے لئے۔		یہ جملہ پرانے ایڈیشن میں نہیں ہے۔
ص نمبر ۹۵	کسی آزاد خیال سیاسی تنظیم یا سیاسی تحریک کا وجود ہی گوارا نہ تھا۔	ص نمبر ۸۱	کسی ایسی سیاسی تنظیم یا سیاسی تحریک کا وجود بھی گوارا نہ تھا۔
ص نمبر ۹۵	عقدہ سرگوں نہ ہوگیا۔	ص نمبر ۸۲	عقدہ "تکون" ہوگیا۔
ص نمبر ۹۵	تحریک خلافت کے ٹھنڈا ہوتے ہی	ص نمبر ۸۲	تحریک خلافت کے بعد۔
ص نمبر ۹۷	جو مہرے کام کر رہے تھے وہ نہایت درجہ خطرناک تھے۔	ص نمبر ۸۲	جو مہرے کام کر رہے تھے وہ راون کے بارہ سروں کی طرح تھے۔
ص نمبر ۹۶	عام لوگوں کو علم سے محروم رکھنے کے لئے بر الطائف الحیل تعلیمی دروازہ بند رکھے گئے۔	ص نمبر ۸۲	عام لوگوں کو تعلیم سے محروم رکھنے کے لئے بطور خاص اکثر دروازے بند رکھے گئے۔
ص نمبر ۹۷	مُلّا کا دین فی سبیل اللہ فساد بنادیا۔	ص نمبر ۸۲	مُلّا کا دین فی سبیل اللہ بنادیا۔
ص نمبر ۱۹۵	شاہ جی اور خطابت یارِ غار تھے۔	ص نمبر ۱۸۱	شاہ جی اور خطابت ہم نشین ہیں۔
ص نمبر ۱۹۶	یہ فقرہ نئے ایڈیشن میں شامل نہیں ہے۔	ص نمبر ۱۸۲	تو بتیس برس ایک عام پاکستانی یا عام ہندوستانی کی اوسط عمر کا سوایا ہے۔
ص نمبر ۱۹۷	نئے ایڈیشن میں یہ فقرہ موجود نہیں ہے۔	ص نمبر ۱۸۲	گویا آپ کی شخصیت کو اجالنے میں قیادت اور خطابت باہم گھتے گئے تھے۔
ص نمبر ۱۹۸	علامہ ابن رشد کے متعلق روایت ہے۔	ص نمبر ۱۸۵	ابن تیمیہ کے متعلق روایت ہے۔

جدید اشاعت میں خاندانی حالات کے علاوہ کوئی اہم تبدیلی نہیں ہے ۔ حالات و واقعات من وعن پہلی اشاعت والے درج ہوئے ہیں ۔ جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ حالات و واقعات مستند ہیں ۔ اس کے علاوہ اشاعت جدید میں تحریک ختم نبوت (سنہ ۱۹۵۳ء) "احرار کی تحریکیں" اور "چند یادیں" کے عنوان سے تین ابواب کا اضافہ ہوا ہے ۔ جس سے کتاب کی ضخامت ۲۹۸ صفحات ہوگئی ہے ۔ جب کہ پہلی اشاعت ۲۰۲ صفحات پر مشتمل ہے ۔ اس اضافے نے شاہ جی کے سوانحی حالات کو مکمل کر دیا ہے ۔

آغا شورش کاشمیری نے اس کتاب میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے حوالے سے جن موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اُن میں خطابت قید و بند ۔ مرزائیت اور مجلس احرار شامل ہیں ان میں سے کوئی موضوع بھی ایسا نہیں جس کے متعلق آغا شورش کاشمیری کو ذاتی علم اور تجربہ نہ ہو ۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ خود آغا صاحب کی زندگی ان ہی موضوعات کا حاصل تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ان موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے ۔ شاہ جی کی زندگی کا سب سے بڑا کمال اُن کی خطابت ہے ۔ اور آغا صاحب نے "لاثانی خطیب" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف شاہ جی کے خطابتی معرکوں تک محدود نہیں بلکہ انہوں نے اس موضوع پر عالمانہ نظر ڈالی ہے اور فن خطابت کے اسرار و رموز بھی زیر بحث لائے ہیں ۔ آغا صاحب نے شاہ جیؒ کی بہت سی تقریریں نقل نہیں کیں ۔ صرف ایک دو اقتباس دیئے ہیں ۔ جن میں شاہ جیؒ کی خطابت کے کمال کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے مثلاً شاہ جی کی تقریر کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جو خطابت کا شاہکار ہے ۔ اور جسے سننے کے بعد غازی علم الدین شہید نے راج پال کو قتل کر دیا تھا ۔

> "آج آپ لوگ جناب فخر رسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے عزت و ناموس کو برقرار رکھنے کیلئے جمع ہوئے ہیں ۔ آج جنس انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے ۔ آج اس جلیل المرتبت ہستی کا ناموس معرض خطر میں ہے ۔ جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے ۔
> آج مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی کے دروازے پر اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ آئیں اور فرمایا ۔ ہم تمہاری مائیں ہیں ۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ؟ کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں ــــــ ارے دیکھو ام المومنین عائشہ صدیقہؓ دروازے پر تو کھڑی نہیں ؟ یہ جملہ اس جلال و غضب سے ادا کیا کہ حاضرین کی نگاہیں بے ساختہ دروازے کی طرف اٹھ گئیں ، ایکا ایکی کہرام مچ گیا ، مسلمان دھاڑیں مار مار کر رونے لگے ۔

تمہاری محبت کا تو یہ عالم ہے کہ عام حالتوں میں کٹ مرتے ہو تمہیں معلوم نہیں کہ آج گنبد خضریٰ میں
رسول اللہؐ تڑپ رہے ہیں، آج خدیجہؓ و عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ تمہارے دلوں میں
امہات المومنین کی کوئی جگہ ہے؟ سنو ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کیا کہہ رہی ہیں۔ ہاں ہاں
سنو، وہی عائشہؓ جنہیں رسول اللہ حمیرا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ جنہوں نے سید عالمؐ کو وصال
کے وقت مسواک چبا کر دی تھی اگر تم خدیجہؓ و عائشہؓ کے ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو یہ
کچھ کم فخر کی بات نہ ہوگی[1]؎

آغا صاحب نے خطابت کے علاوہ تحریک ختم نبوت اور مرزائیت پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہاں پر استدلال اور حوالوں سے اپنی بات کو موثر بنایا ہے۔ اور مجلس احرار کی تو مختصر تاریخ لکھ دی ہے۔ جدید اشاعت میں آغا صاحب نے زبان کی جس کانٹ چھانٹ سے کام لیا ہے۔ اُس سے کتاب کی "ادبی حیثیت" میں اضافہ ہوا ہے۔ زبان کے اعتبار سے اِس کتاب میں اب کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ اِس طرح آغا صاحب نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وہ تصویر بنائی ہے جس کا مقابلہ خود شاہ جیؒ نے اپنی کیمرے سے بنائی تصویر کے ساتھ کیا اور فیصلہ دیا کہ اِس قلمی تصویر کے ہوتے ہوئے کیمرے کی تصویر کی ضرورت نہیں۔
برصغیر پاک و ہند کی تاریخ و سیاست کے پاکستانی طالب علم کی شاہ جی کے متعلق خواہ کچھ بھی رائے ہو لیکن زبان و بیان کی قوت کو سمجھنے والا کوئی بھی شخص شاہ جیؒ کی خطیبانہ عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور اردو زبان کے اِس عظیم المرتبت خطیب کی زندگی کے بارے میں جو صاحب علم بھی کچھ جاننا چاہتا ہے اُس کیلئے آغا صاحب کی تصنیف سے زیادہ مستند اور شگفتہ و شاداب ماخذ کی کوئی کتاب نہیں۔ یہ وہ کتاب ہے جس کی تحریر کی زنجیر میں اُس مردِ آزادی کی تصویر نظر آتی ہے۔

شاہ جی پر اُن کے عقیدت مندوں نے جو چند کتابیں تصنیف کی ہیں وہ زبان کے اعتبار سے غیر معیاری۔ خیال کے اعتبار سے ناپختہ اور حالات و واقعات کے اعتبار سے جانبدارانہ اور یک طرفہ ہیں۔ شورش کاشمیری اپنی کتاب میں وہ صاحب قلم نظر آتا ہے جو عقیدت کے جوش میں غیر جانبداری کے دامن کو آلودہ نہیں کرتا اور اپنے ممدوح کو اُس کے بلند مرتبے پر رکھنے کے باوجود اُس کو آسمانی مخلوق بنا کر پیش نہیں کرتا۔ اُس کا قلم ادیب کا قلم ہے لیکن وہ سیاسی واقعات سے بے خبر نہیں اور سیاسی دھارے کا رخ پہچاننے کے باوجود اُس کے ساتھ بہنے کی بجائے اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔

صفحہ ٢١١ / ٢١٢

ظفر علی خان

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی جو ۲۳۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کا ابتدائیہ پروفیسر سرور نے لکھا ہے۔ انتساب مشہور صحافی جناب حمید نظامی کے نام ہے۔ ابتدائیہ سے پہلے مولانا ظفر علی خان کا یہ شعر درج ہوا ہے کہ ؎

شورش سے مرا رشتہ ہے اور وہ ازلی ہے
میں وقت کا رستم ہوں وہ ہے ثانیٔ سہراب

اس کتاب کو آغا صاحب کی دوسری کتاب "قید فرنگ" کے ساتھ ملا کر پڑھنا چاہیئے کیونکہ مولانا ظفر علی خان کی زندگی کا ایک بڑا حصہ قید و بند میں گزرا ہے۔ جسے آغا صاحب نے "قید فرنگ" کے نام سے ترتیب دیا ہے۔ اگر ان دونوں کتابوں کو ملا دیا جائے تو مولانا ظفر علی خان کی زندگی کے اہم پہلوؤں کا احاطہ ہو جاتا ہے۔ رزم گاہ ہندوستان کے رستمِ حریت کی یہ کہانی بیشۂ حریت کے سہرابِ ثانی نے لکھی ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے یہ رستم و سہراب بھی بہادری۔ جرات اور دشمن سے ٹکرانے کی ویسی ہی طاقت رکھتے تھے۔ جیسی کہ فردوسی کے رستم و سہراب۔ ہندوستان کے اس رستم کا نام ظفر علی خان اور سہرابِ ثانی شورش کاشمیری ہیں۔ فردوسی کے رستم و سہراب باپ اور بیٹا تھے۔ لیکن ہندوستان کے یہ رستم و سہراب استاد اور شاگرد تھے اور حقیقت یہ ہے کہ اختر علی خان میں باپ کی جو صفات پیدا نہ ہو سکیں وہ صفات ہمیں شورش کاشمیری میں نظر آتی ہیں۔ بیٹا اگر باپ کے اوصاف کی تصویر ہوتا ہے تو پورے ہندوستان میں ہمیں ظفر علی خان کا ایک ہی معنوی فرزند نظر آیا ہے۔ جس کا نام اختر علی خان نہیں شورش کاشمیری ہے۔

ایک بیٹے سے زیادہ اپنے باپ کے اوصاف۔ تضاد۔ خوبیوں۔ خامیوں۔ کردار۔ افکار۔ افعال اور اعمال سے اور کون واقف ہو سکتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان کی سیاست۔ صحافت۔ خطابت۔ ادب اور شاعرانہ زندگی سے شورش کاشمیری کی یہی واقفیت اس کہانی کا حصہ ہے۔ جسے آغا صاحب نے خود باقاعدہ سوانح عمری سے زیادہ کہانی کہنا پسند کیا ہے[1]۔ جس میں سوانح عمری کے خطوط[2] بھی ہیں۔ اس کتاب کا محرک مولانا ظفر علی خان کی گمنام

---

[1] بحوالہ ظفر علی خان   شورش کاشمیری   ص نمبر ۱۵

موت ہے۔ آغا صاحب کو اس بات کا قلق تھا کہ زندگی میں مولانا ظفر علی خان نے جو شہرت اور ناموری پائی موت کے بعد اُسے فراموش کر دیا گیا۔ جس کی بڑی وجہ آغا صاحب کے نزدیک عوام سے زیادہ حکام کی غفلت ہے۔

آغا صاحب نے جس خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ مولانا ظفر علی خان کی زندگی کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ واقعتاً مولانا ظفر علی خان خاص طور پر پنجاب اور اس کے بعد ہندوستان کے عظیم رہنماؤں میں سے ایک عظیم رہنما تھے۔ جن کی صحافت، خطابت، بدیع گوئی اور تبحر علمی سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ آغا صاحب نے مولانا کی شخصیت کا مجموعی تاثر یہ دیا ہے کہ

"ہندوستان کے پنجابی راہنماؤں میں سرفہرست مجموعہ اضداد اور جامع صفات ایک زندگی میں کئی زندگیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ ادیب، شاعر، خطیب، صحافی اور سیاسی ان کا وجود برصغیر کی ملی جدّوجہد کی تاریخ بنتا گیا۔ ہرچند اس تاریخ میں عجیب سا تضاد ہے اور ظفر علی خان اس تضاد کا ایک شدید مظہر تھے لیکن زمانے کے احوال و ظروف سے ملا کر اُن کی شخصیت کو پرکھیں تو اس تضاد میں بھی ایک ایسی دلکشی نظر آتی ہے۔ جس میں ادب کی فرزانگی اور سیاست کی دیوانگی یکساں ہیں۔ اُن کا ادب ان کی زندگی کا عکس تھا اور اُن کی زندگی ان کی سیاست کا ملبہ۔ ان دونوں کے امتزاج سے ایک ایسا وجود ابھرتا گیا جس میں مصوری تھوڑی اور سنگتراشی زیادہ تھی۔ وہ سرتاپا ہنگامہ تھے۔ ظاہر ہے کہ ہنگامے میں حکائتیں شاذ اور شکائتیں وافر ہوتی ہیں اس نصف صدی کی سیاسی اور ادبی تاریخ کا کوئی سا نقشہ ایسا نہیں جس میں اُن کا خط نہ ہو ــــ وہ محض خط ہی نہیں رنگ بھی تھے، کہیں مدھم کہیں شوخ۔ غرض وہ ایک ایسی تصویر تھے جس میں بوقلمونی ہی بوقلمونی ہو"[1]

لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ ہی اختلافی شخصیت رہے جس کی سب سے بڑی وجہ مولانا ظفر علی خان کی طبیعت

---

[1] ظفر علی خان شورش کاشمیری ص نمبر ۵۷/۵۸

کا تلوّن تھا۔ مولانا ظفر علی خان پر لکھی جانے والی کتابوں اور مضامین میں مولانا کے مزاج کا یہ جھول اکثر زیر بحث آیا ہے۔ خاص طور پر اُن کی طنز نگاری اور ہجو گوئی نے اس بات کو اور بھی تقویت دی ہے کہ مولانا خدا جانے کب کس کے خلاف کیا لکھ دیں گے۔ آغا صاحب نے مولانا ظفر علی خان کے اس تضاد کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"کبھی موڑ پر بھی وہ "سچی" بات کہنے سے رُکے نہیں جو ان کے خامہ عنبر شامہ کی زد میں آ گیا مارا گیا۔ بظاہر اس پر حیرت ہوتی ہے کہ آج جس شخص کی تعریف کی ہے کل اسی شخص کی ہجو لکھ رہے ہیں لیکن یہ تضاد اصلاً ان کا اپنا تضاد نہیں معاشرے کا تضاد ہے وہ ایک مصوّر ہیں جن لوگوں کی منفی و مثبت تصویریں بناتے ہیں وہ معناً انہی کے خد و خال کی تصویریں ہوتی ہیں وہ افراد کی ذات کے نہیں بلکہ ان رنگا رنگ افعال کے نقاد ہیں"[1]

آغا صاحب نے اس تضاد کو معاشرے کا تضاد کہا ہے۔ اگر مولانا ظفر علی خان اور ان کی سیاسی۔ صحافتی اور ادبی زندگی کا مطالعہ ہندوستان کے پُر آشوب ماحول میں کیا جائے تو یہ بات غلط معلوم نہیں ہوتی اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا ظفر علی خان کے سیمابی مزاج اور جذباتی طبیعت نے اس تضاد کو کچھ زیادہ ہی نمایاں کر دیا ہے۔ شعر کا تعلق چونکہ جذبات سے ہے لہذا یہ تضاد بھی زیادہ تر مولانا کی شاعری ہی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ آغا صاحب نے اس حقیقت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

"مولانا کی شاعری کا سارا مدار اس پر ہے کہ ان کے ہاں خیالات کی گہرائی کے بجائے جذبات کی گیرائی ہے۔ وہ سیاسی معاملہ بندی اور حربی تصویر کشی میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ کوئی واقعہ پیش آ گیا تصویر کھینچ لی کوئی سانحہ دیکھا، عکس لے لیا۔ کسی سے بگاڑ ہو گیا اس کا حلیہ بگاڑ ڈالا کسی سے لگاؤ پیدا ہوا تو اس کو سجا دیا، ادھر سے ادھر، یہاں سے وہاں میمنہ و میسرہ سے بے نیاز، ہراول دستہ کی طرح حریفوں کو للکارتے بڑھے چلے جاتے ہیں"[2]

۱۔ ظفر علی خان — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۲۵/۱۲۶

۲۔ ایضاً — ص نمبر ۱۲۹

اس کتاب میں آغا صاحب نے مولانا کی صحافت۔ سیاست۔ نثر نگاری اور نعتیہ شاعری پر بڑے وقیع تبصرے کئے ہیں لیکن سب سے زیادہ توجہ مولانا کی ہجویہ۔ مزاحیہ اور طنزیہ شاعری پر دی ہے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب لکھتے ہیں کہ

"ان کی طنزوں نے اس طبقے کی عزت مٹی میں ملا دی جس کا طنطنہ ہمارے روگی معاشرے کو محیط تھا۔ ان کی طنزوں میں بسا اوقات واضح دشنام بھی ملتی ہے لیکن انہوں نے جس کو "گالی" دی اس کو بسا اوقات گالی بنا ڈالا۔ مثلاً ان کا یہ شعر کسی متعین فرد یا متعین جماعت پر بالواسطہ حملہ نہیں لیکن ایک خاص تحریک یا عہد پر بھرپور وار ہے، کھلی گالی اور اس خوبصورتی سے آکر جمی ہے کہ دشنام میں بھی حسن پیدا ہو گیا ہے۔

تہذیب نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرامزادی کا حلیہ بگاڑ دے" [1]

مولانا ظفر علی خان کی طنز اور ہجو کا نشانہ بطور خاص یہ افراد اور جماعتیں ہیں۔

"ان کے معتوبین اور مغضوبین میں قادیانی جماعت اور برطانوی حکومت سرفہرست ہیں اور مجروحین و مفتوحین میں علماء سو، جعلی پیر، نقلی صوفی، سیاسی مخالف، سنگھٹنی مہاشے اور وہ اخباری معاصرین ہیں جن سے اکثر و بیشتر ان کی نوک جھونک رہی ہے" [2]

اس کے بعد آغا صاحب نے مولانا ظفر علی خان کے کلام سے مثالیں دی ہیں کہ مولانا نے کس جماعت کو، کن افراد کو اور کن واقعات کو طنز یہ ہجو گوئی کا نشانہ بنایا ہے یا مدح سرائی کی ہے۔ آغا صاحب مولانا ظفر علی خان کی ان نظموں کا پس منظر بیان کرنے کے بعد جب مولانا کے وہ اشعار نقل کرتے ہیں تو مولانا ظفر علی خان کی ان نظموں کا نہ صرف مطلب سمجھ میں آجاتا ہے بلکہ حالات و واقعات کے مرقعے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا ظفر علی خان کی شاعری کا یہ حصہ وقتی تھا کیونکہ کسی خاص واقعے پر کہے گئے اشعار اس واقعے کے گذر جانے

۱۔ ظفر علی خان — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۵۲/۱۵۲

۲۔ ایضاً — ص نمبر ۱۵۵

کے بعد بے اثر ہو جاتے ہیں یا ایسے آدمی کیلئے ضرور بے اثر ہوتے ہیں۔ جیسے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ اشعار کس موقع پر کہے گئے ہیں۔ مولانا کی صحافتی زندگی میں اُن کا واسطہ اکثر و بیشتر روزمرہ کے حالات و واقعات ہی سے پڑتا تھا۔ لہٰذا مولانا نے ایسے ہی واقعات اور حالات پر اشعار کہے ہیں۔ صحافی کا ویسے بھی زود نویس ہونا بڑا ضروری ہوتا ہے مگر مولانا زود نویسی کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجہ کے بدیع گو شاعر بھی تھے بقول آغا صاحب

"جتنی مدت میں وہ حُقّہ کا کش کھینچتے اتنی ہی مدت میں کھٹ سے شعر کہہ دیتے بسا اوقات یہ کہنا مشکل ہو جاتا کہ حُقّہ کا کش پہلے کھینچا ہے یا شعر پہلے موزوں ہوا ہے"[۱]

تو ایسے کہے گئے اشعار کا وقتی اور عارضی ہونا کوئی بری بات نہیں بلکہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ لیکن آغا صاحب چونکہ حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علی خان کی شاعری سے بھی واقف تھے لہٰذا انہوں نے ان نظموں کو حالات و واقعات کا پس منظر عطا کر کے ان نظموں کی عارضی حیثیت کو تاریخی اور مستقل حیثیت عطا کر دی ہے۔ آغا شورش کاشمیری نہ صرف مولانا کے ہم عصر ہیں بلکہ بقول پروفیسر محمد سرور

"مولانا مرحوم اور شورش صاحب میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔ جبلّی وہ بھی اور اکتسابی بھی"[۲]

اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے شورش صاحب، مولانا ظفر علی خان سے گہری عقیدت اور محبت رکھتے ہیں۔ آغا صاحب، مولانا ظفر علی خان کی جماعت "اتحادِ ملت" سے الگ ہو کر احرار میں ضرور شامل ہو گئے تھے مگر مولانا ظفر علی خان سے اُن کا ذہنی رشتہ ہمیشہ قائم رہا۔ شورش کاشمیری کا مولانا ظفر علی خان سے یہ ذہنی رشتہ جہاں اُن کے حالات لکھنے میں معاون تھا وہاں مانع بھی تھا کہ کسی محبوب شخصیت کی کمزوریاں قلم کو پابند اور خوبیاں قلم کو بے راہ کر دیتی ہیں مگر شورش کا جاندار قلم ان دونوں موقعوں پر یکساں چلا ہے اور آغا صاحب نے عقیدت کو حقیقت پر غالب نہیں آنے دیا۔ بلکہ واقعات کی صحت اور تبصرہ کی خوبی نے مولانا ظفر علی خان پر لکھنے والوں کیلئے بہت سے راستے کھول دیئے ہیں۔ اور بعد کو لکھنے والوں نے شورش کاشمیری کی اس ادبی

۱۔ ظفر علی خان — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۲۵

۲۔ ظفر علی خان — ابتدائیہ از پروفیسر محمد سرور — ص نمبر ۹

دیانت سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اس سلسلے میں "مولینا ظفر علی خان" از محمد اشرف عطا۔ "ظفر علی خان ادیب و شاعر" از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اور "ظفر علی خان اور اُن کا عہد" از عنایت اللہ نسیم سوہدروی کی کتابیں بے شبہ بڑی وقیع اور جامع ہیں۔ جن میں تحقیق و تبصرے کے خوبصورت اضافے بھی ہیں مگر شورش کاشمیری کی کتاب نقشِ اوّل کے طور پر اسلوب و بیان میں آج بھی لاجواب ہے۔

قیدِ فرنگ

یہ کتاب مولانا ظفر علی خان کے ایام اسیری کا مرقع ہے جسے آغا صاحب نے ستمبر ۱۹۶۳ء[۱] میں تحریر کیا طباعت جون ۱۹۶۷ء[۲] میں ہوئی اس کتاب کے کل ۹۱ صفحات ہیں۔ یہ کتاب آغا صاحب کے اپنے پریس یعنی چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپی۔ کتاب کے شروع میں روزنامہ "زمیندار" کے ۴۔دسمبر ۱۹۲۶ء کے سنڈے ایڈیشن کے پہلے صفحے کا عکس دیا گیا ہے۔ جس پر "پیامِ وقت" کے عنوان سے مولانا ظفر علی خان کی نظم چھپی ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے کہ

"جو کرنی ہے جہانگیری محمد ﷺ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پر رکھ خداوندِ عجم ہو جا"[۲]

اور اس نظم کا آخری شعر ہے کہ

"گرانا ہے قلم ہاتھوں کو رودادِ جنوں لکھ کر
تو اس دورِ ستم پرور میں میرا ہم قلم ہو جا"[۳]

کتاب کو "سیاسی جاسوسوں کے نام" معنون کیا ہے اور نیچے مرزا غالب کا یہ مصرع بہ تصرف درج کیا ہے۔

موت سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں

اُس کے اگلے صفحے پر نظیری نیشاپوری کا یہ مصرع حروفِ جلی میں لکھا ہے

۱۔۲ بحوالہ قیدِ فرنگ — شورش کاشمیری — ص نمبر ۳

۳۔۳ قیدِ فرنگ — ایضاً — ص نمبر ۱

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست

اس کے بعد حرفِ اول کے عنوان سے آغا صاحب نے لکھا ہے کہ

"مولانا ظفر علی خاں کے ایامِ اسیری کا یہ تذکرہ کچھ اُن کی اور کچھ میری زبانی ہے ۔۔۔۔۔

۔۔۔۔ بہرحال جو باتیں میں نے لکھی ہیں وہ کچھ تو اپنی یادداشتوں سے ماخوذ ہیں کچھ ثقہ روایتوں سے اور کچھ مولانا کے کلام سے مستعار لی ہیں"[1]

یہ کتاب ایک انٹرویو کی صورت میں ہے۔ آغا صاحب مولانا ظفر علی سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ سفر میں رفاقت کا شرف بھی حاصل رہا اور سفر کے دوران میں[2] آغا صاحب نے مختلف سوالات کے ذریعے مولانا ظفر علی خان سے اُن کی قید و بند کے حالات دریافت کئے اور مولانا نے اِس سلسلے میں جو کچھ بتایا وُہ اِس کتاب کا حصہ ہے۔

آغا صاحب نے مولانا سے مختلف قسم کے سوالات پوچھے۔ خاص طور پر مقدمہ خفرو کی روداد اور اس مقدمے کے نتیجے میں پانچ سال قید جو منٹگمری جیل میں کاٹی، کی تفصیلات بڑی خوبی سے بیان ہوئی ہیں۔ اسی سلسلے میں مولانا ظفر علی خاں نے سیاسی جاسوسوں، سی آئی ڈی کے اہلکاروں اور پولیس کے سیاہ کارناموں اور انگریز کے پشتینی وفادار خاندانوں کے افراد کے سیاسی چال چلن پر روشنی ڈالی ہے۔ جن کے نام آغا صاحب نے اس کتاب کو معنون کیا ہے۔ جن کی پشت در پشت خدمات کے صلے میں انگریز نے انہیں سردار بنا رکھا تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے آغا صاحب کو بتایا کہ

"انہی لوگوں میں سے انگریزی حکومت کے کارندے منتخب یا نامزد ہوتے۔ فوج میں انہی لوگوں کی اولاد پر تکیہ کیا گیا۔ پولیس میں انہی کو مواقع دیئے گئے اور جیل خانوں میں بھی انہی خاندانوں کے افراد افسر ہو کے آتے تھے۔ غرض برطانوی سرکار کا ہندوستانی نقشہ ان خاندانوں ہی کے آب و رنگ کا منت پذیر تھا"[3]

۱۔ قید فرنگ — شورش کاشمیری — ص نمبر ۹

۲۔ بحوالہ قید فرنگ — " — ص نمبر ۲۷

۳۔ قید فرنگ — " — ص نمبر ۶۵

اور ان خاندانوں کے لوگوں کے کار ہائے نمایاں پر مولانا کا تبصرہ یہ ہے۔

"مولانا آزردہ ہوگئے فرمایا کہ قیامت کے روز یہ لوگ خدا کو کیا جواب دیں گے۔ سی آئی ڈی کے افسروں کا خصوصیت سے ذکر کیا۔ اس وقت ان کے لہجہ میں تلق تھا کہہ رہے تھے کہ ان لوگوں نے اپنے عہدوں کی ترقی کی خاطر محض انگریزوں کی خوشنودی کیلئے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان لوگوں نے ہمیشہ رائی سے پہاڑ۔ قطرے سے دریا اور ذرہ سے میدان بنایا ہے .... یہ لوگ پہلی جنگ عظیم میں لہ گونہ خدمات پر مامور تھے اولاً فوجیوں کے خیالات کی نگرانی کرتے ثانیاً مسلمان ملکوں کی جاسوسی۔ ثالثاً جب کسی اسلامی ملک کا سقوط ہوتا تو برطانیہ کی طرف سے اس کی انتظامیہ میں شریک ہوتے .... مولانا نے فرمایا محمد علی حجاز گئے یا میں حجاز پہنچا تو ہمارے ساتھ ہی اس قبیلے کی تشریح صورتیں کردی گئی تھیں یہ لوگ مکہ معظمہ کا طواف بھی کرتے قبور پر حاضری دیتے۔ مدینۃ النبیؐ میں روضہ اطہر کے سامنے کھڑے ہوکر گڑگڑاتے بھی اور ہماری خبریں بھی سرکار انگلشیہ کو ہم پہنچاتے تھے۔"[1]

اس کے علاوہ منٹگمری سنٹرل جیل کے حالات وواقعات کی جو تصویر آغا صاحب نے پیش کی ہے۔ اس کے حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ آغا صاحب خود بھی اسی جیل کی "آٹھویں بارک کے عقبی حصے میں"[2] رہے۔ جہاں کبھی مولانا ظفر علی خان رہ چکے تھے۔ بہر حال جیل اور متعلقاتِ جیل آغا صاحب کا مرغوب موضوع ہے۔ اور جو کچھ مولانا ظفر علی خاں سے سُنا تھا اُسے دیکھ بھی چکے تھے۔ اس طرح اس کتاب میں جگ بیتی کے ساتھ آپ بیتی کے امتزاج نے اس دردناک بیان کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ شورش کاشمیری کا قلم اس موضوع پر بڑا ہی بیباک ہے۔ اس کتاب کا اسلوب اور بیان وہی ہے جو ہمیں "پسِ دیوارِ زنداں" میں نظر آتا ہے انھوں نے اس اسیری کی سرگذشت کو ادبی زبان سے لازوال بنا دیا ہے۔

---

1. قیدِ فرنگ — شورش کاشمیری — ص نمبر ۶۲/۶۳/۶۴
2. بحوالہ قیدِ فرنگ — ص نمبر ۷۲/۷۳

نورتن

یہ کتاب پہلی مرتبہ جون ۱۹۶۷ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ ص ۶ پر ابن رشد کی یہ عبارت لکھی گئی ہے۔

"تمام زندگی میں صرف دو راتیں میں نے مطالعہ کتب کے بغیر گذاری ہیں۔ پہلی جب میری شادی ہوئی۔ دوسری جب میرے والد رحلت فرما گئے"۔

ابن رشد

اگلے صفحہ پر انتساب

ادیب العصر پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نام ہے

اس کتاب کے متعلق آغا صاحب نے "ایک بات اور" کے عنوان سے جو کچھ لکھا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ کتاب فروری ۱۹۶۵ء میں لکھنا شروع کی اور ہفتے یا دس دن میں نصف کتاب لکھ ڈالی۔ اس کے بعد فرصت نہیں ملی کہ کتاب مکمل کرتے دوسری مصروفیات کے علاوہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں قید و بند کا مرحلہ بھی پیش آیا جس کی وجہ سے کتاب پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ آخر مئی ۱۹۶۷ء میں کتاب دوبارہ لکھنا شروع کی اور ایک ہفتے میں مکمل ہو گئی۔ اس کتاب کو لکھنے میں صرف دو ہفتے لگے لیکن اگر حساب فروری ۱۹۶۵ء سے لگایا جائے تو جون ۱۹۶۷ء تک دو سال پانچ ماہ کا عرصہ بنتا ہے۔

اس کتاب میں لاہور کے نو صحافیوں کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے۔ جن کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

۱۔ عبدالمجید سالک

۲۔ چراغ حسن حسرت

۳۔ مہاشہ کرشن

۴۔ سید حبیب

۵۔ مرتضیٰ احمد میکش

۶۔ اظہر امرتسری

۷ ۔ حاجی لق لق

۸ ۔ ابوصالح اصلاحی

۹ ۔ مجید لاہوری

اس کتاب کا پہلا خاکہ نامور صحافی اور ادیب جناب عبدالمجید سالک کا ہے۔ بقول آغا صاحب

"سالک صاحب ایک زندہ دل۔ بذلہ سنج۔ کہنہ مشق۔ خوش گفتار۔ پاک سیرت نیک سرشت۔ دوست نواز۔ صاحبِ طرز اور نکتہ طراز ادیب تھے" [1]

آغا صاحب نے اس خاکے میں سالک صاحب کی زندہ دلی۔ بذلہ سنجی اور خوش گفتاری کی مثالوں سے رنگ بھرا ہے۔ نیاز مندانِ لاہور کے ادبی معرکوں کا ذکر کیا ہے۔ سالک صاحب کی زبان دانی۔ روزمرہ اور محاورہ پر ان کی گرفت اور انشاء پردازی میں ان کی مہارت پر تبصرہ کیا ہے۔ ان کی سیرت کی پاکیزگی اور سرشت کی نیکی کو اجاگر کیا ہے۔ مختلف واقعات بیان ہوئے ہیں جن سے مل کر ایک خوبصورت خاکہ بنا ہے۔ سالک صاحب کی صحافت کے ضمن میں "انقلاب" کا کردار بھی زیرِ بحث آیا ہے۔ "انقلاب" کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

"انقلاب کے اس کردار کا دفاع نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مزاج حکومت کے نزدیک رہا" [2]

مجموعی طور پر سالک صاحب کے متعلق آغا صاحب کا ذاتی تاثر بہت خوب ہے۔

چراغ حسن حسرت

یہ اس کتاب کا دوسرا خاکہ ہے۔ جس کا آغاز آغا صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

"ادب کی عام گفتگو میں حسرت اپنے سوا شاذ ہی کسی کو ملتے تھے مزاج ان کا یہ تھا کہ نئی پود کا ذکرِ خیر کرتے ہوئے ہچکچاتے۔ ہمعصروں میں دو چار کی تعریف کرتے لیکن مین میخ ان میں بھی نکالتے۔ یہ ان کی طبیعت کا انداز تھا یا شاید ہم ہی لوگ یہ محسوس کرتے تھے" [3]

---

۱ نورتن شورش کاشمیری ص نمبر ۶۲

۲ ایضاً ص نمبر ۴۲

۳ ایضاً ص نمبر ۶۵

آغا صاحب کا یہ ذاتی تاثر حسرت صاحب کے اس جھگڑے سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے جو میاں افتخار الدین کے ساتھ ہوا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب حسرت صاحب اخبار "امروز" میں ملازمت کرتے تھے اور میاں صاحب اِس اخبار کے مالک تھے۔ آغا صاحب نے عرب ہوٹل کی محفلوں اور کافی ہاؤس کی اُن مجلسوں کا ذکر بھی کیا ہے جہاں حسرت صاحب شراب بقول شورش صاحب "پیتے اور رِوٹ کر پیتے" تھے اور اسی شراب نے بالآخر حسرت صاحب کی جان لے لی۔ اِس کے علاوہ جہاں تک چراغ حسن حسرت کی ادبی حیثیت کا تعلق ہے آغا صاحب نے نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اسے اجاگر بھی کیا ہے بقول آغا صاحب

"وہ نثر کی ہر صنف پر قادر تھے۔ سیرت بھی لکھی۔ افسانے بھی تحریر کئے۔ تاریخ پر بھی قلم اٹھایا۔ بچوں کا نصاب بھی لکھا۔ عروض میں بہرۂ وافر رکھتے تھے، شاعری کے ہر کوچہ سے آشنا رہے لیکن اپنے آپ کو شاعری کے حوالے نہیں کیا، کبھی کبھار شعر کہہ کر جی بہلا لیتے تھے غزل ہو یا نظم، طنز کریں یا پیروڈی، نعت لکھیں یا منقبت قلم ان کا موتی ہی بکھیرتا تھا۔ ان کا شاعرانہ کلام بہت مختصر ہے لیکن جو لکھا ہے ناپ تول کر لکھا ہے اور دل میں ترازو ہو جاتا ہے"[1]

آغا صاحب کے اِس بیان کی صداقت کا ثبوت حسرت صاحب کے کلام کا وہ انتخاب ہے جو اس کتاب میں نقل کیا گیا۔ ادب کے علاوہ صحافت میں بھی حسرت صاحب کا مقام بلند ہے۔ آغا صاحب نے اپنے اِس خاکے میں ایک انا پرست صحافی۔ ادیب اور شاعر کا جو عکس پیش کیا ہے اور جن واقعات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان سے یہ خاکہ زندگی سے بھرپور نظر آتا ہے۔

مہاشہ کرشن

ہندوؤں کے مشہور اخبار "پرتاپ" کے مالک و مدیر مہاشہ کرشن کا یہ خاکہ ہندو اخباروں اور ان کے مدیروں کا مجموعی عکس ہے۔ آغا صاحب نے اِس خاکے کے پس منظر میں ہندو اخبار کی خصوصیات۔ ان کا تعصب

۱۔ نورتن شورش کاشمیری ص نمبر ۹۶/۹۷

ان کی تنگ نظری۔ ان کی مسلم آزاری۔ ان کی اردو سے دشمنی اور اسلام سے نفرت پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ جیسے ہندو اخباروں اور ہندو مدیروں کے طرزِ عمل کی تاریخ کہنا چاہیے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب نے جن باتوں کو موضوع بنایا ہے۔ وہ ہندو قوم کی طبعی اور اساسی خصوصیات ہیں۔ جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

سیّد حبیب

اخبار "سیاست" کے مالک و مدیر سید حبیب کے اس خاکے میں آغا صاحب نے سید حبیب صاحب میں بہت سی کمزوریوں۔ خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کی ہے[۱]۔ اور سید حبیب صاحب کا یہ طرزِ عمل کسی لحاظ سے قابلِ تحسین نہیں لیکن اُن کی ایک خوبی ایسی ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد آدمی کو شک ہونے لگتا ہے کہ اس جراُت کے حامل اور سچائی کا اعلان کرنے والے آدمی میں یہ برائیاں کیسے پیدا ہو سکتی ہیں بقول شورش صاحب

"ہربرٹ ایمرسن صوبہ کا گورنر تھا ایک وفد کے ہمراہ اس سے ملے روزوں کے دن تھے افطار کا وقت ہوگیا پانی مانگا تو گورنر نے نلکے کی طرف اشارہ کردیا بس یہ بگڑ جانے کیلئے کافی تھا گورنر کو وہیں آڑے ہاتھوں لیا بدمزگی ہوگئی اگلے روز "سیاست" میں مقالہ لکھا کہ ایمرسن نے اس بدتمیزی کا مظاہرہ کرکے انگریز قوم کے اخلاق کو مجروح کیا ہے۔ محکمہ اطلاعات نے گورنر کی طرف سے تردید کی تو شاہ صاحب نے اداریہ لکھا "گورنر کا جھوٹ"۔ دوبارہ تردید آئی تو لکھا "گورنر نے پھر جھوٹ بولا" غرض آن واحد میں لڑائی باندھ لی اور حق کو یہ ہے کہ تن گئے۔ اسی اثنا میں سکندر حیات سے چھڑ گئی افتتاحیہ دھر گھسیٹا "سر الیگزنڈر رعونت کا اُلو" طرازِ عنوان فردوسی کا مصرع تھا...... کہ

پرستار زادہ نہ آید بکار[۲]

۱۔ آغا صاحب نے اپنی کتاب "پسِ دیوارِ زنداں" کے صفحہ نمبر ۷۵ تا ۸۰ اور دوسری کتاب "بوئے گل" کے صفحہ نمبر ۲۰۲ تا ۲۰۵ میں بھی سید حبیب کا ذکر ہے۔

۲۔ نورتن   شورش کاشمیری   ص نمبر ۱۲۹ / ۱۳۰

مندرجہ بالا واقعہ سید حبیب کی جس قلندرانہ شان کی غمازی کرتا ہے۔ وہ اُن کی صحافت کو بڑا بلند مقام عطا کر دیتا ہے۔ سکندر حیات جیسے حکمران سے آنکھیں چار کرنا اور برطانوی راج کے گورنر کو للکارنا کوئی معمولی بات نہیں بلکہ اُن کا "سیاست" میں یہ لکھنا کہ "ایمرسن نے اِس بدتمیزی کا مظاہرہ کر کے انگریز قوم کے اخلاق کو مجروح کیا ہے" بہت بڑی جسارت ہے۔ عجیب نہیں کہ شورش صاحب کو سید حبیب کی اسی ادا نے ہی یہ خاکہ لکھنے پر مجبور کیا ہو۔

مرتضیٰ احمد میکش

جالندھر کے پٹھان تھے[1]۔ لاہور سے شائع ہونے والے ایک فارسی ہفت روزہ "افغانستان" کے ایڈیٹر تھے[2]۔ زمیندار میں مدیر معاون کے طور پر کام کیا[3]۔ پھر "انقلاب" میں کام کرتے رہے[4]۔ مرتضیٰ احمد کا شمار صحافت کی تاریخ میں اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو مدیروں کی صحیح تصویر تھے۔ مرتضیٰ احمد میکش بقول آغا صاحب

"تخلص ہی کے گنہگار تھے خدا معلوم کس نسبت یا رعایت سے انہوں نے اپنا تخلص میکش کیا۔ میکدہ دیکھا نہ پیالہ اُٹھایا۔"[5]

آغا صاحب نے اِس خاکے میں پرانے اور نئے مدیروں کا مقابلہ کیا ہے۔ پرانی اور نئی صحافت کا فرق دکھایا ہے۔ یہ بھی بتایا ہے کہ صحافت کیلئے زبان و ادب کی پاسداری کتنی ضروری ہے۔ مرتضیٰ احمد میکش میں پرانے صحافیوں کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔ بقول آغا صاحب

"یہ واقعہ ہے کہ انہوں نے صحافت کی اعلیٰ قدروں کا نہ صرف احترام کیا بلکہ استحکام بھی کیا۔ جس نقطہ نگاہ کو درست سمجھتے اس کے مبلغ ہو جاتے۔ ان میں ایک عالم کی روح۔ ادیب کا حسن۔ شاعر کی رنگینی۔ رند کا ظرف۔ فقیر کا گداز۔ مجاہد کا ولولہ اور بادشاہ کی تمکنت موجود تھی۔"[6]

بحوالہ نورتن	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۳۷/ ۱۳۸
نورتن	"	ص نمبر ۱۲۵
"	"	ص نمبر ۱۳۲/ ۱۳۳

اظہر امرتسری

آغا صاحب نے اظہر امرتسری کے خاکہ میں اُن کی تصویر ان لفظوں سے بتائی ہے

"شکل و صورت کے اعتبار سے شاعر، ادیب، صحافی یا خطیب کچھ نظر نہ آتے تھے۔ چہرہ مہرہ واجبی ہی تھا۔ گہرا گندمی رنگ۔ میانہ قد۔ اکہرا بدن۔ لمبی ناک، آنکھوں میں سگریٹ اور حقّے کے دھوئیں کی جمی ہوئی تہہ۔ خشخشی ڈاڑھی۔ مونچھوں میں عمر بھر اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ یعنی کبھی زاویہ قائمہ بناتی تھیں کبھی بالکل ہی غائب۔ کبھی چھوٹی بحر میں اور کبھی برائے وزن بیت۔ دانتوں میں کھڑکیاں لیکن نقشوں کی سیاہ رنگ سے داغدار۔ آواز میں خرخراپن۔ حسن صورت مجروح ہو گیا تھا چال ڈھال سے لے کر حال و قال تک کوئی چیز نہ تھی جس سے گمان ہو کہ اس پیکرِ خاکی میں کوئی صاحب علم بھی ہے"[1]

اس کے باوجود اظہر امرتسری "زمیندار" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ ایک اچھے شاعر بھی۔ لیکن شراب کی نذر ہو گئے۔
آغا صاحب نے اظہر امرتسری کے علاوہ حاجی لق لق اور عبید لاہور کے خاکوں میں بھی شراب کی تباہ کاریوں پر تاسف کیا اور شراب نے جس طرح ان تینوں کی جان لی اُس سے عبرت دلائی ہے اور ان تینوں کی حسرت ناک موت پر نوحہ کیا ہے۔ لاہور کے صحافی اگر شراب کے رسیا نہ ہوتے تو اپنی صلاحیتوں سے بڑا کام لے سکتے تھے۔

ابوصالح اصلاحی

آغا صاحب کے دوست جو قاہرہ کے حادثہ میں جاں بحق ہوئے۔ آغا صاحب نے اُن پیشہ ورانہ خوبیوں کے علاوہ اُن کے کردار کی اچھائیوں کو نمایاں کیا ہے۔ اور ایک اچھے دوست کو اچھے نام سے یاد کیا ہے۔

نورتن لاہور کے نو صحافیوں کا اجمالی تذکرہ ہے۔ لیکن آغا صاحب نے اس اجمال میں جو کچھ کہا ہے۔ اس سے ان پیشہ صحافت سے تعلق رکھنے والوں کی سیرت و کردار کا پتہ چلتا ہے۔ جس زمانے کے صحافیوں کا یہ تذکرہ ہے اُس زمانے میں صحافت کیلئے ادب سے لگاؤ رکھنا بڑا ضروری تھا۔ اور زبان

---

[1] نورتن — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۴۹/۱۵۰

کے اسرار و رموز سے آشنائی کے بغیر اِس پیشے کو اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اخبار کی زبان کا جھول اخبار اور مدیر دونوں کیلئے عیب تھا۔ آغا صاحب نے ان صحافیوں کی اس خوبی کو بطور خاص نمایاں کیا ہے۔ اُن کے ادبی اور شعری ذوق نے صحافت میں جو ادبی نشان پیدا کی ہے۔ اُس پر آغا صاحب کی خاص نظر ہے۔ اِس کے علاوہ اُن کی پیشہ ورانہ خوبیوں کا اعتراف ہے۔ صحافتی معرکوں اور طنز و مزاح کی حکایتوں نے ان خاکوں کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ ان خاکوں میں آغا صاحب نے بعض لوگوں کی قلمی تصویریں بنائی ہیں۔ جنہیں پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اِس صفحہ پر اُس صحافی کا فوٹو لگا ہوا ہے۔ جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہے۔

حمید نظامی

یہ کتاب ۱۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلی مرتبہ فروری ۱۹۶۷ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

کتاب کے پہلے صفحات میں سے ایک صفحہ پر مرزا اسداللہ غالب کا یہ شعر درج ہے۔

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب

اِک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے   غالب

اس سے اگلے صفحہ پر لمحہ فکریہ کے عنوان سے یہ عبارت درج ہے۔

"بیشتر لوگ زندگی ہی میں مر جاتے ہیں لیکن کچھ لوگ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں اور ان کی حیات مستعار آئندہ نسلوں کیلئے نشانِ راہ بن جاتی ہے۔"

اس سے اگلے صفحے پر لکھا ہے۔

ڈاکٹر مبشر حسن کے نام

اگلے صفحے پر جناب جنید نظامی کی تصویر ہے اور تصویر کے نیچے یہ شعر درج ہے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں   ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اس کے بعد مشہور صحافی جناب ظہور عالم شہید کا تحریر کردہ ابتدائیہ ہے اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ کتاب کے آخر میں اختتامیہ کے عنوان سے آغا صاحب نے اس کتاب کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ کتاب انہوں نے سنٹرل جیل ساہیوال میں لکھی تھی۔ انہیں ۶ ستمبر ۱۹۶۶ء کو چھ ماہ کیلئے مقید کر دیا گیا تھا اور قید کی اس تنہائی میں بقول شورش صاحب

شورش کاشمیری   ص نمبر ۱۰۹

"حمید نظامی" ہفتہ عشرہ بلکہ اِس سے بھی کم مدت میں تیار ہوگئی۔ مواد ذہن میں تھا۔ فرصتِ تنہائی حاصل ہوگئی۔ قلم آمادہ ہوگیا۔ دو چار نشستوں میں جو معلوم تھا اور جو محسوس کر رہا تھا، اوراق میں منتقل ہوگیا۔"[۱]

اس کتاب کے بارے میں آغا صاحب کی اپنی رائے یہ ہے۔

" آپ نے محسوس کیا ہوگا کوئی باقاعدہ سوانح عمری نہیں کسی مبسوط کتاب کا حصہ نہیں۔ اِس پر کسی تذکرہ کا اطلاق نہیں ہوتا نہ ہم اِسے کہانی کہہ سکتے ہیں اور نہ اِس میں افسانوی خوبو پائی جاتی ہے۔ اسمیں ایک ایسی داستان کی آمیزش ضرور ہے۔ جو ہمارے سامنے رونما ہوئی۔ پھر ایکا ایکی ختم ہوگئی۔ یہ ایک تجزیہ ہے، ایک مشاہدہ ہے، ایک مطالعہ ہے۔ اِس شخص کے بارے میں جو ہمارے سامنے زندگی کے سفر کو نکلا تھا، دِنوں ہی میں نمایاں و ممتاز ہوگیا۔"[۲]

گویا کتاب تجزیہ، مشاہدہ، اور مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ آغا صاحب نے واقعتاً ایسا ہی کیا ہے۔ آغا صاحب نے اِس کتاب میں کچھ واقعات بیان کیے ہیں۔ جو سنے سنائے نہیں بلکہ آغا صاحب کی ذات بھی اِن واقعات کا حصہ ہے یعنی یہ واقعات حمید نظامی کو ہی پیش نہیں آئے بلکہ آغا صاحب کو بھی پیش آئے۔ کیونکہ وہ نظامی صاحب کے ساتھ تھے۔ اِس کے ساتھ ہی آغا صاحب نے دوستوں کی محفلوں کی حکایت لکھی ہے۔ اور ہوٹلوں اور ریستورانوں میں حمید نظامی کے ساتھ بیتے دِنوں کی یادیں ہیں۔ جسے ہم آغا صاحب کا مطالعہ و مشاہدہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن سفر کے ساتھ میں، دوستوں کی محفلوں میں، حکومت کی مخالفت میں، ہوٹلوں اور ریستورانوں میں، آغا صاحب سے ملاقاتوں میں، صحافت کی وادی میں، سیاست کے خارزار میں، تحریک آزادی کی حفاظت میں، حق کہنے میں اور سچ سننے میں نظامی صاحب کا طرزِ عمل کیا رہا، یہ اِس کتاب کا

۱/۲ ۔ حمید نظامی ۔ ص نمبر ۱۰۷ / ۱۱۰

موضوع ہے۔ جس سے نظامی صاحب کے عادات و اطوار، سیرت و کردار، دوستی و دشمنی، ہنسی مذاق، پسند و ناپسند اور نفرت و محبت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ جو نظامی صاحب کی سوانح عمری کا ایک حصہ ہے۔ آغا صاحب کو خود بھی احساس تھا کہ یہ کتاب نظامی صاحب کی زندگی کا پوری طرح احاطہ نہیں کرتی بلکہ کئی باتیں بیان ہونے سے رہ گئی ہیں۔ جس کی نشاندہی آغا صاحب نے خود ہی کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یہ بتانا سیرت نگار کا کام ہے کہ وہ کون تھے؟ کہاں پیدا ہوئے؟ اُن کے والد کیا تھے؟ کب پیدا ہوئے؟ کب رحلت فرمائی؟ کتنے بہن بھائی تھے؟ کتنے حیات ہیں؟ کتنوں کو موت چاٹ گئی؟ کس شہر یا قصبے سے نکلے؟ کہاں کہاں گئے؟ لاہور کب آئے، کہاں تک تعلیم حاصل کی کیسے پڑھے؟ پڑھنے کے بعد کیا کرتے رہے؟ نوائے وقت کب نکالا، کیسے نکالا، کیونکر نکالا، اسوقت کون کون شریک تھا، ہفتہ وار تھا یا روزنامہ، روزنامہ بنا تو کب بنا؟ اس کیلئے کہاں کہاں کھکھیڑیں اٹھائیں اور ہاں اُن کی شادی کب ہوئی کہاں ہوئی، کتنی اولاد ہے؟ کیا کرتی ہے؟ غرض اس سلسلے کی جتنی کڑیاں ہیں وہ ایک محقق یا مؤرخ کا کام ہے کہ اِن کی جستجو کرے، اِن کا کھوج لگائے۔ میرا کام اس حمید نظامی کے خط و خال بیان کرنا ہے جو پاکستان بن جانے کے بعد ہمارے ساتھ رہا۔ جسکا اس روز سے قبر تک ہمارے ساتھ تعلق خاطر رہا۔"[1]

اِس کمی کو کسی حد تک ظہور عالم شہید نے کتاب کا ابتدائیہ لکھ کر پورا کر دیا ہے۔ انہوں نے نظامی صاحب کے سوانح حیات اور نوائے وقت کی مختصر تاریخ بیان کر کے اِس کتاب کو بڑی حد تک

---

[1] حمید نظامی ص نمبر ۳۱/۳۲

سوانح عمری کے قریب کر دیا ہے لیکن انہوں نے آغا صاحب کی کتاب کے اس حصے کی تردید بھی فرمائی ہے اور اِس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی ہے جو آغا صاحب نے محسوس کیا تھا۔

- آغا صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔

"اِن ساری خوبیوں کے باوجود ایک خلا ہمیشہ ہی محسوس کیا گیا، کہ

۱- قدرت وقت نے متبادل لیڈر شپ پیدا نہ کی۔

۲- جن لوگوں کو وہ پرکھ چکے تھے۔ انہیں بار بار آزماتے رہے یا انہی کے بتوں کو اجالتے چلے گئے"۔

۳- اِن سے معافی پاکر قاتل بھی مقتول ہو جاتا ہے۔

۴- انہوں نے لیگ سے شدید اختلاف کے باوصف پرانے اور سیاسی مسلم لیگیوں ہی کو مقدم رکھا۔ جن کا طول اِس زمانے میں خان عبدالقیوم خان اور عرض احمد سعید کرمانی تھے۔

۵- وہ بسا اوقات ساتھیوں کے انتخاب میں بھی غلطی کر جاتے تھے۔

۶- انکا اختلاف بہت شدید ہوتا تھا۔

۷- وہ اِن لوگوں کی بھی سرپرستی کر جاتے تھے جن کے متعلق انہیں معلوم ہوتا تھا کہ اِن کی بدولت ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔

۸- جن لوگوں سے اختلاف ہوتا ان میں عفو و درگذر کا مادہ بالکل نہ تھا۔

۹- وہ سیاسی کام کرنے کے بڑے متمنی تھے لیکن ایک جماعت کیونکر فراہم ہو سکتی ہے خود اِس کیلئے اقدام نہیں کرتے تھے۔

۱۰- انہیں اپنی رائے پر اتنا اعتماد ہوتا کہ اِس کے منوانے پر مصر ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ دوستوں کے غور و فکر کا راستہ رک جاتا تھا۔

۱۱۔ وہ تنہا فیصلہ کرتے اور دوستوں سے توقع کرتے کہ بلا چون و چرا تسلیم کرلیں گے۔ چونکہ اِن سیاسی معاملوں میں انکی اپنی ذات کا سوال نہیں ہوتا تھا۔ اِس لئے اکثر و بیشتر دوست اِن کی فراست اور اِن کے اخلاص کو ملحوظ رکھتے ہوئے صاد کردیتے تھے لیکن اِس کا نتیجہ وہی نکلا جو ناگزیر تھا یعنی وہ رحلت کر گئے تو اِن کا مرکزی وجود بھی ختم ہو گیا۔"[۱]

جناب ظہور عالم شہید نے " نوائے وقت نے متبادل لیڈرشپ پیدا نہ کی " پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔

" میں صرف یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ ایک صحافی کا کام متبادل لیڈرشپ پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ وہ ایک سیاسی مفکر ہوتا ہے۔ وہ نظریات پیش کرتا ہے اور ملکی مسائل پر بے باکانہ تنقید کرتا ہے۔ یہی فرض حمید نظامی مرحوم نے بھی انجام دیا۔ وہ غور و فکر کی غذا مہیا کرتے رہے۔ اور یہ "نوائے وقت" کا اعجاز تھا کہ ملک میں متبادل قیادت پیدا کرنے کی ضرورت کا احساس پیدا ہوا۔ اور اب یہاں ایسے رہنماؤں کی کمی نہیں جنہوں نے مختلف جماعتوں کی قیادت کرتے ہوئے ملک و قوم کی خدمت کا فرض بجا لانے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔"

راقم الحروف کے نزدیک جناب ظہور عالم شہید نے ایک سیدھی سادی عبارت کو الجھا دیا ہے یا پھر جن باتوں پر اعتراض ہوا ہے اِن پر لگے ہوئے نمبروں سے دھوکا کھایا ہے۔ سب سے پہلے ظہور عالم شہید صاحب نے آغا صاحب کے اِن اعتراضات پر تنقید کی ہے جن کے نمبر ۱، ۲، ۳، ۴ اور ۷ ہیں۔ حالانکہ اگر وہ اِس عبارت کو اِس طرح سمجھیں تو شائد الجھاؤ دور ہو سکتا ہے۔ نوائے وقت نے متبادل

---

[۱] حمید نظامی ص نمبر ۹۶ / ۹۷

[۲] حمید نظامی ابتدائیہ از ظہور عالم شہید ص نمبر ۱۹ / ۲۰

لیڈر شپ نہ پیدا کی کیونکہ حمید نظامی صاحب جن لوگوں کو پرکھ چکے تھے انہیں بار بار آزماتے رہے یا انہی کے بتوں کو اجالتے چلے گئے۔ یہی لوگ حمید نظامی سے معافی پاکر قاتل سے مقتول بن گئے تھے۔ اور یہ لوگ مسلم لیگ کے تھے۔ نظامی صاحب نے لیگ سے شدید اختلاف کے باوصف پرائے اور سیاسے مسلم لیگیوں ہی کو مقدم رکھا۔ جن کا طول اس زمانے میں خان عبدالقیوم خان اور عزت احمد سعید کرمانی تھے۔ کیونکہ خان عبدالقیوم خان اور احمد سعید کرمانی ایسے لوگ ملک و قوم کو نقصان پہنچا رہے تھے اور مسلم لیگ میں شامل تھے اور نظامی صاحب مسلم لیگ کی سرپرستی کرتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد اقتدار کی باگ ڈور صرف اور صرف مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھی لیکن قائداعظمؒ کی وفات کے بعد اس جماعت نے اقتدار کیلئے کیا کچھ نہیں کیا اور جو کچھ ہوا وُہ تاریخ کا حصہ ہے اُسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ کیا اقتدار کی اِس جنگ میں جو مسلم لیگ والوں نے شروع کی خواہ وُہ حزب اقتدار میں تھے یا حزب اختلاف میں ملک و قوم کو نقصان نہیں پہنچا؟ اور نظامی صاحب نے بھی کسی ایک کا ساتھ تو دیا ہوگا۔ جو یقیناً ملک و قوم کو نقصان پہنچا ہے۔ "ملک دشمنی" کے الفاظ ظہور عالم صاحب کے ہیں۔ آغا صاحب نے "ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اگر قائداعظمؒ کی وفات کے بعد مسلم لیگ کی حکومتوں کے روّیے سے ملک و قوم کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تو آغا صاحب غلطی پر ہیں اور اگر مسلم لیگ کی حکومتوں نے جمہوری عمل کو بحال رکنے کی کوشش کی ہے تو ملک و قوم کا نقصان بھی ہوا ہے۔ بلکہ آج تک ہو رہا ہے۔ یہ آغا صاحب کا محبوب موضوع ہے پہلے باب میں اِس کا ذکر تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ آغا صاحب نے مسلم لیگ کی اِس منطق کو بھی تسلیم نہیں کیا کہ پاکستان صرف اس نے بنایا ہے اور حکمرانی کا حق بھی اُسی کو پہنچتا ہے اور جو لوگ مسلم لیگ میں شامل نہیں رہے وُہ غدار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ آغا صاحب نے اپنی تحریروں میں اس بات کا بھی بار بار اعلان کیا ہے کہ یہ لوگ مسلم لیگ میں آئے ہی اس مقصد کے تحت تھے کہ اقتدار پر قابض ہو سکیں۔ خود ظہور عالم صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ

"تحریک پاکستان کے آخری مراحل میں جو لوگ حلقہ بگوش ہوئے ان میں سارے مخلص نہیں تھے البتہ وُہ بارسوخ ضرور تھے۔ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ کی بدولت حکومت میں بھی مقام حاصل کر لیا تھا۔"[1]

۱۔ حمید نظامی — ابتدائیہ ظہور عالم شہید — ص نمبر ۱۷

آغا صاحب کا اعتراض انہی لوگوں پر ہے۔ آغا صاحب نے اِن لوگوں کا حدود اربعہ بھی بتا یا ہے۔ جسے تنقید کرتے ہوئے ظہور عالم صاحب نے نظر انداز کر دیا ہے۔ ظہور عالم صاحب نے یہ تو لکھ دیا کہ "انہوں نے لیگ سے شدید اختلاف کے باوصف پرانے اور سیانے مسلم لیگیوں ہی کو مقدم رکھا" مگر دوسری بات چھوڑ دی کہ "جن کا طول اس زمانے میں خان عبدالقیوم اور عرض احمد سعید کرمانی تھے"۔ شاید ظہور عالم صاحب "پرانے اور سیانے" کی طنز کو نہیں سمجھے ورنہ آغا صاحب کی مراد ایسے ہی مسلم لیگیوں سے ہے جو خان عبدالقیوم اور احمد سعید کرمانی جیسے لوگ تھے۔ چونکہ نظامی صاحب مسلم لیگ کے فدائی تھے۔ جیسا کہ ظہور عالم صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے

"مسلم لیگ سے ان کی محبت کچھ زیادہ ہی تھی اور یہ ماضی کی دلچسپیوں کے باعث ایک قدرتی بات تھی"

لہذا خان عبدالقیوم خان اور احمد سعید کرمانی جیسے لوگ صرف مسلم لیگ کے نام کی وجہ سے نظامی صاحب سے معافی پا لیتے تھے کیونکہ نظامی صاحب مسلم لیگ کو ہر حال میں عزیز رکھتے تھے۔ نظامی صاحب سچے اور کھرے مسلم لیگی تھے۔ مسلم لیگ سے اُن کی محبت اور وابستگی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلم لیگی وزارتوں کی شکست وریخت میں کئی چہرے بار بار سامنے آئے اور نظامی صاحب نے مسلم لیگ کا ساتھ اُن چہروں کے بار بار آنے پر بھی دیا۔ جس بنا پر آغا صاحب کو یہ لکھنا پڑا کہ:

"جن لوگوں کو وہ پرکھ چکے تھے انہیں بار بار آزماتے رہے"

حمید نظامی ابتدائیہ ظہور عالم شہید ص نمبر ۲۱

انہی کے بتوں کو اُجالتے چلے گئے ہیں[1]

اس کتاب میں آغا صاحب اپنے مخصوص انداز میں پاکستان کے دانشوروں۔ قلم کاروں۔ شاعروں۔ ادیبوں اور مورخوں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہے ہیں کہ انہوں نے پاکستان کی تاریخ اور اس کے عظیم رہنماؤں کے کارناموں کو آنے والی نسلوں کیلئے کیوں قلمبند نہیں کیا؟ وہ اُن کی اِس غفلت پر تازیانے برساتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی بتاتے ہیں کہ حمید نظامی پر کچھ لکھنا سہل نہیں۔ پھر اس کی وجہ بھی بیان کی ہے۔

اِس عبارت میں معنی و مفہوم کی ایک دنیا آباد ہے۔ یہ عبارت یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسی شان و شوکت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ حمید نظامی اور "نوائے وقت" کے رشتے کا حسین مرقع سامنے آتا ہے۔ اِس ساری عبارت میں خطابت کا جوش اور ادب کا بہاؤ بڑا ہی خوبصورت ہے۔ جس نے حمید نظامی کے اِس خاکے میں بڑی رعنائی پیدا کر دی ہے۔ یہ آغا صاحب کے دوستانہ اخلاص زبان کے زور اور جوشِ خطابت کا ہی کرشمہ ہے کہ انہوں نے پاکستان۔ قائدِ اعظم رح اور حمید نظامی کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔

حمید نظامی اردو صحافت کی تاریخ کے بڑے صحافی تھے لیکن آغا صاحب کی یہ کتاب پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے صحافی تھے۔ آغا صاحب نے نظامی صاحب کی جن خامیوں کا ذکر کیا ہے۔ انہیں نظامی صاحب میں ہونا چاہیے کیونکہ ان خامیوں کی وجہ سے نظامی صاحب ہمیں نہ صرف ایک بڑے صحافی بلکہ بڑے انسان بھی نظر آتے ہیں اگر ظہور عالم صاحب کی توجیحات کو درست سمجھ کر ان خامیوں کو قلم زد کر دیا جائے تو نظامی صاحب صرف بڑے صحافی ہو کر رہ جائیں گے۔ اور پھر اِس کتاب کو "مدلّل مداحی" بھی کہا جا سکتا ہے جیسا کہ مولانا شبلی نے "حیاتِ جاوید" کے بارے میں کہا تھا۔

---

[1] حمید نظامی   شورش کاشمیری   ص نمبر ۲۹/۳۰

حسین شہید سہروردی

یہ کتاب پہلی مرتبہ نومبر ۱۹۶۷ء میں چٹان پرنٹنگ پریس سے شائع ہوئی۔ جو ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے صفحہ ۳ پر آغا صاحب کا شعر درج ہے۔

ہزار بار زمانہ کے سرد طاقوں پر
چراغ خونِ جگر سے جلائے ہیں میں نے

اور صفحہ ۴ پر یہ عبارت درج ہے۔

" سوانحی افکار نئی پود کی ذہنی تعمیر میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ماضی کو حال سے ملاتے اور مستقبل کو اجالتے ہیں"۔

اس کے بعد دیباچہ آغا صاحب کے اپنے قلم سے ہے۔ پھر آغا صاحب اور حسین شہید سہروردی کی ایک تصویر ہے۔

صفحہ ۹ پر سُرخ رنگ میں لکھا ہے۔

"گمشدہ جمہوریت کی یادیں"،

صفحہ ۱۱ پر حسین شہید سہروردی جلی حروف میں لکھا ہے اور نیچے یہ عبارت لکھی گئی ہے۔

" یہ نظم اس زمانے میں ہدیہ سپاس کے طور پر لکھی گئی۔ جن فیض احمد فیض راولپنڈی کے مقدمہ سازش کیس میں ماخوذ تھے اور حسین شہید سہروردی اس مقدمہ میں صفائی کے وکیل تھے"۔

اور صفحہ ۱۲/۱۳ پر فیض احمد فیض کی یہ نظم تحریر کی گئی ہے جسکے پہلے چند اشعار یہ ہیں۔

" کس طرح بیان ہو تیرا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر

وہ زور ہیں، اک لفظ ادھر نطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر

گرمی بھی ہے، ٹھنڈک بھی، روانی بھی، سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیئے۔ ہے تاثیر ہی تاثیر

اعجاز اسی کا ہے کہ ارباب ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

اطراف وطن میں ہوا حق بات کا شہرہ
ہر ایک جگہ مکر وریا کی ہوئی تشہیر

روشن ہوئے امید سے رخ اہل وفا کے
پیشانی اعدا پہ سیاہی ہوئی تحریر"

آغا صاحب نے اپنی پہلی دو کتابوں "میاں افتخار الدین" اور "حمید نظامی" کی طرح یہ کتاب بھی بڑے کم عرصہ یعنی دو ہفتے میں ساہیوال سنٹرل جیل میں سپردِ قلم کی۔

دیباچہ میں آغا صاحب نے تحریر کیا ہے کہ

"جو واقعہ بھی قلم سے نکلا اور جس مرحلہ میں پیش آیا اسکی صحت کو بہ کمال وتمام محفوظ رکھا ہے۔ میں تاریخ میں افسانہ آرائی اور داستان سازی کو جرم سمجھتا ہوں۔"[1]

سہروردی، تحریکِ پاکستان اور متحدہ پاکستان کے زمانہ میں ہمارے قومی رہنما تھے۔ اس لحاظ سے وہ تحریکِ پاکستان کے علاوہ تاریخِ پاکستان میں بھی اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ آغا صاحب نے اس کتاب میں جن واقعات کا ذکر کیا ہے۔ وہ زیادہ پرانے نہیں بلکہ جب آغا صاحب نے یہ کتاب لکھی اس وقت تک تو اِن واقعات کی بازگشت عام سنائی دیا کرتی تھی۔ جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک سیاسی اور دوسرے نجی واقعات۔

حسین شہید سہروردی آغا صاحب کے بے تکلف دوست تھے۔ اور قیام پاکستان کے بعد آغا صاحب نے اسی دور میں تھوڑے عرصہ کیلئے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا۔ اور نجی سطح پر آغا صاحب، حسین شہید سہروردی سے ملتے جلتے رہے۔ سہروردی صاحب، آغا صاحب کے گھر بھی آجاتے آغا صاحب کو طلب بھی کر لیتے۔ آغا صاحب خود بھی چلے جاتے اس تعلق خاطر میں سیاسی صورتِ حال کے علاوہ بھی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو رہتی۔ بعض دفعہ آغا صاحب، سہروردی صاحب سے مختلف قسم کی باتیں پوچھ بھی لیا کرتے تھے۔ اور سہروردی صاحب سیاسی واقعات میں آغا صاحب کی رائے معلوم کر لیتے تھے۔ تعلقات کا یہ رشتہ ہی اس کتاب کی بنیاد ہے۔ جہاں تک تاریخی اور سیاسی واقعات کا تعلق ہے وہ بلاشبہ درست اور سچے ہیں جہاں تک دوستانہ سطح کے واقعات کا تعلق ہے۔ جن سے آغا صاحب نے مختلف قسم کے تاثرات پیدا کیے ہیں جو اس کتاب کا حصہ ہیں وہ تاثرات آغا صاحب کے ذاتی تاثرات ہیں اور کتاب میں یہ ذاتی تاثرات سیاسی اور تاریخی واقعات پر کہیں کہیں اثر انداز بھی ہوئے ہیں۔ جسکی بنا پر ہم اس کتاب کو تاریخی دستاویز کا درجہ نہیں دے سکتے۔ یہ کتاب درحقیقت حسین شہید سہروردی کی زندگی کا ایک خوبصورت خاکہ ہے۔ چونکہ سہروردی صاحب ایک سیاسی آدمی تھے۔ لہٰذا سیاسی واقعات کا پس منظر میں آجانا ضروری تھا۔

یہ کتاب اگرچہ حسین شہید سہروردی کے سیرت و کردار کا آئینہ ہے۔ سہروردی صاحب کے سیرت و کردار کی یہ تصویر اجمالی ہے تفصیلی نہیں۔ آغا صاحب نے کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اور آغا صاحب کے قلم کا کمال ہے۔ مثلاً سہروردی صاحب کے متعلق ان کے یہ الفاظ دیکھیے کوزے میں دریا والی بات معلوم ہوتی ہے

"یہ معاشرہ کی ہر جماعت میں رہ سکے اور اکثر و بیشتر رہ چکے تھے۔ انہوں نے سبھی قسم کے دور دیکھے اور ہر قسم کے لوگوں سے میل جول رکھا۔ بادشاہوں کے مہمان ہوئے ان کی میزبانی بھی کی۔ متحدہ ہندوستان میں ملک کے سب سے بڑے صوبے بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ملک آزاد ہوا حزبِ اختلاف کے قائد ہو گئے۔ پھر وزارتِ عظمیٰ کا تاج پہنا۔ سکندر مرزا کی سازش کا شکار ہو کر باہر نکلے تو

معاً بھول گئے کہ ابھی کچھ دیر پہلے وزیرِ اعظم تھے۔ وہ زندگی کو روگ لگانے
یا کسی شئے کے کھو جانے پر سوگ منانے کے سرے سے قائل ہی نہ تھے۔
اپنے دماغ کو حالات کے مطابق ڈھالنا اور اپنے دِل کو سیلاب کی رو
میں بھی خوش رکھنا اِن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مارشل لاء کی حکومت
نے انہیں قید کیا وہ قید ہو گئے۔ اقبال و زوال کی ہر گھاٹی عبور کر چکے
تھے۔ اِس بارے میں کسی ملال و خیال کے عادی نہ تھے۔"[۱]

اِس طرح آغا صاحب نے حسین شہید سہروردی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پہ تبصرہ کیا ہے۔ اور اِن کے مختلف کارنامے گنوائے ہیں۔ تحریکِ پاکستان میں سہروردی صاحب کے کردار سے لیکر حزبِ اختلاف کے قیام تک اور پھر وزارتِ عظمیٰ سے لیکر وفات تک چیدہ چیدہ واقعات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اِس کے علاوہ ضمنی طور پر سکندر مرزا، میاں ممتاز احمد دولتانہ، نواب ممدوٹ، مشتاق احمد گورمانی، سردار عبدالرّب نشتر، خواجہ ناظم الدین اور بعض دوسرے قومی رہنماؤں کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ اور اِن شخصیات پر آغا صاحب نے اپنے ذاتی تاثرات بھی قلم بند کیے ہیں۔ لیکن سکندر مرزا کے بارے میں اُن کے تاثرات قوم کے اجتماعی تاثرات معلوم ہوتے ہیں۔ آغا صاحب نے مرزا کی ریشہ دوانیوں محلاتی سازشوں، عیارانہ چالوں اور گھٹیا حربوں کا پردہ چاک کیا ہے۔ کتاب میں ون یونٹ کی افادیت وزارتوں کے بننے اور بگڑنے، حزبِ اختلاف کے قیام کردار، رہنماؤں کے طرزِ عمل۔ آغا صاحب اور سہروردی کے سیاسی جلسوں اور ملک کی عام سیاسی صورت حال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔۔ مجموعی طور پر یہ کتاب حسین شہید سہروردی کی سیاسی اور عوامی زندگی کا خوبصورت خاکہ ہے۔

---

[۱] حسین شہید سہروردی ص نمبر ۱۸

میاں افتخار الدین یہ کتاب پہلی مرتبہ فروری ۱۹۶۷ میں چٹان پرنٹنگ پریس نے شائع کی جو ۱۱۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

اِس کتاب کا انتساب باغبان پورہ کے لوگوں کی سرد مہری کے نام ہے جو آغا صاحب نے باغبانپورہ میں میاں صاحب کے جنازے کے موقع پر محسوس کی۔

اِس کے بعد ایک صفحہ پر یہ شعر لکھا گیا ہے۔

"زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا"
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے!

یہ کتاب آغا صاحب نے "دو چار روز" میں لکھی ہے۔[1] تاہم میاں صاحب کے بارے میں یہ خیالات ایک مدت سے آغا صاحب کے ذہن میں موجود تھے۔ یہ کتاب اُن ہی خیالات کی تلخیص ہے۔[2] آغا صاحب نے اِس حقیقت کو خود ہی بے نقاب کر دیا ہے کہ میاں صاحب اور اُن میں فکر و نظر کا اختلاف رہا ہے۔[3] یہ میاں صاحب کی سوانح عمری نہیں بلکہ بقول آغا صاحب انہوں نے،

"میاں صاحب کی تجزیاتی تصویر ان کے سیاسی آئینے میں دیکھی اور اپنے ادبی چوکھٹے میں جڑ دی ہے"

گویا یہ میاں افتخار الدین کی سیاسی زندگی کا عکس ہے۔ اور آغا صاحب کا ذاتی تأثر ہے۔ اِسی لیے انہوں نے اِس کہانی کو تحریکِ شہید گنج سے شروع کیا ہے کیونکہ آغا صاحب خود بھی اسی دور میں سیاست میں آئے تھے اور تا دیر سیاست میں رہے۔ میاں صاحب کے جس سیاسی دور کا یہ افسانہ ہے وہی شورش صاحب کی سیاسی زندگی کا زمانہ بھی ہے۔ اِس حقیقت سے تو ہر کوئی واقف ہے کہ میاں افتخار الدین ...... ۱۔ کمیونسٹ تھے۔

۲۔ دولت مند اور جاگیر دار تھے۔

۱۔۳ بحوالہ میاں افتخار الدین ص نمبر پہلا / دوسرا

۲ میاں افتخار الدین ص نمبر دوسرا۔

آغا صاحب نے میاں صاحب کے سیاسی خاکے کو اِسی پس منظر میں لکھا ہے ۔ کمیونزم اور جاگیرداری میں چونکہ کبھی ملاپ نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا اگر یہ دونوں صفات کسی ایک فرد میں پیدا ہو جائیں تو تضاد کے پیدا ہو جانے میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا ۔ میاں افتخار الدین اِسی تضاد کا نام ہے ۔ جو وقت پڑنے پر کمیونسٹ اور طبعیت کے فطری افتاد میں جاگیردار تھے ۔ وہ کمیونسٹوں میں کمیونسٹ نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ جاگیردار تھے اور جاگیرداروں میں جاگیردار نہیں ہو سکتے کیونکہ کمیونسٹ تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ کامریڈ فیروزالدین منصور جو پاکستان میں سجاد ظہیر کی جگہ کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر تھے[۱] جس کا میاں صاحب نے وظیفہ بھی لگا رکھا تھا اور ایک دوسرے کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے[۲] ۔ جب آغا صاحب نے کامریڈ منصور سے پوچھا کہ کمیونسٹوں نے آغا صاحب کو کس بنا پر لیڈر بنا رکھا ہے[۳] تو

"کہنے لگے ۔ ۔ ۔ ہم نے انہیں لیڈر نہیں بنایا یہ ایک ناگزیر مرحلہ ہے ۔ جس سے ہم گزر رہے ہیں ۔ اس وقت اگر کوئی دولت مند ہمارے ہاتھ میں آ کر ہمارے خیالوں کی اشاعت کا باعث بنتا ہے یا ہمارے ذہن کی معاونت کرتا ہے تو ہمیں اِس کو ساتھ ملانے میں کوئی عیب نہیں ۔ رہا اِس پر اعتماد کا سوال تو یہ خارج از وجود ہے ۔ ہم میاں صاحب کا قطعاً اعتماد نہیں کرتے ۔ لیکن اُن سے جس قدر فائدہ اُٹھا سکتے ہیں وہ اٹھا لینا چاہتے ہیں میاں صاحب میں اپنے طبقے کی تمام تر برائیاں ہیں ۔ اگر آج پرولتاری انقلاب آ جائے تو سب سے پہلے جس شخص کا سر قلم ہو گا وہ افتخار ہو گا ۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں میاں صاحب اور کمیونسٹوں کے طرزِ عمل کا پتہ چلتا ہے ۔ آغا صاحب نے میاں صاحب کے اِس تضاد کو حالات و واقعات کی روشنی میں یہ لکھا ہے ۔ جسے نکرو نظر کا اختلاف نہیں کہا جا سکتا ، جو آغا صاحب اور میاں صاحب میں موجود تھا ۔ آغا صاحب نے اس

[۱-۳] بحوالہ میاں افتخار الدین ص نمبر ۳۵ / ۳۶

[۴] میاں افتخار الدین ص نمبر ۳۶ ، ۳۷

میاں صاحب کی سیاسی تصویر میں متضاد رنگوں کے ملاپ نے جو تھوڑی بہت دلکشی پیدا کی تھی آغا شورش کاشمیری کے سیاسی تجزیے نے اُن رنگوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔

اِس طرح ہر رنگ اپنی انفرادی حیثیت میں کوئی خاص کشش نہیں رکھتا۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے، آغا صاحب نے ایک ایک لفظ جانچ پرکھ کر استعمال کیا ہے۔

تحریر میں وہ بہاؤ نہیں جو عام طور پر آغا صاحب کے ہاں مل جاتا ہے بلکہ ایک نقاد کی احتیاط ملتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب نے بعض تلخ باتوں کو زبان کی نرمی سے معتدل بنا دیا ہے مثلاً

"میاں صاحب جب کسی دوست سے آنکھیں پھیرتے تو ایشیائی شاعری کے روایتی معشوق کی طرح آنِ واحد میں بدل جاتے تھے۔ پھر نہ انہیں وصال کے لمحوں کا احساس ہوتا نہ عہد و پیماں کا پاس بعض لفظ اُن کی لغت میں تھے ہی نہیں۔ مثلاً ہجر کا لفظ وہ سمجھتے تھے کہ شاعروں کی ذہنی اُپج ہے۔ ہاتھ تنگ ہو تو اِس کا نام ہجر ہے۔ روپیہ پاس ہو تو وصال کی خرید و فروخت مشکل نہیں[1]"

لہجے کی اِس نرمی کے باوجود "میاں افتخار الدین" ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں میاں صاحب سے تعلق رکھنے والوں کیلئے آغا صاحب سے اختلاف رکھنے کی گنجائش موجود ہے۔

---

[1] میاں افتخار الدین ص نمبر ۶۰

ایک فقرے میں میاں افتخار الدین کی سیرت کے تضاد کی مکمل تصویر پیش کردی ہے

"وہ شدومد سے دولت کی تقسیم کے "پرچارک" تھے لیکن خود کبھی ایک کوڑی بھی تقسیم نہ کی"[1]

گویا میاں صاحب اپنے ترقی پسند نظریہ سے مخلص نہیں تھے۔ آغا صاحب نے اپنی اس کتاب میں میاں صاحب کی دولت اور جاگیر کے متعلق بھی بتایا ہے کہ میاں صاحب رئیس کیسے بنے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ وہ کمیونسٹ کیسے ہوئے۔ انہوں نے اپنی دولت کے سہارے اخبارات نکالے کمیونسٹوں کو اپنی ذات کو اچھالنے کیلئے استعمال کیا۔ اپنے ترقی پسندانہ اخباری طرزِ عمل سے بہت سی دولت بھی کمائی۔ دوسرے کمیونسٹ ممالک میں صاحبِ اعتبار ہوئے۔ کمیونسٹ ممالک سے مختلف چیزوں کے درآمدی لائسنس میاں صاحب کی پالیسی کا خاص حصہ تھے۔ میاں صاحب کے اخبار یعنی "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کا طرزِ عمل بھی میاں صاحب ایسا ہی تھا۔ یہ اخبار بظاہر حزبِ اختلاف کا کردار ادا کرتے مگر

"ان اخبارات کا اختلاق تصور بھی ایک خاص قسم کی سیاسی فکر میں ڈھلا ہوا تھا"[2]

یعنی اختلاف کے پردے میں اقتدار پرستی سے کام لیا۔ اور اس طرزِ عمل سے اُن

---

1. میاں افتخار الدین — شورش کاشمیری — ص نمبر ۳۶/۳۷
2. ایضاً — ص نمبر ۲۰

کی شہرت اور دولت میں خوب اضافہ ہوا۔ میاں افتخار الدین میں ایک جاگیردار اور سرمایہ دار کی ساری روایتی خصوصیات موجود تھیں۔ مگر اُن کی دولت شاہد و شراب[1] کی خریداری میں کبھی صرف نہیں ہوئی۔ بلکہ اپنی دولت کو سیاست کے کاروبار میں لگایا اور خاصا فائدہ اٹھایا۔

مجموعی طور پر میاں صاحب کی یہ تصویر خوش رنگ نہیں ہے۔ متضاد رنگوں کی تیزی نظروں کیلئے جاذب نہیں بلکہ ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ میاں صاحب کی سیاسی تصویر میں متضاد رنگوں کے ملاپ نے جو تھوڑی بہت دلکشی پیدا کی تھی آغا شورش کاشمیری کے سیاسی تجزیے نے ان رنگوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔ اس طرح ہر رنگ اپنی انفرادی حیثیت میں کوئی خاص کشش نہیں رکھتا۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے۔ آغا صاحب نے ایک ایک لفظ جانچ پرکھ کر استعمال کیا ہے۔ تحریر میں خطابت کا وہ بہاؤ نہیں جو عام طور پر آغا صاحب کے ہاں مل جاتا ہے بلکہ ایک نقاد کی احتیاط ملتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب نے بعض تلخ باتوں کو الفاظ کی نرمی سے معتدل بنا دیا ہے۔ مثلاً

"میاں صاحب جب کسی دوست سے آنکھیں پھیرتے تو ایشیائی شاعری کے روایتی معشوق کی طرح آن واحد میں بدل جاتے تھے۔ پھر انہیں نہ وصال کے لمحوں کا احساس ہوتا نہ عہد و پیماں کا پاس۔ بعض لفظ اُن کی لغت میں تھے ہی نہیں مثلاً ہجر کا لفظ وہ سمجھتے تھے کہ شاعروں کی ذہنی اُپج ہے۔ ہاتھ تنگ ہو تو اس کا نام ہجر ہے۔ روپیہ پاس ہو تو وصال کی خرید و فروخت مشکل نہیں۔"[2]

لہجے کی اس نرمی کے باوجود "میاں افتخار الدین" ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں میاں صاحب سے تعلق رکھنے والوں کیلئے آغا صاحب سے اختلاف رکھنے کی گنجائش موجود ہے۔

۱۔ بحوالہ میاں افتخار الدین — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۲

۲۔ میاں افتخار الدین — ؍؍ — ص نمبر ۶۰

چہرے

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۶۵ء میں جاوید پریس میکلوڈ روڈ سے شائع ہوئی جو ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور اس کے ناشر انور عارف مالک مکتبہ ماحول کراچی۔

آغا صاحب نے اِس کتاب میں پاک و ہند کے بڑے لوگوں کی قلمی تصویریں بنائی ہیں۔ جنہیں انہوں نے قریب سے دیکھا۔ اِس بات کی وضاحت آغا صاحب نے اِس کتاب کے ابتدائیہ میں اس طرح کی ہے۔

"راقم التحریر خوش قسمت ہے کہ اِس نے ربع صدی کے ہر بڑے پاکستانی و ہندوستانی کو دیکھا اور شاید قریب سے پڑھا ہے۔ ان میں راہنما بھی تھے۔ علماء بھی تھے۔ ادباء بھی تھے۔ مدیر بھی تھے۔ وزیر بھی تھے۔ صحافی بھی تھے، شاعر بھی تھے اور ذاتی دوست بھی۔"[1]

کتاب کی ترتیب اِس طرح ہے۔

ا۔ رہنما اور علماء کے چہرے ہیں۔ جن میں قائداعظم۔ علامہ اقبال۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا محمد علی۔ مولانا حسین احمد مدنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اِس کے علاوہ بھی اس عنوان کے تحت بہت سے لوگوں کی قلمی تصویریں بنائی گئی ہیں۔ جن کی کل تعداد ۲۸ ہے۔ اِس حصے میں صدر ایوب خان کا چہرہ بھی شامل ہے۔ جس کے متعلق جناب انور عارف صاحب نے معذرت کے عنوان سے لکھا ہے کہ

"صدر ایوب کا چہرہ آغا شورش کاشمیری صاحب نے جنوری ۱۹۶۵ء

---

[1] چہرے شورش کاشمیری ابتدائیہ

میں لکھا اور اس وقت سوائے پہلی کاپی کے پوری کتاب
چھپ چکی تھی۔ لہذا ہم اسے ترتیب سے قطع نظر ابتدائی
صفحات میں شامل کر رہے ہیں"

۲۔ "وزارتی چہرے" کے عنوان سے مختلف وزیروں کے چہرے شامل ہیں، جن میں خان ممدوٹ۔ شوکت حیات۔ محمد ممتاز دولتانہ اور ملک فیروز خان نون قابلِ ذکر ہیں۔ وزراء کی کل تعداد ۱۶ ہے۔

۳۔ "خواتین کے چہرے" اس حصے میں محترمہ فاطمہ جناح۔ بیگم شاہنواز۔ وجے لکشمی پنڈت اور مسز سروجنی نائیڈو کے چہرے شامل ہیں۔

۴۔ "صحافتی وادبی چہرے" صحافتی چہرے صرف دو ہیں، یعنی ظفر علی خان اور حمید نظامی اس کے بعد ادبی چہرے ہیں، جن کی تعداد ۲۶ ہے۔ جن میں دیوان سنگھ مفتون۔ محمد سرور۔ بابائے اردو۔ غلام رسول مہر۔ عبدالمجید سالک۔ چراغ حسن حسرت قابل ذکر ہیں۔

۵۔ شاعروں کے چہرے کے عنوان سے ۱۲ چہرے ہیں، جن میں رابندر ناتھ ٹیگور۔ فیض احمد فیض حفیظ جالندہری۔ تاجور نجیب آبادی۔ جوش ملیح آبادی۔ جگر اور اختر شیرانی قابلِ ذکر ہیں۔

۶۔ دوستوں کے چہرے۔ یہ کل ۵ چہرے ہیں، پنڈی داس۔ چوہدری محمد حسین اور بابا علی بخش قابل ذکر ہیں۔

اس طرح اس کتاب میں کل ۹۲ چہرے ہیں۔ جن میں ۴ عورتوں کے چہرے ہیں باقی سب مرد ہیں اور کسی نہ کسی عنوان بڑے اور مشہور آدمی ہیں۔

۱۔ چہرے شورش کاشمیری معذرت دانور عارف

اِس کتاب کے "پیش لفظ" میں پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں۔

"شورش صاحب کے اُن شخصیتوں کے متعلق یہ تاثرات کہاں تک مبنی بر حقیقت ہیں، یہاں اِس بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا ——— شورش صاحب غیر جانبدار اور معروضی بہت کم ہی ہوتے ہیں ——— یہ "چہرے" دراصل ان شخصیتوں کے متعلق شورش صاحب کے ذاتی تاثرات ہیں اور بس ——— ان میں آپ حقیقتِ واقعی کو زیادہ تلاش نہ کریں ——— ایک فن کار نے ان شخصیتوں کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسے وہ جیسی نظر آئیں، اُس نے اپنے موقلم سے اُن کے خاکے کھینچ دیئے۔ ان خاکوں کی حقیقت پسندی سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے اور لازماً ہوگا۔ لیکن یہ "چہرے" ہیں بڑے دِلکش اِس بات سے آپ انکار نہیں کریں گے۔"[1]

پروفیسر محمد سرور صاحب نے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی یہ کہہ دیا ہے کہ "شورش صاحب غیر جانبدار اور معروضی ۔۔ کم ہی ہوتے ہیں۔" اِس سلسلے میں آغا صاحب نے بھی کوئی دعویٰ نہیں کیا کہ یہ "چہرے" مبنی بر حقیقت ہیں بلکہ انہوں نے اپنے ابتدائیہ میں آخری جملہ بڑا معنی خیز تحریر کیا ہے کہ

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ خوبصورت الفاظ کانوں کو اور خوبصورت چہرے آنکھوں کو دھوکہ دے جاتے ہیں۔"[2]

گویا آغا صاحب اِس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کے بیانات میں غلطی کا امکان ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اُن سے چہرہ پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو۔ لیکن ان چہروں میں اکثریت ایسے چہروں کی ہے۔ جو لوگوں کے جانے پہچانے ہیں۔ جن کے متعلق کوئی سی غلطی بھی نقصان زد ہو سکتی ہے لیکن یہ نشان دہی بھی نشان دہی کنندہ

ا۔ چہرے ص نمبر ۱۸/۱۹

۲۔ چہرے ابتدائیہ

کا اپنا ذاتی اندازہ ہوگا کہ وہ کسی شخصیت کو کیا سمجھتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح آغا صاحب نے کسی شخصیت کو سمجھا ہے۔ انسانی روابط اور رشتے اگرچہ پائیدار ہوتے ہیں مگر نازک بھی۔ کسی انسان کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں عقل کی رہنمائی سے زیادہ جذبات کی کرم فرمائی ہوتی ہے اور بڑے لوگوں کے متعلق آراء میں جذباتیت کا عنصر عقیدت کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ اور انسانی جذبات کا یہ عالم ہے کہ ہر آن، ہر لمحہ، ہر ثانیہ اور ہر دقیقہ بدل سکتے ہیں اور بعض دفعہ ماہ و سال کی گردشیں بھی ان میں تغیر پیدا نہیں کر سکتیں اور بعض اوقات اِس اثبات میں ایک جملہ یا ایک فقرہ بلکہ لہجہ کی سرد مہری یا نادانستہ تغافل کیشی بھی اُن کو تہہ و بالا کر سکتی ہے۔ جس کا کوئی مستقل معیار یا کوئی قاعدہ اور کلیہ نہیں لہذا اسے پسند یا ناپسند کا نام دیا جا سکتا ہے۔ "بس ہے" اور "نہیں ہے"۔ "کیوں" کو یہاں کوئی دخل نہیں۔ لہذا کسی شخص کی پسند اور ناپسند کے نفسیاتی عوامل تلاش کرنا یا کسی محبت اور نفرت کی تہہ میں چھپے ہوئے محرکات کو خارج میں کسی طرزِ عمل اور جذبہ کا نام دینا۔ خود اپنے پر الزام لینا ہے۔ جیسے کوئی جانب داری کا نام دے گا۔ ممکن ہے کہ حکم لگانے والے کی نفسیات کا تجزیہ پہلے سے زیادہ بھیانک ہو۔ اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ لہذا بہتر ہے کہ ہر آدمی کو اپنی رائے کے اظہار یا پسند اور ناپسند کی آزادی دی جائے۔ ایسا کرنے سے معاملہ نہ صرف سلجھ جاتا ہے بلکہ انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کسی کے متعلق کوئی حکم لگائیں یہ آپ کی پسند اور ناپسند کا مسئلہ ہے اگر میں اسے تسلیم نہ کروں یہ میری پسند اور ناپسند کا مسئلہ ہے قطع نظر اس سے کہ کیوں۔ شورش صاحب نے انسانوں کے متعلق اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ انسان سب کے سب اگر بڑے نہیں تو سب کے سب نمایا ضرور ہیں۔ لہذا لوگ ان کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور جانتے اور کوئی نہ کوئی رائے رکھتے ہیں۔ اور یہ لوگوں کی اپنی پسند اور ناپسند ہے کہ کوئی کسی کو کیا سمجھتا ہے اور کیسا سمجھتا ہے۔ لہذا "چہرے" پڑھ کر یقیناً لوگ آغا صاحب سے اختلاف کریں گے اور کرنا چاہیئے لیکن کوئی آدمی بھی اِس کی وجہ نہیں بتا سکتا کہ کوئی کیوں کسی کو ایسا سمجھتا ہے۔ کسی واضح عصبیت کے باوجود بھی نتائج غلط ہو سکتے ہیں۔ ہم ایک بہت بُرے آدمی کو بھی اچھا سمجھ سکتے ہیں۔ اگر اُس کا سلوک ہمارے ساتھ اچھا ہو۔ اسی کا نام ذاتی تاثر ہے۔ لہذا

آغا صاحب کے تاثرات پر جو اختلافات ہونگے وہ بھی لوگوں کے ذاتی تاثرات ہونگے۔ جس طرح آغا صاحب کے تاثرات ذاتی ہیں۔ لہذا پروفیسر محمد سرور صاحب کا یہ کہنا درست نہیں کہ "شورش صاحب غیر جانبدار اور معروضی بہت کم ہی ہوتے ہیں۔" البتہ اسے پروفیسر صاحب کا ذاتی تاثر سمجھنا چاہیے۔ بہرحال بڑے آدمیوں کے متعلق حکم لگانا یا کسی تاثر کو عام کرنا بڑا خطرناک کام ہے۔ خود حکم لگانے اور کسی تاثر کو عام کرنے والے اپنا تاثر اُن عقیدت مندوں کی نظروں میں ضرور خراب کر لیتے ہیں۔

جو اپنے ممدوح کو کسی دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ کام بڑا جرأت مندانہ ہے اور یہی جرأت مندی حقیقت میں شورش کاشمیری میں بھی ہے کہ وُہ جو کچھ لکھتا ہے بے خوف ہو کر لکھتا ہے اور جو کچھ کہنا ہوتا ہے۔ وُہ کسی نفع و ضرر کے خیال سے ماورا ہو کر کہتا ہے۔ آغا صاحب نے ان شخصیات کے متعلق اپنے جن ذاتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اُس میں نرمی گرمی یا کمی بیشی کا امکان تو ہے۔ لیکن اگر اس سے قطع نظر کر لیا جائے کہ کچھ کہا گیا ہے وہ ٹھیک ہے اور جس طرح کہا گیا ہے اس میں یقیناً کوئی خامی نہیں جیسا کہ پروفیسر سرور صاحب نے لکھا ہے کہ یہ چہرے بڑے دلکش ہیں۔

چہرہ نگاری درحقیقت الفاظ کی میناکاری ہے۔ جس طرح شاعر سراپا نگاری میں نگینے جڑتا ہے اُسی طرح نثر نگار کو چہرہ نگاری میں بندش الفاظ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ چونکہ لفظوں سے تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ لہذا کوئی ایک اکھڑا ہوا لفظ بھی تصویر کو حقیقت سے دور اور اُس کے حسن کو مجروح کر سکتا ہے۔ لیکن آغا صاحب کو زبان پر جو عبور ہے اُس نے ان چہروں کو بدزیب یا بدصورت ہونے سے بچا لیا ہے۔ ان چہروں کی تصاویر اگر ان کی قلمی تصاویر کے مقابلے میں لائی جائیں تو چشمِ تصور اُن کی صداقت کی تصدیق کر سکتی ہے۔ مثلاً صدر ایوب کی قلمی تصویر دیکھئے۔

"قد، ترکش کے تیر کی طرح سیدھا۔ بدن، دوہرا، رنگ گورا، سرخ و سفید
آنکھیں کچھ سوچتی ہوئیں۔ کچھ بولتی ہوئیں۔ کچھ کہتی ہوئیں، ہر لحظہ متحرک،
میسر ہوتے تو اس عمر میں بھی مطلع کہہ لیتے۔ پیشانی شگفتہ لیکن جھریوں کی
طبع آزمائی سے خالی۔ چہرہ بہر حال غصہ کی لو دیے جاتا ہے —— جسم، سڈول
پیراہن کسی کیلئے تصویر ہے[۱]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی قلمی تصویر اس طرح بنائی ہے۔

"دراز قامت، دوہرا بدن، گول چہرہ، سفید داڑھی، ظالم آنکھیں،
طوفانی لہجہ، کوندے تو بجلی، کڑکے تو بادل، اٹھے تو آندھی ——[۲]

اور یہ قلمی تصویر سید مودودی کی ہے۔

"دوہرا بدن۔ میانہ قامت، چمپئی رنگ، بیضوی آنکھیں، سیحی داڑھی،
خوش پوشاک زبان، شستہ لہجہ رفتہ قلم کے دھنی۔ جماعت اسلامی کے
قائد"[۳]

یہ تو گویا نین نقش کی بات تھی جس کے حقیقی ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن ان نقوش کو ——
ابھارنے میں پس منظر کے رنگوں کا بڑا دخل ہے اور یہ پس منظر کے رنگ ہی مل جل کر ان نقوش
کی تکمیل کرتے ہیں تو تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اور یہ رنگ ان شخصیات کی وہ خصوصیات ہیں جن کو آغا
صاحب چھوٹے چھوٹے اور بیتے تلے فقروں میں ادا کرتے ہیں جو یقیناً بڑا ہی مشکل فن ہے۔ مولانا ظفر علی
خان کے متعلق آغا صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن یہ چند جملے ظفر علی خان کی زندگی کا حاصل کہے جا سکتے
ہیں۔

۱۔ ۲۔ ۳ چہرے ص نمبر ۳۰، ۴۷، ۴۵

"وہ تمام زندگی چو مکھی لڑتے رہے، ادھر ہندوؤں سے نبرد آزما ہیں تو ادھر انگریزوں سے دو دو ہاتھ کر رہے ہیں۔ ابھی رجعتی مسلمانوں سے زور آزمائی ہے اور ابھی اپنوں ہی سے دست و گریباں ہیں . . . .

ظفر علی خان نے بیسیوں تحریکیں پیدا

. . . .

کیں۔ بیسیوں ایڈیٹر بنائے اور بیسیوں قومی کارکن اٹھائے۔ لیکن اس کے باوجود تاریخ کے صفحوں نے ان کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ ان کے نام پر ایک بے نام سا غبار پڑا ہوا ہے"۔[۱]

محترمہ فاطمہ جناح کے خاکے کو پروفیسر محمد سرور نے بہترین خاکہ قرار دیا ہے محترمہ فاطمہ جناح کے متعلق آغا صاحب کے یہ چند جملے محترمہ کے پاکستان میں مقام کو متعین کرتے ہیں۔

"وہ پاکستان کی واحد مرکزی شخصیت ہیں۔ جس سے عوام محبت رکھتے ہیں"۔ انہیں یورپی معاشرہ کی ریس میں خاتونِ پاکستان کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ خاتونِ پاکستان ہی نہیں بلکہ پاکستانی عوام کی ارادت کا مرجع بھی ہیں — ان سے ٹکر لینا تقدیر سے ہی ٹکر لینا ہے —

ان سے قومی لیڈر شپ کے قصر و ایوان کی ایک ایک اینٹ کانپتی ہے جن لوگوں کے تصرف میں "تاج و تخت" ہیں وہ بھی اس کے دروازہ پر "سجدۂ سہو" کیلئے آتے ہیں۔ الغرض وہ مشرق و مغرب کے محاسن کا ایک قابلِ تکریم امتزاج ہے، کھلے تو پھول، سمٹے تو دھارا، ابھرے تو جوار اور نکھرے تو افق جثہ صبا سے نازک اور بدن ایک مشتِ استخواں جس پر حیا اور رعنائی آپ چڑھی ہوئی ہے"۔[۲]

---

[۱] چہرے ص ۱۵۷ / ۱۵۸ [۲] چہرے [illegible] ص نمبر ۷۸

اس طرح سر فضل حسین کے متعلق یہ باتیں گویا میاں صاحب کی شخصیت کا نچوڑ ہیں

"غالباً اس بارے میں کوئی شخص بھی دو رائیں نہیں رکھتا کہ سر میاں فضل حسین سے زیادہ کائیاں شخص ہندوستانی مسلمانوں کی سرکاری سیاست میں نہیں گزرا ہے ـــ مرحوم میاں صاحب نے بڑے بڑوں کو چت کیا ان کے سامنے بڑے بڑے وائسرائے بھی دم نہیں مارتے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے ان کا ہمہمہ قائم رہا۔ وہ پہلے شخص تھے جنہیں کانگریس کی سیاست کے ہندوانہ برگ و بار نے مایوس کیا اور فرقہ وارانہ سیاست کی راہ پر نکل گئے۔"[1]

میاں افتخار الدین پر آغا صاحب ایک کتاب لکھ چکے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ میاں صاحب سے متعلق آغا صاحب کی رائے اچھی نہیں۔ یہی حال ڈاکٹر شیخ عالم صاحب کا ہے۔ لیکن دیوارِ زنداں میں ڈاکٹر عالم صاحب کے متعلق کوئی اچھا تاثر نہیں ملتا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر عالم صاحب کا مقابلہ میاں افتخار الدین سے اس طرح کیا ہے

"ڈاکٹر شیخ محمد عالم جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوتے تو میاں افتخار الدین ہوتے۔ اور افتخار الدین سرگودھا کے قانون گو خاندان میں نشوونما پاتے تو ڈاکٹر شیخ محمد عالم ہوتے۔ عالم اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور افتخار الدین آج کل انگلستان میں ملکۂ معظمہ کا جشنِ تاجپوشی دیکھنے تشریف لے گئے ہیں۔ ایک آنجہانی ہیں ایک ایں جہانی ہیں لیکن دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً دونوں دوستوں کے معاملہ میں

[1] چہرے ص نمبر ۱۴۶ / ۱۴۷

غیر مخلص سب کے دوست کسی کے بھی دوست نہیں ۔ دونوں کے
قول و فعل میں تضاد ـــــ لِمَ تقولون مالا تفعلون ـــــ کی
دلچسپ تفسیر ـــــ دونوں نے سیاسیات کی وادی میں گھاٹ
گھاٹ کا پانی پیا ـــــ دونوں اپنی گرہ کے پکے دونوں عوام کی قیادت
کا دم بھرتے لیکن دونوں عوام کو کالانعام سمجھتے ۔ دونوں الفاظ
کے شعبدہ باز ـــــ عالم نے اخبار نکالا توڑ لو دیا ۔ افتخار الدین
نے پروان چڑھایا ۔ دونوں سیاسی کارکنوں کو استعمال کر نے
میں جہرد بیگ ، البتہ قابلیت کے اعتبار سے دونوں میں
زمین و آسمان کا فرق ـــــ !
عالم ایک بڑا کامیاب بیرسٹر ایک تیز مقرر اور ایک زمانہ ساز
سیاستدان تھا ۔ افتخار ایک ناکامیاب بیرسٹر ، ایک روکھا
پھیکا مقرر اور ایک ایک موقع پرست سیاستدان ہے[1]" ۔

کتاب میں اس قسم کے خاکے یقیناً متنازعہ فیہ ہیں لیکن جہاں تک زبان اور اسلوب کا تعلق ہے ۔ اُس نے چہروں کو اتنا صحت مند بنا دیا ہے کہ اب اُن پر بڑھاپے کا بھی کوئی خطرہ نہیں ۔ اور یہی اُس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے کہ شورش صاحب نے بڑے بڑے اور نمایاں لوگوں کی زندگیاں اپنی فن کاری سے چند جملوں میں سمیٹ دی ہیں ۔

---

[1] پہ چہرے ص نمبر ۸۱/۸۲

تحریکِ ختم نبوت - یہ کتاب پہلی دفعہ جنوری ۱۹۷۶ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی - اور دوسری بار جنوری ۱۹۸۵ء میں چھپی۔ اس کتاب کا انتساب شہیدانِ تحریک ختم نبوت کے نام ہے۔

کتاب کے آغاز میں چند تصاویر دی گئی ہیں پہلی تصویر پیر صاحب گولڑہ شریف حضرت مہر علی شاہ صاحب کی ہے۔ اس کے بعد حکیم الامت علامہ اقبال کی تصویر ہے۔ پھر مولانا ظفر علیخاں اور امیرِ شریعت سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی تصاویر ہیں۔ اور آخر میں آغا شورش کی اپنی تصویر ہے۔ اس کتاب میں مندرجہ بالا شخصیتوں کے حوالے سے ہی ختم نبوت کی تحریک پر روشنی ڈالی گئی۔

کتاب کے آغاز میں مسلمانوں کے زوال اور انگریزی اقتدار کے محرکات پر روشنی ڈال کر یہ بتایا ہے۔ کہ انگریز کیلئے ہندوستان میں سب سے بڑا خطرہ مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ تھا جسے ختم کرنے کیلئے انگریزوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کو مہرے کے طور پر استعمال کیا۔ متنبی مرزا غلام احمد نے پہلے دوسرے مذاہب سے مناظرہ بازی کر کے مسلمانوں کی ہمدردیاں حاصل کیں پھر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا اور مسلمانوں میں یہ بات عام کرنیکی کوشش کی کہ اب جہاد کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ انگریزی حکومت کی وفاداری ہی مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ متنبی مرزا غلام احمد نے جس وقت نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس وقت سے اس کا محاسبہ شروع ہوا۔ بڑے بڑے علمائے کرام نے دینی طور پر مرزا کو جھوٹا ثابت کیا۔ اس کے خلاف سب سے مؤثر آواز پیر مہر علی شاہ صاحب کی تھی۔ جنہوں نے غلام احمد قادیانی کو دینی محاسبہ کی حد تک بے بس کر دیا۔ مولانا ظفر علیخاں نے سب سے پہلے مرزائیوں کا سیاسی محاسبہ کرنا شروع کیا۔ اور پہلی بار مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ

قادیانی مذہبی تنظیم کی آڑ میں ایک سیاسی تنظیم ہے۔ جسے انگریز نے اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کیلئے تخلیق کیا ہے۔ قادیانیوں کے خلاف سب سے بڑا محاذ احرار کا تھا۔ اس نے اس کو ایک باقاعدہ تحریک کی صورت دی اور ہر جگہ اور ہر میدان میں قادیانیوں کا مقابلہ کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خطابت نے قادیانیوں کو گالی بنا دیا۔ اس کے بعد علامہ اقبال نے جو کچھ مرزائیت کے خلاف لکھا۔ اس نے علمی و فکری سطح پر مرزائیت کو بالکل ختم کر دیا۔ علامہ اقبال نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا آج تک مرزائی اُمت اس کا جواب پیدا نہ کر سکی۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے واقعات ہیں۔ جس میں مسلمانوں کے تمام فرقوں اور علماکرام کا ذکر ہے جنہوں نے اس تحریک میں حصہ لیا اور پھر حکومت اور اس کی سیاست پر بھرپور تبصرہ ہے۔ جس نے اپنی رعایا کے خلاف اس فوج کو استعمال کیا جو مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اسی قوم کا ایک حصہ بھی تھی جس کے خلاف وہ استعمال ہوئی۔ اور پھر اس ڈرامہ پر کڑی تنقید کی ہے جو "جسٹس منیر" کی معرفت عدالت میں لکھا گیا۔ جس کا انجام آج بھی منیر انکوائری رپورٹ کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ مرزائیت کے خلاف آغا صاحب کی اپنی جدوجہد پر مشتمل ہے۔

قادیانیت آغا شورش کاشمیری کیلئے ایک پامال موضوع ہے۔ انہوں نے اس سلسلے میں جتنا کچھ لکھا اور کہا ہے اور کسی کے حصے میں نہیں آیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے بلاشبہ اپنی میں مرزائیت پر بہت کچھ کہا ہے لیکن انہوں نے اس مسئلہ پر لکھا کم ہے۔ لیکن آغا صاحب نے تحریر اور تقریر دونوں سے مرزائیت کے خلاف جو کچھ کیا وہ انہیں کا حصہ ہے۔ اور یہ فیضان بھی درحقیقت آغا صاحب نے پیر مہر علی شاہ صاحبؒ۔ مولانا ظفر علی خان۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور حضرت علامہ اقبال کی عقیدت و محبت کی وجہ سے ہی پایا۔ جس کا ذکر وہ ہمیشہ کرتے رہے۔ مرزائیت کے مسئلے میں وہ مندرجہ بالا شخصیتوں کے ہی مقلد معلوم ہوتے ہیں۔ گویا انہوں نے یہ موضوع ورثے میں پایا تھا۔ اور اس پر کچھ لکھنا ان کیلئے بڑی معمولی بات تھی۔

آغا صاحب نے یہ کتاب قلم برداشتہ لکھی ہے۔ اس کیلئے انہیں تیاری کی ضرورت بھی نہ تھی۔ انہوں نے ختم نبوت کی تحریک کے تمام محرکات۔ واقعات اور نتائج کو بڑی سادہ اور رواں زبان میں بیان کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ کوئی تاریخ کی کتاب ہے۔ جس میں واقعات بڑی ہی سادگی کے ساتھ قلمبند ہوئے ہیں۔ آغا صاحب نے قادیانیت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ جس کی صحت میں کلام نہیں۔ جہاں تک قادیانیوں کے خلاف آغا صاحب کی اپنی جدوجہد کا تعلق ہے وہ سب کچھ ان کے ہفت روزہ چٹان میں تحریری طور پر موجود ہے۔ ان کی بعض تقریریں بھی اس موضوع پر چھپ چکی ہیں۔ اور انکی آواز میں بھی محفوظ ہیں۔ آغا صاحب نے جو پمفلٹ اس سلسلے میں لکھے یعنی عجمی اسرائیل اور اسلام کے غدار انہیں بھی اس کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے جن تاریخی بیانوں کو اس کتاب میں محفوظ کیا گیا ہے۔ وہ اس کتاب کی اہمیت میں ایک زبردست اضافہ ہیں۔ آغا صاحب کا موقف قادیانیوں کے متعلق ہمیشہ یہی رہا کہ یہ مسئلہ کوئی مذہبی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ اور اس کتاب میں ہمیں اسکی تفسیر ملتی ہے۔ مرزائیت کے آغاز سے لیکر اس کے اقلیت قرار پانے تک اختصار کے ساتھ جو کچھ بیان ہوا ہے اس نے اس کتاب کو قادیانیت کے محاسبے کی تاریخ بنا دیا ہے۔ لیکن اس مسئلے کے پس منظر میں چونکہ حکومت اور سیاست کا دخل بھی رہا ہے۔ خاص طور پر قیام پاکستان کے بعد تو یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی۔ لہٰذا مرزائیت کے محاسبے کی تاریخ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاسی تاریخ کے نشیب و فراز، حکمرانوں کے طرزِ عمل کی کہانی بھی اس کتاب میں قلمبند ہوئی ہے۔ لیکن کہیں کہیں تکرار سے کام لیا ہے۔ اگرچہ الفاظ کچھ بدل گئے ہیں علاوہ ازیں منیر انکوائری رپورٹ کو کئی جگہ زیرِ بحث لا دیا گیا ہے۔ اسی طرح عجمی اسرائیل اور اسلام کے غدار نامی پمفلٹوں میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ اس کتاب میں پہلے ہی موجود ہے اس طرف خود آغا صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے آغا صاحب لکھتے ہیں

یہ اس پمفلٹ کی بعض چیزیں زیرِ نگاہ کتاب کے بعض پچھلے ابواب میں آچکی ہیں۔ لیکن سوال تکرار کا نہیں پمفلٹ کا ہے۔ کہ اس کی اشاعت سے قادیانی اُمّت تمام اسلامی ریاستوں کے مطالعہ و اعتقاد میں عریاں ہوگئی ہے[1] لیکن اس تکرار سے واقعات کی صداقت مجروح نہیں ہوئی۔ کتاب کا بڑا حصّہ خود آغا صاحب کے اپنے تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ خاص طور پر کتاب کے آخری باب "قومی اسمبلی کا تاریخی فیصلہ" میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ آغا صاحب کی ذاتی معلومات اور اپنے مشاہدے کا حسین مرقع ہے۔ یہ زیادہ تر ۱۹۷۵ سنہ میں قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریک کا حصّہ ہیں۔ اس کا جو تاریخ وار اشاریہ آغا صاحب نے مرتب کیا ہے۔ اس کا انداز رواں تبصرے کا سا ہے۔ ایک ایک بات کو چھوٹے چھوٹے فقروں میں ڈھالتے جاتے ہیں۔ اور تحریر دریا کی سی روانی کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے۔ غرض آغا صاحب کی اس کتاب کو قادیانیت کے محاسبے کی تاریخ کہا جا سکتا ہے۔

اِسلام کے غدّار

یہ کتاب پہلی مرتبہ چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے ۱۹۷۴ سنہ میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب بھی عجمی اسرائیل کی طرح ۳۲ صفحات کا ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے۔ حضرت علامہ اقبال نے ۲۱ جون ۱۹۳۵ سنہ کو ایک خط پنڈت جواہر لال کے نام لکھا تھا۔ آغا صاحب نے اس پمفلٹ کے آخر میں یہ خط جو انگریزی زبان میں ہے۔ اردو ترجمہ کے ساتھ نقل کیا ہے۔

اس خط میں علامہ اقبال نے لکھا ہے۔ کہ

---

[1] = تحریکِ ختمِ نبوّت ، ص نمبر ۲۱۰

"میرے ذہن میں اس کے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔"

علامہ اقبال کے یہی الفاظ اس تصرف کے ساتھ کہ

"احمدی اسلام اور پاکستان دونوں کے غدار ہیں۔"

آغا صاحب کے تحریر کردہ اس پمفلٹ کا مرکزی نقطہ ہے۔ آغا صاحب نے اس پمفلٹ کے ذریعے لوگوں کو اختصار کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ احمدیت کیا ہے۔ اس کا آغاز کیسے ہوا۔ اس کا مقصد کیا تھا اور قیام پاکستان کے بعد اس جماعت نے کیا روپ اختیار کیا۔ قیام پاکستان کے وقت مرزائیوں کا انداز فکر کیا تھا۔ انہوں نے اپنی الگ ریاست بنانے کی کوششیں کس طرح کیں۔ مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے میں مرزائی کس طرح معاون ہوئے۔ اور اب ان کا منصوبہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کو توڑ کر اپنے لیے ایک الگ ریاست بنانا چاہتے ہیں۔ بقول آغا صاحب

"وہ قادیانی عالمی استعمار سے اپنی اس ریاست کا وعدہ لے چکے ہیں۔ اور اس کے عوض عالمی استعمار کے گماشتہ کی حیثیت سے اسرائیل کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے وہ مسلمانوں کی صف میں رہ کر عرب ریاستوں کی بیخ کنی اور مخبری کیلئے افریقہ کی بعض ریاستوں میں مشن رچائے بیٹھے ہیں اور حیفا (اسرائیل) میں حکومت یہود کے مشیر برائے اسلامی ممالک ہیں۔ اس لیے وہ اسلام اور پاکستان دونوں کے غدار ہیں۔" یہ پمفلٹ اس غرض سے لکھا گیا کہ تمام اسلامی ریاستوں کو مرزائیوں کے خطرناک عزائم سے آگاہ کیا جائے۔ اور بیرون ملک مرزائیوں کے پھیلائے ہوئے اس زہر کا مداوا ہو سکے کہ مرزائیت بھی اسلام کا حصہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ پمفلٹ سنہ ۱۹۷۴ء کو پاکستان میں منعقد ہونیوالی اسلامی کانفرنس کے شرکاء اور ان ریاستوں کے صحافیوں میں عربی اور انگریزی میں چھاپ کر تقسیم کیا گیا[1]۔ اس کے بعد پاکستانی عوام کیلئے اردو میں شائع ہوا۔

---

[1] بحوالہ ہفت روزہ چٹان۔ ۱۵ مارچ ۱۹۷۴ء جلد نمبر ۲۲ شمارہ نمبر ۱۱ ص نمبر 19

قادیانی، پاکستان میں استعماری گماشتے ہیں

عجمی اسرائیل

ایک انڈر گراؤنڈ خطرے کا تجزیہ

آغا شورش کاشمیری کی یہ کتاب اصل میں چالیس ۴۰ صفحے کا ایک چھوٹا سا پمفلٹ ہے جو ۱۹۷۳ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوا۔ بعد میں اس پمفلٹ کو اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مجلسِ تحفظ ختم نبوت پاکستان نے بھی شائع کیا۔

اِس پمفلٹ میں مرزائیوں کی اِس سازش کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ جس کے تحت قادیانی پاکستان کو توڑ کر بھارتی پنجاب کے سکھوں کے تعاون سے ایک سکھ احمدی ریاست بنانے کا منصوبہ رکھتے ہیں اور اسے عملی جامہ پہنانے کیلئے اقدامات کر رہے ہیں۔ جس طرح یہودیوں نے فلسطین کو اپنے پیغمبروں کی سرزمین قرار دے کر اس پر قبضہ کیا۔ اسی طرح مرزائی عالمی استعماری طاقت کی مداخلت سے قادیان کو ساتھ ملا کر ایک نیا پنجاب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ جو کہ اُن کے متنبی کی سرزمین ہے۔ قادیانی اپنے مذموم عزم کو مذہب کے نقاب میں چھپائے ہوئے ہیں حالانکہ وُہ ایک سیاسی جماعت ہیں مذہب کا نقاب ان کو انگریزوں نے اپنے مخصوص سیاسی اغراض ومقاصد کو حاصل کرنے کیلئے پہنایا تھا۔ آزادی کے بعد انہوں نے اپنی مذہبی حیثیت کو برقرار رکھنے کیلئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنے تبلیغی مشن بیرون ممالک میں قائم کئے۔ یہاں تک کہ اسرائیل میں بھی اپنا مشن قائم کیا۔ جب کہ پاکستان سے اسرائیل کا کسی قسم کا تعلق آج تک نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں سر ظفر اللہ خان نے اپنی حیثیت سے فائدے اٹھاتے ہوئے بیرون ملک مرزائیوں کے متعلق یہ تاثر پھیلانے میں بڑی مدد دی کہ یہ فرقہ بھی اسلام ہی کا ایک فرقہ ہے اور احمدیت دراصل ایک مذہبی تنظیم ہے۔

پاکستان میں مرزائیت کے پنپنے کی اصل وجہ پاکستان کا مغرب زدہ طبقہ ہے بقول آغا شورش کاشمیری

"ایک خطرناک صورت حال جو ہمارے ہاں پیدا ہو چکی ہے یہ ہے کہ ہمارے مغرب زدہ طبقے نے ...... ابھی تک نہ قادیانی مذہب کو سمجھنے کی ضرورت محسوس کی ہے کہ وہ خود مذہب سے بیگانہ ہو رہا ہے اور نہ قادیانی امت کے سیاسی

عزائم کی مفرتوں سے آگاہ ہے وہ یہی سمجھتا ہے کہ ایک چھوٹی سی اقلیت کو مسلمانوں کے کٹھ ملا تنگ کر رہے ہیں وہ ان کی جنگی داڑھی دیکھ کر اور ان کے تبلیغی اداروں کی روداد سن کر انہیں مسلمان سمجھتا ہے کیونکہ اس کیلئے اپنے ظاہری و باطن وجود سے اسلام خارج ہو چکا ہے"۔[1]

اور جہاں تک حکمرانوں کا تعلق ہے۔ پاکستان کی اکثر حکومتوں کا سلوک مرزائیوں کے حق میں اچھا رہا ہے بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

"پاکستان بننے کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کا نظام آیا وہ اس کے مذہبی پہلو سے تو ناواقف تھے ہی سیاسی پہلو کو سمجھنے کی بھی استعداد نہ رکھتے تھے ان کو قادیانیوں کے اندر یہ خوبی نظر آئی کہ یہ وقت کی ہر حکومت اور وقت کے ہر حکمران کی وفاداری اور خوشامد کرنے کے ماہر ہیں"۔[2]

ایسے حالات میں مرزائیوں نے اپنی سیاسی حیثیت کو بڑا مستحکم کیا۔ حکومت میں بڑے بڑے عہدے حاصل کیے اور ان کلیدی اسامیوں کو اپنی جماعت کے اثر و رسوخ بڑھانے میں استعمال کیا۔ آغا صاحب کے اس پمفلٹ میں اسی بات کو عام کیا ہے کہ قادیانی پاکستان کیلئے مذہب سے زیادہ سیاسی طور پر خطرناک ہیں۔ آغا صاحب نے اس پمفلٹ میں یہ بھی بتایا ہے کہ درپردہ قادیانی عالمی استعماری طاقتوں کے ایجنٹ ہیں اور اسرائیل کے ساتھ اس کا تعلق اس گروہ کے پرانے طریق کار یعنی "جاسوسی" کرنے کا رابطہ ہے۔ مرزائیوں نے جس طرح برطانوی دور اقتدار میں مسلمانوں اور مسلمان ممالک میں جاسوسی کے فرائض انجام دیئے تھے۔ اب بھی انہوں نے اپنی جاسوسی کی اس روش کو نہیں بدلا جس سے مسلمان ریاستوں کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب نے لکھا ہے کہ

"غور کیجئے جس اسرائیل میں عیسائی مشن قائم نہیں ہو سکتا وہاں اسلام کے لیے

1۔ عجمی اسرائیل — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۵

2۔ چٹان — ۱۱۔ جون ۱۹۷۳ء — مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا خط عجمی اسرائیل کے متعلق

قادیانی مشن لطیفہ نہیں تو کیا ہے؟ اس مشن سے جو کام لیئے جا رہے ہیں وہ ڈھکے چھپے نہیں
تمام عالمِ عرب میں اس کے خلاف احتجاج ہو چکا اور ہو رہا ہے لیکن مشن جوں کا توں قائم ہے۔

۱۔ اس مشن کی معرفت عرب ریاستوں کی جاسوسی ہوتی ہے۔ اس مشن کی وساطت سے حجاز و اردن کی فضائیہ کے پاکستانی افسروں سے جو بعض دفعہ قادیانی بھی ہوتے ہیں، وہاں کے راز حاصل کیے جاتے اور اسرائیل کو پہنچائے جاتے ہیں۔

۲۔ اس مشن کی معرفت اسرائیل کے بچے کھچے مسلمان عربوں کو عرب ریاستوں کی جاسوسی کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔

۳۔ اس مشن کی معرفت پاکستان کی اندرونی سیاست کے راز لیئے جاتے اور اسلام دوستوں سے متعلق مطلوبہ خبریں حاصل کی جاتی ہیں۔

۴۔ اس مشن کی معرفت پاکستان میں عالمی استعمار اور یہودی استحصال کی راہیں قائم کی جاتیں اور سیاسی نقشے درآمد برآمد ہوتے ہیں۔ خود صدر بھٹو پاکستان میں تل ابیب کی سیاسی مداخلت اور صیہونی سرمایہ کی زمانۂ انتخاب میں برآمد کا انکشاف کر چکے ہیں، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ تل ابیب کا سرمایہ پاکستان کے عام انتخابات میں مقامی مرزائیوں کی معرفت اسی مشن کی وساطت سے آیا تھا اور یحییٰ کے زمانہ میں اکثر وزراء نے خود راقم الحروف سے اس کی روایت کی تھی۔

۵۔ پاکستان کو اس وقت جو خطرہ درپیش ہے اس میں قادیانی اُمت اور تل ابیب کا گٹھ جوڑ عالمی استعمار کی مخفی خواہشوں کو معرض وجود میں لانے کا ذریعہ (LINK) بن چکا ہے۔

پاکستان میں اسلام کے خلاف ۱۹۷۰ء کے جنرل الیکشن میں جو سب سے بڑی ذہنی بغاوت ہوئی اس کے منتظم قادیانی تھے جو اسرائیل کے حسب ہدایت

کام کر رہے تھے۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں کھلی حقیقت ہے اور پیش آمدہ واقعات کا تسلسل اس کی تصدیق کرتا ہے۔[١]

آغا صاحب نے مرزائیت کے ماضی اور حال کا جو سیاسی تجزیہ کیا ہے اُس کی بنیاد پر آغا صاحب کی مرزائیت کے متعلق وہ وسیع معلومات ہیں۔ جو انہیں ملک کے کونے کونے اور دوسرے ممالک میں مقیم پاکستانیوں سے فراہم ہوتی تھیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ مرزائیت کے متعلق آغا شورش کاشمیری باخبر ترین آدمی تھے۔ لوگ آغا صاحب کو مرزائیوں کا سب سے بڑا دشمن اور اسلام کا سب سے بڑا خیر خواہ جانتے تھے۔ لہذا مرزائیوں کے متعلق ہر قسم کی اطلاع انہیں پہنچ جاتی تھی اور مرزائیوں کے متعلق جتنے بھی انکشافات ہوتے رہے وہ سب سے پہلے آغا صاحب کے ہفت روزہ "چٹان" میں شائع ہوئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ "چٹان" کی ساری تاریخ مرزائیت کے محاسبے کی ہی تاریخ ہے۔

جس زمانے میں یہ پمفلٹ شائع ہوا اُس وقت پاکستان میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تھی۔ مرزائیوں نے اس پارٹی کی خدمت انتخاب کے آغاز ہی سے شروع کر دی تھی۔ جب اس حکومت کی مذہب سے بیگانگی کا رنگ نمایاں ہوا تو مرزائیوں کے حوصلے اور بھی بڑھ گئے۔ کیونکہ حکومت ملک کی سیاسی جماعتوں کے علاوہ مذہبی جماعتوں سے بھی ناروا سلوک کر رہی تھی۔ اور مرزائی اس طرزِ عمل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے آغا شورش کاشمیری نے جب یہ پمفلٹ شائع کیا تو حکومت نے بظاہر اس کا کوئی نوٹس نہ لیا لیکن بعد کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ حکومت مرزائیوں کے طرزِ عمل کو نظر میں رکھتی تھی۔ لہذا اسی دور میں انہیں اقلیت قرار دیا گیا۔ اور یہ ایسا کام تھا جو اس سے پہلے کوئی بھی حکومت کرنے کو تیار نہ تھی۔

یہ پمفلٹ ایک بڑی تعداد میں تقسیم ہوا۔ ہفت روزہ "چٹان" میں اس کتاب کا اشتہار دیا گیا اس اشتہار میں لکھا ہے کہ

١۔ عجمی اسرائیل — شورش کاشمیری — ص نمبر ٢٢/٢٣

"عربی ترجمہ تیار ہو چکا ہے
انگریزی ترجمہ زیر تسوید ہے" [1]

یہ تراجم یقیناً دوسرے ممالک میں تقسیم ہوئے ہونگے۔ اس پمفلٹ کی قیمت صرف ۲۵ پیسے مقرر کی گئی تھی جو کہ صرف کاغذ کی قیمت تھی۔ لوگوں نے ۲۵ روپے میں سو کاپیاں خرید کر عام مسلمانوں میں مفت تقسیم کیں تاکہ انہیں مرزائیوں کے مذموم ارادوں کی خبر ہو سکے۔ مجلس تحفظ ختم نبوت پاکستان نے اس پمفلٹ کے شائع ہونے پر اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں اور مرزائی اس سازش کے بے نقاب ہونے کی وجہ سے دبک گئے۔ اور حکومت کی معاونت اور خوشامد کرنے کی طرف خاص توجہ دینے لگے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک خط میں جو ہفت روزہ "چٹان" میں شائع ہوا۔ اس پمفلٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"آغا صاحب نے یہ پمفلٹ لکھ کر ایک بڑی خدمت انجام دی ہے" [2]

قادیانیت کا محاسبہ

مرزائیل

یہ کتاب شیخ پرویز احمد جنرل سیکرٹری مجلس طلبہ اسلام پاکستان نے چٹان پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر فروری ۱۹۶۸ء میں چنیوٹ سے شائع کی اس کتاب کا انتساب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نام ہے۔ پیش لفظ جناب خواجہ صادق کاشمیری نے تحریر کیا ہے اور دیباچہ آغا صاحب کے قلم سے ہے۔ یہ کتاب ۱۲۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک حصہ آغا صاحب کی ایک تقریر پر مشتمل ہے اور دوسرے حصے میں اس تقریر کے ردعمل کے طور پر مرزائیوں نے جو کچھ لکھا اور ہفت روزہ چٹان میں جو اس کا جواب دیا گیا۔ ان تمام شذرات پر مشتمل ہے۔

پہلے حصے میں آغا صاحب کی جس تقریر کی رپورٹ حمید اصغر نجید صاحب نے تیار کی ہے وہ تقریر

---

1. ہفت روزہ چٹان ۹۔ جولائی ۱۹۷۳ء ص نمبر ۹
2. الفضل ۱۱۔ جون ۱۹۷۳ء ص نمبر ۷

آغا صاحب نے ۲۰- اپریل ۱۹۶۷ء کو چنیوٹ میں کی[1]۔ جہاں تک تقریر کو تحریر کرنے یا تلخیص و خلاصہ کا تعلق ہے۔ یہ ناممکن سی بات ہے۔ کسی بھی تقریر کو احاطۂ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ اِس لئے کہ تقریر سے ہی کرنے کی چیز جس میں مرکزی نقطہ خود خطیب یا مقرر کی شخصیت ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ اُن کی آواز۔ اس کا لہجہ۔ اُس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ۔ آواز کا زیر و بم۔ جلسے کا ماحول۔ سامعین کا جوش و خروش۔ خطیب سے سامعین کی عقیدت و محبت۔ سٹیج کا جاہ و جلال۔ سامعین کے نعرے۔ زندہ باد، مردہ باد کی فضا۔ جلسہ گاہ کی آرائش و زیبائش اور یہاں تک کہ موسم کے اثرات کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں ہوتی ہیں جن سے مل کر تقریر تیار ہوتی ہے۔ جو اُسی ماحول اور کیفیت میں سُنی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اُسے کسی اور جگہ یا کسی اور ماحول میں سُنا جائے گا۔ تو وہ کیفیت اور اثرات پیدا نہیں ہو سکتے جو اس تقریر کا لازمی جزو ہیں۔ لہٰذا یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ زیر نظر تقریر کی تلخیص کسی طور پر بھی اُس تقریر کی قائم مقام نہیں ہو سکتی جو آغا صاحب نے ۲۰ اپریل ۱۹۶۷ء کو چنیوٹ کے ایک بہت بڑے اجتماع میں کی۔ تاہم آغا صاحب نے جو کچھ کہا وہ الفاظ کی صورت میں اِس تلخیص میں موجود ہے۔ جناب حمید اصغر نجید نے مختلف عنوانات قائم کر کے اِس کا خلاصہ دیا ہے۔ جب کہ آغا صاحب نے خود اپنی اِس تقریر کے اہم نکات کا ذکر اپنی کتاب "موت سے واپسی" میں اِس طرح کیا ہے۔

"۱۔ میرزائیت کی تاریخ سیاسی دینیات کی تاریخ ہے۔

۲۔ یہ بحث ہی غلط ہے کہ میرزا غلام احمد نبی تھے یا نہیں؟ اس طرح کی بحث بجائے خود حضورؐ کی اہانت کا باعث ہوتی اور سوءِ ادب تک چلی جاتی ہے۔

۳۔ قرآن و حدیث میں ظلی و بروزی نبوت کے الفاظ ہی نہیں اور نہ ان کے ہم معنی مترادفات ہیں ایسے کسی لفظ کی عربی لغت نشاندہی نہیں کرتا۔

۴۔ میرزائیت کی اصل بنیاد دین نہیں سیاست ہے۔

۵۔ سلطان ٹیپو کی شہادت (۱۷۹۹ء) سے لے کر بہادر شاہ ظفر کی

---

۱ بحوالہ موت سے واپسی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۶۳

گرفتاری (۱۸۵۷ء) تک ـــــــــ اسلامی مزاج کی استعمار شکن ذہنیت کو ملحوظ رکھیں تو معلوم ہوگا کہ میرزا صاحب انگریزوں کی ہر نوعی وفاداری اور جہاد کی تنسیخ کیلئے استعمار کی طرف سے مبعوث کئے گئے تھے۔

۶۔ میرزا صاحب نے برطانوی شہنشاہیت کی پشت پناہی کیلئے الہامی بنیاد، ربانی سند فراہم کی۔

۷۔ ان کی نبوت، سلطان ٹیپو، سراج الدولہ اور بہادر شاہ ظفر کے محاربات کی بیخ کنی کا استعماری نسخہ تھا اس کے علاوہ ان کا "ظہور" سید احمد شہید کی تحریک، جنگ امبیلہ کے نتائج واثرات، انبالہ، پٹنہ، راج محل اور مالوہ میں علماء کے مقدمات ان کے شوق جہاد وشہادت اور سرحدی علاقوں کی انگریز دشمنی کا ایک توڑ تھا جو انگریزوں نے دوررس نتائج کے تحت تلاش کیا تھا۔

۸۔ میرزا صاحب نے مسلمان قوم کو برطانوی ہاتھوں سے ہٹا کر برطانوی پادریوں سے اُلجھا دیا۔

۹۔ جہاد کی تنسیخ پر مناظرہ کی نیو رکھی۔

۱۰۔ وہ مسلمانوں کی مذہبی وحدت میں نہیں سیاسی وحدت میں حرف اس لیے شریک رہنا چاہتے ہیں کہ اس طرح انہیں طاقت حاصل کرنے اور مقاصد پروان چڑھانے میں کوئی سی دقت مانع نہیں ہوتی۔

۱۱۔ پاکستان سے پہلے وہ برطانوی استعمار کے آلہ کار تھے اب وہ یہودیت کی طرح معاشی طاقت کے بل پر حکومت کے فعال اداروں میں سیل بنا کر بین الاقوامی استعمار کی معاونت سے پاکستان پر حکمران ہونا چاہتے ہیں۔

۱۲۔ کشمیر سے متعلق انہیں جو "بے چینی" ہے اصلاً وہ اس مقصد تک پہنچنے کی

بوقلمونیوں کا ایک حصہ ہے یا ہے[1]

اس کے ساتھ ہی اس کتاب کے باقی مندرجات کے متعلق علم بھی آغا صاحب کے ان الفاظ سے حاصل ہو جاتا ہے کہ

"یہ تقریر خاصی طویل تھی کچھ نوجوانوں نے مارچ ۱۹۶۸ء میں "میزائیل" کے نام سے یہ تقریر کتابچہ کی شکل میں شائع کی۔ کتابچہ شائع کیا تو میرزائی جو پہلے ہی اپنے جرائد کی محرومت مجھ پر برس رہے تھے سب وشتم پر اُتر آئے، ہفتہ وار "لاہور" عقیدتاً قادیانی تھا۔ اس نے میرے خلاف مغلظات واتہامات کا ڈھیر لگا دیا، کوثر نیازی ٹھیک انہی دنوں اپنے ہفتگی میں یہی فرض انجام دے رہا تھا گویا دونو میرے خلاف متحد تھے ـــــ میں نے جب بھی قادیانی اُمت کا سیاسی محاسبہ کیا اس پر کچھ نکھا قادیانی میرے خلاف گالی گلوچ پر تل گئے، حالانکہ جو میں کہہ رہا تھا جواب اُس کا ہونا چاہیے تھا۔ ان کی گالیاں ختم ہوگئیں تو ہوم ڈیپارٹمنٹ نے سنسر عائد کر دیا ہے"[2]

گویا اس کتاب میں اس تقریر کے علاوہ جو کچھ دیا گیا ہے وہ اسی تقریر کا ردِ عمل ہے کیونکہ مرزائیوں نے اس تقریر کے بعد آغا صاحب کو ہدف تنقید بنایا اور آغا صاحب نے مرزائیوں کی دروغ گوئی اور ژاژ خائی کا جواب "چٹان" میں دیا جو اس کتاب کا حصہ ہے اس طرح سے اس تقریر، اس پر اعتراضات اور اس کے جوابات میں ایک تعلق ہے جو ہر لحاظ سے مربوط اور ایک دوسرے سے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ آغا صاحب کی اس تقریر سے قطع نظر باقی تحریریں صحافت کی چیزیں ہیں اور اسی اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ آغا صاحب قلمی معرکوں میں عموماً صحافی کم اور ادیب زیادہ ہوتے ہیں۔ مخالف پر طنز وتحریض کے تیر ادب کی آب دے کر تیار کرتے ہیں۔ جہاں تک مرزائیوں کا تعلق ہے۔ اُن کے ساتھ آغا صاحب کا تعلق بڑا پرانا

1۔ موت سے واپسی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۶۳/۶۴/۶۵

2۔ ایضاً — ص نمبر ۶۵

ہے اور انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ضرب کہاں پڑنی چاہیئے۔ غرض آغا صاحب کے یہ اخباری مضامین جو مرزائیوں کے جواب میں لکھے ہیں۔ اُن کی زبان بڑی طرح دار ہے اور تنقید و تبصرہ کا رنگ استدلالی اور منطقی ہے۔ مرزائیت کے متعلق آغا صاحب کے جن خیالات کا پتہ اس کتاب سے چلتا ہے۔ یہ خیالات قادیانیوں کے متعلق آغا صاحب کے مستقل موضوعات ہیں اور اس زمانے کے پس منظر میں مرزائیوں کے عزائم چونکہ بڑے ہی خطرناک تھے لہذا آغا صاحب نے کم و بیش ان خیالات کو مرزائیوں کے خلاف تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔ اس کے بعد آغا صاحب نے جو دو پمفلٹ لکھے "عجمی اسرائیل" اور "اسلام کے غدار" اُن میں بھی کم و بیش ان ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ جن کا تعلق مذہب سے کم اور سیاست سے زیادہ ہے۔ اور آغا صاحب نے ہمیشہ مرزائیت کو ایک سیاسی مسئلے کے طور پر تنقید و تبصرہ کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کتاب میں بھی مرزائیوں کے اس سیاسی نصب العین سے پردہ اٹھایا ہے۔ جس کے ذریعہ مرزائی درپردہ یہ کوشش کر رہے ہیں کہ پاکستان کو توڑ کر اسرائیل کی طرح وہ بھی ایک الگ ریاست قائم کریں۔ اور آغا صاحب نے اس سازش کو سب سے پہلے بے نقاب کیا۔ اور مسلسل اس کے خلاف لکھتے رہے۔ تاکہ عوام اور حکومت اس بات سے آگاہ ہوں اور مرزائیوں کا محاسبہ کریں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہم ہے کہ اس میں مرزائیوں کے خفیہ عزائم سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور مرزائیت کے اصل خدوخال نکھر کر سامنے آ گئے ہیں۔

کتاب کے صفحہ ۱۴۳ پر آغا صاحب کی ایک نظم بعنوان "عجمی اسرائیل" دی گئی ہے جس کے دو شعر مندرجہ ذیل ہیں۔

کرۂ ارض کی ہر عنوان سے تذلیل ہے
قادیاں! مابینِ ہند و پاک اسرائیل ہے
قادیاں والو قیامت ہوں تمہارے واسطے
میرے رشحاتِ قلم میں صورِ اسرافیل ہے

اقبال اور قادیانیت (غلام احمد کی خانہ ساز نبوت کا استعماری پس منظر)

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۲۱ اپریل ۱۹۷۷ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی جو ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اسے انہوں نے خواجہ عبدالرحیم صاحب کے نام معنون کیا ہے۔

صفحہ نمبر ۴ پر یہ عبارت درج ہے
ایک معرکہ آرا تجزیہ
سرنامہ

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش

زیر نظر کتاب علامہ اقبال کے مختلف بیانات پر مشتمل ہے جو انہوں نے قادیانیت کے خلاف مختلف اوقات میں دیئے۔ پہلا بیان ۲ مئی ۱۹۳۵ء میں جاری کیا گیا[۱] جو روزنامہ سٹیٹس مین دہلی میں چھپا۔ اس اخبار کے مدیر نے اپنے ۱۴ مئی ۱۹۳۵ کے اداریے میں اس پر تنقید کی جس میں ان کے چھ استفسارات کا جواب دیا گیا[۲] اس کے بعد علامہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے اُن سوالات کا جواب دیا جو انہوں نے اپنے تین مقالوں میں اٹھائے ہیں[۳]۔ یہ تمام بیانات انگریزی میں تھے۔ اس کے متعلق مؤلف کی یہ وضاحت ص نمبر ۲۲ کے حاشیے پر موجود ہے کہ

"پہلا بیان سٹیٹس مین کے نام خط اور چھ استفسارات کا ترجمہ مطبوعہ تراجم سے نقل کیا گیا ہے اور مسٹر ممتاز لیاقت رکن ادارہ چٹان نے ان تراجم کی تصحیح و تکمیل کی

۱-۳ بحوالہ اقبال اور قادیانیت ص نمبر ۸-۱۵-۲۶

ہے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے جواب میں علامہ کے طویل مقالہ کا ترجمہ راقم نے کیا ہے"۔[1]

جہاں تک علامہ اقبال کے اِن عالمانہ بیانات کا تعلق ہے ۔ اِن کے متعلق یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ یہ بیانات علامہ اقبال کے ہیں ۔

آغا صاحب نے ان بیانات کو اِس طرح ترتیب دیا ہے کہ قادیانیت کا پورا پسِ منظر سامنے آجاتا ہے ۔ اِس کے علاوہ آغا صاحب نے الفضل کے ۳۱ مئی ۱۹۳۶ء اور ۱۱ جون ۱۹۳۶ کے شماروں کے حوالوں کی مدد سے بتایا ہے کہ مرزائی پنڈت جواہر لال کے کتنے سپاس گذار تھے اور اِن کے بعد آغا صاحب نے علامہ اقبال کا وہ خط بھی نقل کیا ہے جو انہوں نے ۲۱ جون ۱۹۳۶ء کو پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا اور اِس خط میں واضح طور پر لکھا کہ

"احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں"۔[2]

آغا صاحب نے اِس کتاب میں جو کچھ کہا ہے وہ مرزائیت سے متعلق اِن کے عام خیالات کی تکرار ہے ۔ علامہ اقبال کا وہ مضمون جو انہوں نے پنڈت نہرو کے جواب میں لکھا تھا ۔ آغا صاحب کی کتاب "تحریکِ ختمِ نبوت" میں بھی نقل ہو چکا ہے ۔ بہر حال یہ کتاب اِس لحاظ سے ایک تاریخی دستاویز ہے کہ اِس میں مرزائیوں کے متعلق علامہ اقبال کے افکار کو یکجا کر دیا گیا ہے ۔

---

[1] اقبال اور قادیانیت ص نمبر ۲۲

[2] " ص نمبر ۶۳

اُس بازار میں

اس کتاب کا جدید ایڈیشن ۲۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور اسے چٹان پرنٹنگ پریس نے شائع کیا۔

آغا شورش کاشمیری کی اِس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ فحاشی کی تاریخ۔

۲۔ موسیقی کی تاریخ۔

۳۔ لاہور کے چکلے کی تاریخ اور اُس میں جنم لینے والے حالات و واقعات۔

کتاب کے آغاز میں اُس بازار کے کچھ کرداروں کی تصاویر ہیں۔ گذارش کے عنوان سے دیباچہ ثانی اور دیباچہ اوّل کو چہرہ نما کا عنوان دیا گیا ہے جو دونوں آغا صاحب کے قلم سے ہیں۔ مولانا عبدالمجید سالک نے کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ آغا صاحب کی چند نظمیں بھی اس کتاب کے آغاز میں دی گئی ہیں۔

۱۔ فحاشی کی تاریخ

کتاب کے پہلے باب کا عنوان "رہزنی کا پہلا شکار" ہے۔ اس عنوان کے مطابق دنیا میں جو چیز سب سے پہلے رہزنی کا شکار ہوئی وہ عورت کی عصمت تھی۔ گویا یہ عصمت فروشی کی تاریخ کا نقطۂ آغاز تھا۔ اِس کے بعد عہد قدیم میں عصمت فروشی کے ارتقا اور مختلف صورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے اور تیسرے باب میں قدیم ہندوستان کی عصمت فروشی کی تاریخ اور مسلمان بادشاہوں کی رنگین مزاجیوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ کتاب کے اس حِصّے کے متعلق آغا صاحب نے کتاب کے چہرہ نما میں لکھا ہے کہ

" اردو میں نیاز فتح پوری "جنسیات" پر ایک جامع کتاب لکھ چکے ہیں اور میں نے ابتدائی دو بابوں کے مواد کا ایک حصہ اُسی سے اخذ کیا ہے ۔"[۱]

فحاشی کی اس مختصر تاریخ کے بعد کتاب کا اصل حصہ شروع ہوتا ہے۔ جس کے متعلق آغا صاحب کا یہ

۱۔ اُس بازار میں   چہرہ نما   شورش کاشمیری   ص نمبر ۲۱

دعویٰ ہے کہ

"میں نے ان چار ساڑھے چار برس میں کوئی چھ سو لڑکیوں سے فحاشی کے

اسباب کی چھان پھٹک کی ہے [۱]"

اور نتیجہ کے طور پر فحاشی کے مختلف محرکات واسباب کا ایک گوشوارہ بنایا گیا ہے۔ تاہم آغا صاحب نے اِس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وُہ محلِ نظر ہے۔ اِس کتاب میں آغا صاحب نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے اپنے دوستوں کے ہمراہ لاہور کی ہیرا منڈی کی سیر کی تاکہ اس کتاب کیلئے صحیح معلومات فراہم کی جا سکیں۔ آغا صاحب کی رفاقت میں جن دوسرے لوگوں نے یہ انٹرویو کرنے میں ساتھ دیا ان میں سے چند ایک نام بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً اختر[۲]۔ تاجی[۳] اور ابو یوسف[۴]۔ اسماعیل[۵]۔ خواجہ[۶] وغیرہ۔ کتاب میں ایک جگہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کل سات آدمی تھے[۷]۔ اور چار ساڑھے چار سال تک یہ عمل جاری رہا۔ اِس کتاب میں جتنے واقعات ہیں وُہ سب قیامِ پاکستان کے بعد کے ہیں[۸]۔

---

۱ اُس بازار میں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۰۳

۲ بحوالہ اُس بازار میں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۰۲ - ۲/۲ - ۲۲۲ - ۲۲۰

۳ یہ گروہ سب سے پہلے جن لڑکیوں سے معلومات حاصل کرتا ہے وُہ خورشید اور زرد ہیں جو ایک سوال کے جواب میں بتاتی ہیں کہ

"اور اب بیسیوں مہاجرہ ہیں" (اُس بازار میں ص نمبر ۱۰۷)

ان لڑکیوں کے کمرے کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو کمرے کی چھت پر کچھ اخبار چپکائے ہوئے ہوتے ہیں ان اخبارات کی معنی خیز سرخیاں اور دلچسپ عبارتیں جو کتاب میں نقل کی گئی ہیں وُہ یہ ہیں۔

"حکومت پاکستان چکلے اٹھا دینے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے"

(زمیندار)

""چٹان" کو فحاشی کے الزام میں بند کر کے حکومت نے مستحسن قدم اٹھایا ہے۔ — آفاق وغیرہ وغیرہ" ص نمبر ۱۱۲ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آغا صاحب نے لکھا ہے کہ

"یہ کتاب دسمبر ۱۹۴۹ء کو شروع کی اس وقت میرے سامنے محض ایک مقالے کا خاکہ تھا اور وُہ مقالہ "چٹان" میں چھپ گیا۔ لیکن یہ مقالہ ہر پہلو سے ادھورا تھا۔ مرحوم مولانا عبد المجید سالک نے اس کو سراہا اور زور دیا کہ اس موضوع پر کتاب لکھ ڈالو۔ ان کا خیال تھا کہ ہمارے ادیب زندگی کے کریہہ حقائق پر گفتگو تو کرتے ہیں لیکن زندگی کے راست مطالعہ سے کنی کتراتے ہیں۔ ان کی اس ہمت افزائی کے باوجود میرے دل میں ایک ناتمام سا خوف کروٹیں لے رہا تھا۔"[1]

(بقیہ حاشیہ)

نیلم کہتی ہے

"پاکستان تک تو خدا لایا تھا اِس بازار میں پیٹ لے آیا۔" ص نمبر ۱۱۶

شمشاد ۔ امتیاز ۔ ممتاز اور شہناز چار بہنیں ہیں

"...... پہلے چاروں امرتسر میں رہتی تھیں اور ان کا بڑا نام اور کام تھا۔ اب پانچ برس سے لاہور میں رہتی ہیں۔" ص نمبر ۱۳۱

حمزی کے متعلق

"ہندوستانی یا پاکستانی سنگیت طبلہ کے بغیر ایک نظم معریٰ ہے۔"

شوکت ہیجڑا جب بٹوارہ ہو گیا تو وُہ بھی اپنے والدین کے ہمراہ مشرقی پنجاب سے چلا گیا ص نمبر ۲۰۷

اور کتاب کے آخری باب میں مشہور طوائف امیر سے ملنے کا ذکر ہے اُس دن

"۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کی شب پاکستان میں پہلا یوم اقبال تھا۔" ص نمبر ۲۱۲

[1] اُس بازار میں شورش کاشمیری ص نمبر ۲۸

گویا دسمبر ۱۹۴۹ء کو "چٹان" میں مقالہ چھپنے کے بعد عبدالمجید سالک کے ایماء پر آغا صاحب نے ڈرتے ڈرتے اِس موضوع پر کام کرنے کا بیڑا اُٹھایا اور بقول ان کے

"میں تین برس تک ان مکانوں میں گھومتا رہا ہوں"[1]

پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

"میں نے ان چار ساڑھے چار برس میں کوئی چھ سو لڑکیوں سے فحاشی کے
اسباب کی چھان پھٹک کی ہے!"[2]

تین سال، چار سال یا ساڑھے چار سال کے فرق سے قطع نظر آغا صاحب کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ

"مؤلف نے عنفوانِ شباب میں اُس بازار کا سفر کیا ہے"[3]

ان تمام بیانات سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ آغا صاحب نے یہ کام ۱۹۵۰ء میں شروع کیا اور ۱۹۵۲ء میں کتاب لکھی۔[4] اِس طرح یہ عرصہ تین سال۔ چار سال یا ساڑھے چار سال نہیں بنتا۔ ۱۹۵۲ء تک آغا صاحب کی عمر تقریباً ۳۸ سال ہو چکی تھی۔ جسے عنفوانِ شباب نہیں کہا جا سکتا اور یہ ہو بھی نہیں سکتا کہ آغا صاحب جیسے ادیب کو عمر کے اِس حصے کی خبر نہ ہو جسے عام طور پر عنفوانِ شباب کہا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف کے نزدیک اِس سلسلے میں سی۔ ایل۔ کاوش کا یہ بیان درست معلوم ہوتا ہے کہ

"شورش کے سیاست میں جانے سے پہلے ہم لوگ رات رات بھر آوارہ گردی
کرتے رہتے تھے اِس وقت تک ہم میں سے صرف حفیظ قندھاری سیاست
کے بازار سے ہو کر آئے تھے........." "اُس بازار میں" شورش کاشمیری

---

١ اُس بازار میں شورش کاشمیری ص نمبر ۲۹
٢ ایضاً ص نمبر ۳۲
٣ ایضاً ص نمبر ۵
٤ بحوالہ چٹان شورش نمبر جگنی لال کاوش ص نمبر ۲۱

کی کتاب کا ہیولا اصل میں اس کے دماغ میں اُس وقت سے بُنا جا رہا تھا۔ اُسے عورت پر بڑا ترس آتا تھا بعد میں یہ کتاب ایک عظیم شاہکار کی صورت میں نمودار ہوئی۔ ہم لوگ غریب تھے اور باضمیر تھے۔ اس لیے ہمارے ہیرا منڈی کے چکر صرف طوائفوں کی چوکھٹ تک ہی محدود ہوتے تھے۔ چوکھٹ الانگ کر کسی نے نہیں دیکھا ہے[1]

یہ واقعہ جس کا ذکر سی۔ ایل کاوش نے کیا ہے۔ آغا صاحب کے سیاست میں آنے سے پہلے کا ہے۔ آغا صاحب نے سیاست میں حصّہ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی تحریک سے لیا۔ ۱۹۳۵ء تک آغا صاحب کی عمر ۱۸ سال بنتی ہے۔ جسے عنفوانِ شباب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور سی۔ ایل کاوش یا حفیظ قندھاری وغیرہ، حقیقت میں شورش کاشمیری کے بچپن کے دوست ہیں۔ جب کہ جن لوگوں کی ہمراہی میں آغا صاحب نے ہیرا منڈی جانے اور چھ سو لڑکیوں سے بات چیت کرنے کی بات ہے۔ ان کا تعلق صحافت کی دنیا سے ہے۔ مگر اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو آغا صاحب کے عنفوانِ شباب میں کبھی اُن کے ساتھ رہا ہو یا صحافت کی دنیا میں کسی ایک کا نام بھی کبھی سننے میں آیا ہو بلکہ اُن کا وجود ہی مشکوک ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مرزا محمد ہادی رسوا نے امراؤ جان ادا میں اپنے آپ کو بھی کردار بنایا ہے۔ اسی طرح آغا صاحب نے بھی اپنی کتاب کو موثر بنانے کے لیے اپنے آپ کو اس کتاب کا ایک کردار بنا لیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ انہوں نے چھ سو لڑکیوں سے گفتگو کرنے کے بعد کتاب لکھی ہے اور کتاب میں اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے چند معروف طوائفوں اور اُن کی رشتہ دار عورتوں کا ذکر بھی کر دیا ہے۔ مثلاً مختار جس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا آغا حشر کاشمیری سے تعلق تھا۔ اسی طرح شمشاد۔ امتیاز۔ ممتاز۔ شہناز۔ زہرہ۔ مشتری وغیرہ۔ آغا حشر والی مختار کی رشتہ دار ہیں اور ہندوستان کی معروف طوائف اور مغنیہ امیر اور فریدہ کا ذکر بھی صرف

۱؎ چٹان شورش نمبر مضمون سی۔ ایل کاوش ص نمبر ۳۴/۳۵

اِس لیے کیا گیا ہے کہ کتاب کے اِس پہلو کو موثر بنایا جائے کہ اِس کتاب کے حالات و واقعات سچے ہیں مگر غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ اِن سب سے آغا صاحب کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ جو کچھ ان کی زبانی معلوم ہوا ہے وُہ سب عام باتیں ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا کوئی خاص تجربہ۔ کوئی نفسیاتی حقیقت۔ کوئی چونکا دینے والا واقعہ بیان نہیں کیا اور اگر کوئی بات قابلِ توجہ ملتی ہے تو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی طوائف یا مغنیہ نہیں بلکہ شورش کاشمیری خود بول رہے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آغا صاحب نے اپنے عنفوانِ شباب میں سی۔ ایل کاوش اور دوسرے دوستوں کے ساتھ جو ہیرا منڈی کے چکر لگائے تھے۔ اُس کی وجہ سے ہیرا منڈی کے محل وقوع۔ تماش بینوں کے طرزِ عمل۔ بڑی بڑی خاندانی طوائفوں کی بلند عمارتوں کے حدود اربعہ، بازار کی عام فضا، طوائفوں کے ہار سنگھار اور دلاتوں کے طریقے وغیرہ کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اور اسی مشاہدے کی بنیاد پر انہوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ جس میں کچھ عورتوں سے چند سوال پوچھے گئے۔ جن کے جوابات آغا صاحب نے ان کی زبانی خود دیئے ہیں۔ جس کی بنا پر سالک صاحب اس کتاب کے تعارف میں لکھتے ہیں۔

"صرف شمشاد۔ امتیاز۔ ممتاز اور شہناز ہی کو مصنف نے طباعی تفلسف ادب اور تفنن کے پیکر ہائے حسین میں ڈھالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ڈیرے دارنیوں کی صحبت کے طفیل سے محمد دین تانگہ والا۔ حمزہ طبلے والا۔ مائی وزیر بلکہ شوکت ہیجڑا تک حقائق حیات کا وُہ علم اور اس کے اظہار کا وُہ ملکہ رکھتے ہیں کہ ہمارے بڑے بڑے فلسفیوں اور ادیبوں کو نہیں ——— پھر مختار نے تو علم موسیقی کے متعلق معلومات کے وُہ دریا بہائے ہیں کہ مختار تو مختار، آغا حشر کو بھی میسر نہ ہوں گے"[۱]

مندرجہ بالا اقتباس میں سالک صاحب نے جس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اُس کی تصدیق

۱۔ اُس بازار میں — تعارف عبدالمجید سالک — ص نمبر ۲۲

مختار کے اِس بیان سے ہوتی ہے جو انہوں نے آغا حشر سے منسوب کیا ہے کہ ایک دن بہت سے احباب جمع تھے تو کسی نے آغا حشر سے یہ سوال پوچھ لیا کہ غنا کا موجود کون ہے[1]؟ پھر کیا تھا آغا حشر نے موسیقی کے موجد سے لے کر مغلوں کے دور تک موسیقی اور ارباب موسیقی کا تذکرہ ایک تقریر کی صورت میں کر ڈالا جو کتاب میں مختار کی زبان سے ادا ہوئی ہے۔ لیکن یہ تقریر آغا شورش کاشمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر" کے آخری خط کے حوالے سے ترتیب دی جس کے ثبوت میں یہ عبارتیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مولانا ابوالکلام۔ "غبارِ خاطر" کے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں کہ

"کیونکہ خود عربوں کا فن موسیقی کچھ نہ تھا اور جتنی کچھ عمارت بھی انہوں نے اٹھائی تھی اس کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی کے کھنڈروں سے حاصل کیا گیا تھا"[2]

"اُس بازار میں" اسی بات کو اس طرح ادا کیا گیا ہے:

"خود عربوں کا فن موسیقی کچھ نہ تھا۔ اُن کا تمام تر مواد ایران کی ساسانی موسیقی سے ماخوذ ہے"[3]

"غبارِ خاطر"

"خلجی اور تغلق کے درباروں میں ہندوستانی موسیقی کی مقبولیت اور قدر دانیوں کے واقعات تاریخ میں موجود ہیں لیکن جس شاہی خاندان نے ہندوستانی موسیقی سے بہ حیثیت ایک فن کے خاص اعتنا کیا وہ غالباً جونپور کا مشرقی خاندان تھا"[4]

1۔ بحوالہ اُس بازار میں شورش کاشمیری ص نمبر ۱۵۵/ ۱۵۶

2۔ غبارِ خاطر ابوالکلام آزاد ص نمبر ۳۱۸

3۔ اُس بازار میں شورش کاشمیری ص نمبر ۱۵۸

4۔ غبارِ خاطر ابوالکلام آزاد ص نمبر ۳۲۰

"اُس بازار میں"

"چنانچہ مسلمان بادشاہوں میں خلجی اور تغلق خاندانوں کی موسیقی سے دلچسپی کے واقعات عام ہیں۔ جس شاہی خاندان نے موسیقی سے بحیثیت فن اعتنا کیا وُہ شرقی خاندان تھا"[1]

"غبارِ خاطر"

"ابراہیم عادل شاہ تو بقول ظہوری کے اِس تعلیم کا جگت گورو تھا"[2]

"اُس بازار میں"

"چنانچہ ابراھیم عادل شاہ کو ظہوری نے جگت گورو کہا ہے"[3]

"غبارِ خاطر"

"مُلّا مبارک کے حالات میں خصوصیت کے ساتھ اس کی تصریح ملتی ہے کہ ہندوستانی موسیقی کا عالم و ماہر تھا اکبر نے اسے تان سین کا گانا سنایا تو صرف اتنی داد ملی کہ "ہاں گا لیتا ہے""[4]

"اُس بازار میں"

"مُلّا مبارک موسیقی کے نکتہ شناسوں میں تھے انہوں نے تان سین کا گانا سُنا تو صرف یہ کہا تھا "ہاں گا لیتا ہے""[5]

۱؎	اُس بازار میں	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۵۹
۲؎	غبارِ خاطر	ابوالکلام آزاد	ص نمبر ۳۲۰
۳؎	اُس بازار میں	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۵۹
۴؎	غبارِ خاطر	ابوالکلام آزاد	ص نمبر ۳۲۲
۵؎	اُس بازار میں	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۵۹/۱۶۰

"غبارِ خاطر"

"سرس بائی جو شہزادہ داد بخش کی محبوبہ تھی خیال گانے میں اپنا جواب
نہ رکھتی تھی .... اورنگ زیب نے جب مراد کو قید کیا
تو سرس بائی بھی تیار ہو گئی کہ اس کے ساتھ قید بند کی سختیاں گوارا کرے"[1]

"اُس بازار میں"

"شہزادہ داد بخش کو اورنگ زیب نے قید کیا تو اپنے ہمراہ سرس بائی
کو لے گیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس عہد کے خیال گانے
والوں میں اس کا ثانی نہ تھا"[2]

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس تقریر میں آغا حشر یا مختار کا کوئی دخل نہیں بلکہ شورش کاشمیری نے خود یہ تقریر ترتیب دی ہے۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ شورش کاشمیری کی محبت اور عقیدت سے تو ہر کوئی واقف ہے اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریر کا شاید ہی کوئی لفظ ہو جو آغا صاحب کے مطالعے میں نہ آیا ہو اور پھر موسیقی کے متعلق یہ خط تو دنیائے ادب میں بڑا ہی معروف ہے اور موسیقی کی تاریخ کو تقریر کی صورت دیتے وقت آغا صاحب کے ذہن پر اُس کی پرچھائیں پڑ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں بلکہ یہ بڑا ضروری اور فطری تھا کیونکہ شورش کاشمیری کے مطالعے کا معتبر حصہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریریں اور تقریریں ہیں۔ غرض آغا صاحب نے جو بیانات اُس بازار کے کرداروں کے ساتھ منسوب کئے ہیں وہ آغا صاحب کے اپنے مطالعے اور مشاہدے کا حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب میں ان کے مخصوص خیالات کی جھلکیاں عام ہیں۔ زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف افراد اور اداروں سے یہ چھیڑ چھاڑ ملاحظہ کیجئے جو صحافت میں شورش کا ایک خاص رنگ ہے۔ شوکت نامی خواجہ سرا کہتا ہے۔

---

1. غبارِ خاطر — ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۳۲۵
2. اُس بازار میں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۶۵

"نہ کبھی ہم نے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا ہے اور نہ ہمارے کوئی حقوق

ہیں افسوس کہ خدا کی مخلوق سیاسی مخنثوں کے قبضہ میں ہے۔

"اور یہ سیاسی مخنث کون ہیں"

شوکت کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ معاف کیجئے انہیں آپ بھی جانتے ہیں۔

سیاسی مخنثوں کی مضرتیں اجتماعی ہیں اور جنسی مخنثوں کی فردی ہیں[1]

"وہ مذاق کیا کرتی ہے اُس کا پیشہ ایک انقلابی مشن ہے اس کی ابتدا

کیسے ہی ہوئی ہو لیکن طوائف نے ہر دور میں رجعتی قوتوں کو ڈبو یا ہے۔

اُس نے ہر دولت مند سے مزدور کی محنت کا انتقام لیا ہے"[2]

ہیرا منڈی کی طوائف ایک سوال کے جواب میں انکشاف کرتی ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"آپ بھی انجان بنتے ہیں حکومت کے لئے اور تھوڑے کام ہیں یہ ایک اخلاقی

مسئلہ ہے اور اس کا تعلق پورے معاشرہ سے ہے"

"لیکن حکومت کے بھی تو کچھ فرائض ہوتے ہیں؟"

جی ہاں کیوں نہیں وہ اپنے فرائض کو بڑی خوبی سے پورا کرتی ہے مثلاً ایک دفعہ

قلعہ کی سیڑھیوں پر لیاقت علی خان نے سلامی لی تھی تو قلعہ کی سیڑھیوں پر

جو قالین بچھائے گئے تھے ہمارے ہی مکانوں سے گئے تھے جب کبھی قلعہ سے

باہر یا قلعہ کے اندر کوئی تقریب ہوتی ہے قالین ہمارے ہاں ہی سے جاتے ہیں۔

"اوہو یہ تو ایک خبر ہے"

خبر کیسی؟ راعی کا رعایا پر حق ہوتا ہے ہمیں تو دنگل کے لئے بھی ٹکٹ خریدنے

1۔ اُس بازار میں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۱۰/۲۱۱

2۔ ایضاً — ص نمبر ۱۴۱

پڑتے ہیں۔[1]

ممتاز کہتی ہے۔

"ہر رات دس بجے کے بعد قلعہ کی سیڑھیوں۔ شاہی مسجد کی پیٹھ اور علامہ اقبال کی قبر کے پاس جو بیکارڈ کاریں کھڑی ہوتی ہیں وہ ہمارے ہی شبینہ مہمانوں کی ہوتی ہیں۔ یہ وہی ہیں جن کے قبضۂ قدرت میں بالواسطہ یا بلا واسطہ عنانِ اقتدار ہے۔"[2]

آغا صاحب نے اِس کے علاوہ بھی معاشرے کی برائیوں پر طنز کے تیر چلائے ہیں اور یہ تیر آغا صاحب کے اپنے ہی ترکش کے ہیں یہ الگ بات کہ چلانے والی کمان کسی خوبصورت طوائف کے نازک ہاتھوں میں تھما دی گئی ہے۔ مولانا عبدالمجید سالک نے اِس کتاب کے تعارف میں اُس بازار کی یہ عبارت نقل کی ہے اور اس عبارت کو شورش کے قلم سے ادبیت کا اسراف کہا ہے۔[3] عبارت یہ ہے۔

"اُس کا ناچ تیز ہوگیا، اس کی دھنیں پھیلتی گئیں، اُس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا، اس کی ادائیں نکھرتی گئیں، اس کے پھول کھلتے گئے، اس کے شُعلے ٹوٹتے گئے، اس کا رُوپ سوا ہوتا گیا۔ اس کی جوانی کا الاؤ بھڑکتا گیا، کبھی لہروں کی طرح بڑھی، کبھی پنکھڑیوں کی طرح سمٹی، کبھی خوشبو کی طرح پھیلی، کبھی بجلی کی طرح کوندی، کبھی مینا کی طرح چھلکی، کبھی ساغر کی طرح کھنکی، کبھی گلاب کی طرح مہکی، کبھی بُلبل کی طرح چہکی، کبھی گھٹاؤں کی طرح اُٹھی، کبھی میکدے کو نکل گئی، کبھی بُتکدے کو آگئی، کبھی آغوش بن گئی، کبھی امنگوں میں گھلنے لگی، اور کبھی رنگوں کا پیکر بن گئی ــــ لیکن جیسے جیسے وُہ ناچتی گئی، اس کا ہر زاویہ سوال بنتا گیا ــــ فرشتوں کا زہرخند ــــ قدرت کا نوحہ۔"[4]

۱۔ اُس بازار میں ــ شورش کاشمیری ــ ص نمبر ۱۳۰/۱۳۱

۲۔ ایضاً ــ ص نمبر ۱۴۱/۱۴۲

۳۔ بحوالہ اُس بازار میں ــ تعارف عبدالمجید سالک ــ ص نمبر ۲۳

۴۔ اُس بازار میں ــ شورش کاشمیری ــ ص نمبر ۲۲۶

سالک صاحب نے یہ عبارت نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

"میرے نزدیک یہ زیادہ تر شورش کا حسنِ نظر ہی ہے کہ ایسے شہپارے
رقاصئہ فلک یا آکاش کی اپسرا بن کر نظر آئی اور شورش کا
توازنِ تحریر اس کے فنِ رقص کی موجوں میں تنکا بن کر بہ گیا ہے"[1]

سالک صاحب نے اِس عبارت کا ایک حصہ نقل کیا ہے جس کی وجہ سے سالک صاحب کو شورش کا توازنِ تحریر رقص کی موجوں میں بہتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اس عبارت کے دوسرے حصے پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ عبارت فنِ خطابت کا ایک شاہکار ہے، نہ صرف یہ عبارت بلکہ اس کتاب کے اکثر مقامات پر ایسی کئی مثالیں مل جاتی ہیں۔ کیونکہ شورش کی تحریروں میں ادب کے ساتھ خطابت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ اس عبارت کو صحیح آہنگ میں ادا کرنے سے خطابت خود بخود ٹپک پڑے گی۔ پہلے "اُس کا ناچ تیز ہو گیا سے لے کر "اُس کی جوانی کا الاؤ بھڑ کتا" تک کو ایک آہنگ میں درمیانی آواز میں اور نہایت تیزی و روانی کے ساتھ ادا کرنا ہو گا۔ اس کے بعد "کبھی لہروں کی طرح بڑھی" سے لے کر "کبھی رنگوں کا پیکر بن گئی" تک کی عبارت میں آہنگ بدل جائے گا۔ تیزی اور روانی قائم رہے گی۔ اور قوافی ملتے جائیں گے اور جب یہ الفاظ ادا کئے جائیں کہ "لیکن جیسے جیسے وہ ناچتی گئی اس کا ہر زاویہ سوال بنتا گیا۔ فرشتوں کا زہر خند، قدرت کا نوحہ" تو آواز میں اضمحلال پیدا ہوگا اور یہ فقرہ آہستہ ادا کیا جائے۔ پھر جب "وہ ناچ رہی تھی" سے لے کر الغرض "فضا میں ناچ ہی ناچ تھا" تک آغاز آہستہ آواز میں ہوگا اور آواز بتدریج اونچی ہوتی جائے گی اور جب ان الفاظ کو ادا کرنے کا وقت آئے گا کہ "لیکن یہ ناچ سے لے کر کوئی کا نشانہ نہ تھا" تو آواز اپنے پورے عروج پر ہوگی۔

---

[1] اُس بازار میں   تعارف عبدالمجید سالک   ص نمبر ۲۳

اور لہجہ کسی قدر درد کا حامل ہوگا اور بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ یہ الفاظ ادا ہونگے۔ مصرع دھیمی آواز میں ادا ہوگا۔

یہ عبارت کتاب کے آخری اوراق ہیں اور حقیقت میں یہ کتاب یہاں ختم ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد دو تین صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ وہ صرف اس لیئے ہے کہ اس محفل کا اختتام بھی دکھا دیا جائے۔ جس کی یہ عبارت منتظر تھا۔ خطابت میں تقریر کا اختتام بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ جس کے کئی طریقے ہیں سب سے مشکل مگر کامیاب طریقہ یہی ہے کہ تقریر کو عروج پر لے جا کر ختم کیا جائے۔ آغا صاحب نے اس مقام پر اسی اصول کو برتا ہے۔ وہ اپنی تقریر ہمیشہ عروج پر لے جاکر ہی ختم کیا کرتے تھے۔

شورش کاشمیری کی تحریروں میں ادب اور خطابت کے امتزاج نے ایک خاص جوش پیدا کر دیا ہے۔ جس سے اُن کی تحریروں میں اثر پیدا ہوتا ہے اور یہ اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ طوائف سے نفرت کی بجائے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کے موضوعات پر لکھنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ قلم کی ذرا سی کوتاہی بھی ادب کے دامن میں عریانی یا فحاشی کا داغ بن سکتی ہے۔ کسی بھی فنکار کی صلاحیت کو پرکھنے کا ایک معیار یہ ہے کہ وہ اس قسم کے موضوعات سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ شورش صاحب اس امتحان میں پورے اترے ہیں۔ انہوں نے اشاروں اور کنایوں میں ناگفتنی کو گفتنی بنا دیا۔ جس کی وجہ سے اُن کی تحریر میں شوخی کے ساتھ حسن کا اضافہ بھی ہوا ہے۔

دہلی چلو۔ یہ کتاب آزاد ہند فوج اور اس کے انقلابیوں کی تاریخ ہے جنہوں نے ہندوستان کی آزادی کیلئے مسلح جدوجہد کو اپنا نصب العین قرار دیا تھا۔ کتاب ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ پہلے ۱۶ صفحات پر کوئی صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔ لہذا اگر ان صفحات کو بھی شامل کر لیا جائے تو کل صفحات ۲۴۰ بن جاتے ہیں۔ اس کا انتساب پر بودھ چندر کے نام ہے جو آغا صاحب کے عزیز دوست تھے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۴۶ میں اردو اکیڈمی لاہور سے شائع ہوئی۔ کتاب کے شروع میں علامہ انور صابری کی "دہلی چلو" کے عنوان سے ایک نظم ہے۔ جس کا آخری شعر یہ ہے کہ

اپنی اس تصنیف تازہ میں بخوش رنگ کلام
کہہ رہا ہے شورش رنگیں بیاں 'دہلی چلو'

'دہلی چلو' آزاد ہند فوج کا نعرہ تھا اور یہی نعرہ اس کتاب کا نام بھی ہے۔ کتاب کا مقدمہ پروفیسر تلک رام چڈھا ایم۔اے، ایم ایل اے پنجاب نے لکھا ہے۔ "آغاز کی بات" کے عنوان سے کامریڈ یوسف مہر علی سیکرٹری آل انڈیا کانگریس سوشلسٹ پارٹی بمبئی کا تاثر درج ہوا ہے۔

پھر آغا صاحب کے قلم سے اس کتاب کے تحریر کئے جاتے پر چند باتیں ہیں۔ آغا صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"کچھ صفحے دہلی میں لکھے۔ دو باب انبالے میں سپرد قلم کئے اور نصف سے زیادہ حصہ چلتی گاڑی میں لکھا۔ آزاد ہند فوج کے بڑے افسروں سے ذاتی تعلقات کا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔ بہت سی معلومات ان سے حاصل ہوگئیں۔ کچھ کتابیں ریلوے بک سٹالوں سے خریدیں اور استفادہ کیا اور اس طرح دو تین ہفتوں میں کتاب تیار ہوگئی ہے"[1]

۱۔ دہلی چلو .... ص ۲۲ شورش کاشمیری

آغا صاحب کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو لکھنے کیلئے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا۔ بلکہ یہ کتاب آغا صاحب کی چند ہفتوں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ لیکن کتاب کو پڑھنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب نے کس آسانی کے ساتھ آزاد ہند فوج کے نام سے اس عہد کی سیاسی تاریخ لکھ دی ہے۔ بادی النظر میں یہ کام بڑا ہی مشکل نظر آتا ہے۔ کیونکہ کسی عہد کی تاریخ لکھنے کیلئے حالات و واقعات کی صحت کا لحاظ رکھنا بڑا ضروری ہوتا ہے۔ جس کیلئے تلاش و جستجو کرنا پڑتی ہے مگر آغا صاحب چونکہ خود سیاست کی پرخار وادی کے راہرو تھے۔ لہٰذا اس کتاب میں بیان ہونے والے واقعات کا دوسروں سے زیادہ علم رکھتے تھے۔ بلکہ وہ عملی سیاسی تحریکوں سے وابستہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام واقعات بڑی صحت اور خوبی کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ کانگریس اور گاندھی جی سے اُن کے اختلاف کے پس منظر میں انتہا پسندوں کی سرگرمیوں پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد دہشت پسندوں کے کارناموں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جو ہندوستان کی آزادی کیلئے انجام دیئے گئے۔ آزاد ہند فوج کا قیام دوسری جنگ عظیم کا ایک بہت بڑا واقعہ ہے۔

دوسری جنگ عظیم میں آزاد ہند فوج کی کہانی اس طرح ہے کہ سبھاش چندر بوس ہندوستان سے غائب ہو گئے۔ چھپتے چھپاتے کابل پہنچ گئے۔ وہاں سے برلن روانہ ہو گئے۔ جرمنی کے حکام سے ملاقات کی۔ بہت سے ہندوستانی سپاہی جو جنگی قیدی بنا لیے گئے تھے اور بہت سے ہندوستانی فوجی برطانیہ کی طرف سے اس جنگ میں حصہ لے رہے تھے انہیں ترغیب دی کہ برطانیہ کیلئے لڑنا بند کر دیں کیونکہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو غلام بنا رکھا ہے۔ سپاہیوں سے یہی کہا گیا کہ اگر لڑنا ہی ہے تو کیوں نہ ہندوستان کی آزادی کیلئے لڑا جائے جس جنگی قیدیوں اور برطانوی حکومت کی طرف سے لڑنے والے ہندوستانی سپاہیوں نے انگریز کو غاصب سمجھ کر اُن کی طرف سے لڑنا بند کر دیا۔ ان تمام فوجیوں نے آزاد ہند فوج کا نام پایا۔ آزاد ہند فوج کا مقصد یہ تھا کہ یہ فوج برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کرے اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر آزادی حاصل کرے۔

اِس مقصد کیلئے ایک عارضی آزاد ہند حکومت قائم کی گئی۔ ابتدا میں اِس حکومت کا مرکز سنگا پور تھا اس کے بعد رنگون اور پھر بنکاک میں اِس کے دفاتر چلے گئے تھے۔ عارضی آزاد ہند حکومت ایک باقاعدہ حکومت تھی۔ جسے آٹھ مختلف ممالک نے تسلیم کیا۔ حکومت کے مختلف محکموں کے علاوہ براڈ کاسٹنگ اسٹیشن، اخبار وغیرہ بھی عام حکومتوں کی طرح کام کرتے تھے۔ اِس حکومت کی اپنی ایک کابینۂ جنگ بھی تھی۔ سبھاش چندر بوس صدر ریاست، وزیر اعظم، وزیر جنگ، وزیر امور خارجہ تھے۔

عارضی آزاد ہند حکومت کی طرح آزاد ہند فوج کی بھی باقاعدہ تنظیم کی گئی تھی۔ جس کے اپنے قواعد وضوابط تھے۔ اِس فوج میں مختلف ڈویژن تھے۔ عورتوں اور بچوں کی رجمنٹیں بھی بنائی گئی تھیں۔ فوج کو باقاعدہ تنخواہ دی جاتی تھی اس کے اپنے امتیازی نشانات تھے۔ جس طرح آزاد ہند حکومت ایک مکمل حکومت تھی اُسی طرح آزاد ہند فوج بھی ایک مکمل فوج تھی۔ جنگ کے سلسلے میں آزاد ہند فوج اور جاپانیوں میں اتحاد تھا۔ اور دونوں فوجیں ایک دوسرے کی اتحادی تھیں یکم فروری ۱۹۴۴ء کو برما کی سرحد سے باقاعدہ حملہ کیا گیا۔ ابتدا میں اِس فوج نے کچھ کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ لیکن نامساعد موسمی حالات، خوراک اور ہتھیاروں کی کمی اور جاپانیوں کے مدد سے گریز کی وجہ سے یہ فوج اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ آزاد ہند فوج کے جو افسر قیدی بن کر ہندوستان آئے اُن پر مقدمات بھی چلائے گئے۔ اِن مقدمات نے ہندوستان میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اور اِس دوران میں اِن پر کئی کتابیں بھی لکھی گئیں۔ تقسیم کے بعد بھی ہندوستان میں اِس واقعے سے دلچسپی کم نہ ہوئی اور بہت سی کتابیں اِس موضوع پر تحریر ہوئیں۔ ہندوستان کی حکومت کی سرپرستی میں اِس واقعے کے متعلق تحقیقی کام کیا گیا۔

۱۹۷۷ء میں مسٹر ایس۔ اے آئیر[1] کی کتاب جس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر تمر رئیس نے "آزاد

---

[1] مسٹر ایس اے آئیر، سبھاش چندر بوس کے رفیق خاص ہیں اور سنگاپور سے سبھاش چندر بوس کے آخری سفر پر روانہ ہوتے وقت بھی موجود تھے اور آزاد ہند فوج کی عبوری حکومت میں پبلسٹی کے وزیر تھے جنہوں نے ۱۹۵۱ میں جاپان کا دورہ کرکے سبھاش چندر بوس کی آخری روپوشی کی رپورٹ حکومت ہند کو دی

ہند فوج کی کہانی کے عنوان سے کیا جسے نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ مصنف نے اپنی ذاتی معلومات کے علاوہ پچیس کے قریب کتابوں سے استفادہ کیا ہے[1]۔ جن کا موضوع خالصتاً آزاد ہند فوج اور سبھاش چندر بوس ہے۔ ان کتابوں میں وہ چھ سات کتابیں شامل نہیں ہیں جن سے آغا صاحب نے استفادہ کیا ہے[2]۔ تاہم مسٹر اے۔ ایس آئیر کی کتاب اس موضوع پر کوئی خاص اضافہ نہیں بلکہ وہی واقعات اور باتیں درج ہوئی ہیں جو آغا صاحب نے ۱۹۴۶ء میں تحریر کی تھیں۔ بلکہ بعض مقامات پر آغا صاحب نے واقعات کا تجزیہ جس حسن و خوبی سے کیا ہے۔ مسٹر اے ایس آئیر کی کتاب میں نہیں۔ مثلاً آغا صاحب نے سبھاش چندر بوس کے سیاسی مسلک کی روشنی میں کانگریس اور گاندھی جی سے اُن کے اختلافات پر جو بحث کی ہے وہ ایک تاریخی حقیقت ہے۔

مگر مسٹر ایس' اے آئیر نے اُن کا سرسری ذکر کیا ہے۔ اسی طرح دہلی کے لال قلعے میں آزاد ہند کے نامور ارکان شاہنواز، سہگل اور ڈھلوں پر جو مقدمہ برطانوی حکومت کی طرف سے چلایا گیا۔ آغا صاحب نے ہندوستان کی تاریخ کے پس منظر میں اُس کی خوبصورت تصویر پیش کی ہے۔ مگر ایس' اے آئیر کی کتاب میں تفصیلات کم ہیں۔ مثلاً آغا صاحب نے آنجہانی بھولا بھائی ڈیسائی جنہوں نے اس مقدمے کی پیروی کی، کے دلائل کو کتاب کے صفحہ نمبر ۱۹۶ تا ۱۹۹ پر جس مؤثر انداز میں پیش کیا ہے وہ بات مسٹر ایس' اے آئیر کی کتاب کے صفحہ نمبر ۹۹ / ۱۰۰ پر نظر نہیں آتی۔ یہاں یہ دلائل نقل کیے گئے ہیں۔ نیز اس مقدمے کے ملزموں کے بیانات کو بھی مسٹر ایس' اے آئیر نے زیادہ اہمیت نہیں دی جبکہ آغا صاحب نے شاہنواز سہگل اور ڈھلوں کے بیانات کو خاص اہمیت دی ہے۔

مسٹر ایس۔ اے آئیر کے مقابلے میں آغا صاحب نے نہ صرف آزاد ہند فوج کی کہانی لکھی ہے بلکہ خود انقلابیوں اور اُن کے کارناموں کی تاریخ بھی مرتب کر دی ہے۔

---

[1] بحوالہ آزاد ہند فوج کی کہانی ایس اے آئیر ترجمہ قمر رئیس ص نمبر ۱۲۸ نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا دہلی

[2] بحوالہ دہلی چلو شورش کاشمیری ص نمبر ۲۲۴

جن کا بڑا کارنامہ آزاد ہند فوج کا بنانا۔ عبوری حکومت کا قیام اور ہندوستان کی آزادی کے لئے جاپانیوں کے لئے امداد حاصل کرنا ہے اور انگریزوں کے خلاف معرکہ آرا ہونا تھا ان واقعات کو آغا صاحب نے پوری جزئیات کے ساتھ بڑی خوبی سے قلم بند کیا ہے۔

'دہلی چلو' میں سبھاش چندر بوس کے پیغامات، خطبے اور تقریروں کے جو اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ اس نے اس کتاب کو زیادہ وقیع بنا دیا ہے۔ اس طرح شاہنواز کی ڈائری اور کرنل ڈھلوں کی ڈائری سے جو حوالے دئیے ہیں وہ بے شبہ تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں

آخر میں چہرے کے عنوان سے آزاد ہند فوج کے ارکان کا تعارف دیا گیا ہے۔ جسمیں میجر جنرل شاہنواز، لیفٹیننٹ کرنل ڈھلوں[1]، کرنل حبیب الرحمن، کرنل بھونسلے[2]، کپتان احسان قادر، کرنل لوگا ناتھن، میجر جنرل عزیز احمد خاں، لیفٹیننٹ ناگ، کپتان ارشاد، کپتان برہان الدین، جنرل موہن سنگھ اور کیپٹن لکشمی شامل ہیں۔

یہ کتاب آغا صاحب کی ابتدائی کتابوں میں سے ہے، آغا صاحب کو لکھنے کی مشق چونکہ بچپن سے تھی لہذا زبان کی خوبی کے لحاظ سے یہ کتاب ابتدائی نقش معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ زبان وبیان پر آغا صاحب کی گرفت بڑی مضبوط نظر آتی ہے۔ واقعات سپاٹ طریقے سے بیان نہیں ہوئے۔ نہ ہی تاریخی واقعات کے بیان کرنے کا عام طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ واقعات کے بیان میں زبان کا ادبی پہلو نمایاں ہے۔ کتاب کے کل چھ ابواب ہیں اور بقول پروفیسر تلک راج چڈھا

"یہ چھے باب بہ اعتبار معلومات تاریخ کا سرمایہ اور بلحاظ زبان خوش نگاری کا مرقع ہیں"[3]

---

[1] پورا نام گور بخش سنگھ ڈھلوں ہے — دہلی چلو — ص نمبر ۲۱۱

[2] پورا نام جگن ناتھ راؤ بھونسلے ہے — دہلی چلو — ص نمبر ۲۱۵

[3] مقدمہ از پروفیسر تلک راج چڈھا — دہلی چلو

فن خطابت ۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے اکتوبر ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی یہ کتاب ۱۱۳ صفحات پر مشتمل ہے کتاب کے صفحہ چار پر آغا صاحب کے بیٹے آغا مسعود شورش کی طرف سے "عرض ناشر" ہے اگلے صفحہ پر آغا صاحب کی تصویر ہے۔ جس میں وہ تقریر کرتے دکھائے گئے ہیں ۔ اس سے اگلے دو صفحات پر آغا صاحب کے متعلق مشاہیر کے تاثرات درج ہیں جن مشاہیر کے تاثرات نقل ہوئے ہیں ان کے اسماء گرامی ہیں مولانا ظفر علی خان ؒ۔ مولانا ابوالکلام آزاد ؒ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ چوہدری افضل حق ؒ مولانا شوکت علی خان ؒ۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ اور ڈاکٹر پروفیسر رشید احمد صدیقی علی گڑھ یونیورسٹی ۔ اس کے بعد سید عبداللہ صاحب کا دیباچہ ہے اس کے بعد خطابت کا یہ چارٹ دیا گیا ہے۔

خطابت کا چارٹ ، مطالعہ سے پہلے ۔ مطالعہ سے بعد

خطابت کے اجزائے ترکیبی کا تناسب درج ذیل ہے ۔ اپنی ابتدائی استعداد کا تناسب لکھیں مطالعہ کر چکیں تو اپنے تجربے کا جائزہ لیں اور اسطرح چھ ماہ کے لیے چارٹ بنالیں۔ ہر مہینہ کی پریکٹس کا نتیجہ لکھتے جائیں پہلی شش ماہی میں معلوم ہو جائے گا کہ آپ کے شوق و محنت نے کس قدر برگ و بار پیدا کیے ہیں **خطابت کا چارٹ**

نمبر شمار	اجزائے خطابت	تناسب	مطالعہ سے پہلے	مطالعہ کے بعد	تجربہ سے پہلے	تجربہ کے بعد	
۱	آواز	۱۵ فیصد					
۲	اظہار	۱۵ فیصد					
۳	تکنیک	۱۰ فیصد					
۴	اسلوب	۱۵ فیصد					

جاری ہے

۵	سلاست	۱۵ فی صد				
۶	متانت	۱۰ فی صد				
۷	ظرافت	۱۰ فی صد				
۸	اشارات	۵ فی صد				
۹	استدلال	۵ فی صد				
۱۰	تجربہ	۱۰ فی صد				
۱۱	تمثیلات	۵ فی صد				
۱۲	انفرادیت	۵ فی صد				

آغا صاحب نے اس کتاب میں یہ بتایا ہے کہ خطابت کیا ہے پھر عربی اور فارسی زبان کے حوالے سے اردو زبان میں خطابت کی نشو نما اور اردو خطابت کا ارتقا دکھایا گیا ہے۔ عام طور پر ہر تقریر کرنے والے کو خطیب کہہ دیا جاتا ہے۔ آغا صاحب نے اس فنی فرق کو بڑے خوبصورت پیرائے میں واضح کیا ہے۔ جو ایک خطیب۔ مقرر۔ واعظ، ذاکر اور باتونی میں ہوتا ہے۔ خطیب اس فن کی معراج ہے۔ اردو زبان میں صرف چند خطیب ہیں۔ باقی کا تعلق خطابت کی دوسری اقسام سے ہے۔ ایک خطیب میں مندرجہ ذیل اوصاف کا ہونا بڑا ضروری ہے

۱۔ بے ریاکار
۲۔ بلند نصب العین
۳۔ اخلاص فی العمل
۴۔ صداقت شعاری
۵۔ شخصی وجاہت
۶۔ باخبر ذہن
۷۔ نستعلیق اشارات
۸۔ طلاقت لسانی
۹۔ بے عیب آواز
۱۰۔ صحیح تلفظ

۱۱۔ حاضر جوابی	۱۲۔ برجستہ گوئی
۱۳۔ موقع شناسی	۱۴۔ وحدت مقصد
۱۵۔ ہمدردی وپامردی	۱۶۔ مجمع کی نفسیات سے آگاہی
۱۷۔ فہم عامہ ومہارت تامہ	۱۸۔ مطالعہ کی چٹک
۱۹۔ مشاہدہ کی لگن [1]	

اس کے بعد اُن لوازم و خصائص کا ذکر ہے۔ جن سے خطابت ترکیب پاتی ہے۔ یہ وہی عناصر ہیں جو شروع میں خطابت کے چارٹ میں دیئے گئے ہیں۔ اور یہاں ان خصوصیات کی ترتیب وار تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔

اس کے بعد ایک باب سٹیج کے متعلق ہے۔ پھر زبان کی فنی نزاکتوں کا بیان ہے آخر میں نکات واشارات کے عنوان سے خطابت کے لوازم کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس کتاب میں دیباچے میں بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ

"شورش کی یہ کتاب نظری / نظریاتی کم ہے اور تجرباتی۔ مشاہداتی اور تاثراتی زیادہ ہے" [2]

آغا صاحب نے اس کتاب میں اردو کے جن خطیبوں کا بطور خاص ذکر کیا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری۔ مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علیخان شامل ہیں۔ اگرچہ دوسرے بڑے مقرروں کی خطابت پر بھی اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن مرکزی خطیب بھی یہیں جن کا حاصل خود شورش کی خطابت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان خطیبوں کا ذکر

---

[1] فن خطابت ص نمبر ۳۲ / ۳۳

[2] دیباچہ فن خطابت ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۵

کتاب میں بار بار آیا ہے گویا آغا صاحب کا تجربہ۔ مشاہدہ اور تاثر مولانا ابوالکلام آزاد۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری۔ مولانا ظفر علی خان اور مولانا محمد علی کی خطابت کا رہینِ منت ہے۔ اور یہ کتاب لکھتے وقت ان خطیبوں کی خطابت ہر وقت آغا صاحب کے شعور میں موجود نظر آتی ہے۔ آغا صاحب ایک عوامی خطیب تھے اور ان کا خمیر بھی عوام ہی سے اٹھا تھا۔ وہ اس طبقے کے مزاج شناس اور نباض تھے۔ جس کا تعلق عوامی تحریکوں کی روح سے ہوتا ہے۔ گویا وہ اس طبقے کی معاشرت اور تہذیب کے رازداں تھے اور اس بات کا تجربہ بھی رکھتے تھے کہ مختلف خیال رکھنے والے لوگوں کو اکائی میں کیسے تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ لوگ کیسے رو سکتے اور کیسے ہنس سکتے ہیں۔ کہاں واہ اور کہاں آہ کرتے ہیں۔ مگر ان سب باتوں کے نفسیاتی محرکات کیا ہیں۔ اس کا تجزیہ نہیں کرتے بلکہ صرف تجربے کی بنیاد پر حاصل کردہ حقائق کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اور شاید یہ اُن کا کام بھی نہ تھا۔ ایک ماہر نفسیات ان محرکات کا تجزیہ آغا صاحب سے بہتر کر سکتا ہے۔ لیکن وہ اس تجزیے کی بنیاد پر مجمع پر اسطرح جادو نہیں کر سکتا۔ جسطرح آغا صاحب کیا کرتے تھے۔ لہٰذا اس کتاب میں یہ بیان تو ملتا ہے کہ خطیب بپھرے ہوئے ہجوم اور بگڑے ہوئے مجمعوں کو رام کر لیا کرتے تھے کیونکہ ایسا کرنے میں شورش صاحب کا خود اپنا تجربہ بڑا وسیع ہے لہٰذا وہ اس کا ذکر بار بار کرتے ہیں لیکن ایسا کیوں اور کسطرح ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب اس کتاب میں واضح نہیں ہے۔

فنِ خطابت اردو زبان میں ایک مستند کتاب ہے۔ جس کی اردو زبان میں اس سے پہلے کوئی مثال نہیں۔ خطابت زمانہ جنگ میں نشو ونما پاتی ہے اور جس صدی کے تجربات پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ اس میں نہ صرف پہلی اور دوسری جنگِ عظیم ہوئیں بلکہ انگریزوں کے خلاف آزادی کی ایک بھرپور اور نتیجہ خیز جنگ بھی ہوئی جس میں حریت پسندوں کا سب سے بڑا ہتھیار خطابت ہی تھا۔ اور جس کے شاہسوار فنِ خطابت کے مصنف آغا شورش کاشمیری خود بھی تھے۔ اور اب چونکہ جنگ کی حالت ختم ہو

چلی ہے لہٰذا آئندہ بھی اس سے بہتر تجرباتی کتاب لکھے جانے کی کوئی خاص صورت نظر نہیں آتی کیونکہ حالات و واقعات سے خطابت ہمارے ملک میں زوال پذیر ہے -

اس کے علاوہ انہوں نے خطابت اور شاعری کا جو موازنہ کیا ہے - اور اردو ادب کے عظیم شاعروں کے اسالیب بیان کا فرق جس طرح واضح کیا ہے - وہ ادبی تحریک کا بہترین حصہ کہا جا سکتا ہے - لطف کی بات یہ ہے کہ یہ تنقید کسی طرح طوالت کا رنگ لیے ہوئے نہیں ہے بلکہ بڑی ہی مختصر مگر جامع ہے مثلاً

"میر میں عشق کی لہک اور درد کی کسک ہے - غالب میں خیال کی گیرائی اور احساس کی گہرائی ہے حالی نے شاعری کا مزاج بدلا اور قومی اصلاح کی نیو اٹھائی - اُن کے لہجہ میں پکار ہے، للکار نہیں - ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیبی و تعلیمی ویرانیوں کے طنّاز تھے" [ل]

بالکل اسی طرح خطیبوں کے اسلوب بیان کے فرق کو واضح کرنے کے لیے پہلے ان کی تقریروں کے اقتباسات دیئے گئے ہیں اور پھر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے -

"مولانا ابوالکلام آزاد میں علم کا وقار، مطالب کا عمق اور خطابت کا دبدبہ تھا وہ سامعوں کو مسخر کرتے تھے - سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنی تلوار تھے ان میں آواز کا جدل اور لہجہ کا جمال تھا - محمد علی جوہر بے پناہ تھے - ان کی طاقت لسانی میں آہو چشموں کی شوخیاں تھیں - مولانا احمد سعید دہلوی اداس راتوں میں باد صبحگاہی کا رجز تھے - سردار عبدالرب نشتر میں غنچہ نورسیدہ کی چٹک تھی - جواہر لال کے لہجہ میں پریاگ کا حسن تھا - مولانا ظفر علی خان اردو لہجہ میں حجازی نغمہ تھے - نواب بہادر یار جنگ بروایت اردو کی

ل فن خطابت ص نمبر ۲۹

نیام میں عربی تلوار تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو ضیغم کی للکار تھے۔ ڈاکٹر اشرف سید کے چاند کی طرح طلوع ہو کر دیوالی کے دیپ کی طرح بجھ گئے ہیں[1]

ڈاکٹر سید عبداللہ نے بجا طور اس کتاب کو مدرسانہ[2] کہا ہے۔ جس میں ہر بات کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس کتاب کی زبان بڑی بلیغ اور استعاراتی ہو کر اتنی خوبصورت ہو جاتی ہے کہ قاری مطالب تک رسائی سے پہلے الفاظ کی خوبصورتی پر وجد کرنے لگتا ہے[مثلاً]

"فی الجملہ خطابت الفاظ کی ژالہ باری نہیں، الفاظ کی گلباری ہے۔ ایک مقرر کی سب سے بڑی خوبی یہ کہ وہ لالہ زار خیال کے مختلف تختوں میں گھمتا اور کارزار خطابت کے مختلف محاذوں پر لے جاتا ہے۔ وہ جذبات کی لہروں میں تلاطم و تموّج پیدا کرتا اور متضاد و متحرک کیفیتوں کو اچھالتا اور اجالتا ہے۔ اس کے فن کا سہاگ، سلاست کے حسن میں حاضر کلامی، حاضر دماغی اور برجستہ گوئی کی شہابی لہریں ہیں جن سے سماعت تیز ہوتی اور زنگار زنگ ذہن، ایک ساتھ جاگ اٹھتے ہیں اور طبائع کا ہجوم جذبہ کی وحدت میں ڈھل جاتا ہے"[3]

یہ کتاب پڑھنے کے بعد ایک قسم کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر یہ کتاب آغا صاحب کی زندگی میں شائع ہوتی تو یقیناً اس میں ترمیم و اضافہ کرتے اور یہ کتاب ایک بہتر صورت میں ہمارے سامنے آتی جیسا کہ ابتدائی سطور میں آغا مسعود شورش نے لکھا ہے کہ کتاب میں تاخیر کی وجہ آغا صاحب کے لخت لخت مسودہ کو ترتیب دینا تھا۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آغا صاحب نے جو کچھ لکھا وہ کسی خاص ترتیب سے نہیں تھا بلکہ وہ اسے بعد کو ترتیب دینا چاہتے تھے۔ بہر حال اس کے باوجود فن خطابت سے متعلق جملہ اسرار و رموز اس کتاب میں مل جاتے ہیں۔

---

[1] فن خطابت ص نمبر ۸۵ [2] بحوالہ فن خطابت دیباچہ سید عبداللہ ص نمبر ۱۵ [3] فن خطابت ص نمبر ۶۶

فیضانِ اقبال

تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

آغا شورش کاشمیری، علامہ اقبال کو اپنا ذہنی مرشد مانتے تھے اور علامہ اقبال سے گہری محبت اور عقیدت رکھتے تھے۔ لہٰذا جب کبھی کوئی جماعت یا فرد علامہ اقبال یا افکارِ اقبال کے متعلق غلط بیانی سے کام لیتا تو اس کا محاسبہ کرتے بلکہ جنگ مول لے لیتے اور یہی طرزِ عمل مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں بھی رکھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا پاکستان میں دفاع کرنا بڑا مشکل تھا لیکن آغا صاحب نے یہ فرض بھی بڑی بہادری اور جرأت سے ادا کیا۔ علامہ اقبال کی شخصیت پاکستان میں اتنی بڑی ہے کہ کوئی شخص بھی ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن بعض اداروں، افراد یا جماعتوں نے افکارِ اقبال کی تشریح و توضیح سے اپنے مخصوص مقاصد حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے۔ ان میں قادیانی جماعت سرِفہرست ہے۔ شورش کاشمیری نے ہمیشہ ان طالع آزماؤں کی مخالفت کی اور اپنے ہفت روزہ "چٹان" میں ان کے خلاف لکھا اور سخت احتجاج کیا ہے۔

۱۹۶۵ء میں پنجاب یونیورسٹی میں مسندِ اقبال پر قاضی محمد اسلم صاحب کا تقرر ہوا (جو قادیانی تھے) تو آغا صاحب نے دانش گاہ پنجاب میں مسندِ اقبال ایک قادیانی پروفیسر کے حوالے انا للہ وانا الیہ راجعون کے عنوان سے ایک زبردست اداریہ لکھا اور ساتھ ہی اقبال کے ساتھ ایک سانحہ کے نام سے ایک زبردست نظم لکھی جس کا آخری شعر یہ ہے کہ ؎

حضرتِ اسرار ابھی سوچتے ہی رہ گئے ۔۔۔ مسندِ اقبال بھی اک قادیانی لے گیا[1]

اور ساتھ ہی "نوائے وقت" کا اداریہ بعنوان غلط بخشی مورخہ ۱۶؍ اپریل ۱۹۶۵ء بھی نقل کیا جس میں قاضی محمد اسلم صاحب کے قادیانی ہونے کی بنا پر مسندِ اقبال دیئے جانے پر شدید احتجاج تھا۔[2] اس طرح قادیانیوں کے خلاف یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے اقبال سے

۱۔ بحوالہ چٹان ۱۲؍ اپریل ۱۹۶۵ء

۲۔ بحوالہ چٹان ۱۹؍ اپریل ۱۹۶۵ء

متعلق چند جملوں پر اعتراض کرتے ہوئے آغا صاحب نے انہیں ٹوکا [1] ساتھ ہی ایک مضمون میں ان اداروں پر بھی اعتراض کیا جنہیں سرکاری امداد ملتی تھی اور خاص طور پر "اقبال" سے متعلق اداروں پر تنقید کی جو فکر اقبال کی صحیح ترجمانی کرنے سے قاصر رہے تھے۔[2] اور چٹان کے اسی شمارے میں "واقعہ ایک شخصیتیں دو" کے عنوان سے ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی کتابوں میں علامہ اقبال سے متعلق غلط روایات گھڑنے پر تنقید کی۔ ان کے بیان کردہ واقعات کی صداقت سے بہ دلائل انکار کیا [3]۔ اسی دوران میں جناب احمد سعید کرمانی نے اقبال اور ندوۃ الاسلام کا مقابلہ کیا تو آغا صاحب محاسبے پر اتر آئے [4] اور ساتھ ہی "اقبال کے بگلا بھگت" کے عنوان سے ایک اداریہ تحریر کیا اور لکھا کہ

"اقبال کے نام پر جن لوگوں نے اکیڈمیاں بنائی ہیں۔ ان میں بگلا بھگت زیادہ ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اقبال ان بگلا بھگتوں کے ہاتھ میں آگیا ہے۔" [5]

اس کے بعد ۱۲ جون ۱۹۶۷ء کے شمارے میں پھر اسی موضوع کو لیا ہے اور لکھا ہے کہ

"لاہور کی بزم اقبال نے اقبال پر جو کچھ شائع کیا ہے وہ ننانوے فیصد ناقص، ادھورا، بیہودہ اور روح اقبال کے منافی ہے۔ مجلس اقبال کراچی کے شائع کردہ لٹریچر کا بیشتر حصہ افسوسناک ہے۔ کسی مصنف، مؤلف یا مرتب نے موضوع و مقصد کے مدوہ غور و فکر سے کام نہیں لیا۔ اقبال عمر بھر شاہینوں کا سبق دیتے رہے لیکن ان کے افکار پر بگلا بھگت قابض ہو گئے ہیں۔ جو اقبال کے نام پر خود نمایاں ہونا چاہتے لیعنی اقبال کی آڑ میں اپنے آپ کو چمکانا چاہتے ہیں۔" [6]

۱تا۳ ـه ۔ بحوالہ چٹان ۲۲ مئی ۱۹۶۷ء
۴ ـه ۔ " " ۲۹ مئی ۱۹۶۷ء
۵ ـه ۔ چٹان " ۲۹ مئی "
۶ ـه " ۱۲ جون ۱۹۶۷ء۔

اِن باتوں کی تصدیق سید نذیر نیازی کے اِس خط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ایڈیٹر چٹان کے نام لکھا۔ سید صاحب لکھتے ہیں ۔

"مجلس اقبال خاموش ہے اور اس بات سے بے خبر کہ ایک نیا اقبال

تیار ہو رہا ہے۔ سامنے آئے گا تو بحیرت کہنا پڑے گا

اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

عاشق حسین بٹالوی کی غلط بیانیوں کا کیا کہنا" [1]

اِس کے ساتھ ساتھ الطاف گوہر اور اس کی تشکیل کردہ دانشوروں کی انجمن کو بھی ان کی غیر دانشمندانہ سرگرمیوں سے ٹوکتے تھے اور روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ غرض آغا صاحب کا موقف یہ تھا کہ علامہ اقبال کے افکار کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا۔ اور قادیانی پس منظر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ بلکہ مولانا حامد علی خان کے کہنے پر ہفتہ وار "لاہور" جو قادیانی ہونے کی وجہ سے علامہ اقبال کے متعلق حقیقت سے بعید افکار منسوب کر رہا تھا کا محاسبہ کیا۔ [2] اور اس قلمی جنگ میں قادیانیوں کی پوری تنظیم آغا صاحب کے خلاف متحرک و مستعد رہی۔ جناب احمد سعید کرمانی نے مجلس اقبال کا جلسہ خراب کرنے کی کوشش کی۔ [3] یہ واقعہ بھی ۱۹۶۸ء ہی میں پیش آیا۔ میاں امیرالدین نے بھی اپنے ایک مضمون میں اِس بات کو تسلیم کیا ہے۔ کہ آغا صاحب کو مجلس اقبال کی سیکرٹری شپ سے الگ کرنے کی حکومت کی طرف سے کوششیں ہوئیں [4] غرض ۱۹۶۸ء میں آغا صاحب پر جو مقدمہ قائم ہوا جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب "موت سے واپسی" میں کیا ہے اُس کے بہت سے سیاسی اسباب تھے۔ جس میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ شورش مجلس اقبال کا جنرل سیکرٹری کیوں ہے؟ اور اقبال کے حوالے سے نہ صرف حکومت پر فرض ہے بلکہ حکومت کے بعض دانشوروں

1۔ چٹان ۲۵ ستمبر ۱۹۶۷ء

2، 3۔ بحوالہ موت سے واپسی صفحہ نمبر ۶۵ – ۷۰

4۔ بحوالہ چٹان شورش نمبر مضمون آگ اور شبنم از میاں امیرالدین

اور وزیروں پر بھی تنقید کرتا ہے۔ جناب احمد سعید کرمانی کا مجلس اقبال کا جلسہ خراب کرنے کا واقعہ ۱۹۶۸ء کا ہے اور باقی تمام واقعات فیضان اقبال کی اشاعت سے پہلے کے ہیں۔ فیضان اقبال پہلی بار ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو شائع ہوئی جبکہ ۱۹۶۷ء کا تقریباً پورا سال ان مباحث میں گزرا اور اس سال میں بطور خاص مخالفین اقبال پر نظر رکھی گئی۔ فیضان اقبال کے طویل دیباچہ میں آغا صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے یہ وہی خیالات ہیں جن کا اظہار اس سے پہلے ہفتہ وار چٹان میں ہوتا رہا ہے۔ اور جن کا تذکرہ سطور بالا میں کیا گیا ہے یہی واقعات "فیضان اقبال" کی اشاعت کا باعث بنے ہیں۔ گویا ان واقعات کو "فیضانِ اقبال" کا پس منظر کہنا چاہیے۔ فیضان اقبال کے دیباچہ میں آغا صاحب نے انہی باتوں کو دہرایا ہے۔ اس کے بعد تحریر کرتے ہیں۔

> "چند لوگ جو اقبال کے زمانہ حیات میں کہیں نظر نہیں آتے تھے اب ان کے نام پر قائم شدہ اکادمیوں کے وارث بن کر اپنی شخصیت قائم کرنے کی تگ و دو میں منہمک ہیں پاکستان سے پہلے اِن لوگوں نے اقبال کے اپنے روابط کا ذکر کہیں نہیں کیا اور نہ کوئی ایسی روایت موجود ہے ان کی زندگی میں گویا ان کا وجود ہی نہ تھا۔"[1]

غرض آغا صاحب نے یہ احتجاج افکار اقبال کو مسخ کرنے سے بچانے کیلئے کیا ہے۔ اس کے بعد آغا صاحب نے ان موضوعات کی ایک فہرست دی ہے۔ جو مطالعہ اقبال کی بنیاد ہیں۔ اور جس پر کام کیا جا سکتا ہے مگر نہیں ہوا۔ اِس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ جو علامہ اقبال کے اپنے اقوال و کلمات پر مشتمل ہے۔ جس میں زیادہ تر وہ نکات شامل ہیں جو فکر اقبال کی بنیاد ہیں آغا صاحب نے اقبال کے ان اقوال و کلمات کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت جمع کیا ہے۔

۱۔ خود آگاہی　　　　۲۔ علم و آگہی

---

1. فیضان اقبال　　ص نمبر ۶۹ / ۷۰

۳۔ فکر و نظر　　۴۔ خودی

۵۔ محبت رفتگاں　　۶۔ ادب۔شاعری۔آرٹ

۷۔ قرآن واسلام　　۸۔ تصوف

۹۔ تاریخ وسیاست　　۱۰۔ قادیانیت

اقوال اقبال کی چند مثالیں یہ ہیں ۔

" روح کے افکار

وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں طوفان بپا کئے ہوئے ہیں عوام پر ظاہر ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی[۱]

(عطیہ بیگم کے نام ۱۹۰۹ء)"

" راہنما نہ پیرو

میں کسی جماعت کا رہنما نہیں نہ کسی راہنما کا پیرو ہوں ، میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اسلامی فقہ ، سیاست ، تہذیب ، تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے ۔ میرا خیال ہے اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے رہا ہے میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کرلی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے ۔[۲]

(خطبہ مسلم لیگ سالانہ اجلاس الہ آباد ۲۹ دسمبر ۱۹۳۵ء")

" اسلامی مسائل

اسلامی و مذہبی مسائل کے فہم کے لئے ایک خاص تربیت کی ضرورت ہے ۔ افسوس کہ مسلمانوں

۱ـ۲۰۱　فیضان اقبال　ص نمبر ۱۳۵ - ۱۳۹

کی نئی پود اس سے بالکل کوری ہے

(نیاز احمد خان کے نام ۱۹۳۱ء)" [۱]

"تعلیم و علم

آجکل تعلیم زیادہ ہے لیکن علم نہیں ۔ پہلے زمانے میں علم زیادہ تھا اور تعلیم کم

(روزگار فقیر جلد اول ص نمبر ۱۴۷)" [۲]

"قران مجید کی تعلیم

وہ لوگ جنہوں نے تعلیم کا یہ اصل الاصول قائم کیا تھا کہ ہر مسلمان بچہ کی تعلیم کا آغاز کلام مجید سے ہونا چاہئے وہ ہمارے مقابلہ میں قوم کی ماہیت و نوعیت سے زیادہ با خبر تھے ۔ [۳]

خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء منعقدہ لاہور صفحہ ۱۱۳)"

"مادہ پرستی

ہمارے نوجوانوں کی باتیں کہ مذہب کو بالائے طاق رکھ کر تمام تر توجہ سیاسیات پر دینی چاہئے، یورپ کی غلامانہ تقلید کے سوا اور کچھ نہیں ۔ یورپ کی مادہ پرستی اس کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لئے پیام موت ثابت ہو چکی ہے ۔ [۴]

(انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار صفحہ نمبر ۴۲)"

"شوق

شوق خود مرشد ہے [۵]

(ملفوظات ، خط بنام عرشی ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء)"

۱-۲ے فیضان اقبال ص نمبر ۱۵۸

۳-۵ے فیضان اقبال ص نمبر ۱۵۹/ ۱۶۰/ ۱۱۷

"تاریخ کی مادی تعبیر

میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان معاشرے نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے (غلام السیدین کے نام خط)"[1]

"زندگی کا مقصد

زندگی کا مقصد زندگی ہے موت نہیں (اسرار خودی اور تصوف، وکیل امرتسر ۱۵ جنوری ۱۹۱۵ء)"[2]

"منصوبے

جہاں منصوبے نہیں ہوتے وہاں قومیں غارت و برباد ہو جاتی ہیں۔

(خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس ص نمبر ۶۶ اجلاس منعقدہ لاہور ۳۱ مارچ ۱۹۳۱ء)"[3]

"تباہی

قومیں فکر سے محروم ہو کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ (خطبۂ صدارت ۱۹۲۳ء)"[4]

"خودی کا عرفان

خودی کا عرفان قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ہے (عرشی ملفوظات)"[5]

"زبان

زبان کو میں ایک بت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ سمجھتا ہوں زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے (عبدالرب نشتر کے نام)"[6]

"زبان کی بقا

زبانیں اپنی اندرونی قوتوں سے نشو و نما پاتی ہیں۔ اور نئے نئے خیالات و جذبات ادا کر سکنے پر ان کی بقا کا انحصار ہے (مولوی صدیق کے نام)"[7]

غرض آغا صاحب نے علامہ اقبال کے اسی قسم کے بہت سے جہاز پارے اس کتاب میں جمع کر دیئے جن کے متعلق یہی لکھ دینا کافی ہے کہ اقوال اقبال ہیں۔ آغا صاحب کی مرتب کردہ چھوٹی سی کتاب ہے جسے ہینڈ بک کہا جا سکتا ہے صفحات ۲۵۶ ہیں۔ طباعت یکم مارچ ۱۹۶۸ء اور ۲۱ اپریل ۱۹۶۸ء کو پہلی بار شائع ہوئی۔ مطبع چٹان پرنٹنگ پریس ہے اور ناشر مطبوعات چٹان لاہور ہے۔ کتاب کے صفحہ نمبر ۸ پر علامہ اقبال کی ایک خوبصورت تصویر چھپی ہے جس کے نیچے سرخ روشنائی میں لکھا ہے۔ کہ

گلیم پوش ہوں میں صاحب کلاہ نہیں

۱-۴؎ فیضان اقبال ص نمبر ۱۸۵/۱۹۵/۲۰۰/۲۰۱ ۵-۷؎ فیضان اقبال ص نمبر ۲۰۲/۲۲۵/۲۶۵

اقبالی مجرم ۔ یہ کتاب پہلی دفعہ اپریل ۱۹۷۴ء میں چٹان پرنٹنگ پریس سے شائع ہوئی جو ۷
صفحات پر مشتمل ہے۔

مجید نظامی ایڈیٹر "نوائے وقت" کے نام

شمع محفل کی طرح سب سے جدا اپنا رفیق

ذکر اقبال (عبدالمجید سالک) شعر اقبال (عابد علی عابد) فکر اقبال (خلیفہ عبدالحکیم)

پر ایک چھچھلتی ہوئی نگاہ

آغا شورش کاشمیری کی یہ کتاب دراصل اقبالیات کے سلسلے کی تین کتابوں کا محاکمہ ہے۔

۱۔ 'ذکر اقبال' جسے جناب عبدالمجید سالک صاحب نے تحریر کیا۔

۲۔ 'شعر اقبال'، جو جناب عابد علی عابد کی تصنیف ہے۔

۳۔ 'فکر اقبال'، جو خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے تحریر کی ہے۔

یہ کتاب بھی فیضان اقبال ہی کی دوسری شکل ہے۔ جس کا پس منظر بھی وہی ہے جو 'فیضان اقبال' کے سلسلے میں لکھا جاچکا ہے۔ کتاب کے ابتدائی اوراق میں آغا صاحب نے کم و بیش وہی باتیں دہرائی ہیں۔ جن کا ذکر وہ 'فیضانِ اقبال' کے دیباچے میں کر چکے ہیں۔

فکر و نظر اور علم و ادب کے اِس مقدمے میں مدعی حضرت علامہ اقبال ہیں۔ جناب شورش کاشمیری نے وکیلِ استغاثہ کے فرائض سر انجام دیئے ہیں۔ ملزمان جناب عبدالمجید سالک، جناب عابد علی عابد اور خلیفہ عبدالحکیم صاحب بنائے گئے ہیں۔ وکیلِ استغاثہ نے جو فردِ جرم تیار کی ہے وہ انہی کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے۔

1 ۔ سالک صاحب کے خلاف الزامات کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

"فی الجملہ سالک صاحب نے سوانح اقبال اِس طرح مرتب کیے ہیں کہ

اقبال کی عظمت کا معیار قائم نہیں رہتا۔ اس میں بہت سی دراڑیں یا خلا محسوس ہوتے ہیں۔ سالک جہاں اُن کے سوانح کا ذکر کرتے ہیں وہاں اِس انداز سے قلم لگاتے ہیں کہ علامہ کی شخصیت لہو ولعب سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور جہاں اِن کے افکار کا ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ وہاں ہندوؤں سے متعلق ان کی مخاشرت کھل کے لکھی ہے۔ گاندھی و نہرو پر طنزیں کی ہیں اور وہ مسلمان جو انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ تھے انہیں بھی نیشنلسٹ ہونے کے جرم میں رگیدا ہے۔ لیکن رجعت پسند سرکاری مسلمانوں کا ذکر احترام سے کیا ہے۔ اور ان کی کاسہ لیسی کو مخفی رکھا ہے، قادیانیت کا ذکر اِس طرح کیا ہے گویا علامہ اقبال نے اِن کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ بداہتہً کسی عقیدت مند کی درخواست پر تھا ان کے اپنے مطالعہ و تجزیہ اور غور وفکر کا حاصل نہیں تھا درنہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد قادیانی العقیدہ تھے اور والدۂ جاوید کے متعلق اُن کی بدگمانی رفع ہوگئی تو ازدواجی زندگی قائم کرنے کیلئے حکیم نورالدین (خلیفہ اول) سے شرعی مسئلہ دریافت کیا۔ پھر اُنہی کے حسب مشورہ عمل کیا۔

حضرت علامہ نے یہ کہیں نہیں کہا کہ قادیانی امت کی بنیاد غلطی پر ہے۔ انہوں نے اِس کی بنیاد اِسلام سے غداری قرار دی ہے۔ غداری کو غلطی کہنا قلم کی اچھوتی بانگی ہے۔ المختصر ذکرِ اقبال کئی ایک غلطیوں کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ سالک صاحب کے بہار آفریں قلم کی سب سے بڑی غلطی ہے۔¹

عابد علی عابد کے خلاف الزامات کی تفصیل اِس طرح ہے۔

۱۔ انہوں نے پیسے کیلئے کتاب لکھی، نتیجۃً رطب و یابس جمع کیا اور اِس

طرح کتاب مضحک ہوگئی ۔ عابدؔ صاحب نے اکسٹھ صفحے پس منظر کی سطحیت میں ضائع کیے ۔ اگر پس منظر ضروری تھا تو اِس سائز ہی کے پانچ چھ صفحوں میں آسکتا تھا ۔ اِس کے بعد ۶۵ سے ۱۳۷ صفحات تک ”ابتدائی تعلیم و تربیت محفل احباب ، “ اور ”داغ و اردو شاعری کی روایت“ کا اَنمل بے جوڑ مضمون لکھا ہے جو قرطاس و قلم کی آنکھ مچولی ہے ۔ اِس کے بعد مندرجات حد درجہ افسوس ناک ہیں ۔

عابد علی عابدؔ اپنے بارے میں وہ گوارہ نہ کرتے جو داغ کے متعلق لکھا ہے تیسرا حصہ ابتدائی عواملِ تخلیق اور اُن کے اثرات پر ہے ۔ جو ایکسو اکتالیس[۱۴۱] صفحے سے شروع ہوتا ہے اور ۲۱۰ صفحے پر ختم ہوتا ہے ، اقبالؔ زندہ ہوتے تو سر پیٹ لیتے ۔ انہوں نے غلط نہیں کہا تھا ؎

من اے میرِ اُمم[۲] داد از تو خواہم

مرا یاراں غزلخوانے شمر دند !

جزوِ دوم میں اقبال کے سفرِ یورپ اور فکری انقلاب کی روداد ہے عابدؔ نے وہی اسلوب اختیار کیا ہے جو ان کے لئے اعادۂ شباب کا موجب رہا ہے ۔ یہ حصہ ۲۱۳ صفحہ سے ۳۶۰ صفحے تک پھیلا ہوا ہے ، اور محض الفاظ کی شعبدہ بازی ہے ۔ عابدؔ نے اِس باب میں اقبال کو عطیہ فیضی کے سپرد کیا اور قلم سے اٹکھیلیاں لی ہیں ۔۔ ـــــ ـــــ ـــــ یہ باب خیالات کی بےرنگی کا مجموعہ ہے ، اور کوئی سا پہلو بھی درست نہیں ۔ جزوِ سوم کا عنوان ہے ۔ ”اقبال کے شعورِ تخلیق کا ابلاغ و اظہار “ ، صفحہ ۳۶۳ سے شروع ہو کر صفحہ ۷۳۴ پر ختم ہوتا ہے ۔ اِن کے ضمنی عنوان ہیں ۔

مطابقت الفاظ و معانی ، علائم و رموز ، صنعت گری !

"..........خرابی یہ ہے کہ عابد نے اقبال کے شعری ارتقا کا تدریجی مطالعہ نہیں کیا۔ اس لئے جائزہ لینے کی خصوصیت سے محروم رہے ہیں"[1]

خلیفہ عبدالحکیم صاحب پر مندرجہ ذیل الزامات ہیں ۔

"خلیفہ صاحب نے سب سے پہلے تحریکِ ختمِ نبوت (۱۹۵۳) کے زمانے میں اقبال و مّلا کے نام سے کتابچہ لکھا، جس میں ملاّ کی آڑ لے کر اسلام کی بھد اڑائی۔ اقبال کے اشعار کی غلط توجیہیں کیں اور اس طرح لغویت کا ایک پلندہ تیار کیا۔ اس کتابچہ کے پسِ منظر میں ایک تو حکومت کا لادینی طائفہ تھا، جس کا سرغنہ خود ملک غلام محمد تھا، دوسرے اس میں قادیانی امّت کی خواہشوں کا دخل تھا۔ مرزا بشیر الدین خلیفہ صاحب کے ملاقاتی تھے"[2]

فکر اقبال کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ اسلام کے متعلق اُن کی معلومات سطحی تھیں۔

۲۔ انہیں شاید قرونِ اولیٰ سے للّہی بغض تھا، یا وہ اس دور کی عظمت سے ہی ناواقف تھے۔

۳۔ یورپ کے مادّی نخلیے اور ذہنی بازیچے سے انہیں غایت درجہ وابستگی تھی۔

۴۔ انہیں علماء کے ادارے سے تنفّر تھا۔ غالباً اس کی وجہ سے اُن پر بے لگام تبرّہ بازی کی ہے۔

۵۔ اہلِ صفا سے قلبی و قلمی عداوت رکھتے تھے۔

۶۔ شاید نہیں جانتے تھے کہ سرورِ کائنات کا مقام ادب کیا ہے۔ ان کا قلم بے احتیاط تھا۔ حضورؐ کے تذکرے میں الفاظ کے چناؤ کا سلیقہ ہی نہ تھا۔

---

[1] اقبالی مجرم ص نمبر ۱۴۱، ۱۴۲ - [2] اقبالی مجرم ص نمبر ۵۸

۷۔ یورپی تہذیب و دانش سے لگاؤ تھا اور اِس کیلئے احترام و اعتراف کے جذبات رکھتے تھے۔

۸۔ غلط زبان لکھتے اور محاورہ و روزمرّہ سے بیگانہ تھے۔

۹۔ کج مج تعبیریں کرنے اور ممریزو کجدار قسم کا اسلوب رکھتے تھے۔

۱۰۔ قدما کے اشعار میں الفاظ کا غیر ارادی حک و اضافہ کرتے اور محسوس ہی نہ کرتے تھے کہ اِس موضوع پر کن لوگوں سے ہمکلام ہیں۔

۱۱۔ اقبال کی بصیرت پر فرنگی دانشوروں کی چھاپ لگائے بغیر اقبال کے بنیادی تصورات کو تسلیم نہیں کیا

۱۲۔ 'فکرِ اقبال' میں اول سے آخر تک وحدت بیان کا فقدان ہے۔

۱۳۔ اِنہیں اسلامیات سے رسمی شغف تھا۔

۱۴۔ اقبال کے افکار کی معنوی روح سے کاملاً بیگانہ رہے۔

۱۵۔ انگریزوں کے دور سے ابلہانہ عشق تھا۔

۱۶۔ اسلاف کا تذکرہ بے ادبی سے کرتے۔

۱۷۔ تمام کتاب فی الجملہ بات کہنے پر غیر ضروری اعتماد، لیکن بات نہ کہہ سکنے کے عجز کا شہ پارہ ہے۔

۱۸۔ ان کی سیاسی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ یا تو اُن کے جیب و داماں خالی تھے یا اِن معلومات کو حسبِ حال نہ پاکر چپ سادھ لیتے تھے۔

۱۹۔ مطالعۂ مشرق کی لطافتوں سے محروم لیکن مطالعۂ مغرب کی غلاظتوں میں لتھڑے ہوئے تھے، لیکن مغربی دانش سے اُن کا دماغ سوءِ ہضم کا شکار تھا۔"[۱]

---

[۱] اقبالی مجرم ص نمبر ۶۰/۶۱

آخر میں وکیلِ استغاثہ نے کہا ہے کہ اقبال سے متعلق حکومت کے قائم کردہ ادارے کوئی شاہکار کتاب چھاپنے سے محروم رہے ہیں ۔ بلکہ

"دانشورانِ اقبال کی سرکاری کھیپ نے انجمن ستائشِ باہمی کی نیو اُٹھاکر آپس میں ایک دوسرے کی دستارِ نگارش میں طرۂ ستائش ضرور ٹانکا لیکن اصلاً افکارِ اقبال کو مجروح کیا اور اِن کے مطالب پر قاتلانہ حملے کیے ہیں۔ اگر یہ لوگ ان سے مخلص ہوتے تو نہ اقبال کو مغربی افکار کی ترازو میں تولتے اور اُن کے نظریات پر مغربی فلاسفہ کی خوشہ چینی کا الزام دھرتے کہ اقبال کے بنیادی تصورات یورپی حکماء سے ماخوذ ہیں"[1]

اِس مقدمے کے جج خود قارئین ہیں اور چونکہ وکیلِ صفائی موجود نہیں اور ملزمان بھی غیر حاضر ہیں اِس لیے وکیلِ استغاثہ کے الزامات سنگین نظر آتے ہیں ۔ لہٰذا سزا دیتے وقت جج کو وکیلِ صفائی کے فرائض بھی خود ہی انجام دینے ہونگے ۔ اور ملزموں کی غیر حاضری کو مدّنظر رکھنا ہوگا ۔ تاہم کسی بھی جج کیلیے سزا دینا ناگزیر ہوگا کیونکہ مجرم اقبالی ہیں اور فردِ جرم مجرموں کی تحریروں سے تیار کی گئی ہے ۔ اور وکیلِ استغاثہ نے الزامات ثابت کرنے کیلیے تحقیق و تنقید کا حق ادا کر دیا ہے ۔ البتہ سزا میں کمی بیشی کی گنجائش ہے ۔ اِس سلسلے میں جج صاحبان کو چاہیے کہ ایک سا رویہ رکھیں کیونکہ تینوں مجرم اقبالی ہیں۔ وکیلِ استغاثہ نے جنابِ سالک صاحب سے اپنے تعلقات کی وجہ سے نرم رویہ اختیار کیا ہے اور سالک صاحب کے معاملے میں زبان نرم استعمال کی ہے ۔ جس کا اقرار خود وکیلِ استغاثہ نے اِس کتاب میں کیا ہے ۔ مگر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ تینوں اقبالی مجرم برابر کی سزا کے سزاوار ہیں ۔

---

[1] اقبالی مجرم ص نمبر ۱۴

شب جائے کہ من بودم

حجاز میں چودہ دن

یہ کتاب پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۷۱ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب آغا صاحب کا سفرنامۂ حجاز ہے۔ جن دنوں آغا صاحب عمرہ کی سعادت سے سرفراز ہوئے۔ یہ کتاب انہی دنوں کی یادگار ہے۔ آغا صاحب حجاز میں کل ۱۴ دن رہے اور ان چودہ دنوں میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا۔ وہ من وعن اس کتاب میں درج کر دیا ہے۔ کتاب کے آغاز میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مشہور اور مقدس مقامات کی سولہ تصاویر دی گئی ہیں۔ اس کے بعد سفر کی ترتیب کے ساتھ واقعات بیان ہوئے ہیں۔ جن کے عنوان اس طرح دیئے گئے ہیں۔

جدہ ۔ ذرا قرنِ اول کو آواز دینا۔

مکہ معظمہ ۔ جہاں اپنی جبیں اپنی جبیں معلوم ہوتی ہیں۔

مدینۃ النبی ۔ خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں۔

یہ کتاب جہاں ایک سفرنامہ ہے۔ وہاں عربوں کے ماضی اور حال کی تاریخ بھی ہے۔ آغا صاحب جب عرب اور عربوں کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہیں تو عالمِ تخیل میں روایت اور تاریخ کے سہارے قرونِ اولیٰ میں پلٹ جاتے ہیں اور عرب کی موجودہ حالت کا مقابلہ ماضی کے حالات سے ہر جگہ کرتے ہوئے حقیقت اور تخیل کے حسین امتزاج سے خوبصورت مرقعے تیار کرتے ہیں۔

آغا صاحب جدہ پہنچتے ہیں تو ان کے ذہن میں جدہ کی وہی پرانی تصویر ہوتی ہے جو تاریخ اور روایت نے ہر مسلمان کے ذہن میں نقش کر رکھی ہے۔ مگر عربوں کا چلن اور نئی تصویر کے شوخ وشنگ رنگ دیکھ کر ذہن کی وہ تاریخی تصویر دھندلا جاتی ہے۔ وہ جو کچھ دیکھنے کے تمنائی تھے۔ انہیں نظر نہیں آتا۔ اور عالمِ مایوسی میں وہ عربوں کے چلن اور ان کی حالت پر تنقید کرتے ہیں۔ اور اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ عرب کیا تھے اور کیا ہو گئے ہیں۔

اسی طرح مکہ معظمہ میں پہنچ کر بیت اللہ کو بھی اس کی اصل حالت میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اور وُہ خانہ کعبہ سے لے کر غلافِ کعبہ تک کی تاریخ تلمبند کر جاتے ہیں۔ یہی حال مدینہ منورہ کی زیارت گاہوں کا ہے آغا صاحب جس مقام۔ جگہ۔ میدان۔ پہاڑ۔ غار اور روضہ و مزار پر جاتے ہیں۔ اُس کے پرانے آثار ڈھونڈ نکالتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُنکی موجودہ حالت پر بھی روشنی ڈالتے ہیں۔

کتاب میں اس بات کی تکرار ہے کہ سعودی حکومت نے عہدِ رسالت مآب کے آثار و شواہد یکسر مٹا دیئے ہیں۔ آغا صاحب سعودی حکومت کی اِس تاویل کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کہ یہ آثار و مظاہر بدعت ہیں۔ اور عقیدہ توحید کے منافی ہیں۔ اِس سلسلے میں آغا صاحب کا موقف یہ ہے کہ[1]

"آخر خانہ کعبہ اور مسجد نبوی بھی تو آثار ہیں؟ صفا و مروہ بھی تو شعائر اللہ ہیں۔ مزدلفہ کیوں جاتے ہیں۔ منیٰ کیوں پہنچتے ہیں؟ عرفات کیا ہے؟ جمرۃ العقبیٰ، جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ الاولیٰ کیا ہیں؟ آثار ہیں، جو رسمیں وہاں ادا کی جاتی ہیں وہ مظاہر ہیں ــــ انہیں عقیدہ کی بنا پر محفوظ کیا گیا تو یہ عقیدہ جس کی معرفت ہم تک پہنچا۔ اور جس نے یہ ملت تیار کی بقول اقبالؒ دین اللہ کی طرف سے آتا اور مِلّت پیغمبر بناتے ہیں۔ اِس عالیشان پیغمبر کا مولد و مسکن، اس کی دعوت کے مراکز و منازل اور نزولِ وحی کے محور و مہبط کیوں نہ محفوظ کیئے جائیں۔ اس کے سانچہ میں ڈھلے ہوئے انسانوں کی یادگاریں کیوں نہ باقی رہیں؟ یہ سب یادگاریں ان انسانوں کی ہیں جو تاریخ کے دھارے کو ابدالآباد تک موڑ کے زندہ جاوید ہوگئے۔ جن کا نام اور کام صبح قیامت تک زندہ رہے گا۔ جن کے لیے تمام عزتیں ہیں۔ جو حضورؐ کے اہل بیت تھے۔ وجدان جنہیں عشق کی آنکھوں سے اب بھی چلتے پھرتے دیکھتا ہے۔ ان کے آثار محفوظ نہ رہیں تو پھر کون سی چیز محفوظ کی جائے گی۔ سعودی حکومت نے شرک کو منہدم کیا لیکن ساتھ ہی عشق کو بھی مسمار کر دیا ہے

---

[1] بحوالہ شب جائے کہ من بودم شورش کاشمیری ص نمبر ۲۲

وہ شرک و عشق میں امتیاز نہیں کر سکی۔ حالانکہ یہ چیزیں عقیدہ نہیں
تاریخ ہیں۔ جس قوم نے سب سے پہلے دنیا کو تاریخ دی اور جس
کے مآخذ کلام الٰہی نے محفوظ کئے ہیں۔ وہ قوم آج اپنی تاریخ مٹانے
پر تلی ہو۔ تو یہ ایک المیہ ہے۔ ان آثار کی تعظیم دین کا
مسئلہ نہیں۔ بلاشبہ توحید باری ان پرستشوں کی اجازت نہیں
دیتی لیکن یہ مسئلہ تہذیب کا مسئلہ ہے ۱؎

اس کے علاوہ سعودی حکومت کی بادشاہت۔ اس کے محلات اور اس کے کردار و چلن پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اور عرب کی سیاسی زندگی پر تبصرہ بھی کیا ہے۔ بہرحال یہ ایک بڑی ہی دلچسپ اور مؤثر کتاب ہے۔ جس میں قاری کھو کر رہ جاتا ہے۔ اور اس کتاب میں اتنے شدید جذبات کا اظہار ہوا ہے۔ کہ اس کو پڑھ کر ہر مسلمان بارگاہِ رسالت میں اپنے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آغا شورش کاشمیری کی ساری زندگی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی میں گذری اور آستانہ رسالت ﷺ کا یہ گدا اگر ساری عمر بادشاہوں کے گریبانوں سے کھیلتا رہا۔ وہ اپنے تمام تر گناہوں۔ لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس بات پر فخر کرتا رہا کہ اسے تحفظِ ختمِ نبوت ﷺ کے سلسلے میں قید و بند کا شرف حاصل ہوا۔ اس مسئلے پر وہ اپنی جان سے لے کر اپنے بچوں تک کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اور جب یہ عاشقِ رسول حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قدم بوسی کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ تو اس کے جذبات کا کیا عالم ہے۔ اس کا جواب ہمیں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مل جاتا ہے۔ آغا صاحب نے کہا ہے کہ

۱؎ شب جائے کہ من بودم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۷/۷۵

"یہ کہانی دل کے محسوسات اور روح کی کیفیات میں ڈوب کے لکھی گئی ہے"[۱]

یوں تو جذبات ہر انسان کے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا فنکارانہ اظہار ہر آدمی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اردو ادب میں حجاز کے سفر کے کئی سفرنامے لکھے گئے ہیں۔ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا اظہار بھی ہوا ہے۔ لیکن جن شدید جذبات کا اظہار ہمیں آغا شورش کاشمیری کے اس سفرنامے میں ملتا ہے۔ وہ کسی دوسرے مصنف کے بس کی بات نہیں وہ اس لیے کہ ادیب تو ہمارے ہاں بڑے ہیں۔ مگر ادیب کے ساتھ اتنا بڑا خطیب کوئی نہیں۔ جتنے بڑے خطیب آغا شورش کاشمیری تھے۔

آغا صاحب نے ان جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے اپنی ادبی حیثیت سے کم اور اپنی خطابت سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

حقیقی جذبات و خیالات کا اظہار تو کسی زبان میں بھی ممکن نہیں۔ دنیا کا بڑے سے بڑا ادیب یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ کہ اُس نے جو کچھ محسوس کیا ہے من وعن تلمبند کر دیا ہے۔ بلکہ کسی نہ کسی کوتاہی۔ جھول یا سقم کا آجانا ضروری ہوتا ہے۔ اور یہ زبان کی معذوری ہوتی ہے۔ ادیب کا قصور نہیں ہوتا۔ لیکن خطابت کا فن ایک ایسا فن ہے۔ جو براہِ راست سامعین کے جذبات کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اور خطیب کا کام لوگوں کو ہم خیال و ہم رنگ کر کے ایک اکائی میں بدل دینا ہوتا ہے۔ جس کے لئے وہ لوگوں کے جذبات کو ابھار کر اپنی بات منوا لیتا ہے۔ اور سب لوگ اُس کی سی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن یہ کام سہل نہیں۔ آغا صاحب نے اپنی اس کتاب میں اپنے شدید جذبات کے اظہار

۱۔ دیباچہ شب جائے کہ من بودم شورش کاشمیری

کیلئے خطابت کا موزوں طریقہ استعمال کیا ہے ۔ اور اِس طریقے سے جتنے شدید جذبات و محسوسات خود آغا صاحب رکھتے تھے کسی حد تک اِن جذبات و محسوسات کی شدت کو قارئین تک پہنچانے میں کامیاب رہے ہیں ۔ اور یہ طریقہ بڑا ہی پُر اثر ثابت ہوا ہے مثلاً آغا صاحب بیت اللہ میں جب پہلی نماز ادا کرتے ہیں ۔ اور اُن پر جو کیفیت طاری ہوتی ہے ۔ اُس کے بیان کیلئے تخیل کا سہارا اور خطابت کو وسیلہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

نمازِ فجر سے گھنٹہ بھر پہلے نہا دھو کر حرم میں گیا ۔ اذان کی دلکشی دل میں اتر گئی ۔ بیت اللہ کے روبرو بارگاہ ایزدی میں فجر کی نماز کا پہلا سجدہ تھا کہ خشوع و خضوع کی لذت سوا ہو گئی عرب کی آواز کانوں میں گھلی جارہی تھی ۔ رسولِ عربی کی قوم کا فرد قرأت کر رہا تھا ۔ وہی لہجہ وہی آواز وہی ترنگ اور وہی پکار سلام پھیر کے محسوس کیا کہ حضور فرو کش ہیں قدسیوں کی ایک جماعت نے ہالہ باندھ رکھا ہے ۔ پروانے ہیں کہ ٹوٹے پڑتے ہیں ۔ بلالؓ ہو ہو کی ہانک لگا رہے ہیں اور فدائی ہیں کہ کھچے جارہے ہیں وہ سامنے صدیق اکبرؓ آرہے ہیں اُدھر وہ عمرؓ نکل رہے ہیں ۔ عثمانؓ آنکھیں جھکائے چل رہے ہیں ۔ علیؓ اوباً ایک قدم پیچھے ہیں ۔ طلحہؓ اور زبیرؓ قربان ہو رہے ہیں ۔ ابوذرؓ رکتے ہی نہیں ۔ ابو ہریرہؓ تھکتے ہی نہیں جو لفظ لبِ نبوت سے نکلتا ہے ۔ آویزہ گوش بنا لیتے ہیں ۔ سب اپنا اپنا کشکول بھر رہے ہیں ، اور اپنے اپنے حافظہ کو جلد دے رہے ہیں ۔ اوپر ملائکہ سائبان کئے ہوئے ہیں ۔ نیچے جانثاروں نے حلقہ باندھ رکھا ہے ۔ دائیں بائیں عشرہ مبشرہ ۔ خالد بن ولید ہیں کہ شجاعت بلائیں لے رہی ہے ۔ جو دیکھ رہا ہے ابد تک محفوظ ہو رہا ہے ۔ ایک شرف اِس سارے قافلے کے ساتھ ہے ۔ امیر قافلہ کے جلوے نے بے شمار انسانوں کو بارگاہِ ایزدی میں خلعتِ دوام بخش دیا ہے ۔ مجال دم زدن نہیں ۔ قدم اٹھتے ہیں تو صبا خرام سیکھتی ہے ۔ چہرہ مسکراتا ہے تو سورج چمکتا ہے تبسم سے کلیاں کھلتی اور خندہ سے پھول مہکتے ہیں ۔ خانہ کعبہ کی زمین دیکھئے ہیرے کی ڈلک بنی ہوئی ہے ۔ رسالتِ مآب کے قدم کہاں سے کہاں لے گئے ہیں چاروں طرف کہ

بہار دم بخود ہیں۔ ہر چیز ادب سے لرز رہی اور ہر آواز احترام سے سر و سہی ہو گئی ہے۔ ایک ہی پیکر میں آدم علیہ السلام کا خلق شیث ؑ کی معرفت نوح ؑ کی شجاعت ابراہیم ؑ کا ولولہ توحید اسماعیل ؑ کا شیوۂ رضا۔ اسحاق ؑ کی خوئے تسلیم صالح ؑ کی فصاحت۔ لوط ؑ کی حکمت موسیٰ ؑ کا دبدبہ۔ ایوب ؑ کا صبر۔ یونس ؑ کی اطاعت۔ یوشع ؑ کا جہاد۔ داؤد ؑ کی آواز۔ دانیال ؑ کی محبت۔ الیاس ؑ کا وقار۔ یحییٰ ؑ کی پاک دامنی عیسیٰ ؑ کا زہد ڈھلا ہوا ہے۔ ع

"یاراں خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست"[1]

اس طرح کتاب کا یہ حصّہ خطابت کا شاہکار ہے۔ جب آغا صاحب مدینہ پہنچ کر بارگاہِ رسالت میں ہدیۂ سلام پیش کرتے ہیں۔ اس کا عنوان ہی آغا صاحب نے الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ لکھا ہے اور اس عنوان کے تحت چار صفحات لکھے گئے ہیں ذیل میں اس خطیبانہ شاہکار کا آخری حصّہ دیا جاتا ہے تاکہ آغا صاحب کے رنگِ خطابت کی نشاندہی ہو سکے۔

"اے کرۂ ارض کے سر تاج! اے سر تاج الانبیا کی آرام گاہ ایک انسان کی بدولت کروڑوں انسانوں کو زندگی بخشنے والے۔ اے کلام اللہ کے ۸۶۴۳۰ کلمات اور تین لاکھ ۲۳ ہزار سات سو ساٹھ حروف میں سے ۔۔۔ مدنی آیتوں کی جائے نزول اے اس آخری نبی ؐ کے مدفن مبارک جس کی ذاتِ اقدس پر ۲۲ سال ۵ ماہ کے عرصہ میں ۶۶۶۶ آیتیں نازل ہوئیں۔ اے رحمتوں اور فضیلتوں کے شہر اے عظیم انسانوں کے مامن اے زبان و بیان کی روحِ رواں اے سپہ سالاروں کے دل کی دھڑکن اے انشاپردازوں کے علو فکر اے شاعروں کے تخیّل کی معراج۔ اے خطیبوں کے ولولہ خطابت کی آبرو اے عالموں کے افکار کی آرزو۔ اے دانش وروں کے علم و حکمت کی جستجو اے اہلِ اللہ کے آستانہ آخر۔ اے عابدوں کی جبین کے ناز اے زاہدوں کی محبت کے محور۔ اے جود و سخا کے مخزن اے جمالِ دولت کے مسکن اے گناہگاروں کی

1۔ شب جائے کہ من بودم   ص نمبر ۶۰/۶۱

بخشش گاہ اے بلدۂ رسالت پناہ اے مرکزِ دل و نگاہ اے انس و ملک کی
بوسہ گاہ اے خطا کاروں کے خطا پوشی اے ہر عہد کے مضطروں کی منزل اے
عاشقانِ صادق کے محل ——

—— ایک ہیچ مداں اور بے سر و ساماں کا سلام قبول کر۔

اے مدینۃ النبیؐ تو مرکزِ انوارِ الٰہی ہے۔ تونے سب غائیتوں کی غائیتِ اولیٰ کو دیکھا اور جاوداں ہو گیا۔ اللہ نے تجھے ہمیشگی بخشی ہے۔ فرشتے اللہ کے عرش سے تیرے فرش پر سلام و درود کے تحفے لاتے ہیں۔ تونے اسلام کو رونق بخشی اور تاریخ کو عظمت دی ہے۔ تونے ادب کو درخشاں کیا تونے قلم کو توانائی، زبان کو رعنائی بیان کو زیبائی اور فکر کو گہرائی بخشی ہے۔ ہم تیرے اور تو ہمارا ہے۔ تیری صبحوں میں صحابہؓ کا سوزِ دروں اور انصار و مہاجرین کا جوشِ جنوں ہے تیری شب زندہ داروں کی بلا واسطہ حکایت کا گوہرِ مکنوں ہے۔ تو عرش سے نازک تر ہے تیری آغوش میں نصف اسلام سو رہا ہے۔ تیری مٹی پاتال تک مقدس ہے تو سب سے بڑی تاریخ ہے۔ تیرے شمال میں احد ہے جس نے بقول ابوالحسن علی ندوی لغت کو شجاعت کیلئے بے شمار الفاظ دیئے ہیں۔ ———— وہ پہاڑ جو قیامت کے روز جنت میں اٹھایا جائے گا۔ تیرے مشرق میں جنت البقیع ہے جہاں وہ لوگ سو رہے ہیں جو ابدالآباد تک زندہ ہیں۔ جن کے لئے موت نہیں۔ جن سے موت بھاگتی رہی۔ اور ہمیشہ کیلئے بھاگ گئی۔ جن کے چہروں کی غیرت نے عرش و فرش سے سلام لئے ہیں۔ جو صرف زندہ رہنے کیلئے پیدا کئے گئے۔ جن کا عقیدہ تھا کہ موت زندگی کی ابتدا ہے۔ اور وہ مر کر زندگی کی ابتدا کر گئے۔ یہی زندگی تب سے اب تک رواں دواں ہے۔

سلام ہو اے مدینۃ النبی ـــــــ سلام ہو

اے شہروں کے شہنشاہ

اے انسانوں کی امید گاہ

اے زیر فلک عالم پناہ

سلام ہو۔ ہا[۱]

اِسی طرح آغا صاحب کی خطابت کی مثالیں بار بار آتی ہیں۔ جہاں تک فن خطابت کا تعلق ہے اِس فن کو ادب سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اِسی فن کی آبیاری کیلئے ادبی زبان بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مندرجہ بالا اقتباسات میں بھی ادبی زبان کی چاشنی محسوس کی جاتی ہے۔ جہاں تک خالص ادبی زبان کا تعلق ہے۔ اِسی کتاب میں اِس کی بھی کمی نہیں اِسی کتاب میں آغا صاحب کبھی ادیب ہوتے ہیں اور کبھی خطیب آغا صاحب کی اِن دو حیثیتوں کو اِس چھوٹی سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے مثلاً ایک جگہ زمزم کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح لوگ پانی بھر بھر کے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی کہتے ہیں کہ

"اِن صراحیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ صراحی دار گردن کیا ہوتی ہے۔"[۲]

اور دوسرے لمحے کہتے ہیں۔

حضرت ہاجرہ کے منہ سے نکلا تھا زم زم یعنی ٹھہر ٹھہر رہی اُس کا نام ہو گیا

زم زم کے لفظ پر غور کیجئے ایک ایسا لطیفہ ہے کہ

کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کیلئے "[۳] کے لئے

زم زم ٹھہر ٹھہر کے اِس صوتی آہنگ کا کوئی خطیب ہی ادراک کر سکتا ہے۔

---

۱ شب جائے کہ من بودم — ص نمبر ۱۳۷/ ۱۳۸

۲ شب جائے کہ من بودم — ص نمبر ۵۳

۳ شب جائے کہ من بودم — ص نمبر ۵۳

بہر حال آغا صاحب جب ادبی رنگ میں ہوتے ہیں وہاں پر بھی زبان کے حسن کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس کا اندازہ چند نئی تشبیہوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

"اب سیارے تو اس طرح اُڑتے پھرتے ہیں جس طرح انواہیں بے تابو ہو کر پھیل جاتی ہیں۔" [1]

"ان بر جیوں پر شام ہوتے ہی ہنڈے روشن ہو جاتے ہیں جیسے پشواز پر بادلے جڑ دیئے ہوں یا کسی دلہن کے دوپٹہ پر گوٹے کے پھول کھلے ہوں" [2]

"جبل عمامہ گویا دھرتی کے سر پر عمامہ بندھا ہو" [3]

"بیت اللہ مکۃ مکرمہ کے نشیب میں اس طرح ہے جس طرح لون کے وسط میں لنگلہ یا کٹورے کی تہہ کا دائرہ اس نشیب کو مسجد الحرام نے آغوش میں لے رکھا ہے" [4]

"مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی بید لرزاں کی طرح کانپنے لگا دل یوں ہو گیا جس طرح کنویں میں خالی ڈول تھر تھراتا ہے" [5]

غرض اس طرح کے بے شمار خوبصورت جملے اور فقرے ایسے ہوتے ہیں۔ جنہوں نے خطابت کے ساتھ مل کر اس کتاب میں انفرادیت کی شان پیدا کر دی ہے۔ آغا صاحب کی کتابوں میں اس قسم کے اسلوب کی کمی نہیں لیکن اس کتاب میں انہوں نے ادب کے ساتھ ساتھ خطابت کو سب سے زیادہ استعمال کیا ہے۔ آغا صاحب نے بلا شبہ یہ درست کہا ہے کہ

"سر زمین حجاز میں جو کچھ محسوس کیا وہ اس کتاب میں آگیا ہے یہ کتاب تازگی و اعتقاد و تاثر و یقین۔ ایمان و عرفان عشق و ارادت کا مرقع ہے" [6]

اور اس کتاب کی زبان کے متعلق آغا صاحب کا یہ دعویٰ ناقابل تردید ہے کہ

"اپنے قلم کا تمام حسن میں نے اس کتاب میں سمو دیا ہے" [7]

---

۱ تا ۵ شب جائے کہ من بودم ص نمبر ۱۸ ـ ۲۱۰ ـ ۳۱ ـ ۱۴۱ ـ ۱۶۳

۶ سے ۷ چٹان ۱۵ نومبر ۱۹۷۱ء

یورپ میں چار ہفتے

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۶۰ میں چٹان پرنٹنگ پریس سے شائع ہوئی جو ۱۷۶ صفحات پر مشتمل ہے
اس کا دوسرا ایڈیشن ۲۵ اپریل سنہ ۱۹۶۲ کو اسی پریس نے شائع کیا۔

کتاب کے آغاز میں ۲۰ صفحات پر مختلف تصاویر دی گئی ہیں لیکن یہ بیس صفحات اس کل تعداد میں شامل نہیں ہیں۔

کتاب کو نیاز فتح پوری کے نام منسوب کیا گیا ہے

۱۹۵۹ء میں آغا صاحب انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ کے عمومی اجلاس میں شرکت کے لئے یورپ تشریف لے گئے اور چار ہفتے جرمنی۔ آسٹریا۔ فرانس۔ انگلینڈ۔ سوئٹزرلینڈ۔ اٹلی اور لبنان کی سیر کی اور وہاں سے اپنے گھر والوں اور دوستوں کو اپنے سفر کے تاثرات خطوط کی صورت میں لکھے۔ بعد کو جب اس کتاب کے لکھنے کا خیال آیا تو یہ تمام خطوط ان دوستوں سے حاصل کیے گئے۔ جن کو یہ خطوط لکھے گئے تھے۔ چند خطوط تو گھر میں موجود تھے۔ اور چند خطوط پورے نہ ہو سکے تھے لہذا ان تمام خطوط میں کچھ حک و اضافہ کے بعد اس کتاب کی صورت میں شائع کیا گیا۔ کتاب میں کل چوبیس خطوط ہیں جس میں سے چار خط آغا صاحب نے اپنی بیٹیوں کو لکھے ہیں۔ ۳ خط شیخ حسام الدین کے نام ہیں۔ باقی خطوط مختلف دوستوں کے نام ہیں۔ ان خطوط میں ایک خاص بات یہ ہے۔ کہ جس قسم کے تعلقات کسی دوست کے ساتھ ہیں اس کے ذوق اور تعلق کی مناسبت سے خط لکھا گیا ہے۔ مثلاً وہ چار خط جو آغا صاحب نے اپنی بیٹیوں کو لکھے ہیں۔ نہایت سادہ اور گھریلو قسم کی خبروں پر مشتمل ہیں۔ لیکن شیخ حسام الدین کے ساتھ چونکہ آغا صاحب کے سیاسی تعلقات تھے انہیں اسی قسم کی باتیں تحریر کی ہیں۔ جس سے شیخ صاحب کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اسی طرح ایک خط شیخ عنایت اللہ بٹ کے نام ہے۔ جو پاکستان میں ایک ہوٹل کے مالک ہیں۔ لہذا انہیں جو خط لکھا اس میں یورپ کے ہوٹلوں۔ کھانوں اور گاہکوں اور خریداروں کے متعلق معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اسی طرح دوسرے احباب کے خطوط ہیں۔ جن میں ان کے ذوق اور اپنے ذاتی تعلق کی

نوعیت کو آغا صاحب نے ملحوظ رکھا ہے۔ آغا صاحب نے اِن چار ہفتوں میں سات ملکوں کی سیر کی۔
ظاہر ہے کہ یہ وقت بڑا ہی کم تھا کہ اِن ملکوں کو اچھی طرح دیکھا جاتا۔
آغا صاحب نے اِس کم مدت میں جو کچھ وہاں دیکھا اور محسوس کیا وہی دوستوں کو لکھا۔ اِس طرح
آغا صاحب کے یہ تاثرات زیادہ گہرے نہیں بلکہ مشاہدے کی جھلکیاں ہیں۔ آغا صاحب نے اِس
سفر میں زیادہ تر قیام ہوٹلوں میں کیا۔ لہٰذا زیادہ تر خطوط میں اِن ممالک کے ہوٹلوں کی داستانیں
اور کہانیاں ہیں۔ اِس کے علاوہ تاریخی مقامات کے نقشے بھی ہیں۔ اور کوچہ و بازار کے واقعات
بھی۔ شراب و شاہد کی حکایت بھی ہے۔ اور اپنی کم ہمتی کی شکایت بھی۔ غرض یورپ کی زندگی کی بلندیاں
اور پستیاں پوری طرح بے نقاب ہیں۔ یورپ کے شب و روز کا ذکر ہو تو خیال فوراً وہاں کی رنگینیوں
اور رعنائیوں کی طرف جاتا ہے جس کی وجہ وہاں پر اِن چیزوں کی بہتات ہے۔ آغا صاحب کا واسطہ
بھی زیادہ تر انہیں چیزوں سے پڑا۔ جس کی وجہ سے زیادہ تر خطوط میں اِن ہی باتوں کا تذکرہ ہے
اِس کتاب کو پڑھنے کے بعد آغا صاحب کی ژرف نگاہی اور قوتِ مشاہدہ کی داد دینی پڑتی ہے کہ انہوں
نے پہلی ہی نظر میں جو کچھ دیکھا اُس کی لفظوں میں تصویر بنا دی۔
آغا صاحب کی زبان اور یورپ کی رنگینیوں نے مل کر جو سماں پیدا کیا ہے وہ اِس کتاب کی جان ہے
کتاب کے آغاز میں آغا صاحب نے لکھا ہے۔

"یورپ میں جو کچھ دیکھا اُسے نظم کی زبان اور غزل کے لہجہ میں سپرد کر دیا ہے۔"

اور یہی زبان و لہجہ در حقیقت اِس سفر نامے کا طرۂ امتیاز ہے۔ ورنہ اب تو یورپ کو ایشیا میں تصویروں
کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن آسٹریا کا قبرستان خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو اِس شاہی قبرستان کی تصویر
یہ تاثر پیدا نہیں کر سکتی جو آغا صاحب کے اِن الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔

"جن پادشاہیوں کے کانوں کی قوتِ سامعہ پر انسانوں کی فریادوں سے چوٹ پڑتی
تھی اب روز مرہ اِن کی کھوپڑیوں کو انسانی قدموں کی چاپ جھنجھوڑتی چلی جاتی
اور ہر درجہ کا سیاح اِن پر ہنستا ہوا گذر جاتا ہے۔

موت نے دھات کی مہریں لگا رکھی ہیں۔ معلق تابوت یہ ظاہر کرتے ہیں جیسے آسمان پناہیوں کو زمین نے بھی پناہ نہیں دی ہے۔ تمام قبریں تماشائیں معلوم ہوتا ہے بشاہی محلوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے گرگر کر دھاتوں اور پتھروں کی شکل میں منجمد ہو گئے ہیں۔"[1]

اسی طرح ایک بوڑھی ترجمان عورت کے متعلق آغا صاحب کے یہ الفاظ اس عورت کا بھرپور تعارف ہیں۔

"ہماری ترجمان ایک بڑھیا کھوسٹ تھی"

"شوخی اور طراری میں لڑکیوں سے بھی دو ہاتھ آگے متعارفین سے زیادہ تیز چار گھنٹے کے سفر میں ایک لحظہ کے لئے بھی اس کی زبان تالو سے نہیں لگی ہر مقام کے حسب نسب سے واقف بلکہ پتھروں اور کنکروں تک کی نسل سے آگاہ — یہ کہنا تو مشکل ہے کہ جو اس نے بیان کیا درست تھا لیکن اس کے بوڑھے ہونٹوں کی سالخوردہ سطح پر جوان الفاظ بڑے بھلے معلوم ہوتے بلکہ لہجہ کی روانی میں دلفریب ہو جاتے تھے"[2]

اسی طرح اس کتاب میں زبان اور معنی کی ایک نئی دنیا آباد نظر آتی ہے۔ تشبیہ، استعارہ اور رمز و ایماء در حقیقت شاعری کی چیزیں ہیں۔ لیکن آغا صاحب نے ان خطوط میں شاعری کے ان لوازمات سے نثر میں جو کام لیا ہے اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب نے نثر میں شاعری کی ہے۔ مثلاً پیرس کے متعلق کہتے ہیں۔

"پیرس دلہن بھی ہے۔ اور داشتہ بھی ممنوعہ بھی ہے اور منکوحہ بھی اہلیہ بھی ہے اور مدخولہ بھی — وہ محض لہو و لعب کا مہبط نہیں یہ صحیح ہے کہ یورپ نشین کے لئے اس کی زہرہ وشوں سے غمزہ ہائے لباس کی بھیک مانگتا ہے۔ لیکن پیرس میں ادب کی شوخی اور علم کی سنجیدگی بھی ہے"[3]

---

[1] یورپ میں چار ہفتے ص نمبر ۱۸/ ۱۹

[2] " " " " ص نمبر ۱۷/ ۱۸

[3] " " " " ص نمبر ۱۰۳

اسی طرح فرانس کی عورت کا تعارف یہ ہے

"وہ فرانسیسی عورت پھول ہے اور پھول کی طرح ہمیشہ کھلی رہتی ہے بلکہ کلی ہو کر بھی کھلی ہی رہتی ہے فرانس نے گناہ کو گناہ نہیں رہنے دیا آرٹ بنا دیا ہے"[۱]

آغا صاحب کے یہ بلیغ اشارے ہی زبان کا حسن ہیں اور فن کارانہ چابکدستی کا ثبوت بھی چند تشبیہیں ملاحظہ ہوں

"ان فواروں کا پانی ایک قطرہ سے دوسرے قطرے کی گود میں کنواریوں کے رقص کی طرح موجیں مارتا ہوا ایک پھرتی سی جھیل بن جاتا ہے"[۲]

"یہاں باہر پانی اور روشنی کے فواروں کا طائفہ پنگھٹ پر ناچتی ہوئی لڑکیوں کے جھرمٹ کی طرح ناچ رہا ہے۔ اور گرتے ہوئے پانی کی بوندیں رقاصہ کے گھنگھروؤں کی طرح لو دے رہی ہیں"[۳]

"بیروت کوئی بڑا شہر نہیں ایک تصویری قالین کی طرح دور دور تک بچھا ہوا ہے۔ ایک سمت بحیرہ روم کے نیلگوں پانی کی مہیب لہریں ناگنوں کی طرح پھنکار رہی ہیں دوسری سمت چٹانوں کے انبار کنواریوں کے جوبن کی طرح پھیلے پڑے ہیں"[۴]

غرض نثر کی اس شاعری نے اس سفرنامے کو بڑا ہی دلچسپ اور رنگین بنا دیا ہے اس سفرنامے کے خطوط جب لکھے گئے اس وقت یہ بات پیش نظر نہ تھی کہ انہیں کتابی صورت دی جائے گی۔ اس لحاظ سے آغا صاحب کے تمام تاثرات جنہوں نے واقعات کے ساتھ مل کر ایک حسن پیدا کیا ہے۔ حقیقی اور فطری ہیں۔ جس میں بناوٹ اور تصنع کا شائبہ تک نہیں جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے۔ کہ واقعات کو کسی خاص نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں ہے۔ اور نہ ہی واقعات کے نفسیاتی اور تنقیدی تجزیے پر کسی علمیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک شاعرانہ نظر کا حقیقی مشاہدہ ہے۔ جو قارئین کے لئے بھی جاذب نظر ہے۔ آغا صاحب نے انفرادی طور پر جو کچھ محسوس کیا اس کی حقیقی عکس بندی نے اسکو اجتماعیت کا رنگ عطا کر دیا ہے۔

---

۱ یورپ میں چار ہفتے ص نمبر ۱۰۱

۲،۳،۴ " " " ص نمبر ۱۲۶ — ۱۲۸، ۱۲۷

شورش بنام عبداللہ ملک

یہ کتاب پہلی مرتبہ ستمبر ۱۹۷۸ء میں کوثر پبلشرز نے پاکستان ٹائمز پریس سے چھپوا کر شائع کی
جو ۲۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔

کتاب کے سرِ ورق پر مجاز کا یہ شعر درج ہے۔

دفن کر سکتا ہوں سینے میں تمہارے راز کو
اور تم چاہو تو افسانہ بنا سکتا ہوں میں

اِس کے بعد یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

شورش کے ۴۰ برس پرانے جیل سے ۷۰ خطوط
عبداللہ ملک کے تفصیلی دیباچے کے ساتھ

لیکن کتاب میں ۷۰ کے بجائے چالیس خطوط دیئے گئے ہیں اور کتابت کے ساتھ آغا صاحب کی اصل تحریر کا عکس بھی چھاپا گیا ہے اِس کتاب کا انتساب ڈاکٹر سید عبداللہ کے نام ہے۔ اِس بات کی تشریح حرفِ آخر میں موجود ہے۔ کہ شورش صاحب نے یہ خط کئی ایک ناموں سے لکھے ہیں جس کی وجہ جیل کی پابندیاں تھیں۔ اور جن دوستوں کا ذکر اِن خطوط میں ملتا ہے۔ اُن کا تعارف کتاب کے آخر میں دیا گیا ہے۔ یہ خطوط ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۹ء سے لے کر ۱۸/اپریل ۱۹۴۰ء تک مختلف تاریخوں میں لکھے گئے جو کتاب میں ترتیب کے ساتھ درج ہیں اِن خطوط کی تعداد ۳۴ ہے آخر میں چھ خط ایسے ہیں جن پر کوئی تاریخ نہیں دی گئی لہٰذا انہیں "بلا تاریخ خطوط" کا عنوان دیا گیا ہے اِس طرح یہ کل چالیس خطوط ہیں۔

عبداللہ ملک صاحب نے اپنے دیباچے میں اِن خطوط پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی البتہ انہوں نے اپنے مخصوص اشتراکی نظریات کا پرچار ضرور کیا ہے۔ وہ مجلسِ احرار کے رہنماؤں کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ

جب وہ کانگرس میں تھے تو اُس وقت بھی اُن کا تعلق کانگرس کے بائیں بازو سے تھا۔ اور جب انہوں نے مجلسِ احرار بنائی تو اُس وقت بھی وہ ایک

رومانوی سوشلسٹ کے طور پر باتیں کرتے رہے ہیں"۱؎

اسی بات کا ذکر پہلے سیاسی تحریکوں کے ضمن میں بھی آ چکا ہے۔ کہ عبداللہ ملک صاحب احرار کی غریب دوستی اور غریب قیادت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ مجلس احرار ایک مذہبی سیاسی جماعت تھی اور جس کا تعلق صرف اسلام سے تھا۔ اسی طرح انہوں نے آغا صاحب کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"اس کی کمیونسٹ دشمنی خاصی پرانی ہے۔ اس کا اسلام پسندی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ یہ دراصل اس نے کانگریسی سوشلسٹوں سے حاصل کی تھی ....

حقیقت یہ ہے کہ شورش اور میرے سیاسی عقائد میں بنیادی اختلافات تھے اور اس اختلافات سے ایک زمانہ آشنا ہے میرے نزدیک شورش کے سیاسی عقائد اور اس کے موجودہ دوستوں کے سیاسی عقائد میں بھی کوئی ہم آہنگی نہ تھی"۲؎

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب عبداللہ ملک صاحب نے یہ خطوط بالغور نہیں پڑھے کیونکہ آغا شورش کاشمیری کی طرف سے بھی اس خیال کی تردید ایک خط میں موجود ہے آغا صاحب لکھتے ہیں کہ

"تم والٹیئر، روسو، کارل مارکس، اینگلز، سٹالن، لینن ایسے تازہ واردانِ فکر کے پیچھے جانا چاہتے ہو۔ اور میں انہیں انسانوں کا محسن تو مانتا ہوں لیکن ان پر اعتماد و یقین نہیں ہے۔ ان کی باتیں مجھے اسلام میں بھی ملتی ہیں انہوں نے جو شراب نئے جاموں میں پلانی چاہی ہے وہ میکدہ اسلام میں پہلے سے موجود ہے۔ البتہ پیالوں میں تفاوت ضرور ہو گیا ہے۔"

"تم مذہب کو مٹی کا آبخورہ سمجھتے ہو اور اپنے تصور و فکر کو زجاج کا پیالہ، آبخورہ بدلتا ہے تو شراب نہ پھینکو مبادا دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھو۔ مے خانہ کا انتظام خراب ہے تو ساقی سے گلہ کرو جام ٹوٹے ہوئے ہیں تو پیر میکدہ سے کہو لیکن یہ کہاں لازم آتا ہے کہ شراب ہی پھینک دو۔ یا میکدہ میں آگ لگا دو۔"

۱-۲؎ شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۱۶ — ۲۶

اچھا حکیم مرض کو ختم کرتا ہے ، نیم حکیم مریض کا خاتمہ۔ مرض کا خاتمہ دانا کی حکمت
ہے اور مریض کا خاتمہ حماقت ۔

تم مرض کے ساتھ مریض کو بھی ختم کر رہے ہو پیالہ کی شکستگی سے شراب کا
ضیاع اچھا نہیں۔ عقل و دانش اس کی حریف بے ایقان و محبت کو اعتبار نہیں ہے[1]

لہذا عبداللہ ملک صاحب کا یہ فرمانا کہ آغا صاحب کی کمیونسٹ دشمنی اسلام کی بجائے کانگرسی سوشلسٹوں سے حاصل شدہ تھی درست نہیں پھر ایک جگہ خود ملک صاحب نے بھی تحریر فرمایا ہے کہ

جب مجلس احرار نے اسکی (شورش) ذہنی پرورش کی اور سامراج دشمنی
اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی تو ابوالکلام ۔ حسین احمد مدنی ،
عطاءاللہ شاہ بخاری اور چوہدری افضل حق اس کے محبوب ٹھہرے ہے[2]

اور حقیقت یہ ہے کہ شورش کی کمیونسٹ دشمنی ان لوگوں کی اسلام پسندی کا نتیجہ تھی ۔ اسی طرح عبداللہ ملک صاحب کی یہ بات بھی درست نہیں کہ شورش کے سیاسی عقائد اور ان کے موجودہ دستوں کے سیاسی عقائد میں بھی کوئی ہم آہنگی نہ تھی ۔ انسانی ذہن اپنی ارتقائی منزل میں مختلف مراحل سے گذرتا ہے ۔ اور اس کے فکر و نظر میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے ۔ جہاں تک شورش صاحب کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ مجلس احرار میں تھے ۔ اور احرار نے تصور پاکستان کی مخالفت بھی کی تھی اور اس بات کا اعتراف احرار کے بڑے بڑے رہنماؤں نے ہزارہا لوگوں کے سامنے کیا ہے ۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد شورش کے سیاسی عقائد اتنے واضح ہیں ۔ کہ شک و شبہ کی گنجائش نہیں وہ پاکستان میں اسلام کا احیاء چاہتے تھے ۔ کمیونزم اور سوشلزم دونوں کے خلاف رہے ۔ اور آغا صاحب کی دوستیاں انہیں لوگوں کے ساتھ تھیں جو کمیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کرتے تھے جو سیاسی عقائد میں ہم آہنگی کی دلیل ہے ۔

بہر حال ملک صاحب کو چاہیے تو یہ تھا کہ وہ ان خطوط پر بھرپور نظر ڈالتے اور بتاتے کہ ان کی نوعیت کیا ہے ۔ اس بات کی تشریح بھی فرما دیتے کہ انہوں نے آغا صاحب کو کیا لکھا تھا جس کا

۱ـ شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۱۷۱

۲ـ [illegible] شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۱۴

جواب آغا صاحب نے یہ دیا ہے۔ مگر انہوں نے مجلس احرار اور شورش صاحب کے حوالے سے اپنے
اشتراکی نظریات کا اثبات کرنا شروع کر دیا۔ جس کا یہ موقع نہ ہوتا۔ اور نہ ہی شورش صاحب
یا مجلس احرار کا کمیونزم یا سوشلزم سے کوئی تعلق ہوتا۔ وہ اگر سرمایہ دار کے خلاف ہیں یا غریبوں
کی بات کرتے یا خود غریب طبقہ سے تعلق رکھتے یا ہندوستان کے مفلوک الحال مسلمانوں کو سیاسی
شعور عطا کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب کہاں ہے کہ وہ کمیونسٹ یا سوشلسٹ ہیں؟ تاہم انہوں
نے اپنے دیباچے میں یہ بتایا ہے کہ آغا صاحب سے اُن کی دوستی مجلس احرار کی وجہ سے ہوئی اور وہ
۱۹۳۱ء میں آغا صاحب کے دوست بنے۔ ابھی اس دوستی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ آغا صاحب ۱۹۳۶ء
میں پھر قید ہوگئے اور عبد اللہ ملک صاحب آغا صاحب کو جیل میں ملتے رہے۔ عدالت میں ہر پیشی پر
موجود رہتے۔ اگر آغا صاحب کو ایک جیل سے دوسری جیل بھیج دیا جاتا۔ اور عبد اللہ ملک کو اطلاع
ہو جاتی تو وہ آغا صاحب کے ساتھ سفر کرتے ان باتوں کا پتہ عبد اللہ ملک کے دیباچے کے علاوہ
آغا صاحب کے خطوط سے بھی ملتا ہے اور اس زمانے میں ملک صاحب سے اُن کی گہری دوستی تھی

ان خطوط کے مطالعے سے جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ خطوط میں
جذبات کا شدید اور بے ساختہ اظہار ہے جس کی وجہ آغا صاحب کی نوعمری ہے اس زمانے میں
آغا صاحب کی عمر بائیس ۲۲ سال تھی ظاہر ہے کہ اس عمر میں محبتیں اور دشمنیاں شدید ہوتی ہیں
اس عمر میں جب آغا صاحب قید ہوئے تو وہ ایک غریب۔ مفلس اور بے یار و مددگار نوجوان تھے
عبد اللہ صاحب کی دوستی نے ان کا دل جیت لیا۔ وہ ان کے اس طرزِ عمل سے متاثر ہیں کہ وہ
ایک امیر آدمی ہوتے ہوئے بھی ایک مفلوک الحال انسان سے جیل میں ربط رکھتے ہیں۔ آغا صاحب،
عبد اللہ صاحب کے اس اخلاص کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ اور اکثر خطوط میں انہوں نے اس کا
ذکر بھی کیا ہے۔ ایک تو عمر جذبات کی۔ پھر شورش صاحب جیسا جذباتی آدمی۔ اس پر جب شاعری
اور ادب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ تو ان خطوط کا رنگ واضح ہو جاتا ہے۔ آغا صاحب نے جن جذبات و
احساسات کا اظہار ان خطوط میں کیا ہے۔ وہ دوستی۔ محبت۔ پیار اور اخلاص کے جذبات ہیں۔

لیکن جس رنگ میں یہ خطوط لکھے گئے ہیں اُس سے گُل و بلبل کے افسانے کا گمان ہوتا ہے۔
اِس بات کے ثبوت کیلئے مندرجہ ذیل خط ہی کافی ہے۔ جبکہ اکثر خطوط اِسی طرز کے ہیں۔

"غمگین بستی
۱۵- نومبر ۱۹۳۹ء

عزیز بھائی۔ اسلامِ شوق قبول ہو ؎

ہمارا کون تھا فرقت میں پوچھنے والا
تمہاری یاد کے صدقے کہ بار بار آئی

طعنِ بے نیازی کا شکریہ! آپ کی باتوں کے جواب میں تامّل اور تغافل

بے نیازی نہیں بے چارگی نکمر ہے ورنہ ؎

گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں
انہی کی یاد میری زندگی ہے۔

تمہارے خط میرے ہاں غیر محفوظ ہیں ؟ میری نسبت تم اپنے دل سے
پوچھ لیتے تو بہتر ہوتا میں تو حضرت غالبؔ مرحوم کے اُس ارشاد کا احترام

کر رہا ہوں جو یقیناً تمہیں بھی یاد ہوگا کہ ؎

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

خط محفوظ ہیں۔ تصویر! میرے خیال میں تم نامناسب سمجھو گے ؟ ایک ناموزوں
بات کیلئے میں کیونکر مجبور کرسکتا ہوں ! تمہیں یاد ہوگا ؎

تصویر تیری دیکھ کے رونا وہ بار بار
رونے کے بعد پھر تری تصویر دیکھنا

مقدمہ کی تاریخ ۱۵ نومبر ہے شاید اُس دن یا دو ایک روز میں فیصلہ ہو جائے

لاہور آنے کی مجھے کوئی خبر نہیں ۔ ۲۰ نومبر کی تاریخ کہی جاتی ہے کاش یہ درست ہو ۔

نام لے کر جن کا اکبر رو دیا کرتا ہوں میں

ہائے اُن چیزوں میں شامل ہو گیا لاہور بھی

تم نے شاید پہلے خط میں "ارباب زمانہ" کی سرد مہریوں کا ذکر کیا تھا اور بے معنی سی بات کی تشریح چاہی تھی ۔ میں نے مصلحتاً جواب میں اجتناب برتا تھا چونکہ میری یہی خواہش تھی اور میں یہی چاہتا تھا ـــــ !

لیکن اِس وقت جب کہ تم مجبور کر رہے ہو تو میں عریاں الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ سورج کی کرنوں میں سے تاریکی پھوٹ سکتی ہے، ستارے اندھیرے کا نشیمن بن سکتے ہیں، بادِ خزاں فصلِ گل مہکا سکتی ہے۔ دوزخ کے انگارے جنت کے پھول ہو سکتے ہیں ۔

لیکن حریفان "تاریک ضمیر کی نامبارک مساعی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی ہیں ـــ !!

کیا میں اپنے دعوٰی میں غلطی تو نہیں کر رہا ہوں ؟"[1]

اِن خطوط کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ اشاعت کی غرض سے لکھے ہوئے خط نہیں ہیں بلکہ اُس وقت کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ خطوط چھپ بھی سکتے ہیں ۔ اِن خطوط سے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ جیل کی تنہائی میں کسی اہتمام کے ساتھ لکھے گئے ہوں گے بلکہ بعض خط عدالت کے کمرے سے بعض خط عدالت کے سامنے کی دکان پر بیٹھ کر اور بعض ایسی حالت میں لکھے گئے ہیں کہ ہاتھوں کو ہتھکڑیاں بھی لگی ہوئی ہیں.... یہی وجہ ہے کہ اِن خطوط میں حقیقی جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ کسی قسم کی بناوٹ یا تصنع کا اظہار نہیں ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اخلاص اور محبت کے اِن جذبات کو شدید تر بنانے کے لئے کہیں کہیں مبالغے سے کام لیا گیا ہے ۔

دوستی کی ابتدا میں ایک دوسرے کو اپنے اخلاص و محبت کے اظہار کے لئے جو عہد و پیمان کئے جاتے ہیں اِن خطوط میں ایسے ہی وعدوں کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے ۔

---

[1] شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۶۵ / ۶۶

دو میں اپنے دعاوی میں شاہانہ حشمت رکھتا ہوں انہیں میری طرح غریب نہ سمجھ لینا سیم وزر میں میری قیمت خزاں زدہ پتوں سے بھی کم ہے، لیکن اپنے خلوص پر مجھے فخر ہے۔ میرا یہ افتخار تاروں کے بے شمار خزانوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے میری نظروں میں تمہارے لئے احترام و محبت ہے۔ میرا دل تمہارا ہے میرے جوان خیالات کی ترتیب تمہارے دامانِ خیال میں ہوئی ہے۔ میں تم سے اسلئے محبت نہیں کرتا ہوں کہ مجھے تم سے کچھ لینا ہے۔ میرا پیار محض اس لئے ہے کہ تم مجھے پیارے معلوم ہوتے ہو۔ تم نے کہا ہے کہ میں تمیں بھول جاؤں گا۔ تو تمہاری آتش بار آہیں مجھے بھسم کر دیں گی میں تمیں بھول جاؤں ـــــ ! یہ ہو سکتا ہے اے دوست ! تم مجھے بھول گئے تو میں صاف کہے دیتا ہوں میں افسانہ حیات کو ختم کر دونگا۔ میرے دامن میں تمہارے سوا کچھ بھی نہیں ہے[۱]

اِن خطوط میں ایک اور بات بڑی واضح ہے کہ آغا صاحب اِس اخلاص اور محبت کے باوجود جو وہ عبداللہ ملک کے لئے رکھتے تھے۔ جہاں کہیں کسی مخالف نظریے یا مذہبی مسئلے کا ذکر ملتا ہے۔ آغا صاحب ملک صاحب سے اختلاف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر دوست کے پاس خاطر کیلئے لہجہ نہایت ہی ملائم ہے۔ اِن خطوط میں بعض معروف آدمیوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مثلاً مولانا گل شیر قاضی احسان احمد شجاع آبادی۔ صاحبزادہ فیض الحسن۔ شیخ حسام الدین اور عبداللہ بٹ وغیرہ بعض غیر معروف نام بھی ہیں۔ مثلاً اختر۔ اقبال۔ قاضی مسعود۔ رب نواز اور غفور وغیرہ کتاب کے آخر میں شخصیات کا جو تعارف دیا گیا ہے اِس میں مشاہیر کو چھوڑ کر باقی حضرات کا تعارف نہایت ہی مختصر اور ادھورا ہے۔ اِن اشخاص سے عبداللہ ملک صاحب اور آغا شورش کی دوستی پر کوئی روشنی نہیں پڑتی عبداللہ ملک صاحب نے اِس کتاب کے دیباچے میں آغا شورش کاشمیری کا لکھا ہوا ایک دیباچہ بھی شامل کیا ہے۔ جو انہوں نے عبداللہ ملک صاحب کی کتاب "سرمایہ داری" پر لکھا تھا۔

---

[۱] شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۱۵۶

جس میں آغا صاحب نے سرمایہ داری کی مخالفت اور غریبوں کی حمایت کی ہے۔ لیکن اشتراکیت کے کسی کلیے قاعدے کا ذکر نہیں کیا۔ انہوں نے اپنا زیادہ تر زورِ قلم عبارت آرائی۔ الفاظ کی شان و شوکت اور خطیبانہ اسلوب کی گھن گرج پر صرف کیا ہے اور سارے دیباچے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کی پیروی کی گئی ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل اقتباس سے نمایاں ہے۔

"سرمایہ داری کا بڑھتا ہوا سیلاب غریب انسانوں کی متاعِ حیات کو خس و خاشاک کی سی اہمیت نہیں دینا چاہتا ہے۔ اِس ایوانِ استبداد کی بنیادیں متزلزل کرنے کے لئے بے نوا انسانوں کی آنکھیں خونیں آنسو رو چکی ہیں ماتم کرنے والوں کے نالہائے شیون و صدائے دلخراش ہولناک ہنگاموں اور خطرناک طوفانوں کو لا چکی ہیں۔ ارادوں کے افق پر انقلاب کی شعاعیں کئی بار نمودار ہوتی ہیں۔ لیکن اضطراب و بے چینی۔ آہ و فغاں اور قنوط و حسرت اِن تاریک گھرانوں سے ابھی تک دور نہیں ہوئی ہے۔[۱]

آغا صاحب کے یہ خطوط نجی خطوط ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے مختلف گوشوں سے بے تکلف پردہ اٹھایا ہے ہم اِن خطوط میں شورش کی پوری شخصیت کو بے نقاب دیکھ سکتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"بھائی ——— !اِس دور کا سب سے بڑا جرم افلاس ہے۔ گناہ امارت کی آغوش میں نیکی کہلاتا ہے۔ اور نیکی افلاس کے دامن میں گناہ ہو جاتی ہے۔ غریب کی دنیا حسرتوں کا نشیمن ہے۔ امارت کا ماحول مسرتوں کا سرچشمہ ہے میری مفلسی نے میری بہت سی امنگوں کو جوان ہونے سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ میری بہت سی کئی تمنائیں اِن کلیوں کی مانند مرجھا گئی ہیں، جو پھول بننے سے پہلے سوکھ جایا کرتی ہیں۔ مجھے اِن کی معصوم موت کا افسوس ہے۔[۲]

اِسی طرح ذیل کے اقتباس میں آغا صاحب نے اپنی سیرت کے جس پہلو کی عکاسی کی ہے وہ شورش کی شخصیت کا بنیادی جزو ہے وہ لکھتے ہیں۔

---

[۱] شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۲
[۲] ص نمبر ۵۶

"مجھے قدرتِ خداوندی نے سوچ بچار کی صلاحیت دی ہے ، خوددار طبع بخشی ہے روشن دل دیا ہے ۔ دامن میں اخلاص کی دولت رکھتا ہوں ۔ میں نے اپنی پیشانی محبت کو آج تک طمع و مایوسی سے داغدار نہیں ہونے دیا ۔ میرے ہاتھ غیروں کے حضور میں دراز ہونا نہیں جانتے ہیں ۔ میری آنکھوں میں محبت کی شرم ضرور ہے لیکن احسانوں کا حجاب بالکل نہیں ہے ۔ میں تو اس سجدہ کا بھی قائل نہیں ہوں جو غرورِ جبیں کو ہموار کرے"[۱]

شورش کاشمیری کا جس حوصلے اور جرأت کا نام ہے اس کا اظہار ان الفاظ میں ہوا ہے ۔

"میری ان باتوں سے یہ نہ سمجھ لینا کہ میں اپنے مصائب سے گھبرا گیا ہوں ۔ میری ایذا پسند طبیعت ہمیشہ دشوار پسند رہی ہے ۔ جو مزہ تکلیف میں ہے آرام میں نہیں ، تم اس کا حقیقی لطف لینا چاہتے ہو تو کڑوی شئے بھی چکھ لو ۔ پھولوں کی لطافت سے کھیلنا چاہتے ہو ، تو کانٹوں کی چبھن سے بھی پیار کرو"[۲]

اور اس بات کیلئے جس عزم کی ضرورت ہے ۔ اسکی نشاندہی آغا صاحب نے اس طرح کی ہے ۔

"پیارے دوست ! تمہارے مشورات نیک ہیں ۔ میں بھی وہی چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو ۔ سات برس زندگی کی ایک اہم کڑی ہیں ۔ جوانی کے عزیز دن ان طویل و تاریک مصائب میں گذارنا بچوں کا کھیل نہیں ہے ۔ صبر و ہمت کی انتہا چاہیے ۔ بعض دوست میرے اس اقدام کو عظیم غلطی خیال کرتے ہیں ، نادانی کہتے ہیں ، لیکن شاید انہیں علم نہیں کہ فرض کی ادائیگی میں مصلحت کفر ہے ۔ نوجوانی واقعی پیاری ہے جان کیسے عزیز نہیں لیکن وطن کا پیار ـــــ ان سب پر فوقیت رکھتا ہے ۔ کاش ! میری قوم کے نوجوانوں میں بھی آزادی کی تڑپ پیدا ہو جائے"[۳]

---

۱ شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۱۱۶
۲ " " " " ص نمبر ۹۶
۳ " " " " ص نمبر ۸۰

مندرجہ بالا اقتباسات میں جہاں آغا صاحب کی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں ہوتے ہیں ۔ وہاں ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے ۔ کہ انہوں نے اِن خطوط کو خطیبانہ اسلوب میں لکھا ہے ۔ جن کو پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ بعض خطوط میں آغا صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی ہے ۔ جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد اپنی تحریروں میں اشعار کے برمحل استعمال سے نثر میں نظم کی سی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ۔ یہی انداز ہمیں اِن خطوط میں بھی نظر آتا ہے ۔ اگرچہ اس قسم کے خطوط کی تعداد زیادہ نہیں ۔ جن میں اشعار کثرت سے استعمال ہوئے ہیں ۔ تاہم جہاں جہاں اِس کا التزام کیا ہے وہاں وہاں نثر کے مفہوم و مطالب نکھر کر سامنے آگئے ہیں ۔

یہ خطوط آغا صاحب کی ابتدائی تحریروں کا حصّہ ہیں ۔ اور بڑی بے سروسامانی اور افراتفری میں لکھے ہیں ۔ تاہم زبان کا ادبی حُسن کہیں بھی مجروح نہیں ہوا ۔ بعض جگہ انہوں نے بڑے بلیغ اشاروں سے کام لیا ہے ۔ جس کی وجہ سے مطالب کے سمجھنے میں دشواری بھی پیدا ہوتی ہے ۔ مثلاً ایک جگہ اپنے متعلق لکھتے ہیں ۔

"میری داستان بھی وقت کے ناہموار تھپیڑوں کی ترتیب دی ہوئی ہے ۔ زمانہ کی بے دردیوں نے اِن اوراق کو سنوارا ہے غمگین لمحوں نے تدوین کی ہے ۔ میرے آنسو میرے الفاظ ہیں ۔ میری آہیں میرے حروف ہیں ۔ عبرت و نفوط میرے مغموم افسانہ کے خاص عنوان ہیں ۔ شاید کوئی لفظ تم پر بھی اثر پذیر ہو ۔ ——— ! طلب بھی ہے ۔ اور جستجو بھی ۔ تلاش بھی ہے اور تمنّا بھی ۔ بے نشانی نشان ہو کر رہ گئی ہے ۔ کارواں گذر چکا ہے ۔ اب نقشِ کارواں کی تلاش میں ہوں گم شدہ منزل کی جستجو نے دیوانہ کر رکھا ہے ۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا ہوں ، کون ہوں ، کہاں جا رہا ہوں"[1]

---

[1] شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۵۵

آغا صاحب کے یہ خطوط اگرچہ اُن کی ابتدائی ادبی زندگی کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن زبان کی پختگی سے کسی کہنہ مشق ادیب کی تحریر کا گمان ہوتا ہے۔ جس کی بنا پر یہ خطوط ادب کا حصہ ہیں۔

جذباتِ شورش

آغا شورش کاشمیری کا پہلا مجموعۂ کلام اور سب سے پہلی کتاب ہے جو ۱۹۴۱ء میں مسلم پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی اس کتاب پر آغا صاحب کا نام اِس طرح لکھا ہے

آغا عبدالکریم شورش کاشمیری

جب کہ دوسری تمام کتابوں پر صرف شورش کاشمیری لکھا گیا ہے۔ خان حبیب الرحمٰن خان کابلی احرار نے تعارف کے عنوان سے آغا صاحب کے مختصر حالاتِ زندگی اور قید و بند کا حال لکھا۔ لیکن اِس کتاب اور آغا صاحب کے کلام پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ خان کابلی کے اِس جملے سے کہ

"فی الحال آپ منٹگری جیل میں ایام اسیری گزار رہے ہیں۔"[۱]

پتہ چلتا ہے کہ یہ کتاب آغا صاحب کی موجودگی میں نہیں چھپی بلکہ آغا صاحب اُس وقت جیل میں تھے کتاب میں کئی جگہ اشعار حذف کئے گئے ہیں۔ اور اُس جگہ سوالیہ نشان لگایا گیا ہے۔ لیکن کتاب میں اِس کی وجہ نہیں بتائی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب کے یہ اشعار خان کابلی نے اپنے طور پر شائع کئے ہیں۔ اور ایسے اشعار جو اصل مسودے میں سے پڑھے نہ جا سکے ہوں یا اُن میں کوئی سقم ہو شائع نہیں کئے اور اُن کی جگہ سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ آغا صاحب نے اپنی اِس کتاب کا ذکر کہیں بھی نہیں کیا البتہ اپنے خطوط میں انہوں نے جن دو کتابوں کا ذکر کیا ہے اُن میں سے ایک قیدی کا روزنامچہ ہے جو بعد میں "پسِ دیوارِ زنداں" کے نام سے شائع ہوئی اور دوسری کتاب کا نام "جنگ و پیکار" ہے اِس سلسلے میں آغا صاحب اپنے ۹ جنوری ۱۹۴۰ء کے ایک خط میں عبداللہ ملک صاحب کو لکھتے ہیں۔

۱۔ جذباتِ شورش ۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۱۱

"حالات نے بے وفائی نہ کی تو مذکورہ کتاب دو ایک روز تک بھجوا دوں گا۔ جنگ و پیکار ۶، ۷ ماہ
تک مرتب کر سکوں گا۔ اول الذکر کا مقدمہ کوشش کروں گا کہ چودھری افضل حق صاحب
لکھ دیں۔ نظمیات کے مجموعے کی ترتیب پر تقریب؟ جوش تک رسائی دشوار ہے
میں ہوتا تو اُن سے مجبوراً لکھوا لیتا۔ اب ایک صورت ہے خان کابلی کو کہوں گا
اگر اختر شیرانی رضامند ہو گئے تو بہتر ورنہ آگرہ کے ایک دوست نے سیماب صاحب
کی طرف سے حامی بھری ہے۔ فرمائیے آپ کا کیا ارشاد ہے؟
میں اپنی نا قابلیت کی اِن دو کاوشوں کو آپ کی نذر کرنا چاہتا ہوں اگر تم نے
انہیں قبول کر لیا تو میرے لئے یہ قبولیت عامہ ہو گی"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آغا صاحب جیل میں دو کتابیں لکھ رہے تھے اور اِن دونوں کو وہ عبداللہ ملک کے نام منسوب کرنا چاہتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ اُن کے شعری مجموعہ پر جوش اختر شیرانی یا سیماب اکبر آبادی تبصرہ کریں۔ اِس سلسلے میں عبداللہ ملک صاحب سے مشورہ چاہتے ہیں۔ ۳۰ جنوری ۱۹۴۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ

"روزنامچہ اگرچہ ایک ادبی چیز ہے تمہاری محسوسات اِس میں نہیں ہیں لیکن
مجھے امید ہے کہ تم جذبات کے اِس خاکہ کو ضرور پسند کرو گے"[2]

اِسی خط میں آگے چل کر آغا صاحب نے لکھا ہے۔

"تم نے شاعری سے نفرت کا اظہار کیا ہے میرے لئے اب شعر کہنا حرام
جنگ و پیکار کی ترتیب کا ارادہ بھی ترک کر چکا ہوں۔ جو نظمیں اکٹھا کی تھیں
انہیں امروز و فردا میں پھونک دوں گا ...."[3]

ا۔ شورش بنام عبداللہ ملک ص نمبر ۸۹ / ۹۰
ص نمبر ۱۲۸

میری بعض نظموں میں دلی گداز اور روحانی خلش ضرور ہے لیکن کمیونزم کو قرآن سے
زیادہ اہمیت دینے والی طبعیتیں ان میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ آپ کے لئے
اُن میں کچھ بھی نہیں ہے[۱]

مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ ملک صاحب نے شاعری سے بیزاری کا اظہار کیا ہوگا اور آغا صاحب نے "جنگ و پیکار" نامی شعری مجموعہ ترتیب دینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ عبداللہ ملک صاحب نے آغا صاحب کو "قیدی کا روزنامچہ" شائع کرانے کے لئے جب مالی امداد کی پیشکش کی تو آغا صاحب نے ملک صاحب کو لکھا کہ

"مجھے آپ سے بھی ایک شکایت ہے۔ اور وہ صرف اس قدر ہے کہ میں نے قیدی کا روزنامچہ کے انتساب سے قبل از اشاعت تمہیں کیوں آگاہ کر دیا ہے۔ یہ میرا اچھوراپن تھا۔ مجھے اس پر کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ "حقیر تحفہ" مجھے اس وقت نذر کرنا چاہئیے تھا۔ جب کتاب چھپ کر تیار ہو جاتی۔ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی ہے۔ کہ کتاب کے انتساب کی قیمت تمہاری جیب سے وصول کروں یہ تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی نگرانی میں اسکی اشاعت کا اہتمام کریں۔ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ تمہاری جیب اِن اخراجات کی متحمل ہو۔ سنا"
یہ آپ سے کہہ رہا ہوں اور اِسی لئے کہہ رہا ہوں کہ تم بھی جانتے ہو۔
"جنگ و پیکار" یہ خیال تو ختم کر چکا ہوں"[۲]

غرض اِن تمام باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب قید خانے میں ایک شعری مجموعہ ترتیب دے رہے تھے۔ جس کو شائع کرنے کا ارادہ بعد کو ترک کر دیا گیا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی نظمیں ہیں، جو آغا صاحب نے جیل میں کہی تھیں اور جن کا نام جنگ و پیکار کی جگہ جذباتِ شورش کر دیا گیا۔

۱-۲ شورش بنام عبداللہ ملک ص ن ب ۱۲۵ — ۲۰۹

اِس خیال کو اِس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ خان کابلی سے آغا صاحب کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ انہوں نے یہ نظمیں آغا صاحب سے حاصل کر کے آغا صاحب کے تعارف کے ساتھ جیسے انہوں نے خود لکھا شائع کر دیں

یہ بھی امکان ہے کہ خان کابلی نے آغا صاحب کے کہنے پر جیسا کہ اوپر رائے ایک اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے۔ اختر شیرانی سے اِس مجموعہ پر رائے دینے کیلئے کہا ہو۔ اور اختر شیرانی نے انکار کر دیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خان کابلی نے کسی بڑے شاعر سے رجوع کرنے کی بجائے خود ہی تعارف لکھ کر ان کو "جذباتِ شورش" کے نام سے شائع کرا دیا ہو

۸۔ اپریل ۱۹۴۰ء کے ایک خط میں آغا صاحب لکھتے ہیں کہ

"خان کابلی کو میرا اسلام کہیے گا اور اُن سے کہیئے گا کہ وہ اپنے ہمراہ میرے اباجی
کو لانے کی کوشش نہ کریں"[1]

اِس عبارت سے خان کابلی اور آغا صاحب کے قریبی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن یہ بات تعجب خیز ضرور ہے کہ آغا صاحب نے اپنی اِس کتاب کا کہیں بھی ذکر نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ آغا صاحب نے اپنی اِس اولین کاوش کو در خور اعتنا نہ سمجھا ہو۔ مگر اِس میں شک نہیں کہ یہ مجموعہ کلام شورش صاحب کی اُن نظموں پر ہی مشتمل ہے جو انہوں نے اِس زمانے میں کہیں جبکہ وہ منٹگمری میں اپنی پانچ سالہ قید کاٹ رہے تھے۔ آغا صاحب پانچ سال کے لئے ۱۹۳۹ء کو قید ہوئے اور "جنگ و پیکار" نامی کتاب کا تذکرہ بھی ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء کے خطوط میں ملتا ہے۔ اور "جذباتِ شورش" ۱۹۴۱ء کو شائع ہوئی۔ لہذا اِن حقائق سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وہی نظمیں ہیں جنہیں آغا صاحب "جنگ و پیکار" کے نام سے شائع کرنا چاہتے تھے مگر خان کابلی نے اِسے جذباتِ شورش کے نام سے شائع کروایا "جذباتِ شورش" میں زیادہ تر نظمیں آزادی اور جد و جہد آزادی سے متعلق ہیں۔ جن میں آغا صاحب نے وطن کے دوسرے نوجوانوں کو آزادی کی جد و جہد کیلئے ابھارا ہے اِس لحاظ سے اِس کتاب کا نام جو آغا صاحب نے تجویز کیا تھا یعنی جنگ و پیکار بالکل مناسب معلوم ہوتا ہے صرف چند

---

[1] شورش بنام عبداللہ ملک — س ن: ۱۲۵

نظمیں ایسی ہیں جو اختر شیرانی کی رومانی شاعری کی طرز پر کہی گئی ہیں۔ جہاں تک اِس مجموعہ کلام کے شعری محاسن کا تعلق ہے، وہ زیادہ جان دار معلوم نہیں ہوتے۔ لیکن آغا صاحب نے اِن اشعار میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ جذبات سچے اور حقیقی ہیں۔ اُس وقت کے سیاسی ہندوستان کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ اور آغا صاحب کی ذہنی انداز کی عکاسی بھی خوب ہوتی ہے۔ اِس زمانے میں آغا صاحب مجلس احرار کے سیکرٹری جنرل تھے اور مجلس احرار کے ساتھ گہری وابستگی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے کے اِس مجموعۂ کلام میں بہت سی نظمیں ایسی ہیں۔ جو مجلس احرار اور اکابرین احرار کی تعریف کی گئی ہیں۔ جن میں مجلسِ احرار کی حریت پسندی اور اکابرین کے ہمت و استقلال کی تعریف کی گئی ہے اِس مجموعے سے آغا صاحب کے ابتدائی سیاسی خیالات پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً جذباتِ حریت کے عنوان سے ایک جگہ کہتے ہیں۔

"میں غازی ہوں وطن کے نام پر گردن کٹا دوں گا

حریفانِ سیہ باطن کو دنیا سے مٹا دوں گا۔

مسلماں اور ہندو ہند کی آنکھوں کے تارے ہیں۔

میں اِن بچھڑے ہوؤں کو ایک دن باہم ملا دوں گا۔"

ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مجلس احرار کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ ہندو اور مسلمان مل کر آزادی کیلئے کوشش کریں۔ اور فرقہ پرستی سے بالاتر رہ کر ہندوستان کو آزاد کرائیں۔ آغا صاحب نے احرار کی اِس حکمت عملی کو شعر کا روپ عطا کر دیا ہے۔

اسی طرح "بیداری احرار" نامی نظم میں آغا صاحب یہ کہتے ہیں۔

"آزادیٔ کامل کے طلبگار اُٹھے ہیں۔

ہے شور کہ پنجاب میں احرار اٹھے ہیں

ناموسِ وطن کے وہ نگہ دار اٹھے ہیں۔

یثرب کی شجاعت کے عَلَم دار اٹھے ہیں۔

کس شمشیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے۔ "

ہندوستان میں کامل آزادی کا نعرہ مجلسِ احرار نے کانگریس اور مسلم لیگ دونوں سے پہلے لگایا تھا۔ اور پنجاب میں سب سے پہلے مجلسِ احرار ہی نے کامل آزادی کیلئے جد وجہد شروع کی تھی۔ اور ان اشعار میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

غرض ایسی بہت سی نظمیں ہیں۔ جن میں اُس وقت کی سیاست کے نقوش بڑے واضح اور مکمل نظر آتے ہیں۔ بہر حال "جذباتِ شورش" آغا صاحب کے ابتدائی کلام پر مشتمل ہے۔ جس طرح ہر شاعر کے ابتدائی کلام میں ناپختگی اور گہرائی کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی حالت اس مجموعے کی بھی ہے۔ لیکن بعض نظموں سے طبیعت کے موزوں ہونے اور سلجھے ہوئے مذاق رکھنے کا احساس ہوتا ہے۔ اور نقشِ اول کے لحاظ سے "جذباتِ شورش" قابلِ قدر چیز ہے۔

گفتنی و ناگفتنی

یہ کتاب پہلی مرتبہ فروری ۱۹۵۶ء میں اردو پریس لاہور سے شائع ہوئی جو ۲۷۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کا انتساب مولانا ظفر علی خان کے نام ہے اس کے بعد میر انیس کا یہ مصرعہ لکھا گیا ہے۔

چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے۔

مولانا غلام رسول مہر نے گفتنی کے عنوان سے اس کتاب پر اظہار خیال کیا اور خود آغا صاحب نے "ناگفتنی" کے عنوان سے ایک تفصیلی دیباچہ لکھا ہے۔ آغا صاحب نے اپنے اس دیباچے میں ایک جگہ اس مجموعے کی پہلی نظم یعنی "غبار خاطر" کو اس مجموعے کا پیش لفظ کہا ہے۔ اور لکھا ہے کہ

"دوسری تمام نظمیں اس کی شرح و تفسیر ہیں"[1]

اور یہ حقیقت بھی ہے واقعی آغا صاحب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس نظم کے چند شعر یہ ہیں۔

"خروشِ نعرۂ پیکار لے کے آیا ہوں
حکایتِ رسن و دار لے کے آیا ہوں
غمِ حیات و غمِ آرزو، غمِ ملت
تمام عمر کے افکار لے کے آیا ہوں
حیات و موت کی سنگین شاہراہوں میں
غرورِ جادۂ ایثار لے کے آیا ہوں

جہاں تک "خروشِ نعرۂ پیکار" کا تعلق ہے یہ اس کتاب میں پوری طرح موجود ہے یہ آغا صاحب کا اسلوبِ خاص ہے جس کی طرف انہوں نے سب سے پہلے اشارہ کیا ہے۔ اس کتاب کی ساری سیاسی نظمیں پڑھ جائیے جو بقول آغا صاحب اس مجموعے کا نوے فیصد ہیں"[2] وہ حکمرانوں۔ سیاست دانوں۔ خان زادوں۔ رہنماؤں۔ فقیہوں اور واعظوں سے الجھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور بعض جگہ تو لہجہ میں تلخی آگئی ہے۔ جس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے کہ

نقیبِ شہر کا وجود شعری صورتوں کے معرکۂ ہائے ناز و نیاز اور رنگ ہائے سفید و سیاہ کا SYMBOL ہے لیکن یہ واحد متعین وجود ہے جس کی شعری تاریکیوں اور سیاسی سیہ کاریوں پر قلم نے توازن کھو دیا ہے۔[3]

۱،۲،۳ـ گفتنی و ناگفتنی شورش کاشمیری ص نمبر ۳۷ ، ۳۷ ، ۴۰

بہر حال آغا صاحب جب اِس جنگ میں نعرہ لگاتے ہیں۔ تو اُن کا انداز خطیبانہ ہوتا ہے۔ جو اِس نعرے میں خروش پیدا کر دیتا ہے۔ یہی اسلوب اِس مجموعۂ کلام کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جس کے متعلق آغا صاحب نے خود کہا ہے۔

"میرے لہجے کی چبھن آہ شرربار میں ہے۔

میرا سرمایۂ فن دعوتِ پیکار میں ہے۔

میرا اسلوبِ سخن تیغ کی جھنکار میں ہے۔

میں نے کچھ اور بھی موضوعِ سخن ڈھونڈے ہیں"[1]

جہاں تک حکایتِ رسن و دار۔ غمِ حیات۔ غمِ آرزو۔ غمِ ملت اور موت و حیات کے سنگین راستوں کا تعلق ہے۔ شورش صاحب اِن راستوں پر بڑی ہی آن بان سے چلے ہیں۔ جنہیں وہ بجا طور پر غرور جادۂ ایثار کا نام دیتے ہیں۔ اور یہ سب باتیں واقعی آغا صاحب کی "تمام عمر کے افکار" ہیں۔ جن میں آزادی کی تڑپ۔ ملک و ملت سے محبت۔ انگریز سے نفرت اور قید و بند کی اذیتیں شامل ہیں۔ جنہیں وہ رسن و دار غمِ حیات۔ غمِ آرزو۔ غمِ ملت اور موت و حیات کی سنگین راہیں کہہ رہے ہیں۔ یہی اِس مجموعہ کلام کا پس منظر ہے یہ تمام حالات و واقعات انگریزی عہد سے متعلق ہیں۔ لیکن اِس مجموعے کی تمام نظمیں قیام پاکستان کے بعد لکھی گئی ہیں۔ اِس مجموعہ کلام میں جو بات سب سے نمایاں ہے۔ وہ آغا صاحب کی اپنی ذات ہے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ انہوں نے اِس سارے کلام میں زیادہ تر اپنی اُن خدمات کا تذکرہ کیا ہے جو آزادی کی جدوجہد سے متعلق ہیں۔ جس کا اعتراف موجودہ دور میں نہیں کیا گیا۔ اِسی طرح اِن نظموں میں ماضی اور حال کا تقابلہ بھی ملتا ہے۔ نیز ماضی اور حال کے رہنماؤں کے سیرت و کردار پر روشنی پڑتی ہے[2]

اُن کی مشہور نظم سیاست کے چند اشعار ہیں۔

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۷۶

"ہم نے اُس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا

جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں۔

سر فروشوں کیلئے دار و رسن قائم تھے

خان زادوں کیلئے مفت کی جاگیریں تھیں"[1]

مندرجہ بالا اشعار آغا صاحب کی اپنی داستان ہیں جو ان کے ماضی کا حصہ ہے لیکن اِس نظم کے آخری شعر میں انہوں نے حال کی حقیقت بھی بتائی ہے۔ کہ

"حیف اب وقت کے غدّار بھی رستم ٹھہرے

اور زنداں کے سزاوار فقط ہم ٹھہرے"[2]

یہی حال اُن کی نظم "ہم" کا ہے پہلے اشعار میں وہ بتاتے ہیں کہ "ہم" کیا ہیں۔ مثلاً

دار و رسن کی گود کے پالے ہوئے ہیں ہم

سانچے میں مشکلات کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم

اور پھر کہتے ہیں۔

رجعت میں فرد ہیں تو دنایت میں بے مثال

اب ایسے رہزنوں کے حوالے ہوئے ہیں ہم"

اِسی طرح یہ اشعار بھی اِسی کیفیت کے ترجمان ہیں۔

ناقدو! وقت کی رفتار بدلنے کے لئے

میں نے مجبور زبانوں کو نوا بخشی ہے۔

کجکلاہوں کی رعونت کا اڑایا ہے مذاق

میں نے تاریخ کے چہرے کو ضیا بخشی ہے

۱-۲ شورش: گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۹۲

اور آج بھی اِس دورِ ستم پیشہ میں میں
کج کلاہوں کی رعونت سے الجھ سکتا ہوں

ڈال سکتا ہوں مہ و مہر کے سینے پہ خراش
برق و باراں کی خشونت سے الجھ سکتا ہوں

ہے مبارک یہ مری جرأتِ گفتار مجھے
کیا تماشا ہے ڈراتے ہیں ستمگار مجھے

کج کلاہوں کے در و بام ہلا ڈالے ہیں
اپنے اِس جرم کی شدت کا ہے اقرار مجھے

معذرت شیوۂ مردانِ اولوالعزم نہیں
آج بھی اپنی صداقت پہ ہے اصرار مجھے

مندرجہ بالا تمام اشعار کو پڑھنے سے جس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ وہ آغا صاحب کا احساسِ انا ہے۔ جسے تعلی یا شاعرانہ خودستائی سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ آغا صاحب جو کچھ کہتے ہیں۔ وہ سب کچھ اُن پر بیت چکا ہے۔ بلکہ یہ احساسِ انا خود اُن تجربات کی پیداوار ہے جن سے آغا صاحب گذر چکے ہیں۔ بہرحال آغا صاحب کے کلام میں یہ "احساسِ انا" چونکہ اُن کی شخصیت کا حصّہ ہے۔ لہٰذا اِس احساسِ انا کی موجودگی نے اُن کے اشعار میں ایک زبردست قوت۔ جوش اور تاثیر کی شکل اختیار کرلی ہے۔ مولانا غلام رسول مہر نے آغا صاحب کے اِس احساسِ انا کے متعلق اِس کتاب کے تعارف میں بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔ اور حقیقت میں آغا صاحب کا مدعا بھی یہی ہے مولانا مہر صاحب فرماتے ہیں۔

"وہ جو کچھ کہتا ہے کیوں کہا جائے کہ اس کا مقصود ستائشِ ذات ہے یعنی وہ اپنی تعریف کررہا ہے؟ کیوں یہ نہ مانا جائے کہ اس کے پیشِ نظر دعوتِ عام ہے اور وہ ہر طلب پر یہی رنگ چڑھا دینا چاہتا ہے؟

یعنی اپنے الاپ ہوئے زمزموں کو ہر فرد کے سازِ وجود کا ترانہ بنا دینے کا خواہاں ہے۔[۱]

اِس مجموعہ کلام کی دوسری نمایاں بات اربابِ اقتدار پر طنز اور ملکی سیاست پر تبصرہ ہے۔ اِس طنز اور تبصرے کا تعلق اگرچہ ایک خاص ماحول اور معاشرے کی ایک خاص کیفیت سے ہے لیکن جن بلیغ اشاروں میں حقیقتِ حال کی ترجمانی کی گئی ہے۔ اُن سے آغا صاحب کا کلام ہر زمانے کے غلط کار سیاست دانوں پر صادق آتا ہے۔

"رندانِ میکدہ کی عبائیں ہیں چاک چاک
مینا خراب حال ہے، ساقی ذلیل ہے۔

انساں پہ حکمراں ہیں بلاکو کے جانشیں
قدرت کے احتساب خصوصی میں ڈھیل ہے"[۲]

"پابجولاں ہیں غلط کار سیاست کے حریف
بامِ زنداں پہ سلاسل کی صدا آج بھی ہے

زر پرستوں کو ہے انکار تو انکار کریں
میرا ایماں ہے غریبوں کا خدا آج بھی ہے"[۳]

بادِ صرصر سے ہے مجروح شگوفوں کا دماغ
گھات میں بلبل و قمری کی ہے صیاد ابھی[۴]

"ابھی — اِسی چمن میں لٹیرے ہیں باقی
ابھی — اِس فضا میں اندھیرے ہیں باقی
ابھی — مہر و مہ کو بلانا پڑے گا

ابھی — کونپلوں کی فضا لالہ گوں ہے
ابھی — دامنِ شب پہ تاروں کا خوں ہے
ابھی قصرِ ظلمات ڈھانا پڑے گا۔[۵]

---

[۱] گفتنی و ناگفتنی — تعارف مولانا غلام رسول مہر — ص نمبر ۱۱

[۲ تا ۵] " " " — ص نمبر ۶۶ - ۷۸ - ۸۷ - ۸۸

اِن سیاسی تبصروں میں آغا صاحب نے زیادہ عوام کی حالت کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ آغا صاحب زندگی بھر اربابِ اقتدار کے خلاف نبرد آزما رہے جس سے اُن کا مقصد پاکستان کے لوگوں کے لئے ایک بہتر معاشرے کی تشکیل تھا۔ نہ کہ ذاتی دشمنی یا رنجش۔ اِن اشعار میں انہوں نے لوگوں کی جس زبوں حالی کی ترجمانی کی ہے۔ وہ پاکستانی معاشرے کی حقیقی تصویر ہے

"عروسانِ چمن کی دردسامانی نہیں جاتی
گلاب و سنبل و ریحاں کی حیرانی نہیں جاتی

ابھی تک رشتہ رگِ محنت ہے استعمار کی زد میں
ابھی تک انقلابِ نو کی ویرانی نہیں جاتی

اب اپنا ملک ہے، بالکل بجا، میرے خداوندو!!
مگر جمہور کے چہرے کی حیرانی نہیں جاتی

کلاہیں کج کئے پھرتے ہیں اربابِ صنم خانہ
کنیزانِ حرم کی چاک دامانی نہیں جاتی

تمہاری باندیاں انبار میں ریشم کے تُلتی ہیں
ہماری بیٹیوں کے تن کی عریانی نہیں جاتی"[1]

لیکن آغا صاحب اِس صورتِ حال سے مایوس نہیں بلکہ انہیں یقین ہے کہ کچھ دنوں کی بات ہے اور پھر یہ ناانصافیاں اور ناہمواریاں ختم ہو جائیں گی وہ کہتے ہیں۔

"اک نئے دور کی ترتیب کے ساماں ہونگے
دستِ جمہور میں شاہوں کے گریباں ہونگے

ناؤ منجدھار سے بے خوف و خطر کھیلے گی
ناخدا برلبِ طوفاں پہ رجز خواں ہونگے

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۹۳

راہ رو اپنی مسافت کا صلہ مانگیں گے
رہنما اپنی سیاست پہ پشیماں ہوں گے [۱]

اِن اشعار میں بھی وہی بات دہرائی گئی ہے۔

" انساں ہے بے قرار کوئی پوچھتا نہیں — فطرت ہے اشکبار کوئی پوچھتا نہیں
بکھری پڑی ہیں جیب و گریباں کی دھجیاں — دامن ہے تار تار کوئی پوچھتا نہیں
نورستہ کونپلوں کی قبائیں ہیں چاک چاک — زخمی ہے لالہ زار کوئی پوچھتا نہیں
اشجارِ باغ ماتمِ گل میں ہیں سرنگوں — بے رنگ ہے بہار کوئی پوچھتا نہیں [۲]

کچھ دنوں بعد زمانے کی ہوا بدلے گی
وقت کے ساتھ رہ و رسمِ وفا بدلے گی
شاخساروں سے نئے پھول نکل آئیں گے
لالہ زاروں میں شگوفوں کی ردا بدلے گی
آگ برسائے گی بام و درِ سرمایہ پر
نوجوانوں کی جسارت سے فضا بدلے گی [۳]

۱۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۸۱

مولانا غلام رسول مہر نے دیباچے میں اِن اشعار کے متعلق لکھا ہے کہ
"اِن اشعار کے بعض الفاظ و اصطلاحات سے متاثر ہو کر انہیں کمیونزم کی صدائے بازگشت نہ سمجھنا چاہیے یہ اسی عادل اور متوازن انسان کی دعوت ہے جو اسلام اِس دنیا میں لے کر آیا ہے"۔
(دیباچہ گفتنی و ناگفتنی غلام رسول مہر ص نمبر ۱۵

۲۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۲۷

۳۔ ص نمبر ۱۵۲

مندرجہ بالا اشعار سے اِس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب ملکی سیاست پر جو طنز کرتے ہیں، اُس کا مقصد صرف اصلاح ہے۔ وہ سیاست میں تعمیری نقطۂ نظر کے قائل ہیں۔ سیاست کے سلسلے میں آغا صاحب کا موقف احیائے اسلام ہے وہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی مملکت دیکھنے کے تمنائی تھے اور اِس معاملے میں انہیں حکمرانوں کے علاوہ عوام سے بھی گلہ ہے کہ

غنچے خموش، پھول پریشاں، فضا اداس
لطفِ خرامِ بادِ صبا کون لے گیا
آنکھوں کو پاسِ شرعِ پیمبر نہیں رہا
چہروں سے آب و تابِ حیا کون لے گیا۔
نقش و نگارِ چہرۂ اسلاف مٹ گئے
وہ استوارِ عہدِ وفا کون لے گیا
انصاف بک رہا ہے زر و سیم کے عوض
اِن حاکموں سے خوفِ خدا کون لے گیا[1]

اِس کے بعد وہ یہ مشورہ دیتے ہیں۔

در اربابِ سیاست کی سیادت سے گذر جا
منزل سے اُٹھا ہاتھ، مسافت سے گذر جا
لادین حلیفوں کی معیت سے حذر کر
پُرپیچ عباؤں کی امامت سے گذر جا۔
مومن ہے تو دامانِ محمدؐ میں چلا آ
پیرانِ صنم خو کی اطاعت سے گذر جا۔[2]

۱؎ گفتنی و ناگفتنی — ص نمبر ۹۸

۲؎ " " " — ص نمبر ۱۳۴

اِس مجموعے کی چند نظمیں اِن شخصیات سے متعلق ہیں جن سے آغا صاحب نے فیضان پایا تھا وہ انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں اور اُن کی سیرت و کردار کی خصوصیتوں کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ اُن میں مندرجہ ذیل نظمیں شامل ہیں۔

" چوہدری افضل حق کے مزار پر" "حکیم مشرق" "ظفر علیخاں" "خطیبِ اعظم" اور "ابوالکلام آزاد"

سیاست کے علاوہ اِسی مجموعہ کلام میں آغا صاحب نے بعض سماجی مسائل کو بھی موضوع بنایا ہے۔ خاص طور پر وہ عورت کے معاملے میں بڑے حساس ہیں۔ تمام پاکستان کے بعد مغویہ عورتوں کی بے حرمتی سے متعلق اردو ادب میں بہت کچھ لکھا گیا۔ آغا صاحب کے اِسی مجموعے میں مغویہ لڑکیوں کی داستان شعر کے روپ میں ظلمبند ہوئی ہے۔ "عید آئی ہے" اور "عید آرہی ہے" کے عنوان سے یہ دونوں نظمیں بڑے ہی مؤثر انداز میں لکھی گئی ہیں۔

عید آئی کا ایک بند یہ ہے۔

" کل وہ اِک پارۂ عصمت تھی اِسی بستی میں
آج بازیچۂ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں
اِس پہ جو بیت گئی بیت رہی ہے اب تک
رہنماؤں کی سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں
کہہ بولی یہ سکینہ سے کہ عید آئی ہے
سن کے یہ روئے سکینہ پہ ملال آہی گیا

اِسی طرح 'عید آرہی ہے' کے عنوان سے لکھا ہے۔

" کبھی ماں باپ کا نورِ نظر تھی — شعاعِ مہر تھی رنگِ سحر تھی
جہاں تھی ہر طرح سے معتبر تھی — مگر اب مغویہ کہلا رہی ہے۔
پرائے دیس میں عید آرہی ہے" ۴۸

اِس کے علاوہ "ایک کہانی" اور "جاگیردار" نامی دونوں نظمیں عورت کی بے بسی اور مظلومی کی داستان ہیں۔ اِس مجموعے میں کچھ نظمیں بازارِ حسن سے بھی متعلق ہیں۔ جو اِس سے پہلے آغا صاحب کی کی کتاب "اُس بازار میں" کے شروع میں چھپ چکی ہے۔ اور اِس مجموعۂ کلام میں اِن نظموں میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ عنوان بھی وہی ہیں۔ جس عنوان سے "اُس بازار میں" چھپی ہے یعنی "ردِ عمل" "گنہگار" "مسجد و مینار" سوائے ایک نظم کے جس کا عنوان بدل دیا گیا ہے۔ کتاب "اُس بازار میں" میں اِس نظم کا عنوان بھی "اُس بازار میں" ہے لیکن زیرِ نظر کتاب میں اُسی نظم کا عنوان "قمار خانہ" ہے اِن نظموں کے علاوہ دو قطعے بھی "اُس بازار میں" چھپ چکے ہیں جو اِس مجموعۂ کلام میں بھی شامل ہیں دونوں طرف اُن کا عنوان "خرید و فروخت" اور "ریشم میں ٹاٹ کا پیوند" ہیں۔ آغا صاحب کی یہ نظمیں بڑی مشہور اور زوردار ہیں۔ اِن نظموں کے متعلق آغا صاحب کی اپنی رائے یہ ہے۔

"گفتنی و ناگفتنی" کے بہت سے شعر اپنی مجروح عصمتوں کی کہانی ہے۔ اِس مجموعے میں نہ صرف آنسو ہی ڈھلے ہیں بلکہ بعض جگہ خون کی آمیزش بھی ہے۔[1]

آغا صاحب کے اِس مجموعۂ کلام میں کچھ نظمیں اختر شیرانی کے رنگ میں کہی ہیں۔ گویا اِس مجموعہ کا یہ حصّہ عشقیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ جہاں تک اِس حصّے کی شاعری کا تعلق ہے تو اِسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے۔ کہ اِس حصّہ میں وہ شورش صاحب نہیں ہیں، جو کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں۔ بلکہ یوں لگتا ہے۔ کہ اِس پُر جوش ندی کا طوفان ختم ہو گیا ہے اور اب اِس ندی میں سبک خرامی اور ٹھہراؤ کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اِس کے باوجود پھر بھی کوئی نہ کوئی موج جوش میں آ کر ساحل سے سر ٹکرا جاتی ہے۔

[1] ربیعہ آ کہ زمانے پہ مسکرا کے چلیں
بہار بن کے رہیں ہم قدم ملا کے چلیں۔

۱۔ گفتنی و ناگفتنی صفحہ ۳۶

فضا کے رخ کو بدل دیں بعزمِ عشق جواں
حیات تلخ سہی اس پہ مسکرا کے چلیں
افق کے پار شفق رنگ لالہ زاروں میں
چلی چلو تو یہاں سے قدم بڑھا کے چلیں
شہنشہوں کو جو کاٹیں حضورِ محنت میں
قلم کو تیغ بنا کر فضا پہ چھا کے چلیں "

اس مجموعے کی نظموں میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جنہیں غزل کے شعر کہنا چاہیے

" خوب ہے نیم نگاہی بھی، مگر وقت نہیں
آنکھ سے آنکھ ملا رات چلی جاتی ہے۔
وقت کو لوٹ کے آتے بھی کبھی دیکھا ہے؟
آج کی رات نہ جا رات چلی جاتی ہے۔

" وفا تو خیر بڑی چیز ہے زمانے میں
تیری جفا کو بھی ناپائیدار دیکھا ہے۔
تیرے قریب بھی ہے کشمکش وہی باقی
تیرے حضور بھی دل بے قرار دیکھا ہے "

" بادل کی کھڑکیوں سے رہبر کے روپ میں
اے چاند مسکرا کہ طبیعت اداس ہے "
نیتے دلوں کی مندہ جبینی کا واسطہ
اک بار تو نگاہِ پشیماں اٹھائیے "

۱۳۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۴۳ ۔ ۱۴۶ ۔ ۱۴۳

مندرجہ بالا اشعار آغا صاحب کی عشقیہ شاعری کا اسلوب بھی متعین کرتے ہیں۔ نیز ایسی شاعری میں انہوں نے زبان کا خاص خیال رکھا ہے۔ پر شکوہ اور بھاری بھرکم الفاظ استعمال نہیں کئے جیسا کہ وہ سیاسی رنگ میں اکثر کر جاتے ہیں۔ انہوں نے جذباتِ محبت کی عکاسی بہت ہی نرم و ملائم الفاظ میں کی ہے۔ کتاب کے آخر میں پانچ مصرعی قطعات بھی خوب ہیں۔

آخر میں اِس مجموعۂ کلام کے متعلق یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ بقول آغا صاحب

"اِس مجموعہ میں کوئی نظم ایسی نہیں جس کے لئے مجھے کئی دن یا کئی گھنٹے غلطاں رہنا پڑا ہو۔ بس شعر کہنے کے لئے ایک کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اودھر وارد ہوئی اودھر کھٹ سے شعر ہونے لگے جس نظم میں آدھ یا پون گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ اُٹھے میں وہ نظم کہہ ہی نہیں سکتا" [1]

بعض الفاظ اِس مجموعہ کلام میں بہ تکرار استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً گل و لالہ۔ فقیہہ شہر۔ منبر و محراب اور کونسل وغیرہ۔ آغا صاحب نے اِس کا جواز یہ بتایا ہے۔ کہ جس طرح سب شاعروں کے محبوب الفاظ ہوتے ہیں۔ اسی طرح گل و لالہ اور فقیہہ شہر۔ وغیرہ اُن کے بھی محبوب الفاظ ہیں۔ [2] لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ اِن دو لفظوں کے ساتھ موضوع بھی مخصوص ہو گئے ہیں جن کی تکرار بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ مجموعی طور پر اپنے موضوع اور زبان کے اعتبار سے یہ مجموعہ کلام ایک منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ بقول مولانا غلام رسول مہر

"شورش ابھی خدا کے فضل سے جوان ہے۔ اِس کی حیثیت شعروادب کے مراحل میں تازہ وارد کی ہے۔ تاہم اِس کا دامن جن جواہر پاروں سے مزین ہے۔ وہ ایسے ہیں۔ کہ کہنہ مشق سخن ور بھی انہیں باعث فخر سمجھیں۔" [3]

---

[1] گفتنی و ناگفتنی — ص نمبر ۳۵

[2] ،، ،، — ص نمبر ۱۶

الجہاد والجہاد

یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۶۶ء میں چٹان پرنٹنگ پریس لاہور سے شائع ہوئی جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

یہ کتاب آغا صاحب کی ان جنگی نظموں کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران میں کہی تھیں۔ انہیں دنوں آغا صاحب کی بعض نظمیں بڑی مقبول ہوئیں۔ اور اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہ بچے بچے کی زبان پر تھیں۔ ریڈیو پاکستان نے ان نظموں کو بہ تکرار نشر کیا۔ اور اس زمانے کے ہفت روزہ چٹان میں بھی شائع ہوئیں۔ اس مجموعے میں آغا صاحب کی ایک نظم "مشرقی بنگال کے آتش بجانوں کو سلام" کو بڑی شہرت ملی۔ یہ نظم اس زمانے کے رزمیہ ادب میں اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس نظم میں مغربی اور مشرقی پاکستان میں اتفاق و اتحاد قائم رکھنے کا درس دیا گیا ہے۔ جو آغا صاحب کی سیاسی بصیرت کا نتیجہ ہے جس کا اعتراف پاکستان کونسل راولپنڈی کے علاوہ وزارتِ امور خارجہ ڈھاکہ نے بھی تحسین و داد سے نوازا۔ آغا صاحب نے ان خطوط کو جن میں یہ اعتراف کیا گیا ہے انگریزی کی اصل عبارت بھی اردو ترجمے کے ساتھ اس کتاب میں شامل کر دی ہے۔ اس کے علاوہ اس نظم کا ترجمہ انگریزی اور بنگالی زبان میں کیا گیا تھا جو اس کتاب میں موجود ہے۔

آغا شورش کاشمیری کے متعلق ان کے سیاسی حریف ہمیشہ یہی کہتے رہے۔ کہ کہ وہ پاکستان کے مخالف تھے اور یہ بات اس حد تک درست بھی ہے۔ کہ آغا صاحب پاکستان کے معرض وجود میں آنے سے پہلے اپنے ذہنی اور سیاسی ارتقاء کے ایک دور میں تصور پاکستان سے اختلاف رکھتے تھے۔ مگر پاکستان کے مخالف وہ کبھی بھی نہ تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اس بات کا نہ صرف اعلان کیا کہ وہ پاکستانی ہیں۔ اور پاکستان ان کا وطن ہے بلکہ اس کا عملی ثبوت بھی ہمیشہ پیش کرتے رہے۔ پاکستان کی سیاسی۔ ثقافتی۔ مذہبی اور معاشرتی زندگی کو سنوارنے میں جس

جوشں و خروش کا مظاہرہ کیا۔ کوئی بڑے سے بڑا محب وطن بھی اس کا تصور نہیں کر سکتا
انہوں نے مارشل لاء کی حکومتوں کو پاکستان کی اساس اور نظریہ پاکستان کا مطلب سمجھایا
اور ملک کی حکومتوں کو جن میں مسلم لیگ کی حکومت بھی شامل تھی۔ بار بار جھنجھوڑا کہ یہ
سیاسی بازی گری جو اُن کا شعار بن چکی تھی۔ پاکستان اور نظریہ پاکستان کے منافی
ہے۔ مگر ہر حکومت نے شورش کی حب الوطنی کو پاکستان دشمنی پر محمول کیا اور شورش
صاحب کی تنقید اور حق گوئی کی تاب نہ لاتے ہوئے انہیں پس دیوار زنداں بھیجتے رہے
اور اس بات کو ہوا دیتے رہے کہ چونکہ شورش کاشمیری کبھی پاکستان کا مخالف رہا ہے۔
لہذا اب بھی پاکستان کا دشمن ہے۔ اس بات کیلئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ
پاکستان کی ہر حکومت نے اپنے اعمال و کردار اور شخصی اقتدار کو ہی پاکستان سمجھا۔ لہذا
وہ شخصی اقتدار اور اس کی اجتماعی حکمت عملی پر تنقید کو پاکستان کی مخالفت سمجھتے رہے
اور اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے شورش صاحب پر پاکستان دشمنی کا بہتان باندھتے رہے
لیکن آغا صاحب کی حق گوئی اور پاکستان سے اُن کی محبت میں کبھی کمی نہیں آئی اور پاکستان
کے محب وطن لوگ جناب شورش کاشمیری سے محبت کرتے رہے کہ وہ آغا صاحب کو
حکمرانوں سے زیادہ وطن دوست سمجھتے تھے۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جب وطن کی سلامتی کو خطرہ
لاحق ہوا تو شورش کاشمیری جن حکمرانوں کی خواہشات کو ہمیشہ پائے حقارت سے ٹھکرانے
کے عادی تھے وہ انہی حکمرانوں کے اشارۂ ابرو پر چلنے لگے کہ اس میں اُن کے ملک کی
بقا کا راز مضمر ہے۔ انہوں نے اپنی خطابت۔ صحافت۔ شاعری اور ادب کو ملک کے دفاع
کا حصہ بنا دیا۔ اور وطن کی محبت میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے
زیر تبصرہ کتاب کی پہلی نظم میں اس خواہش کے اظہار کا بھرپور تاثر موجود ہے۔

"میں تو کیا میرا اسار اموال و منال ۔۔۔ مرا گھر بار مرے اہل و عیال

میرے اِن ولولوں کا جاہ وجلال — میری عُمرِ رواں کے ماہ وسال

میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے۔

میری عزت کا پاسباں ہے وطن — میری غیرت کا ترجماں ہے وطن

میرے اسلاف کا نشاں ہے وطن — ساتھیو! اِن دنوں جواں ہے وطن

میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے۔

مجھ کو جو کچھ ملا یہیں سے ملا — یعنی اِس پاک سرزمین سے ملا

شاعرِ عہد آفریں سے ملا — نقدِ اظہار اِس یقین سے ملا

میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے!!

مگر وطن کے دردمند حکمرانوں نے جلد ہی آنکھیں بدل لیں اور آغا صاحب کو ۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۶۶ کو امنِ عامہ کی خلاف ورزی کے جرم میں سنٹرل جیل ساہیوال میں نظر بند کر دیا۔ آغا صاحب نے اِس کتاب کا انتساب حکومت کے اِسی حکمنامہ کے نام کیا ہے جس کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں۔

انتساب

"سترہ روز جنگ کے دوران راقم نے جو کچھ لکھا، اس کا اعتراف حکومت کے ایوان ذوالفقار کی طرف سے برابر ہوتا رہا۔ راقم نے مغربی پاکستان کے بہت سے حصوں میں بے شمار جلسوں کو خطاب کیا۔ "چٹان" کو اِس مقصد کے لئے وقف کر دیا۔ ریڈیو پر راقم کے بہت سے نغمے گونجتے رہے۔ تقریریں نشر کیں۔ صلہ کیا ملا؟ جنگ کی پہلی سالگرہ یعنی ٹھیک ۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۶۶ کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ نمبر ۳۲ کے تحت چھ ماہ کیلئے منٹگمری سنٹرل جیل میں نظر بندی! —— یہ ہے اِس آرڈر کا متن —— اپنی اِن نظموں کو میں اِسی حکم نامہ سے منسوب

۳۰ / ۲۹

کرتا ہُوں ستم

حاضر ہیں میرے جیب و گریباں کی دھجیاں

شورش کاشمیری [1]

اِس انتساب کے بعد حکومت کا حکم نامہ جو بحروف انگریزی ہے اردو ترجمے کے ساتھ درج ہُوا ہے۔ فہرست کے بعد صفحہ ۱۵ پر آغا صاحب کا یہ مصرع جلی حروف میں لکھا گیا ہے۔

میرا قلم بھی جنگ میں تلوار ہوگیا۔

اِس کے بعد جناب حکیم احمد شجاع نے اِس کتاب کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور جناب ظہیر کاشمیری نے "حرفے چند" کے عنوان سے آغا صاحب کی اِن رزمیہ نظموں پر تبصرہ کیا ہے۔ جناب حکیم احمد شجاع نے اِس کتاب کو رجز نامہ کہا ہے اور لکھا ہے کہ

"یہ کارنامہ ایک ہنگامی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ دوامی قدر و منزلت کا حامل ہے
اور آگے چل کر ہمارے اس دورِ عظمت کی تاریخ کا ایک روشن پس منظر بن جائے گا" [2]

اسی طرح جناب ظہیر کاشمیری صاحب نے تحریر کیا ہے کہ

"میرے خیال میں ایسا ہنگامی ادب تاریخ ادب میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے
اور آنے والی نسلیں ایسی تخلیقات کو ممنونیت کی نظر سے دیکھیں گی" [3]

اِس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب کی اِس کتاب کا تعلق ادب کی اُس شاخ سے ہے جسے ہنگامی ادب کا نام دیا گیا ہے۔ اور جس کی عمر کا دار و مدار ہنگامی حالات تک ہی ہُوا کرتا ہے۔ لیکن ایسا ہنگامی ادب تخلیق کرنا کسی بھی ادیب و شاعر کیلئے ایک کسوٹی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس قسم کی رزمیہ شاعری میں شاعر کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ کلام کی نوک پلک درست کی جائے یا اُس کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکے بلکہ شاعر اِن ہنگامی حالات میں جن شدید جذبات کا طوفان اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اِسے فی البدیہہ اور ارتجالاً الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ لیکن ایسا کرنا ہر کسی کے

---

[1] الجہاد و الجہاد — انتساب — ص نمبر ۹
[2] ایضاً — ص نمبر ۱۸ — حکیم احمد شجاع
[3] ایضاً — حرفے چند — ص نمبر ۲۲ — ظہیر کاشمیری

بس کی بات نہیں اِس کے لئے فنکاری اور مہارت کا ہونا بڑا ضروری ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ جذبات کی سچائی اور شدت اِس درجہ کی ہونی چاہیے کہ فنکار کسی تردد کے بغیر اُس کا برجستہ اظہار کر سکے۔ یہ یقیناً آسان نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے تمام شاعر آغا صاحب سے پیچھے رہ گئے اور پاکستان کے بعض شعراء کو تو یہ سعادت ہی نصیب نہ ہو سکی کہ وہ وطنِ عزیز کے دفاع میں شامل ہوتے۔

۱۹۶۵ کی جنگ کے دوران جو جنگی نظمیں یا ترانے لکھے گئے اِن تمام کی کیفیت ارتجال کی سی تھی اور جنگ سے پہلے اِس قسم کے نمونے اردو ادب میں نہ ہونے کے برابر تھے اور حالت یہ تھی کہ اِدھر کوئی نظم لکھی گئی اُدھر کسی گلوکار نے بغیر ریاض کے ریکارڈ کرا دی اور اِس طرح سارے ملک میں پھیلا دی۔ اِسی طرح شعراء نے ملکی دفاع میں حصہ لیا۔ اور اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوئے۔ آغا صاحب نے اِس جنگ میں جہاں اپنی خطابت اور صحافت سے کام لیا۔ وہاں انہوں نے اپنے اشعار سے افواج پاکستان کے حوصلے بڑھائے۔ اُن کے خون کو گرمانے اور اُن کے جذبات کو ابھارنے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ اور یہ مجموعہ اِن ہی اشعار پر مشتمل ہے۔

آغا صاحب کے اِس شعری مجموعے کی سب سے بڑی خصوصیت اُس کی گھن گرج۔ رعب و دبدبہ تمکنت۔ وقار اور جوش و ولولہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ کہ آغا صاحب خود میدانِ جنگ میں موجود ہیں۔ اور سپاہیوں کو دعوتِ عمل دے رہے ہیں۔ اِس کا بڑا ہی خوبصورت نمونہ آغا صاحب کی یہ نظم ہے۔ جس کا عنوان "الجہاد و الجہاد و الجہاد" ہے یہ ساری نظم اِسی خصوصیت کی حامل ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

"توڑ ڈالو ایک ہی یلغار میں بندِ نساد — الجہاد و الجہاد و الجہاد و الجہاد

الجہاد و الجہاد

موت کا پیغام بن کر دشمنوں پر جا پڑو — ملت بیضا کے بیٹو آخری دم تک لڑو

الجہاد و الجہاد

عرصۂ جنگاہ میں توپوں کے جبڑے پھاڑ دو ہر محاذِ جنگ پر ہیبت کے جھنڈے گاڑ دو

الجہاد والجہاد [۱]

اسی طرح ایک دوسری "نظم یلغار کرو یلغار چلے" میں یہ اشعار ہیں۔

؎ یوں جنگ تہ افلاک کرو کفّار کا سینہ چاک کرو

دشمن کی صفوں کو خاک کرو یلغار کرو یلغار چلے

بھارت سے نپٹ ننکا پہ جھپٹ، سینا کو الٹ چاؤں کو پلٹ

خنجر کو اٹھا پرچم کو اڑا للکار انہیں للکار چلے [۲]

ایک اور نظم کے اشعار بھی اسی رنگ کی غمازی کرتے ہیں۔

"دبدبہ ہند پر بٹھا دوں گا کفر کی دھجیاں اڑا دوں گا۔

ملک کی آبرو بڑھا دوں گا اس پہ اولاد تک لٹا دوں گا۔

میرا سب کچھ مرے وطن کا ہے [۳]

اسی طرح "نفیرِ جنگ" کے عنوان والی نظم میں بڑی ہی شدت ہے۔

؎ ہر اک محاذِ جنگ پہ ان کو پچھاڑ دو

ہندوستان کی فوج کا حلیہ بگاڑ دو۔

واہگہ کی سرزمین پہ ہر لیفا دوں نہاد

میرِ سپہ کی زیرِ قیادت جھنجھاڑ دو

مشکل کشا ہے ذاتِ خداوندِ ذوالجلال

دہلی پہ چل کے پرچم اسلام گاڑ دو [۴]

۱۔ الجہاد والجہاد ص نمبر ۳۳

۲۔ " " ص نمبر ۳۱

۳۔۴۔ " " ص نمبر ۳۵ ۔ ۴۰

اسی طرح اُن کی نظموں "بڑھے چلو بڑھے چلو"۔ "گھمسان کی جنگ" اور "ہم ایک ہیں"۔ کا بھی یہی حال ہے مندرجہ بالا اشعار میں الفاظ کے رعب و دبدبہ اور جوش و خروش کے علاوہ اِن کا اندازِ خطابت ایک منفرد چیز ہے۔ جو صرف شورش صاحب ہی کو نصیب ہو سکا تھا۔

آغا صاحب کو الفاظ کے برمحل استعمال میں جو کمال حاصل ہے وہ محتاجِ بیاں نہیں۔ اِن کے اِس مجموعے میں الفاظ کے موزوں استعمال کے ساتھ موسیقی کو بھی بڑا دخل ہے۔ انہوں نے بحور اور قوافی کے انتخاب میں یہ خاص التزام کیا ہے۔ کہ اشعار کی موسیقیت مجروح نہ ہونے پائے۔ چونکہ یہ ترانے اور جنگی نظمیں گلوکاروں کے ذریعہ ملک میں ہر جگہ پہنچائی جاتی تھیں۔ لہذا یہ بڑا ضروری تھا کیونکہ

"موزوں الفاظ اور جذبات میں ایک گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ یہ وجہ ہے کہ زمانۂ قدیم میں حدتِ خون بڑھانے اور برانگیختگی پیدا کرنے کیلئے نوجوں کے ساتھ جنگی ساز رہتے تھے۔"[۱]

گویا موسیقی سے جذبات کو ابھارنے کا کام لیا جاتا تھا اور آغا صاحب کے اشعار میں موسیقی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اِس مجموعے کی تمام نظمیں اِس لحاظ سے منفرد ہیں۔ مثلاً اِن کی مشہور نظم "کھیم کرن" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں

"یہ لوگ کبھی ڈٹ کے لڑے تھے نہ لڑے ہیں۔
لاشوں کے ذخیرے ہیں کہ میدان میں پڑے ہیں۔
میدان نہیں بت کدۂ گنگ و جمن ہے۔
یہ کارگہ کھیم کرن کھیم کرن ہے"[۲]

۱۔ امیر خسرو اور موسیقی — منتخب مضامین بعنوان ڈاکٹر سید مجیب حسین — ص نمبر ۶
نیشنل کمیٹی برائے سو سالہ تقریبات امیر خسرو اسلام آباد

۲۔ الجہاد الجہاد — ص نمبر ۵۷

اِسی طرح اِن کی مشہور نظم "مشرقی پاکستان کو سلام" کے یہ اشعار ہیں۔

"میں نے دیکھا ہے انہیں مانندِ تیغ بے نیام
مشرقی بنگال کے آتش بجانوں کو سلام
جو ملے اُن کے جواں تھے ولولے اُن کے مدام
اِن کا نعرہ انتقام و انتقام و انتقام
مشرقی بنگال کے آتش بجانوں کو سلام"[1]

اور یہ ترانہ بھی موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔

"نوائے کار راز ہیں | عرب کے شہسوار ہیں
تو غا کا تیز وار ہیں | صدائے کردگار ہیں۔
میرے وطن کے پاسباں"[2]

ایک اور نظم کے اشعار یہ ہیں۔

"جلال ہیں جمال ہیں مجاہدوں کی ڈھال ہیں
بڑی ہی باکمال ہیں یہ عید کا ہلال ہیں۔
سہری نگر کی بیٹیاں"[3]

مندرجہ بالا نظمیں جن کے اقتباس دیئے گئے ہیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اِس کے علاوہ اور نظموں میں بھی موسیقی کا یہ عنصر موجود ہے۔

آغا صاحب کے اِس مجموعے کو اگر ہندو ذہنیت کے سیاسی پس منظر میں دیکھا جائے تو اِن کی سیاسی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے۔ اِس کتاب میں "دو ٹوک فیصلہ" کے عنوان سے جو نظم دی گئی ہے اُس کے متعلق آغا صاحب کا یہ نوٹ موجود ہے کہ

۱-۳ الجہاد و الجہاد ص نمبر ۶۵ - ۷۶ - ۹۱

"یہ نظم سیاسی پیشگوئی کی حیثیت رکھتی ہے سترہ روزہ جنگ سے ۳ ماہ ۱۸ دن
پہلے موزوں ہوئی اور ۲۴ مئی ۱۹۶۵ء کے چٹان میں شائع کی گئی ہے"

اِس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اِس سلسلے کی اور نظمیں بھی اِس کتاب میں موجود ہیں جس سے اُس وقت کی ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر روشنی پڑتی ہے۔

آغا صاحب نے اپنے اِس مجموعۂ کلام میں ہندوؤں کی ذہنیت اور اُن کے کردار کی دوائی اور مستقل تندروں کا مذاق اڑایا ہے۔ جس سے مقصود اُن کی فوج کے حوصلے پست کرنا تھا کہ ہندوستان کے سپاہی اُس قوم کے افراد ہیں جن کا شعار بزدلی۔ مکاری۔ دھوکے بازی۔ مکر و فریب ہے اُن کے مقابلے میں اسلام کے اصول اور اُن کی عظمت اور مسلمان قوم کی بہادری اور جانثاری کی مثالیں عام ہیں۔ جس سے مقصود دشمنوں کے حوصلے پست کرنے کے علاوہ اپنی فوج کے حوصلے بلند رکھنا اور انہیں یہ درس دینا تھا کہ ایک عظیم اور بہادر قوم کے افراد ہمیشہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو دہراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں آغا صاحب کے اشعار میں اسلام کے بڑے بڑے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کے نام عام ملتے ہیں۔ ہندو ذہنیت کی عکاسی اور اُس کے قومی کردار پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

"بھاگے ہوئے نکلے تھے مہادیو کا ڈھنڈ
بھاگے تو پس پشت تھی گھڑیال کی ٹن ٹن
کس موج میں ہیں بھارتی سیناؤں کے سینک
کس اوج پہ ہے لکشمی بائی کی چھنا چھن ہے"

خوب! فوجوں کے سپہ سالارِ اعظم نے کہا
انکی ذہنیت میں دھوکہ انکی فطرت میں دغا
ہوشیار رہ ہوشیار

۱-۵ الجہاد والجہاد ص نمبر ۳۵ - ۴۹

مختلف اوقات میں دیکھا انہیں بز دل ہیں یہ
خیر کی اُن سے توقع باپ کے قاتل ہیں یہ
ہوشیار و ہوشیار [1]

"گاندھی ٹوپی لال بجھکڑ — مکر کی آندھی جھوٹ کا جھکڑ
ننگی گالی ۔ عریاں پھکڑ — صدیوں کا منحوس غلام
ناچ رہا ہے ننکو رام" [2]

عساکر پاکستان کو اُن کے اسلاف کی بہادری کے کارنامے سناتے ہیں ۔

" سلام شوق عساکر کے نوجوانوں کو
بلال و بوذرؓ و طارقؒ کی یادگار ہیں آپ
خدا کے خوف سے لبریز شیشۂ دل ہے
حضورِ خواجۂ کونین پہ نثار ہیں آپ
خدا نے آپ کو اِس قوم کا امین کیا
کہ جس کے معرکہ آراؤں کی بہار ہیں آپ" [3]

نکل آئیں سرِ میدان علیؓ کا بانکپن لے کر
تو پھر وحشت و جبل میں ہیبت شیر نریاں ہم ہیں" [4]

اِسی طرح آغا صاحب اپنی دوسری نظموں اور اشعار میں بھی عساکر پاکستان کے ساتھ مل کر جنگ میں حصہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔

۱۔ؔ الجہاد و الجہاد ص نمبر ۵۵ ۔ ۹۷
۳۔۴ " " ص نمبر ۵۳ ۔ ۵۹

جناب ظہیر کاشمیری نے شورش صاحب کی اِن نظموں کے اسلوب کو شعلہ و شبنم کہا ہے لیکن ہمیں اِن نظموں کے اسلوب میں شبنم کی ٹھنڈک کا کہیں احساس نہیں ہوتا البتہ شعلے کی لپک کہیں کم اور کہیں زیادہ ضرور ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض جگہ یہ شعلہ دھیمی آنچ میں بدل گیا ہے ۔ مگر حرارت کا احساس کبھی بھی ختم نہیں ہوتا آغا صاحب نے خود بھی اپنے اِس کلام کے بارے میں کچھ ایسے ہی خیال کا اظہار کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

شورش کی زباں شمشیر و سناں شاعر کا بیاں غیرت کا نشاں
ہیبت کا جہاں یہ جوش رواں دھرتی پہ لہو کی دھار چلے

بہر حال آغا صاحب کے کلام کا یہ مجموعہ جسے جناب حکیم احمد شجاع صاحب نے "رجز نامہ" کا نام دیا ہے ۔ اردو ادب کی تاریخ میں ایک خوبصورت اضافہ ہے ۔

چہ قلندرانہ گفتم

یہ کتاب ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے ۔ شروع میں پورے صفحہ پر علامہ اقبال کا یہ شعر درج ہے

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند ۔

اِس کے بعد مصنف کی تصویر ہے اور پھر "آغاز میں" کے عنوان سے آغا صاحب کے اپنے قلم سے مختصر تعارف ہے ۔ یہ کتاب پہلی دفعہ جنوری سنہ ۱۹۶۶ کو شائع ہوئی ۔

اِس کتاب کی تمام نظمیں آغا صاحب کے ہفت روزہ چٹان میں بھی چھپ چکی ہیں ۔ ۱؎

آغا صاحب کی اِس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔

۱ ۔ حمد و نعت

۱؎ بحوالہ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر 7 "آغاز میں" شورش کاشمیری

۲۔ وہ نظمیں جو بریلوی علماء کے ساتھ ایک قلمی معرکہ میں لکھی ہیں ۔

۳ سیاسی نظمیں جو پاکستان کی سیاست کی نمائندگی کرتی ہیں ۔

جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے یہ بڑا ہی مشکل فن ہے ۔ جس کا احساس خود آغا صاحب کو بھی ہے ۔ شورش کاشمیری صاحب نے اگر کہیں اپنے قلم کو بے بس پایا ہے تو وہ صرف نعت کا میدان ہے ۔ جس کا اعتراف انہوں نے اسی کتاب میں اس طرح کیا ہے ۔

" اُن کی تعریف و ثنا پر نہیں انسان قادر
اُن کے اوصاف کا اظہار کہاں ہوتا ہے "[۱]

" نعت لکھتے ہو تو یہ اُن کا کرم ہے شورش
ورنہ ہر شخص پہ یہ فیض کہاں ہوتا ہے "[۲]

" نعت گوئی کی تمنا ہے تو اس کوچہ میں
رومی و جامی و قدسی کا اشارے کے چلو "[۳]

مرتبہ اُن کا مرے زورِ بیان سے باہر تذکرہ اُن کا سرِ کون و مکاں ہوتا ہے "[۴]

لیکن جونہی آغا صاحب نعت کے میدان سے باہر آتے ہیں تو اُن کا لہجہ یکسر بدل جاتا ہے پھر وہ اس طرح کہتے ہیں

" خدا نے مجھ کو عطا کی ہے جراتِ گفتار
نکل کے جائے کہاں دامنِ بیاں مجھ سے "[۵]

اور یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب میں بیان کا دامن شورش صاحب کے قلم سے الجھتا نہیں بلکہ اُن کے قلم کو ہوا دیتا ہوا نظر آتا ہے جس کی بنا پر وہ گرجتے اور برستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اس گرجنے اور برسنے کو انہوں نے "قلندرانہ" کا نام دیا ہے لیکن خالص نعت کے اشعار میں اُن کا یہ انداز قلندرانہ

۱-۲ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۲۵ ۔ ۴۱
۳-۴ ، ، ، ص نمبر ۲۸ ۔ ۴۰
۵ ، ، ، ص نمبر ۶۶

ہوتا ہے جو عاجزانہ اور مؤدبانہ بھی ہوتا ہے مثلاً

" عاجز ہوں مگر تیری طرف دیکھ رہا ہوں — خاکِ کفِ پا ہوں

کونین کی دولت ہے ترا سایۂ دیوار — یا سیّد الابرار "[1]

" لاؤں کہاں سے شہپرِ جبریلؑ کی اڑان

دل کھنچ رہا ہے جانبِ دربار مصطفےٰؐ!

شورش بہ فیض خواجۂ کونین دیکھ لوں

جی چاہتا ہے کوچہ و بازارِ مصطفےٰ "[2]

"مدینہ کے مسافر" کے عنوان سے جو نعت اس کتاب میں درج ہے اس پوری نعت کا انداز یہی ہے۔ جس کے چند شعر درج ہیں۔

" یہ سارے ولولے اسلام سے ہیں۔ — محمد مصطفےٰ کے نام سے ہیں۔

خلیل اللہ کے پیغام سے ہیں۔ — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں۔

دماغوں میں سرور جاوداں ہے۔ — ادب! اے دل "ادب گاہِ جہاں ہے

شہ کون و مکاں کا آستاں ہے۔ — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں۔"[3]

اور اسی طرح "محمد عربیؐ" کے عنوان سے ایک بڑی منفرد نعت میں حضورِ سرورِ کونینؐ سے التجا کرتے ہیں

" ہم پہ ہو تری رحمت جم جم صلی اللہ علیک وسلم

تیرے ثنا خواں عالم عالم صلی اللہ علیک وسلم

ہم ہیں تیرے نام کے لیوا اے دھرتی کے پالن ہارا

یہ دھرتی ہے برہم برہم صلی اللہ علیک وسلم

---

[1] چہ قلندرانہ گفتم — ص نمبر ۲۳

[2] " " " — ص نمبر ۲۷

[3] " " " — ص نمبر ۳

دیکھ تیری امت کی ناؤ میں ڈوب چکی ہیں ڈوب رہی ہیں۔

دھیرے دھیرے مدھم مدھم صلی اللہ علیک وسلم

قریہ قریہ بستی بستی دیکھ مجھے میں دیکھ رہا ہوں

نوحہ نوحہ ماتم ماتم صلی اللہ علیک وسلم

اے آقا اے سب کے آقا ارض و سما ہیں زخمی زخمی

ان زخموں پہ مرہم مرہم صلی اللہ علیک وسلم [۱]

آغا صاحب کی نعتوں میں رسالت مآب کی غلامی کے شرف کا احساس بار بار ابھرتا ہے۔

" ادنیٰ تریں غلام رسالت مآب ہوں

چھپتی نہیں ہے بات کسی شہر یار کی

جاں وقف کر چکا ہوں محمد کے نام پر

یہ ہے دلیل خاص مرے افتخار کی [۲]

" کیوں کیوں نہ تری حلقہ بگوشی پہ ہمیں ناز — کچھ کم ہے یہ اعزاز

ہے تیرے سوا کون فقیروں کا طرف دار — یا سید الابرار [۳]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا یہ شرف آغا صاحب کیلئے سرمایۂ افتخار ہے۔ اور وہ اپنے اس شرف کے سامنے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں وہ رسالت مآب کی غلامی پر اس طرح فخر کرتے ہیں۔

" زباں دراز فقیہو! مری طرف دیکھو

کہ بارگاہ رسالت میں باریاب ہوں میں۔ [۴]

۱-۲ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۱۵ / ۱۲

۳ " " " ص نمبر ۲۳

۴ " " " ص نمبر ۳۴

"لکھتا ہوں نعت سرورِ کونین روز و شب
شورش مجھے قصیدہ نگاری ہے ناپسند" [۱]

"حق بات کے اظہار سے رکتا نہیں شورش | جھکتا نہیں شورش
مومن کیلئے ہیچ ہے خوفِ رسن و دار | یا سید الابرار" [۲]

"یہ جرم مجھ فقیر سے ہوگا نہ حشر تک
اربابِ اختیار کی مدح و ثنا کروں

اس سے بڑا گناہ نہیں اس زمین پر
جو لوگ راہزن ہیں انہیں رہنما کروں" [۳]

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم جس احترام و ادب اور اخلاص و محبت کا تقاضا کرتی ہے آغا صاحب نے اس کو ملحوظ رکھا ہے۔ شورش کاشمیری کی زندگی متنبیؐ غلام احمد قادیانی اور اس کی کاذب امت کے محاسبے میں گزری اس سلسلے میں وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ جس کی وجہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا عشق ہے اور ان کی نعت گوئی کا محرک بھی یہی عشق کا جذبہ ہے۔ جس کی تاثیر ان کی نعت کا وصف خاص ہے۔

اور ان کی ہر نعت میں یہ خوبی موجود ہے۔ مثلاً

"رحمتِ باری جھوم رہی ہے۔ | روئے منور چوم رہی ہے۔
آگیا کالی کملی والا | صلی اللہ علیہ وسلم
گردشِ دوراں زیرِ قدم ہے | گردنِ میر و سلطاں خم ہے
ارض و سما میں دھوم اس کا | صلی اللہ علیہ وسلم" [۴]

۱؎ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۳۶
۲؎ " " " ص نمبر ۲۴ - ۳۱
۳؎ " " " ص نمبر ۱۹

اسی طرح یہ نعت

"اونٹوں کے چرانے والوں نے اُس شخص کی صحبت میں رہ کر
قیصر کے تخت کو روندا، کسریٰ کا گریباں چاک کیا
اُس نام کی عظمت عرش پہ ہے اُس شخص کا چرچا فرش پہ ہے
وہ ذات نہیں تو کچھ بھی نہیں قرآن کی ہر آیت سے کھلا"[۴۴]

"اس ذات پہ حجت ختم ہوئی، نبیوں کی شہادت ختم ہوئی
یعنی کہ نبوت ختم ہوئی، پھر کوئی نہ اس کے بعد آیا"[۴۵]

غرض آغا صاحب نے کتاب کے اِس حصے میں نعت گوئی کے جملہ رموز کو ملحوظ رکھا ہے۔

اِس کتاب کا دوسرا حصہ اُن نظموں پر مشتمل ہے جو بریلوی علماء سے اختلاف ہونے پر لکھا گیا۔ اِس جھگڑے کی تفصیل پہلے آ چکی ہے۔ اِس کتاب میں آغا صاحب نے خود "فی سبیل اللہ فساد" کے عنوان والی نظم پر یہ نوٹ تحریر کیا ہے جس سے اِس حصے کے سارے کلام کے پس منظر کا پتہ چلتا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"بریلی کے علمائے تکفیر، پنجاب مرحوم کے بعض شہروں میں زبان درازی کی
اِس حد پر آ گئے تھے کہ اُن کے نزدیک حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رح
شیخ الاسلام رشید احمد گنگوہی رح۔ شیخ الحدیث علامہ انور شاہ رح
شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح۔ شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح
حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رح۔ شیخ التفسیر مولانا احمد علی رح
امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رح اور انتہا یہ ہے کہ رئیس المجاہدین
شاہ اسمٰعیل شہید رح بھی کافر و ملحد تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ہ

۴۴۔ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۱۷

۴۵۔ " " " ص نمبر ۱۶

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

اِن خود فروش راعظوں کا یہ سلسلہ سب وشتم تقریری و تحریری میرے سامنے آیا تو انتہائی صدمہ اور اِس کے ساتھ تعجب ہوا کہ اِس قسم کی خود کاشتہ نسل بھی یہاں موجود ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل ۲۹، اشعار اِس محاسبہ کا حرفِ آغاز تھے۔ جو اِس خانوادۂ تکفیر کی مدارات کیلئے اِس آرزو کے ساتھ بے اختیار زبان پر آگئے تھے۔ کہ

شاید کہ اتر جائے کسی دل میں مری بات [1]

اِن ہی خیالات کو آغا صاحب نے اِس طرح نظم بھی کیا ہے۔

"دل میں اگر ملال نہ لائیں بریلوی — باتیں کرونگا اُن سے یقیناً کھری کھری
کافر گری کی رسم پہ نازاں ہے کون شخص — کس خاندانِ علم کا شیوہ ہے بت گری
کچھ یاد بھی ہے دین فروشانِ عصرِ نَو — کیونکر دلوں سے شرم رسولِ خدا گئی
نانوتوی پہ کفر کا فتویٰ ؟ حیا کرو! — توہین کر رہا ہے رسالت کی تھانوی
دشنام ہو گئے ہیں کمالاتِ دیوبند — تکفیر کا شکار ہیں ایمان و آگہی
سرخیلِ ملحداں ہیں شہیدانِ بالاکوٹ ؟ — یارانِ خود فروش! اندازِ خودسری ؟
احمد علی کی ذات پہ کیچڑ اچھال کر — کرتے ہو ایک عاشق صادق کی ہمسری
کل تک تھے آپ لارڈ کلائیو کے خانہ زاد — پاتے تھے خاندانِ حکومت سے راہبری

یہ خیالات چونکہ اِس جھگڑے کی بنیاد ہیں۔ لہذا آغا صاحب نے اِن خیالات کو تکرار کے ساتھ باندھا ہے اور بہت سی نظموں میں اِن خیالات کی تکرار ملتی ہے۔ آغاز میں یہ جھگڑا بڑا ہی معمولی تھا۔ لیکن

---

[1] چہ قلندرانہ گفتم — ص نمبر ۴۳
[2] " " " — ص نمبر ۴۳ / ۴۴

آہستہ آہستہ یہ مسئلہ دیوبندی اور بریلوی مسلک کے اختلاف کی صورت اختیار کر گیا۔ اور پورا پاکستان اِس لپیٹ میں آگیا۔ ہر جگہ جلسے اور وعظ ہونے لگے۔ آغا شورش صاحب کو اگرچہ دیوبندی مسلکِ فکر کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن جہاں تک تحریر و تقریر کا تعلق ہے۔ انہوں نے یہ جنگ تنہا لڑی۔ بریلوی مسلک کے بعض جوشیلے اور ناپختہ ذہن لوگوں نے آغا صاحب کی تقریر و تحریر کا مقابلہ کرنا چاہا اور وہ اپنے جوش۔ ناسمجھی اور ناتجربہ کاری کی بنا پر گالی دینے میں کوسوں نکل گئے۔ لیکن آغا صاحب کے ادبی چٹکلوں۔ سیاسی چوٹوں مذاق کی رنگینی۔ طنز کی سنگینی اور ذکاوت کی لطافت کا جواب نہ لا سکے۔ بریلوی مکتبۂ فکر کے بہت سے لوگوں نے اِس معرکے میں حصہ لیا لیکن آغا صاحب۔ ظفر علیخاں کے تکلّف کی طرح ساری پتنگوں سے اکیلا ہی لڑا اور صحیح سلامت واپس اتر آیا۔ جناب شورش کاشمیری نے اپنے کلام میں جس بات کو بطورِ خاص مدِّنظر رکھا ہے۔ وہ اِس کا ادبی پہلو ہے۔ انہوں نے اپنے مخالفین کیلئے کوئی بھی سنگین یا تلخ لفظ استعمال نہیں کیا لیکن جہاں تک شوخی اور تیزی کا تعلق ہے وہ اپنی پوری رعنائی کے ساتھ اُن کے کلام میں موجود ہے مثلاً

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجئے دہن بگڑا[۱]

اِسی مشہور زمین میں آغا صاحب نے اِس طرح طبع آزمائی کی ہے۔

زباں بگڑی۔ قلم بگڑا۔ روش بگڑی چلن بگڑا
خود اپنے ہاتھ سے کافر گروں کا پیرہن بگڑا
چلا تکفیر کا جھکڑ کہ شرق و غرب کانپ اٹھے
اٹھی دشنام کی آندھی مزاج اہرمن بگڑا

۱۔ چہ قلندرانہ گفتم ص ۴۳۰/۴۴

یہی وہ لوگ ہیں جو وارثِ احمد رضا خاں ہیں
انہی کی خوبیٔ گفتار سے رنگِ چمن بگڑا [۱]

"مزاج اہرمن" "بگڑا" اور "خوبیٔ گفتار" سے چمن کے رنگ کا بگڑ جانا اپنے اندر جو بلاغت رکھتا ہے۔ اسے طنز کی بہترین شکل کہنا چاہئیے اسی طرح یہ شعر دیکھئے

"زباں دراز فقیہو! یہ بات یاد رہے
تمہاری توند کمر سے ملا کے چھوڑوں گا" [۲]

صورت پہ زاہدانہ پیوست کی سلوٹیں   فطرت میں راہبانہ ارادوں سے ابتری [۳]

چہرے پہ ہے شکن تو زباں پر خروش ہے
منبر پہ لازماً کوئی بدعت فروش ہے۔ [۴]

آغا صاحب نے جہاں چٹکی لی ہے وہاں ان کی تصویر بھی کھینچی ہے کہ مزاروں کی روٹیاں کھا کھا کر بے فکرے اور تنومند نام نہاد مذہبی رہنما کیسے ہوتے ہیں۔ آغا صاحب نے اِن نام نہاد عالموں جعلی پیروں۔ مزاروں کے مجاوروں اور دین فروش واعظوں کی کارگزاری کی عکاسی بھی بڑے ہی دلکش انداز میں کی ہے۔

"وہ میلاد کی محفل ہو تو ناغہ نہیں کرتے
ملتا ہے مریدوں سے تن و توش کا چارا
رندانِ سیہ مست کو حجروں میں بلا کر
دیتے ہیں مریدانِ تہی دست کو لارا" [۵]

۱	چہ قلندرانہ گفتم	ص نمبر ۵۲
۲	″ ″ ″ ″	ص نمبر ۵۹
۳	″ ″ ″ ″	ص نمبر ۴۶
۴	″ ″ ″ ″	ص نمبر ۴۹
۵	″ ″ ″ ″	ص نمبر ۶۱

"مار کر ڈالو مریدانِ ارادت کیش پر
خلوتوں میں مسکراؤ کیا یہی اسلام ہے؟
آئے دن خلوت کدوں میں نقدِ عصمت لوٹ کر
اپنے حجروں کو سجاؤ، کیا یہی اسلام ہے؟ ۱؎

کیا پوچھتے ہو اُمتِ اعلیٰ رضا کا حال
اندر سے داغدار تو باہر سے چمپٹی
ریش دراز، زلفِ چلیپا سے فیضیاب
اُس لعبتِ فرنگ کے شوہر کی ڈوگی" ۲؎

"شیخ کھاتے ہیں چادرِ زہراؓ — جاں چھڑکتے ہیں نوش جمالوں پر
دل سیہ خانۂ ہوس کا شکار — روسیاہی سفید بالوں پر" ۳؎

"نو شگفتہ کوپلوں کو خواہشِ اولاد پر
اپنے پہلو میں بٹھاؤ کیا یہی اسلام ہے" ۴؎

"سیم تنیانِ زلیخا کی جواں سالی کو
شیخ کی ریشِ حنائی سے گلا ہے یارو
شہر کے نام پہ جو لوگ دغا کرتے ہیں
اُن سے کہہ دو کہ خدا دیکھ رہا ہے یارو" ۵؎

"حنائی جھالروں کے پیچ و خم سے سرکشی نکلی
سیاسی تربتوں پر زائروں کا جمگھٹا دیکھا

۱تا۳؎ چہ فلسفہ را نہ گفتم — ص نمبر ۷۹ - ۸۹ - ۹۱
۴؎ . . . — ص نمبر ۸۱
۵؎ . . . — ص نمبر ۹۸ / ۹۹

بہت سے لوگ دیکھے کارگاہِ خود فروشاں میں
قلم کی آبرو کے دشمنوں کو رہنما دیکھا"[۱]

یہ اشعار "اِس بازار" میں عید میلاد النبیؐ کی ایک محفل کا نقشہ ہیں۔

کر رہے ہیں دخترانِ معصیت کو سلمش
شہسوارانِ خطابت مجلہ گفتار میں

آنچلوں کی سرسراہٹ سے عبائیں شرمسار
عقدہ ہائے ناکشودہ طرّۂ دستار میں

دائیں بائیں کے مکانوں میں ہوس محوِ نشاط
محو ہے ہیں شیخ جی الفاظ کے انبار میں

چند آوارہ لطائف، چند نامربوط شعر
تاجرانِ منبر و محراب کے افکار میں"[۲]

"بزعمِ خویش زہد واتقا کے بیج بوتے ہیں۔
خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر ایسے ہوتے ہیں"[۳]

آغا صاحب کے اِس مجموعۂ کلام کی زبان بڑی ہی شوخ وشگفتہ ہے انہوں نے اِس مسئلے پر ایک نیا لغت ایجاد کیا ہے۔ آغا صاحب نے اِس مجموعے میں اپنی خطابت کی صلاحیت سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اِس میں استفسار "تلخ نوائی معاف" اور "تم بھاگتے کیوں ہو" کے عنوان سے جو نظمیں دی گئی ہیں وہ خطابت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

" او خدا ناآشناؤں کے گروہِ نامراد!
اک ذرا مجھ کو بتاؤ کیا یہی اسلام ہے؟

۱-۲ے چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۱۰۰ — ۱۰۷

۳ے " " " ص نمبر ۹۳

اِس خدا کی سرزمین پر اے کینہ ورزانِ دیں
چادرِ زہرا رض چراؤ ، کیا یہی اسلام ہے؟[۱]

" بریلی کے ہتو! نامِ خدا سے بھاگتے کیوں ہو
خطا کے بعد انجامِ خطا سے بھاگتے کیوں ہو
اگر تم پاک داماں ہو تو میداں میں چلے آؤ
سواعظ بیچنے والو دغا سے بھاگتے کیوں ہو"[۲]

" بزدلو! نانوتوی کا خون ہے تم پر حلال
ظالمو! یہ خونِ طیب راس آ سکتا نہیں ہے"[۳]

آغا صاحب کے اِس مجموعۂ کلام کا آخری حصہ سیاسی نظموں پر مشتمل ہے جو اُس زمانے کی سیاسی صورتِ حال سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ اِس حصہ میں قابلِ ذکر دو نظمیں علامہ اقبال کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ ایک کا عنوان ہے "ساقی نامہ" اور دوسری "خمار خانہ" ہیں ان دونوں نظموں کو آغا صاحب کی سیاسی شاعری کی نمائندہ نظمیں قرار دیا جا سکتا ہے مجموعی طور پر یہ کتاب اسم با مسمیٰ ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد واقعی قلندرانہ لہجے کا احساس ہوتا ہے اِس لحاظ سے یہ آغا صاحب کی منفرد کتاب ہے۔

اِن کتابوں کے علاوہ کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جنہیں آغا صاحب نے ترتیب دیا یا ان پر دیباچہ لکھا

۱۔ خطباتِ احرار

یہ کتاب قائدِ احرار چوہدری افضل حق مرحوم اور مولانا مظہر علی اظہر کے صدارتی خطبات کا مجموعہ ہے۔ جسے آغا صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ اور دیباچہ بھی لکھا ہے۔ یہ کتاب مکتبہ احرار لاہور نے شائع کی ہے۔

---

[۱] چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۷۹ / ۸۰
[۲] " " " ص نمبر ۹۶
[۳] " " " ص نمبر ۲۴۷

۲- میرا افسانہ حصہ دوم

یہ چوہدری افضل حق کی کتاب ہے جس میں انہوں نے اپنے حالاتِ زندگی لکھے ہیں۔ آغا صاحب نے اس کتاب کا ۱۶ صفحات کا دیباچہ "غریبِ شہر سخن ہائے گفتنی دارد" کے عنوان سے تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب بھی مکتبۂ احرار نے شائع کی ہے۔

۳- اقبال پیامبر انقلاب

یہ کتاب علامہ اقبال پر لکھے گئے چودہ مقالات پر مشتمل ہے۔ آغا صاحب نے مرکزیہ مجلسِ اقبال کے سیکرٹری کی حیثیت سے اسے ترتیب دیا ہے۔ اور "اقبال ایک عہد ایک تحریک" کے عنوان سے اس کا پیش لفظ لکھا ہے۔ جو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے۔

۴- خطباتِ ابوالکلام

مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات کا مجموعہ جسے آغا صاحب نے محمد طفیل مدیر نقوش اور لطیف فاروقی مدیر زراعت کی خواہش پر مرتب کیا[1]

۵- ہاتھ کی لکیریں

یہ ایم۔ اے مالک صاحب کی کتاب ہے جو علم نجوم سے متعلق ہے۔ آغا صاحب نے اس کا تعارف لکھا ہے۔

۶- سرمایہ داری

عبداللہ ملک صاحب کی کتاب ہے۔ اس کا دیباچہ آغا صاحب نے لکھا ہے۔ اور یہ دیباچہ عبداللہ ملک صاحب نے اپنی کتاب شورش بنام عبداللہ ملک میں بھی نقل کیا ہے۔

غیر مطبوعہ: ان کتابوں کے علاوہ آغا صاحب نے پاکستان میں بننے والی ایک فلم "غالب" کے مکالمے بھی تحریر کئے ہیں غیر مطبوعہ کتابوں میں "مولانا ابوالکلام آزاد۔ سوانح و افکار" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

---

[1] بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں ص نمبر ۴۱۸

اِس کتاب کے متعلق آغا صاحب نے لکھا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ میں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح و افکار پر ایک جامع کتاب اپنے مطالعے کی تمام وسعتوں کو سمیٹ کر سپردِ قلم کی ہے۔ فل سکیپ سائز کے ۷۰۰ صفحوں کا مسودہ ٹائپ ہوا ہے اور اِس وقت زیرِ کتابت ہے۔"[۱]

لیکن یہ کتاب ابھی تک شائع نہیں ہو سکی۔ آغا صاحب کی وفات کے بعد جناب مسعود شورش نے اِس کتاب کے کئی اقتباس ہفت روزہ چٹان میں شائع کئے۔ ۱۹۷۵ء کے ایک شمارے میں اِسی کتاب کے ایک اقتباس کے آغاز میں مندرجہ ذیل عبارت جلی حروف میں درج ہے۔

"آغا شورش کاشمیری مرحوم کی زیرِ طبع کتاب

"مولانا ابوالکلام آزاد" کا ایک باب

عظیم خطیب

• آزاد خطابت کی ہر ادا میں ڈھلے ہوئے تھے

• وہ قدیم و جدید کے محاسن کا امتزاج تھے

• وہ شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا اور سب کے رفیق تھے۔"[۲]

راقم الحروف نے جناب مسعود شورش صاحب سے خود اِس کتاب کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ابھی اِس کتاب کے شائع ہونے میں دیر لگے گی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ آغا صاحب کے کچھ مسودے اور تحریریں بھی ہیں جنہیں کوئی عنوان نہیں دے سکا۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ اِن مسودات کی کوئی صورت بن سکے

اسلام کی سرگزشت

حضرت مجدد الف ثانیؒ سے سید ابوالاعلیٰ مودودی تک۔ اِس کتاب کے متعلق آغا صاحب لکھتے ہیں۔

---

۱ ہفت روزہ چٹان ۲ جون ۱۹۷۵ء

۲ ... یکم دسمبر ۱۹۷۵ء

دو اسلام کی سرگذشت حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لے کر ابوالاعلیٰ مودودی تک ہے۔ اس کا خاکہ تیار ہو چکا ہے۔ تمام مواد یکجا کر لیا ہے۔ حواشی بھی مدون کر لیے ہیں دعا کیجئے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت قلم کی معاون ہو آمین ثم آمین

اس کے علاوہ آغا صاحب ہندوستان کے حریت پسندوں کی ایک تاریخ لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے اس سلسلے میں ہفت روزہ چٹان میں یہ اشتہار چھپتا رہا ہے۔

"ان لوگوں کی تاریخ"

جنہیں آج تک تذکروں نے اپنے دامن میں جگہ نہیں دی

آغا شورش کاشمیری نے منتخب اہل قلم کے ایک بورڈ کی معیت میں ان سرفروشوں بہادروں، دلیروں اور شہیدوں کے حالات و افکار کا ایک تذکرہ لکھنے کا تہیہ کیا ہے۔ جو مختلف مکاتیب فکر کے پرچم تلے برٹش سامراج کے خلاف جد وجہد کرتے رہے جانیں قربان کیں، سنگین قیدیں کاٹیں۔ لیکن آزادی کے بعد ہندوستان کے فرمانرواؤں نے انہیں مسلمان ہونے کے جرم میں طاق نسیان پر رکھ دیا۔ پاکستان کے رجعت کاروں نے ان کے وجود کو اپنے ماضی کے خلاف ترنالے کا ایک تھپیڑا سمجھا۔ اور مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے انکی گمنامی و افلاس کو اپنے قلم کی حیثیت سے فروتر خیال کیا۔ یہ گمنام مجاہد ہر جماعت میں موجود تھے۔ ان کا ضخیم تذکرہ، خلافت۔ خاکسار، احرار، اتحادِ ملت، جمعیۃ العلما اور مسلم لیگ وغیرہ کے ماضی سے تیار ہو سکتا ہے۔ سرحد، سندھ، بلوچستان، پنجاب اور بنگال کے احباب سے درخواست ہے کہ وہ ان کارکنوں کی تصاویر و حالات سے مطلع فرمائیں تاکہ یہ کتاب جلد سے جلد تیار ہو سکے اور کوئی رہنما کار یا کارکن ایسا نہ رہے جس کا تذکرہ اسمیں شامل نہ ہو۔

لے ہفت روزہ چٹان ۲ جون ۱۹۶۵ء

عبدالسلام ملک

جنرل مینیجر

مطبوعات چٹان ۸۸ میکلوڈ روڈ ۔ لاہور[۵]

لیکن یہ منصوبہ پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اگر یہ تذکرہ لکھا جاتا تو یقیناً کام کی چیز ہوتا۔ اِن غیر مطبوعہ کتابوں کے بارے میں آغا صاحب نے خود بھی اشارے کئے ہیں۔ انہوں نے اِس سلسلے میں انور عارف صاحب کو ایک انٹرویو میں بتایا

" ا ـــ آغا صاحب! آپ نے اپنی کئی کتابوں کا بارہا اعلان کیا لیکن ابھی تک چھپ کر نہیں آئی ہیں۔ لوگ شوقِ انتظار میں مبتلا ہیں آخر یہ کتابیں آپ نے لکھی ہیں؟ یا محض لوگوں کے شوق کو تیز کیا جا رہا ہے۔؟

ش ـــ میرے ذہن میں کئی ایک کتابوں کے خاکے ہیں اور اِن میں بعض کتابیں نہایت اہم ہیں بلکہ میں انہیں اپنی زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں لیکن مجھ میں ایک نقص ہے۔ کہ مدتوں مضمون کی موجودگی کے باوجود اسلوب کی تلاش میں رہتا ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کوئی اچھوتا اسلوب مل جائے۔

میرا اصل موضوع شخصیات ہیں ایک مدت سے مولانا ابوالکلام آزاد کے سوانح و افکار پر ایک تفصیلی کتاب لکھنا چاہتا ہوں، کئی ایک سٹائل ذہن میں ہیں لیکن دماغی پریشانیوں نے اب تک یکسو ہونے کی مہلت نہیں دی ہے۔

مولانا آزاد کے متعلق میرا خیال ہے کہ وہ ایشیا میں ابن تیمیہ رحؒ کے ثانی تھے اور ہندوستان میں دوسرے سقراط ـــ جنہیں قوم کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا۔

---

۵ ہفت روزہ چٹان ص نمبر ۸ ۷ فروری ۱۹۶۶ء

دوسری کتاب میرے ذہن میں علامہ اقبال کے متعلق ہے اِس کا پورا خاکہ مرتب کر چکا ہوں۔ قلم اٹھانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ بعض حوادث پیش آ گئے۔ تیسری کتاب جو میرے ذہن میں پرورش پا رہی ہے وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کے احوال و کوائف کی تاریخ ہے۔ اِس غرض سے میں نے ایک ہزار کے لگ بھگ کتابیں جمع کی ہیں۔ کئی سو صفحے کے اشارات لکھ چکا ہوں لیکن قلم کو حرکت نہیں ہوتی ہے۔

اِس کے علاوہ کئی ایک کتابیں ذہن میں ہیں مثلاً اِس برِ عظیم کے بعض مشاہیر جن سے میری رسم و راہ رہی۔ یا جن کا بلا واسطہ اور بالواسطہ مطالعہ کیا اِن پر ایک کتاب لکھنا چاہتا ہوں، میرا خیال ہے یہ کتاب ایک عمدہ شخصی مطالعہ ہوگا جس سے تذکرہ و تاریخ کو بہت سے گم شدہ پہلو مل جائیں گے لیکن یہ تمام کتابیں صحت اور فرصت چاہتی ہیں میں عمر کی اس منزل میں ہوں جب طبیعت تھک کے آرام چاہتی ہے۔ خدا نے زندگی اور ہمت دی تو اِن کتابوں کو ضرور مکمل کروں گا۔[۱]

جناب اختر کاشمیری نے آغا صاحب کی تصانیف اور ہفت روزہ چٹان کے صفحات، سطور اور الفاظ کی تعداد کا یہ گوشوارہ بنایا ہے۔ لیکن یہ گوشوارہ مکمل نہیں۔ کیونکہ اِس گوشوارے میں آغا صاحب کی کتابیں۔ "جذباتِ شورش"۔ "فنِ خطابت" اور "مرزائیل" اور وہ تمام دیباچے جو آغا صاحب نے مختلف کتابوں پر لکھے تھے اور جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ اس میں شامل نہیں ہیں۔

۱؎ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۱۴

نمبر شمار	نام کتاب	صفحات	سطور	الفاظ	میزان
۱	پٹھان	۳۶۴۰	۱۸۵۶۴۰	۱۹۳۲۰۴۰	۱۹۳۲۰۳۰
۲	بوئے گل	۵۳۴	۱۰۲۱۴	۳۴۳۹۴	۱۹۶۶۵۳۴
۳	ظفر علی خان	۲۲۲	۴۲۳۹	۵۵۰۸۱	۲۰۲۱۶۱۵
۴	اس بازار میں	۲۴۰	۴۰۸۰	۲۸۵۶۰	۲۰۵۰۱۷۵
۵	میاں افتخار الدین	۶۴	۱۰۸۸	۱۶۳۲۰	۲۰۶۶۴۹۵
۶	تمغۂ خدمت	۱۳۸	۲۳۴۶۰	۳۵۱۹۰	۲۱۰۱۶۸۵
۷	حسین شہید سہروردی	۱۳۲	۲۶۴۰	۱۲۹۰۴۰	۲۱۳۰۷۲۵
۸	نورتن	۱۹۱	۴۰۱۱	۴۴۱۲۱	۲۱۷۴۸۴۶
۹	حمید نظامی	۱۱۲	۱۹۰۴	۲۶۶۵۶	۲۲۰۱۵۰۲
۱۰	قید فرنگ	۹۶	۱۶۳۲	۲۷۷۴۴	۲۲۲۹۲۴۶
۱۱	گفتنی ناگفتنی	۲۷۲	۵۱۶۸	۹۸۱۹۲	۲۳۲۷۴۳۸
۱۲	الجہاد والجہاد	۱۱۲	۲۱۲۸	۳۱۹۲۰	۲۳۵۹۳۵۸
۱۳	چہ قلندرانہ گفتم	۱۴۴	۲۷۳۶	۱۴۳۷۷۶	۲۴۰۳۱۳۴
۱۴	تحریک ختم نبوت	۲۵۶	۵۸۸۸	۱۰۱۱۸۷۲	۲۵۱۵۰۰۶
۱۵	موت سے واپسی	۳۰۴	۳۹۲۰	۹۵۷۶۰	۲۶۱۰۷۶۶
۱۶	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	۲۹۸	۶۲۵۸	۱۰۱۲۶۴۴	۲۷۲۳۴۱۰
۱۷	پس دیوار زنداں	۴۳۲	۸۲۰۸	۱۰۷۲۳۶۸	۲۸۹۵۷۷۸
۱۸	اقبال اور قادیانیت	۹۶	۲۰۱۶	۴۲۳۳۶	۲۹۳۸۱۱۴
۱۹	عجمی اسرائیل	۴۱	۵۷۴۰	۱۳۹۴۰	۲۹۵۲۰۵۴
۲۰	اسلام کے غدار	۳۲	۶۴۲۰	۹۶۶۰	۲۹۶۱۷۱۴
۲۱	فیضانِ اقبال	۴۴۲	۶۳۶۰	۶۰۳۶۰۰	۳۰۲۵۳۱۴
۲۲	اقبالی مجرم	۷۰	۴۸۸۰	۱۰۹۵۸۰	۳۰۴۴۸۹۴
۲۳	دہلی چلو	۲۲۳	۴۲۳۷	۵۵۰۷۱	۳۰۹۹۹۶۵
۲۴	شب جائے کہ من بودم	۲۱۲	۴۰۲۸	۶۰۴۲۰	۳۱۶۰۳۰۵
میزان		۸۰۸۱	۲۶۱۵۴۲	۳۲۲۰۸۰۵	۳۲۲۰۸۰۵
متفرق	اسرار بصری اور دوسرے تاثرات	۲۰۰۰	۳۰۶۱۶۴۰	۲۱۶۹۸۴۰	۵۲۹۰۶۴۵

ہفت روزہ چٹان ۲۶ / اکتوبر ۱۹۸۱ء ص نمبر ۷

باب ۴

شاعری

شورش کاشمیری بطور شاعر

جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے آغا شورش کاشمیری ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے اور چھٹی جماعت ہی سے اخبار زمیندار کے مطالعے کی وجہ سے طبیعت کا رجحان شعر وادب کی طرف مائل ہوگیا۔ ۱۹۳۲ء میں میٹرک کے امتحان کے بعد انہوں نے شعروادب کی طرف خاص توجہ دی اور اساتذہ کا کلام اکثر زیر مطالعہ رہا۔ اس زمانے میں لاہور میں ادب کے دو معروف حلقے تھے۔ ایک نیاز مندان لاہور کا حلقہ تھا جس میں تاثیر۔ پطرس۔ سالک۔ غلام مصطفےٰ تبسم۔ ہری چند اختر اور حفیظ جالندھری شامل تھے[1]۔ اور اس کے مقابلے میں دوسرا علامہ تاجور نجیب آبادی کا حلقہ تھا جس میں وقار انبالوی۔ فاخر ہریانوی۔ روش صدیقی۔ اختر شیرانی اور احسان دانش ایسے شعرا شامل تھے[2]۔ سیماب اور ساغر نظامی تو نیاز مندان لاہور کی تاب نہ لاتے ہوئے لاہور چھوڑ گئے لیکن علامہ تاجور نجیب آبادی اور ان کے رفقاء نے اس ادبی معرکہ آرائی میں بڑی استقامت دکھائی۔ جس کی وجہ سے لاہور میں خاص طور پر اور پنجاب میں عام طور پر نئی نسل میں شعر وشاعری کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" اور مہر و سالک کے اخبار "انقلاب" کی چشمک میں بھی لاہور کے ان دو حلقوں سے متعلق شعرا نے بڑا حصہ لیا۔ اس سلسلے میں مولانا ظفر علی خان کا مقابلہ چونکہ بڑا مشکل کام تھا لہذا سالک صاحب کی امداد کے لئے نیاز مندان لاہور کے اراکین نے فلمی نام رکھ کر ان صاحب کا ہاتھ بٹایا جبکہ تاجور نجیب آبادی اور اختر شیرانی نے اس ادبی لڑائی میں مولانا ظفر علی خان کا ساتھ دیا[3]۔ اس چشمک اور ادبی محاذ آرائی نے شعروادب کے ذوق کو عام کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ اسی طرح لاہور کے معروف ادبی رسائل نے بھی اس ادبی فضا کو پروان چڑھایا۔ جس میں شورش کاشمیری نے اپنی شاعری کا آغاز کیا۔ ان رسالوں میں "نیرنگ خیال"، "عالمگیر" اور ماہنامہ "ہمایوں" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ عام اردو شاعری میں مغربی تاثرات کے تحت نئے نئے تجربات بھی کئے جا رہے تھے۔ جس میں حفیظ جالندھری۔ عظمت اللہ۔ اور اختر شیرانی نے خاص طور پر نئے تجربوں پر توجہ دی اور گیت۔ سانیٹ۔ مکالمے۔ نظم معریٰ وغیرہ میں طبع آزمائی کی۔ ان شعرا کے علاوہ جگر۔ فراق

[1،2] بحوالہ بوئے گل ص نمبر ۶۴

[3] بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند جلد نمبر ۱۰ ص نمبر ۵۲۷

یگانہ اور فانی نے غزل میں نئے میلان کو عام کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔[1] لیکن اردو شاعری میں علامہ اقبال کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ اس پورے دور پر ان کی شاعری کی چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ عام طور پر اردو شاعری میں اقبال کے بعد جو جدیدیت شروع ہوئی نیز جو نئے نئے تجربات آج تک ہو رہے ہیں اور جن پیمانوں کو جدت، زندگی کی ترجمانی۔ انسان دوستی۔ مزدوروں کی فلاح اور عام انسانیت کی بقا کا نام دے کر ادب کو پرتاثیر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ دراصل اقبال کی شاعری اور شخصیت سے شکست خوردگی کی دلیل ہے۔ اقبال کے اشعار اپنے فلسفہ و فکر کی وجہ سے آج بھی اتنی توانائی رکھتے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا شاعر اپنی تمام تر جدیدیت اور ترقی پسندی کے باوجود اس سے لگا نہیں کھاتا۔ دراصل یہ سب پیمانے ایک بے بسی کا اظہار ہیں چونکہ اقبال کی طرح شعر کہنا ممکن نہیں۔ لہٰذا ترقی پسندی اور جدیدیت کی اساس پر نئے نئے تجربے اس لئے بھی کئے جا رہے ہیں کہ ان تجربوں کو ادب میں منفرد مقام حاصل ہو سکے۔ بہرحال آغا صاحب نے جب ہوش سنبھالا۔ اس وقت لاہور کی ادبی فضا میں علامہ اقبال کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، اختر شیرانی۔ حفیظ جالندھری۔ ڈاکٹر تاثیر۔ علامہ تاجور نجیب آبادی اور احسان دانش ایسے شعرا موجود تھے۔ اور آپس کی نوک جھونک کا سلسلہ بھی چلتا رہتا تھا۔ آغا صاحب چونکہ بچپن ہی سے مولانا ظفر علی خان سے حد درجہ عقیدت رکھتے تھے لہٰذا شاعری میں ان کا رجحان شروع ہی سے مولانا ظفر علی خان کی طرف تھا۔ نیاز مندان لاہور چونکہ سالک صاحب کے ساتھ تھے اور مولانا ظفر علی خان سے ادبی چشمک رکھتے تھے، قدرتی طور پر آغا صاحب بھی مولانا ظفر علی خان کی محبت اور عقیدت کی وجہ سے نیاز مندانِ لاہور کی بجائے علامہ تاجور نجیب آبادی کے طرف داروں میں شامل ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پہلے پہل اختر شیرانی اور علامہ تاجور نجیب آبادی سے اپنے اشعار پر اصلاح لی۔ جبکہ آغا صاحب کے باقاعدہ استاد احسان دانش تھے جن کا شمار بھی نیاز مندان لاہور کے مخالفین میں ہوتا تھا۔ آغا صاحب ابھی شاعری کے راستے پر گامزن ہی ہوئے تھے کہ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کی تحریک میں سیاست کی وادئ پرخار میں قدم رکھ دیا جس کی وجہ سے اب وہ سیاست کے ہو گئے۔ اور قید و بند کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ مختلف اوقات میں ۱۹۴۵ء تک جیل میں رہے۔ اور اس سارے عرصے میں بہت کم مدت جیل سے باہر گزاری۔ اس طرح انہیں ادبی محفلوں۔ ادبی تنظیموں اور ادبی تحریکوں میں شمولیت کا

---

[1] بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند جلد نمبر ۱۰ ص نمبر ۵۲۷

موقع ہی نہیں مل سکا۔ لیکن جیل میں انہوں نے اردو ادب کا کارآمد حصہ ضرور پڑھ ڈالا۔ ۱۹۴۶ء میں وہ جب مجلس احرار کے اخبار "آزاد" کے مدیر مقرر ہوئے تو پھر شاعری کی طرف توجہ دی۔ لیکن باقاعدہ شاعری کا آغاز "چٹان" کے اجرا کے ساتھ کیا۔ اس وقت تک آغا صاحب کے ذہن پر ملک کے بڑے بڑے ادیبوں۔ خطیبوں۔ صحافیوں اور سیاستدانوں کی چھاپ لگ چکی تھی۔ آغا صاحب مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے عقیدتمند تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد خاص طور پر آغا صاحب کی محبوب شخصیت تھے۔ اس وجہ سے انہوں نے مولانا کی تحریک احیائے اسلام کیلئے اپنے کو وقف کر دیا۔ علامہ اقبال بھی چونکہ یہی درس دیتے تھے لہذا علامہ سے بھی آغا صاحب کی محبت اسی بنا پر بڑھتی چلی گئی پھر علامہ اقبال کے ان افکار کے مفسر بن گئے۔ جو مسئلہ ختم نبوت کی اساس ہیں۔ گویا آغا صاحب کی طبیعت کا ایک غیر متزلزل انداز شاعری شروع کرنے سے پہلے ہی بن چکا تھا۔ جس کی بنیاد احیائے اسلام کی تحریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال کے شیدائی بن گئے تھے۔ اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۵ء سے ہوا۔ اور اسی سن سے آغا صاحب کی قید و بند کا سلسلہ چلا۔ جیل خانے میں آغا صاحب نے کمیونزم اور سوشلزم کا گہرا مطالعہ کیا۔ ملک کے بڑے بڑے کمیونسٹ اور سوشلسٹ جیل میں آغا صاحب کے دوست رہے۔ لیکن وہ اسلامی افکار کی روشنی میں اس فلسفے سے متاثر نہ ہوئے بلکہ ملک کے جید علماء سے ارادت بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ وہ عالم دین نہ ہونے کے باوجود علماء اور مذہبی حلقوں میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جانے لگے۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آغا صاحب اسلام کے مقابلے میں ہر فلسفۂ زندگی کو بیکار اور نقصان دہ سمجھتے تھے۔

پھر جب آغا صاحب نے شاعری کا باقاعدہ آغاز کیا تو یہ زمانہ تقریباً ۱۹۵۰ء کا ہے۔ اس وقت تک ترقی پسند تحریک میں اعتدال اور ٹھہراؤ پیدا ہو چکا تھا۔ اس دور کے شعراء نے اب زیادہ بہتر انداز اختیار کر لیا تھا۔ اور ان کی شاعری میں معاشرے کی تعمیر کے سامان بھی نظر آنے لگے تھے۔ لیکن آغا صاحب اس تحریک کے ہمنوا نہ بن سکے۔ اور انہوں نے اپنی پرانی روش کو برقرار رکھا۔ اور احیائے اسلام کی تحریک ہی کے پیرو رہے۔ انہوں نے جن شعراء کی پیروی کی ان میں مولانا ظفر علی خان، علامہ اقبال اور اختر شیرانی بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ جس وقت آغا صاحب نے باقاعدہ شاعری شروع کی اس وقت ملک کے اندر کچھ ادبی حلقے قائم تھے۔ شورش صاحب نے کسی حلقے۔ گروہ

بزم یا مجلس سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ بلکہ ان حلقوں میں موجود شاعروں اور ادیبوں کو اپنے اخبار ہفت روزہ "چٹان" میں تنقید کا نشانہ بناتے رہے۔ اور ان کے لئے "حلقہ ستائش باہمی" کی ترکیب ایجاد کی۔ جس کی زد خاص طور پر ان ادیبوں اور شاعروں پر پڑتی تھی جو پہلے صرف اہل قلم تھے، پھر فنکار ہو گئے اور فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور حکومت میں دانشور کہلانے لگے۔ بقول آغا صاحب

"دانشور کے معنی ہیں جو باتیں زیادہ کرتا ہو۔ حق و باطل کے معرکے میں غیر جانبدار رہے داؤں لگے تو باطل کا ہمنوا ہو۔ لکھتا کم ہو یا پھر لکھتا ہی نہ ہو"[1]

نتیجے کے طور پر ان دانشوروں نے بھی شورش کاشمیری کو نظر انداز کیا۔ چونکہ ذرائع ابلاغ پر زیادہ تر ان ہی دانشوروں کا قبضہ تھا لہذا ادب کی اس سرکاری اجارہ داری، نظریاتی اساس اور مخصوص اغراض و مقاصد کی محفلوں سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ آغا صاحب کو بطور شاعر تسلیم کریں۔ ان لوگوں کے بس میں ہوتا تو وہ آغا صاحب کی شاعری پر ضرور طبع آزمائی کرتے۔ لیکن ان ادیبوں اور شاعروں نے آغا صاحب اور ان کی شاعری، صحافت اور خطابت کو ہمیشہ نظر انداز کیا۔ کیونکہ یہ سب لوگ ان کے قلم کی کاٹ اور لہجے کی درشتی سے واقف تھے اور جانتے تھے کہ شورش کاشمیری ادب کی اس سیاسی قصیدہ نگاری کا سب سے بڑا مخالف ہے۔ جس کا مقابلہ ملک کے سارے اخبارات بھی مل کر نہیں کر سکتے۔ اس طرح ان کی شاعری صرف ان کے ہفت روزہ "چٹان" تک محدود ہو گئی۔

وہ کبھی کسی مشاعرے میں کلام سنانے نہیں گئے۔ ادبی حلقے یا ادبی بزم کے رکن نہ بنے اور نہ ہی ملک کے اخبارات و رسائل نے ان کی شاعری کو جگہ دی۔ کیونکہ وہ مخالفوں کے قبضے میں تھے۔ تاہم اس بے اعتنائی کے باوجود اگر آغا صاحب کی شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان کی شاعری میں ایک بڑا شاعر ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس سے پہلے کہ آغا صاحب کی شاعری پر تبصرہ کیا جائے۔ یہ مناسب

---

[1] شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۰۰

ہوگا کہ آغا صاحب کے زمانے کی عمومی شاعری کا جائزہ لیا جائے ۔

آغا صاحب نے جب ادب کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت مولانا حالیؔ اور محمد حسین آزادؔ کی جدید شاعری کی تحریک عروج پر تھی ۔ اور شاعری میں نئے نئے تجربے ہو رہے تھے ۔ اس دور کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبالؔ تھے ۔ جن کا اثر اردو شاعری پر سب سے زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ۔

ترقی پسند تحریک کا آغاز ۱۹۳۵ء میں علامہ اقبالؔ کی زندگی ہی میں ہو چکا تھا ۔ لیکن علامہ اقبالؔ کی وفات کے بعد ترقی پسند تحریک نے ادب میں بھی انقلابی تبدیلیاں کیں اور شاعری میں ایک نئے رجحان کو عام کیا ۔ علامہ اقبالؔ کے بعد کے شعری افق پر ہمیں ترقی پسند شعرا کا اثر نمایاں نظر آتا ہے ۔ اور یہ اثر اس جذبۂ بغاوت کا تھا جو

"مجازؔ ۔ جوشؔ ۔ فیضؔ ۔ راشدؔ ۔ میراجیؔ ۔ اختر الایمانؔ ۔ علی سردار جعفری وغیرہ میں پوری تابناکی کے ساتھ جلوہ گر ہوا ۔"[1]

بقول ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی

"مایوسی اور ناکامی کا یہ احساس ۱۹۴۷ء کے انقلاب کے بعد اردو شاعری میں جگہ جگہ اور بار بار ملتا ہے ۔"[2]

جس کی وجہ ڈاکٹر صاحب ہی نے یہ بتائی ہے کہ لوگوں کو بجا طور پر بہتری کی توقع تھی مگر آزادی کے بعد ان کی توقعات پوری نہ ہوئیں ۔ بلکہ قتل و غارتگری کا بازار گرم ہوا ۔ اور لوگ بے انصافی اور جبر و استحصال کا شکار ہوئے ۔[3]

اس طرح گویا آغا شورش کاشمیری کی شاعری کا زمانہ دراصل مایوسی اور ناکامی کے احساس کا زمانہ تھا ۔ مگر شورش کاشمیری آزادی کے بعد ان وعدوں ، ان خیالات اور ان تصورات و خواہشات کی تکمیل کے لئے کوشاں نظر آتے ہیں جو آزادی

۱؎ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند جلد نمبر ۱۰ ص نمبر ۷۵۲

۲؎ آج کا اردو ادب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی ص نمبر ۱۷۰

۳؎ ایضاً ایضاً ایضاً

سے پہلے لوگوں سے کئے گئے یا آزادی سے پہلے لوگوں میں موجود تھے۔ شورش کاشمیری کی حکومتوں سے لڑائی کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ پاکستان کو وہی پاکستان دیکھنا چاہتے تھے۔ جس کے لیے لوگوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا تھا۔ مگر قیام پاکستان کے بعد انہیں مایوسی اور ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

جیسا کے پہلے کہا جا چکا ہے کہ آغا صاحب کی شاعری کا آغاز تو بچپن ہی سے ہو چکا تھا۔ مگر باقاعدہ شاعری انہوں نے اپنے ہفت روزہ "چٹان" کے اجرا کے بعد شروع کی۔ اور یہ زمانہ تقریباً ۱۹۵۰ء کا ہے۔ گویا آغا صاحب ۱۹۵۰ء سے پہلے شعر تو کہتے تھے مگر کبھی کبھی۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں "چٹان" کے بہت کم شمارے ایسے ملتے ہیں جن میں آغا صاحب کا کلام نہ چھپا ہو۔ بعض اوقات وہ جیل میں ہوتے مگر ان کا کلام "چٹان" میں موجود ہوتا۔ آغا صاحب کا ابتدائی مجموعہ کلام "جذبات شورش" ہے جو ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔

دوسرا مجموعۂ کلام "گفتنی و ناگفتنی" ہے جو فروری ۱۹۵۶ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا۔ "گفتنی و ناگفتنی" کے دیباچے میں آغا صاحب نے لکھا ہے کہ

> "تقریباً پندرہ برس سیاست میں غارت ہو گئے اس اثناء میں کبھی کبھار شعر ہوتے رہے لیکن خال خال ع
>
> جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
>
> "چٹان" نکالا تو زندگی ایک نئے موڑ پر آ گئی۔ سیاسی شاعری کا اخباری انداز دل و دماغ کو محیط رہا لیکن درمیان میں چند دن "جوانی چناں کہ افتد دانی" نے بھی راہ پائی۔ وہ چیز جو شعر کہلاتی ہے، جذبات میں کروٹیں لینے لگی۔ کئی اثرات جو ذہن میں پہلے سے مرتب تھے ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو کر مصرعوں میں ڈھلنے لگے۔ گویا مصرعوں کی اس ڈھلائی کا نام "گفتنی و ناگفتنی" ہے اور یہی اس کا حسب نسب ہے۔ اس مجموعہ میں جتنی غزلیں یا نظمیں بھی آپ دیکھیں گے۔ ان کی عمر دو چار برس سے زیادہ نہیں۔"[1]

---

[1] گفتنی و ناگفتنی   شورش کاشمیری   ص نمبر ۱۸

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ "گفتنی و ناگفتنی" کا سارا کلام دو چار برس پر محیط ہے۔ اس طرح ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک کا کلام اس مجموعے میں شامل ہے۔ اور اس سے پہلے جو اشعار کبھی کبھار اور خال خال کہے گئے وہ ان کے مجموعۂ کلام "جذبات شورش" کا حصہ ہیں۔ اس طرح "جذبات شورش" آغا صاحب کی شاعری کا بالکل ابتدائی حصہ ہے۔ ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۵۰ء تک کا کوئی کلام کسی مجموعے میں بھی شامل نہیں۔ آغا صاحب ۱۹۳۹ء میں پانچ سال کے لئے قید ہو گئے، پھر دو سال تک نظر بند رہے۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء کا انقلاب رونما ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں انہوں نے کچھ بھی نہ کہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے اس عرصے میں کبھی کبھار اشعار کہے ہوں مگر چھپ نہ سکے ہوں یا ضائع ہو گئے ہوں۔ بہر حال ہم اس طرح آغا شورش کاشمیری کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ پہلے حصے میں ابتدا سے لے کر ۱۹۵۶ء تک کے اشعار جو "گفتنی و ناگفتنی" میں شامل ہیں

۲۔ دوسرے حصے میں ۱۹۵۶ء سے لے کر ۱۹۷۵ء یعنی آغا صاحب کی وفات تک کا کلام شامل ہے جو ہفت روزہ چٹان کے مختلف شماروں کے علاوہ ان کے مجموعہ کلام "چہ قلندرانہ گفتم" اور "الجہاد والجہاد" میں موجود ہے۔

آغا شورش کاشمیری نے اپنی شاعری میں جن موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل موضوعات قابل ذکر ہیں۔ جن کے ذریعے سے ان کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

۱۔ حمد و نعت

۲۔ سیاسی شاعری

۳۔ طنزیہ شاعری

۴۔ مشاہیر پرستی

۵۔ عشقیہ شاعری

حمد و نعت

آغا شورش کاشمیری حمد و نعت کی شاعری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ مثلاً حمد میں ان کا انداز ملاحظہ ہو۔

حمد

"کلیدِ حمد و ثنا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
خلاصہ ہائے دعا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
حیات و موت کو آسان کر لیا میں نے
بنا کے راہ نما، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
ہمہ خیال فسانہ، ہمہ دلیل غلط
بنائے ارض و سما، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
نظر پڑی جو کہیں بارگاہِ سلطانی
دماغ و دل نے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
ڈرا رہے ہیں مجھے سرکشوں کے ہنگامے
مگر ہے میری نوا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ"[1]

جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے اس کو بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

"مشرقی ادبیات میں ایک عام رسمی حیثیت حاصل رہی ہے۔"[2]

کیونکہ شعرا میں یہ رسم تھی کہ وہ اپنے دواوین کا آغاز حمد و نعت سے کرتے تھے[3]۔ اس طرح ہر شاعر نے اس غرض سے کوئی نہ کوئی نعت اور حمد ضرور کہی اور یقیناً وہ مسلمان شعرا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت بھی کرتے تھے۔ اور ان کی نعتوں میں عقیدت کا رنگ بھی ہوتا تھا۔ مگر انہوں نے اس صنف سخن کو چونکہ کوئی مستقل حیثیت

۱؎ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۹

۲؎ ظفر علی خان ادیب و شاعر ص نمبر ۱۶۲ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار

۳؎ ایضاً ص نمبر ۱۶۴

نہیں دی لہذا ہم انہیں رسمی حیثیت ہی کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن آغا شورش کاشمیری کے یہاں اس کی حیثیت مختلف ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں بہت سی نعتیں ملتی ہیں۔ پھر ان کی نظموں میں بھی خواہ وہ سیاسی ہوں یا غیر سیاسی کوئی نہ کوئی نعت کا شعر ضرور مل جاتا ہے۔ اور وہ اس افتخار کو کہ وہ نعت نبی ؐ کہتے ہیں، اللہ تعالےٰ کا بہت بڑا انعام سمجھتے ہیں۔

ع اب اس انعام سے بڑھ کر کوئی انعام کیا ہوگا۔
کیا شورش کو حمد و نعت میں رطب اللسان تو نے

آغا شورش کاشمیری سچے عاشقِ رسول ؐ تھے۔ ان کی زندگی کے آخری الفاظ جو ادا ہوئے وہ یہی تھے کہ .... "گواہ رہنا میں عاشقِ رسول ؐ ہوں"۔ رسول ؐ اللہ سے آغا صاحب کی محبت بہت ہی شدید اور گہری ہے۔ انہوں نے ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔ ان کی شاعری میں مرزائیت کا محاسبہ ایک موضوع ہے جس کی بنیاد جذبۂ عشقِ رسول ؐ ہی ہے۔ شورش کاشمیری بڑا جذباتی، بہادر، حکمرانوں کی رعونت کا مذاق اڑانے والا کج کلاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والا۔ اقتدار کے دربار میں مغرور و متکبر اور حریفوں کے مقابلے میں سرکش اور سر کو بلند رکھنے والا انسان تھا۔ لیکن جونہی بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوتے ہیں تو سراپا عجز و انکسار ہو جاتے اور اپنے آپ کو بڑا ہی حقیر اور بے مایہ سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ع

عاجز ہوں مگر تیری طرف دیکھ رہا ہوں
خاک کفِ پا ہوں

کونین کی دولت ہے ترا سایۂ دیوار
یا سید الابرار ؐ

آغا صاحب کے نزدیک نعت گوئی سامانِ بخشش ہے وہ کہتے ہیں ع
"نعت گوئی کے عوض، حمد و ثنا کے باعث   ہر سیہ کار کو بخشش کا گماں ہوتا ہے"[1]

---

[1] چہ قلندرانہ گفتم   ص نمبر ۴۰

اسی بات کو ایک اور جگہ اس طرح ادا کیا ہے ۔ ؎

جب قلم نعت پیمبرؐ میں رواں ہوتا ہے
ہر گنہگار کو بخشش کا گماں ہوتا ہے[1]

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ نے نعت میں اثر و تاثیر پیدا کرنے کے لئے سوز، اشتیاق، طلب، توصیف اور دعا کو ضروری قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ سارے عناصر مل کے نعت میں اثر و تاثیر پیدا کرتے ہیں۔[2] آغا صاحب کی نعتوں میں مندرجہ بالا عناصر بڑی خوبصورتی سے جمع ہوئے ہیں۔ ان کی نعت کے یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎
ہر اک دکھ کا مداوا آ گیا ہے — زہے ملجا و ماویٰ آ گیا ہے
خوشا قسمت بلاوا آ گیا ہے — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں
نگاہیں شہر رحمت بار پر ہیں — نبیؐ کے کوچہ و بازار پر ہیں
رسولؐ اللہ کے دربار پر ہیں — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں
کرم کُن خسروِ عالم پناہے — چہ نسبت خاک را با پادشاہے
"نگاہے یا رسولؐ اللہ نگاہے" — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں
یہ عشق و عاشقی کا مرحلہ ہے — زمیں سے آسمان تک غلغلہ ہے
یہ سب اس کی غلامی کا صلا ہے — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں
یہ سارے ولولے اسلام سے ہیں — محمد مصطفٰیؐ کے نام سے ہیں
خلیلؑ اللہ کے پیغام سے ہیں — مدینہ کے مسافر جا رہے ہیں[3]

---

1. چہ قلندرانہ گفتم — ص نمبر ۲۵
2. ثنائے خواجہ — حافظ لدھیانوی — حروف آغاز از ڈاکٹر سید عبداللہ — ص نمبر ۱۴/۱۵
3. چہ قلندرانہ گفتم — ص نمبر ۲۹/۳۰

نعت گوئی میں آغا صاحب کا زیادہ تر رجحان عصری مسائل کی طرف ہے۔ وہ ملک وقوم کی زبوں حالی اور بے بسی و بے کسی کا اظہار کرکے حضورؐ سے عنایات و اکرام کی دعا کرتے ہیں۔ مثلاً آغا صاحب بہ پیشِ حضورؐ عرض کرتے ہیں۔

ہم ہیں تیرے نام کے لیوا، دے دھرتی کے پانی دیوا
یہ دھرتی ہے برہم برہم، صلّی اللہ علیک وسلّم
دیکھ تری اُمّت کی نبضیں ڈوب چکی ہیں ڈوب رہی ہیں
دھیرے دھیرے، مدھم مدھم، صلّی اللہ علیک وسلّم
دیکھ صدف سے موتی ٹپکے، دیکھ حیا کے ساغر چھلکے
سب کی آنکھیں پرنم پرنم، صلّی اللہ علیک وسلّم
قریہ قریہ، بستی بستی، دیکھ مجھے میں دیکھ رہا ہوں
نوحہ، نوحہ، ماتم، ماتم، صلّی اللہ علیک وسلّم
اے آقاؐ اے سب کے آقاؐ ارض و سما ہیں زخمی زخمی
ان زخموں پر مرہم مرہم، صلّی اللہ علیک وسلّم[1]

آغا صاحب کی نعت گوئی کا ایک پہلو اس عصری سیاست سے متعلق ہے جو تعلیمات اسلامی کے مطابق نہیں ہے۔ آغا صاحب نعت میں سیرت پاک کے حوالے سے اسلام کی صحیح تعلیمات کو عام کرتے ہیں۔ لیکن نعت گوئی کے لئے جس عقیدت واحترام اور تقدس و پاکیزگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آغا صاحب نے اسے پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

نقش توحید بٹھانے کے لئے آپؐ آئے
شرک کا نام مٹانے کے لئے آپؐ آئے
کج کلاہوں کی رعونت کو نگوں سار کیا

---

[1] چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۱۵

زیردستوں کو اٹھانے کے لئے آپ آئے

زر کی بنیاد پہ انسان کی تقسیم غلط

شہریاروں کو مٹانے کے لئے آپ آئے

کوئی انسان کسی انسان سے ہراساں نہ رہے

ہر کومہ کو جگانے کے لئے آپ آئے

آج پھر منبر و محراب کو آگاہ کرو

اختلافات مٹانے کے لئے آپ آئے

طاعتِ غیر ہے اللہ کے بندوں پہ حرام

اس حقیقت کو سمجھانے کے لئے آپ آئے [1]

شعرا نے غزل کے رنگ میں نعتیں بھی کہی ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے ایسی نعت کے متعلق لکھا ہے کہ ۔

" غزل کے رنگ کی نعت معمولی بے احتیاطی سے اپنے درجے سے گر جاتی ہے ۔" [2]

آغا صاحب نے غزل کے رنگ کی نعت گوئی سے احتراز کیا ہے ۔ ان کے کل نعتیہ کلام میں شاید ہی دو چار شعر مل سکیں جن کو غزل کے رنگ کے نعتیہ اشعار کہا جا سکے ۔

سیاسی شاعری

آغا صاحب کی سیاسی شاعری کا آغاز ان کے سیاست میں آجانے کے ساتھ ہی ہو گیا تھا ۔ جو ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے ۔ جس کی مثالیں ان کی کتاب "جذبات شورش" میں موجود ہیں ۔ اس ابتدائی دور میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ان کے حقیقی جذبات کا آئینہ دار ضرور ہے مگر خیالات کی پختگی یا فکر کی گہرائی اس میں نہیں ۔ جن موضوعات پر اس دور

---

[1] چٹان ۴ جولائی ۱۹۶۶ء

[2] ثنائے خواجہ حافظ لدھیانوی حرف آغاز ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۵

میں اشعار کہے گئے ہیں وہ بھی اس وقت کے ہندوستان کے ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ آزادی سے محبت، وطن سے دوستی اور جرات وایثار کے جذبات ان کی اس وقت کی سیاسی شاعری میں عام پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی ایک نظم "اعلانِ آزادی" کا ایک بند ہے کہ

اعلان یہ کرتا ہوں کہ آزاد کروں گا　　ماتم کدۂ ہند کو دلشاد کروں گا

میں پیروئ سنتِ سجادؓ کروں گا　　جلاد کو آمادۂ بیداد کروں گا۔

یہ خاک میرے خون سے جو رنگین نہ ہو گی

شورشؔ میرے جذبات کی تسکین نہ ہو گی[۱]

اسی طرح ان کی نظم "حقائق و معارف" کے یہ اشعار

ننگ اسلاف نہیں قوم کا غدار نہیں۔　　تیرے بندوں کا الٰہی میں گنہگار نہیں

میں پجاری ہوں محبانِ وطن کا شورشؔ　　کاسہ لیسانِ حکومت کا طرف دار نہیں

میرے سینے میں ہے آزادئ کامل کی تڑپ　　خادمِ قوم ہوں میں حامئ سرکار نہیں

ناروا ہے مرے مشرب میں غلامی کا خیال　　میں پرستارِ وطن ہوں کوئی غدار نہیں[۲]

ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں انگریزی حکومت اور حامیانِ انگریز سے واقعی ایسی ہی نفرت کی جاتی تھی۔ اور ایسے لوگوں کو ننگ اسلام اور قوم کا غدار سمجھا جاتا تھا۔ اور حریت پسند واقعی وطن پر نثار ہو جانے کو بہت بڑی سعادت سمجھتے تھے۔ اسی لئے آغا صاحب کی ابتدائی سیاسی شاعری میں ہمیں آزادی کی تڑپ، پیغام اور دعوتِ عام ملتی ہے۔ مثلاً

تیغ ظالم جب اٹھے بیداد کرنے کے لئے

میرا سر ہو ہند کو آزاد کرنے کے لئے[۳]

---

[۱] جذباتِ شورش　　شورش کاشمیری　　ص نمبر ۲۵

[۲،۳] ایضاً　　ص نمبر ۲۲ - ۲۷

جو ماؤں کو کریں مجبور یہ آواز دینے پر،

کہ "موت اچھی ہے اے نور نظر ذلت کے جینے سے"

ہیں ان جذبات کی پاکیزگی پہ جان دیدوں گا[۱]

اٹھو تو ذرا فوج سیہ کار کو روکو۔

شیرانہ بڑھو کفر کی یلغار کو روکو

تانے ہوئے سینوں پر ہر اک وار کو روکو

چلتی ہوئی تلوار پہ تلوار کو روکو۔

کچھ قبلۂ اول کا تمہیں درد نہیں ہے

کیا تم میں کوئی شخص جوانمرد نہیں ہے[۲]

اس قسم کے جذبات کی عکاسی ہمیں آغا صاحب کے ابتدائی سیاسی کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ آغا صاحب کی سیاسی شاعری کا آغاز دراصل قیام پاکستان کے بعد ہی سے ہوتا ہے۔

پاکستان کا قیام ایک انقلاب کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں نے اس انقلاب کی تمنا کی تھی وہ سب کے سب مسلمان تھے اور اس انقلاب کی خواہش کو پروان چڑھانے میں ان کے دینی جذبات واحساسات کا حصہ سب سے زیادہ تھا۔

"عوام کبھی کسی انقلاب کے برگ و بار سے واقف نہیں ہوتے۔ وہ محض قومی ولولوں کی مظہر قوت کا نام ہیں"[۳]

اور یہ قومی ولولوں کی مظہر قوت اسلام کے نام پر پیدا کی گئی۔ اور ۱۹۴۷ء کا انقلاب اسی قوت کی وجہ سے رونما ہوا۔

۱۔ جذبات شورش — شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۸

۲۔ جذبات شورش — شورش کاشمیری — ص نمبر ۳۰

۳۔ بوئے گل — شورش کاشمیری — ص نمبر ۵۲۶

لیکن جب اس قوت نے انقلاب کے برگ وبار دیکھے جس سے وہ ناواقف تھے اور جو ان کی تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق نہ تھے تو ان میں مایوسی اور بددلی پھیل گئی ۔ اس میں کسی راہ نما کا قصور نہیں تھا بلکہ

" بڑے سے بڑا اور اچھے سے اچھا انقلاب بھی اگر قبل از وقت اپنے ادنیٰ سے ادنیٰ نتائج و آثار دکھا دے تو شاید بہت سے انقلاب رک جائیں ۔"[1]

گویا یہ برگ وبار دراصل انقلاب ہی کا بدیہی نتیجہ تھے ۔ جس میں لوگوں کو ہر طرح کی قربانی دینی پڑی ۔ جس میں ان کی جان ۔ مال ۔ گھر بار ۔ ساز و سامان یہاں تک کہ عزت و آبرو بھی قربان ہو گئی ۔ اس کے باوجود لوگ اس انقلاب کا اصل حاصل دیکھنے کے تمنائی تھے ۔ اور وہ حاصل تھا پاکستان میں " اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" ۔ مگر بقول شورش صاحب راہنماؤں کے وعدے روز بروز دوشیزہ کی کہہ مکرنی ہوتے گئے ۔[2] اور

" اگر سات آٹھ لاکھ مسلمانوں کی بے دریغ قربانی سے پاکستان میں اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ہو جاتی تو یہ کوئی قیمت نہ تھی ۔"[3]

آغا صاحب کی سیاسی شاعری کا آغاز چونکہ اسی دور سے ہوتا ہے لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اس انقلاب کی تباہ کاریوں اور بربادیوں پر آنسو بہائے ہیں ۔ خاص طور مغویہ عورتوں کے ساتھ جو وحشت ناک اور انسانیت سوز سلوک کیا گیا ، آغا صاحب نے ان "مغویہ عورتوں" کی بے کسی اور مظلومیت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

دخترِ اسلام نانک کے پجاری لے گئے	رام کے بیٹے سکینہ کی سواری لے گئے
سورما اٹھے حیاؤں کو اٹھا کر لے گئے	کچھ لٹیرے عصمت سیتا چرا کر لے گئے

---

[1] بوئے گل ص نمبر ۵۲۶

[3] بوئے گل ص نمبر ۵۲۷

حیف ایسے سورماؤں کی کمینہ فوج پر

حیف اس اعلانِ آزادی کی خونیں موج پر[1]

اسی طرح آغا صاحب نے اپنی تین نظموں میں مختلف انداز سے عید کے موقع پر ایک مغویہ عورت کے تاثرات کو شعر کا جامہ پہنایا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "عید آئی ہے"۔ جس کا پہلا اور آخری بند ہے۔

کملا بولی یہ سکینہ سے کہ "عید آئی ہے"

سن کے یہ روئے سکینہ پہ ملال آ ہی گیا

ایک گم گشتہ زمانے کی خلش جاگ اٹھی

اپنے ماں باپ کی شفقت کا خیال آ ہی گیا

کل وہ اک پارۂ عصمت تھی اسی بستی میں

آج بازیچۂ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں

اس پہ جو بیت گئی، بیت رہی ہے اب تک

رہنماؤں کی سیاست کے سوا کچھ بھی نہیں

کملا بولی یہ سکینہ سے کہ "عید آئی ہے"

سن کے یہ روئے سکینہ پہ ملال آ ہی گیا[2]

ایک دوسری نظم کا عنوان ہے "عید آ رہی ہے" اس نظم میں ایک مغویہ کے تاثرات اس طرح رقم ہوئے ہیں۔

فضاؤں پر اداسی چھا رہی ہے عزیزوں کی خلش تڑپا رہی ہے

ہجوم یاس سے گھبرا رہی ہے سکینہ آہ بنتی جا رہی ہے

پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۲۰۰

[2] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۲۲۱/۲۲۲

کبھی خوش تھی مگر رنجور ہے اب   پرائے دیس میں مجبور ہے اب
سکینہ نالۂ مہجور ہے اب   یہ اک نورس کلی مرجھا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

اسی گاؤں میں اک شہکار تھی یہ،   مثال نیّر منوبار تھی یہ،
حریف سبحۂ و زنّار تھی یہ   مگر اب خاک ہوتی جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

کبھی ماں باپ کی نور نظر تھی   شعاعِ مہر تھی رنگِ سحر تھی
جہاں تھی ہر طرح سے معتبر تھی   مگر اب مغویہ کہلا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے

زمانہ کیا سماں دکھلا رہا ہے   دلِ کون و مکاں تھرا رہا ہے
خدا کا خوف اٹھتا جا رہا ہے   فضا میں آگ لگتی جا رہی ہے
پرائے دیس میں عید آ رہی ہے [1]

آخری بند میں آغا صاحب نے اس زمانے کا ذکر کیا ہے جس کے واقعات سے واقعی انسان کا دل تھرانے لگتا ہے۔ اور اس ماحول اور فضا کو جس میں آگ لگی ہوئی ہے، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اسے ناکامی اور مایوسی کا دور کہا ہے۔ جس کا پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلے میں بہت سے شعرا کے کلام سے مثالیں بھی دی ہیں۔ جن سے اس احساس کی ترجمانی ہوتی ہے۔ آغا شورش کاشمیری نے بھی جب اپنے اسی احساس کو اپنی سیاسی شاعری کا موضوع بنایا جو کہ شعرا کے علاوہ پاکستانی عوام میں بطور خاص مہاجرین میں عام ہو چکا تھا تو آغا صاحب پر پاکستان دشمنی کا الزام لگایا گیا۔ مگر آغا صاحب نے کسی الزام کی پروا کئے بغیر ہر حکمران

---

[1] گفتنی و ناگفتنی   ص نمبر ۲۳۶/۲۳۷

کو یہ یاد دلایا کہ پاکستان کی اساس کیا تھی۔ اور اس ملک کو آپ کے وعدوں کے مطابق کیا ہونا چاہئے تھا۔ یہیں سے آغا صاحب کی سیاسی شاعری میں اقتدار دشمنی اور عوام دوستی کی ابتدا ہوتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جس عام مایوسی اور بد دلی کی کیفیت لوگوں میں پائی جاتی تھی آغا صاحب بھی اس سے دامن نہ بچا سکے۔ انہوں نے اس کیفیت کی ترجمانی اس طرح کی ہے۔

چراغ لالہ بہ عنوان داستاں نہ رہا،
کہ جس کے ہم تھے عنادل وہ گلستاں نہ رہا
بہار آئی تو شاخوں پہ کونپلیں نہ ملیں
سحر ہوئی تو گل و لالہ کا نشاں نہ رہا
ہزار شکر ملی رہزنوں سے راہ نجات
ہزار حیف کوئی میر کارواں نہ رہا[1]

یہ اشعار "انقلاب اے انقلاب" کے عنوان سے ہیں۔ جن میں قیام پاکستان کے بعد کی حالت دکھائی گئی ہے۔ ان اشعار میں "گلستان" کی جگہ "ہندوستان"، "بہار" کی جگہ "آزادی"، "رہزنوں" کی جگہ "انگریزوں" اور "میر کارواں" کی جگہ "قائداعظم کی وفات کے بعد کی قیادت" کو رکھ کر دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے بعد کی حالت سامنے آجاتی ہے

یہی حال ان کی نظم "کچھ دنوں بعد" کا بھی ہے۔ جس میں وہ کہتے ہیں۔

عام ہے قاتل و مقتول کی روداد ابھی
خون روتے ہیں کئی خانماں برباد ابھی
دامن شب سے جھلکتا ہے ستاروں کا لہو
کھیلتی ہے لب خورشید پہ فریاد ابھی

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۵۳

بادِ صرصر سے ہے مجروح شگوفوں کا دماغ
گھات میں بلبل و قمری کی ہے صیاد ابھی [۱]

اسی طرح ان اشعار میں بھی یہی تاثر پایا جاتا ہے

اب اپنا ملک ہے ! بالکل بجا ! میرے خداوند
مگر جمہور کے چہرے کی حیرانی نہیں جاتی [۲]

میکدے پر ہے بتانِ سیم و زر کو اختیار
بزمِ ساقی تک غریبوں کی رسائی جرم ہے [۳]

حق پسندوں سے زمانے کی دغا آج بھی ہے
تیرے بندوں پہ ستم میرے خدا آج بھی ہے

پابجولاں ہیں غلط کارِ سیاست کے حریف
بامِ زنداں پہ سلاسل کی صدا آج بھی ہے [۴]

اس قسم کے اشعار اس زمانے کے مجموعۂ کلام "گفتنی و ناگفتنی" میں اور بھی مل سکتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آغا صاحب نے ہر زمانے کے حکمرانوں پر اس وجہ سے تنقید کی ہے کہ حکمرانوں کا طرز عمل پاکستان کی اساس کے خلاف تھا۔ اور لوگوں کے حقوق پامال کئے جا رہے تھے۔

قائداعظم کی وفات سے لے کر ۱۹۷۵ء یعنی خود آغا صاحب کی وفات سے کچھ ہی دن پہلے تک پاکستان کی سیاست پر چٹان کے ۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کے شمارے میں ایک نظم جس کا عنوان ہے "قائداعظم کے بعد"۔ اس میں پاکستان کی تقریباً ۲۸ سالہ سیاست کی اجمالی تصویر ہے۔ جس میں حکمرانوں کے طرز عمل اور عوام کی حالت کا تفصیلی جائزہ پیش

۱۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۸۷ ۔ ۲۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۹۵

۳۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۹۳ ۔ ۴۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۸۷

کیا گیا ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تم نے کچھ سوچا ہے یاراں سیاست آشنا
اٹھ گئے جب قائداعظم تو کیا تم نے کیا

وحدت ملی کا شیشہ توڑ ڈالا بے دریغ
طاق ملت پر جلایا آمریت کا دیا

کرسیوں کے شوق میں صبح و شام لڑتے رہے
دم زدن میں ترک کی رسم و رہ مہر و وفا

دس برس ایسے بھی آئے ہیں تمہاری ڈار میں
راہبر کوئی نہ تھا اس میں سبھی تھے راہنما

آن واحد میں کئے مدفون بنیادی حقوق
نت نیا اس سرزمیں میں حادثہ ہوتا رہا

خود فروشانِ سیاست پر خدا کی مار ہو
قائداعظم کا پاکستان بٹ کے رہ گیا

ہو گئے ہم منحرف اسلام سے شورش اگر۔
پائیں گے اپنے خدا سے اس بغاوت کی سزا[1]

پاکستان کی سیاست اور سیاستدانوں پر آغا صاحب کی تنقید برائے تنقید نہیں ہے اور نہ ہی اس میں کسی ذاتی مخاصمت کا شائبہ نظر آتا ہے۔ بلکہ اس کے پس منظر میں ان کا "احیائے اسلام" کا نظریہ کارفرما ہے۔ وہ پاکستان کو ان بنیادوں پر استوار دیکھنا چاہتے تھے، جن بنیادوں پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ اس لئے وہ

---

[1] چٹان ۲۲ ستمبر ۱۹۷۵ء

اسلام سے منحرف نہیں ہونا چاہتے۔ آغا صاحب ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی سیاست پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اور جدید نظریات و افکار سے بھی واقف تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ پاکستان اور پاکستان کے باشندوں کی نجات صرف اسلام میں مضمر سمجھتے ہیں۔ وہ پاکستانی عوام کی زبوں حالی اور غربت و افلاس کے نوحہ گری نہیں بلکہ وہ انہیں اپنی حالت بہتر بنانے کا درس بھی دیتے ہیں۔ وہ لوگوں کو مایوسی و ناامیدی سے نکال کر ان میں ایک جوش و ولولہ پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو یہ خوشخبری سناتے ہیں کہ

بجلیاں سوئیں گی مٹی کے گھروں میں کب تلک
ابر کروٹ لے گا، تعضارنگِ وغا بدلے گی

ٹوٹ جائے گا ہر اک حلقۂ زنجیرِ ستم
بے نواؤں کی زبانوں پہ دعا بدلے گی

آگ لہرائے گی بام و درِ سرمایہ پر
نوجوانوں کی جسارت سے فضا بدلے گی[1]

اسی طرح ان کی ایک نظم "رہگذر" کا یہ آخری بند اپنے رجائی لہجے کے علاوہ لوگوں میں ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا کرتا نظر آتا ہے۔

آج ماحول دل شکن ہے تو کیا — کل یہاں آشنا بھی اٹھیں گے
کچھ دنوں اور انتظار سہی — لازماً باوفا بھی اٹھیں گے
منزلیں خود بخود پکاریں گی — خود بخود راہنما بھی اٹھیں گے
وقت کی بات ٹل نہیں سکتی — کچھ مرے ہمنوا بھی اٹھیں گے
ہاں اسی رہگذر سے شام و سحر[2]

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۰۲

[2] ہفت روزہ "چٹان" مارچ ۱۹۵۹ء جلد نمبر ۱۲ شمارہ نمبر ۱۲

اور پھر یہ مشورہ دیتے ہیں ۔

ارباب سیاست کی سیادت سے گزر جا
منزل سے اٹھا ہاتھ مسافت سے گزر جا
لادین خلیفوں کی معیّت سے حذر کر
پُرپیچ عباؤں کی امامت سے گزر جا
مومن ہے تو دامانِ محمدؐ میں چلا آ
پیرانِ صنم خو کی اطاعت سے گزر جا[1]

حفظِ خودی پہ نظمِ جہاں کا مدار ہے   یہ راز آشکار اگر کر سکے تو کر
بیدار کر ضمیر کو بیباک کر عمل   یہ عہد استوار اگر کر سکے تو کر[2]

کونین کے آقاؐ کی رسالت کے علم کھول
توحید پرستوں کو سکھا صبر و رضا تو
"واماندگی" شرعِ پیمبرؐ کی خبر لے
خیبر کی حدیں سرحدِ سلہٹ سے ملا تو[3]

سیاست میں جمہوری عمل معاشرے کی نموبیں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ جس سے معاشرے کی عمرانی ۔ معاشرتی ۔ تہذیبی اور ادبی اقدار کو فروغ حاصل ہوتا ہے ۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں اب تک سیاسی عمل میں کوئی ارتقا نہیں ہوا ۔ پاکستان کے ابتدائی حکمرانوں نے جس طرح اقتدار کو اس بنا پر موروثی بنایا کہ وہ پاکستان کے

---

[1] گفتنی و ناگفتنی   ص نمبر ۱۳۲
[2] گفتنی و ناگفتنی   ص نمبر ۸۲
[3] گفتنی و ناگفتنی   ص نمبر ۱۳۶

خالق ہیں لہٰذا ان کے سوا ہر کوئی غدار قوم اور دشمن پاکستان ہے ۔ اسی طرح بعد کے آنے والوں نے مختلف نعروں سے اقتدار کو دوام بخشنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو حکومتیں بدلنے کے لئے تحریکیں چلانا پڑیں ۔ مارشل لاء آتے رہے اور حکمرانوں نے انتخابات کو جو جمہوریت کی روح ہوتے ہیں ، مذاق بنا دیا ۔ اور اگر کبھی انتخابات ہوئے بھی تو مختلف بہانوں سے انتقال اقتدار میں رکاوٹ پیدا کی گئی ۔ یہاں تک کہ ملک آدھا رہ گیا ۔ اس طرح سے پاکستان کی سیاست میں جمہوری عمل میں ٹھہراؤ پیدا ہوا جو اب تک موجود ہے ۔ شورش کاشمیری نے اپنی سیاسی شاعری میں ان واقعات کو موضوع بنایا ہے ۔ چونکہ ملک کے سیاسی عمل میں ٹھہراؤ ہے ۔ لہٰذا آغا صاحب کا سیاسی کلام آج بھی ویسا ہی مؤثر ہے جیسا کہ پہلے تھا ۔

مثلاً آغا صاحب کی نظم " انتخاب " اگرچہ پہلے دور کی شاعری سے متعلق ہے ۔ لیکن اس نظم میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ آج بھی ایک حقیقت ہے ۔ اس نظم کے چند بند ہیں ۔

قوم کے ہمدرد جاگ اٹھے کہ ابھرا آفتاب
اوڑھ لی ہر راہزن نے رہنمائی کی نقاب

انتخاب ، انتخاب ، اے انتخاب

اب کئی خدام اس سانچے میں ڈھالے جائیں گے
آستینِ قوم میں کچھ سانپ پالے جائیں گے

انتخاب ، انتخاب ، اے انتخاب

اے غریبو ! اب سنبھل جاؤ خدا کے واسطے
ان کا دامن پھاڑ دو اپنی ردا کے واسطے

انتخاب ، انتخاب ، اے انتخاب [1]

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۳۲ - ۱۳۳

لیکن غریب سنبھل نہ سکے اور راہنما آج تک مختلف نعروں سے انہیں دھوکہ دینے میں کامیاب ہیں ۔ اس لئے آغا صاحب کی شاعری میں قیام پاکستان سے لے کر اب تک کی سیاست کے اجزائے ترکیبی پر بھرپور طنز اور تبصرہ ملتا ہے ۔

حصول اقتدار کی یہ ریشہ دوانیاں اور محلاتی سازشیں ہر دور میں سیاستدانوں کا شعار رہا ہے ۔ آغا صاحب نے پاکستان کی اس سیاست کو اپنی ایک نظم جس کا عنوان ہے " قمار خانہ میں " ۔ اس میں مارشل لاء کے فوراً بعد سیاسی مقامروں کی شب آرائیوں کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ نظم پاکستانی سیاستدانوں کی کارگزاریوں اور کارسازیوں کی وہ روداد ہے جس میں پاکستانی سیاست کے مجموعی خدوخال ابھر کر سامنے آگئے ہیں ۔ یہ نظم علامہ اقبال کی مشہور نظم " ابلیس کی مجلس شوریٰ " کی طرز پر لکھی گئی ہے ۔ فکری اعتبار سے اس نظم کو علامہ اقبال کی نظم سے کوئی علاقہ نہیں لیکن جہاں تک اس نظم کی ہیئت کا تعلق ہے اس میں علامہ اقبال کی نظم کی پوری طرح تقلید کی گئی ہے ۔ جس طرح " ابلیس کی مجلس شوریٰ " میں ابلیس اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرتا ہے اور ابلیس کا ایک ایک ساتھی اپنی کارگزاری بیان کرتا ہے اسی طرح اس نظم میں بھی پہلے مقامروں کا سرخیل اپنے ساتھیوں کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے ۔ کہ مارشل لاء کے بعد اقتدار کے حصول کے لئے کیا کیا جائے ۔ پھر اس کے چار ساتھی اسے مختلف مشورے دیتے ہیں ۔

" مقامروں کا سرخیل اپنے ساتھیوں سے ۔

دوست داران چمن آؤ صبا پر سوچیں
بات بنتی نظر آتی ہے فضا پر سوچیں
یہ ہے سہ سالہ خموشی کے در و بست کا راز
بند کمروں میں کوئی بات دغا پر سوچیں
طوف لیلائے وزارت پہ ہے موقوف حیات
کیا ضروری ہے کہ آئین وفا پر سوچیں
کوئی افسانہ تراشیں کسی عنوان کے ساتھ
اک نئے رخ سے زمانے کی ہوا پر سوچیں

باغبانوں سے نشیمن میں کریں راز و نیاز

حزب و تقسیم کی شب رنگ قبا پر سوچیں

غیر کے ہاتھ میں ہے ناقۂ لیلیٰ کی مہار

دشت مجنوں کے کسی آبلہ پا پر سوچیں

ہے نیا دور، نیا رنگ رچانا ہوگا

اک تماشا سر آغاز دکھانا ہوگا

پہلا ساتھی۔

شہر یاروں سے الجھنا نہیں اچھا لیکن

ان کو ہر کوچہ و بازار میں بدنام کریں

شعبدہ کوئی دکھا کر کسی انداز کے ساتھ

جن کا اس ملک پہ قبضہ ہے انہیں رام کریں

لوگ کیا چیز ہیں اور ان کی حقیقت کیا ہے

یہ تو بازار کی شے ہیں انہیں نیلام کریں

سوچنا یہ ہے کہ صیاد کے ہم چشموں کو

زیر کرنے کے لئے کون سا اقدام کریں

دوسرا ساتھی۔

وقت کہتا ہے کہ ملاح کی مرضی کر لو

ناؤ منجدھار میں ڈالو اسے راضی کر لو

پہلا ساتھی۔

ناخدا ڈوب کے نکلیں سر ساحل شاید ناؤ طوفان کے منہ آئے نظر آتا ہے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ پیمانہ و ساغر ہیں چلے   یا کوئی رندِ سزا پائے نظر آتا ہے
ہوس بادہ کشی شوق کو بھڑکاتی ہے   نیّتِ پیرِ مغاں صاف نظر آتی ہے

تیسرا ساتھی۔

قوم کے ساتھ ضروری ہے کوئی کھیل کرو   کہ یہاں رسم و رہِ شیشہ گری باقی ہے
کوئی شوشہ کسی اندازِ نوی سے چھوڑیں۔   شہر میں فہم و فراست کی کمی باقی ہے
چھوڑ کر ماضیٔ مرحوم نئی بات کرو   بھول کر بھی نہ کبھی ترکِ موالات کرو

دوسرا ساتھی۔

جتنے سجدے ہیں جبینوں میں لٹانے کے لئے
وقف کر دو انہیں شاہوں کے منانے کیلئے

چوتھا ساتھی۔

نازنینانِ سیاست ہیں حرم کی زینت۔   شاہزادوں کی زباں پر ہے کہ مال اچھا ہے
جس سخن سے ہو جبینوں پہ شکن، لاحاصل   جس میں ہو بوئے گدائی وہ سوال اچھا ہے
گردنیں گفتۂ سرکار پہ خم کر کے چلو   یہ بڑی بات ہے، اس فن میں کمال اچھا ہے
سازشی دور میں نیزے کی انی ہوتے ہیں   اپنے احباب وزارت کے دھنی ہوتے ہیں

سرِ خیل۔

دل پریشاں نہ کرو رات کے ہنگاموں پر   آج کی رات کٹے گی تو سویرا ہو گا
اس بیاباں میں شغالوں کی روش بہتر ہے   جو بھی یہ چال چلے گا وہی بالا ہو گا
جتنے سجدے ہیں جبینوں میں انہیں ڈھیر کرو   شاہ کے در پہ بکھیرو گے تو چرچا ہو گا
کسی کوشش سے وزارت میں جگہ مل جائے   پھر جو طوفان اٹھاؤ گے وہ برپا ہو گا
شرط یہ ہے کہ بزرگوں کے قدم لے کے چلو   اپنی گم گشتہ سیاست کا بھرم لے کے چلو

—: ۲ :—

خدمت الناس ضروری ہے مگر یاد رہے　　نام و ناموسِ وزارت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ خفی راز ہے اس راز کو عریاں نہ کرو　　ذکرِ اسلام شرارت کے سوا کچھ بھی نہیں
ہم جو کہتے ہیں کہ خادم ہیں مسلمانوں کے　　شوخ چشمانہ جسارت کے سوا کچھ بھی نہیں
خوفِ یزداں بھی غلط، حاصلِ ایماں بھی غلط　　دامنِ شب میں امارت کے سوا کچھ بھی نہیں
مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ خاموش رہو
شوقِ لیلائے وزارت میں وفاکوش رہو[1]

اسی طرح آغا صاحب نے اقبال کی ایک اور مشہور نظم "ساقی نامہ" کا تتبع کرتے ہوئے تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے دنوں میں ایک نظم لکھی۔ جس کا عنوان بھی "ساقی نامہ" ہے۔ نظم کا آغاز تحریک ختم نبوت کے شہیدوں کے تذکرے سے ہوتا ہے، اس میں آغا صاحب اس زمانے کی سیاست پر طنزیہ انداز میں تبصرہ اور تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء کے پس منظر میں سیاستدانوں کے سیاسی مقاصد کی مصوری بھی کرتے ہیں۔ میاں ممتاز احمد دولتانہ اور نواب ممدوٹ صاحب کی چپقلش اس دور کا مشہور واقعہ ہے۔ آغا صاحب نے اس واقعہ کا پیش منظر اس نظم میں دکھایا ہے اور سیاستدانوں کی غلط کاریوں کا مرقع اس طرح پیش کیا ہے۔

وزارت کے چشمے ابلنے لگے۔　　گراں خواب ٹوڈی سنبھلنے لگے۔
ڈرانوں کے طرے لٹکنے لگے　　سیاسی عنادل چہکنے لگے۔
فقیہہ و حکیم و مسیح و کلیم　　بڑے زور پر ہیں سیاسی یتیم
بہ عنوان بادہ، سیہ کار ہیں　　غزل کی زبان میں طرحدار ہیں
سیاست کے اربابِ عالی مقام　　بڑے تیز رو ہیں بڑے بے لگام

۱؎ چہ قلندرانہ گفتم　شورش کاشمیری　ص نمبر ۲۳۰ - ۲۲۵

وہ محدود ہے اور یہ ممتاز ہے | ممولے کے پنجے میں شہباز ہے

اس نظم کے آخری بند میں اس سیاست کے نتائج دکھائے گئے ہیں ۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

پرانی سیاست گری خوار ہے | فضا خان زادوں سے بیزار ہے
پرانے دنوں کا فسانہ گیا | جبینیں گئیں آستانہ گیا
عروس چمن کو خزاں کھا گئی | وزارت کو آہ و فغاں کھا گئی
سیاسی لیٹرے حیا لے گئے | رہ و رسمِ مہر و وفا لے گئے
شہیدوں کے خونیں کفن بک گئے | گل و لالہ و نسترن بک گئے[1]

۱۹۵۳ء کے بعد ۱۹۵۶ء میں پاکستانی سیاسیات کے متعلق بعض معنی خیز اشارے ان کی نظم "دوراہہ" میں ملتے ہیں،
چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

اک طرف بالانشینانِ سیاست نعرہ زن | سر فروشانِ وطن کی کوچہ گردی اک طرف
اک طرف ہم خانماں برباد با حال نزار | خان زادوں نے ہوس کی جیب بھر دی اک طرف
چل رہے ہیں ہم ہگر غیروں کی انگلی تھام کر | رہبروں نے قوم کی حالت یہ کر دی اک طرف
اک طرف نامردئ اہل خوشامد کا فرار | بے نوایانِ وطن کی پامردی اک طرف
ٹوٹ جائے گا فرنگستاں کا شورش فسوں | بیٹھ کر روئیں گے انگریزوں کے دردی اک طرف[2]

اسی طرح ان کی نظم "اس بازار میں" ہے ۔ جس میں آغا صاحب نے ری پبلکن وزارت کے عہد میں سیاستدانوں
پر تبصرہ کیا ہے ۔ یہ ایک طویل نظم ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں ۔

کچھ دارا کچھ اسکندر ہیں | کچھ روٹی توڑ قلندر ہیں ۔

۱۔ چہ قلندرانہ گفتم شورش کاشمیری ص نمبر ۱۲۲
۲۔ ایضاً ص نمبر ۱۱۸

کچھ ملہی ہیں کچھ گھمن ہیں۔ کچھ پھندنے ہیں کچھ پھمن ہیں۔
کچھ فتنہ و شر کے بانی ہیں۔ کچھ دین کے دشمن جانی ہیں۔
کچھ بادہ خوار پرانے ہیں۔ کچھ کھرّ اور تو انے ہیں۔
کچھ مفتی کچھ میانے ہیں۔ کچھ جاہل اور سیانے ہیں۔
کچھ چورا چوری کرتے ہیں کچھ سینہ زوری کرتے ہیں۔
کچھ موتی ہیں، کچھ مالا ہیں کچھ دال میں کالا کالا ہیں۔
جتنے ہیں سبھی بے مایہ ہیں خورشید کا ڈھلتا سایہ ہیں۔
پہلے تو بڑے جاسوس تھے یہ انگریز سے بھی مانوس تھے یہ
اب قوم کی خدمت کرتے ہیں اسلام کا دم بھی بھرتے ہیں [۱]

قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کی قیادت نے جو سیاسی انداز اختیار کیا وہ آمرانہ اور فاتحانہ تھا۔ جس سے حکمران طبقے کو یقیناً فائدہ ہوا۔ مگر پاکستان کے عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا۔ بعد میں آنے والے سیاستدانوں اور حکمرانوں نے بھی اسی سیاسی روش کو برقرار رکھا۔ جو مسلم لیگ کی قیادت نے اپنائی تھی۔ جس کے نتیجے میں پاکستانی عوام کی زبوں حالی میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس دوران میں ملک و قوم کی جو حالت **ہوگئی تھی آغا صاحب نے** "یوم حساب" کے عنوان سے یہ اشعار کہہ کر اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

قریب ہے یارو روز محشر ہر ایک شے کا حساب دوگے
عوام سے جو کیا ہے تم نے خدا کے ہاں کیا جواب دوگے
تمہارے وعدوں کی ناؤ ڈوبے گی بیچ منجدھار میں یقیناً
صدف سے موتی چرانے والو ہمیں کہاں تک حباب دوگے

۱۔ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۱۱۱ - ۱۱۳

علیل چہروں کی رونقیں تم سے حقِ تنویر مانگتی ہیں ۔
ہر ایک دل انتقام لے گا ہر ایک چہرے کو آب دو گے
بجا کہ تم نے چمن فروشوں کو شہریار چمن کہا ہے
تمہارے ہاتھوں جو مٹ چکے ہیں انہیں بھی کوئی خطاب دو گے
جنہیں تمہارے جلن کی سختی نے سرد لاشیں بنا دیا ہے
وہ لوگ پھر انقلاب مانگیں گے اور تم انقلاب دو گے[۱]

سکندر مرزا کے زمانے کی سیاست سے لے کر بھٹو صاحب کے عوامی دور تک اور بھٹو صاحب کے دور سے لے کر موجودہ دور تک جس طرح اقتدار پر قبضہ کیا جاتا رہا اور پھر اقتدار پر قابض رہنے کے لئے جن حیلوں اور بہانوں سے کام لیا گیا وہ قانونی تھے نہ جمہوری اور نہ عوامی ، بلکہ ہر دور کے حکمران ناانصافی کو قانون ، آمریت کو جمہوریت اور ذاتی فلاح کو عوام کی خدمت قرار دے کر اپنے اقتدار کی مسند کو مضبوط کرتے رہے ۔ ان حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے والوں کی کمی نہ تھی لیکن جتنی اونچی آواز ہمیں آغا صاحب کی سنائی دیتی ہے اتنی اونچی آواز میں بات کرنے کی جرأت پاکستان کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی ۔ اور جس جرأت کے ساتھ شورش کاشمیری ان حکمرانوں سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں وہ کسی دوسرے شاعر کے بس کی بات نہیں ۔ وہ "عرض حال" کے عنوان سے کہتے ہیں ۔

بن گئے چور رہنما صاحب — اس سے آگے کہیں تو کیا صاحب
خان زادوں کی مہربانی ہے — ناروا ہوگیا روا صاحب
ظلم سہتے رہیں کہاں تک لوگ — کوئی حد ہے نہ انتہا صاحب
اتنی قربانیوں کے بعد ہمیں — سوچنا یہ ہے کیا ملا صاحب
آپ کی خشمگیں نگاہوں کا — ہم سمجھتے ہیں مدعا صاحب[۲]

۱۔ چہ قلندرانہ گفتم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۱۹ - ۱۲۰
۲۔ چہ قلندرانہ گفتم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۰۹

اسی طرح ان اشعار میں بھی قوم کی حالت اور رہنماؤں کی سیاست پر بلیغ اشارے ملتے ہیں۔

خود اپنے ہاتھوں سے باغبانوں نے لالہ وگل کو بیچ ڈالا
بظاہر آنکھیں کھلی ہوئی ہیں مگر کوئی دیکھتا نہیں ہے

قمار خانے میں بادہ خواروں کو داؤں پر داؤں مل رہے ہیں
عوام کی ہار ہو رہی ہے مگر انہیں کچھ پتا نہیں ہے

یزید پھر سر اٹھا رہا ہے حسینؑ ابن علیؑ کو ڈھونڈو
کہاں کہاں نینوا نہیں ہے کہاں کہاں کربلا نہیں ہے[۱]

راہنماؤں کی ایک تصویر ان کی نظم "مغل شہزادے" ہے۔ یہ نظم دراصل ۱۹۵۶ء سے پہلے کی سیاست سے متعلق تھی اور "گفتنی و ناگفتنی" میں شائع ہوئی۔ لیکن یہ نظم ۲۷ ، اکتوبر ۱۹۷۵ء کے چٹان میں بھی اسی عنوان کے ساتھ موجود ہے۔ جس کے آغاز میں ایک شعر کا اضافہ اور آخری شعر میں صرف ایک لفظ بدل دیا گیا ہے۔ آغاز میں ایک شعر کا اضافہ صرف اس وجہ سے ہے کہ ۱۹۷۵ء میں پاکستان کی حکمران پارٹی بری طرح انتشار کا شکار تھی۔ لہٰذا یہ شعر بڑھا دیا گیا۔

کوئی کمزور رہنماان میں تو کوئی تگڑا تھا
خانہ جنگی تھی کہیں اور کہیں جھگڑا تھا

اس نظم کا آخری شعر یہ تھا۔

داغ ہی داغ ہیں تاریخ جہانبانی پر
آج کچھ بل ہیں مگر وقت کی پیشانی پر[۲]

لیکن ۱۹۷۵ء میں مندرجہ بالا شعر کے دوسرے مصرع کو اس طرح بدل دیا گیا ہے۔ ع " آج پھر بل ہیں وہی وقت کی پیشانی پر "

---

[۱] چٹان ۵ ، اپریل ۱۹۷۶ء

[۲] گفتنی و ناگفتنی شورش کاشمیری ص نمبر ۱۴۳

اس طرح یہ نظم جو ۱۹۵۶ء تک کی سیاست پر تبصرہ تھا، ۱۹۷۵ء میں بھی راہنماؤں کی تصویر ہے۔ جس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ پاکستان کے راہنماؤں نے ملک میں سیاسی عمل کو آگے نہیں بڑھنے دیا اور اقتدار کے حصول کے لئے وہی پرانی روش اختیار کی جو تاریخ میں "مغل شہزادوں" کے لئے خاص تھی۔ اور پاکستان کے سیاسی شہزادوں کے طرزِ عمل کی تصویر بھی اسی سے ملتی جلتی ہے، مثلاً

کوئی کمزور تھا ان میں نہ کوئی تگڑا تھا ۔۔۔ خانہ جنگی تھی کہیں اور کہیں جھگڑا تھا
سازشیں عام تھیں حالات پراگندہ تھے ۔۔۔ کج کلاہوں کے خیالات پراگندہ تھے
اپنے ہاتھوں ہی سے اپنوں کے گلے کٹتے تھے ۔۔۔ وہ بھی تاش کے پتوں کی طرح بٹتے تھے
رات بے داغ اجالے کو ترستی ہی رہی ۔۔۔ سلطنت برف کی مانند پگھلتی ہی رہی
شہسواروں میں شجاعت کا کہیں نام نہ تھا ۔۔۔ شہزادوں کو رعیت سے کوئی کام نہ تھا
جال ہی جال تھے پھیلے ہوئے غداری کے ۔۔۔ اہلِ دربار ہی سرخیل تھے مکاری کے

داغ ہی داغ ہیں تاریخ جہانبانی پر
آج پھر بل ہیں وہی وقت کی پیشانی پر[۱]

تاریخ جہانبانی کے یہی داغ شورش کاشمیری کے سینے کے داغ ہیں۔ جن کو وہ اپنے اشعار کی صورت دے کر لوگوں کو دکھاتے ہیں۔ انہیں صرف راہنماؤں ہی سے نہیں بلکہ اپنی قوم سے بھی گلہ ہے کہ انہوں نے ظالم کو ظلم کرنے کی اجازت کیوں دی۔ وہ کہتے ہیں "اے مری قوم" تو نے

قلبِ اسلام میں صدمات کے خنجر بھونکے ۔۔۔ کربلا میں کفِ قاتل کا تماشا دیکھا
ابوسفیان کے پوتے کی غلامی کر لی ۔۔۔ خود فروشوں کو دنایت سے پنپتا دیکھا
اے مری قوم ترے حسنِ کمالات کی خیر ۔۔۔ تو نے جو کچھ بھی دکھایا وہی نقشا دیکھا

---

[۱] چٹان ۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۵ء

یہ بھی کیوں اور یہ کیا ہے مجھے کچھ سوچنے دے
کوئی تیرا بھی خدا ہے مجھے کچھ سوچنے دے [1]

ایک دوسری جگہ اس طرح لکھتے ہیں۔

میں تو اس قوم کی تاریخ سے شرمندہ ہوں ‏ ‏ ‏ جس نے ہر دور میں عزت کا تماشا دیکھا
جس نے اخلاص و دیانت کو طمانچے مارے ‏ ‏ ‏ جس نے اسلام کی اقدار کا لاشا دیکھا [2]

اس طرح آغا صاحب راہنماؤں اور قوم دونوں کے طرز عمل پر کڑی تنقید کرتے ہیں۔ لیکن قوم کے ساتھ ان کا رویہ مقابلتاً نرم ہے۔ جبکہ راہنماؤں کے ساتھ سخت اور درشت لہجے میں بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔
آغا شورش جس سیاست کے پروردہ تھے۔ اس سیاست کی بنیاد حق گوئی اور ایثار پر قائم تھی۔ اور وہ زمانہ آزادی کی جنگ کا زمانہ تھا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد جب اقتدار کی جنگ شروع ہوئی تو سیاست کی پرانی اقدار کی جگہ نئی قدروں نے جنم لیا۔ جن کی اساس خود غرضی، دھوکہ دہی۔ لالچ اور جھوٹ پر تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی سیاست سے بہتری کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ کیونکہ آغا صاحب ایسی سیاست ہی کے خلاف تھے۔ لہذا انہوں نے پاکستان میں قائم ہونے والی ہر حکومت کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی بڑی وجہ آغا صاحب کا نظریہ یعنی تحریک احیائے اسلام تھا۔ جو آغا صاحب نے علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیمات سے حاصل کیا تھا۔ اور جس کے لئے انہوں نے ماضی میں قربانی و ایثار کی روشن مثالیں قائم کی تھیں۔ وہ اب بھی پرانی سیاست کے علمبردار تھے اور چاہتے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہو۔ جس کے لئے انہوں نے پاکستان کی ہر حکومت کے خلاف جہاد کیا۔ انہوں نے پاکستان میں چلنے والی تحریکوں کی آبیاری جہاں اپنی خطابت اور صحافت کے ذریعے سے کی وہاں شاعری کے ذریعے سے بھی عوام کو نظریہ پاکستان اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے تیار کرتے رہے اور حکمرانوں کو یہ یاد دلاتے رہے

---

[1] چٹان ‏ ‏ ۱۱ دسمبر ۱۹۷۴ء
[2] چٹان ‏ ‏ ۱۸ مارچ ۱۹۷۴ء

کہ انہوں نے پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ مگر وہ اب اسلام ہی سے روگردانی کر رہے ہیں۔ ذیل کے اشعار اسی حقیقت کے ترجمان ہیں۔

یہ اشعار ان کی نظم "اقبال سے ہمکلامی" سے لئے گئے ہیں۔ نظم اس طرح شروع ہوتی ہے کہ آغا صاحب نے عالم خواب میں دیکھا کہ علامہ اقبال، شیخ مجدد، مولانا ابوالکلام آزاد، میر و مومن۔ حالی، شبلی اور مولانا روم ایک جگہ بیٹھے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ آغا صاحب علامہ اقبال کی خدمت میں عرض کرتے ہیں۔

میں نے بڑھ کر مرشدِ اقبال سے یہ عرض کی — آپ کو ہم تیرہ بختوں کی خبر ہے یا نہیں
دل شکستہ ہو کے فرمایا مجھے معلوم ہے — "بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں"
سلطنت لے کے خدا و مصطفےٰ[1] کے نام پر — اب خدا و مصطفےٰ[2] کی راہ پر کوئی نہیں
ہے ابھی شہباز کی عزت پہ کرگس خندہ زن — "ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں"
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب — "بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں"
کون سمجھائے؟ اندھیری رات کو آئینِ مہر — وائے بدبختی کہ خود مومن ہے محروم یقیں

خون دے کر خانہ صیاد کو روشن کرو
جاؤ[1] مشرق کے خراب آباد کو روشن کرو

اسی طرح وہ عید سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں "اے عید چلی آ" لیکن

توحید کے انوار لٹانے کے لئے آ — اسلام کی توقیر بڑھانے کے لئے آ
تاریخ کی مرحوم کتابوں کو الٹ کر — ماضی کی روایات دکھانے کے لئے آ
ملاح تو اب اس سے دغا کر ہی چکے ہیں — اسلام کی کشتی کو بچانے کے لئے آ
وہ چند ہو پھر نشاۃ اسلام کی تحریک — اے عید نیا رنگ جمانے کے لئے آ

---

[1] چٹان ۲۰ر اپریل ۱۹۶۱ء

اس دورِ پر آشوب کے ہرلات وہبل کو
شورش کی یہ خواہش ہے کہ ڈھانے کے لئے آ[۱]

گویا آغا صاحب سیاست کے تمام نظام ہائے حکومت کو ختم کرکے مشرق کے خراب آباد کو اسلام کی شمع جلا کر روشن کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس بارے میں وہ پُرامید بھی ہیں۔ کہتے ہیں

سطوت اسلام ابھرے گی ہماری خاک سے
حشمتِ اسلام کا دورِ کہن پھر آئے گا

پھر وہ نوجوانوں کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ

نوجوانانِ وطن آؤ کوئی کام کریں۔ خدمت قوم کریں، خدمت اسلام کریں۔
تا بہ کے تنکوئی بے مہری ایام کریں تا بہ کے ماضیٔ مرحوم پر فریاد و فغاں
ہر کہ ومہ پر عیاں ہیبت اسلام کریں[۲] توڑ کر بندہ و آقا کی تمیزِ کہنہ

غرض آغا صاحب کی سیاسی شاعری کا بنیادی مقصد اسلام کا احیاء ہے۔ جس کے لئے وہ ہر اس فرد ادارے اور تحریک کو نشانہ بناتے ہیں جو ان کے اس مقصد میں حائل ہوتی ہے۔

طنزیہ شاعری۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مولانا ظفر علی خان کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو شاعری میں تین کامل الفن اساتذہ کا نام لیا ہے[۳]۔ جنہوں نے اپنی شاعری میں طنز و مزاح کی بلند سطح کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور یہ تین نام ہیں۔ مرزا محمد رفیع سودا۔ اکبر الہ آبادی اور مولانا ظفر علی خان[۴]۔ ڈاکٹر صاحب مولانا ظفر علی خان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں

---

۱ چٹان یکم جنوری ۱۹۶۸ء

۲

۳-۴ مولانا ظفر علی خان ادیب و شاعر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص نمبر ۲۱۲-۲۱۳

"طنزیات کی حدود اتنی ہی وسیع ہیں جتنی کہ بیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی وسیع ہے اور ان کا اسلوب بھی منفرد خصوصیات کا حامل اور ان کی شگفتگی کا آئینہ دار ہے۔ افراد، جماعتیں، ادارے اور تحریریں سبھی ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری کی لپیٹ میں آجاتے ہیں"[1]

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کے بعد جب ہم ظفر علی خان کے بعد کی اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسی ہی خصوصیات کا حامل ایک اور طنزیات کا شاعر ملتا ہے اور وہ ہے آغا شورش کاشمیری۔ مندرجہ بالا اقتباس میں اگر ظفر علی خان کی بجائے شورش کاشمیری کا نام لکھ دیا جائے تو بھی یہ عبارت حقیقت ہی کی ترجمان رہے گی۔ لیکن ہمیں ہندوستان کی بجائے پاکستان ضرور لکھنا پڑے گا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے جب یہ کہا تھا کہ

"پنجاب نے اقبال و ظفر علی خان ہی کو نہیں بلکہ شورش کو بھی پیدا کیا ہے"[2]

تو ان کے پیش نظر بھی مولانا ظفر علی خان اور شورش کاشمیری کی مماثلتیں تھیں۔ جو صحافت، خطابت اور شاعری میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ صحافت کی تیزی، خطابت کی روانی، طنز کی کاٹ اور طبیعت کا تلون مولانا ظفر علی خان اور آغا صاحب کی شخصیتوں میں ملتی جلتی چیزیں ہیں۔ بلکہ آغا صاحب مولانا ظفر علی خان کی روش کے بڑے ہی پرستار ہیں۔ انہوں نے اپنے اشعار میں اس بات کا ذکر بڑے ہی کروفر سے کیا ہے۔

"مرے قلم کی آب میں النشائے ابوالکلام۔
میں ہوں ظفر علی کی ہدایت کا خوشہ چیں"[3]

---

1. مولانا ظفر علی خان ادیب و شاعر - ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ص نمبر ۲۱۳
2. فن خطابت ص نمبر ۷
3. چٹان ۱۵ر اگست ۱۹۶۶ء

شورشؔ، ظفرؔعلی سے تلمذ کا فیض ہے

میری نوا بھی صورِ سرافیل ہوگئی[۱]

ظفرؔعلی بھی گئے، اٹھ گئے بخاریؔ بھی

وہ کیا گئے کہ خطابت سے آگہی نہ رہی[۲]

ظفرؔعلی کی روش پر چلے چلو شورشؔ

جو لوگ ذلہ ربا ہیں انہیں خدا نہ کہو[۳]

آغا صاحب نے مولانا ظفر علی سے تلمذ، خوشہ چینی اور روش کو اپنانے کا جو ذکر کیا ہے یہ تلمیذانہ سپاس گزاری نہیں بلکہ حقیقت نگاری ہے۔ آغا صاحب نے اس بات کا اعتراف اپنے مجموعۂ کلام "گفتنی و ناگفتنی" کے دیباچے میں اس طرح کیا ہے۔

"جو شعر سیاسی زندگی میں کہے وہ مولانا ظفر علی خان کی نظر سے گزرتے رہے۔۔۔۔ ۔۔۔حقیقت یہ ہے کہ شعری ذوق کی پختگی اور فن کی نکتہ شناسی اصلاً انہی کا فیضانِ صحبت ہے۔ اس باب میں میرا ان سے ذہنی تلمذ رہا۔ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔ اور اس کا اعتراف نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے۔ اس مجموعہ کی زیادہ تر نظموں میں انہی کے پیرایۂ اظہار کی روح بولتی ہے"[۴]

یہ حقیقت اس طرح اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ مولانا ظفر علی خان نے بھی سیاست اور سیاستدانوں

۱۔ چٹان ۱۶ جون ۱۹۷۵ء

۲۔ چٹان ۷ جون ۱۹۷۵ء

۳۔ چٹان ۳۰ جون ۱۹۷۵ء

۴۔ گفتنی و ناگفتنی دیباچہ شورش کاشمیری ص نمبر ۳۵

کو طنز کا نشانہ بنایا ہے تو آغا صاحب کا بھی یہ خاص موضوع رہا ہے۔ قادیانیوں کے محاسبے میں بھی آغا صاحب مولانا ظفر علی خان کی سی شہرت رکھتے ہیں۔ آغا صاحب بھی مولانا ظفر علی خان کی طرح عاشق رسولؐ تھے۔ جس کا اظہار دونوں نے نعت کی صورت میں کیا ہے۔ علماء سوء سے بھی آغا صاحب مولانا ہی کی طرح چشم نمائی کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان کی طرح ہم عصر صحافیوں سے آغا صاحب کی بھی معرکہ آرائی ہوتی رہی۔ لیکن ان ساری مماثلتوں کے باوجود آغا صاحب کا طنزیہ شاعری میں اپنا ایک رنگ اور اسلوب ہے۔ آغا صاحب کی طنزیہ شاعری کے زیادہ تر ہدف جو ادارے، جماعتیں اور افراد ہیں ان میں

۱۔ مرزائیت

۲۔ علماء سوء

۳۔ جعلی پیر و جعلی صوفی

۴۔ ادیب و شاعر اور دانشور

۵۔ سیاسی حریف

خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

مرزائیت

مرزائیوں کی سو سالہ تاریخ کے مطالعے سے جو بات سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ اس گروہ کا معاشی اور سیاسی مقصد ہے۔ یہ لوگ اپنے وجود کو عام مسلمانوں میں شامل کر کے اپنے معاشی اور سیاسی مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مسلمانوں میں شامل ہوتے ہوئے اپنا ایک الگ مذہب ایجاد کیا۔ تاکہ لوگوں میں تنظیم و اتحاد پیدا کیا جا سکے۔ اس کے بعد جب یہ گروہ پیدا ہو گیا تو انہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ دوسری اقوام سے بھی اپنے کو الگ رکھا اور تاثر یہ دیا کہ یہ گروہ بھی مسلمانوں ہی کی ایک شاخ ہے۔ ہندوستان میں مسلمان قوم کی قوت اور اتحاد کو توڑنے کے لئے انگریز نے اپنی عقل و دانش کی ساری فریب کاریاں صرف کیں۔ جس کا ایک نمونہ یہ گروہ بھی تھا۔ جو مسلمانوں میں درج

جہاد کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ انگریز مسلمانوں کے اسی جذبۂ جہاد سے ہمیشہ خوف کھاتا رہا اور اس خوف کی وجہ انگریزوں کے وہ تلخ تجربات تھے جو ان کو مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کی جنگ میں ہوئے تھے۔ لہٰذا اس گروہ کو پیدا کر کے اس کے سرپرست بن گئے تاکہ مسلمانوں کے دلوں سے جذبۂ جہاد کو ختم کر دیا جائے۔ اس کے معاوضے میں مرزائیوں نے انگریزوں سے مراعات حاصل کیں۔ اور اپنے گروہ کو معاشی اور سیاسی طور پر مضبوط کیا۔

قیام پاکستان کے بعد بھی اس گروہ نے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ہر حکومت کی تائید اور تعاون کو اپنا مذہب سمجھا۔ حکومتوں کو چونکہ منظم گروہوں کے تعاون کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ لہٰذا پاکستان کی حکومتوں نے بھی اس سیاسی قوت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جس کے معاوضے میں انہوں نے حکومتوں سے اعلیٰ عہدے اور کلیدی اسامیاں حاصل کیں۔ اور حکومت کے ہر شعبے میں ان کے مفادات کا خیال رکھا جانے لگا۔ اس طرح وہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی سیاسی زندگی میں عمل دخل حاصل کرنے کے لئے پخت و پز کرتے رہے۔

مرزائیوں کا سیاسی اور معاشی محاسبہ قیام پاکستان کے بعد بھی جاری رہا۔ لیکن اس گروہ کے کچھ ارکان چونکہ حکومت کا حصہ تھے اور محاسبہ کرنے والے زیادہ تر وہ لوگ تھے جن کو ارباب اقتدار اپنی مصلحتوں کی بنا پر پاکستان کے مخالف سمجھتے تھے جس کا فائدہ ہمیشہ مرزائیوں نے اٹھایا۔ سنہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت اسی بنا پر احراری، احمدی تنازع قرار پائی۔ لیکن مجلس احرار نے مرزائیوں کا محاسبہ پھر بھی جاری رکھا۔ شورش صاحب اگرچہ مجلس احرار سے علیحدہ ہو چکے تھے مگر مرزائیوں کے محاسبے میں وہ ہمیشہ مجلس احرار کے موقف پر عمل پیرا رہے۔ بلکہ تحریک ختم نبوت سنہ ۱۹۵۳ء کے بعد آغا صاحب اپنے ہفت روزہ چٹان کے ذریعے مسلمانوں کو ہمیشہ قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں، سیاسی اور معاشی شعبدہ بازیوں سے آگاہ کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مرزائیوں کا اخبار "الفضل" بھی آغا صاحب پر کیچڑ اچھالتا رہا۔ مگر آغا صاحب نے نہ صرف اپنی شاعری بلکہ صحافت اور خطابت کے ذریعے مرزائیوں کی کارگزاریوں کا محاسبہ جاری رکھا۔ اور لوگوں کو مجلس احرار کے موقف کی ترغیب دی۔ اور کہتے رہے کہ

فہم میں ختم نبوت کا مقام آئے گا۔ — شرط یہ ہے کہ ابو ذرؓ کی نظر لے کے چلو

محو ہو جائے گا دز دانِ نبوت کا گروہ — اپنے لہجہ میں بخاری کا اثر لے کے چلو[1]

آغا صاحب کی شاعری میں قادیانیوں کی جماعت وہ واحد جماعت ہے جس پر ان کی طنز کے تیر بڑے ہی تیزی سے برستے ہیں۔ جس کی وجہ آغا صاحب کی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت ہے اور اسی جذبے کے تحت وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہیں۔

میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے قادیاں کے باب میں
پارۂ الہام ہے آوازۂ جبریل ہے
میرا یہ لکھنا کہ ربوہ کی خلافت ہے فراڈ
خواجۂ کونینؐ کے ارشاد کی تکمیل ہے[2]

صحافتی تحریروں میں کبھی کبھی تو آغا صاحب اعتدال کا دامن بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا تھا جب انہیں قادیانیوں کی ژاژ خائی کا جواب دینا ہوتا تھا۔ مگر شاعری میں وہ ایسا نہیں کرتے بلکہ طنز کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں طنز شدت بھی اختیار کرتی ہے۔ مثلاً

قادیاں کے مغلیۂ مرحوم دہلی کے کلال۔
ان بتوں میں کون اس بازار کا پتا نہیں[3]
ہارڈنگ تھا قافیہ محمود احمد تھا ردیف۔
راز ایسا ہے کہ ہم پردہ اٹھا سکتے نہیں

۱۔ "چٹان" ۴ر مارچ ۱۹۶۳ء
۲۔ "چٹان" ۳۱ر جولائی ۱۹۶۷ء
۳۔ "چٹان" یکم اپریل ۱۹۷۴ء

یادگار ابنِ ملجم ہے غلام احمد کی پود ۔
ہم کسی عنوان اسے خاطر میں لا سکتے نہیں [۱]

اب چٹختی ہیں بہشتی مقبرے کی ہڈیاں ۔ اہلِ ربوہ کو بہر عنوان ننگا کر دیا
اپنے دادا کی نبوت کو تماشا کر دیا ۔ ناصر احمد نے مرے صوبہ کو رسوا کر دیا [۲]

قادیاں کیا ہے ؟ جہنم کی زمینِ ناقص ، ،
اس کے ذرات کی حدت سے عیاں ہوتا ہے [۳]

آزاد کشمیر کی اسمبلی نے جب مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا تو آغا صاحب نے کہا کر ،

پڑی ہے کھلبلی ربوہ کے ایوانِ خلافت میں
بہشتی مقبرے پر برق لہرائی بحمد اللہ

فضا میں اڑ رہی ہیں دھجیاں ظلی نبوت کی
اکٹھے ہو گئے اک صف میں لٹھائی بحمد اللہ

نبوت قادیاں کی سرزمیں میں ؟ توبہ توبہ کر
نتیجہ کیا ہے ؟ اس ٹولے کا پسپائی بحمد اللہ [۴]

اسی طرح یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں قادیانیوں کی خبر لی گئی ہے۔

قادیاں کیا ہے ؟ غلاظت عہد استعمار کی اس کی شہ رگ کے لئے بیک قضا ہو جاؤں گا

---

[۱] چٹان ۲۴ جون ۱۹۷۴ء
[۲] چٹان ۱۷ جون ۱۹۷۴ء
[۳] چٹان ۱۵ اپریل ۱۹۷۴ء
[۴] چٹان ۷ مئی ۱۹۷۳ء

ناصر احمد میرزا کے رو برد بیلوں کا ڈنرۃ۔ غازیان سربکف کا رہنما ہو جاؤں گا[1]

غضب خدا کا، رسول فرنگ کی امت

سر بر آرا ہے اسلام کی زمینوں میں[2]

مرزائیوں سے دین محمدؐ میں اختلال اردو زباں ہے ان کی خرافات سے علیل[3]

جس سیہ رو کو پچاس الماریوں پر ناز تھا

اس کے پیرو فطرتاً لابہ گری کرتے رہے[4]

قادیانیوں کو رسول فرنگ کی امت کہنا اور عہد استعمار کی غلاظت قرار دینا دراصل وہی بات ہے کہ مرزائی انگریز کی معنوی اولاد ہیں یا انگریز کا خود کاشتہ پودا۔ جس کا ذکر آغا صاحب کی تحریروں میں اکثر ملتا ہے۔ مرزا غلام احمد نے انگریزوں کی مدح میں کتابوں کی پچاس الماریاں لکھی تھیں جن کا ذکر متبنی غلام احمد بڑے فخر سے کرتے تھے ان سب باتوں کو آغا صاحب نے شعری جامہ پہنانے میں جس فنکاری کا ثبوت دیا ہے۔ اس سے آغا صاحب کے یہ عمومی خیالات بھی نئے اور انوکھے معلوم ہوتے ہیں۔ قادیانیوں کے بارے میں آغا صاحب کا موقف یہ ہے کہ یہ گروہ مسلمانوں میں رہ کر مسلمانوں سے غداری کرتا ہے اور پاکستان میں اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے۔ آغا صاحب مرزائیوں کو اسرائیل کے یہودیوں سے زیادہ خطرناک سمجھتے ہیں کیونکہ مرزائی بھی پاکستان کو توڑ کر اپنی ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اسی بنا پر انہوں نے مرزائیوں کی اس خواہش کو "عجمی اسرائیل" کا نام دیا ہے۔ مرزائیوں سے متعلق آغا صاحب کی نثر کی تمام کتابوں میں اس بات کا ذکر ملتا ہے جن پر پہلے تبصرہ ہو چکا ہے۔ شاعری میں بھی انہوں نے اسی موقف کا اعادہ

---

1. چٹان ۲۴، دسمبر ۱۹۷۳ء
2. چٹان ۵، مارچ ۱۹۷۳ء
3. چٹان ۲۲، اکتوبر ۱۹۷۳ء
4. چٹان ۲۴، جولائی ۱۹۷۶ء

کیا ہے ۔ مثلاً وہ کہتے ہیں ۔

؎ کرۂ ارض کی ہر عنوان سے تذلیل ہے قادیاں ! مابین ہندو پاک اسرائیل ہے
کاسہ لیسی کا حصارہ مخبری کا زہر ناب ان سیاسی مغبچوں کے خون میں تحلیل ہے[1]

؎ محو کرنا چاہیے مل جل کر اسرائیل کو ۔
ایک ربوہ، ایک حیفا، دونوں خانہ زاد ہیں[2]

غرض مرزائیوں سے متعلق آغا صاحب نے ایک ہی جیسے خیالات کا اظہار کیا ہے ۔

جعلی پیر اور علمائے سوء

آغا شورش کاشمیری جعلی پیروں ، صوفیوں ، ولیوں اور علمائے سوء کو معاشرے کا سب سے زیادہ گھٹیا اور خطرناک طبقہ خیال کرتے ہیں ۔ پاکستان میں دینی و اسلامی تعلیم کی کمی اور غربت و افلاس کی زیادتی کی وجہ سے ضعیف الاعتقادی عام ہے ۔ لہٰذا یہ پیر ، صوفی اور ملا قسم کے لوگ اس ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو لوٹتے، دھوکہ دیتے اور ان کی جہالت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں ۔ بقول آغا صاحب

" اس کھیپ نے لوگوں کی ضعیف الاعتقادی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے ۔ پہلے ماتم یہ تھا کہ لوگ علم و نظر کی گدیوں پر بیٹھ کر شیخیت کی آڑ میں شکار کرتے تھے ۔ نتیجۃً زخم خوردہ لوگ ان گدیوں پر بھی انگشت نمائی کرنے لگے ۔ جس سے درویشی پر کوئی آنچ نہ آ سکتی تھی ۔ مگر رفتہ رفتہ علم و نظر کی مسندیں پس منظر میں چلی گئیں اور ایشیاء میں مسلمانوں کے ذہنی زوال نے ان پر ایسے لوگ مسلط کر دیئے جن کا وجود علم و نظر کی جانکنی کا ہم معنی تھا ۔ ایک قلیل البضاعت قوم کے افراد ان پڑھ اور بے سمجھ پیروں کے

---

[1] چٹان ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء
[2] چٹان ۱۱ فروری ۱۹۷۲ء

نرغے میں چلے گئے۔ ہر شخص جس نے مجذوبیت اختیار کر لی اور چار مشٹنڈوں کو ساتھ لیا
ولی اللہ بن بیٹھا۔ بوجوہ اس قسم کے لوگ بڑھتے ہی گئے[۱]۔"

جس کی وجہ سے معاشرے میں برائیوں نے جنم لیا۔ اور لوگ اسلام کی تعلیم اور توحید پرستی کی جگہ پیر پرستی کے شرک میں مبتلا ہو گئے۔ اور پیر بھی ایسے جن کے متعلق آغا صاحب لکھتے ہیں

"یہ لوگ سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی معیت میں چند اوباش قسم کے مرید ہوتے ہیں۔ جن کا کام بچوں کو اغوا کرنا۔ لڑکیوں کی گمراہی اور عورتوں سے معاشقے کرنا ہوتا ہے۔ ان مجذوبوں۔ فقیروں۔ درویشوں۔ ولیوں کی زندگیاں اسلام سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں ان کا وجود ہی اسلامی تعلیمات کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے۔ یہ لوگ عجیب و غریب کلموں کے موجد اور ظالمانہ مسالک و طریق کے بانی ہیں[۲]۔"

آغا صاحب نے اسی قبیلے کے افراد کو طنز کا نشانہ بنا کر اس طرح ان کی پردہ دری کی ہے۔

؎ میں جانتا ہوں مجمعِ زہاد کا مزاج۔ | حجروں میں ان کو جلوۂ جانانہ چاہیے۔
پیر حیا فروش ہے محبوب در بغل | سادہ دلانِ شہر سے نذرانہ چاہیے

پہلو میں نازنیں ہو تو اسلام زندہ باد
ورنہ مزاجِ یار فقیرانہ چاہیے[۳]۔

آغا صاحب کے نزدیک ان لوگوں کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ

؎ اسلام ان کے دشنۂ الحاد کا شکار۔ مذہب کے اعتبار سے عضوِ ضعیف ہیں

۱۔ اداریہ ہفت روزہ چٹان جلد نمبر ۱۱، شمارہ نمبر ۴۳ اکتوبر ۱۹۵۸ء
۲۔ ایضاً ایضاً ایضاً
۳۔ چہ قلندرانہ گفتم شورش کاشمیری ص نمبر ۶۰

فطرت کے اعتبار سے دشنام واشگاف۔ پیشہ کی رو سے تاجرِ دینِ حنیف ہیں[1]

اسی طرح ان کے یہ اشعار بھی ان ہی لوگوں کی حالت کے ترجمان ہیں۔

دندناتے ہیں خانقاہوں میں — طعن کرتے ہیں خستہ حالوں پر
بیچ کھاتے ہیں چادرِ زہرا — جاں چھڑکتے ہیں خوش جمالوں پر
ثبت ہے ان کی داستانِ ہوس — بادۂ ناب کے پیالوں پر
دل سیہ خانہ ہوس کا شکار
روسیاہی سفید بالوں پر[2]

شورش صاحب علماء دین اور اہل اللہ سے بڑی عقیدت اور ارادت رکھتے ہیں۔ لیکن علماء سوء، جعلی پیروں اور مذہبی ریاکاروں کے دشمن ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ آغا صاحب کسی طرح کی رعایت کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ان لوگوں کو خاص طور پر طنز و ملامت کا نشانہ بنایا ہے۔ فقیہ شہر کا لفظ آغا صاحب کی شاعری میں مذہبی ریاکاروں جعلی پیروں اور علمائے سوء کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کہیں کہیں صوفی۔ ملّا۔ مولانا اور شیخ کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ لیکن فقیہ شہر کا لفظ ان کی شاعری میں بڑی کثرت کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

ہماری عید کے چہرے پہ ہے گرد و غبار اب تک
فقیہ شہر سے اسلام ہے شکوہ گذار اب تک[3]

بہت دنوں سے حرم کے چراغ مدھم ہیں
فقیہ شہر بتوں کا غلام ہے ساقی[4]

---

[1] چہ قلندرانہ گفتم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۸۴
[2] ایضاً — ایضاً — ص نمبر 91
[3-4] گفتنی و ناگفتنی — آغا شورش — ص نمبر ۱۳۰/۲۳۲

ے خروشِ نعرۂ پیکار سے خدا کی پناہ — فقیہ شہر کی گفتار سے خدا کی پناہ [1]

ے فقیہ شہر کلام خدا کا تاجر ہو۔ — خطیب شہر کو قرآں سے آگہی نہ رہے [2]

یہ چند مثالیں آغا صاحب کے مجموعۂ کلام "گفتنی و ناگفتنی" سے نقل کی گئی ہیں۔ یہی صورت ان کے باقی کلام کی ہے اور ان کا مجموعۂ کلام "چہ قلندرانہ گفتم" کا تو بیشتر حصہ اسی قبیلے کے لوگوں سے متعلق ہے۔ بعض اوقات وہ صوفی و ملاّ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً

ے فقیہ و صوفی و ملاّ کو خانقاہوں میں۔ — فغاں، کہ تاجر ام الکتاب دیکھا ہے [3]

ے قبائے ملاّ و صوفی کا نرخ سستا ہے۔ — بلالؓ چپ ہو اذانوں میں دلکشی نہ رہے [4]

بہرحال ان تمام الفاظ سے آغا صاحب کی مراد کوئی خاص مسلک یا کوئی خاص آدمی نہیں ہے۔ بلکہ ان سے مراد ہر وہ آدمی ہے جو مذہب کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دیتا ہو۔ جو اسلامی شعائر میں ظاہر و باطن کا تضاد رکھتا ہو۔ آغا صاحب ایسے تمام مذہبی بہروپیوں کو اسلام کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ اور ان سے پوچھتے ہیں

ے مار کر ڈاکہ مریدانِ ارادت کیش پر — خلوتوں میں مسکراؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

آئے دن خلوت کدوں میں نقد عصمت لوٹ کر — اپنے حجروں کو سجاؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

باندھ کر پلّے میں سجادہ نشینی کا غرور۔ — گدّیوں پر دندناؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

شیخ چلّی کے لطائف ہیں مدارِ گفتگو — میرؔ کی غزلیں سناؤ، کیا یہی اسلام ہے؟

حاشیہ ادرک کی چٹنی کا بھربری دال ہیں

قورمہ، فرنی، پلاؤ کیا یہی اسلام ہے [5]

۱،۲ے گفتنی و ناگفتنی — آغا شورش — ص نمبر ۲۴۴/ ۲۴۹

۳،۴ے گفتنی و ناگفتنی — آغا شورش — ص نمبر ۲۴۸/ ۲۴۹

۵ے چہ قلندرانہ گفتم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۷۹/ ۸۰

مندرجہ بالا اشعار میں ان نام نہاد مذہبی رہناؤں کے کردار پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ جنہیں اسلام اور اسلامی تعلیمات سے تو کوئی علاقہ نہیں لیکن انہوں نے مذہب کا جو لبادہ اوڑھ رکھا ہے اس نے ان کی صورتوں کو مقدس بنا دیا ہے۔ آغا صاحب ان کے جسم سے یہ لبادہ اتار کر لوگوں کو ان کی اصل صورت دکھانا چاہتے ہیں۔ جو نہ صرف بھیانک ہے بلکہ قابل نفرت بھی آغا صاحب علماء کرام کو قوم کا سب سے زیادہ محترم طبقہ سمجھتے تھے۔ وہ مشائخ اور پیران عظام سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی یہ محبت وعقیدت محض ان کے علم، تقویٰ اور سیرت وکردار کے اجلے پن کی وجہ سے ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اپنی وضع وقطع میں علماء ومشائخ کی نقل کر کے لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے تو ایسے ریاکار اور مذہب کے دکاندار علماء ومشائخ کے لئے آغا صاحب کے قلم میں رعایت کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ بلکہ ان لوگوں کے نقاب اتارنے میں بعض اوقات آغا صاحب اپنی شاعری میں اعتدال کا دامن بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ آغا صاحب ان لوگوں کو اسلام کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

ع اسلام اس کی تیغ سے مضروب ہو گیا
شورش فقیہ شہر سے پیچھا چھڑا ئیے[1]

لیکن آغا صاحب اس فقیہ شہر سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ بلکہ تمام عمر ہی ان سے مقابلہ کرتے رہے۔ ان لوگوں پر آغا صاحب کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے۔

ع قران کے احکام سے رکھتے نہیں رغبت۔ توحید کے اذکار سے کرتے ہیں کنارا
بے روک ہیں ان فتویٰ فروشوں کی زبانیں اسلاف کی توہین پہ کرتے ہیں گزارا[2]

پھر وہ یہ سمجھاتے ہیں کہ

ع توحید سے بڑھ کر نہیں دنیا میں کوئی چیز۔ قرآن جو کہتا ہے اسے عام کئے جا

---

[1] چٹان ۱۷ اکتوبر ۱۹۶۹ء
[2] چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۶۱

سجدہ ہے فقط خالق کونین کو جائز ۔ کونین کے سینہ پہ اسے نقش کئے جا ۔

سرمست تھے جس بادۂ عرفاں سے صحابہ اس بادۂ عرفاں کو شب و روز پئے جا

اللہ کی توحید، پیمبرؐ کی اطاعت
دارین کی دولت ہے اسے عام کئے جا [1]

پھر انہیں ٹوکتے ہیں کہ

ے اس فتنۂ جدید پہ خوف خدا کرو
یوں بے لگام ہو کے نہ فتوے دیا کرو [2]

کبھی وہ "بت خانہ بدعت کے عزیٰ" سے سوال کرتے ہیں کہ

ے سوچا بھی ہے کہ آپ ہیں کس سمت گامزن اے تاجرانِ دین ہدیٰ عقل و ہوش ہے
بے ربط گفتگو کو بنا کر اساس فکر لوگوں سے کہہ رہے ہو نوائے سروش ہے [3]

وہ لوگوں کو ان لوگوں کے اتباع سے روکتے ہیں ۔

ے واجب نہیں لطیفہ فروشوں کا اتباع
فہمِ حدیث جادۂ خیرالوریٰؐ سے مانگ [4]

پھر لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں ۔

ے ایرے غیرے بن گئے شیخ الحدیث لشکر بے نام کے آگے نہ جھک
واعظانِ شہر ہیں بدعت فروش اس سوادِ خام کے آگے نہ جھک [5]

۱-۲ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۷۰ / ۶۷
۳-۴ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۴۹ / ۸۲
۵ چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۴۸

دانشور، ادیب اور شاعر

ادیبوں اور شاعروں میں معاصرانہ چشمک تو ہوا ہی کرتی ہے۔ مگر آغا صاحب کی شاعری میں ادیبوں اور شاعروں کے متعلق جس طنز اور تبصرے کا اظہار ہوا ہے وہ معاصرانہ چشمک سے زیادہ چند اصولوں کی بنا پر ہے۔ شورش کاشمیری کے نزدیک وہ شاعر اور ادیب قابل مذمت ہیں جو حکام کے اغراض و مقاصد کے ترجمان ہوں یا سرکاری سرپرستی میں شعر و ادب کو حکومت کی قصیدہ خوانی اور سرکاری کارناموں کی تشہیر کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ حکومت کے اچھے کاموں میں معاون ہونا بری بات نہیں۔ لیکن حکومت کی سرپرستی میں حق گوئی سے باز رہنا، ناجائز کو جائز قرار دینا، عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی سے پہلوتہی کرنا، معاشرے میں موجود گھٹن اور برائیوں سے چشم پوشی کرنا اور اقتدار کے مخصوص اغراض و مقاصد کے حصول میں مدد دینا۔ زندگی کی عکاسی نہ کرنا۔ اور حکومت سے ناجائز مراعات حاصل کرنا۔ بہر حال ادیبوں، شاعروں۔ دانشوروں اور قلم کاروں کو زیب نہیں دیتا۔ شورش صاحب اس سلسلے میں کسی خاص آدمی پر اعتراض نہیں کرتے، وہ کسی خاص گروہ کے بھی مخالف نہیں اور نہ ہی کسی خاص تحریک سے وابستہ افراد کے خلاف ہیں، بلکہ ان کا ہدف ایسے لوگ ہیں جو شاعر۔ ادیب۔ صحافی اور قلم کار بن ہی اس لئے بیٹھے ہیں کہ ہر حکومت کی مدح سرائی اور حاشیہ آرائی سے روپیہ، پیسہ یا ناجائز مراعات حاصل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب اس قسم کی پیشہ ور مخلوق کو ان الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہمارے صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور قلم کاروں کی ایک بڑی کھیپ نے اپنے فن میں کسبیوں کو بھی شہ مات دی ہے۔"[1]

یہی حال دانشوروں کا ہے۔ آغا صاحب لکھتے ہیں

"دانشور پاکستان کی دناعی فضا کا سب سے مہمل لفظ ہے۔ ایوب خان مرحوم کے زمانے میں یہ لفظ ایجاد ہوا۔ اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا تھا۔ جو لکھنے کی صلاحیت سے محروم، سوچنے کی طاقت سے درماندہ اور بولنے کی سلاست سے عاجز تھے۔ لیکن حکومت کے لئے ہر اسٹیج پر

---

[1] چٹان ۲۵ مارچ ۱۹۷۴ء

رقص کرنا ان کا شیوۂ خاص تھا۔ .... ان دانشوروں کے متعلق بس یہ کہہ دینا کافی ہے کہ ان کا علمی وجود ذہنی لحاظ سے مخنثوں کی ڈار ہے۔ ان احمقوں سے سانپ، بچھو، گدھ اور سوسمار کہیں اچھے ہیں۔"[1]

آغا صاحب کی دانشوروں سے مخالفت کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ

"پاکستان سیاستدانوں کے ہاتھوں پامال ہوا۔ لیکن دانشوروں کے ہاتھوں بزدل ہو گیا۔"[2]

آغا صاحب دانشوروں کو مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ جن سے ان کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے مثلاً وہ کہتے ہیں۔

"ہو سکتا ہے محاوروں کی ترقی سے چکنا گھڑا ہی دانشور ہو گیا ہو۔ اگر واقعی یہ ترقی ہوئی ہے جس طرح گناہ نے ترقی کر کے اپنا نام آرٹ رکھ لیا ہے تو ذہن میں اس کی ایک تصویر بن سکتی ہے"[3]

اس طرح وہ ان لوگوں کی اصل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

"یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ بعض کم مایہ لوگوں نے جن کی عقلیں مغربی تعلیم میں ڈھلی ہیں لیکن عقل کی کمی اور زنگ زیادہ ہے۔ اپنے آپ کو مشخص کرنے کے لئے اپنا نام دانشور رکھ لیا ہے اور اگر واقعی انہیں زعم ہو گیا ہے کہ وہ دانشور ہیں تو پھر اس کیمپ کی تصویر اس کے سوا کچھ نہیں کہ اک معزز پیٹ ہیں۔"[4]

غرض آغا صاحب کی تحریروں کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ان لوگوں کے متعلق یہ علم ہو جاتا ہے کہ یہ خود غرض اور طامع

۱۔ چٹان ۳۰ ر جولائی تا ۵ ر اگست سنہ ۱۹۷۴ء

۲۔ چٹان ۲۵ ر مارچ سنہ ۱۹۷۴ء

۳۔ چٹان ۱۸ ر دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء

۴۔ چٹان ۱۸ ر دسمبر سنہ ۱۹۶۷ء

آزما قسم کے لوگ ہیں جنہوں نے ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا لبادہ پہن رکھا ہے۔ اس ریاکاری اور فریب دہی کی وجہ سے آغا صاحب نے ان کو اپنی شاعری میں طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ آغا صاحب نے اس مخلوق کا حلیہ یہ بتایا ہے،

"قد داستان عمرو عیار، چہرہ رتن بھارتی کے ناول کا خوبصورت گردپوش، آنکھیں خرابی، ہونٹ گلابی، رنگ عنابی، کام خانہ خرابی۔ جس طرز کا، جس عنوان سے، جس ڈھب پر، جس رنگ میں جو موضوع یا عنوان شرعی و سیاسی، یا ادبی و تہذیبی ذہن میں ہو اس پیران بزرجمہروں سے مقالہ یا مضمون لکھوایا جاسکتا ہے۔ انہیں مال سے غرض ہے، گاہک سے مطلب ہے، آپ پیسہ ان کے حوالے کیجئے اور قلم کو حرکت میں لے آئیے۔ ایک ہی وقت میں یکساں شدت و تاثیر کے ساتھ سہرا و مرثیہ لکھنے میں انہیں کوئی دقت محسوس نہ ہوگی ...... بہرحال ان کی ذات ان کمالات کا مجموعہ ہے جن کمالات کی ضرورت ہر دور کی ہر حکومت کو رہی ہے[1]"

ان دانشوروں کی وجہ سے شعروادب کی جو حالت ہوئی وہ " دانشور ۔ فکرونظر کا ایک نیا قبیلہ " کے عنوان سے لکھے گئے ان اشعار میں ملتی ہے۔

ے حسن خیال یار نکو نام ہوگیا۔ ذوق ادب حوالۂ حکام ہوگیا۔

پیشہ وران فن کی بدولت خدا گواہ دانشوروں کا لفظ بھی دشنام ہوگیا

شعروادب کی آب رقیبوں نے لوٹ لی. اہل قلم کا زور بیاں خام ہوگیا.

سلوٹ جو شہریار کے ماتھے پر آگئی، نام اس بلا کا گردش ایام ہوگیا

ذلہ ربا ہوئے ہیں ادب کے اجارہ دار

شورش مذاق شعر و سخن خام ہوگیا[2] .

---

[1] شذرہ سہیلی بوجھ پہیلی شورش کاشمیری چٹان ۱۴ر فروری ۱۹۶۶ء ص نمبر ۵/ ۱۸

[2] چٹان ۱۸ر اپریل ۱۹۶۶ء

۲۵ر جنوری ۱۹۶۵ء کے ہفت روزہ چٹان میں آغا صاحب کی ایک نظم "ہم اہل قلم کیا ہیں" کے عنوان سے چھپی تھی۔ اس نظم پر آغا صاحب نے یہ نوٹ دیا ہے۔

"ورکنگ جرنلسٹوں کی اکثریت نے پچھلے پندرہ سولہ برس میں اخبار نویسی کو جو شرف بخشا ہے۔ یہ نظم اس کا ایک پرتو ہے۔ روئے سخن کسی طرف ہو تو روسیاہ، بہرحال ایک اجتماعی تصویر ضرور آگئی ہے۔ تمام اشعار صحافیوں ہی کی تصویر نہیں بلکہ ان میں ادیبوں اور شاعروں کی اس کھیپ کا چہرہ بھی نظر آرہا ہے جو طاقت کی محراب میں مدۃ العمر سے سجدہ کناں ہیں اور جن کی پرونناری جبینوں پر بڑے بڑے سیٹھوں کی تجوریوں کے درخشندہ داغ ہیں۔ ان تلخ نوائیوں کے لئے ہم اپنے ان مخلص اہل قلم سے معذرت خواہ ہیں جو ہماری ہی طرح اس قبیلے کے فرد ہیں۔ لیکن جن کا سینہ فکر و نظر کی دیانت کے اعتبار سے ایمان کا خزینہ ہے۔ نظم بلند نہ سہی لیکن حقیقت سے قریب ہے۔"[1]

اس نظم کے چند بند یہ ہیں۔

ع الفاظ کا جھگڑا ہیں بے جوڑ سراپا ہیں۔
بجتا ہوا ڈنکا ہیں ہر دیگ کا چمچا ہیں۔
— ہم اہل قلم کیا ہیں
مشہور صحافی ہیں۔ عنوانِ معافی ہیں
شاہانہ قصیدوں کے بے ربط قوافی ہیں
— ہم اہل قلم کیا ہیں
تابع ہیں وزیروں کے خادم ہیں امیروں کے

---

[1] چٹان ۲۵ر جنوری ۱۹۶۵

قاتل ہیں اسیروں کے   دشمن ہیں فقیروں کے

— ہم اہل قلم کیا ہیں

اوصاف سے عاری ہیں۔   نوری ہیں نہ ناری ہیں

طاقت کے پجاری ہیں   لفظوں کے مداری ہیں

— ہم اہل قلم کیا ہیں[1]

اسی طرح ان کی نظم "فقیہ و ادیب" کے چند اشعار ہیں

ے ادب کے دلکشا چہرے کی رونق کو ہوا کیا ہے

غزل کے پیرہن میں آخر شب کی صدا کیا ہے

قصیدوں پر قصیدے لکھ رہے ہو بے دماغوں کے

قلمکارو! ذرا یہ تو بتاؤ ماجرا کیا ہے

خدا کے خوف کو لے آئے ہو نیلام گاہوں میں

کبھی سوچا بھی ہے اس شوخ چشمی کی سزا کیا ہے[2]

آغا صاحب کا یہ خطاب بھی "قلم کاران پاکستان" کے نام ہے۔

ے اب کسی لے میں حرارت نہیں للکار نہیں۔   ملک مغموم ہے لیکن کوئی فنکار نہیں

بک گئے اہل قلم وقت کے درباروں میں   اس سے آگے جو کہوں طاقت گفتار نہیں

وہ ہزاری ہیں ترقی کے علمدار نہیں

سب حکومت کے ملازم ہیں قلمکار نہیں[3]

---

[1] چٹان   ۲۵ر جنوری ۱۹۶۵ء

[2] چٹان   ۲۲ر اگست ۱۹۶۶ء

[3] چٹان   ۲۷ر نومبر ۱۹۷۲ء

آغا صاحب قلم کو عوام کی امانت سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی قلم کے تقدس کو مجروح نہ ہونے دیں۔ شورش صاحب کا مسلک یہ ہے کہ قلم کی آبرو خود انسان کی آبرو ہے اور قلم کا بے آبرو ہوجانا گویا انسانیت کا بے آبرو ہوجانا ہے۔ لہذا ہر صاحب قلم کا فرض ہے کہ وہ قلم کی حفاظت اپنی آبرو کی طرح کرے۔ ان کے نزدیک قلم اس وقت بے توقیر ہوتا ہے جب اس کا لکھا ہوا ایک شوشہ بھی بک جائے۔ وہ قلم کا کاروبار کرنے والوں کو طوائف اور کسبی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا "عہد" کرتے ہیں کہ

؎ اگر تصرف گل چیں رہا بہاروں پر — تو پھر میں ان کا ہو تک نچوڑ لاؤں گا۔
مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے — میں اپنے فرض کو ہر حال میں نبھاؤں گا

یہی وجہ ہے کہ وہ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ

؎ لرزاں ہیں میرے نام کی ہیبت سے کاسہ لیس
ارباب اقتدار کا نوکر نہیں ہوں میں۔
مجھ کو رہا ہے فن خوشامد سے احتراز
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کا خوگر نہیں ہوں میں

ضرب خودی ہوں تاج شہی کے غرور پر
حلقہ بگوش سنجر و قیصر نہیں ہوں میں[1]

اسی طرح وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں

؎ یہ جرم مجھ فقیر سے ہوگا نہ حشر تک — ارباب اختیار کی مدح و ثنا کروں
اس سے بڑا گناہ نہیں اس زمین پر — جو لوگ راہزن ہیں انہیں راہنما کروں[2]

---

[1] گفتنی و ناگفتنی — ص نمبر ۹۱

[2] چہ قلندرانہ گفتم — ص نمبر ۳۱

حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب اپنے دعووں میں غلط نہ تھے۔ ان سے ارباب اختیار کی مدح کا گناہ کبھی سرزد نہیں ہوا۔ اور انہوں نے کبھی راہزنوں کو راہنما بھی نہیں کہا۔ اسی بنا پر ان کے نام سے کاسہ لیس لرزاں رہتے تھے۔ آغا صاحب یہی خصوصیات دوسرے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور اگر کبھی حق گوئی کی بنیاد پر ان ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں پر افتاد پڑی تو شورش صاحب نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ یہ اشعار انہوں نے "ہم قلم رفیقوں کی گرفتاری پر" کہے ہیں۔

اس ابتلا کا نام ہے ایثار دوستو۔ ❊ میرا سلام شوقِ قلمکار دوستو

ضبطِ فغاں کہ ضبطِ زباں سب گذشتنی ❊ لائے گی رنگ جرأتِ گفتار دوستو

اہلِ قلم کی آبرو دہ چند ہوگئی۔

نکلی ہے جب نیام سے تلوار دوستو۔[1]

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب نے ہر حکومت کا احتساب کیا اور لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ حکمرانوں کو من مانی کرنے سے روکیں۔ وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ ارباب اختیار قلم کاروں سے کس بات کی توقع رکھتے ہیں۔ وہ اقتدار کی اس مذموم کوشش کو "ابتلا" کا نام دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اسی کا نام زمانے میں ابتلا ہے دوست ❊ ہم ایسے لوگ بتوں کو بلند و بام کریں۔

قلندروں کی سیادت پہ اکتفا کر کے ❊ گرہ کٹوں کی جماعت کا احترام کریں

وہ جن کا نام شریفوں میں ایک گالی ہو ❊ انہیں ہم ایسے قلمکار بھی سلام کریں

مرے خدا یہ سزا کس لئے ہمیں دی ہے ❊ کہ ہم گداؤں کے سرخیل کو امام کریں

عجیب کام ہے جس پر لگا دیا ہے ہمیں ❊ کہ دھوپ چھاؤں کے بیٹوں کو نیک نام کریں

بنوں کو قبلۂ حاجات کا لقب بخشیں ❊ برائے شکم خلافِ ضمیر کام کریں[2]

---

[1] چٹان ۱۷ اپریل ۱۹۷۲ء

[2] چٹان ۲۱ مارچ ۱۹۶۶ء

جو ادیب، شاعر اور دانشور اس ابتلا سے نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ آغا صاحب کے نزدیک بڑے ہی محترم ٹھہرے لیکن جنہوں نے پیٹ کے لئے اپنے ضمیر کے خلاف کام کیا۔ جنہوں نے دھوپ چھاؤں کے بیٹوں کو نیک نام کرنے کے لئے اپنے قلم وقف کر دیئے، جنہوں نے اس عجیب کام میں حصہ لے کر قلندروں کی سیادت کو کافی سمجھتے ہوئے گرہ کٹوں کا احترام کرنا شروع کر دیا۔ وہ آغا صاحب کے معتوب ٹھہرے۔ اس سلسلے میں رائٹرز گلڈ سے وابستہ ادیب و شاعر خاص طور پر آغا صاحب کی طنز کا ہدف بنے ہیں۔ لیکن آغا صاحب نے سوائے جمیل الدین عالیؔ کے کسی شاعر اور ادیب کا نام نہیں لیا۔ اس ادارے سے ناراض ہونے کی وجہ بھی صرف یہی نظر آتی ہے کہ اس ادارے کو سرکاری سرپرستی حاصل تھی۔ یہ ادارہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور حکومت میں قائم ہوا[۱]۔ اس کا مقصد بظاہر ادب نوازی تھا۔ مگر اس ادارے کے بعض اراکین نے سرکار نوازی شروع کر دی[۲]۔ اس سرکاری سرپرستی کے سلسلے میں بڑے بڑے سرمایہ داروں نے سرکاری شہ پہ سالانہ انعامات دینے کا انتظام کیا[۳]۔ اور ان انعامات کی تقسیم میں ایک ہی نظریے کے لوگوں کا نام لیا جانے لگا منصفین حضرات بھی اسی نظریۂ ادب کے داعی ہوتے تھے[۴]۔ جناب جمیل الدین عالیؔ چونکہ اس ادارے کے "بادشاہ گر" تھے[۵] لہذا آغا صاحب نے ان کا نام لے کر اس ادارے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں

سنا ہے آج کل دانشوری پروان چڑھتی ہے
بکاؤ مال کے بازار میں "روشن ضمیروں" سے

کہتا کیا ہے؟ خدا کا خوف کیجے حضرت والا
بھلائی کی توقع اس صدی میں ان امیروں سے

جمیل الدین عالیؔ جانشین داغ ہیں صاحب
ادب چھلنی ہوا اس مملکت میں ان کے تیروں سے

قلمکاروں نے خرکاروں کی شورش نوکری کر لی
قلم رسوا ہوا اس دور کے ان سور بیروں سے[۶]

---

[۱] تا [۵] مضمون رائٹرز گلڈ خالد ادیب چٹان ۱۴ مارچ ۱۹۶۴ء ص نمبر ۷ [۶] چٹان ۱۴ ستمبر ۱۹۶۷ء

ے اس زمانے کے ادیبوں کی روایت کیا ہے۔

شہریاروں کے لئے سرو وسمن لے کے چلو

کاسہ لیسانہ بدیہہ گوئی کے ویرانے ہیں۔

رائٹرز گلڈ کا اسلوب سخن لے کے چلو [1]

ے او قلم کارو! خدا کے خوف سے ڈرتے رہو

اس قبیلے کی بڑی تعداد زیر دام ہے

دہ ہزاری ہیں مصنف ، شش ہزاری ہیں اُدَب

نام اس کا گلڈ کے الفاظ ہیں انعام ہے [2]

اس کے علاوہ بھی آغا صاحب نے اپنے کلام میں ایسے ہی ادیبوں اور شاعروں اور دانشوروں سے متعلق بہت سے اشعار کہے ہیں ۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں ۔

ے نامناسب ہے قلم کے تاجروں کا نام لوں ۔۔۔ اس بکاؤ مال کا ہر کٹ کتنا بدنام ہے

ٹیلی ویژن پر حکومت کی ثنا خوانی کریں ۔۔۔ آج کل دانش فروشی کا یہی اک کام ہے [3]

ے میکدہ لٹ گیا عیاش قلم کاروں میں ۔

ہیں شرابی نہیں اے پیر مغاں سوچنے دے [4]

ے خیرہ چشمان سیاست، خود فروشانِ ادب ۔۔۔ اس قبیلے پر یقیں شورش کبھو مت کیجیو [5]

---

[1] چٹان ۹، اگست سنہ ۱۹۷۶ء

[2] چٹان ۲۱، فروری سنہ ۱۹۷۶ء

[3] چٹان ۱۱، دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء

[4] چٹان ۱۰، جولائی سنہ ۱۹۷۲ء

[5] چٹان ۳، مارچ تا ۹ مارچ سنہ ۱۹۶۹ء

ع قلم فروش ادیبوں کے خدوخال کی خیر یہ اک گروہ ہے اس دور کے رذالوں کا[1]

ع واقعہ اتنا ہے شورش اس زمانے کے ادیب بندگانِ سیم وزر کی بندگی کرتے رہے[2]

ع دلی خواہش ہے ان دانشوروں کی صورتیں پرکھوں
جنہیں جینے نہیں دیتی دغا ان کی وفا میری
میں ان بہروپیوں کو جانتا ہوں ظاہر و باہر
کئی برسوں سے ہے جن کے تعاقب میں وفا میری
ادب کے نام پر ڈاکہ زنی بازار اردو میں،
اسے تحریر میں لاؤں تو بنتی ہے خطا میری[3]

آغا صاحب اپنی شاعری میں ان شاعروں ، ادیبوں اور دانشوروں پر طنز و تنقید ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں یہ درس بھی دیتے ہیں کہ

ع ملتا نہیں مانگے سے کبھی حق نگارش قربانی و ایثار کے کوچے میں صدا کر
تسلیم کہ یہ رات کڑی بھی ہے سیاہ بھی یہ رات نکل جائے گی ہمت تو ذرا کر[4]

گویا آغا صاحب شاعروں ، ادیبوں اور دانشوروں کو باہمت اور غیور دیکھنا چاہتے ہیں ۔ آغا صاحب نے اپنی طنزیہ شاعری میں بعض سیاسی اور دینی جماعتوں اور ان کے افراد پر بھی طنز کی ہے اور بعض ادبی مرکزوں میں ہم عصر لکھنے والے بھی طنز کا نشانہ بنے ہیں ۔ سیاسی جماعتوں میں مسلم لیگ ، پاکستان اور اشتراکی نظریات رکھنے والی

---

[1] چٹان ۳ر فروری ۱۹۶۴ء

[2] چٹان ۲۴ر جولائی ۱۹۶۷ء

[3] چٹان ۴ر اپریل ۱۹۶۶ء

[4] چٹان ۲۲ر مارچ ۱۹۶۵ء

پارٹیاں اور ان کے افراد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ مذہبی جماعتوں میں بریلوی مکتب فکر کے افراد شامل ہیں۔ جس پر آغا صاحب کی کتاب "چہ قلندرانہ گفتم" کے ضمن میں تبصرہ کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح سیاسی شاعری کے ضمن میں مسلم لیگ اور اس کے افراد پر بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ یہاں پر ہم اشتراکی نظریات رکھنے والی پارٹیوں اور معاصرانہ ادبی معرکوں کے افراد کا تذکرہ کریں گے۔ جنہیں آغا صاحب نے اپنی شاعری میں خاص طور پر طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

اشتراکی سوشلزم کے داعی تھے اور آغا صاحب پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے تھے۔ لہذا انہوں نے پاکستان میں سوشلزم کی زبردست مخالفت کی اور اپنی شاعری کے ذریعے ان جماعتوں اور ان کے افراد پر طنز کیا۔ اشتراکیوں کی مخالفت آغا صاحب نے صرف اور صرف اپنے نظریاتی اصولوں کی بنیاد پر کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اسلام کے سوا اس ملک میں کسی دوسرے نظریہ کا نام بھی لیا جائے۔ آغا صاحب اپنی شاعری میں اشتراکی نظریات کے حامل افراد کو "سرخے" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اشتراکیوں کے کارکنوں کی اجتماعی تصویر انہوں نے اس طرح بنائی ہے۔ یہ اشعار ان دنوں لکھے گئے، جن دنوں اشتراکیوں نے آغا صاحب کی صحافتی یلغار کی تاب نہ لاتے ہوئے ان کے ہفت روزہ اخبار چٹان کے دفتر پر سنگباری کی تھی۔

رات کے تاریک سناٹوں کی پیداوار ہیں	یہ وہ سیاسی زاچے جو خنجر خونخوار ہیں۔
جا لعالم کے کھلونے داغ کے شہکار ہیں	چمپئی چہروں پہ بل کھائی لٹوں کے زاویے
اور خوبی ہے تو بس اتنی کہ یہ میخوار ہیں۔	سنگباری کے سوا ان میں کوئی خوبی نہیں
ایک وحشت ناک افسانہ سر بازار ہیں۔	ایک نستعلیق گالی منچلوں کے روپ میں
ہم جہاد فی سبیل اللہ کی للکار ہیں۔	اپنے دل پر نقش کر لیں اشتراکی کوچہ گرد

ایک نا بالغ سیاسی راہنما کے منہ سے
ہو گیا ثابت کہ سب اسلام کے غدار ہیں[1]

---

[1] ہفت روزہ چٹان ۲۴ مارچ ۱۹۶۹ء

یہ اشعار بھی ایسی جماعت اور کارکنوں سے متعلق ہیں۔

ے اس جماعت کا ڈٹو بنا لازم جس کے ارکان تک اصیل نہیں۔
نوجواں پود سر پیٹتی ہے ایک بھی راہنما خلیل نہیں [1]

ے انقلاب عوام کی رو میں تیغچہ بے نیام کرتا جا۔
او سیاست کے رہنمائے جدید نسل نو بے لگام کرتا جا۔ [2]

ان اشتراکی راہنماؤں کا ساتھ کچھ علمائے کرام نے بھی دیا تھا۔ لہذا آغا صاحب ان علمائے کرام کے بھی خلاف ہوگئے۔ آغا صاحب " ہوالشافی " کے عنوان سے ان اشعار میں انہی علمائے کرام سے مخاطب ہیں۔

ے ان عالمان دین کے قربان جایئے سرخوں کا مال کھا کے حدیثیں پڑھایئے
مضبوط ہو گی ریڑھ کی ہڈی بہ التزام پیر مغاں سے لے کر سلاجیت کھایئے
اس سے بڑھے گی فتویٰ و تقویٰ کی آبرو اسلام کے خلاف تماشا رچایئے
تی خوف، شین شان، چون چانگ نا او ف ان سب محدثیں کا ڈنکا بجایئے
سرخوں کے ہمرکاب تہجد کا ہے ثواب یا شیخ! میکدے میں مصلیٰ بچھایئے

اسلام اس کی تیغ سے مغروب ہو گیا۔
شورش فقیہ شہر سے پیچھا چھڑایئے [3]

آغا صاحب کو اشتراکیوں سے زیادہ ان علمائے کرام سے بجا طور پر شکوہ ہے جنہوں نے اشتراکی فلسفہ کی حزر رسانیوں کو سمجھے بغیر اشتراکی فکر کا ساتھ دیا۔ گو بعد کو ان علمائے کرام کو اس بات کا احساس بھی ہو گیا تھا۔ اشتراکی فکر میں اسلامی فکر کا رنگ نام کے طور پر تو استعمال ہو سکتا ہے۔ لیکن عملی طور پر یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اشتراکی فلسفے کی بنیاد ہی لادینیت

---

[1] ہفت روزہ چٹان یکم جنوری ۱۹۷۳ء

[2] ہفت روزہ چٹان ۱۹، مارچ ۱۹۷۳ء

[3] ہفت روزہ چٹان ۶، اکتوبر ۱۹۶۹ء

پر ہے ۔ آغا صاحب نے اپنی شاعری میں ان علمائے کرام کو سرخوں سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں یاد کیا ہے ۔ آغا صاحب " نگہ کی نامسلمانی سے فریاد " کرتے ہیں کہ

کوششیں سرخوں کی آخر کار بار آور ہوئیں — مٹ گیا اس مملکت سے امتیاز کفر و دیں
واعظوں کا بھاؤ پہلے سے بھی سستا ہو گیا — رونقیں محراب و منبر کی نٹافٹ بک گئیں
قوم کی خدمت تلعب، دین کی خدمت فراڈ — ان سیاسی تجربوں نے میری آنکھیں کھول دیں
میں نے ٹوکا جب کسی ملا کو اس کے کفر پر — شرع کے لہجہ میں اس نے گالیاں مجھ کو سنیں

خوانِ استعمار پر سرخوں سے سبزے مل گئے
یا شفیع المذنبیں، یا رحمۃ للعالمیں[1]

آغا صاحب نے جہاں عوامی دور کے بعض بڑے بڑے رہنماؤں پر بھی تبصرہ کیا ہے وہاں اس دور کی سیاسی حالت پر چوٹ بھی کی ہے ۔ میاں محمود علی قصوری آغا صاحب کے دوستوں میں سے ہیں ۔ صدر محمد ایوب خان کے دورِ حکومت میں جب آغا صاحب پر مقدمے قائم ہوئے، چٹان کا ڈیکلریشن منسوخ ہوا اور پریس ضبط کر لیا گیا تو میاں محمود علی قصوری نے نہ صرف حکومت کی مذمت کی بلکہ آغا صاحب کی طرف سے قانونی چارہ جوئی کرنے کے سلسلے میں مشورہ بھی دیا[2] ۔ لیکن جونہی میاں محمود علی قصوری عوامی حکومت میں چلے گئے تو آغا صاحب نے اس دوستی اور اخلاص کے باوجود میاں صاحب کے اس طرزِ عمل کو پسند نہیں کیا ۔ بلکہ میاں محمود علی قصوری کی نذر یہ شعر کئے تھے ۔

وکالت میں سینہ سپر ہونے والا — زمینِ سخن میں گہر بونے والا
بڑے ٹھاٹھ سے گفتگو کرنے والا — نئے دور کی آرزو کرنے والا
یہ طرہ تھا اس کا، یہ اس کی پھبن تھی — اسے شہری آزادیوں کی لگن تھی

۱۔ چٹان ۶ر اکتوبر ۱۹۶۹ء

۲۔ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۷۶

رہ و رسم مہر و وفا چھوڑ بیٹھا　　پرانے رفیقوں کا دل توڑ بیٹھا

شرافت سرِ رہگذر مر رہی ہے　　ذہانت، جہالت کا دم بھر رہی ہے

برس دو برس ہی میں کیا ہوگیا ہے　　نشست ایک لے کر فنا ہوگیا ہے

سیہ مست کو رہنما کر لیا ہے

وڈیرے کو اپنا خدا کر لیا ہے[1]

اسی طرح مولانا کوثر نیازی سے آغا صاحب کا اختلاف ہوا جس نے باقاعدہ لڑائی کی صورت اختیار کرلی۔ بعد کو مولانا کوثر نیازی عوامی دور میں وزیر ہوگئے تھے اور سوشلزم کی پاسداری کرتے تھے۔ لہذا آغا صاحب نے ان کے خلاف نظم و نثر میں خوب لکھا۔ لیکن شاعری میں آغا صاحب نے جو کچھ لکھا اس نے اس تلخی کو بھی خوشگوار بنا دیا ہے۔ مثلاً "بنا سپتی مولانا" کے عنوان سے جو اشعار کہے گئے ہیں وہ ہر اس مولانا پر منطبق ہوتے ہیں جو بناسپتی ہو۔ اشعار یہ ہیں۔

؎ بباطن دخترِ انگور کے عشاق کی صف میں۔　　بظاہر کوثر و تسنیم کہلاتے ہیں مولانا

سنا ہے آجکل اک جیب کترے کی معیت میں　　کلام اللہ کی تفسیر فرماتے ہیں مولانا

غضب کی شوخیاں مضمر ہیں اس لوٹن کبوتر میں　　پھریرے کی طرح منبر پہ لہراتے ہیں مولانا

ہزاروں چوچلوں کا روپ اس بانی عمر یا میں　　مگر ابلیس کی شوخی سے کہلاتے ہیں مولانا

جنہیں یارانِ محفل، میرؔ کا مطلع سمجھتے ہیں۔

الٰہ العالمین، وہ لوگ بن جاتے ہیں مولانا[2]

آغا صاحب نے اپنی شاعری میں حکومت کے بعض کاسہ لیسوں اور خوشامدیوں پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی نظم "دربار اکبری" میں ان ہی لوگوں کے چلن کی عکاسی کی گئی ہے۔

---

[1] چٹان　　۶، دسمبر ۱۹۷۱ء

[2] چٹان　　یکم اگست ۱۹۶۶ء

ے سیاست کے زہرہ جبینوں کی خیر۔ ہمیبر³ کے ان نکتہ چینوں کی خیر۔
قلم کی روش پر حسینوں کی خیر یہ سب سانپ ہیں آستینوں کی خیر
سلامت رہیں بندگان حضور

یہاں مرگئے یا وہاں مرگئے، نشان چھوڑ کر بے نشاں مرگئے
وزیروں کے پیر مغان مرگئے ابوالفضل و فیضی کہاں مرگئے
سلامت رہیں بندگان حضور

وہ جس کے منڈیروں پہ تھے چند زاغ لقب جن کا چھجے، تخلص ایاغ
وہ آنکھوں کا لگرا وہ سینے کا داغ وہ فتراک، نخچیر تھا کالا باغ
سلامت رہیں بندگان حضور

بڑے لاٹ صاحب کی دربانیاں زبان غزل میں تھیں کرمانیاں
بہت دن سہی ہیں ستم رانیاں سیاسی مسافت کی حیرانیاں
سلامت رہیں بندگان حضور[۱]

۲۵ر اپریل ۱۹۶۶ء کے چٹان میں آغا صاحب نے "لاہور نامہ" کے کالم نویس کی سیرت اور صورت کا خاکہ اڑایا ہے۔ سیرت اور صورت دونوں پر طنز کے تیر برسائے ہیں۔ ان اشعار کا عنوان "لاہور نامہ" ہے۔

ے میرٹھ اور اس کے نواحی کی زباں کا پاسدار ڈیڑھ فٹ کی قد وقامت میں ادیب خام کار
ذات اس کی کٹ کھنوں کے روزمرہ کی دلیل کام اس کا انتشار و انتشار و انتشار
اس کے لہجے میں نخاسہ کی ہناری کا مزہ چاوڑی کے اکے والوں کی زباں کا اشتہار
نون غنہ کی جراحت اس کی ستواں ناک میں وصل کے ہمزہ کی شوخی اس کے چہرے کا نکھار

---

[۱] چٹان ۲۲ر دسمبر ۱۹۶۹ء

روزناموں کے جزیرے میں فکاہی مسخرہ — خود غلط، املا غلط، انشا غلط کی یادگار
طنز کے دریا میں غیبت کا تعفن موجزن — اڑ رہا ہے شہر میں "لاہور نامہ" کا غبار
چال بے ڈھنگی، قلم دشنہ، طبیعت عقربی — ہر کسی پہ طعن کرنا اس کا دیرینہ شعار
وائے اردو اس مچھندر کی نگاہ ناز میں
کوئی بھی جچتا نہیں پنجاب کا معجز نگار[1]

مندرجہ بالا مثالوں کے علاوہ اور بہت سے لوگ ہیں جن پر آغا صاحب نے اپنی شاعری میں طنز کیا ہے۔

مشاہیر پرستی۔

ہر وہ کام جس میں عظمت کا کوئی پہلو ہو انسانوں کو بڑا اور عظیم بنا دیتا ہے۔ وہ انسان جنہوں نے بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے بڑے بڑے کارنامے انجام دیئے۔ جنہوں نے اپنے طرز عمل سے ملکوں اور اقوام کی تقدیریں بدل دیں، جو نیکی اور حق گوئی کے مرقعے، جو قربانی و ایثار کے مینار اور انسانیت کا ہار سنگار ہیں۔ مشاہیر کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں۔ تو میں ایسے نفوس کو ان کے کارناموں، تعلیمات و افکار اور سیرت و کردار کی بنا پر اپنی قومی تاریخ میں جگہ دیتی ہیں اور نہیں چاہتیں کہ ان کے کارناموں کو بھلا دیا جائے۔ بلکہ ان کو یاد رکھتی ہیں تاکہ ان کے افکار اور کارناموں سے آئندہ کے لئے روشنی حاصل کی جائے اور نسل نو کو فعال بنانے میں محرک کا کام دیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اس حقیقت کے متعلق لکھا ہے کہ

> "دنیا کی ہر قوم نے اپنے ماضی کے ان واقعات و حوادث کی ہمیشہ تنظیم کی ہے جن کے اندر قوم و ملک کے لئے کوئی غیر معمولی تاثیر یا عبرت پائی جاتی تھی۔ اور ہمیشہ ان انسانی بڑائیوں اور عظمتوں کی یاد کو یادگاروں، تہواروں، عمارتوں، تاریخوں، قومی روایتوں اور قومی مجمعوں کے انعقاد کے ذریعہ زندہ رکھنا چاہا ہے۔ جس کے اندر خود اس قوم کی کوئی عظمت اور بڑائی پوشیدہ ہے پہلی چیز جس کو تمام اقوام متمدنہ نے "مشاہیر پرستی" کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہی چیز ہے

---

[1] چٹان ۲۵ر اپریل ۱۹۶۶ء

کہ ہر قوم اپنی قومیتوں کے بڑے بڑے بانیوں، مذہبی معلموں، محب الوطنوں اور قومی شہیدوں
کی یاد کو کبھی بھی مفقود ہونے نہیں دیتیں ۔"[1]

مولانا ابوالکلام آزاد نے مشاہیر پرستی کا مقصد" احیاء کار ہائے نمایاں " قرار دیا ہے۔ وہ مشاہیر پرستی کے متعلق کہتے ہیں کہ

"اس سے اصل غرض یہ تھی کہ جو اعمال حسنہ، عزائم مہمہ، نتائج عظیمہ اور بصائر و مواعظ جلیلہ ان مشاہیر اور ناموروں کی زندگی سے وابستہ ہیں اور جس کی یاد اور تذکرہ کے اندر قوموں اور ملکوں کے لئے زیادہ موثر اور نافذ دعوت عمل و اتباع ہے۔ ان کی یاد کو ہمیشہ حتی وقائم رکھا جا سکے اور مختلف ذریعوں سے ایسے مواقع بہم پہنچائے جائیں۔ جس کی وجہ سے کبھی بھی آئندہ نسلیں ان اعمال حسنہ کے نمونوں کو اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں ۔"[2]

آغا شورش کاشمیری بھی یہی چاہتے ہیں کہ مشاہیر جدوجہد آزادی کے کارناموں کو پاکستان کی تاریخ کا حصہ بنا دیا جائے اور ان کارناموں پر سیاسی اغراض و مقاصد کا جو غبار پڑ چکا ہے اسے صاف کیا جائے۔ تاکہ آئندہ نسلیں ان کارناموں سے سبق حاصل کر سکیں، انہیں اپنے لئے مشعل راہ بنا سکیں۔ آغا صاحب نے اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ کہ آزادی کی جنگ صرف مسلم لیگ نے لڑی اور جیتی ہے۔ اور پاکستان پر صرف اسی ایک جماعت کا حق ہے۔ وہ ہمیشہ اس بات کا اعلان کرتے رہے کہ آزادی کی جدوجہد میں جن اکابر راہنماؤں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں ان کا اعتراف کیا جائے۔ اور آزادی کی تاریخ میں ان لوگوں کو بلند مقام دیا جائے۔ جنہوں نے آزادی کے لئے قربانی و ایثار کیا تھا۔ تاکہ نئی نسل آزادی کی قدر و قیمت سے آگاہ ہو۔ مگر پاکستان نے حکمرانوں نے اس بات کی طرف کبھی توجہ ہی نہیں دی، یہاں تک کہ پاکستان کی تاریخ لکھنا تو ایک طرف رہا بانئ پاکستان کے مستند سوانح تک بھی تلمبند نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ ملک میں بہترین دماغوں کی کمی تھی یا وسائل راستے کی دیوار بنتے رہے بلکہ اس کی وجہ حکمرانوں کی مجرمانہ غفلت تھی کہ جن لوگوں کے پاس پاکستان

1۔ شہادت حسین   مولانا ابوالکلام آزاد   ص نمبر ۱۲۶
2۔ شہادت حسین   مولانا ابوالکلام آزاد   ص نمبر ۱۲۸/۱۲۷

میں اقتدار تھا انہوں نے اپنے اقتدار کے قصیدے ضرور سنے لیکن پاکستان کی کہانی اور جدوجہد آزادی کی مستند تاریخ یا اکابرین جدوجہد آزادی کے حالات نہ صرف قلمبند ہونے دیئے بلکہ مقصداً اغماز برتا گیا۔ کیونکہ اگر ان اکابرین کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا تو حکمران خود شرمندہ ہوتے کہ وہ کس قدر تہی دامن ہیں۔ ان کی شخصیت کی وہ چمک دمک ماند پڑجاتی جو اقتدار نے انہیں عطا کردی تھی۔

آغا شورش کاشمیری پاکستان میں واحد مرد مجاہد تھے جنہوں نے حکمرانوں کی اس غفلت کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا۔ وہ اکثر اکابرین آزادی کا مقابلہ حکمرانوں سے کیا کرتے تھے۔ اور پاکستان کے حکمرانوں کے پاس صرف ایک ہی جواب تھا کہ سوائے ان کے باقی سب پاکستان کے مخالف اور غدار تھے۔ آغا صاحب اس سلسلے کی ایک تاریخ خود لکھنا چاہتے تھے مگر موت نے انہیں مہلت ہی نہ دی۔ لیکن انہوں نے اپنے طور پر ہمیشہ یہ کوشش کی کہ آزادی کی جنگ کے نامور لوگوں کو تاریخ کا حصہ بنا دیا جائے۔ آغا صاحب نے نثر میں جو سرمایہ چھوڑا ہے اس میں بیشتر حصہ ان ہی لوگوں کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اور شاعری میں بھی انہی مشاہیر کو خراج تحسین پیش کرنا ایک مسلسل موضوع ہے وہ کہتے ہیں۔

لائی ہے میکدے سے صبا یادِ رفتگاں۔ ہوتی ہے پھر فسانہ سرا یادِ رفتگاں۔
بنتی ہے خلوتوں میں انیس دل ونظر دیتی ہے درس صبر و وفا یادِ رفتگاں۔
اک بار رفتہ رفتہ ہوئی درد دلپذیر اک درد رفتہ رفتہ بنا یادِ رفتگاں۔
اب لکھ رہا ہوں عہد گذشتہ کی داستاں اب کھولتی ہے اپنے لوا یادِ رفتگاں۔

یاراں جاں سپار لحد میں چلے گئے۔
لے دے کے رہ گئی بھی تو کیا، یادِ رفتگاں[1]

یوں تو آغا صاحب نے آزادی کی جنگ میں حصہ لینے والے بہت سے لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس سلسلے میں آغا صاحب کی محبوب ترین شخصیتیں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ

---

[1] چٹان ۲۹ فروری ۱۹۶۰ء

بخاری ہیں ۔

؎ اس ایک دور کی شمشیرِ بے نیام کے ساتھ
رہی ہے مجھ کو عقیدت ابوالکلام کے ساتھ ۔
دیا ہے فکرِ رسا الہلال نے مجھ کو
چلا ہوں اس کی روش پر اسی اہتمام کے ساتھ
ہر ایک سانس میں تکبیرِ ذوالجلال کی ناؤ
ہر ایک گام کی رفتار احتشام کے ساتھ ۔
رہا ہوں اس کے علاوہ ، شریکِ فکر و نظر
حکیمِ مشرق رح کی صحبت میں دھوم دھام کے ساتھ
قلم سے پھول کھلانے کا ڈھنگ سیکھا ہے
ظفر علی رح کے تلمذ میں احترام کے ساتھ
مرے کمالِ خطابت کو اس زمانہ میں
لگاؤ ہے تو بخاری رح کے نیک نام کے ساتھ
خدا گواہ اکابر کی خوشہ چینی سے
بڑا مقام ملا ہے ، بڑے مقام کے ساتھ
تمام عمر رہا ہے تعلقِ خاطر ،
حضورِ سرورِ کونین ؐ کے پیام کے ساتھ [۱]

یہ تمام نام ایشیاء میں خاص طور پر احیاءِ اسلام کی تحریک کے داعی ہیں ۔ ان تمام حضرات نے کسی نہ کسی طرح لوگوں کو اسلام کے احیاء کے لئے ابھارا ہے ۔ خود آغا صاحب بھی اسی گروہ کی باقیات میں سے ہیں جو پاکستان میں اسلام کا احیاء چاہتے تھے ۔

جہاں تک علامہ اقبال کا تعلق ہے پاکستان میں ان کے مداحوں کی کمی نہیں ۔ لیکن مخالفین اقبال کے لئے شمشیر برہنہ صرف اور صرف شورش کاشمیری ہی تھے ۔ وہ مخالفین اقبال کے لئے سخت الفاظ بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے جس کی وجہ ان کی اقبال سے والہانہ محبت ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

؎ جتنے تنک حرام ہیں اقبال کے خلاف
ان مجرموں کے سر پہ لگا ضرب حیدری
پھر مرجبی ہیں مرتضوی سے ستیزہ کار
پھر سر اٹھا رہے ہیں زمانے میں عنتری

---

[۱] چٹان ۴، جون ۱۹۷۳ء

ان بزدلوں کے دامن تزویر پھاڑ دے۔
اس سرزمیں میں پرچم اسلام گاڑ دے [1]

آغا صاحب نے اپنی شاعری میں علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے قصیدے پڑھے ہیں اور مرثیے لکھے ہیں۔ نیز ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور نئی نسل کے لئے ان لوگوں کو نمونے کے طور پر پیش کیا ہے۔ تاکہ نئی نسل میں یہ احساس پیدا کیا جائے کہ رہنما کیسے ہوتے ہیں اور حکمران کیا ہیں۔ آغا صاحب کی شاعری میں اسلاف سے محبت اور اکابرین سے عقیدت ایک خاص موضوع ہے۔ اپنی اس روش کے متعلق آغا صاحب کہتے ہیں۔

؎ تذکرہ عہد سلف کا ہے مرا مضمون خاص — قرن اول کی روایت ہے مرے اشعار میں [2]

؎ عزیزوں کی ستائش، دوستوں کی داستاں لکھی
مجھے جس دن سے شورش شعر کہنے کا شعور آیا [3]

؎ کچھ عزیزوں کی ثنا، کچھ دوستوں کا شکریہ — ان دنوں شورش مرا سرمایہ گفتار ہے [4]

؎ یادگاروں کا محافظ تذکروں کا پاسباں — گمشدہ تاریخ کے اوراق لاتا ہے قلم
اہل دل، اہل سخن، اہل نظر، اہل وفا — ان کے خدوخال کا نقشہ جماتا ہے قلم [5]

اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب کے قلم نے واقعی تاریخ کے یادگار انسانوں کے افکار کی حفاظت کی ہے اور صاحب بصیرت انسانوں کے لئے ان کے دل میں بڑی جگہ ہے۔ وہ واقعی ان کے اشعار کی تشہیر کرتا رہا اور مخالفین

۱؎ چٹان فروری ۱۹۶۱ء

۲؎ چٹان ۹ جون ۱۹۷۵ء

۳؎ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۹۹

۴؎ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۱۴

۵؎ چٹان ۷ فروری ۱۹۶۶ء

کے لئے برق بن کر ٹوٹتا۔ آغا صاحب نے اپنی شاعری میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ذیل میں چند اکابرین کا ذکر کیا جاتا ہے:

اقبال

ع حافظ و خیام کی پرواز لے کر آ گیا ۔۔۔ ایک شاعر میر و غالب کی ہمہ دانی کے بعد
نغمۂ یثرب کی خاطر ساز لے کر آ گیا ۔۔۔ ایک دیوانہ جمال الدین افغانی کے بعد [1]

آغا صاحب علامہ اقبال کو اپنا ذہنی مرشد کہتے ہیں۔ علامہ کو "درویش بے گلیم"، "بلال مشرق" اور "حکیم شرق" کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ذیل کے اشعار ان کی نظم "درویش بے گلیم" کے ہیں۔

ع اک ابر نوبہار فضاؤں پہ چھا گیا۔ ۔۔۔ اقبال اس چمن کی رگوں میں سما گیا
دل کا خروش، عشق کا شعلہ، نظر کی آگ ۔۔۔ اپنے قلم کی گرم نوا سے بڑھا گیا
اس کی صدا تھی صور سرافیل کا جواب ۔۔۔ اس کا خروش ہر کہ و مہ کو جگا گیا،
ہر رہنما کو منزل عرفاں کی دی خبر، ۔۔۔ ہر راہرو کو جادۂ ایماں بتا گیا

شورش مرے قلم کو دیا اذن انقلاب
اور خواجگان دہر سے لڑنا سکھا گیا [2]

علامہ اقبال کو خراج تحسین پیش کرنے کے بعد وہ اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ اقبال کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا گیا۔ اور ملک و ملت کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ ذیل کی نظم "حکیم شرق" آج کے پاکستان کی بھی وہی تصویر ہے جیسی کہ اس وقت تھی جبکہ یہ نظم کہی گئی تھی۔

ع ابھی تو ہے بجلیوں کی زد میں ہر ایک طائر کا آشیانہ
ابھی تو ہے چہرۂ چمن پر خشونت گردش زمانہ

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ۔۔۔ ص نمبر ۲۵۶
[2] گفتنی و ناگفتنی ۔۔۔ ص نمبر ۲۰۹

ابھی تو محلوں کے رہنے والے جلالِ یزداں سے بے خبر ہیں
ابھی تو جمہور کی جبینیں ہیں اور شاہوں کا آستانہ
ابھی تو حوا کی بیٹیوں کا شباب بکتا ہے راستوں پر
ابھی تو زہرہ وشوں کی دوشیزگی ہے زیبِ شراب خانہ
عقیدت دل کے پھول لے کر چلا ہوں اقبال کی لحد پر
کہ مرجعِ انقلابِ نو ہے، حکیمِ مشرق کا آستانہ[1]

اسی طرح ان کی یہ نظم "بلالِ مشرق" ہے۔ جس میں آغا صاحب نے اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے کہ ابھی تک پاکستان میں علامہ کی تعلیمات پر عمل نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ملک و قوم کی جو حالت ہوئی انہوں نے اس کو نظم کر دیا۔ لیکن اس حالت کے باوجود وہ حالات سے مایوس نہیں ہیں بلکہ بلالِ مشرق کی تعلیمات کا درس دیتے ہیں۔ جو اس نظم کے آخر میں موجود ہے۔ نظم یہ ہے۔

لہو کی آب ہے جمہور کے پسینوں میں — قضا کا رنگ ہے ہستی کے آبگینوں میں،
شریک ہو گئے حلقہ بگوشِ میرِ امم — نظامِ زر کی سیاست کے خوشہ چینوں میں
حذر حذر کہ ابھی تک مفاد کے بت ہیں — خدا فروش فقیہوں کی آستینوں میں،
نوید دی ہے عجم کو بلالِ مشرق نے — "اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ"[2]

اقبال سے متعلق یہ چند مثالیں آغا صاحب کے مجموعۂ کلام "گفتنی و ناگفتنی" سے لی گئی ہیں۔ چٹان کے مختلف شماروں میں اسی طرز کی اور نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ۲۲، اپریل ۱۹۵۷ء کے شمارے میں دو نظمیں چھپی ہیں۔ جن کے عنوان "حضورِ اقبال میں"

---

[1] گفتنی و ناگفتنی — ص نمبر ۱۹۲
[2] گفتنی و ناگفتنی — ص نمبر ۱۲۸

اور اقبال پوچھتا ہے"۔ آغا صاحب نے ان نظموں میں اقبال کے حوالے سے اپنے دور کے سیاسی، معاشرتی اور سماجی حالات کی عکاسی کی ہے۔ اور چاہا ہے کہ یہ حالات بدل جائیں۔ اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ واپس آجائے۔ جس کے اقبال داعی تھے۔ اسی طرح ایک اور نظم "تربت اقبال" کے چند اشعار یہ ہیں۔

قائم ہیں غلامانہ روایات ابھی تک ، بدلے نہیں اس دور کے حالات ابھی تک

اے تربت اقبال

کانٹوں میں شفق فام بہاروں کا لہو ہے خورشید کے ساغر میں ستاروں کا لہو ہے

اے تربت اقبال

بے رنگ ہے افسانۂ ایام ابھی تک اس ملک میں مجبور ہے اسلام ابھی تک

اے تربت اقبال[1]

آغا صاحب کی تمام نظموں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ جس بات پر زور دے رہے ہیں وہ پاکستان اور پاکستان کے لوگوں کی حالت ہے۔ جو کہ اقبال کے مطابق نہیں بدلی۔ بلکہ اس حالت نے ایک دوسرا رخ اختیار کرلیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں آغا صاحب حکمرانوں سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ اور لوگوں کو اس بات کی دعوت دے رہے ہیں کہ پاکستان جس نظریے اور جس نظام کے لئے معرض وجود میں آیا تھا، ابھی تک اس ملک میں اس کا نفاذ نہیں ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

اقبال کی طرح آغا صاحب مولانا ابوالکلام آزاد کے بھی بڑے مداح ہیں۔ مولانا ابوالکلام نے مسلمانان ہند کو جو سیاسی اور دینی بصیرت عطا کی، آزادی کے لئے قربانی و ایثار کی جو دعوت دی، مسلمانوں کو جو قومی برتری کا احساس دلایا اور اپنے قلم کی معجز نمائیوں سے قوم کے دلوں میں آزادی کے لئے جو جوش وخروش، حوصلہ اور ولولہ پیدا کیا وہی درحقیقت بعد کو انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ میں بنیاد بنا۔ علمی، فکری، سیاسی اور دینی سطح پر ہندوستان کے مسلمانوں پر جتنا اثر مولانا ابوالکلام

---

[1] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۲۱۹

آزاد کے نظریات و افکار کا تھا اتنا کسی دوسرے رہنما کا نہیں تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" اور پھر "البلاغ" کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو جو درس دیا وہ وہی احیائے اسلام کا نظریہ تھا جو علامہ اقبال کے افکار کی بھی بنیاد ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے بڑے محبوب رہنما تھے اور ان کے پیروکار ایک دبستان کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن جب وقت کی سیاست سے پلٹا کھایا اور پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام لینا عتابِ شاہی کو دعوت دینے سے کم نہ تھا۔ پاکستان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور دبستانِ آزاد ہمیشہ معتوب رہا یہاں تک کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو اردو ادب کے بہت بڑے ادیب تھے لیکن ایک عرصہ تک وہ اپنے اس مقام سے بھی گرائے گئے۔ پاکستان میں جس شخص نے مذہب، سیاست اور ادب میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نام اعلانیہ لیا وہ آغا شورش کاشمیری تھے۔ انہیں ہندوستان کا ابنِ تیمیہ کہا اور "امام الہند" کا دناع کیا۔ آغا صاحب کے ہفت روزہ چٹان میں جس شخصیت کے متعلق سب سے زیادہ لکھا گیا وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہی ہیں۔

دیدہ وران دیں کا نشاں تھا ابوالکلام ہندوستاں کی روحِ رواں تھا ابوالکلام
لذت کشانِ بادۂ ایثار زندہ باد اس انجمن کا پیرِ مغاں تھا ابوالکلام
اس سرزمیں کے منبر و محراب ہیں گواہ بت خانۂ وطن میں اذاں تھا ابوالکلام
تھے اس پہ واشگاف سیاست کے پیچ و خم اک شہ دماغ و سیف زباں تھا ابوالکلام
اربابِ اقتدار کی ہیبت سے بے نیاز طاعت گزارِ ربِّ جہاں تھا ابوالکلام

شورش جنہیں تھا اس کی بصیرت سے اختلاف
وہ اب سمجھ رہے ہیں کہاں تھا ابوالکلام[1]

اور حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد سے بڑا فیض پایا۔ وہ ان کی پیروی کو باعثِ فخر سمجھتے ہیں

---

[1] چٹان ۲۴ر فروری ۱۹۷۵ء

اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

ع ابوالکلام کی صحبت کا فیض ہے شورش قلم میں تیغ کے انداز پائے جاتے ہیں[1]

ع حکیم شرق نے میری زباں کو بانکپن دیا مرے قلم کو دبدبہ ملا ہے ابوالکلام سے[2]

ع جیسے ابوالکلام کی انشا کا بانکپن، شورش کے دل میں یاد بخاری ہے اس طرح[3]

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت میں بڑا تنوع ہے۔ ان کی گوناگوں خوبیوں کو چند اشعار میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ لیکن آغا صاحب نے اپنی شاعری میں مولانا کی شخصیت کے جس پہلو کو منظوم کیا ہے اس کی تصویر بنا دی ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھئے جن کا عنوان ہے "ابوالکلام آزاد"

عشق میں رومی، فکر میں رازی، عزم کا مبنع، جہد کا حاصل
حسنِ عمل کا گوہر یکتا، علم و نظر کا جلوۂ کامل۔
اس کی روش سے گردش دوراں اپنے کئے پر آپ پشیماں
اس کی صدا سے سر بگریباں، شورش گیتی، لشکر باطل
اس کی فصاحت معدنِ شعری، اس کی بلاغت مقصد و معنی
اس کی نفاست گلشن گلشن، اس کی لطافت محفل محفل
اس کی جبیں پر شکنیں ہی شکنیں لب بستہ غنچوں کی صورت
اہل چمن سے پوچھ رہی ہیں، آخر ان خدمات کا حاصل
بت خانے کے طاق میں شورش شمع حرم کو دیکھ رہا ہوں
صحن چمن میں شام کو جیسے دور خزاں میں شورِ عنادل[4]

---

[1] چٹان ۴؍ اگست ۱۹۷۵ء

[2] چٹان ۲؍ جولائی ۱۹۷۴ء [3] چٹان ۲۳؍ فروری ۱۹۶۲ء

[4] گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۲۳۱

بریلوی مکتب فکر کے ایک مولوی صاحب بھی ابوالکلام ہونے کے دعویدار تھے۔ آغا صاحب نے اس ابوالکلام کا مقابلہ مولانا ابوالکلام آزاد سے کیا ہے۔ یہ نظم "دو ابوالکلام" کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے، پہلے حصے میں آغا صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کی عظمت بیان کی ہے۔ باقی اشعار میں اس ابوالکلام کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

پہلے اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، جن میں دونوں کا مقابلہ کیا گیا ہے۔

اک وہ ابوالکلام تھا اک یہ ابوالکلام — وہ شہسوار علم تھا یہ خنگ بے لگام
اس سے کلاہِ فقر کی تقدیس خستہ حال — وہ پیروئے خلق پیمبرؐ میں لاکلام
ہے اس پہ اشتباہ بریلی کے بانس کا — وہ سرزمین ہند میں شمشیر بے نیام[1]

اس کے بعد اس ابوالکلام کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ جس نے مولانا ابوالکلام آزاد کی ہمسری کا دعویٰ کیا تھا۔

قامت کے اعتبار سے بجز رجز کا بول۔ — اور اس پہ یہ غرور کہ ہیں آپ ابوالکلام
اس حادثے پہ اس کے سوا اور کیا لکھوں — اللہ رے مینڈکی کو بھی ہونے لگا زکام
زاغ و زغن کی بلبل گلستاں پہ چشمکیں — یہ کیا غضب کہ بوم کو ہے خوئے انتقام
خلوت کدوں میں ریش حنائی کے زور پر — لاتا ہے مہوشان طریقت کو زیر دام

اٹھا ہے اس کے دیدہ و دل سے خدا کا خوف
بیچا ہے اس نے سنتِ خیر البشرؐ کا نام[2]

اس سلسلے میں آغا صاحب کا ایک قلمی معرکہ "م۔ش" مدیر "اقدام" سے بھی ہوا تھا۔ یہ سنہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے آغا صاحب نے چٹان کے ایک اداریے میں اس بات کی تفصیل لکھی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے ریلوے کے وزیر خان عبدالوحید خان نے چند آدمیوں کو اپنے مکان پر اس مقصد کے لئے اکٹھا کیا کہ جن ممتاز اکابر

---

[1] چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۷۶
[2] چہ قلندرانہ گفتم ص نمبر ۷۷

نے برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے لئے کار ہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ان کو تحریروں کو جمع کیا جائے۔ اس سلسلے میں دو کمیٹیاں بنائی گئیں جن کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ فی الحال سر سید، قائداعظم، علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خان کی تحریروں کو جمع کریں گے۔ سید عابد علی عابد نے یہ تجویز پیش کی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کا نام بھی اس فہرست میں شامل ہونا چاہئے۔ لیکن م۔ش (میاں محمد شفیع) نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا ابوالکلام کا نام اس فہرست میں شامل نہ ہو سکا[۱]۔ آغا صاحب نے چونکہ اس فہرست پر اعتراض کیا تھا لہذا "م۔ش صاحب" نے اپنی ڈائری میں یہ لکھا کہ

"دیوبندی علماء کی فضیلت کا ذکر بھارتی حکام کی شہ پر یا اعانت سے کیا جا رہا ہے"[۲]

آغا صاحب نے اس کا جواب دیا۔ میاں صاحب نے ڈول یہ ڈالا کہ

"حسین احمد مدنی اور ابوالکلام آزاد غدار تھے۔"[۳]

پھر کیا تھا۔ آغا صاحب نے میاں صاحب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ اور نظم و نثر میں ان کے اس طرز عمل کو طنز کا نشانہ بنایا۔ لیکن میاں صاحب چونکہ مسلم لیگی تھے اور اس وقت کی حکومت بھی مسلم لیگ کی تھی لہذا دوسری سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں مسلم لیگ اور اکابرین مسلم لیگ کی مدح سرائی یا دوسری جماعتوں کے اکابرین پر گرفت کرنا خطرہ سے خالی اور منافع بخش تھا۔ اس لیئے میاں صاحب نے یہ سودا جاری رکھا۔ لیکن آغا صاحب نے تاریخ کی سچائی کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے میاں صاحب سے کہا

"ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی لاش پر برطانوی راج قائم ہوا۔ جس نے جبر و استبداد کو انتہا پر پہنچا دیا۔ تمام اسلامی ممالک برطانوی سلطنت کے ہاتھوں پارہ پارہ ہو گئے۔

مسلمانوں کے ایک فعال گروہ نے اس راج کے خلاف لگاتار جدوجہد کی۔ تیدیں کاٹیں، جانیں

۱۔ بحوالہ چٹان ۱۳ رمئی ۱۹۶۳ء

۲۔ چٹان ۱۷ رجون ۱۹۶۳ء

۳۔ چٹان ۱۷ رجون ۱۹۶۳ء

دین - مال لٹا یا - اولادیں مروائیں - صعوبتیں سہیں - ایک دوسرا گروہ محض تماشائی رہا - اس نے دولت وقوت کے نشہ میں انگریزوں کے خانہ زاد کی سی حیثیت اختیار کرلی"[1]

اس پر میاں صاحب کھل کر سامنے آگئے اور آغا صاحب نے ان کے ہر وار کا جواب دیا - آغا صاحب کہتے ہیں۔

ے اس سرزمین پاک میں ان کی نظیر، شورش عجب چیز ہیں "اقدام" کے مدیر،
جاتے ہیں روز کوچۂ دلدار کی طرف لاتے ہیں کوئے یار سے سوغات دلپذیر
یہ طنطنہ کے سلطنت جم کے لاڈلے یہ ہمہمہ کے جیسے کوئی نامزد وزیر
مدنیؒ و بوالکلام کو بے طرح گالیاں جی ہاں، حضور آپ ہیں اسلام کے سفیر

قومے فروختند وچہ ارزاں فروختند
یہ فیصلہ کرے گا خداوند دیرگیر

یہ شعر بھی جناب م۔ش کی نذر ہیں -

ے آپ نے اسلام کے گھر میں لگائی ہے جو آگ اس کو دامن کی ہوا سے اور بھی بھڑکائیے
بوالکلام آزاد کو گالی، حسین احمدؒ سے لاگ اپنے اسلوب نگارش پر ذرا شرمائیے
آپ کا بے شک سرِ افلاک ہے اثر و رسوخ برق بن کر خرمن احرار پر لہرائیے

آغا صاحب مجلس احرار میں رہے اور اس بات پر ہمیشہ فخر کیا کہ ان کا تعلق سرفروشوں کی جماعت سے تھا - میاں صاحب بلکہ تقریباً سبھی مخالفین شورش نے ہمیشہ یہ الزام دیا ہے کہ وہ احرار میں سے تھے اور احرار پاکستان کے مخالف تھے۔ مندرجہ ذیل اشعار میں اسی بات کا جواب دیا گیا ہے کہ

ے کچھ دنوں بعد مورخ یہ لکھے گا صاحب آپ کیا چیز ہیں تاریخ کے ایوانوں میں

---

[1] چٹان ۱۳ مئی ۱۹۶۳ء

جرأت و عزت و ایثار کے افسانوں میں آپ نے کون سے عنوان کئے ہیں قائم ۔
کس قدر عمر گزاری ہے گراں جانوں میں کئے برس آپ رہے ہیں پسِ دیوارِ قفس ،
اک پہیلی ہیں مگر آپ مسلمانوں میں آپ لکھا کریں اسلاف کو غدار وطن
آپ کی بات چلے گی نہ مسلمانوں میں آپ جس رنگ میں چاہیں ہمیں بدنام کریں

ڈائری ڈٹ کے لکھو خسرو ذ بجاہ کے نام
لیکن اس بات کی پروا نہیں دیوانوں میں [1]

اسی طرح ان اشعار میں "م رش صاحب" کے اسی طرز عمل پر تنقید کی گئی ہے ۔

تیری جبیں کا محور پیروں کے آستانے اسلاف سے عداوت تیرے لہو کا حصہ ۔
محروم کر دیا ہے انصاف سے خدانے تاریخ لکھ رہے ہو اغلاط کی زباں میں

جو کچھ کیا ہے تم نے احرار سے وطن میں ،
اک اک ورق ہے اس کا عبرت کے تازیانے [2]

غرض آغا صاحب نے اپنی شاعری میں مولانا ابو الکلام آزاد پر جو کچھ لکھا ہے ، وہ مولانا سے آغا صاحب کی محبت اور عقیدت کا ثبوت ہے ۔ اور اس عقیدت اور محبت کا ایک مرقع یہ نظم ہے جو چٹان کے ابو الکلام نمبر میں شائع ہوئی ۔

سلام اس پر جو اس دورِ پر آشوب میں شورش
ہمیں اسلام کے آداب سکھلاتا رہا برسوں

---

1. چٹان ۱۳ رمئی ۱۹۶۳ء
2. چٹان ۲۰ رمئی ۱۹۶۳ء

خدا نے اس کے فہم و فکر کو بالا کیا ایسا
رسول اللہ کا پیغام پھیلاتا رہا برسوں
لگا کر آگ استعمار و استبداد کے گھر میں
جہاد حریت کی راہ دکھلاتا رہا برسوں
نکالا اس وطن سے ویلزلی کے جانشینوں کو
کفن باندھے ہوئے میدان میں آتا رہا برسوں
قلم سے جو بھی نکلا وہ نے لالاسے افضل تھا
زبانِ ریختہ کا روپ چمکاتا رہا برسوں
ہر اک پہلو سے ابن تیمیہ کا ہو بہو نقشہ
پسِ دیوار زنداں آئے دن جاتا رہا برسوں
بہ انداز امام ابن حنبلؒ اس زمانہ میں،
بہ عنواں شہنشاہوں سے ٹکراتا رہا برسوں،
میں اتنا جانتا ہوں مالکؒ و اعظمؒ کے لہجہ میں
کلام اللہ کی تفسیر سمجھاتا رہا برسوں
کسی پرواز کرنا اس کی عظمت کے منافی تھا
پرایوں کے مصائب میں بھی کام آتا رہا برسوں
مسلمانوں نے اس سے جو کیا معلوم ہے سب کو،
مسلمانوں کی شورش گالیاں کھاتا رہا برسوںؔ

ؔ چٹان ۱۵ فروری سنہ ۱۹۶۵ء

مولانا ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں تحریک حریت کے اُن رہنماؤں میں سے ہیں جنہوں نے عوام میں آزادی کی لگن اور غلامی سے نفرت پیدا کرنے میں بڑا کردار ادا کیا تھا مولانا ظفر علی خاں علمی۔ فکری اور سیاسی سطح پر ہندوستان کے چند نامور رہنماؤں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر علمی اور فکری بلندی کے باوجود ہندوستان کے مسلمان عوامی حلقوں کی روح رواں تھے۔ انہیں قدرت نے یہ ملکہ ودیعت کیا تھا کہ بڑی بڑی سیاسی تحریکوں کو بہت تھوڑے عرصے میں عوامی بنا دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں کی تحریریں، اشعار اور تقریریں ہر طبقے کے چھوٹے بڑے ہندوستانی کو یاد ہوتی تھیں اور ان کی گونج ہندوستان کے کوچہ و بازار میں سنی جا سکتی تھی اور یہ کام کوئی معمولی کام نہ تھا بقول علامہ اقبال

"مصطفےٰ کمال کی تلوار نے ترکوں کو جگانے کیلئے جو کام کیا۔ ظفر علی خاں کے قلم نے وہی کام ہندوستان کے مسلمانوں کو جھنجھوڑنے کیلئے کیا ہے۔"[۱]

حضرت علامہ اقبال کا یہ تبصرہ تو مولانا کی سیاسی زندگی کے متعلق ہے۔ جس میں اُن کی صحافت اور خطابت اور شعر گوئی کو بڑا دخل تھا۔ انہوں نے اپنی ساری صلاحیتیں ملک کی آزادی کیلئے وقف کردیں۔ وہ مسلم لیگ کے ساتھ رہے' قیام پاکستان کے بعد بھی وہ عرصے تک زندہ رہے۔ مگر حکمرانوں نے جو سب کے سب مسلم لیگی تھے۔ انہیں وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ یہاں تک کہ اُن کی وفات کے بعد بھی اُن کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا۔ اس میں حکمرانوں کے ساتھ ساتھ مرزائیوں کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ مگر آغا صاحب نے ان کی تمام کوششوں کو ناکام بنایا اور ظفر علی خان کو اپنی تحریروں اور شاعری کا موضوع بنایا تحریروں میں ظفر علی خان کے کارناموں پر تبصرہ کیا اور حکمرانوں کو بتایا کہ

---

۱ چٹان ۳ / دسمبر ۱۹۶۲ء

"یہاں سب سے زیادہ مظلوم وہ شخصیتیں ہیں جن کی عمریں برطانوی
سامراج کے خلاف جدوجہد آزادی میں گزریں جن کے قلم سے حق کی
اشاعت ہوئی۔ جن کا جہاد افراد و افکار باطلہ کے خلاف رہا۔ جنہوں نے
دین حقہ کے چراغ روشن رکھے۔ ان کی جگہ کون لوگ آگے آئے؟ وہی
لوگ جو اس جدوجہد کے زمانے میں پیدا ہی نہیں ہوئے تھے جن کا
قلم بازار میں فروخت ہوتا رہا۔ جن کی خدمات حکومت انگریزی کے
حوالے تھیں۔ جنہوں نے تلبیس کے فرائض انجام دیئے جو کمیروں کی
حیثیت سے سرکاری نگار خانوں میں کورنش بجا لاتے رہے یہ ایک
قومی المیہ اور ملی سانحہ ہے۔ یہ ایک ادبی حادثہ اور فکری استہزا ہے"[1]

اس کے باوجود جب حکومت نے اغماض سے کام لیا۔ یہاں تک کہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے جو مرزائی ہونے کی وجہ سے مولانا ظفر علی خاں کے خلاف تھے۔ کھلے عام یہ سوال کیا کہ ظفر علی خاں کہاں ہے؟ اس پر آغا شورش صاحب نے ۲-جون ۱۹۶۷ء کو ملک کے اکابرین اور مولانا ظفر علی خاں سے ارادت رکھنے والے بزرگوں کا ایک اجلاس بلایا[2] اور چوہدری ظفر اللہ خاں کے سوال کا جواب اس صورت میں دیا کہ ظفر علی خاں کے نام سے ایک اکادمی تشکیل دی۔ جس کے صدر ملک اسلم حیات ایڈووکیٹ اور جنرل سیکرٹری آغا صاحب خود تھے[3]۔ اس اکادمی کے مقاصد یہ تھے۔

۱۔ چٹان ۱۲-جون ۱۹۶۷ء

۲-۳۔ بحوالہ چٹان ۱۲-جون ۱۹۶۷ء

"۱۔ مولانا کے افکار و سوانح اور خدمات و مہمات کا تذکرہ و اشاعت

۲۔ مرزائیوں کا شدید تعاقب۔ ظفر علی خاں اکادمی اس سلسلہ میں

لٹریچر شائع کرے گی۔"[۱]

غرض آغا صاحب چونکہ بچپن سے لے کر آخری دم تک مولانا ظفر علی کے مداح ہی نہیں رہے بلکہ انہوں نے مولانا ظفر علی خان سے خوشہ چینی اور فیض یابی کا اعتراف بھی کھلے بندوں کیا ہے۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اسی لیئے آغا صاحب نے اپنی شاعری میں مولانا ظفر علی خان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر اشعار کہے ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے یہ ملاحظہ فرمائیں کہ آغا صاحب کے نزدیک مولانا ظفر علی خاں کیا تھے

"معجز رقم تھا شعلہ بیاں تھا ظفر علی

انشا کی رفعتوں کا نشاں تھا ظفر علی

اب اور کیا لکھوں کہ بہ قول ابوالکلام

ہندوستاں میں تیغِ رواں تھا ظفر علی

اُس کے قلم سے لولوئے لالہ بکھر گئے

شیوہ نگار و شعلہ بیاں تھا ظفر علی

جس کے جلو میں خنجر براں کا دبدبہ

باطل کے سر پہ گرزِ گراں تھا ظفر علی"[۲]

اس کے بعد آغا صاحب نے بتایا ہے کہ مولانا ظفر علی خان نے ملک و قوم کیلئے کیا کچھ کیا ہے۔

۱۔ چٹان ۱۲ر جون ۱۹۶۷ء

۲۔ چٹان ۲۶ نومبر تا ۲ دسمبر ۱۹۷۴ء

وہ غلام قوم کبھی نامور نہیں ہوتی
یہ راز خاص بتایا ظفر علی خاں نے

ادب کے پھول کھلا کر زمین اردو میں
قلم کا رعب بٹھایا ظفر علی خاں نے

انیس و غالب و حالی و اکبر و اقبال
شکوہ سب کا دکھایا ظفر علی خاں نے

اذان دی تو کئی سومنات کانپ اٹھے
صنمکدوں کو ہلایا ظفر علی خاں نے"[1]

۲۷۔ نومبر ۱۹۵۶ء مولانا ظفر علی خان کا یومِ وفات ہے[2]۔ ذیل کی نظم آغا صاحب کے مجموعۂ کلام میں چھپی ہے اور یہ نظم اُن دنوں کی یادگار ہے۔ جب مولانا ظفر علی خاں زندہ تھے۔ آغا صاحب نے مولانا ظفر علی خان کے آخری ایام کی تصویر اس طرح کھینچی ہے

"میں اس گئے دور میں بھی اک باکمال انساں کو دیکھتا ہوں
ذرا نظر سے کہو کہ ٹھہرے، ظفر علی خاں کو دیکھتا ہوں

خمیدہ قامت، علیل صحت، رہینِ رعشہ، ادائے رفتہ
ضعیف نظریں، شکستہ چہرہ، زباں میں لکنت صدائے رفتہ

ظفر علی خاں، ہماری تحریک حریت کا نشان آخر
فرنگیوں کا حریفِ اول، مجاہدوں کی سنانِ آخر

---

[1] چٹان ۔ ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء
[2] بحوالہ چٹان ۲۶ نومبر ۱۹۷۳ء

ادیب ایسا کہ اس کے لہجے میں گل کدوں کی کہانیاں تھیں
خطیب ایسا کہ اس کے پیرایۂ سخن میں جوانیاں تھیں

اسی گلستاں میں زندگی کی خزاں سے پہلے وہ کیا نہیں تھا
وہ بلبلِ خوشنوا نہیں تھا کہ ہم صفیرِ صبا نہیں تھا

اُٹھا تو ہر معرکہ میں برقِ تپاں سے کھیلا، قضا سے اُلجھا
بڑھا تو ہر مرحلہ میں تیغِ رواں سے کھیلا، وغا سے اُلجھا

یہ ماجرائے جہادِ ملی کہ حرفِ تمت کا منتظر ہے
یہ ایک سمٹا ہوا اُجالا ہے اور رحلت کا منتظر ہے ۱؎

ان اشعار کے علاوہ بھی آغا صاحب نے بہت سے اشعار کہے ہیں جو "چٹان" کے مختلف شماروں میں موجود ہیں ۲؎۔

۱؎ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۹۳/ ۱۹۴

۲؎ مثلاً ۲۴/ اکتوبر ۱۹۶۵ء شمارہ نمبر ۴۳ جلد نمبر ۱۳ "مولانا ظفر علی خان کی یاد" کے عنوان سے دو نظمیں موجود ہیں۔ جو پہلے روزنامہ "زمیندار" اور روزنامہ "نوائے وقت" میں چھپ چکی ہیں۔ اسی طرح

چٹان ۱۹۶۱ء جلد نمبر ۱۳ شمارہ نمبر ۴۸
چٹان ۲۸۔ دسمبر ۱۹۶۲ء نظم بعنوان "ظفر علی خان کو ڈھونڈھتا ہوں"
چٹان ۳۰/ نومبر ۱۹۶۴ء اشعار بعنوان "مولانا ظفر علی خان"
چٹان ۱۳/ دسمبر ۱۹۶۵ء اشعار بعنوان "مولانا ظفر علی خان"

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ہندوستان میں جدوجہد آزادی کی چلنے والی سیاسی تحریکوں کو عوامی بنانے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ وہ بے شبہ اردو زبان کے سب سے بڑے عوامی خطیب تھے۔ شاہ جی کی پوری زندگی خطابت کے معرکوں میں گذری۔ یوں تو مجلس احرار جماعت ہی خطیبوں کی تھی۔ لیکن شاہ جی کی خطابت کا جواب خود مجلس احرار میں بھی نہ تھا۔ تقسیم ہند سے پہلے ہندوستان کے باشندوں میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ اخبارات اور ریڈیو بھی عوام کی چیزیں نہ تھیں۔ اگر کہیں اخبارات عوام میں پڑھے بھی جاتے تھے تو عوام کا زیادہ حصہ اپنی ناخواندگی کی وجہ سے سمجھ نہ سکتا تھا۔ لہذا اس زمانے میں عوام تک بات پہنچانے کا سب سے مؤثر ذریعہ خطابت تھی اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو یہ کمال حاصل تھا کہ وہ مشکل سے مشکل سیاسی مسائل بڑی آسانی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں اتار دیتے تھے۔ اور یہ کوئی معمولی کام نہ تھا۔ متحدہ ہندوستان کے لوگوں کو آزادی کی جدوجہد میں فعال بنانے آزادی کیلئے قربان ہونے اور انگریز کو اس ملک سے نکالنے میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بڑا حصہ ہے۔ لیکن شاہ جی کے کارناموں کا بھی اعتراف نہیں کیا گیا۔ وہ مجلس احرار کے سیاسی طرزِ عمل کی وجہ سے پاکستان کے حکمرانوں کے بھی اُسی طرح معتوب رہے۔ جیسے کہ انگریزوں کے ہوا کرتے تھے۔ آغا شورش کاشمیری، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو اپنا مرشد اور رہنما مانتے تھے۔ شاہ جی کی درویشی۔ بے غرضی۔ اخلاص اور عشقِ رسول کے بڑے مداح تھے۔ انہوں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے فیض پایا تھا۔ جس پر وہ بڑا فخر کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ فطری میلان کے علاوہ یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا بھی فیضان تھا کہ آغا صاحب اتنے بڑے خطیب بن گئے۔ جس کی مثال شاہ جی کی وفات کے بعد وہ خود ہی تھے۔

آغا صاحب نے اپنی شاعری میں دوسرے بزرگوں کی طرح شاہ جی کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"خطیبِ اعظم عرب کا نغمہ عجم کی لَے میں سُنا رہا ہے
سرِ چمن چہچہا رہا ہے، سرِ وغا مُسکرا رہا ہے
حدیثِ سرو و چمن نچھاور، زبانِ شمشیر اُس پہ قرباں!
مسیلمہ ایسے جلسازوں کی بیخ و بنیاد ڈھا رہا ہے

قرونِ اُولیٰ کی رزم گاہوں سے مُرتضےٰ کا جلال لے کر
دبیز نیندیں جھنجھوڑتا ہے، مجاہدوں کو جگا رہا ہے
ہیں اس کی للکار سے ہراساں محمدِ مصطفےٰ کے باغی
وغا کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں، غنیم پر دندنا رہا ہے

میں اس کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس کر رہا ہوں
کہ جیسے کوثر پہ شام ہوتے کوئی دیا جھلملا رہا ہے
خدا فروشوں کی خانقاہوں پہ ایک بجلی سی کوندتی ہے
ہُوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

وُہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ
اسی کی صورت کو تک رہا ہے سفر سے ٹوٹا ہوا زمانہ"[1]

مندرجہ بالا اشعار آغا صاحب کے مجموعۂ کلام میں "خطیب اعظم سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کے عنوان سے چھپے ہیں۔ پہلے یہ نظم فروری ۱۹۵۶ء چٹان جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۸ میں "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کے عنوان سے چھپی تھی۔ عنوان کے نیچے یہ عبارت بھی درج ہے۔

۱۔ گفتنی و ناگفتنی ص نمبر ۱۹۵/۱۹۶

"۲۶ر فروری کو سید عطاء اللہ شاہ بخاری لاہور میں تقریر کر رہے ہیں۔"

آغا صاحب بچپن ہی سے شاہ جی کی تقریروں کے مداح تھے جب وُہ مجلسِ احرار میں شامل ہو گئے تو شاہ جی کی رفاقت بھی میسر آئی پھر دن رات کا ساتھ بھی رہا۔ آغا صاحب کی شاہ جی سے محبت اور اخلاص ہمیشہ بڑھتا رہا۔ جس میں کبھی کمی نہیں آئی۔ مندرجہ ذیل اشعار آغا صاحب کی ابتدائی عمر کی ایک نظم "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" سے لئے گئے ہیں۔ جن میں انہوں نے شاہ جی کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے۔

"قربانی و ایثار کی تفسیر بخاری
ایمان کے گلزار کی ہے بادِ بہاری
یہ ایک حریفوں کے ہزاروں پہ ہے بھاری
واللہ زبان اس کی ہے شمشیر دو دھاری

گفتار کی گرمی سے خیالات بدل دے
چاہے تو غلامی کی روایات بدل دے" [1]

اسی طرح یہ اشعار بھی "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" کے عنوان سے کہے گئے ہیں۔ جن میں شاہ جی کی یاد تازہ کی گئی ہے۔

"ہم نشینانِ رسالت کی دعا یاد آئی
غائب از چشم بخاری کی صدا یاد آئی
پھر کوئی شعلہ بیاں تیغ بکف آ پہنچا
پھر محمدؐ کے گھرانے کی صدا یاد آئی

---

[1] جذباتِ شورش   شورش کاشمیری   ص نمبر ۳۹

جب کبھی اُس کی خطابت کا تصور باندھا
قرنِ اول کے خطیبوں کی ادا یاد آئی
شورشؔ اِس کشمکشِ دہر کے ویرانے میں
ایک محبوب قلندر کی ادا یاد آئی [۱]

غرض آغا صاحب کو علامہ اقبال۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خاں اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے والہانہ عقیدت اور محبت ہے۔ ان اکابرین میں سے ہر بزرگ کی برسی کے موقع پر آغا صاحب اپنے ہفت روزہ "چٹان" میں اُن پر نظمیں کہتے۔ مضامین تحریر کرتے۔ "چٹان" کے صفحہ اول پر اُن کی تصاویر ہوتیں۔ اور اپنے جلسوں میں ان بزرگوں کو خراج تحسین پیش کرتے۔

ان بزرگوں کے علاوہ بھی آغا صاحب نے بہت سے افراد کو منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جس میں اکثریت ایسے بزرگوں کی ہے جنہوں نے آزادی کی جنگ میں حصہ لیا یا اسلام کی خدمت میں پیش پیش رہے۔ ذیل میں چند بزرگوں پر کہے گئے اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

"مولانا قاسم نانوتوی ؒ"

پرچم اسلام ابرِ دُرفشاں کے روپ میں
بُتکدوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا
اُس کے سینے میں خُدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمیں میں محبتِ اسلام تھا

"مولانا رشید احمد گنگوہی ؒ"

اِس زمیں پر عصرِ حاضر کا فقیہہ بے مثال
عظمت اسلام کی تصویر دِکھلاتا رہا

---

[۱] چٹان ۲۶ راگست ۱۹۷۲ء

ضربتِ توحید سے اشراک کی بنیاد و بیخ
جس طرف نکلا، جہاں پہنچا وہیں ڈھاتا رہا

"شیخ الہند محمود الحسنؒ"

گردشِ دوراں کی سنگینی سے ٹکراتا رہا
مالٹا میں نغمۂ صبر و رضا گاتا رہا
حادثوں کی جانگسل موجوں سے ہوکر بے نیاز
نقشۂ قربانی و ایثار دِکھلاتا رہا

"مولانا سیّد انور شاہ کشمیریؒ"

آدمی کے رُوپ میں قدرت کا روشن معجزہ
علم کی ہیبت سے رزم و بزم پر چھاجاتا رہا
یہ جہاں فانی ہے کوئی چیز لافانی نہیں!
پھر بھی اس دنیا میں انور شاہ کا ثانی نہیں

"مولانا احمد علیؒ"

عمر بھر قرآن کا پیغام پھیلاتا رہا
ہر گھڑی اسلام کی تبلیغ فرماتا رہا
سیّدِ خیر البشرؐ کے خُلق کی تصویر تھا
اس صنم آباد میں توحید کی شمشیر تھا[۱]

اس کے علاوہ بھی آغا صاحب نے دیگر عظیم شخصیتوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ مثلاً حضرت قائد اعظم کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔ یہ اشعار ۲ر دسمبر ۱۹۵۳ء کو کہے گئے تھے اور ۱۹۷۶ء

---

۱ چٹان ۱۵ر دسمبر ۱۹۶۳ء شمارہ نمبر ۱۵

کے چٹان میں موجود ہیں۔

"ابھرا تو آفتاب گہن میں چلا گیا　　اٹھا صدائے ضربت طوفاں لیے ہوئے
اس کا خیال بام ثریا سے ماوراء　　اس کا کمال عظمتِ دوراں لیے ہوئے
تاریخ روزگار میں آوازِ ذوالفقار　　آہنگِ انقلاب کے عنواں لیے ہوئے
وہ اس چمن میں بادِ صبا کی مثال تھا　　اپنی نظیر آپ تھا اور باکمال تھا"[1]

جناب صدر ایوب خان نے جب محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں انتخاب میں حصہ لیا۔ آغا صاحب نے یہ اشعار محترمہ فاطمہ جناح کو خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے کہے

"سیاہ رات کا غلبہ شدید تنہائی　　فضا نشینِ افلاک سے اتر آئی
بھلے دنوں کی تب و تاب کا جلال و جمال　　گئے دنوں کے خد و خال کی توانائی
جبیں اسکے غضب ناک تیوروں کا شکار　　پہاڑ اُس کے جلال و جمال سے رائی
قدیم دور کی نسوانیت کے سانچہ میں　　عجم کی ژرف نگاہی عرب کی دانائی"[2]

آغا صاحب نے بہت سے دوسرے اکابرین کو بھی منظوم ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے مثلاً چوہدری افضل حق[3]۔ مولانا مظہر علی اظہر[4]۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی[5]۔ جناب قاری

---

[1] چٹان　۲۷۔ دسمبر ۱۹۷۶ء
[2] چٹان　۱۹۔ جولائی ۱۹۷۶ء
[3] جذباتِ شورش　ص نمبر ۴۰
[4] جذباتِ شورش　ص نمبر ۳۷
[5] چٹان　۲۹ / اکتوبر ۱۹۶۲ء

محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند[1]۔ حسین شہید سہروردی[2]۔ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال[3]۔ بادشاہ خان[4] اور حمید نظامی[5] ــــ اردو زبان کا تشکر نامہ میں سردار محمد اقبال چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ[6] اور کئی اور افراد کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔

مرثیے

سید عابد علی عابد نے اپنی کتاب میں زین العابدین کے حوالے سے مرثیہ کی تین قسمیں بتائی ہیں

۱۔ رثائے تشریفی و رسمی۔

جس میں اکابر قوم اور سلاطین کی موت پر اظہار افسوس کیا گیا ہو۔

۲۔ رثائے شخصی و خانوادگی۔

یہ دوستوں اور اپنے افراد خاندان کی موت پر اظہار افسوس کیلئے کہے جاتے ہیں۔

۳۔ رثائے مذہبی۔

یہ مراثی پیشوایان دین اور شہدائے کربلا کی یاد کیلئے مخصوص ہیں۔[7]

---

1. چٹان ۲۹ر اکتوبر ۱۹۶۲ء
2. چٹان ۱۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء
3. چٹان ۱۵ر دسمبر ۱۹۷۵ء
4. چٹان ۱۴ تا ۲۰ جنوری ۱۹۷۵ء
5. چٹان ۲۲ر فروری ۱۹۶۵ء
6. چٹان ۲۴ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۷۷ء
7. اصول انتقاد ادبیات سید عابد علی عابد ص نمبر ۶۲۵

آغا صاحب نے سبھی قسم کے مرثیے لکھے ہیں۔ لیکن زیادہ تر مرثیے اکابر قوم کیلئے کہے۔ چند دوستوں کی موت پر گریہ وزاری کی ہے اور حضرت امام حسینؓ کے حضور بھی ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

آغا صاحب نے جن کے مرثیے کہے اُن میں خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مولانا ظفر علی خان کے علاوہ اور بھی بہت سے اکابرین شامل ہیں۔ یہاں کچھ اکابرین کے مراثی کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جن سے آغا صاحبؒ کو خاص طور پر عقیدت تھی۔ یہ مرثیہ آغا صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے مزار پر کہا تھا۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲ رفروری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔ یہ مرثیہ مارچ ۱۹۵۸ء کے چٹان میں شائع ہوا۔

"عجب قیامت کا حادثہ ہے کہ اشک ہیں آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پہ مہرِ مبیں نہیں ہے
تری جدائی میں مرنے والے وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے
کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں، کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اُجڑ گئی ہے زباں سے زورِ بیاں گیا ہے
اُتر گئے منزلوں کے چہرے امیر کیا ؟ کارواں گیا ہے
مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے" [۱]

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی موت پر آغا صاحب نے اکثر آنسو بہائے ہیں یہ مرثیہ ایک خاص طرز پر لکھا گیا ہے۔ اشعار یہ ہیں۔

"دل درد میں ڈوبا ہے زباں نوحہ کناں ہے — ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں بخاری تو کہاں ہے؟
اے خطۂ فردوس کے راہی تو پلٹ آ — رحلت پہ تری غلغلۂ آہ و فغاں ہے
آواز تو دے خانہ خرابانِ وفا کو — اک بار تو لوٹ آ کہ مصائب کا سماں ہے" [۲]

۱۔ چٹان مارچ ۱۹۵۸ء

۲۔ چٹان ۲۳ راگست ۱۹۷۶ء

اسی طرح علامہ مشرقی کی وفات پر یہ شعر کہے گئے تھے

"ایک عنوانِ جلی شورش فسانہ ہو گیا
مشرقی فردوس کی جانب روانہ ہو گیا
نور کے تڑکے کفن کی چاندنی مرجھا گئی
جھٹپٹے کا وقت رحلت کا بہانہ ہو گیا"[۱]

مندرجہ بالا اشعار مثال کے طور پر پیش کئے گئے ہیں۔ ورنہ آغا صاحب نے اِس صنف سخن میں بہت کچھ لکھا ہے۔ آغا صاحب نے حضرت شاہ ولی اللہ کے مزار پر حاضری دی، اشعار کہے[۲]۔ اس کے بعد امام ربانی مجدد الف ثانی کے مزار اقدس پر آغا صاحب عرض والتجا کرتے ہیں[۳]۔ اسی طرح انہوں نے حسین شہید سہروردی اور مولانا داؤد غزنوی کی وفات حسرت آیات پر بھی شعر کہے ہیں[۴]۔ ان کے علاوہ آغا صاحب نے جن دوسرے دوستوں کی وفات پر آنسو بہائے ہیں۔ اُن میں حضرت سید غلام محی الدین شاہ گولڑہ شریف (بابوجی)[۵]۔ شفاء الملک حکیم محمد حسن قرشی[۶]۔ خواجہ عبدالرحیم بار ایٹ لاء صدر مرکزیہ مجلس اقبال[۷]۔ ملک اسلم حیات خان[۸]۔ جناب نیاز فتح پوری[۹]۔ جناب حمید

۱۔ چٹان ۲ر ستمبر ۱۹۶۳ء
۲۔ چٹان ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء
۳۔ چٹان ۲۴۔ دسمبر ۱۹۶۲ء
۴۔ چٹان ۲۳۔ دسمبر ۱۹۶۳ء
۵۔ چٹان یکم جولائی ۱۹۷۴ء اور چٹان ۲۳ر جون ۱۹۷۵ء
۶۔ چٹان ۱۰ تا ۱۶۔ دسمبر ۱۹۷۴ء
۷۔ چٹان ۱۲ تا ۱۸ر نومبر ۱۹۷۴ء
۸۔ چٹان ۲۷۔ جنوری ۱۹۷۵ء
۹۔ چٹان ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۶۳ء

نظامی[1] اور جناب دیوان سنگھ مفتون[2] شامل ہیں۔ ان حضرات پر کہے گئے مرثیے ہفت روزہ چٹان کے مختلف شماروں کی زینت ہیں۔ چٹان کے شماروں کی نشاندہی حاشیہ میں کر دی گئی ہے۔

مرثیے کی تیسری قسم شہدائے کربلا کی یاد سے متعلق ہے۔ آغا صاحب نے شہدائے کربلا کی یاد میں جو مرثیے کہے ہیں وہ اگرچہ مختصر ہیں اور واقعاتِ کربلا کی منظر کشی بھی نہیں کرتے لیکن واقعات کربلا کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں۔ انہوں نے امام عالی مقام کے ایثار و قربانی اور تعلیمات اسلامی کو زیادہ تر موضوع بنایا ہے۔ اور بحضور امام عالی مقام ہدیۂ عقیدت و محبت اس طرح پیش کیا ہے۔

"زندۂ جاوید ہے لختِ دلِ زہرا[2] کا نام
گردش دوراں مٹا سکتی نہیں ان کا پیام
کامل و اکمل نمونہ حیدرِ کرار[2] کا
حاضر و غائب میں اُن کی ذات اقدس ہے امام
ان کے خوں سے دامن تاریخ پر لکھا گیا
اُمتِ خیر البشر[3] میں ہے ملوکیت حرام
شورش اُن کی ذات میں ہے پرتو میر اُمم[3]
وہ ہیں سلطانوں کے سلطاں ہم غلاموں کے غلام"[3]

آغا صاحب نے کربلا اور شہدائے کربلا کے حوالے سے اُس قربانی و ایثار کی تجدید پر زور دیا ہے جس کیلئے یہ عظیم قربانی دی گئی تھی وہ کہتے ہیں

---

[1] چٹان ۳ر مارچ ۱۹۷۵ء اور چٹان ۲۲۔ فروری ۱۹۶۵ء
[2] چٹان ۲ تا ۱۰ فروری ۱۹۷۵ء
[3] چٹان ۲ مئی ۱۹۶۶ء

"روحِ اسلام میں شاہی کا تصور ہی نہیں
ہیچ ہیں انکی نگاہوں میں سلاطینِ زمن
آمریت کے خط و خال سے محسوس ہوا
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن
اِس زمانے میں کوئی حیدرِ کرّار بھی ہے"[1]

اس کے علاوہ آغا صاحب نے واقعہ کربلا کے حوالے سے اپنی قوم کا مرثیہ بھی کہا ہے۔ جس میں قوم کے ماتم کے علاوہ شہدائے کربلا پر کئے جانے والے ظلم وستم پر نوحہ خوانی کی گئی ہے۔

"سوچتا ہوں کہ اسی قوم کے وارث ہم ہیں
جس نے اولادِ پیمبرؐ کا تماشا دیکھا
قلبِ اسلام میں صدمات کے خنجر بھونکے
کربلا میں کفِ قاتل کا تماشا دیکھا
ابوسفیان کے پوتے کی غلامی کر لی
خود فروشوں کو دناءت سے پنپتا دیکھا
اے مری قوم! ترے حسنِ کمالات کی خیر
تو نے جو کچھ بھی دکھایا وہی نقشا دیکھا
یہ بھی کیوں ہے، یہ کیا ہے، مجھے کچھ سوچنے دے
کوئی تیرا بھی خدا ہے؟ مجھے کچھ سوچنے دے"[2]

۱۔ چٹان ۲۔مئی ۱۹۶۶ء
۲۔ چٹان ۱۱۔دسمبر ۱۹۷۸ء

اپنی قوم کے مرثیے کے علاوہ آغا صاحب نے خود اپنا مرثیہ بھی کہا ہے۔ اس مرثیے پر آغا صاحب کا یہ نوٹ موجود ہے۔

"انسان کے معاملات نفس بھی عجیب وغریب ہیں۔ اس نظم میں اپنا مرثیہ اپنے قلم سے لکھ کر زندگی میں موت کا لطف اُٹھایا ہے۔ تعریفی پہلو قلم کی زبان پر آہی گئے۔ نفس نے گوارا نہ کیا کہ اس کی برائیاں بکمال وتمام بے نقاب ہوں۔ انسان اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے آخر وقت تک گھبراتا ہے"[1]

اس مرثیہ میں آغا صاحب کی زندگی کے بہت سے پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ مرثیہ کے چند اشعار یہ ہیں۔

"یہ خبر شورش نوائے وقت میں تھی ـــــ پُرملال
ہوگیا لاہور میں شورش کا پرسوں انتقال
مختصر سی اک خبر کونے میں تھی اخبار کے
حاشیہ دے کر سیاہ لکھا تھا لفظ ارتحال
بے اثر لفظوں میں تھی مرقوم روداد وفات
جانکنی میں کوئی بھی انساں نہ تھا پُرسانِ حال
الغرض یہ اس مقرر کا تھا سفرِ آخری
عمر بھر جس کو رہا حاصل خطیبانہ کمال
دس برس تک سختیاں جھیلیں بنام حریت
قید تنہائی میں کاٹے جس نے اپنے ماہ و سال

---

[1] چٹان ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

شعر میں مرحوم یادوں کو رقم کرتا رہا
نظم میں لکھتا رہا افسانۂ ہجر و وصال
بات سچی دار کے تختہ پہ بھی کہتا رہا
ٹوکتا کوئی اُسے کس شخص میں تھی یہ مجال
اِک جماعت نے سرِ منبر اسے "کافر" کہا
دوسری نے اُس کو لکھا عہدِ حاضر کا بلال
دی اذاں اس "مردِ کافر" نے حصارِ شرک پر
یہ خطا ایسی تھی اس پر ہو گیا جینا محال
بات سیدھی ہے کہ اس میں کوئی بھی خوبی نہ تھی
اس کے دشمن تھے چمن میں پات پات اور ڈال ڈال
اس کے حق میں کافر و مومن دُعا کرتے رہیں
بخشش دے اُس کے گناہوں کو خدائے لایزال [1]

مرثیے اور قصیدے

آغا صاحب نے مشاہیر کے جو قصیدے اور مرثیے لکھے ہیں۔ ان میں ہمیں یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ آغا صاحب نے مشاہیر کی مدح میں کسی مبالغے سے کام نہیں لیا بلکہ اُن کی انہی خوبیوں کا ذکر کیا ہے جو اُن میں موجود تھیں اور جن کا اعتراف نہ صرف خواص ہی کرتے ہیں بلکہ عوام میں اُن کی شہرت کی وجہ بھی یہی خوبیاں تھیں۔ جن مشاہیر کا ذکر آغا صاحب نے کیا ہے۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری دونوں ایسی شخصیتیں ہیں جن سے عوام و خواص کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کے علم و فضل اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی شعلہ نوائی اور پارسائی کے سبھی معترف ہیں اور آغا صاحب

[1] چٹان ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

نے ان کی شخصیت کے انہی پہلوؤں کی تعریف کی ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی قصیدے اور مرثیے کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"عرب کی قدیم شاعری میں قصائد اور مرثیے ایسے سچے اور صحیح حالات و واقعات پر مشتمل ہوتے تھے کہ اُن سے متوفی کی مختصر لائف استنباط ہو سکتی تھی"۔[1]

مندرجہ بالا اقتباس کا اطلاق اگر آغا شورش کاشمیری کی قصیدہ گوئی اور مرثیہ نگاری پر کیا جائے۔ تو آغا صاحب کے یہ قصیدے اور مرثیے اِس پیمانے پر پورے اترتے ہیں۔ آغا صاحب نے اپنے قصیدوں اور مرثیوں میں جن جن مشاہیر کے متعلق جو کچھ کہا ہے۔ اُس اجمال سے ہم ان مشاہیر کی زندگی کی تفصیل مرتب کر سکتے ہیں۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آغا صاحب کو ان شخصیات سے ذہنی لگاؤ اور محبت ہے اور جو کچھ ان قصیدوں اور مرثیوں میں کہا گیا ہے۔ وہ آغا صاحب کے حقیقی جذبات کے ترجمان ہیں۔ عقیدت اور محبت میں اعتدال کا دامن چھوڑنا بڑی مشکل بات ہوتی ہے۔ لیکن آغا صاحب نے ان شخصیتوں سے انتہائی محبت اور عقیدت کے باوجود اُن سے کوئی ایسی بات منسوب نہیں کی جو اُن کی شخصیت کا حصہ نہ ہو۔ جس کی وجہ سے یہ قصیدے اور مرثیے حقیقت حال کی تصویریں معلوم ہوتے ہیں

عشقیہ شاعری

آغا صاحب کی شاعری میں عاشقانہ اشعار کچھ زیادہ نہیں۔ ابتدائی دور میں انہوں نے عاشقانہ شعر ضرور کہے لیکن پھر سیاسی شاعری کی طرف چل نکلے۔ اِس دور میں اختر شیرانی سے بہت زیادہ متاثر ہیں اور انہی کے طرز اور کلام کی پیروی کرتے رہے ہیں۔ اختر شیرانی اردو شاعری میں اس

---

[1] مقدمہ شعر و شاعری   از مولانا الطاف حسین حالی   ص نمبر ۱۷۷

بات کیلئے خاص طور پر شہرت رکھتے ہیں کہ انہوں نے محبوب کا نام لے کر اور سامنے بٹھا کر باتیں کی ہیں۔ آغا صاحب کو اختر شیرانی کی یہ بات بڑی پسند ہے وہ اپنے اشعار میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ پہلے پہل تو انہوں نے اختر شیرانی کے محبوب ناموں کو اشعار میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً "جذبات شورش" میں "حسین لمحات" کے عنوان سے آغا صاحب کہتے ہیں

"ہیں سلمٰی کی کافر اداؤں سے بہتر جوانی کی شیریں فضاؤں سے بہتر"[۱]

ایک دوسری جگہ کہتے ہیں

"نکہتِ گیسوئے سلمٰی سے دمک اٹھا چمن نغمۂ ناہید و زہرہ سے مہک اٹھا چمن

جوش میں آئی جوانی روح اٹھلانے لگی کاکلِ عذرا حسیں شانوں پر لہرانے لگی"[۲]

لیکن بعد کو انہوں نے اختر شیرانی کی طرح ربیعہ نامی ایک تخیلی پیکر تراش لیا۔ اور اس نام کو اختر شیرانی کی سلمٰی کی طرح اپنے اشعار میں استعمال کیا۔ آغا صاحب نے "گفتنی و ناگفتنی" کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

"گفتنی و ناگفتنی کی بیشتر نظمیں ان کے (اختر شیرانی کے) انداز میں ہیں مثلاً ربیعہ پر جتنی نظمیں یا سانیٹ موزوں ہوئے ہیں ان کا سانچا اختر سے مستعار ہے فرق یہ ہے کہ کہیں کہیں سیاست کی تلخی آگئی ہے .... لیکن اختر کی سلمٰی* کا وجود ہے ربیعہ کا وجود نہیں"[۳]

۱۔ جذبات شورش شورش کاشمیری ص نمبر ۵۲

۲۔ ایضاً ص نمبر ۵۷

۳۔ گفتنی و ناگفتنی شورش کاشمیری ص نمبر ۳۲

* اختر شیرانی کی سلمٰی کے متعلق انور عارف صاحب نے آغا صاحب سے مندرجہ ذیل گفتگو کی تھی جو ان کی کتاب "شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف" سے نقل کی جاتی ہے

ا (انور عارف) = اختر شیرانی کی سلمٰی کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

ش (شورش) = میری کوئی رائے نہیں

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ربیعہ دراصل ایک تخیلی پیکر ہے۔ جس کی تصویر آغا صاحب نے اس طرح بنائی ہے

"وہ اک پیکر ہے جس کو چاندنی راتوں نے پالا ہے
ربیعہ کون ہے صحرائے فطرت کی غزالہ ہے" [1]

فطرت کے صحرا کی اس غزالہ کے متعلق آغا صاحب کی شاعری میں کوئی تفصیل نہیں ملتی سوائے اس کے کہ

"وہ اک بت خانۂ عفت کی پاکیزہ جوانی ہے" [2]

یا یہ کہ

"وہ فطرت کا حسین شہکار ہے اور غیر فانی ہے" [3]

یا پھر اتنا سا اضافہ اور ہو سکتا ہے کہ اُس کے چہرے پر صباحت ہے اور نازک اندام ہے۔ آغا صاحب نے اِس بات کو اس طرح کہا ہے

(بقیہ حاشیہ)

ا ۔ تو کیا ربیعہ کی طرح وُہ بھی تخیلی پیکر ہے؟

ش:۔ ہو سکتا ہے۔

ا:۔ آپ نے لکھا تھا کہ اس کا وجود ہے؟

ش:۔ وُہ میری ادھوری معلومات تھیں۔ (شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف)

اِس سلسلے میں ن۔م۔ راشد صاحب نے کہا ہے کہ

"سلمیٰ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ideal یا نصب العین تھا جس تک اختر پہنچنا چاہتے تھے۔"

(ادبی مطالعے۔ مضمون اختر شیرانی از ن۔م۔ راشد ص نمبر ۸۶۔
مرتبہ مجلس اردو لاہور)

۱-۲-۳ گفتنی و ناگفتنی شورش کاشمیری ص نمبر ۱۲۹

"تیرے چہرے کی صباحت پہ اُداسی کیسی
تیری جاگی ہوئی آنکھوں میں شکایت کیا ہے

تنِ نازک ترا اور آتشِ بے نام کی لو
آخر اس کربِ مسلسل کی نہایت کیا ہے؟"[1]

بہر حال یہ قطعی بات ہے کہ ربیعہ نام کی کسی لڑکی سے آغا صاحب نے کبھی عشق نہیں کیا لیکن وہ معاملاتِ حسن و عشق کی لذت سے نا آشنا نہ تھے۔ انہوں نے "خورشید" نامی ایک لڑکی سے عشق کیا تھا۔ جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ لیکن شاعری میں انہوں نے خورشید کا نام کبھی استعمال نہیں کیا۔ جیسا کہ ربیعہ کا نام استعمال کرتے ہیں۔ صرف ایک جگہ "جذباتِ شورش" میں، جو کہ اُن کا ابتدائی مجموعۂ کلام ہے، یہ اشارہ ملتا ہے کہ

"بہارِ وادیٔ گجرات کی قسم مجھ کو
تمہارے نقشِ کفِ پا پہ مرمٹا ہوں میں
مری حسین امیدوں کا آسرا تو ہے
تری تمام اداؤں کا مدعا ہوں میں"[2]

خورشید چونکہ گجرات کی رہنے والی تھی لہٰذا قیاس کہتا ہے کہ "بہارِ وادیٔ گجرات" خورشید ہی ہو سکتی ہے۔ ورنہ گجرات سے ان کا کوئی دوسرا جذباتی رشتہ نہ تھا۔ بہر حال ربیعہ کا وجود اگرچہ تخیلی پیکر ہے۔ لیکن آغا صاحب نے ربیعہ کے حوالے سے جن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ ان کے پس منظر میں ہو سکتا ہے۔ آغا صاحب ربیعہ کے روپ میں خورشید کو دیکھتے ہوں۔ اِس سلسلے میں ایک اور نام "شہناز" ہے جسے آغا صاحب نے اپنے اشعار میں اختر شیرانی کی طرح استعمال کیا ہے۔ لیکن "ربیعہ" اور "شہناز"

---

[1] گفتنی و ناگفتنی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۵۳
[2] جذباتِ شورش — شورش کاشمیری — ص نمبر ۳۵

میں کوئی فرق نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ

"شہناز و ربیعہ میں کچھ فرق نہیں لیکن
اک ابروئے پیوستہ اک معرعِ چسپیدہ
شورش کے خیالوں کی رونق یہی چہرے ہیں
ان زہرہ جبینوں پہ قربان دل و دیدہ"[۱]

آغا صاحب نے اپنی عاشقانہ شاعری میں پرانی روایت کی پابندی بھی کی ہے اور نئے تجربات بھی کئے ہیں۔ اُن کے روائتی اشعار یہ ہیں۔

"ہے ایک رات کی کیا بات بیت جائے گی　　خدا کے واسطے آپ اس قدر نہ شرمائیں
شبِ وصال کو تنہائی کی ضرورت ہے　　سہیلیوں سے کہو آج رات سو جائیں"[۲]

"خوب ہے نیم نگاہی بھی مگر وقت نہیں　　آنکھ سے آنکھ ملا رات چلی جاتی ہے
اپنے اِس ریشمی آنچل کی اڑانوں پہ نہ جا　　کھول دے بند قبا رات چلی جاتی ہے"[۳]

شاہد و شراب کے موضوعات عاشقانہ شاعری میں عام ملتے ہیں۔ آغا صاحب نے بھی ان روایتی مضامین کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔

"سبو سے ربط بڑھائیں فضا پہ لہرائیں　　یہ سامنے ہے چلو مے کدے میں ہو آئیں
لطیف نغمہ الاپیں کہ چاند روشن ہے　　عجب نہیں کہ ستارے شراب بن جائیں"[۴]

۱۔ چٹان　۲ر دسمبر ۱۹۵۸ء
۲۔ گفتنی و ناگفتنی　شورش کاشمیری　ص نمبر ۱۵۹
۳۔ ایضاً　ص نمبر ۱۶۲
۴۔ ایضاً　ص نمبر ۱۵۹

"کہاں کا زہد یہ توبہ کی داستاں کیا ہے   سبو اُٹھا کہ گھٹائیں سلام کہتی ہیں"[1]

نئے تجربوں کی نمائندگی ان کے یہ اشعار کرتے ہیں ۔

"ربیحہ! کچھ تو آخر اہتمامِ زندگی کر لیں

زمانے کی ستم آرائیاں دیکھی نہیں جاتیں

عزیزوں کی کرم فرمائیاں دیکھی نہیں جاتیں

ربیحہ! اس سے بہتر ہے کہ دونوں خودکشی کر لیں

قضا کے روپ میں تکمیلِ شرحِ عاشقی کر لیں

ہمیں مہر و وفا کا آسمانی گیت گانا ہے

ہمیں اس زندگی کی سرحدوں سے دور جانا ہے

ثریا سے تعارف، کہکشاں سے دوستی کر لیں"[2]

اسی طرح آغا صاحب کی عشقیہ شاعری میں اور بھی نئے تجربے ملتے ہیں۔ مگر یہ تمام تجربے اختر شیرانی کی تقلید میں کئے گئے ہیں۔ آغا شورش کاشمیری کی یہ عاشقانہ شاعری اُن کے ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب نے عشقیہ شاعری کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ اس ابتدائی دور کے بعد انہوں نے جو شاعری کی ہے وہ اگرچہ زیادہ تر سیاسی شاعری ہے مگر کہیں کہیں ایسا شعر بھی نکل آتا ہے جسے ہم عاشقانہ اور تغزل کا شعر کہہ سکتے ہیں۔

احساسِ انا

آغا شورش کاشمیری کی شاعری میں سب سے زیادہ نمایاں بات اُن کا احساسِ انا ہے۔

۱۔ گفتنی و ناگفتنی ۔   شورش کاشمیری   ص نمبر ۱۵۶

۲۔ ایضاً   ص نمبر ۱۶۹

جسے سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ پہلے ادب میں احساسِ انا کا تعین کیا جائے۔ انانیتی ادبیات کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے یہ کہا ہے کہ

"انانیتی ادبیات سے مقصود اس طرح کی خامہ فرسائیاں ہیں جس میں ایک مصنف کا ایگو (Ego) یعنی "میں" نمایاں طور پر سر اُٹھاتا ہے۔"[1]

مولانا نے کسی بھی ادیب۔ شاعر، مصور اور اہلِ قلم کی انانیت کی تعریف اس طرح کی ہے کہ

"یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے۔ جسے وُہ دبا نہیں سکتا اگر دبانا چاہتا ہے تو اور بھی زیادہ ابھرنے لگتی ہے اور اپنی ہستی کا اثبات کرتی ہے۔"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد نے جس چیز کو فکری انفرادیت کا قدرتی سرجوش کہا ہے وُہ درحقیقت کسی بھی فنکار کی وُہ صلاحتیں ہیں جو کسی میں مبداء فیّاض کا فیضانِ خاص ہو۔ گویا کسی بھی ادیب یا شاعر کی فطری صلاحتیں خود شاعر یا ادیب کو "میں" کہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ شاعر یا ادیب خود ایسا نہیں کرتا بلکہ وُہ ایسا کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد "غبارِ خاطر" کے ایک خط میں اِس بات کو سمجھنے کیلئے فردوسی اور فیضی کے اشعار نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

"جب ہمارے میر انیس نے کہا تھا!

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

تو یہ محض شاعرانہ تعلّیاں نہ تھیں یہ اُن کی پرجوش انفرادیت تھی جو بے اختیار چیخ رہی تھی۔"[3]

---

[1] غبارِ خاطر — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۲۲۰

[2] ایضاً — ص نمبر ۲۲۱

[3] ایضاً — ص نمبر ۲۲۲

مولانا کے اس بیان سے ہم "تعلّی" اور "بیرجوشِ انفرادیت" کا فرق سمجھ سکتے ہیں کہ تعلّی میں فطری صلاحیتوں کا گذر نہیں ہوتا بلکہ وہ ایسا جھوٹا دعویٰ ہوتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ یعنی کچھ لوگ تو عرفان و وجدان میں واقعی قلندر ہوتے ہیں اور کچھ لوگ محض سر منڈوا کر ہی قلندر بن جاتے ہیں۔ اس طرح یہ فرق دراصل حقیقی اور غیر حقیقی کا فرق ہے۔ کچھ شاعر یا ادیب تو واقعی اپنی نابغانہ صلاحیتوں کو دبا نہیں سکتے۔ لہٰذا "میں" کہنے پر مجبور رہتے ہیں اور کچھ ادیب اور شاعر دوسروں کی دیکھا دیکھی "میں" کا استعمال کرتے ہیں۔

آغا شورش کاشمیری کی "میں" کا شمار بھی اُن لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنی فطری صلاحیتوں کو کوشش کے باوجود دبا نہیں سکتے بلکہ "میں" کہنے پر مجبور رہوتے ہیں۔ گویا آغا صاحب کی "انا" یا "میں" حقیقی ہے مثلاً جب وہ یہ کہتے ہیں کہ

"ہر حال میں ہر دور میں تابندہ رہوں گا
میں زندۂ جاوید ہوں پائندہ رہوں گا
تہذیبِ خطابت ہو کہ تہذیبِ صحافت
ان دونوں محاسن کا نمائندہ رہوں گا
تاریخ مرے نام کی تعظیم کرے گی
تاریخ کے اوراق میں آئندہ رہوں گا"[1]

"لرزاں ہیں میرے نام کی ہیبت سے کاسہ لیس
اربابِ اقتدار کا نوکر نہیں ہوں میں
مجھ کو رہا ہے فنِ خوشامد سے احتراز
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کا خوگر نہیں ہوں میں"[2]

1۔ گفتنی و ناگفتنی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۸۳
2۔ ایضاً — ص نمبر ۹۱

"نوجواں عمر کے دس سال گذارے میں نے　　قید کی گود میں ناموسِ وطن کی خاطر"[1]
"اور میں آج بھی اس دورِ ستم پیشہ میں　　کج کلاہوں کی رعونت سے الجھ سکتا ہوں"[2]

تو وہ حقیقت کی ترجمانی کر رہے ہوتے ہیں۔ شورش صاحب کی خطابت اور صحافت واقعی قابلِ قدر ہیں۔ صحافت اور خطابت کی تاریخ شورش کاشمیری کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ آغا صاحب اگر اپنی قید و بند۔ خودداری اور جرأت و بہادری کا اظہار کرتے ہیں تو یہ باتیں بھی آغا صاحب میں بہ کمال و تمام موجود تھیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آغا صاحب کے کلام میں جو "میں" پائی جاتی ہے وہ فطری اور حقیقی ہے۔ اِس کا تعلّی یا مبالغے سے کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح آغا صاحب نے بعض اور حقیقتوں کا اظہار بھی اس طرح کیا ہے۔

"مرے قلم نے مذاقِ حیات بدلا ہے　　بلند لیوں پہ اُڑا ہوں سماء سے کھیلا ہوں
بڑے بڑوں کی فضیلت کے بل نکالے ہیں　　دراز دستیٔ پیک قضا سے کھیلا ہوں
رہا ہوں قیدِ مشقت میں دس برس شورش　　ہر ایک حلقۂ زنجیرِ پا سے کھیلا ہوں"[3]

آغا صاحب کی شاعری کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ آغا صاحب کی "انا" نے اُن کے کلام میں مختلف طریقوں سے سر اُٹھایا ہے۔ بعض اوقات آغا صاحب نااہل لوگوں کو جو اہل ہونے کے دعویدار ہیں اپنے مقابل لے آتے ہیں اور بعض اپنی ذات کے حوالے سے اُن پر تنقید کرتے ہیں مثلاً

"ہم ہیں حرم فروش فقیہوں کے نکتہ چیں
ہم ہیں فقیرِ راہ! مگر شہریار ہیں"[4]

۱ـ گفتنی و ناگفتنی　　شورش کاشمیری　　ص نمبر ۱۰۷
۲ـ ایضاً　　ص نمبر ۱۰۸
۳ـ ایضاً　　ص نمبر ۶۲
۴ـ ایضاً　　ص نمبر ۵۴

"دارورسن کی گود میں پالے ہوئے ہیں ہم
سانچے میں مشکلات کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم
رجعت میں فرد ہیں تو دنائت میں بے مثال
اب ایسے رہزنوں کے حوالے ہوئے ہیں ہم"[1]

"میں نے دیکھے ہیں کئی دارورسن کے معرکے
کوئی سجادہ نشیں مجھ کو ڈرا سکتا نہیں
ولنزکے کے توشہ خانے کا پرانا زلہ خوار
میری اس یلغار سے پیچھا چھڑا سکتا نہیں"[2]

"ہم ایسے کشتگانِ وفا کے خلاف ہیں — اسرار خاندانِ ہلاکو کے مخبری"[3]
"منہ نہ کھلواؤ کھری بات نکل جائے گی — ضربتِ حیدرِ کرار مرا جوہر ہے"[4]

آغا صاحب کی شاعری میں انا کی ایک صورت ایثار پسندی (ALTRUISM)[5] ہے۔ ایک فرانسیسی

---

۱ گفتنی و ناگفتنی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۶۵
۲ ایضاً — ص نمبر ۷۴/۷۵
۳ ایضاً — ص نمبر ۸۹
۴ ایضاً — ص نمبر ۶۸
۵ "کلاسیکل اور مسیحی خیالات میں انانیت (Egoisnm.) اور ایثار پسندی (Altruisim.) میں کوئی بڑا بڑا فلسفیانہ تصادم نہیں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ ایک فرد کیلئے "اچھائی" اور سماجی نظام کیلئے اچھائی میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ سب سے پہلے تھامس ہابز نے ساتویں صدی میں انانیت اور ایثار پسندی کے درمیان فرق کیا۔ اس نے مسیحی۔ افلاطون اور ارسطو کے خیالات کو مسترد کر دیا۔ ہابز نے یہ دعویٰ کیا کہ تمام انسانی افعال کا ماخذ تحفظِ خود کا جذبہ ہوتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ملسقی (JACQUES MARITAIN.) نے اپنی کتاب "فن اور شاعر میں تخلیق وجدان" (The creative Intuition to Art and Poetry.) میں لالیونل دفونسیکا کے حوالے سے "انا" اور ایثار پسندی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"عامیانہ پن فنی تخلیقوں میں ہمیشہ "میں" کرکے بات کرتا ہے۔ جو انائے خود مرکز کی خصوصیت ہے۔ شاعری بھی "میں" کہتی ہے لیکن مختلف طریقے سے شاعری کا "میں" اُس کی زندہ داخلیت ہے جو اظہار و ابلاغ کی بھوکی ہوتی ہے .... چنانچہ شاعرانہ کارروائی نظرتاً بے غرض ہوتی ہے۔ شاعر کی خودنمائی۔ خود پرستی نہیں ہوتی بلکہ اس میں انتہائی درجے کا ایثارِ نفس ہوتا ہے۔"[۱]

(بقیہ حاشیہ)

اور تمام انسانی افعال کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ دوسروں پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ بیسویں صدی کے بہت سے مفکرین نے اس نظریے کی تائید کی جن میں فرائڈ بھی شامل ہے۔ لیکن اس پر بہت سے مفکرین نے اس نظریہ کو مسترد کیا ہے اور کہا ہے کہ ایثار پسندی ایک بہتر نظریہ ہے۔

رچرڈ کیمبرلینڈ (Richard Comberland.) نے کہا ہے کہ ایثار پسندی ایک عظیم ذریعہ ہے جس کی بدولت ایک انسان اپنی اچھائی میں پیش رفت کرتا ہے۔ جے۔ ایس مل بھی اسی نظریے کا قائل ہے۔ تھامس ریڈ (Thumas Reid.) کے نزدیک ایثار پسندی بھی ایک انسان سے اتنی ہی مانوس ہے جتنی کہ انانیت۔ اسی طرح ایڈم سمتھ اور ڈیوڈ ہیوم نے بھی ایثار پسندی کو ایک بہتر نظریہ قرار دیا ہے۔

Encyclopedia Americana

Page No 760-761, Volume No 9. Copyright 1982.

۱؎ مغربی شعریات از محمد ہادی حسین ملخص ترجمہ ص نمبر ۲۵۳/۲۵۲

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شاعر کی "میں" میں کسی خودغرضی کی بجائے ایثار پسندی کی روح کارفرما ہوتی ہے اور اسی ایثار پسندی کی وجہ سے آغا صاحب کی انا اپنی ذات کے حوالے سے ابھرنے کی بجائے ایک سماجی نظام اور اجتماع کیلئے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی وہ اپنی ذات ہی کے حوالے سے ایک نظام یا اپنے وطن و قوم کے ستائش گر ہیں۔ اس طرح آغا صاحب کی "انا" انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف سفر کرتی ہوئی نظر آتی ہے

"ہم نے گنگا کے کناروں پہ اذانیں دی ہیں
ہم ہیں بھارت کے در و بام ہلانے والے

ہم نے ہر عہد کے فرعون کو غرقاب کیا
ہم ہیں دریاؤں میں طوفان اٹھانے والے

ہم نے کفار کو منہ توڑ شکستیں دی ہیں
ہم ہیں ہر دور کی تاریخ بنانے والے

شورش اِس راز سے ہر شخص کو آگاہ کرو
خاک ہوجائیں گے سب ہم کو ڈرانے والے"[1]

آغا صاحب نے مندرجہ بالا اشعار میں اپنی کسی ذاتی صفت یا خوبی کی تعریف نہیں کی بلکہ مسلمان قوم کی اُن خصوصیات کو بیان کیا ہے جو مسلمانوں میں پائی جایا کرتی تھیں۔ کیونکہ بطور مسلمان آغا صاحب بھی مسلمان قوم میں شامل ہیں۔ اس لیے قومی حمیّت کا بیان ایک شخص کی انا کی بجائے ایک قوم کی انا بن گیا ہے۔

مندرجہ ذیل اشعار میں بھی آغا صاحب نے اپنی انفرادی خوبیوں کو وطن کے حوالے کرکے ایک اجتماعی شان پیدا کردی ہے

1۔ الجہاد و الجہاد — شورش کاشمیری — ص نمبر ۷۳

"یہ قلم اور اس کا سیلِ رواں — یہ زباں اور اس کا زورِ بیاں
عرصۂ جنگ میں خنجرِ برّاں — میری بیباک جرأتوں کے نشاں
میرا سب کچھ میرے وطن کا ہے"[۱]

اور یہ اشعار بھی اسی حقیقت کے ترجمان ہیں

"صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا
مرے وطن تری عظمت کے گیت گاؤں گا
لٹاؤں گا تری راہوں پر خندہ ہائے سحر
ترے لیے مہ و خورشید خود بناؤں گا
خدا نے شعلہ نوائی مجھے عطا کی ہے
عوام سوئے ہوئے ہیں انہیں جگاؤں گا
مرا قلم مرے جمہور کی امانت ہے
میں اپنے فرض کو ہر حال میں نبھاؤں گا"[۲]

اسی طرح یہ اشعار ہیں جن میں مندرجہ بالا خیالات ہی کی تکرار ہے۔

"عوام سوئے ہوئے ہیں انہیں جگاؤں گا — کلاہِ قیصر و کسریٰ پہ مسکراؤں گا
اس ارضِ پاک کے جمہور کی ضرورت پر — قلم کے زعم پہ تلوار لے کے آؤں گا
بناؤں گا میں ستاروں کو ہم رکاب اپنا — افق سے مہرِ جہاں تاب کھینچ لاؤں گا"[۳]

غرض آغا صاحب کی شاعری میں انانیت کا عنصر بہت زیادہ ہے اور اس کے کئی پہلو ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر

۱۔ الجہاد والجہاد — شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۹
۲۔ گفتنی و ناگفتنی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۸۴/۸۵
۳۔ ایضاً — ص نمبر ۹۲

نے "گفتنی و ناگفتنی" کے دیباچے میں آغا صاحب کی شاعری کی اس خصوصیت کو "دعوتِ عام"[1] کے نام سے یاد کیا ہے۔ یعنی آغا صاحب کی شاعری میں احساسِ انا لوگوں کیلئے ایک نمونہ ہے۔ جس کے حصول کیلئے سبھی کو کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لیے کہ آغا صاحب نے انہی اقدار پر فخر کیا ہے جو زندگی کی صالح اور سچی اقدار ہیں۔ مثلاً حق گوئی۔ جرأت۔ قربانی۔ بہادری اور حب الوطنی وغیرہ۔

فنی طور پر آغا صاحب کی شاعری میں انانیت کا اظہار بڑا بے ساختہ ہے۔ بناوٹ یا تصنع کا احساس نہیں ہوتا۔ انہوں نے جن باتوں کو اپنے لیئے باعثِ فخر قرار دیا ہے وہ باتیں چونکہ حقیقی اور واقعی ہیں اور آغا صاحب کی ذات کا حصہ ہیں۔ لہٰذا جب وہ اپنی ذات کے اس حصے کا اظہار کرتے ہیں تو وہ حقیقت حال ہی کی تصویر ہوتی ہے۔ اور یہی واقعیت دراصل اُن کی انا کے اظہار کا حسن بھی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے انا کے اظہار میں اسی خوبی کو کامیاب قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> "جو مصنف اپنی انانیت کی بے ساختہ تصویر کھینچ سکتے ہیں وہ اس معاملہ کی ساری مشکلات پر غالب آجاتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تصویر خود اپنے قلم سے کھینچی۔ لیکن یہ بات اس کی دلآویزی میں کچھ مخل نہ ہو سکی۔ کیونکہ تصویر بے تکلف اور بے ساختہ کھینچی وہ لوگوں کو باعظمت دکھائی دے یا نہ دے لیکن اس کی بے ساختگی کی گیرائی سب کی نگاہوں کو لبھا لیگی۔ ایسے ہی مصنف ہیں جو اپنی انانیت کو لافانی اور دلپذیری کا جامہ پہنا دیتے ہیں"[2]

خطیبانہ لہجہ

موجودہ دور میں سیاست اور شاعری کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

"یونانِ قدیم میں سیاست، شاعری کا ایک حصہ تھی اور اُس کی آواز خطابت

۱۔ گفتنی و ناگفتنی — شورش کاشمیری — دیباچہ غلام رسول مہر — ص نمبر ۱۱

۲۔ غبارِ خاطر — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۲۲۵

کے معرکوں میں گونجا کرتی تھی "[۱]

آغا صاحب نے موجودہ دور میں سیاست۔ خطابت اور شاعری کو یکجا کر دیا ہے۔ جہاں تک خطابت کا تعلق ہے وہ تو آغا صاحب کی روح کی گہرائیوں تک اتر چکی تھی اور سیاست کا معاملہ بھی اس سے مختلف نہیں وہ کہا کرتے تھے کہ

"جس دن سیاست چھوڑ دی میں ختم ہو جاؤں گا"[۲]

گویا آغا صاحب کی زندگی سیاست سے عبارت تھی وہ کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ نہ تھے۔ اس کے باوجود پاکستانی سیاست کے روحِ رواں تھے۔ شاعری میں آغا صاحب نے جو کچھ کہا ہے اس کا بیشتر حصہ سیاست پر مشتمل ہے۔ وہ پاکستان کے سب سے بڑے عوامی خطیب تھے اور بدیہہ گو شاعر بھی۔ وہ اپنے خطابتی معرکوں میں بھی شاعری کیا کرتے اور اُن کی شاعری کا لہجہ بھی خطیبانہ ہے۔ آغا صاحب کی خطابت کا اصل میدان تو سیاست ہی ہے ـــــ شاعری کا عنوان خواہ کچھ بھی ہو لیکن آغا صاحب کا لہجہ کہیں نہ کہیں خطیبانہ ضرور ہوتا ہے مثلاً ذیل میں جو اشعار نقل کئے جا رہے ہیں۔ وہ ایک بڑے ہی الم ناک واقعہ پر کہے گئے ہیں۔ ۲ر اپریل ۱۹۷۲ء کو ہاکس بے کراچی میں ساحل سمندر پر تفریح کے لئے آئی ہوئی اسکولوں کی طالبات پر جن کی تعداد ـــــ دو اڑھائی سو کے قریب تھی۔ کالجوں کے طلبا جو تعداد میں دو گنا تھے۔ ٹوٹ پڑے اور ہر وہ حرکت اور فعل کیا جو تصور میں نہیں آسکتا۔[۱]
آغا صاحب نے ان اشعار میں ان ہی درندوں کو خطاب کیا ہے

"غنڈہ گردی کی سیہ تہذیب کے پالے ہو تم .
خوب ثابت کر دیا آفت کے پرکالے ہو تم

۱۔ مغربی شعریات از محمد ہادی حسین مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور ص نمبر ۲۲۵

۲۔ روزنامہ جنگ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۸۵ء انٹرویو بیگم خورشید شورش کاشمیری

۱۔ بحوالہ چٹان ۱۰ر اپریل ۱۹۷۲ء

عصرِ حاضر کی نئی تہذیب کے لے پالکو
شیشہ ہائے ناب کی سرمستیوں کے لاڈلو

رات کے تاریک سناٹوں کی پیداوار ہو
کن سیاسی مورچہ بازوں کے آلہ کار ہو؟

او! خزاں زادو کہاں تک گُل کھلاتے جاؤ گے
خود مٹو گے ملک و ملت کو مٹاتے جاؤ گے

ایسی نسلیں قعرِ ذلت میں ڈبونی چاہیں
تم سے بیٹے ہوں تو مائیں بانجھ ہونی چاہیں

شورشؔ ایسی پود پر اژدر برسنے چاہییں
آگ میں تپتے ہوئے پتھر برسنے چاہییں[1]

مندرجہ بالا اشعار میں جذبات کے جس سیلِ بے پناہ کا اظہار ہوا ہے وہ کسی خطیب کی تقریر کا وہ حصہ ہوتا ہے۔ جس کو تقریر کی معراج کہا جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے۔ جہاں خطیب، لوگوں سے ہر وہ بات منوا سکتا ہے۔ جسے لوگ ماننے کیلئے تیار نہ ہوں۔ جہاں تک سیاسی شاعری میں خطیبانہ لہجے کا تعلق ہے۔ تو یہ سماں اُس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب آغا صاحب اپنے حریفوں پر طنز کے تیر چلا رہے ہوتے ہیں۔ اور انہیں نامساعد حالات کا سامنا ہوتا ہے۔ سی. ڈے لیوس (C.D.Lewis) نے اپنی کتاب شاعری کا امید افزا مستقبل (A Hope for Poetry) میں پہلی جنگ عظیم کے بعد کے شاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جب شاعر کو اپنا ماحول نامساعد اور نفرت انگیز دکھائی دے تو وہ یا تو عمداً دلیرانہ بن جاتا ہے یا ناصحانہ شاعری اختیار کر لیتا ہے۔ مابعد جنگ

---

[1] چٹان ۱۵ر اپریل ۱۹۷۲ء

عصرِ حاضر کی نئی تہذیب کے لے پالکو
شیشہ ہائے ناب کی سرمستیوں کے لاڈلو

رات کے تاریک سناٹوں کی پیداوار ہو
کن سیاسی مورچہ بازوں کے آلہ کار ہو؟

او! خزاں زادو کہاں تک گُل کھلاتے جاؤ گے
خود مٹو گے ملک و ملت کو مٹاتے جاؤ گے

ایسی نسلیں قعرِ ذلت میں ڈبونی چاہیں
تم سے بیٹے ہوں تو مائیں بانجھ ہونی چاہیں

شورشؔ ایسی پود پر اژدر برسنے چاہیں
آگ میں تپتے ہوئے پتھر برسنے چاہیں[1]

مندرجہ بالا اشعار میں جذبات کے جس سیلِ بے پناہ کا اظہار ہوا ہے وہ کسی خطیب کی تقریر کا وہ حصہ ہوتا ہے۔ جس کو تقریر کی معراج کہا جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں خطیب لوگوں سے ہر وہ بات منوا سکتا ہے۔ جسے لوگ ماننے کیلئے تیار نہ ہوں۔ جہاں تک سیاسی شاعری میں خطیبانہ لہجے کا تعلق ہے۔ تو یہ سماں اُس وقت زیادہ نمایاں ہوتا ہے جب آغا صاحب اپنے حریفوں پر طنز کے تیر چلا رہے ہوتے ہیں۔ اور انہیں نامساعد حالات کا سامنا ہوتا ہے۔ سی۔ ڈے لیوس (C. Day Lewis.) نے اپنی کتاب شاعری کا امید افزا مستقبل (A Hope for Poetry.) میں پہلی جنگ عظیم۔ کے بعد کے شاعروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"جب شاعر کو اپنا ماحول نامساعد اور شر انگیز دکھائی دے تو وہ یا تو عمداً دیوانہ بن جاتا ہے یا ناصحانہ شاعری اختیار کر لیتا ہے۔ مابعد جنگ

---

[1] چٹان ۱۰ اپریل ۱۹۷۲ء

کے شعرا میں سے اکثر نے مؤخر الذکر طریقہ استعمال کیا ہے۔[1]

لیکن آغا صاحب نامساعد حالات اور شر انگیز ماحول میں تجاہلِ عارفانہ سے کام نہیں لیتے اور نہ ہی ناصحانہ شاعری کرتے ہیں۔ بلکہ ایسے حالات میں اُن کا لہجہ خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ سی۔ ڈے لیوس نے ہی ییٹس کا یہ قول نقل کیا کہ۔

”ہم اوروں سے جھگڑیں تو خطابت کرتے ہیں اور اپنے سے جھگڑیں تو شاعری“[2]

اور حقیقت یہ ہے کہ آغا صاحب کی خطیبانہ شاعری کے تیور جھگڑے کی صورت میں زیادہ تیکھے ہوتے ہیں۔ ذیل میں ایک مشہور جھگڑے میں کہے گئے اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔ آغا صاحب کا یہ نزاع بریلوی مکتبِ فکر کے علماء سے ہوا اور اس نزاع میں کہے گئے تمام اشعار اُن کے مجموعۂ کلام ”چہ قلندرانہ گفتم“ میں موجود ہیں۔ جن میں سے چند اشعار یہ ہیں۔ خطیبانہ لہجہ ملاحظہ ہو:-

”لازماً اِس راز سے تو آپ بھی ہیں باخبر
سو برس کس نے کیا انگریز کے در کا طواف

غوثِ اعظم کی لحد پر حملہ آور کون تھا
کس ستمگر نے جلایا اُن کے مرقد کا غلاف

کون تڑپاتا رہا ترکوں کو خاک و خوں میں
جی میں آتا ہے کہ لکھوں یہ حقائق صاف صاف

ٹل نہیں سکتا کبھی شورشؔ قضا کا فیصلہ
کر نہیں سکتی مشیّت بدزبانوں کو معاف“[3]

۱۔ مغربی شعریات از محمد ہادی حسن ملخص ترجمہ شاعری کا امید افزا مستقبل ص نمبر ۲۰۶

۲۔ ایضاً ص نمبر ۲۰۳

۳۔ چہ قلندرانہ گفتم۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۵۳

اسی طرح یہ اشعار بھی خطیبانہ لہجے کی بہترین مثال ہیں

"او رُذیلو! ڈیڑھ فٹ لمبی کلاہِ فخر سے — دین کو بٹہ لگا ڈ کیا یہی اسلام ہے؟

اس خدا کی سر زمیں برائے کفن دزدانِ دیں — چادرِ زہرا رضؓ اُدھیڑا ڈ کیا یہی اسلام ہے؟

خود فروشو! ذکرِ میلاد النبی کی آڑ میں — تہمتیں ہم پر لگا ڈ کیا یہی اسلام ہے؟

او خدا نا آشناؤں کے گروہِ نامراد — اک ذرا مجھ کو بتاؤ کیا یہی اسلام ہے؟"[۱]

آغا شورش کاشمیری شاعر ہونے کے علاوہ ایک سیاست دان بھی تھے اور اپنی طبیعت کی افتاد میں جذباتی بھی تھے۔ اور شعر کا تعلق براہ راست جذبات ہی سے ہوتا ہے۔ یوں تو معاشرے میں رہتا ہوا ہر آدمی اپنے گرد و پیش کے سیاسی حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن سیاست دان تو ان سیاسی حالات کو بنانے اور بگاڑنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا سیاست کے حوالے سے وُہ دوسروں سے زیادہ سیاسی حالات کی زد میں ہوتے ہیں۔ پھر اگر سیاست دان شاعر بھی ہے۔ تو ان سیاسی حالات سے دوسرے سیاست دانوں سے بھی زیادہ متاثر ہوگا۔ کیونکہ شاعر ہی معاشرے کا زیادہ حسّاس شہری ہوتا ہے۔

"اب اگر شاعر سیاسی افکار سے متاثر ہو تو قدرتی بات ہے کہ وہ دوسرے لوگوں سے زیادہ شد و مد کے ساتھ اُن کی مخالفت یا حمایت کرے گا۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ قابلِ اعتراض بات صرف یہ ہے کہ ایک شاعر ایک انسان کی حیثیت سے سیاسی خیالات کو محسوس کئے بغیر اُن کو اپنی شاعری کا موادِ خام بنائے۔"[۲]

آغا شورش کاشمیری بطور ایک شاعر یقیناً اپنے نظریات سے متصادم سیاسی افکار کی بڑی شدید مخالفت کرتے ہیں اور حمایت کا رنگ بھی پھیکا نہیں ہوتا۔ وُہ اپنی سیاسی شاعری کا خام مواد

۱ـ چہ قلندرانہ گفتم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۷۹/۸۰

۲ـ مغربی شعریات — سی۔ ڈے لیوس — ملخص ترجمہ از محمد ہادی حسین — ص نمبر ۲۰۲

سیاسی حالات و واقعات ہی سے حاصل کرتے ہیں لیکن وہ صرف ان ہی افکار کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہیں، جن سے متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کا مقصد صرف شدید مخالفت یا شدید حمایت نہیں ہوتا بلکہ اُن کے پیشِ نظر ہمیشہ تعمیر کا پہلو ہوتا ہے۔ البتہ اس شدت کی وجہ سے اُن کی شاعری کا لہجہ خطیبانہ ضرور ہو جاتا ہے۔

مندرجہ ذیل نظم کا عنوان "اقدام" ہے وہ لوگوں کو انقلاب کی دعوت دے رہے ہیں۔ جس کے چند اشعار یہ ہیں

"مجاہدوں کی حمیّت کے پاسدار ہو تم ۔۔۔ خدا کا شکر کہ ٹیپو کی یادگار ہو تم
چلو کہ گردشِ حالات رک ہی جائے گی ۔۔۔ قدم اٹھاؤ کہ تقدیرِ روزگار ہو تم
قضا سے آنچ ملاؤ کہ وقت نازک ہے ۔۔۔ بزن کہ خندۂ شمشیرِ آبدار ہو تم
لگاؤ ضرب زمانے کی بے ثباتی پر ۔۔۔ اٹھاؤ تیغ کہ معمارِ نو بہار ہو تم"[1]

غرض آغا صاحب کی شاعری میں خطیبانہ لہجہ ایک جاندار اور پُر وقار کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

ذوقِ عمل

ذوقِ عمل آغا شورش کاشمیری کے کلام کی ایک خاص خوبی ہے۔ وہ حالات سے گھبرانا یا مایوس ہونا نہیں جانتے بلکہ حالات و واقعات کا مقابلہ بڑی جرأت اور حوصلے سے کرتے ہیں۔ وہ قوم کی بے عملی پر طنز تو کرتے ہیں لیکن اسے مایوس نہیں ہونے دیتے۔ بلکہ کوئی نہ کوئی مژدہ اور کوئی نہ کوئی نوید سناتے رہتے ہیں تاکہ قوم بے عملی کا شکار نہ ہو جائے۔ وہ ہمیشہ حرکت و عمل کی دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ملک و قوم کی زبوں حالی پر آنسو نہیں بہاتے وہ کہتے ہیں

"نامناسب ہے کہ الفاظ میں آہیں بھر کر ۔۔۔ اپنی بے داغ روایات کی تحقیر کروں"[2]

۱۔ گفتنی و ناگفتنی ۔۔۔ ص نمبر ۶۵

۲۔ چٹان ۔۔۔ ۲۷ نومبر ۱۹۶۵ء

اُن کے نزدیک قوم کو فعال بنانے کا طریقہ یہ۔ ۔ کہ

"ٹوٹتی ہے پھڑپھڑانے سے کبھی زنجیرِ شب   طائروں کو دعوتِ قربانی و ایثار دو"[1]

وُہ اس عقیدے کے آدمی نہیں ہیں کہ صرف قربانی و ایثار کی دعوت ہی دی جائے بلکہ وُہ عملی آدمی تھے اور چاہتے تھے کہ اُن کی دعوتِ قربانی و ایثار پر عمل کیا جائے۔ وہ اس سلسلے میں کسی بھی مصلحت کو قبول نہیں کرتے۔ اُن کی تعلیم تو بس یہ ہے کہ

"سفر کی مشکلوں پر سوچنا کیا اس سے کیا حاصل
اگر شوقِ سفر رکھتے ہو اٹھو ابتدا کر دو

زیادہ سے زیادہ دار پر کھینچ جاؤ گے شورش
مگر جو بات کرنا چاہیئے تو برملا کر دو"[2]

اِس طرح آغا صاحب اپنے اشعار کے ذریعے عمل کے ذوق کو عام کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور شاعری کے اِس لہجے نے آغا صاحب کے کلام میں رجائیت کو جنم دیا ہے۔

جذباتی رنگ

آغا صاحب کی شاعری کا عام رنگ جذباتی ہے۔ بقول ڈاکٹر یوسف حسین خاں

"انسانی عزائم کی تہہ کو ٹٹولیئے تو ان کے ڈانڈے ہمیشہ جذبات سے ملے ہوئے نظر آئیں گے جو افراد اور جماعتوں کو تخلیقِ مقاصد پر اکساتے ہیں اور اخلاقی اقدار کی دنیا میں بڑے بڑے کام کراتے ہیں"[3]

گویا جذبات، انسان کے اندر عمل اور حرکت پیدا کرتے ہیں اور کوشش و سعی کی صورت میں انسان کو کامیابی و کامرانی سے ہم کنار کر دیتے ہیں۔ آغا صاحب کی شاعری کا انداز بھی اسی لیئے جذباتی

---

[1] چٹان   ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۶۲ء

[2] چٹان   ۶۔ اگست ۱۹۶۲ء

[3] روحِ اقبال   ڈاکٹر یوسف حسین خاں   ص نمبر ۱۸۲

ہے کہ وُہ قوم کو عظیم تر مقاصد کے حصول کی دعوت دیتے ہیں۔ لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ آغا صاحب ہوش و خرد سے کام نہیں لیتے بلکہ وُہ عقل و خرد سے نصب العین کا تعین ہو جانے کے بعد، جذبات کے وسیلہ سے اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

شورش کی شاعری میں اُس کا محبوب "آزادی" ہے وُہ اُس سے وصال چاہتے ہیں لیکن اس کے فراق میں آنسو نہیں بہاتے، آہیں نہیں بھرتے بلکہ اپنے زنجیر پا محبوب کو چھڑانے کیلئے لائحہ عمل سوچتے ہیں اور پھر یمین و یسار سے بے پروا ہو کر اُس کیلئے کوشش اور عمل کرتے ہیں۔ اس کوشش اور عمل میں اُن کے رفیق اُن کے جذبات ہیں۔ اب وہ کسی دلیل کو ماننے کیلئے تیار نہیں، کسی مصلحت کے تحت باز نہیں آ سکتے۔ اس لیے کہ انہیں یقینِ کامل ہے کہ اپنے محبوب کو حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ جس سے وہ جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں۔ آغا صاحب نے اپنی شاعری میں اس محبوب کو صرف اپنا محبوب نہیں رہنے دیا بلکہ پوری قوم کا محبوب بنا دیا ہے اور وُہ چاہتے ہیں کہ اس زنجیر پا محبوب کو اجتماعی کوشش سے آزاد کرایا جائے۔ اس حقیقت کو آغا صاحب نے اپنی ایک طویل نظم میں انتہائی جذباتی رنگ میں بیان کیا ہے۔ وُہ اِس نظم میں سب سے پہلے اپنے حوالے سے بتاتے ہیں کہ

"اِس حقیقت کو نہ بھولیں ہم نشینانِ چمن — یہ زمینِ پاک میری ہے یہ ہے میرا وطن
میں بھی اِس مٹی کے ذروں کو لہو دیتا رہا — میں بھی طوفانوں میں رہ کر کشتیاں کھیتا رہا
میں بھی استبداد کے منہ پر طمانچے مار کر — مسکرایا بارہا تیغ و سناں کی دار پر
سرفروشوں کی بدولت یہ زمیں آزاد ہے — منتِ شبیرؑ پاکستان کی بنیاد ہے"

لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تصویر یہ ہے کہ

"کچھ سویرے کالی راتوں میں بھٹک کر رہ گئے
کچھ مسافر بر سرِ منزل ٹھٹھک کر رہ گئے

بادلوں کا غول آوارہ افق پر چھا گیا
ٹوڈی بچوں کو غریبوں کا ہوا اس آگیا''

اس طرح آزادی ان لوگوں کے تصرف میں آگئی جو اُس کی قدر و قیمت سے آشنا نہیں تھے۔ اور انہوں نے آزادی کو اپنے ذاتی اغراض کی باندی بنا لیا۔ آغا صاحب آزادی سے متعلق کہتے ہیں

''جس نے حسن و عشق کی راتوں کو تاباں کر دیا
جس نے بت خانے کا بت خانہ مسلماں کر دیا
جس کی خاطر دس برس تک میں لہو روتا رہا
اپنے آنسو سرزمینِ شعر میں بوتا رہا
جس نے ایوانِ تخیل کو منور کر دیا
جس نے ہم ایسے فقیروں کو سکندر کر دیا
ہائے! بزمِ غیر کی زینت ہے وہ زہرہ جبیں
اس قیامت کا مگر دل کو یقیں آتا نہیں''

اب وہ اس بات کا ارادہ کرتے ہیں کہ

''میں یقیناً ایک دن اُس کو منا کر لاؤں گا
اُس کی دیرینہ محبت کے ترانے گاؤں گا
پھر یہاں سے ہم نکل جائیں گے میدانوں کی سمت
اپنے ہاتھوں میں لئے کڑا لے کے ایوانوں کی سمت
نوجوانوں کو پکاروں گا سرِ میدانِ حشر
کاکلِ گیتی سنواروں گا سرِ میدانِ حشر''[1]

---

[1] چٹان ۔ ۱۵ جنوری سالنامہ ۱۹۶۲ء

آغا صاحب اپنی شاعری میں ہمیں واقعی اقتدار کے ایوانوں کو ڈھاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور آزادی پر قابض ہونے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ

"قائدِ اعظم سے پہلے ہم سیہ کاروں میں تھے
یعنی انگریزی حکومت کے نمک خواروں میں تھے"[1]

انگریزی حکومت کے ان نمک خواروں کو آغا صاحب بڑی حقارت سے دیکھتے ہیں وہ کہتے ہیں

"اپنی طاقت پر نہ اِترائیں خدایانِ مجاز
عصرِ حاضر کے بتانِ بے سروپا ہیچ و پست

ملت بیضا کی مسند پر فروکش ہو گئے
اونے پونے لوگ یعنی کج نظر کوتاہ دست

ملت اسلام کی تاریخ پر قابض ہوئے
تھوکنے کے بھی نہیں قابل ہے جن کی سرگذشت

پھر ان لوگوں سے نجات کا طریقہ یہ بتایا۔

منزلِ مقصود تک شورش پہنچنے کیلئے
کافی و وافی ہے ازراہ صداقت ایک جست"[2]

پاکستان آزادی کیلئے بنا تھا۔ لیکن پاکستان آزاد نہیں تھا۔ لوگوں نے قربانیاں اور ایثار آزادی کیلئے کیا۔ وہ پاکستان کو اس لیے حاصل کرنا چاہتے تھے کہ اُس میں آزادی حاصل ہوگی مگر حکمرانوں نے اُس آزادی کو مصلوب کر دیا اور پاکستان کو آزادی کا نام دیا۔ جس میں وہ آزادی نہیں تھی۔ جس کے لیے انہوں نے قربانی و ایثار کیا تھا اور حالت یہ تھی۔

۱۔ چٹان ۷ تا ۱۳ جنوری ۱۹۷۵ء

۲۔ چٹان ۱۸۔ اگست ۱۹۷۵ء

"ہر سزا سے ماوریٰ ہر خوف سے آزاد ہے
اک صنم خانہ بہ اندازِ حرم آباد ہے

داستانِ درد استاں ہیں راستوں کے پیچ و خم
رنگ و بوئے پیرہن میں جنتِ شدّاد ہے

سیم و زر کے اُن کہے قصوں کی ارزانی کے ساتھ
ذرّہ ذرّہ اختیارِ خاص کی روداد ہے

اس کی رفعت ہے ہماری ہڈیوں پر استوار
اس کی شریانوں میں خونِ رشتہ رگِ فرہاد ہے

حاصلِ محنت سے ہے اس گُل کدے کی آب و تاب
بے نواؤں کا لہو ان کو ٹھیوں کی کھاد ہے

دوستو! سلطانیٔ جمہور کے آئین میں
ہم غریبوں کیلئے آنسو ہیں اور فریاد ہے"[ا]

آغا صاحب نے مندرجہ بالا اشعار میں پاکستان کی جس حالت کا نقشہ پیش کیا ہے ۔ یقیناً پاکستان ایسی حالت کیلئے نہیں بنایا گیا تھا وُہ اِس "صنم کدے" کو دراصل "حرم" میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں ۔ شورش کاشمیری کی زندگی اور شاعری کا یہی مرکزی نکتہ ہے اور یہی وُہ نصب العین ہے۔ جس کیلئے وُہ کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کرتے سوائے اس کے کہ پاکستان کی بنیاد ہی وُہ آزادی ہے جس کا وعدہ کیا گیا تھا ۔ لہذا اب وہ اِس کے حصول کیلئے ایک جذباتی لائحہ عمل تیار کرتے ہیں وہ قوم کو بتاتے ہیں کہ حکمران اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کیلئے لوگوں کو دھوکا دے رہے ہیں ۔ لہذا انہیں چاہیے کہ وُہ حکمرانوں سے اس آزادی کو چھین لیں جس کیلئے انہوں نے

ا؎ گفتنی و ناگفتنی ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۲۱۸

قربانی و ایثار کیا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"جور و جفائے گردشِ دوراں اٹھائیے — یارانِ نکتہ داں! کوئی طوفاں اٹھائیے

لات و منات صدر نشینانِ بزم ہیں — اس بت کدے سے کوئی تو انساں اٹھائیے

یارانِ ہم سفر گل و لالہ سے درگذر — لازم ہے ناز خارِ مغیلاں اٹھائیے"

غرض آغا صاحب کی تمام شاعری میں جوش و خروش۔ جنگ، پکار اور جذبات کی شدت ہر جگہ نمایاں ہے۔ آغا صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ

"یہ تمام شعر دراصل "برہم زن" کی صدائے بازگشت ہیں ....
... اس لیے ان میں جذبات کی شدت اور بے ترتیب واقعات کا تسلسل ہے .... کہیں انقلاب کی دعوت ہے۔ کہیں انقلاب کے نتائج پر حیرانی اور کہیں خورش آواز جھنجلاہٹ جس میں یاس کا عنصر تک نہیں پایا"[1]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات یوں سامنے آتی ہے کہ آغا صاحب کی شاعری میں رجائیت پائی جاتی ہے۔

رجائی لہجہ

آغا صاحب کے کلام کے مطالعے سے جو مجموعی تاثر ملتا ہے وہ یہ ہے کہ آغا صاحب کے لہجے میں بے پناہ قوت ہے۔ جس سے وہ لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرتے ہیں۔ نا امیدی۔ مایوسی یا انفعالیت اور شورش کاشمیری دو متضاد چیزیں ہیں۔ آغا صاحب کی تمام زندگی جدوجہد اور سعی و کوشش میں گذری وہ ہمیں اپنی شاعری میں جہدِ مسلسل کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کے اس نظریے کا کہ جس سے چمن افسردہ ہو جائے وہ بادِ سحر بے کار ہے کا صحیح ترین اطلاق آغا صاحب کی شاعری

---

[1] گفتنی و ناگفتنی — دیباچہ شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۹

پر ہوتا ہے۔ شاعری جمال کی چیز ہے۔ حسن کی رعنائی اور حسن کی فتنہ زائیاں نرمی اور نزاکت کا تقاضا کرتی ہیں۔ لیکن شورش کاشمیری کی شاعری میں جمال کی کیفیت سے زیادہ جلال کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

اُن کی شاعری کا جوش و خروش اُن کے رجائی لہجے ہی کا مرہونِ منت ہے اور شورش کاشمیری کی انتہائی جذباتی کیفیت کا عکس ہے۔ جس نے اُن کی شاعری میں زندگی کیلئے حرارت اور حرکت پیدا کر دی ہے۔

آغا شورش کی غزل

آغا صاحب کی شاعری میں غزل کا حصہ بڑا اہم ہے۔ البتہ انہوں نے غزل کی فارم میں نظمیں کہی ہیں۔ جنہیں غزلِ مسلسل بھی کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک غزلوں کا تعلق ہے۔ اِس کے متعلق آغا صاحب لکھتے ہیں

"میں غزل کی طبعیت لے کر پیدا ہوا۔ مجھے اپنی طبعیت کے اس تضاد پر حیرت ہوتی ہے کہ میرے ادبی ذوق کا انحصار غزل پر ہے۔ غزل کے تیر و نشتر فوراً نقش ہو جاتے ہیں۔ انہیں پڑھتا ہوں اور سر دُھنتا ہوں۔ لیکن شعر کہتے وقت میری طبعیت غزل کی طرف راجع نہیں ہوتی۔ شاعری کے ابتدائی دور میں بعض غزلیں ضرور کہی ہیں لیکن انہیں معیاری غزلیں نہیں کہہ سکتا۔ ان کے اشعار رسمی سے نیم جواب بدمزہ معلوم ہوتے ہیں"[1]

آغا صاحب کے کلام میں روایتی غزل کا حصہ تو بہت کم ہے۔ غزل اپنی اصلیت میں وارداتِ حسن و عشق کا بیان ہی ہے۔ لیکن موضوعات کے تنوع کی وجہ سے اس میں ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ آغا صاحب کا موضوعِ خاص سیاست ہی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ

---

[1] شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۹۳

بھی بہت سے موضوعات پر انہوں نے شعر کہے ہیں۔ شاعری میں آغا صاحب کا یہ خاص طریقہ ہے کہ وہ غزل کی فارم استعمال کرتے ہیں مگر اشعار کسی "موضوع" پر کہتے ہیں مثلاً "گفتنی و ناگفتنی" میں ایک نظم ہے "محسوسات" جس میں مطلع کہا گیا ہے۔ مقطع بھی موجود ہے۔ قافیہ ردیف کی پابندی کی گئی ہے اور کُل اشعار بھی پانچ ہیں۔ اس نظم کا اگر عنوان مٹا دیا جائے تو فارم کے لحاظ سے یہ مکمل غزل ہے۔ علاوہ ازیں اُن کی نظم "شہپرِ جبریل" میں مطلع۔ مقطع۔ قافیہ ردیف کی پابندی اور اشعار کی تعداد پانچ ہے۔ اسی طرح اور بھی نظمیں ہیں۔ جن میں اشعار کی تعداد سات ہے اور غزل کی فارم کی پوری پابندی کی گئی ہے۔ اس قسم کی ایک نظم مثال کے طور پر نقل کی جاتی ہے۔ جس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب غزل نما نظمیں کس طرح کہتے ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہے

"عروسُ البلاد"

حلقہ بگوش گردشِ دوراں رہا ہوں میں ۔۔۔ آہنگِ انقلاب کا عنواں رہا ہوں میں

کچھ اپنی سرگذشت بھی ہے برنگِ شعر ۔۔۔ کچھ آپ کے لیے بھی غزل خواں رہا ہوں میں

اک حادثہ رہا ہے انیسِ دل و نظر ۔۔۔ اک عمر اُس کی یاد میں غلطاں رہا ہوں میں

بے نام تہمتوں کو سمیٹا ہے بے دریغ ۔۔۔ امیدوارِ رحمتِ یزداں رہا ہوں میں

حق ہے مری وفا کا زلیخائے شہر پر ۔۔۔ اس سلطنت میں یوسفِ کنعاں رہا ہوں میں

فطرت بھی اس خیال سے شاید نڈھال ہو ۔۔۔ اتنا ترے بغیر پریشاں رہا ہوں میں

شورش گذشتہ رات عروس البلاد میں ۔۔۔ اک جانِ نو بہار کا مہماں رہا ہوں میں

مندرجہ بالا نظم میں غزل کے تمام لوازمات موجود ہیں۔ آخری دو اشعار میں خاص طور پر غزل ہی کی روح بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

بعض اوقات آغا صاحب اسی قسم کی نظمیں کہتے ہیں۔ اشعار کی تعداد طاق کی بجائے جفت ہو جاتی ہے اور آخر میں مقطع نہیں ہوتا ـــــ ایسی نظموں میں ایک آدھ شعر غزل کا بھی نکل آتا ہے۔ البتہ

آغا صاحب کی عشقیہ شاعری میں غزل کی پوری روح سمائی ہوئی ہے۔ لیکن اس نسبت کا عشقیہ کلام زیادہ نہیں ہے۔

بہر حال آغا صاحب کی اِس روش کو کہ وُہ نظم میں قواعدِ غزل کی پابندی کرتے ہیں ایک بہت بڑی فنکارانہ خوبی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ غزل کے مقابلے میں نظم کا لکھنا آسان ہے[1] اور اس کیلئے ایک خاص سلیقے اور ذوق کی ضرورت ہوتی ہے[2]۔ قافیہ ردیف کی التزاماً پابندی قبول کرنا اور پھر اس طرح کے خیالات میں ربط و تسلسل بھی قائم رہے بڑی مشکل بات ہے۔ لیکن آغا صاحب اِس مشکل سے کامیاب گذرے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان نے لکھا ہے کہ

"غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہد جدید کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں تسلسل پیدا کیا جائے گا"[3]

ڈاکٹر یوسف حسین خان کے خیال کی تکمیل ہمیں آغا صاحب کی شاعری میں ملتی ہے۔ آغا صاحب نے ایسا یقیناً عہد جدید کی زندگی کے رجحان کے پیشِ نظر ہی کیا ہے۔ غزل سے قطع نظر اگر آغا صاحب کی پوری شاعری کو فنی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آغا صاحب کو الفاظ کے استعمال میں بڑا درک حاصل ہے۔

بندشِ الفاظ

آغا شورش کاشمیری الفاظ کے برمحل استعمال کا بڑا ملکہ رکھتے ہیں۔ وُہ اس رمز سے واقف ہیں کہ الفاظ کا انسانوں کی نفسیات پر کیا اثر ہوتا ہے۔ کون سا لفظ کس موقع پر اور کس کیفیت کیلئے استعمال کرنا چاہیے۔ اِس فن کے پس منظر میں دراصل اُن کی خطابت کا فن بڑا

۱-۲ے بحوالہ اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خان ص نمبر ۱۱

۳ے اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین خان ص نمبر ۱۲

اثر انداز ہوا ہے۔ وہ اشعار میں بھی خطابت کی طرح الفاظ کو تول کر اور چن کر استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے لفظ جس جگہ کے لیئے اور جن معنوں میں استعمال کیا ہے۔ خود بولتا ہے کہ یہی اس کی مناسب جگہ ہے۔ شاعری میں بندشِ الفاظ کا سلیقہ ہی کسی شاعر کے لیئے کامیابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ آغا صاحب لفظوں کے در و بست اور بندش میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔

تراکیب سازی

آغا صاحب کی شاعری کا اصل میدان سیاست ہے یا پھر معاشرہ کے مختلف طبقے جو ظاہر میں پارسا اور بباطن ریاکار ہیں۔ آغا صاحب اپنے سیاسی حریفوں یا معاشرہ کی ان ریاکارانہ قوتوں پر طنز کرنے کیلئے ایک نیا لغت ایجاد کرتے ہیں۔ مثلاً چند تراکیب یہ ہیں۔

"سوداگرانِ شرعِ رسالت مآب[1]۔ تاجرانِ دینِ بدری[2]۔ شعبدہ بازئ تکفیر
جشنِ بربادئ اسلام[3]۔ دین فروشانِ عصرِ نو[4]۔ گل رخانِ مجلس احناف[5]۔
کفن دزدانِ دین۔ مفتیانِ بدزبان[6]۔ خانزادگانِ بریلی شریف[7]۔ ہم نوایانِ
زاغِ دشتی[8]۔ شوخئ افسونِ جبرِ لاجوردی[9]۔ نامردئ اہلِ خوشامد[10]۔
نازنینانِ سیاست[11]۔"

یہ چند تراکیب آغا صاحب کے مجموعۂ کلام "چہ قلندرانہ گفتم" سے لی گئی ہیں۔ اُن کے باقی کلام کا بھی یہی حال ہے۔

رواں بحریں

آغا شورش کاشمیری کی شاعری بعض رجحانات میں مولانا ظفر علی خان کی شاعری کی بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آغا صاحب اپنی شاعری میں سنگلاخ زمینوں اور مشکل قوافی کا استعمال نہیں کرتے

بلکہ اُن کی بحریں اور قوافی اکثر رواں اور آسان ہوتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی التزاماً مشکل قوافی بھی استعمال کرتے ہیں۔ جہاں کہیں بھی آغا صاحب نے ایسا کیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ظفر علی خان کی پیروی کر رہے ہیں۔ مثلاً یہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔ جن کا عنوان ہے "فریدہ گا رہی ہے"۔ ان اشعار پر آغا صاحب کا یہ نوٹ موجود ہے۔ یہ اخبار اگست ۱۹۶۶ء کے ہفت روزہ "چٹان" میں چھپے ہیں

"مری میں آرٹ کونسل کے زیر اہتمام جشنِ موسیقی۔ جواں سال وزیر بلدیات محمد یاسین وٹو مہمان خصوصی تھے۔ مولانا ظفر علی خان زندہ ہوتے تو ان قافیہ پیمائی کی داد دیتے۔ افسوس یار لوگ بذلہ سنجی کے بجائے شکر رنجی کا شکار ہو جاتے ہیں"

اشعار یہ ہیں

"بہت سے نوجوان ہیں اس رسیلی تان پر لٹو
فریدہ[1] گا رہی ہے گوش بر آواز ہیں وٹو

کہاں سے کھینچ لایا ہے انہیں تقریب کا چسکا
چچا چھکن کے پہلو میں فروکش ہیں میاں چٹو

ثقافت داغ کے ایامِ کلکتہ کا افسانہ
اڑا جاتا ہے بگٹٹ شرع کے حکام کا ٹٹو

ادیباتِ فرومایہ فقیہانِ سیہ فطرت
اکٹھے ہوں تو سب معلوم ہوتے ہیں بجر بٹو

غنا کے زور پر اڑتے ہوئے بن پنچھلے ملا تگل
زبانِ دہلیِ مرحوم میں لیکن چپر غٹو

---

[1] مشہور گلوکارہ

معاذ اللہ! کلام اللہ کی تو تمیر کیا ہوگی
خطیب اسلام کے ہمسن زمانے میں نظر بٹو مالہ[1]

لیکن یہ انداز آغا صاحب کے عام کلام کا نہیں البتہ کہیں کہیں انہوں نے بھی مولانا ظفر علی خاں کی طرح مشکل قوافی کا استعمال کیا ہے۔ عام طور پر آغا صاحب کی بحریں رواں ہوتی ہیں اور قوافی بھی وہ آسان استعمال کرتے ہیں۔

موسیقی

آغا صاحب کے کلام کی ایک خاص بات موسیقی کا عنصر ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ

"نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے سے قریب آجائینگی۔"

آغا صاحب کے کلام میں یہ پیش گوئی پوری ہو گئی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم کو غزل نما بنا دیا ہے اور اُن کی نظموں میں غزل کی سی موسیقیت ہے مثلاً اس نظم میں ملتان کے ایک ثقافتی میلے کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ ایک رقص کا منظر ہے۔

"گورے گورے گالوں والی — کالے کالے بالوں والی
تیکھے تیکھے نین اٹھا کر — بازو کی قوسیں لہرا کر
آنچل کی ابریشمی لَو سے — عارض کی مہتابی ضو سے
سرکاری اسلام کی شہ پر — چھٹے خاں حکام کی شہ پر

ا۔ چٹان ۲۹ر اگست ۱۹۶۶ء

زاویے بنتی ناچ چھنا چھن | نغمے چھنتی ناچ چھنا چھن
ناچ چھنا چھن | تاک دھنا دھن

چھل کے نین کٹورے توبہ | رنگیں رنگیں ڈورے توبہ
قامت کیا شمشیر کا عالم | زلف نہیں زنجیر کا عالم
نزہتِ لالہ زار کا نقشہ | لغزشِ بادہ خوار کا نقشہ
بہکی بہکی چال کا صدقہ | لہکی لہکی تال کا صدقہ
بھاؤ بتا کر ناچ چھنا چھن | نرت جما کر ناچ چھنا چھن
ناچ چھنا چھن | تاک دھنا دھن ۱؎

مندرجہ بالا اشعار میں "گورے گورے"۔ "کالے کالے"۔ "تیکھے تیکھے"۔ "رنگیں رنگیں"۔ "بہکی بہکی"۔ "لہکی لہکی" وغیرہ وہ الفاظ ہیں جن کی تکرار نے اشعار میں موسیقی کی روح پھونک دی ہے۔ اس کے بعد اگر رقاصہ کے سراپا سے نظر ہٹالیں تو طبلے کی دھنا دھن کے ساتھ رقاصہ کی پائل کی جھنکار کانوں میں چھنا چھن کی صورت میں آنے لگتی ہے۔

لفظوں کی تکرار کے علاوہ بعض اوقات آغا صاحب بحروں کی روانی اور الفاظ کی نرمی سے بھی اپنے اشعار میں ترنم کی صورت پیدا کر دیتے ہیں۔

جہاد کی پکار ہیں حیا کا شاہکار ہیں
بلا کی شہسوار ہیں بلوط ہیں چنار ہیں
سری نگر کی بیٹیاں

مندرجہ ذیل بند میں اندرونی قوافی نے موسیقی پیدا کی ہے

جمال ہیں جلال ہیں مجاہدوں کی ڈھال ہیں | بڑی ہی باکمال ہیں یہ عید کا ہلال ہیں
سری نگر کی بیٹیاں

۱؎ چہ قلندرانہ گفتم — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۱۵/۱۱۴

غرض آغا صاحب کی شاعری میں موسیقی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ جس سے انہوں نے اپنے کلام کی تاثیر میں اضافہ کیا ہے۔

پسندیدہ الفاظ

آغا صاحب کی شاعری میں بعض الفاظ بہ تکرار استعمال ہوئے ہیں مثلاً مغنیہ شہر۔ منبر و محراب۔ کونپل۔ گل و لالہ۔ چمن۔ گلستان وغیرہ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ آغا صاحب کے پسندیدہ اور محبوب الفاظ ہیں۔ آغا صاحب نے اِس کا جواز یہ بتایا ہے کہ جس طرح سب شاعروں کے پسندیدہ الفاظ ہوتے ہیں۔ اسی طرح مغنیہ شہر اور گل و لالہ وغیرہ اُن کے محبوب الفاظ ہیں[1]۔ لیکن بعض اوقات مغنیہ شہر کے لفظ کے ساتھ موضوع بھی مخصوص ہو گیا ہے۔ جن کی تکرار زیادہ بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ اِس کے علاوہ دوسرے الفاظ کے ساتھ اُن کے موضوع مخصوص نہیں ہونے بلکہ ان الفاظ کی تکرار کے باوجود موضوعات میں تنوع قائم رہتا ہے۔

باغی شاعر

آغا شورش کاشمیری کی شاعری کے جائزے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وُہ ایک باغی شاعر ہیں۔ انکی شاعری سرتاسر بغاوت ہے۔ وُہ ہر اُس نظریے۔ ہر اُس قدر۔ ہر اُس حکومت۔ ہر اُس معاشرہ اور ہر اُس نظام کا باغی ہے۔ جو اُس کے اپنے نظریے پر پورا نہیں اترتا۔ وُہ ہمیں کسی تخیلاتی صبح کے انتظار میں نہیں رکھتا۔ وُہ ہمیں جھوٹی تسلیاں نہیں دیتا۔ وُہ بغاوت کے طوطا مینا نہیں اڑاتا۔ وُہ ہمیں انقلاب اور تغیر کے سہانے خواب بھی نہیں دکھاتا۔ وُہ ہمیں اُس معاشرہ کے حصول کی کوشش کرنے کے لیئے نہیں کہتا جو کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔

---

[1] گفتنی و ناگفتنی شورش کاشمیری دیباچہ ص نمبر ۲۰

شاعروں پر یہ ایک قدیمی اعتراض تھا کہ جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ لیکن شورش کاشمیری ایک
ایسا شاعر ہے کہ جو کچھ کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے۔ وہ کسی بھی مصلحت کے تحت اپنے نظریہ کا ساتھ نہیں
چھوڑتا۔ وہ اُس نظام کی تجدید چاہتا ہے۔ جو ایک عرصہ تک دنیا میں بڑی کامیابی کے ساتھ نافذ رہا۔ وہ
ہوا میں تلواریں نہیں چلاتا بلکہ اپنے نظریہ کیلئے ہر قسم کی قربانی دیتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ اپنے نظریہ
میں اتنا سچا اور پکا انسان تھا کہ حکومتیں اپنے تمام تر ظلم و ستم کے باوجود اُس کو جھکا نہیں سکیں۔ وہ
ہر اُس نئی اور پرانی چیز کا مخالف ہے۔ جو اُس کے اپنے نظریہ کے مطابق نہیں۔ وہ اپنے مقصد اور
نظریہ کو چھپاتا نہیں وہ بھیس بدل کر اور روپ دھار کر اپنا مطلب نہیں نکالتا بلکہ یہ اعلان کرتا
ہے کہ اسلامی نظام دنیا کا اکمل ترین نظام ہے۔ اور وہ یہ کہتا ہے کہ یہ مُلک اسلام کے نام پر
حاصل کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس میں اسلام کا نظام رائج ہونا چاہیے۔ وہ مصلحت کوش نہیں۔ وہ وقت
کے سازگار ہونے کا انتظار نہیں کرتا۔ وہ کسی ادبی یا سیاسی کمک کے بل پر معاشرہ یا نظام
پر طنز نہیں کرتا بلکہ اُس کی بغاوت بجلی کی طرح کوندتی اور بادل کی طرح گرجتی ہوئی چشمِ زدن میں وہ
راستہ دکھا جاتی ہے۔ جسے گم کر کے لوگ بے عمل ہو گئے ہیں۔ شورش کی اس اضطراری کیفیت
میں جو قلندرانہ قوت اور طاقت ہے وہی طاقت اُس کا نظریہ اور عقیدہ ہے۔ اردو شاعری میں
اتنا بڑا باغی شاعر دوسرا کوئی نہیں۔ جس نے ایک نہیں بہت سی حکومتوں کو تحریکوں کے ذریعہ الٹ دیا
ہو۔ پاکستان میں حکومتوں کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں شورش کاشمیری کا نام ہمیشہ شامل رہا ہے۔
اور انگریزی عہد میں اُن کی جدوجہد تو ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ نقادوں نے انقلاب اور بغاوت کے لفظ
کو ہمیشہ مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جس میں قافیہ ردیف کی بغاوت بھی ہے اور نئے موضوعات
کا انقلاب بھی مگر یہ بغاوت اور انقلاب برپا کرنے والے محض لفظی باغی ہیں۔ عملی باغی شاعر تو پاکستان
کی ادبی تاریخ میں صرف دو چار ہی ہیں۔ جن میں شورش کاشمیری کا نام سرِفہرست ہے۔ جو اپنی شاعری میں
جو کچھ کہتا ہے اُس پر خود عمل کرتا تھا اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتا تھا۔

باب ۵

نثر نگاری

شورش بحیثیت نثر نگار

آغا شورش کاشمیری کے نثری سرمائے میں زیادہ تر سوانح عمریاں خود نوشت سوانح۔ خاکے۔ چہرے۔ روزنامچے سفرنامے اور خطوط شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اُن کی نثر میں تاریخ نویسی۔ محاسبۂ قادیانیت۔ عقیدۂ ختم نبوت کی پاسداری اور افکارِ اقبال کی تشہیر و توضیح بھی ملتی ہے۔ شورش کاشمیری کی وہ نثر جو انہوں نے اخباری اغراض و مقاصد کیلئے لکھی کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے۔ روزمرہ کے سیاسی۔ سماجی۔ تہذیبی۔ مذہبی۔ ادبی اور دیگر ہر قسم کے موضوعات پر ہفت روزہ چٹان میں جو کچھ لکھا گیا اُسے صحافتی نثر کے زمرے میں ہی شمار کرنا چاہئے۔ جس پر تبصرہ آغا صاحب کی صحافت کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ یہاں ہم آغا صاحب کی خالص ادبی نثر نگاری پر ہی بحث کریں گے۔ اور اُسی نثر کو زیرِ بحث لائیں گے۔ جو کتابی صورت میں موجود ہے۔ اس میں آپ بیتیاں۔ سوانح عمریاں۔ سفرنامے۔ خطوط۔ تاریخ۔ خاکے۔ چہرے اور روزنامچے وغیرہ ہیں اگر فنی طور پر دیکھا جائے تو ان موضوعات کو ہم سوانح نگاری کے ضمن میں شامل کر سکتے ہیں۔ آپ بیتی اور سوانح نگاری میں اگرچہ فرق ہے تاہم یہ دونوں اصناف بہنیں ہیں[1]۔ اسی طرح خاکہ نویسی اور چہرہ نگاری بھی سوانح نگاری ہی کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ سفرنامے اور خطوط بھی آپ بیتی کے ضمن میں آتے ہیں کیونکہ سفرناموں میں

> دوسروں کے خیالات بھی ہوتے اور اپنے تجربات بھی ان میں مشہور مقامات اور مشہور شخصیات کی تصویر کشی بھی ہوتی ہے۔ اِس طرح جگ بیتی اور آپ بیتی کا سنگم اگر ملتا ہے تو سفرناموں میں[2]

مکتوبات کے ذریعہ سوانح نگاری کے متعلق یوسف جمال انصاری صاحب نے لکھا ہے کہ

> یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ خطوط خود نوشت سرگزشت ہوتے ہیں[3]۔

اِس طرح ہم آغا صاحب کے سفرناموں اور خطوط کو بھی آپ بیتی کا حصہ بنا سکتے ہیں۔ خاکہ نویسی چہرہ نگاری اور مشاہیر کی

۱۔ بحوالہ نقوش آپ بیتی نمبر مضمون آپ بیتی کیا ہے ریحانہ خانم ص نمبر ۸۷

۲۔ نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء مضمون آپ بیتی اور اسکی مختلف صورتیں یوسف جمال انصاری ص نمبر ۷۷

۳۔ ایضاً ص نمبر ۷۷

سوانح عمریاں سب کچھ سوانح نگاری کے ذیل میں آجاتا ہے۔

آغا صاحب کی نثر کا دوسرا بڑا موضوع تاریخ نویسی ہے۔جس کا تعلق سوانح نگاری کے ساتھ بڑا گہرا ہے۔ ہم اسے بھی سوانح نگاری کے ساتھ ہی زیر بحث لاسکتے ہیں۔عقیدۂ ختم نبوت کی پاسداری اور افکار اقبال کی تبلیغ بھی آغا صاحب کے خاص موضوعات ہیں۔ اِس کے علاوہ کچھ متفرق موضوعات ہیں۔جن کا جائزہ اس کے بعد لیا جائے گا۔آپ بیتی اور سوانح نگاری آغا صاحب کی نثر کا خاص موضوع ہے۔ کتابی صورت میں آغا صاحب کی خود نوشت سوانح مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل

۲۔ پسِ دیوارِ زنداں

۳۔ موت سے واپسی

۴۔ تمغۂ خدمت

۵۔ شب جائے کہ من بودم (سفرنامہ)

۶۔ یورپ میں چار ہفتے (〃)

۷۔ شورش بنام عبداللہ ملک (خطوط)

سوانح نگاری کے سلسلے کی کتابیں مندرجہ ذیل ہیں جن میں خاکے اور چہرے بھی شامل ہیں۔

۱۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری (سوانح عمری)

۲۔ مولانا ظفر علی خاں (〃)

اِس کتاب کے ساتھ "قیدِ فرنگ" کو بھی شامل کر لینا چاہیے کیونکہ یہ مولانا ظفر علی خان کی سوانح عمری ہی کا حصہ ہے

۳۔ ابوالکلام آزاد (غیر مطبوعہ سوانح عمری)

خاکے اور چہرے

۱۔ حسین شہید سہروردی

۲۔ حمید نظامی

۳- میاں افتخار الدین

۴- نور تقی

۵- چہرے

تاریخ نویسی

۱- دہلی چلو

۲- تحریک ختم نبوت

۳- اُس بازار میں

آغا صاحب کی نثر کا جائزہ لینے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سوانح عمری اور خود نوشت سوانح عمری کے فن پر ایک نظر ڈالی جائے تاکہ آغا صاحب کی نثر کو پوری طرح سمجھا جا سکے۔

آپ بیتی کا فن

جہاں تک آپ بیتی کا فن ہے۔ یہ ایک مشکل فن ہے ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"آپ بیتی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔[1]"

اُس کی وجہ سید صاحب نے یہ بتائی ہے کہ آپ بیتی میں صرف اپنی ذات کے تجربات ہی مندرج نہیں ہوتے بلکہ اس کے پس منظر میں خاندان کے کئی صدیوں کے تجربات بھی کارفرما ہوتے ہیں[2]۔ اِس ایک خاص بات کے علاوہ بھی آپ بیتی لکھنا ممکن نہیں۔ کسی سے بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے مکمل حالات زندگی قلمبند کر سکتا ہے کیونکہ بچپن کے حالات بیان کرتا جبکہ خود نوشت سوانح نگار کو خود کا شعور بھی نہ تھا۔[3]

---

[1] نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء مضمون آپ بیتی ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۶۱

[2] بحوالہ نقوش " " "

[3] نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء مضمون ریحانہ خانم ص نمبر ۸۷/۸۸

ممکن نہیں، اس کے باوجود جو خود نوشت سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں اُن میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ لکھنے والا اپنی زندگی کے خاص خاص واقعات کا انتخاب کرتا ہے اور انہی واقعات کے ذریعہ اپنی تمام زندگی کی روداد لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم آپ بیتی میں مشکل ترین مقام دراصل

"دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت ہے[1]"

کوئی بھی آپ بیتی لکھنے والا اپنے آپ سے محبت ہونے کی بنا پر اپنے عیب بیان نہیں کرتا اور دوسروں کا خوف بھی اس امر میں مانع ہوتا ہے۔ آپ بیتی لکھتے وقت جب مصنف کے پیش نظر یہ بات بھی رہے کہ لوگ میرے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا رائے قائم کریں گے؟ تو وہ ہر اس بات پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ جو اُس کے مقام و مرتبہ کے خلاف ہو۔ اور پھر کوئی بھی شخص دوسروں کی نظر میں بُرا بننا نہیں چاہتا یہ ایک فطری بات ہے کہ ہر انسان خود پسند ہوتا ہے وہ اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ خواہ اس کی ذات میں محبت کی جانے والی کوئی صفت بھی موجود نہ ہو۔ لہٰذا ہر انسان خود ستائی سے کام لیتا ہے۔ جس کی بنا پر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے بالکل درست لکھا ہے کہ

"آپ بیتی میں اگر گویم زباں سوزد کی عقوبت ہر ہر گام پر زنجیر پا بن جاتی ہے۔ سچ کہنا یوں بھی مشکل ہے۔ مگر اپنے متعلق سچ کہنا دعوٰی ہی دعوٰی ہے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ حالات کی خارجی روداد اپنے متعلق اور چشم دید تفصیل دوسروں کے متعلق بیان ہو سکتی ہے[2]"

گویا خود نوشت سوانح عمری میں اپنے متعلق کہی گئی باتوں میں اخفا اور مبالغے کا امکان ہے لیکن اپنے متعلق حالات کی خارجی روداد اور چشم دید واقعات کی تفصیل درست ہو سکتی ہے۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ کوئی آپ بیتی لکھنے والا اپنی ساری خامیاں بیان کر دے گا۔ یہ ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں جو کوششیں ہوئی ہیں اُن کا مقصد بھی درحقیقت اشتہار بازی اور شہرت کا حصول تھا[3]۔ لہٰذا آپ بیتی کے سلسلے میں یہ دعوٰی بالکل نہیں کیا جا سکتا۔ کہ جو کچھ لکھا جائے گا وہ شخصیت اور کردار کی ہو بہو نقل ہو گا۔ تاہم اس

---

[1] نقوش آپ بیتی نمبر جون سنہ ۱۹۶۴ء ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۱

[2] نقوش " " " ص نمبر ۱۱

[3] روسو کے اعترافات کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہی خیال ہے ص نمبر ۱۱ نقوش آپ بیتی نمبر

حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آپ بیتی لکھنے والے اپنے تذکروں - اپنے کارناموں - واقعات - اپنے ماحول اور اپنے زمانے کی عکاسی مستند انداز میں کر چکے ہیں - جو ادب اور تاریخ کیلئے بیش بہا ماخذ ثابت ہوتے ہیں - مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مضمون "آپ بیتیوں کی اہمیت" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تاریخوں اور انفرادی سرگزشتوں میں افراد کے بیانات اور اقوال ہی مستند تسلیم کئے جاتے ہیں۱؎ - مولانا کے نزدیک خود بھی استدلال صحیح اور فکر سلیم۲؎ سے کام لے کر جھوٹ اور سچ کو الگ الگ کر سکتے ہیں - اس بنا پر مولانا نے اس بات کی حمایت کی ہے کہ خود نوشت سب کا سب جھوٹا نہیں ہوتا لہٰذا اسے قابل اعتنا سمجھا جانا چاہئے۳؎ - اور پھر یہ بھی تو ممکن نہیں کہ ہر آپ بیتی لکھنے والا جھوٹ ہی لکھے - مولانا کے نزدیک جو لوگ قلندرانہ۴؎ شان کے مالک ہوتے ہیں وہ ہر بات بے تکلف لکھ جاتے ہیں - اور ہمیں بہت سی مفید باتیں ہر ایک آپ بیتی میں مل جاتی ہیں - لہٰذا آپ بیتی خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو مگر کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور دیتی ہے - بلکہ جو باتیں ہمیں تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتیں وہ ہم آپ بیتیوں میں پڑھ سکتے ہیں ایک فرد اپنی ذات کے حوالے سے جو کچھ لکھتا ہے اس سے قطع نظر وہ جس زمانے میں تجربات حاصل کرتا ہے - جن واقعات سے عبرت سیکھتا ہے اور جن جزئیات کا ذکر وہ لاشعوری طور پر کر جاتا ہے وہ بہر حال قابل قدر ہوتے ہیں - اس سلسلے میں جناب علم الدین سالک صاحب نے درست لکھا ہے کہ

> "ہر دور اپنی مخصوص تہذیب رکھتا ہے اس کے بنیادی خدوخال تو صدیوں کے بعد تبدیل ہوتے ہیں مگر فروعی چیزیں ہر دور اور ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہیں - ان کی نشاندہی عام تاریخی کتابیں نہیں کر سکتیں ہمیں ان کے لئے آپ بیتیوں کی طرف رجوع کرنا پڑے گا - کیونکہ ان کی مدد سے ہم ایک قوم ایک ملت ایک ملک کی تہذیب کی ابتدا اور عہد بہ عہد ترقیوں کا اندازہ لگا سکتے ہیں - جو تاریخ کے طالب علم کیلئے بڑی ضروری اور بڑی اہم ہے۵؎"

اردو ادب میں آپ بیتیوں کی کمی نہیں لیکن ایک معیاری آپ بیتی کیلئے ضروری ہے کہ

۱-۴؎ نقوش آپ بیتی نمبر جون ۱۹۶۴ء مضمون مولانا غلام رسول مہر ص نمبر ۲۶/۲۶/۲۷/۲۸

۵؎ نقوش آپ بیتی نمبر مضمون علم الدین سالک ص نمبر ۱۱

"وہ حکمت و فلسفہ اور پند و موعظت کے مناظرہ اور ادب و انشا کے تکلفات سے زیادہ گراں بار نہ ہو۔ اس میں سادگی اور بے ساختگی، جذبات و احساسات کی ترجمانی واقعات و مناظر کی سادہ تصویر کشی غلطیوں اور کوتاہیوں کا کہیں اظہار یا کہیں اقرار، آورد سے زیادہ آمد اور ہدایت سے زیادہ حکایت ہو۔ اس کو لکھنے والے نے اپنی یا دوسروں کی بھاری بھرکم تصنیفات میں اضافہ کرنے کیلئے نہ لکھا ہو۔ بلکہ بھولی بھٹکی یادیں تازہ کرنے۔ مٹے ہوئے نقوش اجاگر کرنے۔ خود اپنی مسرت، حسرت۔ عبرت اور اپنے عزیزوں۔ افرادِ خاندان اور نیازمندوں کو اپنے سے واقف کرنے اور اپنی زندگی کی داستان سنانے کیلئے لکھا ہو۔"[1]

غرض آپ بیتی لکھنا اگرچہ ایک مشکل فن ہے لیکن اِس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اُردو ادب میں بہت سی آپ بیتیاں لکھی گئی ہیں۔ مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "کالا پانی" اردو ادب کی پہلی خودنوشت سوانح عمری ہے۔ مگر یہ مکمل حالات زندگی نہیں بلکہ جزوی خودنوشت سوانح ہیں[2]۔ یہی حال "داستانِ غدر" ظہیر دہلوی۔ "میرا افسانہ" چوہدری افضل حق۔ خواجہ حسن نظامی کی آپ بیتی اور محمد امین زبیری کی خودنوشت کا ہے[3]۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سید ہمایوں مرزا کی کتاب "میری کہانی میری زبانی"۔ رضا علی خاں کی کتاب "اعمال نامہ"، دیوان سنگھ مفتون کی کتاب "ناقابلِ فراموش"، عبدالمجید سالک کی "سرگزشت" نفی محمد خاں کی "عمر رفتہ" اور مولانا حسین احمد مدنی کی کتاب "نقشِ حیات"، کو کسی حد تک آپ بیتی کے اوصاف پورا کرنے والی کتابیں کہا ہے[4]۔

سوانح نگاری

سوانح نگاری سے مراد کسی دوسرے شخص کی زندگی کے حالات لکھنا ہے فن سوانح نگاری کے تحت

"سوانح حیات افراد کی زندگی کی تاریخ ہے اور ممتاز ہستیوں کی زندگی کے واقعات پیش

۱۔ آپ بیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی پیش لفظ سید ابوالحسن علی ندوی ص نمبر ۶

۲۔ نقوش آپ بیتی نمبر مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۶۵

۳،۴۔ نقوش آپ بیتی نمبر ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۶۶

سکے جاتے ہیں[1]۔

لیکن تاریخ نگاری اور سوانح نگاری میں فرق ہے۔ تاریخ کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے جبکہ سوانح نگاری کی اساس جذبات واحساسات پر ہوتی ہے[2]۔ سوانح نگاری تاریخ کے ساتھ مماثلت رکھتی ہے تو کچھ فرق بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن اسے تاریخ سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے سوانح نگاری کے فن کی وضاحت اس طرح کی ہے

"۱۔ شخصیت کا انتخاب

۲۔ شخصیت کا ارتقا

۳۔ واقعات کا انتخاب

۴۔ ترتیب

۵۔ نتائج

۶۔ منصفانہ

۷۔ شخصی

۸۔ اسٹائل[3]۔"

مندرجہ بالا اشاروں کو اگر ترتیب دیا جائے تو اس بات کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ سوانح نگار پہلے ایک شخصیت کا انتخاب کرتا ہے۔ اس کے بعد اُس کی شخصیت کو اوّل سے آخر تک بتدریج نمایاں کرتا جاتا ہے اور اس شخصیت کی زندگی کے بھی واقعات کا انتخاب کرتا ہے جو شخصیت کی زندگی کو سمجھنے اور نکھارنے میں معاون ہو سکتے ہوں پھر ان واقعات کو ایک خاص سلیقے سے ترتیب دیتا ہے۔ اور ایک خاص اسلوب میں بیان کرتا ہے۔ اور نتائج مرتب کرنے اور شخصیت کے تجزیہ میں اُس

---

[1] ادبی اشارے — ڈاکٹر سلام سندیلوی — ص نمبر ۱۴۵ — نسیم بک ڈپو لکھنؤ — سنہ ۱۹۶۱ء

[2] بحوالہ ادبی اشارے — " — ص نمبر ۱۴۵ — " — "

[3] نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء — مضمون سوانح نگاری کیا ہے؟ ڈاکٹر عبدالقیوم — ص نمبر ۱۹۵

کا طرزِ عمل منعکس ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل بھی ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے اپنے مضمون میں دی ہے۔ جس سے سوانح نگاری کے اصولوں پر روشنی پڑتی ہے۔ سوانح نگاری کا فن چونکہ مغرب سے آیا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں اہلِ مغرب ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ ذیل میں ان سائیکلو پیڈیا برٹانیکا کی انگریزی میں فراہم کردہ معلومات کا خلاصہ اُردو میں پیش کرتے ہیں۔ جس سے سوانح نگاری کے جدید اصولوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان معلومات کے مطابق سوانح نگاری ادب کی قدیم ترین صنف ہے جو کسی انسان یا مصنف یا کسی دوسرے شخص کی زندگی کو الفاظ میں تخلیقِ نو کرتی ہے۔ اور اس عمل میں تحریر۔ زبانی اور تصویری تمام ذرائع کو استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کے مختلف پہلو مندرجہ ذیل ہیں۔

تاریخی پہلو

سوانح نگاری کو بعض اوقات تاریخ کی ایک شاخ سمجھا جاتا ہے۔ ابتدائی سوانح نگاری کی تحریروں کو اکثر تاریخی مواد قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً سر ونسٹن چرچل نے جان چرچل کی شاندار سوانح لکھی جو کہ دراصل انگلستان اور یورپ کی تاریخ ہے۔ تاہم آج کل عام طور پر اس بات کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ تاریخ اور سوانح نگاری ادب کی جدا صورتیں ہیں۔ تاریخ عام طور پر ایک وقت، ایک عرصہ لوگوں کے ایک گروہ اور ایک ادارہ کی تعمیم کرتی ہے۔ جب کہ سوانح نگاری اپنی توجہ ایک انسان پر مرتکز کرتی اور اس کی زندگی کے حالات سے واسطہ رکھتی ہے۔ ایک سوانح نگار جو ایک ایسے شخص کی سوانح عمری لکھتا ہے جو کافی عرصہ پہلے مرچکا ہے تو اس کو کئی ایک رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثال کے طور پر تحریری شہادت جو کبھی کبھار میسر ہوتی ہے۔ جس کی صحت کو جانچنا دشوار ہوتا ہے یا گواہوں پر جرح نہیں کی جا سکتی۔ اب تک کوئی ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا جس سے ان مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ تاہم ہر زندگی میں سوانح نگار کو کچھ مواقع اور کچھ مخصوص مشکلات پیش آتی ہیں۔ اب یہ سوانح نگار پر منحصر ہے کہ وہ وقت کے خلاؤں کو جنکے متعلق معلومات میسر نہیں کس طرح پُر کرتا ہے اور اس کاوش کی بنا پر اس کے کام کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ وہ یہ خلا اُن معلومات کو صحیح طور پر اکٹھا کر کے پُر کر سکتا ہے۔ جو کہ اس دور سے متعلق ہوں۔

نفسیاتی پہلو

ایک فرد واحد سے متعلق حقائق کو تاریخ وار ترتیب دینے سے اس کی زندگی پر روشنی نہیں ڈالی جا سکتی یہ عمل

صرف سانحات کے خدوخال واضح کرے گا۔ سوانح نگار کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے مواد سے اُس شخص کی شخصیت واضح کرے۔ جس کی سوانح عمری لکھی جا رہی ہے۔ اور وہ ان محرکات کو بیان کرے جن کی بنا پر اُس شخص سے مختلف اعمال اور کاروائیاں سرزد ہوئیں۔ جو سوانح نگار اُس شخص کو جس کی سوانح عمری لکھی جا رہی ہے۔ ذاتی طور پر جانتا ہے تو اُسے دوسروں کے مقابلے میں برتری حاصل ہوگی وہ اُس گفتگو سے استفادہ کر سکتا ہے جو دونوں کے درمیان ہوئی ہو لیکن اس سلسلے میں یہ نقص ہے کہ سوانح نگار اپنی ذاتی وابستگی کی بنا پر متعصب ہو سکتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ یک طرفہ سوانح عمری لکھ دے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی سوانح نگار اُس شخص کو ذاتی طور پر نہ جانتا ہو جس کی سوانح وہ لکھ رہا ہے تو ایسی صورت میں اُس کی تحریر میں زیادہ معروضیت ہو سکتی ہے کیونکہ وہ صرف تحریری مواد پر انحصار کرتا ہے۔ لہٰذا اُس کے کام میں ذاتی تعلق نہ ہونے کی وجہ سے ذاتی بصیرت نہیں ہوگی۔

اخلاقی پہلو

ابھی تک سوانح نگاری میں اخلاقی معیار مقرر نہیں ہوا کہ کس حد تک ایک شخص کی زندگی کے واقعات دکھانے اور چھپانے چاہئیں۔ عصرِ حاضر کے سوانح نگاروں کی یہ بڑی مشکل ہے کہ وہ حقیقتیں جو انہوں نے تلاش کی ہیں۔ کہاں تک بیان ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ حقیقت نگاری کے ساتھ انہیں کچھ لوگوں کے احساسات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔

جمالیاتی پہلو

سوانح نگاری تاریخ کی طرح حقائق اکٹھے کرتی ہے اور سچائی کی ذمہ داری لیتی ہے۔ لیکن سوانح نگاری اُس وقت آرٹ اور ادب کا درجہ اختیار کرتی ہے۔ جب وہ حقائق میں سے کچھ حقائق کو اس طرح سے منتخب کرے کہ ان سے اُس آدمی کی زندگی جس کی کہ سوانح عمری لکھی جا رہی ہے۔ ایسے ابھر کر سامنے آجائے جیسے کہ وہ واقعی یہ زندگی گزار رہا ہے۔ سوانح نگار اعداد و شمار کی موجودگی اور قیود کے پیشِ نظر سادہ معلومات سے چراغ روشن کرتا ہے۔ اگر وہ مواد کو ایجاد کرتا ہے یا مواد کو دبا دیتا ہے تو وہ حقیقت کو دھوکہ دیتا ہے اور اگر صرف حقائق کو شمار کرتا ہے تو وہ آرٹ یا ادب سے بے وفائی کرتا ہے[1]۔

ڈاکٹر سید عبداللہ نے ان چاروں پہلوؤں کو اس طرح بیان کیا ہے کہ

۱؎ بحوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا نمبر ۱۰

"سوانح عمری کے چار اصول ٹھہرائے گئے ہیں

۱۔ صداقت غیر جانبداری اور ہو بہو تصویر ہونا

۲۔ جزوئیات میں داخلی اور باطنی تصویر ہونا

۳۔ کتاب کا ادبی ہونا

۴۔ جامعیت ہونا"[۱]

اسی طرح ڈاکٹر سلام سندیلوی صاحب نے بھی ان ہی چار باتوں کو سوانح عمری کا لازمی جزو بنایا ہے وہ کہتے ہیں کہ

"سوانح حیات کو ہم چار نقطہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اول تو سوانح حیات کی ایک تاریخی حیثیت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے سوانح حیات میں سچے واقعات کا ذکر ہونا چاہیئے۔ دوسرے سوانح حیات کو انفرادی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے ہیرو کو اپنے ہمعصروں سے ممتاز اور نمایاں ہونا چاہیئے تاکہ دوسروں کے سامنے وہ مثال بن سکے اس کے علاوہ سوانح حیات کو ہم ادبی نقطہ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس صورت میں سوانح حیات میں وہ تمام خوبیاں ہونا چاہئیں۔ جن سے کسی زبان کا ادب ایک اعلیٰ اور بلند مقام حاصل کرتا ہے۔ آخر میں سوانح نگاری کو ہم سائنسی نقطہ نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مصنف کے بیان میں سائنسی حیثیت اور قطعیت ہونا چاہیئے۔"[۲]

سوانح نگاری میں جہاں تک صداقت اور سچائی کا تعلق ہے۔ اس سے انحراف ممکن نہیں سوانح نگاری کو اگر تاریخ کے ساتھ ملایا جاتا ہے تو اس کی وجہ بھی صرف یہ ہے کہ سوانح نگار بھی ایک مورخ کی طرح حالات و واقعات کو بیان کرنا اور کسی شخص کی زندگی کے حقائق کا ہو بہو تصویر کشی کرنا ہے۔ اس سلسلے میں سید ابوالحسن علی ندوی "سیرت سید احمد شہید" کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں کہ

مصنف نے اس کی کوشش کی ہے کہ صاحب سیرت اپنی اصلی صورت میں نظر آئے۔ اس نے

۱۔ طیف نثر ڈاکٹر سید عبداللہ مرتبہ ممتاز منگلوری ص نمبر ۱۷۲

۲۔ ادبی اشارے۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نسیم بکڈپو لکھنؤ ص نمبر ۱۴۶

نہ مشرقی سوانح نگاروں کی طرح رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے نہ مغربی مورخین کی تقلید میں خواہ مخواہ کتاب کو بے روح اور بے اثر بنانے کی کوشش کی ہے ۔ نہ زمانے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے نہ کسی خواہش اور تخیل کے ماتحت تاریخ سازی کا ارادہ کیا ہے بلکہ روایات و واقعات کی زبان میں کم از کم تغیر کیا گیا ہے ۔ اگر یہ طرز ہر ذوق و ہر خواہش کو مطمئن نہ کر سکے تو مصنف معذرت خواہ ہے کہ وہ صرف تاریخ نگار ہے تاریخ ساز نہیں ہے [1]

تاریخ نویسی میں جس طرح واقعات کی صحت کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ ایک سوانح نگار کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اُس شخصیت کی زندگی کو جس کی سوانح لکھی جارہی ہے اُسی طرح پیش کرے جیسے کہ اُس نے زندگی گزاری ہے ۔ سر سید احمد خان نے "المامون" کے دیباچہ میں اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے ۔

ہمارے لائق مصنف نے اِس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اِس کو ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے اور تاریخانہ اصلیت بھی بدستور اپنی اصلی صورت پر موجود ہے ۔ جو خوبصورت ہے خوبصورت ہے جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے نہ خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے اور نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا اور درحقیقت یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے [2]

سر سید احمد خاں کی اِس رائے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سوانح نگاری اگرچہ تاریخ نویسی ہے ۔ لیکن عبارت کا فصیح اور دلچسپ ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ یہی درحقیقت سوانح عمری کا ادبی پہلو ہوتا ہے ۔ جس کے بغیر کوئی بھی سوانح فن کا درجہ اختیار نہیں کر سکتی بلکہ وہ سپاٹ واقعات اور اعداد و شمار کا گورکھ دھندا بن کر رہ جائے گی ۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ واقعات کو دلچسپ بنانے کیلئے حقیقت کو چھپایا جائے بلکہ اس سلسلے میں قطعی جانبداری اور منصفانہ طرزِ عمل کی ضرورت ہے ۔ البتہ عبارت کی خوبصورتی سوانح نگار کی فنکارانہ عظمت کی دلیل ہے کہ وہ حالات و واقعات کے حقیقی مرقع کس طرح تخلیق کرتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی مصنف کسی فرد کی سوانح

---

[1] سیرت سید احمد شہیدؒ   سید ابوالحسن علی ندوی حصہ اوّل دیباچہ طبع سوم ص نمبر ب یونائیٹڈ پریس لکھنؤ

[2] المامون.   علامہ شبلی   دیباچہ سید احمد خاں   ص نمبر ے

قلمبند کرتا ہے تو اُسے صرف اُس کی خوبیوں کی مرقع کاری سے واسطہ نہیں ہوگا۔ بلکہ اُس فرد کی خامیاں بھی تصویر کشی کا مطالبہ کریں گی۔ جو مصنف اِس منزل سے کامیاب گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ یقیناً غیر جانبدار۔ حقیقت پسند اور منصفانہ طرزِ عمل کا مالک ہوگا۔ جسے صحیح معنوں میں سوانح نگار کہا جائے گا۔ رام نرائن گپتا نے پرکاش دیو کی لکھی ہوئی مہاراجہ اشوک کی سوانح عمری کے دیباچہ میں سوانح عمری کے متعلق لکھا ہے کہ

"یہ انسان کو انسانی فطرت کی تعلیم دیتی ہے"[۱]

گویا سوانح عمری کا مقصد انسانوں کو انسانی فطرت سے آگاہ کرنا ہے۔ سوانح عمریاں اسی لئے بڑے اور عظیم لوگوں کی لکھی جاتی ہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں انسانیت کی صفات کے زیادہ پاسدار ہوتے ہیں۔ سوانح نگار پر بھی یہ پابندی اسی لئے لگائی جاتی ہے کہ وہ صاحب تذکرہ کی زندگی کے نفسیاتی محرکات کو ضبطِ تحریر میں لائے تاکہ انسانی فطرت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ انسانی فطرت کا ظاہری اور باطنی تضاد ایک بڑا ہی مشکل مرحلہ ہے۔ جس کو سمجھنے اور سمجھانے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اور سوانح نگار کی فن کارانہ صلاحیتوں کی کسوٹی بھی یہی ہے۔ جو مصنف ژرف نگاہی۔ فکر و استدلال اور روایت و درایت کی مشکلات پر قابو پالے اُس کے کامیاب سوانح نگار ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔

سوانح نگاری کا مقصد

"مولانا حالی نے سوانح نگاری کا مقصد ملک و قوم کی ترقی قرار دیا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں

خصوصاً جو قومیں علمی ترقیات کے بعد پستی اور تنزل کے درجے کو پہنچ جاتی ہیں۔ اُن کے لئے بیوگریفی ایک تازیانہ ہے جو اُن کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اکابر و اسلاف کی زندگی کے حالات اور اُن کے کمالات دریافت کرتے ہیں تو اُن کی غیرت کی رگ حرکت میں آتی ہے اور اپنی کھوئی ہوئی عزت اور برتری کے دوبارہ حاصل کرنے کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ انگلستان کے ایک مشہور مصنف کا قول ہے کہ "بیوگریفی چلا چلا کر سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو۔"[۲]

---

[۱] سوانح عمری مہاراجہ اشوک از پرکاش دیو دیباچہ رام نرائن گپتا ص نمبر ۱ جارج سٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۱۷ء

[۲] حیاتِ سعدی مولانا الطاف حسین حالی دیباچہ ص نمبر ل/۵ مجلس ترقی ادب لاہور

مولانا حالی کے اِس بیان سے جہاں ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ سوانح نگاری کا مدعا و مقصد کیا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ سوانح عمری کس قسم کے لوگوں کی لکھی جانی چاہیئے۔ یعنی سوانح عمری ایسے لوگوں کی لکھی جانی چاہیئے جنہوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کئے اور نیکیاں پھیلائی ہوں اور اُن کارناموں اور نیکیوں میں دوسروں کیلئے حرکت و عمل کی دعوت بھی موجود ہو تاکہ اگر دوسرے بھی وہ کام کریں تو عظمت و عزت کے مستحق قرار پائیں۔ خود مولانا حالی نے جو سوانح عمریاں لکھی ہیں اُن میں یہ مقصد پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔ مولانا حالی نے وقت کی نزاکت کے پیشِ نظر مسلمانوں کو اپنی کھوئی ہوئی عزت اور عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی دعوت اسلاف کے تابندہ کارناموں اور خوبیوں کے ذریعے دی تاکہ قوم میں حرکت و زندگی پیدا کی جا سکے۔ لیکن مولانا حالی کی یہ بات ہندوستان کے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے پس منظر کے بغیر بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اقوام خواہ ترقی یافتہ ہوں یا زوال آمادہ اُن کے لئے اپنے اسلاف کے کارناموں میں بڑی کشش ہوتی ہے۔ افراد قوم میں بڑے اور اچھے کام کرنے کی تحریک اسلاف کے کارناموں سے بھی پیدا ہوتی ہے۔

سوانح نگاری کے امکانات

شیخ اکرام صاحب نے لکھا ہے کہ

"آج بھی سیرت[1] نگاری کیلئے ملک کی فضا ناسازگار ہے۔ قومی خیالات کی باگ ان لوگوں کے جانشینوں اور ہواخواہوں کے ہاتھ میں ہے۔ جو تمام عمر مذہب مذہب پکارتے رہے۔ (اور فی الواقع انہیں مذہب سے شدید جذباتی محبت تھی) لیکن مذہب کی اصل روحانی خوبیوں یعنی باطنی پاکیزگی۔ تقویٰ اور اخلاقی ڈسپلن سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔ ان لوگوں کے مزاج اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اُن کے ممدوحوں کی زندگیاں قریب سے دیکھی جائیں اور ان کا نقشہ واقعات کے مطابق کھینچا جائے[2]"۔

---

[1] شیخ اکرام صاحب نے سوانح نگاری کی بجائے سیرت نگاری کا لفظ استعمال کیا ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ "آج کل سیرت عام سوانح عمری کے مترادف اصطلاح بن گئی ہے یہ در اصل دینی احساسات کے انحطاط کی وجہ سے ہے سیرت کا اطلاق اصولاً "سیرتِ رسول" پر ہوتا ہے۔" (سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقا ڈاکٹر سید عبداللہ۔ حاشیہ ص نمبر ۸۵)

[2] شبلی نامہ۔ شیخ اکرام ص نمبر ۹ مکتبہ اردو۔ لاہور

جناب شیخ اکرام صاحب کا مندرجہ بالا بیان مبہم اور الجھا ہوا سا ہے۔ جس میں انہوں نے مندرجہ ذیل باتوں کو جدید سوانح نگاری کے راستہ میں بڑی رکاوٹیں خیال کیا ہے۔

۱۔ قومی خیالات

۲۔ جس کی باگ ان لوگوں کے جانشینوں اور بہی خواہوں کے ہاتھ میں ہے۔

۳۔ جو تمام عمر مذہب مذہب پکارتے رہے۔

۴۔ اور فی الواقع انہیں مذہب سے شدید جذباتی محبت تھی۔

۵۔ لیکن ان لوگوں کو مذہب کی اصل روحانی خوبیوں یعنی باطنی پاکیزگی اور اخلاقی ڈسپلن سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا۔

۶۔ اب ان لوگوں کے مداح یہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے ممدوحوں کی زندگیاں قریب سے دیکھی اور اُن کا نقشہ واقعات کے مطابق کھینچا جائے۔

شیخ اکرام صاحب اگر اتنا بتا دیتے کہ "کن لوگوں" کی بات کر رہے ہیں تو معاملہ صاف ہو جاتا اور ہر بات کھل کر سامنے آجاتی مگر انہوں نے شاید اُن لوگوں کے ڈر سے جو اپنے ممدوحوں کی زندگیاں قریب سے دیکھنے کی اجازت نہیں دیتے نام لینے سے گریز کیا ہے۔ لیکن شیخ صاحب کے اشارے سے اتنی بات ضرور سمجھ میں آتی ہے کہ وہ لوگ جو مذہب مذہب پکارتے تھے ابھی زمانے کے عظیم اور بڑے رہنما ہوں گے۔ کیونکہ ان کے پرستار ابھی زندہ ہیں جو سوانح عمری کے فن۔ سچائی اور قومی بہی خواہی کے راستے میں حائل ہیں۔ شیخ اکرم صاحب نے جو پہلی بات کہی ہے وہ "قومی خیالات" سے متعلق ہے۔ جہاں تک "قومی خیالات" کا تعلق ہے۔ یہ کسی بھی قوم کے نہیں ہوتے۔ بلکہ منتخب اور منفرد افراد کا فکر و استدلال عام لوگوں کو پسند آجاتا ہے تو وہی خیالات قومی خیالات سے منسوب کر دیئے جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ سبھی افراد قوم ان خیالات سے اتفاق کریں بلکہ اختلافِ فکر و نظر کا دروازہ پھر بھی کھلا رہتا ہے لہٰذا شیخ صاحب کا یہ فرمانا کہ "قومی خیالات کی باگ کسی کے جانشین یا بہی خواہ کے ہاتھ میں ہوگی درست نہیں۔ اگر شیخ اکرام صاحب صرف سوانح نگاری کے مواد کو "قومی خیالات" قرار دے رہے ہیں۔ تو بھی شیخ صاحب کی یہ بات فنی نقطہ نظر سے غلط قرار پائے گی۔ کیونکہ کسی عظیم آدمی کی سوانح عمری لکھنے کیلئے ضروری ہے کہ لکھنے والا اُس کا جانشین یا بہی خواہ ہو۔ جب تک کوئی مصنف اپنے ہیرو کے ساتھ محبت نہیں رکھتا۔ سوانح عمری نہیں لکھ سکتا اِس کیلئے ضروری ہے کہ اپنے ہیرو سے کوئی نہ کوئی لگاؤ رکھتا ہو۔ گویا سوانح عمری کے فن کی رو سے یہ لوگ معاون ہوتے ہیں۔ رکاوٹ

نہیں بنتے۔ اب رہی تیسری بات اور چوتھی بات کہ جو لوگ "تمام عمر مذہب مذہب پکارتے رہے (اور انہیں مذہب سے فی الواقع شدید جذباتی محبت تھی) تو یہ سیدھی سی بات ہے کہ جب کسی کو مذہب سے شدید جذباتی محبت ہوگی تو وہ مذہب مذہب ہی پکارے گا۔ مغرب۔ مغرب یا عقل۔ عقل نہیں کہہ سکتا کیونکہ جن لوگوں کو مغرب پرستی اور عقل و استدلال سے شدید جذباتی محبت ہوگی وہ مذہب مذہب کی بجائے مغرب مغرب اور عقل عقل کی رٹ لگائیں گے۔

لہٰذا اب کون کہہ سکتا ہے کہ مغرب مغرب اور عقل عقل پکارنے والوں کو مغرب اور عقل سے کوئی فیضان حاصل نہیں ہوا۔ لہٰذا شیخ صاحب کا یہ فرمانا بھی غلط ہے کہ جو لوگ مذہب مذہب پکارتے تھے انہیں اصل روحانی یعنی باطنی پاکیزگی تقویٰ اور اخلاقی ڈسپلن سے کوئی حصہ نہ ملا ہو۔ جب اُن لوگوں کو فی الواقع مذہب سے شدید جذباتی محبت تھی۔ جیسا کہ خود شیخ اکرام صاحب کو اقرار ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں اصل روحانیت سے کوئی حصہ نہ ملا ہو۔ کچھ حصہ تو ضرور ملا ہوگا۔ جسے جناب شیخ اکرام صاحب نے نظر انداز کر دیا اور لکھ گئے "کہ کوئی حصہ نہیں ملا" جناب شیخ اکرام صاحب نے "اصل روحانی" وضاحت میں "باطنی پاکیزگی" "تقویٰ" اور "اخلاقی ڈسپلن" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ قطع نظر اِس کے کہ کسی کی باطنی زندگی اور تقویٰ کی پیمائش کس پیمانے سے کی جاتی ہے۔ یہ لوگ نیکی اور شرافت کی زد میں ضرور آتے ہونگے کیونکہ وہ لوگ عظیم اور بڑے لوگ تھے۔ جن کے مداحین ابھی تک موجود ہیں۔ باقی رہی اخلاقی ڈسپلن کی بات تو یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی آدمی بغیر اخلاقی ڈسپلن کے قومی رہنما بن جائے۔ بڑے لوگوں اور قومی رہنماؤں کی زندگیاں لوگوں کیلئے نمونہ ہوتی ہیں اور یہ صرف اخلاقی ڈسپلن ہوتا ہے جو لوگوں کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اُن کی عظمت کا اقرار کریں۔ مشرق میں تو یہ بڑا کٹھن مرحلہ ہے۔ کوئی رہنما خواہ کتنا ہی مذہبی۔ سائنسی۔ علمی اور ادبی عظمت رکھنے والا کیوں نہ ہو۔ مقبولیت اور رہنمائی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ وہ صاحب اخلاق نہ ہو۔ لہٰذا وہ لوگ یقیناً اخلاقی ڈسپلن بھی رکھتے ہوں گے جو قوم کے بڑے اور عظیم لوگ تھے۔ آخر میں اس بات کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ جناب شیخ اکرام صاحب کو یہ مشکل اِسی لئے پیش آتی ہے کہ وہ مغربی فن سوانح نگاری کا اطلاق مشرقی سوانح نگاری پر کر رہے ہیں اسی لئے کبھی انہیں ممدوحوں سے شکوہ ہے تو کبھی ہیرو کی شکایت کرتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ مغربی سوانح نگاری کا اخلاقی پہلو ہے اور خود سوانح نگاری کا مسئلہ ہے۔ جس کے اصول ابھی واضح نہیں ہوئے۔ مغربی اصول سوانح نگاری کے مطابق "سوانح نگار کو اور خاص طور پر ایک ہمعصر کے سوانح نگار کو ایک اخلاقی مسئلہ کا سامنا کرنا

پڑھتا ہے اور وہ یہ کہ اُس حقیقت کو جس کی وہ تصدیق کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے کس حد تک شائع کیا جائے[1]۔

گویا یہ خود سوانح نگار کی ذمہ داری ہے کہ وہ کہاں تک حقائق کا ترجمان ہو سکتا ہے۔ شیخ اکرام صاحب نے جن عوامل کو بھی سیرت نگاری کیلئے ملک کی فضا کو ناسازگار بتایا ہے۔ حالات کی وہ ناسازگاری مغرب میں بھی موجود ہے۔ جس کی پیروی شیخ اکرام صاحب کرنا چاہتے ہیں مثلاً انگریزی کی مشہور سوانح عمری Life of The Samuel Johnson کے شائع ہونے پر JAMES BOSWELL پر یہ سنگین الزام لگایا گیا کہ اُس نے اپنے نامور ہیرو کو بدنام کیا ہے[2]۔ اِس کے ڈیڑھ سو سال بعد Lord Moran کی کتاب Winstan Churchiel (The struggle for The Survival) کے شائع ہونے پر اسی انداز کا حملہ کیا گیا۔ بلکہ یہ معاملہ اِس لحاظ سے بڑا ہی پیچیدہ ہو گیا کیونکہ Lord Moran ـ Winstan Churchiel کا ذاتی معالج ہونے کی وجہ سے اُس کا راز دار تھا[3]۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں William Manchester نے Jhon Kennedy پر اپنی کتاب The death of a President شائع ہوئی جس نے عوامی پریس میں تہلکہ مچا دیا مغرب میں اِس مسئلے کو عوام کے حقِ معلومات " Public right to know " کے تحت پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن سوانح نگار کیلئے یہ ایک مسئلہ ہے کہ وہ تاریخی صداقت کو قائم رکھنے کیلئے اپنا فرض کیسے پورا کرتا ہے اور ایسا کرنے میں وہ لوگوں کو کتنا دکھ پہنچاتا ہے[4]۔

ح[1] The biographer, particularly, The biographer of a contemporary, is after confrounted with an ethical problem, how much of The truth as he has been able to ascertain it, should be printed?

(The New Encyclopaedia Britannica page 1007, Vol: 2 15th Edition)

ح[1] بحوالہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا صفحہ نمبر ۱۰۰۷

بہر حال مندرجہ بالا مثالیں مغربی اصول سوانح نگاری سے اخذ کی گئی ہیں۔ مغرب میں بھی باسول مورن اور مانچسٹر کے خلاف آواز بلند کرنے والے موجود ہیں۔ مگر وہاں سوانح نگار کیلئے فضا سازگار ہے۔ لیکن مشرق میں کیوں نہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سوانح نگاری کیلئے ملک کی فضا ناسازگار ہے۔ درست نہیں۔ دراصل شیخ اکرام صاحب چونکہ مغربی فن سوانح نگاری کو شاید کوئی رُوحانی چیز سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان قوانین کی ہو بہو نقل کرنا چاہتے ہیں حالانکہ بقول سید عبداللہؒ

"ناول اور سوانح عمری میں حقیقت نگاری کی تحریک بہت مقبول ہونے کے باوجود اس بڑے نتیجہ سے نہ بچ سکی کہ حقیقت نگار بالآخر انسانیت کے کیڑے نکال کر اپنا دکان چمکانے والا ثابت ہُوا حقیقت نگار مصوروں کا بھی آخر یہی حال ہُوا کہ اچھے بھلے معقول آدمی ہونے کے باوجود گھناؤنے اور فرومایہ (SORDID) موضوعات میں دلچسپی لینے لگے اور اب حقیقت نگاری پستی اور فرومائگی کی ہم معنی اصطلاح معلوم ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اردو میں سچائی کے نام سے بدی کی ترغیب کا کاروبار کچھ زیادہ چمکا نہیں کیونکہ یہاں بدی کو تقاضائے بشریت سمجھنے کے باوجود کوئی ایسی چیز نہیں سمجھا جاتا جس کی تشہیر کی جائے۔"[1]

لہٰذا ضروری نہیں کہ مغربی اصول سوانح نگاری کی تقلید کی جائے۔ اور پھر مشرق کے بھی کچھ اصولِ سوانح نگاری ہیں جو بڑی کامیابی اور خوبصورتی سے استعمال ہوتے رہے ہیں۔ بقول محترمہ الطاف فاطمہ صاحبہ

"ہمارے سوانح نگاروں کے پیشِ نظر سب سے بڑا معیار تو یہی تھا کہ وہ مشرق کی سعادتمندی اور مرنجان مرنج مزاج کے وارث تھے۔ وہ کسی کی پردہ دری سے زیادہ پردہ پوشی کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ اگلوں کی عیب جوئی اور نکتہ چینی غیر مستحسن فعل ہی نہیں بلکہ بد اخلاقی اور بدکرداری کو راہ دیتی ہے۔ ان کے نزدیک کمزوریوں اور لغزشوں کی تشہیر اتنی ضروری نہ تھی کہ جتنا انسانی شرف و کمال کا اظہار ضروری تھا۔ اس نظریے کے باوجود ہمارے سوانح نگار اپنی تہذیبی

---

[1] نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۲۲۲

اور ثقافتی روایت کے مطابق انصاف اور غیر جانبداری سے کام لیتے تھے اور اپنے ممدوح کو ان ہی اوصاف ...
اوصاف سے یاد کرنے کی کوشش کرتے تھے جن سے وہ متصف تھے[1]

لیکن موجودہ دور میں اگر ان اصولوں میں کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے تو اس ترمیم و اضافہ کو مشرقی روایات ۔ مشرقی تہذیب ۔ مشرقی مزاج اور مشرقی اخلاقی ڈسپلن کے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے ۔ اس کے بغیر جو سوانح عمری لکھی جائے گی اُسے ادب کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ادب زندگی کا ترجمان ہے اور ہم مغرب میں نہیں مشرق میں رہتے ہیں۔

اُردو سوانح نگاری

اردو ادب میں سوانح نگاری ایک پرانی صنف ہے ۔ اُردو ادب کے قدیم نثری سرمایہ کا بڑا حصہ کسی نہ کسی لحاظ سے سوانحی ہے[2] ۔ جو تذکروں ۔ ملفوظات ۔ منقولات اور سوانحات پر مشتمل ہے[3] ۔ ابتدائی اردو سوانح نگاری پر فارسی ادبیات کا بڑا اثر ہے ۔ اردو ادب کے ابتدائی دور میں تذکرہ نویسی کو بڑا فروغ ہوا ۔ جس کا تعلق سوانح نگاری سے بھی ہے ۔ لیکن انہیں سوانح قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ اس کے باوجود ان تذکروں اور ملفوظات کی اپنی ایک اہمیت ہے ۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ

" قدیم سوانح عمری جدید طرز سے کئی حیثیتوں سے الگ اور مختلف ہے ۔ مگر تنوع اور رنگارنگی کے لحاظ سے بہت بڑی حد تک قابلِ توجہ ہے[4] ۔

جدید اردو سوانح نگاری کی ابتدا مولانا الطاف حسین حالی نے کی ۔ انہوں نے مغربی فنِ سوانح نگاری کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھ کر اردو میں بھی ویسے ہی نمونے پیش کرنے کی کوشش کی ۔ جیسی مثالیں کہ انگریزی ادبیات میں موجود تھیں ۔ اس لحاظ سے مولانا حالی کا یہ کارنامہ اردو ادب میں ہمیشہ یادر ہے گا ۔ حالی نے جو سوانح عمریاں لکھیں ان میں حیاتِ سعدی ۱۸۸۴ء[5] یادگارِ غالب ۱۸۹۷ء[6] اور حیاتِ جاوید ۱۹۰۱ء[6] زیادہ مشہور ہیں ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے مولانا حالی کو اُردو کا سب سے بڑا

---

1 ۔ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند الطاف فاطمہ اردو ادب جلد نمبر ۱ ص نمبر ۴۰۱

۲-۳ ۔ بحوالہ تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند ص نمبر ۳۵۱

۴ ۔ سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۸۵

۵-۶ ۔ بحوالہ سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۹۳

سوانح نگار کہا ہے[1]۔ مولانا حالیؔ کے بعد مولانا شبلی نعمانیؔ اردو کے بہترین سوانح نگار تھے۔ مولانا حالی اور مولانا شبلیؔ کے متعلق ڈاکٹر سید شاہ علی لکھتے ہیں کہ

"یہ دو مصنف اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود اردو سوانح نگاری کے امام اور ان کی تصانیف اردو ادب کا ایک دقیع حصہ اور دوسری زبانوں کے ادب کے مقابل اردو ادب کی سربلندی کا باعث ہیں"[2]

سوانح نگاری کے اس فنی جائزے کے بعد ہم آغا شورش کاشمیری کی سوانح نگاری کا جائزہ لیتے ہیں جو کہ آغا صاحب کا ایک خاص موضوع ہے۔

شورش بحیثیت خود نوشت سوانح نگار

فنی نقطہ نظر سے آغا صاحب کی آپ بیتی جدید طرز کی حامل ہے۔ آغا صاحب نے اپنی زندگی کے وہی واقعات منتخب کئے ہیں جو زندگی کے مرقع میں کسی نہ کسی صورت نہایت ضروری تھے۔ اس مرقع میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ کچھ رنگ بڑے ہی شوخ اور نظر خراش ہیں۔ کچھ بڑے ہی معتدل اور جاذب نظر ہیں۔ کچھ پھیکے اور بھدے بھی ہیں۔ مگر ان رنگوں کا مجموعی تاثر تصویر سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ آغا صاحب نے اپنی زندگی کے اس مرقع میں وہی رنگ بھرے ہیں جو فطرت نے خود اُن کی زندگی میں بھر دیئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تصویر ایک حقیقی اور چلتی پھرتی تصویر معلوم ہوتی ہے۔

آغا صاحب کی ساری زندگی تگ و دو۔ جدوجہد اور سعی و عمل کی زندگی ہے اور اس بات کی چھاپ ہمیں ان کے خود نوشت حالات میں بھی ملتی ہے۔ شورش صاحب کی تصویر ہمیں ان کتابوں میں بھی ویسے ہی متحرک و فعال نظر آتی ہے۔ جس طرح وہ اپنی زندگی میں فعال اور متحرک ہوا کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ حالاتِ زندگی آغا صاحب کی ہو بہو تصویر ہیں۔ شورش کاشمیری کے سلسلے میں یہ بات مسلمہ ہے کہ وہ ایک بہادر۔ بے خوف۔ نڈر اور بے باک انسان تھے۔ بلکہ آغا صاحب کی شخصیت کی تعمیر میں بہادری۔ جاں نثاری

---

[1] بحوالہ سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقا ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۹۳

[2] نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء مضمون حالی اور شبلی سوانح نگار کی حیثیت سے ڈاکٹر سید شاہ علی ص نمبر ۱۰۵

بے خوفی اور بیباکی کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ اپنی خودنوشت حالات لکھتے ہوئے انہیں ان اوصاف نے بڑا فائدہ پہنچایا ہے۔ خودنوشت حالات میں جیسا کہ پہلے حوالہ دیا گیا ہے۔ "اپنے آپ سے محبت اور دوسروں کا خوف" حقیقت کی ترجمانی میں مانع ہوا کرتا ہے۔ جہاں تک "دوسروں سے خوف" کا تعلق ہے۔ آغا صاحب کے بارے میں یہ بات کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتی کہ وہ کسی سے ڈرتے بھی تھے۔ اُن کی زندگی اِس بات کا ثبوت قدم قدم پر پیش کرتی ہے کہ وہ بڑے نڈر اور بے خوف انسان تھے۔ آغا صاحب نے اپنے حالاتِ زندگی لکھتے وقت بڑی بیباکی سے کام لیا ہے۔ وہ ملک کی بڑی سے بڑی شخصیت پر بڑی جرأت اور بیباکی سے تبصرہ کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بطور خاص توجہ کے قابل ہے کہ آغا صاحب اپنی آپ بیتی میں صرف ان شخصیتوں یا لوگوں پر ہی تنقید نہیں کرتے جو مر چکے ہیں۔ بلکہ ان بااختیار اور مقتدر لوگوں پر بھی برملا نکتہ چینی کرتے ہیں جو زندہ ہیں۔ اور آغا صاحب کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔ مثلاً جب آغا صاحب کی کتاب "موت سے واپسی" شائع ہوئی تو آغا صاحب زندہ تھے اور وہ تمام لوگ بھی بقیدِ حیات تھے۔ جن پر آغا صاحب نے بے لاگ تبصرہ کیا تھا یعنی فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں۔ گورنر موسیٰ خاں۔ وزیر اطلاعات جناب احمد سعید کرمانی اور اس حکومت کے بڑے بڑے عہدیداران مگر کسی ایک نے بھی آغا صاحب کی تردید یا کسی بیان کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے۔ کہ آغا صاحب نے جو کچھ دوسروں کے متعلق لکھا درست لکھا اور کسی بڑے مقتدر آدمی سے ڈر کر حقائق کو چھپایا نہیں بلکہ حالات و واقعات کو من وعن بیان کیا۔ اس کے علاوہ آغا صاحب نے بعض بڑی سیاسی جماعتوں اور سیاسی رہنماؤں کے حقیقی خدوخال بھی پیش کئے ہیں۔ لیکن کسی سیاسی جماعت کی مقبولیت یا سیاسی شخصیت کی شہرت آغا صاحب کو مرعوب نہیں کر سکی۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ آغا صاحب اپنی آپ بیتی لکھنے میں دوسروں سے خوف زدہ نہیں ہیں۔ اب رہی "اپنے سے محبت"۔ تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر آدمی اپنے آپ سے محبت کرتا ہے یا یہ کہ خود پسند ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی

"انسان ہر حالت میں برتر رہنا چاہتا ہے۔ یہ خودی، یہ رفعت اور برتری کی خواہش ایک ایسی جبلت ہے جو ہر جگہ ہر دل اور ہر ذی روح میں کارفرما ہے۔ ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کا طلسم رنگین ادا دنیا کی ہما ہمی ایسی خلش برتری کی رہینِ منت ہے۔"[1]

---

[1] ادب کا مقصد ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی ص نمبر ۱۱ ہندوستان کتاب گھر لکھنؤ ۱۹۵۶ء

لہٰذا آغا صاحب کو بھی اِس کلیئے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ یقیناً وہ بھی ہر ذی روح کی طرح اپنے اندر احساس برتری رکھتے تھے۔ لیکن خود پسندی اور احساس برتری کے اظہار کو شخصیت کا حسنِ حقیقی یا غیر حقیقی میں بدل دیتا ہے۔

شخصیتیں دو قسم کی ہیں ایک فعلی Active دوسرے انفعالی Passive ......

> انفعالی شخصیت سماج یا ماحول کے ہاتھ میں موم کی طرح ہوتی ہے۔ سماج جس شکل میں چاہے اِس کو ڈھالے جو چاہے اُس سے کام لے۔ اِس میں قوتِ مزاحمت اور صلابت بالکل نہیں ہوتی۔ اِس لئے آسانی کے ساتھ بن کر بگڑتی اور بگڑ کر بن جاتی ہے۔ اِس کے خلاف فعلی شخصیت صرف ایک حد تک ماحول سے اثر قبول کرتی ہے اور اس کے بعد اُسے متاثر کرنا شروع کر دیتی ہے۔ ماحول سے تصادم اُس کی خامیوں کو محسوس کرکے اس کی اصلاح فعلی شخصیت کا کام ہے۔ زندگی میں انقلاب اِس شخصیت کے اثر سے آتے ہیں۔ اگر فعلی شخصیتیں نہ ہوتیں تو زندگی تغیر آشنا نہ ہوتی اور روزِ ازل سے ایک حالت پر قائم رہتی۔"[۱]

انفعالی شخصیت جب اپنی برتری یا خود پسندی کا اظہار کرتی ہے تو وہ حقیقی نہیں ہوتا۔ لیکن جب کوئی فعلی شخصیت اپنی برتری کا اظہار کرتی ہے تو وہ احساس برتری حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ فعلی شخصیت ماحول سے ٹکرانے اور اُسے بدلنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اور اِسی طاقت کے زیر اثر جب کوئی فعلی شخصیت ۔ میں ۔ انا ۔ برتری یا خود پسندی کا اظہار کرتی ہے تو وہ فی الواقع حقیقت کا اظہار ہوتی ہے ۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کا اظہار "میں" "انا" "خود پسندی" یا "احساس برتری" کے ذریعہ کر رہا ہوتا ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی شخصیت کا شمار چونکہ بڑی اور فعلی شخصیتوں میں کیا جاتا ہے لہٰذا اُن کا یہ احساس برتری ایک سچائی اور حقیقت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم آغا صاحب کی آپ بیتی کو پڑھتے ہیں تو ہمیں وہ باتیں جو انہوں نے اپنی زندگی کے متعلق "میں" کہہ کر لکھی ہیں ۔ مصنوعی اور بے جان معلوم نہیں ہوتیں بلکہ ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ واقعی شورش کاشمیری ایسا شخص یہ "میں" کہہ سکتا ہے لیکن آغا صاحب نے کسی غلط بات کو اپنی "میں" میں تبدیل نہیں کیا یعنی آغا صاحب نے اپنی زندگی کے ان واقعات کو بیان کیا ہے

۱۔ نئی پرانی قدریں — ڈاکٹر شوکت سبزواری — ص نمبر ۱۸۹ — مکتبہ اسلوب کراچی

جو حقیقی اور سچے ہیں۔ انسانی جبلت کے اِس احساس برتری کی تسکین کیلئے کوئی کہانی نہیں کہی اور نہ ہی کوئی افسانہ گھڑا ہے۔ آغا صاحب نے خود بھی اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

"بعض مصنف یا مولف اپنے قارئین کو مرعوب کرنے کیلئے کہانیاں گھڑتے اور اچھالتے ہیں کہ اِس قسم کی کہانیاں منشیان کا سرور ہوتی ہیں اِس کے برعکس میرا معاملہ دوسرا ہے کہ اپنی تصویر دو مردوں کے سامنے رکھ دو وہ اس خط و خال سے اندازہ کرلیں گے کہ اس میں کیا ہے!"[1]

یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب کی آپ بیتی اُن کی زندگی کی تصویر ہے۔ جس سے اُن کی شخصیت چلتی پھرتی معلوم ہوتی ہے۔ کسی شخصیت کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ ہمیں اُن عناصر کا علم ہو جن سے شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر شوکت سبزواری تحریر کرتے ہیں کہ

"شخصیت کی تعمیر میں بہت سے عناصر کارفرما ہیں ظاہری شکل و صورت۔ اوضاع و اطوار۔ اخلاق و عادات۔ اعمال و افعال۔ سیرت و کردار۔ ذہن و فکر کی صلاحیتیں یہ سب خصوصیات یکجا ہو کر شخصیت کی تعمیر کرتی ہیں۔"[2]

آغا صاحب نے اپنی آپ بیتی میں ان تمام عناصر پر روشنی ڈالی ہے اور جن سے ہم اُن کی زندگی کے ایک ایک گوشہ سے واقف ہو سکتے ہیں آپ بیتی لکھنے میں یہ بات بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ آپ بیتی لکھنے والے نے اپنی زندگی کی حقیقتوں کو کس قدر چھپایا ہے اور کس قدر آشکار کیا ہے۔ آغا صاحب کی آپ بیتی پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کی بیشتر خوبیوں اور خامیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آغا صاحب نے کچھ نہیں چھپایا یا سب کچھ بیان کر دیا ہے۔ تاہم آغا صاحب کی عام زندگی۔ خطوط۔ دوستوں کی روایت خاندانی طرزِ عمل۔ سیاسی۔ عوامی اور مذہبی حلقوں کے روابط سے کوئی ایسی بات نہیں ملتی جو اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکے کہ شورش نے اپنی زندگی کے کسی گوشہ سے پردہ نہیں اٹھایا یا اخفا سے کام لیا ہے۔ شورش کاشمیری ایک عوامی آدمی تھے۔ اُن کی زندگی کا زیادہ تعلق عوام ہی سے تھا وہ عوامی سیاست۔ خطابت اور صحافت کی وجہ سے عوامی رہنما تسلیم کئے جاتے تھے۔ اِس کے علاوہ شورش کاشمیری

---

۱ موت سے واپسی — شورش کاشمیری — سرآغاز

۲ نئی پرانی قدریں — ڈاکٹر شوکت سبزواری — ص نمبر ۱۸۶

ایک جلوت پسند اور مجلسی آدمی تھے۔ ایسے لوگوں کی زندگیاں کوشش کے باوجود پوشیدہ نہیں رہ سکتیں۔ عقیدت مند تو شاید کسی بات کو نظر انداز کر دیں۔ لیکن مخالفین سے یہ کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مخالف کے عیوب کو عام نہ کریں گے۔ لیکن آغا شورش کی بھرپور عوامی زندگی میں ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جسے ناقابلِ اظہار سمجھ کر چھپانے کی ضرورت ہو۔ شورش کاشمیری اختلافِ فکر و نظر کی بنا پر سیاست خطابت اور صحافت میں مخالفین سے لڑتے جھگڑتے بھی رہے۔ ان جھگڑوں اور لڑائیوں میں الزام تراشیاں بھی ہوئیں۔ لیکن یہ الزامات بھی ایسے نہ تھے کہ انہیں چھپانے کی ضرورت ہو۔ ماسوائے مرزائیت کی طرف سے عائد کردہ الزامات کہ جو افواہوں کی صورت میں پھیلائے جاتے تھے۔ اقتدار و حکومت کی مخالفت کرنا۔ نہ صرف سیاسی محاسبہ کرنا بلکہ افرادِ حکومت کے کردار و افعال کو صحافت کے ذریعے سے طشت از بام کرنا اربابِ اختیار کو اس بات کی دعوت دینا ہے کہ وہ نکتہ چینی کرنے والے کے کردار و افعال پر انگلی اٹھائیں اور یہ افراد اپنی حکومت و اختیار کی بنا پر کسی بھی شخص کا محاسبہ اپنے مخالف سے بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ لیکن شورش کاشمیری تمام عمر اربابِ حکومت اور صاحبانِ اختیار کے مخالف رہے۔ لیکن ان مخالفین کی طرف سے کسی ایسی بات کی نشاندہی نہیں ہوتی جو شورش کاشمیری کے کردار و افعال سے مختلف ہو جو انہوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھے ہیں۔ شورش کاشمیری پر سب سے سنگین الزام جو مختلف حکومتوں اور افراد کی جانب سے لگایا گیا وہ مجلسِ احرار میں ہونے کی وجہ سے پاکستان کی مخالفت ہے۔ جو کبھی وطن دشمنی کہلایا تو کبھی ملت فروشی اور کبھی غداری کی شکل اختیار کر گیا۔ آغا صاحب نے اپنی آپ بیتی میں اس بات پر فخر کیا ہے کہ وہ احرار جیسی انگریز دشمن اور حریت پسند جماعت کے ساتھ رہے۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے جذبات و احساسات کو چھپاتے نہیں بلکہ کہتے ہیں کہ

"۱۴۔ اگست کی رات بہرحال ختم ہو رہی تھی اور یہ تھا ۱۵۔ اگست کا سرآغاز۔ نصف شب بارہ بج کر ایک منٹ پر ریڈیو نے پاکستان بن جانے کا اعلان کیا۔ کلام اللہ پڑھا گیا ظفر علی خان کی نعت گوائی گئی پھر یہ

اے قائد اعظم تیرا احسان ہے ہم پر

گایا گیا۔ ہم لوگ جو آزادی کیلئے سالہا سال جیل میں رہے اور جن کا نصب العین تھا کہ اس ملک پر انگریزوں کا کوئی حق نہیں ہے اس طرح چپکے پھر رہے تھے۔ جس طرح ایک بیوہ اپنے آنسوؤں کو بھائیوں کے خوف سے آنچلوں میں چھپاتی اور رندھے ہوئے گلے میں جذبات دفن کر کے ٹوٹی پھوٹی

قبر ہو جاتی ہے۔"[1]

لیکن قیام پاکستان کے بعد آغا صاحب کے طرزِ عمل نے ان تمام الزامات کو بے بنیاد ثابت کر دیا۔ تاہم آغا صاحب نے جہاں خوبیوں اور کارناموں کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے اپنی کمزوریوں اور خامیوں کو بھی بے نقاب کیا ہے۔ وہ اپنی محبت کی داستان بھی سناتے ہیں۔ تو ہیرا منڈی کے چکر لگانے کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنی حسن پرست طبیعت کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

"انسان شاعر ہو تو خوبصورت آنکھیں بڑا تنگ کرتی ہیں۔ جو کنسٹیبل مجھے جیل سے عدالت میں لے جاتا اور واپس لاتا نوعمر تھا۔ انیس بیس سال کے پیٹے میں ہوگا قدرت نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر آنکھیں دی تھیں۔ اردو غزل میں آنکھوں کی مستی، پلکوں کی خنجر زنی، نظروں کی دل فریبی اور مژگاں کی تیر اندازی پر جو کچھ لکھا گیا ہے۔ سب اُس کی آہو چشمی کا اثاثہ تھا۔ وہ مجھے ہتھکڑی لگاتا۔ میں اُسے ٹکر ٹکر دیکھتا اور قدرت کا ممنون ہوتا کہ اُس نے اِس حال میں بھی کرم کیا ہے۔ کچہری جاتے ہوئے میں راستے کی لمبائی کیلئے دعائیں کرتا مجھے مقدمہ کی سماعت سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں صرف اسی کو دیکھا کرتا۔ واپسی پر ہتھکڑی کھولتا تو مجھے افسوس ہوتا۔ کاش! ان حلقوں کی عمر دراز ہوتی۔"[2]

آغا صاحب کی اِس کمزوری کے متعلق انور عارف صاحب نے درست لکھا ہے کہ

خوبصورت آوازیں اور خوبصورت چہرے اس کو بڑی آسانی سے دھوکہ دے سکتے ہیں۔ حسن اُس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔[3]

اسی طرح وہ اپنے داداجان کے متعلق لکھتے ہیں

وہ چاہتے تو بڑی جائیداد پیدا کر سکتے تھے لیکن ان کی جوانی نے غور نہ کیا۔ ساری کمائی سفینۂ غزل

---

[1] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل — شورش کاشمیری — ص نمبر ۵۰۳

[2] پس دیوارِ زنداں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۱۱/۱۱۲

[3] شورش کاشمیری — مرتبہ انور عارف — ص نمبر ۴۱

اور صراحی مے ناب کی نذر ہو گئی۔"[1]

شورش کاشمیری ایک غریب خاندان کے فرد تھے۔ انہوں نے اپنی غربت اور بے بسی کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے۔ کوئی تاویل اور جواز پیدا نہیں کیا۔ جو کچھ تھا اور جیسا تھا بیان کر دیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں

"وہ ایک کلبۂ احزان تھا اور ہم تھے۔ لبسا اوقات فاقوں پر نوبت آجاتی۔ چیزیں انتہائی سستی ہو کر بھی ہمارے لئے مہنگی ہو گئی تھیں۔"[2]

ابتدائی سیاسی زندگی میں انہوں نے جو کچھ حاصل کیا اُس کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے۔

"اِس عرصے میں جو کچھ ملا یہ تھا کہ مولانا ظفر علی خان نے پانچ روپے عیدی بھیجی۔ مولانا اسحاق مانسہروی نے نزری کی جوتی عنایت کی۔ مجلسِ اتحادِ ملت کے لوگ تقریر پر بلاتے تو آمدورفت کا کرایہ عنایت فرماتے۔ اتحاد ملت کی جماعت عاملہ نے سب کا ماہانہ الاؤنس مقرر کیا خود مجھے ایک بار تیس روپے ملے تھے۔ مَیں قید ہو گیا۔ تو ملک لال خان صاحب (جنرل سیکرٹری) نے ایک دفعہ ہمارے گھر میں وہ تیس روپے بھجوا دیئے۔ الحاج امین الدین صحرائی لاہور کی ایک عجیب شخصیت تھے۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ حجاز سے ایک انگوٹھا چپل لائے تھے مجھے "تحفتہً" عنایت کی۔ کچھ دنوں بعد بگڑ گئے۔ گریبان پکڑ لیا۔۔۔ لاؤ میری چپل؟ اُس وقت میرے پاؤں میں وہی چپل تھی۔ مَیں نے فوراً اُتار دی۔ صحرائی نے مجھے تھپڑ مارا۔ پرانی ہو چکی ہے۔ قیمت ادا کرو۔ چپل کے گھونسلے میں ماس کہاں؟ بہرحال اُن کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا وہ چپل لے کر چلے گئے۔ مَیں ننگے پاؤں واپس آگیا۔"[3]

عرض اِس قسم کے اور بھی واقعات انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لکھے ہیں۔ جو اگرچہ چھوٹے چھوٹے واقعات ہیں۔ مگر چونکہ یہ چھوٹے چھوٹے

۱۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۱۵

۲۔ الف ۔۔۔۔ ۔ " ۔ ص نمبر ۵۹/ ۶۰

۳۔ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۱۸۸/ ۱۸۹

واقعات آغا صاحب کی زندگی کے مختلف ادوار کی عکاسی کرتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے اِن واقعات کو بیان کرنے میں کوئی حجاب محسوس نہیں کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

"اگر ہم میں سے کسی کو یہ جستجو ہو کہ اُردو میں روسو کے اعترافات کی طرح کی کتنی چیزیں لکھی گئی ہیں تو اس کا جواب یہی ہو گا کہ شاید ابھی کوئی نہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ اُردو کا آپ بیتی نگار مشرق میں بیٹھا ہے جہاں اس کیلئے ممکن نہیں کہ سچائی یا سچی تصویر کشی کی آڑ لیکر اپنی بداعمالیوں کی تشہیر کرتا پھرے"[۵]

آپ بیتیوں میں عام طور پر اِس بات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے کہ کوئی مصنف اپنی جوانی کی رنگین داستانیں کس حد تک بیان کرتا ہے۔ عشق و عاشقی کی لغزشوں کو کیسے سناتا ہے یہاں تک کہ جنسی بے راہ روی میں مصنف نے کتنا حصہ لیا۔ جب تک اس قسم کے واقعات درج نہیں ہوتے مصنف کی ذات مشتبہ رہتی ہے کہ اِس نے روسو کی طرح کوئی اعتراف نہیں کیا لہٰذا حقیقت نگار نہیں ہے حالانکہ ضروری نہیں ہے کہ اِس قسم کی سعادتیں ہر ایک کے حصے میں آئیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ان سعادتوں کو خواہ مخواہ اپنے سے منسوب کر لیا جائے تاکہ لوگوں کی نظر میں حقیقت نگار بن سکیں بعض اوقات وسائل اور مواقع کا فقدان بھی انسان کو ان سعادتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ شورش کاشمیری کی زندگی میں ایسی کوئی سعادت موجود نہ تھی۔ لہٰذا آپ بیتی میں اس کا ذکر بھی نہیں کیا۔ البتہ ایک مختصر عرصہ میں گجرات کی رہنے والی ایک خورشید نامی لڑکی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ضرور ہوئے لیکن جلد ہی محبت کی اسیری قیدِ فرنگ میں بدل گئی۔ شاید اسی کی وجہ سے کوئی دلکش داستان جنم نہ لے سکی۔

اِس قسم کی داستانیں جو روسو یا اُردو ادب میں جوش ملیح آبادی کے حصے میں آئیں۔ جوانی کی کوتاہیاں اور شباب کی فتنہ زائیاں ہوتی ہیں۔ لیکن جس آدمی نے اپنی جوانی اور شباب کے دن جیل خانے کی نذر کر دیئے ہوں اُس کا اس قسم کی سعادتوں سے محروم رہ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ شورش کاشمیری کوئی زاہد۔ پارسا یا شیخ اکرام صاحب کے معیار

---

۵ نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۲۲۳

کے مطابق جس کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔ اصل روحانی یعنی باطنی پاکیزگی۔ تقویٰ اور اخلاقی ڈسپلن کے مالک انسان نہ بھی ہوں تب بھی ایک شریف۔ نیک اور بہادر انسان ضرور تھے۔ جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ آزادی کی خاطر جیل خانے میں گذارا یہی وجہ ہے کہ ہمیں اُن کی آپ بیتی میں جیل کی سنگینی تو مل جاتی ہے مگر عشق کی لغزشوں اور جنسی بے راہ روی کے قصوں کی رنگینی نہیں ملتی۔ اِس کا اقرار خود آغا صاحب کو بھی ہے وہ کہتے ہیں۔

وہ عشق کی سیر ضرور کی لیکن عشق کی عمر جیلوں میں بتا دی، صبح ہونے سے پہلے رات آگئی اور اب عمر کی اس منزل میں ہوں کہ صرف مقصد کا عشق رہ گیا ہے[۱]

شورش کاشمیری کی آپ بیتی ایک تاریخی دستاویز بھی ہے آغا صاحب نے ۱۹۳۵ء میں سیاست کے میدان میں قدم رکھا اور عملی حصہ لیا لیکن اس سے پہلے بھی وہ سیاسی ذہن ضرور رکھتے تھے مگر عملی طور پر سیاست میں حصہ دار نہ تھے۔ انہوں نے اپنے زمانے کی سیاست کے نشیب وفراز۔ سیاسی رہنماؤں کے کردار۔ کارکنوں کی حالت۔ عوام کے جذبات اور حالات وواقعات کو اس طرح لکھا ہے کہ ہم اُس گذرے ہوئے دور میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں پر ہم جلسے اور جلوسوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ گولیاں اور لاٹھیاں برستی ہوئی دیکھتے ہیں۔ حریت پسند جان پر کھیلتے۔ قربانی و ایثار کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ کاسہ لیس خود اپنے ہی بھائی بندوں کے مخبر اور دشمن بن جاتے ہیں۔ پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی کے ہندوستانی آفیسر اپنی کارکردگی دکھانے کیلئے اپنے ہی ملک وقوم سے بے وفائی کرتے ہیں۔ راہنماؤں کی کرشمہ سازیاں اور شعبدہ بازیاں حکومت اور اُن کے بہی خواہوں کی مکاریاں۔ نوجوانوں کی جاں نثاریاں اور بوڑھوں کی مصلحت کوشیاں۔ قانون کی بے ضابطگیاں اور انصاف کی بے دست وپائیاں۔ قید وبند کے سلسلے اور جراتوں اور ہمتوں کے قصے بلوے اور ہنگامے۔ ہندو مسلم کشیدگی اور نفرت۔ فسادات اور اس کے محرکات۔ انسانیت سوز مظالم اور مجرمانہ حرکات۔ مسلم لیگ۔ کانگریس۔ احرار۔ ہندو مہا سبھا۔ دہشت پسند اور کمیونسٹ کی سیاست اور سیاستدانوں سے متعلق ہر وہ بات ہمیں آغا صاحب کی آپ بیتی میں مل جاتی ہے۔ جس کا تعلق ان کی زندگی سے تھا یا وہ اُن کے عینی شاہد تھے۔ اس طرح آغا صاحب نے اپنی آپ بیتی میں گویا اپنے عہد کی

۱۔ شورش کاشمیری ۔ مرتبہ انور عارف ۔ ص نمبر ۹۶

تاریخ بھی مرتب کردی ہے اور بعض واقعات وجزئیات تک تحریر میں آگئے ہیں۔ جن سے اُس زمانے اور ماحول کے ایسے مرقعے تیار ہو گئے ہیں۔ جن سے ہمیں اس زمانے کی سیاسی۔ مذہبی اور سماجی کشمکش کا سراغ ملتا ہے جو تحریک آزادی کا پس منظر بھی ہے آغا صاحب نے حالات و واقعات کی مرقع نگاری میں تاریخی صداقتوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ انہوں نے افسانہ سازی سے تاریخی صداقتوں کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ

" افسانے کا سوانح یا آپ بیتی سے الگ کرنا ممکن نہیں تاری کیلئے اگر شاعرانہ صداقت موجود ہو تو افسانہ بھی سوانح حیات یا آپ بیتی سے مختلف نہیں اور اگر بنیادی انسانی قدریں مفقود ہوں تو سوانح حیات بھی بے جان اور بے معنی واقعات کا ایک تسلسل ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں "[1]

جہاں تک افسانے کا تعلق ہے

" افسانہ نگار اپنے گوناگوں مشاہدات اور تجربات میں سے بعض کو یہ مخصوص تاثر پیدا کرنے کے لئے منتخب کرتا ہے اور بعض اوقات ان مشاہدات اور تجربات سے الگ ہٹ کر اپنے مقصد کیلئے بعض نئے تجربات کی تخلیق کرتا ہے اور اس کام میں تصور اور تخیل سے پوری مدد لیتا ہے۔ اس موقع پر اس کا رجحان حقیقت کی بجائے رومانیت کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے تاثر کی وحدت اور شدت کیلئے اُسے معمولی کی بجائے غیر معمولی کی مدد لینی پڑتی ہے "[2]

لیکن خود نوشت سوانح نگاری میں کوئی بھی سوانح نگار مشاہدات اور تجربات سے ہٹ کر تصور اور تخیل کی مدد سے کام نہیں لے سکتا۔ سوانح نگار کا رجحان ہمیشہ حقیقت کی طرف رہتا ہے۔ اور وہ زندگی کی اُن حقیقتوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ جو تجربے اور عمل کی بنا پر معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ آپ بیتی میں تو یہ مشاہدات اور تجربات چونکہ لکھنے والے کے ذاتی ہوتے ہیں

۱۔ نقوش آپ بیتی نمبر — مضمون آپ بیتی اور اسکی مختلف صورتیں — ص نمبر ۷۵

۲۔ فن افسانہ نگاری — وقار عظیم — ص نمبر ۲۴ — اردو مرکز لاہور

لہذا وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کی باز آفرینی تو کرتا ہے لیکن اُسے نئے تجربات تخلیق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

جہاں تک آغا صاحب کی آپ بیتی کا تعلق ہے انہوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی باز آفرینی کی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آغا صاحب نے تاریخی صداقتوں کو فسانے کی طرز میں لکھا ہے۔ مثلاً یہ ایک حقیقت ہے کہ آغا صاحب کو پہلی دفعہ گرفتار کر کے بورسٹل جیل لاہور میں لے جایا گیا۔ اِس حقیقت کو آغا صاحب اِس طرح بیان کرتے ہیں

"جولائی ۱۹۳۵ء کی ایک سہ پہر ــــ بورسٹل جیل لاہور کے قد آور اور سیاہ آہنی پھاٹک کھلے اور بند ہو گئے۔ دونوں پھاٹکوں پر بڑے بڑے تالے دو دھیل بھینس کے تھنوں کی طرح لٹک رہے تھے۔ باہر روشنی تھی ڈیوڑھی میں اندھیرا۔ دربان نے پرمیس وارنٹ لئے۔ گنتی کی نام لکھے ایک ایک کو پکارا پھر چار نفر حوالاتی ازاں ڈسٹرکٹ پولیس لاہور وصول پانے کی رسید لکھ دی۔ حفیظ اس سے پہلے بھی کانگرس کی سول نافرمانی میں یہاں رہ چکا تھا اور کسی حد تک جیل کے در و دیوار اور قاعدے قانون سے واقف تھا۔ ہم نو وارد تھے۔ ہمارے لئے سبھی کچھ نیا تھا۔"[۱]

اِس کے بعد آغا صاحب جیل میں قیدیوں کے مختلف عہدوں کا ذکر شروع کر دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قیدی جو کبدار کون ہوتا ہے۔ یہ کالی شلوار اور کالی پگڑی باندھتا ہے۔ قیدی اوور سیر پیلی پگڑی اور پیلی شلوار پہنتا ہے۔ اور یہ کہ پیلی وردی کسی قیدی کا آخری عہدہ ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔[۲] لیکن یہ ساری معلومات لکھ دینے کے بعد جب یہ فقرہ لکھتے ہیں کہ

"حفیظ یہ سب کچھ بیان کر رہا ہے اور ہم بڑی بڑی دیواروں کی ہیبت کو ٹکر ٹکر گھورتے چلے جا رہے تھے۔"[۳]

۱ــہ پسِ دیوارِ زنداں	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۷
۲ــہ بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں	"	ص نمبر ۱۷/ ۱۸
۳ــہ پسِ دیوارِ زنداں	"	ص نمبر ۱۸

تو پتہ چلتا ہے کہ یہ معلومات حفیظ نے فراہم کی ہیں جو پہلے کانگرس کی سول نافرمانی میں اس جیل کے قاعدے اور قانون کو جانتا ہے آغا صاحب اِس وقت جبکہ یہ آپ بیتی لکھ رہے تھے خود جیل کے ہر قاعدے اور قانون سے واقف تھے۔ لیکن جب وہ پہلی دفعہ جیل گئے تھے اُس وقت انہیں جیل سے متعلق کوئی واقفیت نہ تھی۔ لہٰذا واقعات کی ترتیب کا حسن برقرار رکھنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس طرح " ۱۹۳۵ء کی ایک سہ پہر بورسٹل جیل لاہور کے تند آور پھاٹک کھلے اور بند ہو گئے " وغیرہ افسانوی انداز ہے۔ جس سے دلچسپی اور اثر پیدا کرنے کا کام لیا جاتا ہے اور یہی وہ طرز ہے جو تاریخ کو ادب بنا دیتی ہے۔ اس سلسلے میں فن کا ایک اور پہلو مضمر ہے۔ کہ

" آپ بیتی کا ہر لمحہ تجربے کی روشنی میں ریکارڈ ہونا چاہیے "[۱]

یعنی اگر آغا صاحب اپنی پہلی گرفتاری میں قیدیوں وغیرہ کا ذکر خود کرتے تو یہ آپ بیتی کے حوالے سے غلط ہوتا کیونکہ انہیں کبھی اِن باتوں کا تجربہ اور علم نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ یہ باتیں حفیظ کی روایت سے بیان ہوئی ہیں۔ آغا صاحب نے اپنی آپ بیتی میں مختلف موقعوں پر روائتوں کا سہارا لیا ہے۔ جس کا مقصد فن کے تقاضے پورے کرنا تھا۔ مثلاً " بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل " کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں۔

" ہم لوگ کب مسلمان ہوئے؟ بعض خاندانی روایتوں کے مطابق چھٹی پشت ہے کہ ہمارے جد کسی درویش کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے "[۲]

مندرجہ بالا عبارت میں " بعض خاندانی روایتوں کے مطابق " اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ بات آغا صاحب کے علم اور تجربے میں نہ تھی کہ کون کب مسلمان ہوا۔ لہٰذا یہ ضروری تھا کہ یہ بات کسی اور حوالے سے بتائی جائے اس طرح آغا صاحب نے فنی طور پر اپنی آپ بیتی اپنے ہی تجربات کی روشنی میں لکھی ہے۔ اس آپ بیتی میں بعض دوسری معروف شخصیتوں کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے۔ بعض لوگوں کی تعریف اور بعض کے متعلق تلخی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ لیکن اِن رہنماؤں سے متعلق

۱۔ نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۲۴۵

۲۔ بوئے گُل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل شورش کاشمیری ص نمبر ۹

جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی درحقیقت آغا صاحب کے تجربات ہی کا حصہ ہے تحریک آزادی کے سیاسی سفر میں آغا صاحب کا واسطہ جن جن رہنماؤں سے رہا انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں اُن کے کردار و سیرت پر تبصرے کئے ہیں لیکن یہ تنقید و تبصرہ وہیں تک محدود ہے جہاں تک خود آغا صاحب کی ذات سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں آغا صاحب لکھتے ہیں

"مرحومین کے کفن پھاڑنا اور قومی رسوائیوں کو اچھالنا میرے نزدیک مستحسن نہیں لیکن تاریخ نام ہے قوم کے حافظے کا۔ انسانوں کے تجربے بڑی چیز ہوتے ہیں لوگ دوسروں کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور نہ ہی ان سے سبق لیتے ہیں بلکہ خود تجربہ کرتے ہیں لیکن اس قسم کے تجربات ضرور محفوظ رہنے چاہئیں۔ ہمارے ملک میں ان تجربوں کو محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی تجربے ممکن ہے کبھی نئی نسل کیلئے غلطیوں سے اجتناب کا ذریعہ بن جائیں اور لوگ ان رہبروں سے بچیں جنکی رہزنی ڈھکی چھپی ہوتی ہے۔ لیکن جن کے خط و خال برہنہ ہوتے ہیں تو ان کے دشنہ و خنجر ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا۔"[۱]

گویا انھوں نے اپنی آپ بیتی صرف اسلئے لکھی ہے کہ اپنے تجربات نئی نسل تک پہنچا سکیں تاکہ یہ نسل رہنماؤں کی شعبدہ بازیوں سے دھوکا نہ کھائے۔ اور حقیقت یہ ہے آغا صاحب نے یہ تجربات چونکہ خود دھوکا کھانے کے بعد قلمبند کئے ہیں لہٰذا اس تنقید و تبصرہ کا تعلق آغا صاحب کے ذاتی تجربات اور ذاتی تاثرات سے ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی خود نوشت سوانح عمری کا مرکزی خیال تحریک جد و جہد آزادی ہے اور شورش کاشمیری کس طرح ایک غریب اور مفلوک الحال گھرانے سے اٹھ کر سیاست کے خارزار میں پھرتے رہے۔ قید و بند کے جاں گداز اور ہمت شکن ماحول میں ثابت قدم رہے۔ حکمرانوں کا غرور کس طرح توڑا۔ عوام سے محبت کی۔ اسلام سے لو لگائی۔ باطل قوتوں کو شکست دی۔ سیر و سیاحت کی۔ ملک میں خطابت و صحافت کے ذریعے حق گوئی کو عام کرنے کیلئے کن کن مراحل سے گذرے یہ اس کی تفسیریں ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف لوگوں۔ نظریوں اور عقیدوں کو زیر بحث لایا گیا۔ لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہے۔ لمحات و سانحات کی عکاسی جزئیات نگاری کے ضمن میں آجاتی ہے

۱؎ بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل شورش کاشمیری ص نمبر ۱۹۱

بعض بڑی اور چھوٹی شخصیتوں اور جیل کے حکام کے دلچسپ مرقعے پیش کئے ہیں۔ جیل، حکام جیل اور قیدیوں کی نفسیات بھی سامنے کی چیزیں ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آغا صاحب نے حالات و واقعات کو اُسی پس منظر اور اُسی ماحول میں پیش کیا ہے۔ جس ماحول میں یہ حالات پیدا اور واقعات وقوع پذیر ہوئے تھے۔ لیکن بعض مقامات پر تکرار سے کام بھی لیا گیا ہے جس کا سبب یہ ہے کہ آغا صاحب نے پہلے صرف اپنے قید و بند کے حالات لکھے جو "پسِ دیوارِ زنداں" میں موجود ہیں۔ غالباً پھر انہیں اپنے مکمل حالات زندگی لکھنے کا خیال آیا تو انہوں نے "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" لکھی چونکہ "پسِ دیوارِ زنداں" اور "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل" کا موضوع۔ زمانہ اور ماحول ایک ہی ہے لہذا کچھ باتیں ناگزیر طور پر "بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل" میں آگئیں جو پہلے ہی "پسِ دیوارِ زنداں" میں آچکی تھیں۔ تاہم آغا صاحب نے اپنے ذاتی حالات اس طرح لکھے ہیں کہ اُن کی آپ بیتی میں ہمیں اُن کی شخصیت اور کردار کی تعمیر ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو فنی نقطہ نظر سے کامیابی کی دلیل ہے۔ اسی لئے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"خود نوشت نگاری بڑا مشکل فن ہے۔ لیکن ہمارے جدید دور میں دو ادیبوں نے اِن ذمے داریوں کو پورا کیا ہے۔ ایک تو احسان دانش نے "جہانِ دانش" میں اور دوسرے شورش ہیں جن کی "پسِ دیوارِ زنداں" معرکے کی کتاب ہے۔"[1]

آغا شورش کاشمیری نے اپنی آپ بیتی نگاری میں صرف فنی نزاکتوں کو پورا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اپنی ادبی سلیقہ مندی سے بھی اس فن کے حُسن میں اضافہ کیا۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں کہ

"آپ بیتی میں اگر یہ خصوصیات اور جمع ہو جائیں تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ لکھنے والا زبان کا ادا شناس۔ اپنے زمانہ اور اہل زمانہ کا مزاج شناس۔ کہنہ مشق اور صاحب طرز ادیب بھی ہو۔ قدرت نے اس کو قوت مشاہدہ کی دولت سے مالا مال کیا ہو۔ وہ روزمرہ کے

---

[1] ہفت روزہ چٹان شورش نمبر ۱۹۷۶ء مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۵۶

چھوٹے چھوٹے واقعات کو بھی بڑے غور کی نظر سے دیکھتا ہو۔ اور ان سے بڑے بڑے نتائج نکال لیتا ہو۔ گردوپیش کی دنیا سے واقف ہونے کا شوق رکھتا ہو۔ اس کی اچھی چیزوں کی دل سے قدر کرتا ہو اور ان کے متعلق بے تکلف اظہار کرنے میں کوئی شرح مانع نہ ہو۔ ناگوار اور تکلیف دہ واقعات سے ناگواری محسوس کرتا ہو اور اس کے اظہار میں بھی وہ کسی تکلف سے کام نہ لیتا ہو۔"[1]

مندرجہ بالا تمام خصوصیات آغا صاحب میں موجود تھیں۔ جن سے انہوں نے اپنی آپ بیتی میں بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ اور ان خصوصیات نے فن آپ بیتی میں سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

سوانح نگاری اور شورش

فن سوانح نگاری میں جن چار بنیادی عناصر کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ اُن میں صداقت اور غیر جانبداری کو اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ جزئیات میں داخلی اور باطنی تصویر کا ہونا یا کتاب کا ادبی اور جامع ہونا بعد کی چیزیں ہیں۔ آغا شورش کاشمیری نے فن سوانح نگاری کے اس اصول کی پوری پابندی کی ہے کہ سچائی اور حقیقت کا دامن نہیں چھوڑا۔ جہاں جہاں کوئی روایت نقل ہوئی اس کا تعلق واقعات سے حقیقی طور پر جڑا ہوا نظر آتا ہے۔ واقعات کی صحت اور سچائی کو برقرار رکھنے میں آغا صاحب کو اس لئے بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ انہوں نے جن جن شخصیات پر لکھا ہے۔ وُہ سب کے سب آغا صاحب کے ہم عصر ہیں۔ اکثر شخصیات سے آغا صاحب کے ذاتی تعلقات تھے۔ وُہ ان کی زندگی کو اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر بھی بہتر طور پر سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ ان شخصیات کا زمانہ اور ماحول اور اس کا پس منظر بھی وہی ہے۔ جس میں خود آغا صاحب نے زندگی بسر کی۔ لہذا حالات اور ماحول کی ترجمانی تک میں بھی حقیقت اور صداقت کو برقرار رکھا گیا ہے۔

آغا صاحب نے تین مکمل سوانح عمریاں لکھی ہیں۔ ایک سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسری مولانا ظفر علی خان کی جو شائع ہو چکی ہیں۔ تیسری مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح حیات ہے جو ابھی شائع نہیں ہوئی اس طرح "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" اور "مولانا ظفر علی خان"، آغا صاحب کی دو مطبوعہ سوانح عمریاں ہیں۔ جن کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں

---

[1] آپ بیتی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی پیش لفظ سید ابوالحسن علی ندوی ص نمبر ے

نے مختلف شخصیات پر لکھا ہے۔ جن میں حمید نظامی۔ حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین شامل ہیں۔
"نورتن" جس میں لاہور کے نو صحافیوں کے متعلق لکھا ہے۔ سبھاش چندر بوس اور تحریک آزادی کے بہت سے دوسرے چھوٹے اور بڑے رہنماؤں کا اپنی مختلف کتابوں میں ضمنی طور پر ذکر کیا ہے۔ تقریباً تمام لوگ آغا صاحب کے ہم عصر تھے۔ اور انہوں نے بھی کسی نہ کسی عنوان سے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا۔ اور بعض لوگ تو خود آغا صاحب کے ساتھی اور سیاسی میدان کے ہم راہی تھے۔ لہذا انہوں نے ملک میں چلنے والی تحریکوں سے متعلق اپنا مواد تاریخ یا روایت سے بہت کم لیا ہے اور شخصیات کے سیرت و کردار کے بیان میں بھی بہت کم روایت یا قصہ کہانی کا دخل ہے۔ لہذا آغا صاحب نے شخصیت کے مطالعہ میں اپنے ذاتی تجربات اور ذاتی مشاہدہ کو غیر جانبداری کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ شخصیات کے مرقعے ذی روح انسان معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ شورش صاحب نے صداقت اور سچائی سے کام لے کر حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ افراد و شخصیات کے سیرت و کردار کی عکاسی بڑی خوبصورت اور فن کارانہ انداز میں کی ہے۔

اس سلسلے میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سچائی اور صداقت کی حدود متعین کی جائیں ڈاکٹر سید عبداللہ اس سلسلے میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ

> "خود نوشت یا سوانح عمری میں سچ کی تعریف اور حدود کیا ہیں؟ ادب میں جدید ذوق سچ میں زندگی کی کُل حالتوں کو شامل کرتا ہے۔ ان کو بھی جنہیں انسان چھپانے کے عادی ہیں۔ اور اُن کو بھی جنہیں ظاہر کیا جاتا ہے۔ تو کیا سوانح عمری میں شب و روز کے چوبیس گھنٹوں کی ہر فعل و حرکت۔ ہر سانس اور ہر انگڑائی کا ذکر آنا چاہیے؟ اسے برستان خیال یا طلسم ہوش ربا بن جانا چاہیے یا محض اہم واقعات کی خود نوشت ہی رہنا چاہیے۔ جدید ذوق کا فتویٰ ہے کہ سب کچھ آنا چاہیے مگر فن کا تقاضا یہ ہے کہ انتخابیت سے کام لیا جائے یعنی صرف ان جزئیات کو پیش کرنا چاہیے جن کے اظہار پر مصنف خود کو "مجبور" پاتا ہے۔ بس یہی ایک معیار سچ کا ہے اور اسی معیار کی حدود میں واقعات کا انتخاب ہونا چاہیے۔"[۵۷]

---

[۵۷] ہفت روزہ چٹان ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ے

اِس طرح اگر ہم دیکھیں تو آغا صاحب نے سیج کے اس معیار کو برقرار رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی تحریر کردہ سوانح عمریوں کو بوستان خیال یا طلسم ہوش ربا نہیں بننے دیا۔ بلکہ انہوں نے واقعات کے انتخاب میں بڑی فن کاری کا ثبوت دیا ہے اور پھر یہ واقعات اپنے ماحول کے چوکھٹے میں جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جہاں تک اِس بات کا تعلق ہے کہ وہ کن باتوں کے اظہار پر "مجبور" تھے یہ باتیں ہمیں ان کی سوانح عمریوں میں ملتی ہیں۔ لیکن کیوں "مجبور" ہوئے اِس بات کو سمجھنے کیلئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ شورش کاشمیری اور ان شخصیتوں میں کون سی باتیں مشترک تھیں۔ انسان عموماً انہی باتوں کو پسند کرتا ہے جس کا میلان اُس کی اپنی شخصیت کے مطابق ہو۔ یہ بات اسی وجہ سے اہمیت کی حامل ہے کہ مصنف کو اُس شخصیت کے ساتھ کوئی لگاؤ یا محبت یا عقیدت یا ہمدردی ہو۔ اس سلسلے میں آغا صاحب کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی سے لگاؤ اور محبت رکھتے تھے۔ بلکہ ان دونوں شخصیتوں کے شاگرد تھے۔ اُن کی نگرانی میں تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ سیاست میں کام کئے۔ جلوس نکالے جلسے کئے۔ گرفتار ہوئے۔ جیل کاٹی۔ ان کی خوبیوں کو اپنایا اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا۔ اور پھر ان کی سوانح عمریاں بھی لکھیں۔ اس سلسلے میں بعض مماثلتیں ان دونوں شخصیتوں میں بھی پائی جاتی ہیں —— مثلاً

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان دونوں خطیب تھے۔ دونوں تحریک آزادی کے عوامی رہنما تھے۔ دونوں شاعر تھے۔ دونوں انگریز کے دشمن اور اسلام کے شیدائی تھے۔ دونوں محاسبۂ قادیانیت میں بڑے پرجوش تھے۔ دونوں بے خوف بہادر اور غیور تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اگرچہ صحافی اور ادیب نہ تھے۔ لیکن ادب اور صحافت سے انہیں گہرا تعلق رہا۔ غرض دونوں رہنماؤں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں اور یہی تمام اوصاف یعنی ادیب۔ خطیب۔ صحافی۔ سیاستدان اور شاعر آغا صاحب میں بھی موجود تھے۔ لہٰذا اسی مماثلت کی بنا پر وہ سوانح عمریاں لکھنے میں کامیاب ہوئے اور یہی مماثلتیں آغا صاحب کو "مجبور" کرتی تھیں کہ وہ اُن واقعات کا انتخاب کریں جن میں خود ان کی تسکین کے سامان بھی موجود ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں سوانح عمریوں میں آغا صاحب نے ان ہی صفات اور واقعات کا انتخاب کیا ہے۔ جن میں آزادی۔ بہادری خود اعتمادی۔ جوش و جذبہ۔ قید و بند۔ حب الوطنی اور بیباکی کی کوئی نہ کوئی جھلک پائی جاتی تھی۔ اور صفات و واقعات کے اِس انتخاب نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان کی سیرت کی تعمیر میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم خان صاحب نے باسول کے حوالے سے لکھا ہے کہ

"آزادی۔ علو ہمتی۔ خود اعتمادی اور جوش انسان کی سیرت کے بہت سے گوشوں کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اور کردار کا اہم جزو بن جاتے ہیں" [1]

یہ آزادی۔ بلند ہمتی۔ خود اعتمادی اور جوش تو خود ان دو شخصیتوں کے وہ نمایاں اوصاف ہیں جنہیں تلاش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ آغا صاحب نے اس آسانی سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مولانا ظفر علی خان اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سیرت کی عکاسی میں فن کے اصولوں کی پابندی کی ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

آغا صاحب نے یہ سوانح عمری شاہ جی کی زندگی میں تحریر کی۔ انہوں نے اس سلسلے میں شاہ جی سے رجوع کیا تو جواب ملا کہ

"صد بیاباں بگزشت و دگرے در پیش است — اس سارے سفر کا حاصل ہے لگاتار چالیس برس لوگوں کو قرآن سنایا۔ پہاڑوں کو سناتا تو عجب نہ تھا کہ ان کی سنگینی کے دل چھوٹ جاتے۔ تاروں سے ہم کلام ہوتا تو جھوم اٹھتے۔ چٹانوں کو جھنجھوڑتا تو چلنے لگتیں۔ سمندروں سے مخاطب ہوتا تو ہمیشہ کیلئے طوفان بکنار ہو جاتے۔ درختوں کو پکارتا تو وہ دوڑنے لگتے۔ کنکریوں سے کہتا تو وہ لبیک کہہ اٹھتیں۔ صرصر سے گویا ہوتا تو وہ صبا ہو جاتی۔ دھرتی کو سناتا تو اس کے سینے میں بڑے بڑے شگاف پڑ جاتے۔ جنگل لہرانے لگتے۔ صحرا سر سبز ہو جاتے افسوس میں نے ان لوگوں میں معروضات کا بیج بویا جنکی زمینیں ہمیشہ کیلئے بنجر ہو چکی تھیں۔ جنکے ضمیر قتل ہو چکے تھے جن کے ہاں دل و دماغ کا قحط تھا۔ جن کی بستیاں انتہائی خطرناک تھیں۔ جو برف کی طرح ٹھنڈے تھے جن میں ٹھہرنا المناک اور جن سے گزر جانا طرب ناک تھا۔ جن کے سب سے بڑے معبود کا نام طاقت تھا جو صرف طاقت کی پوجا کرتے تھے تیرہ سو برس کی تاریخ انہی حادثوں

---

[1] نگار پاکستان سالنامہ ۱۹۶۶ء مضمون سوانح نگاری کیا ہے از ڈاکٹر عبدالقیوم ص نمبر ۲۵۳

کی کہانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میاں بابو ڈھونڈھ
سکتے ہو تو ان افکار میں میری سوانح عمری کی بنیادیں ڈھونڈ لو۔[1]

اس طرح شاہ جی نے قوم کی بے حسی اور غفلت شعاری کو خطیبانہ انداز میں موردِ الزام ٹھہرا کر آغا صاحب سے تعاون کرنے سے انکار کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ جی بھی مولانا ابوالکلام کی طرح یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سوانح عمری لکھی ہی نہیں جا سکتی مولانا ابوالکلام آزاد بھی اسی قسم کے اشارے کر کے دامن بچاتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"جتنی زندگی گزر چکی ہے گردن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمودِ غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوۂ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز اور نگہ گم گشتۂ حیرانِ اظہار و تعبیر۔ اپنی سرگزشت و روداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمود غبار و جلوہ سراب کی تاریخ حیات قلمبند ہو تو کیونکر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے طوفان نے درخت گرا دیئے۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن کر تنکے جمع کئے۔ خرمن و برق کا معاملہ آتش و خس کا افسانہ۔ ان سب کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں تو لکھ لیجئے۔ میری پوری الخبری انہی میں مل جائے گی۔"[2]

گویا شاہ جی نے بھی مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح اپنی زندگی کے متعلق صرف چند اشارے کئے ہیں جن کو بنیاد بنا کر ان کی سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی تھی۔ لیکن آغا صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور شاہ جی کے سوانح لکھنے شروع کئے۔ کیونکہ شاہ جی کی سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح آغا صاحب کے سامنے تھی تاہم شاہ جی کی نجی اور ابتدائی زندگی سے متعلق زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس سوانح عمری کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تو ایک قسم کی تشنگی کا

1۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ — شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۱ / ۲۲

2۔ تذکرہ — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۲۸۴ / ۲۸۵

احساس ضرور پیدا ہوتا تھا۔ لیکن شاہ جی کی وفات کے بعد آغا صاحب نے شاہ جی کے اہل خانہ کی مدد سے دوسرے ایڈیشن میں اس تشنگی کو بھی دور کر دیا اور شاہ جی کی زندگی کے بعض حقائق کو جو اخفا میں تھے ظاہر ہو گئے۔ اس طرح اب یہ دوسری اشاعت میں ایک مکمل سوانح عمری ہے۔

سید عطاء اللہ شاہ کی زندگی ایک عوامی خطیب کی زندگی ہے۔ جسے پوری طرح سمجھنے کیلئے فن خطابت کے اسرار و رموز کا جاننا ضروری ہے کیونکہ بقول علامہ ابن خلدون

"علم خطابت کے اقوال محض اقناعی ہوتے ہیں۔ جو عوام کو کسی رائے کی طرف مائل کرنے کیلئے یا اس سے روکنے کیلئے مفید ہوتے ہیں" [1]

گویا خطیب حالات کے مطابق عوام کو کسی بات کی ترغیب دیتا ہے یا منع کرتا ہے تو اس بات کا انحصار دراصل حالات و واقعات کی انتادیر ہوتا ہے ظاہر ہے کہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ اقوال کا تبدیل ہو جانا بھی بڑا ضروری ہے۔ لہذا جو بات جس پس منظر اور ماحول میں کہی گئی ہے جب تک اس کو ان ہی حالات کے مطابق نہیں دیکھا جائے گا نتائج درست نہیں ہو سکتے آغا صاحب نے اس مشکل پر اس طرح قابو پایا ہے کہ وہ خود خطیب تھے۔ اور فن خطابت کے اسرار و رموز سے آشنا اور جانتے تھے۔ کہ شاہ جی نے جو باتیں خطابت کے ذریعہ کہی ہیں اُن کے معنی اس وقت کیا تھے اور بعد کو لوگوں نے حالات بدل جانے کے بعد کیا معنی اخذ کرنے شروع کر دیئے ہیں۔ لہذا آغا صاحب نے شاہ جی کے اقوال کو ان ہی معنوں میں بیان کیا ہے۔ جو اُس وقت حالات کے مطابق تھے۔ یہ کوئی اجتہاد یا معنی آفرینی یا مطالب کی ایجاد نہیں بلکہ حالات کے سلسلے اس طرح مربوط کئے گئے ہیں کہ شاہ جی کی باتوں کے ٹھیک ٹھیک مفہوم سمجھ میں آجاتے ہیں۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پاکستان کے مخالف تھے تو یہ بات اس لئے غلط ہو گی کہ اس وقت تو پاکستان ابھی معرض وجود میں بھی نہیں آیا تھا لہذا جس چیز کا وجود نہ ہو اس کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر اسی بات کو اس طرح بیان کیا جائے کہ تحریک آزادی میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری

---

[1] مقدمہ ابن خلدون حصہ اول علامہ عبدالرحمٰن ابن خلدون ص نمبر ۲۲۳
ترجمہ مولانا راغب رحمانی دہلوی نفیس اکیڈمی کراچی

مسلم لیگ کی سیاست سے اختلاف رکھتے تھے تو یہ بات درست ہو گی۔ کیونکہ اگر پسِ منظر اور اس ماحول کا اندازہ کیا جائے جس کا پس منظر اور ماحول میں یہ اختلاف ہوا تو ہمیں ہندوستان کی سیاست میں آزادی کے متعلق مختلف آراء سے واسطہ پڑے گا جس میں ایک رائے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی بھی تھی۔ غرض آغا شورش کاشمیری نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زندگی کو اسی ماحول اور پس منظر میں پیش کیا ہے۔ جس ماحول میں انہوں نے زندگی گزاری تھی۔ اس سلسلے میں جن جزئیات کا ذکر ہوا ہے اور جن واقعات کی مرقع نگاری کی گئی ہے اُن کا تعلق کسی نہ کسی طرح شاہ جی کی زندگی سے ہے جس کی بنا پر ہم اس سوانح عمری کو اُن کی زندگی کی ہو بہو تصویر بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ جی ایک درویش منش انسان تھے۔ لیکن ان کی درویشی ایک سادہ اور غیور انسان کی وہ ادا ہے۔ جو امراء و حکومت کو پاؤں کی ٹھوکر میں رکھتے ہیں۔ لیکن بے کسوں، مظلوموں اور درماندہ انسانوں کیلئے سراپا شفقت و محبت ہوتے ہیں شاہ کی درویشی مردم بیزاری اور خلوت نشینی نہیں بلکہ اُن کی درویشی انسان دوستی اور جلوت نشینی ہے۔ وہ ایک عوامی رہنما تھے اور عوام میں رہے۔ عوام کے ساتھ اُن کے روابط تعلقات، حسن سلوک، شفقت اور محبت وہ خواص ہیں جنہیں آغا صاحب نے اُن کی سوانح عمری میں زیادہ اہمیت دی ہے۔

مذہب سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو بڑا لگاؤ تھا۔ اُن کی زندگی اسلام اور انسان دونوں سے محبت کا مرقع ہے لیکن وہ زاہدِ خشک نہ تھے۔ بلکہ وہ ہمیں ایک بذلہ سنج۔ نکتہ داں۔ ہنسنے ہنسانے اور رونے رلانے والے خطیب اور انسان نظر آتے ہیں۔ جو زندہ رہنا بھی جانتے ہیں۔ اور دوسروں کو زندہ رہنے کا سلیقہ بھی بتاتے ہیں۔ بہر حال آغا صاحب نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی سوانح عمری میں ہمیں وہ سب کچھ بتایا ہے جو شاہ جی کی زندگی میں موجود تھا۔

شاہ جی چونکہ عوامی رہنما تھے اور عوام کے ساتھ اُن کا رابطہ ہر وقت رہتا تھا۔ اور ہر کوئی بھی شخص کسی بھی وقت اُن سے مل سکتا تھا۔ لہٰذا ایسے انسانوں کے متعلق ہر آدمی کی اپنی رائے بھی ہوتی ہے۔ جو جس حالت میں ملا ایک دائمی تاثر لے گیا اور اب وہ اپنے تاثر کو جو اگرچہ حقیقی ہے اس طرح عام کرتا ہے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں۔ اس طرح بہت سے حقیقی تاثرات مختلف قسم کی روایتوں میں بدلتے ہوئے قصے اور افسانے بن گئے جو بات جس نے سن کر آگے بیان کی اُس میں اپنی عقیدت کا رنگ بھی شامل کر دیا۔ اس طرح حقیقت کچھ سے کچھ روپ اختیار کر گئی۔ آغا صاحب نے ان حکایتوں

اور روایتوں کو زیادہ اہمیت نہیں دی اور ناگزیر واقعات کو نظر انداز بھی نہیں ہونے دیا۔

لوگوں نے بعض باتیں شاہ جی سے سیاسی اختلاف کی وجہ سے مشہور کر رکھی ہیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے اس سلسلے کی ایک مثال "آوازِ دوست" کے مصنف جناب مختار مسعود ہیں۔ جنہوں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ایک آٹوگراف حاصل کر لیا۔ اور اس کی بنیاد پر ایک ملاقات کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے۔ جس کے پس منظر میں احرار دشمنی اور حکومت نوازی کو دخل ہے وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"جب میں ملتان میں تعینات ہوا تو ضلع کے اہم افراد کی ایک فہرست پیش ہوئی۔ اس میں سرکردہ افراد بھی تھے اور سرکش اشخاص بھی۔ بڑے سے بڑے ٹوڈی سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے باغی کا نام درج تھا۔ ایک نام دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا یہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام تھا۔"[1]

اس کے بعد جناب مختار مسعود نے شاہ جی کے ساتھ ملاقات کا ایک واقعہ نقل کیا ہے اور آخر میں شاہ جی سے یہ سوال پوچھا ہے کہ

"اگر قیامت کے دن آپ سے پوچھا گیا کہ اے وہ شخص جسے بیان و کلام میں چالیس کروڑ افراد پر فوقیت دی گئی تھی اُس خطابت کا حساب پیش کرو تو آپ ناکام تحریکوں کے علاوہ کیا پیش کریں گے۔ اس سوال کی دوسری شکل یہ تھی کہ آپ نے اپنی جدوجہد کا انجام دیکھ لیا۔ اب اگر زمانہ چالیس برس پیچھے لوٹ جائے تو آپ اپنی خطابت اور طاقت کا دوبارہ وہی استعمال کریں گے یا آپکی زندگی بالکل نئی ہوگی۔ شاہ جی یکا یک خاموش ہو گئے۔ اس کی خاموشی میں ایک آزردگی بھی شامل تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا۔"[2]

عبارت کے مضمرات سے قطع نظر سب سے پہلے اس واقعہ کی حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں تک اس ملاقات کا تعلق ہے

---

[1] آوازِ دوست — مختار مسعود — ص نمبر ۱۴۷ — ۱۵۴ — مکتبہ جدید پریس لاہور

[2] آوازِ دوست — " — ص نمبر ۱۴۷ — ۱۵۴

اِس کے متعلق سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے بیٹے سید عطاء المومن نے فیصل آباد میں یوم امیرِ شریعت[۱] کے ایک جلسے میں جس میں شہر کے جید علماء کے علاوہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کے ساتھ راقم الحروف بھی موجود تھا یہ کہا کہ جناب مختار مسعود نے "دروغ گوئی اور الزام تراشی" سے کام لیا ہے انہوں نے کہا جہاں اس ملاقات کا تعلق ہے۔ یہ ملاقات ہوئی تھی۔ اور اِس ملاقات میں کچھ اور لوگ بھی شامل تھے جو ابھی زندہ ہیں اور اِس واقعہ کے گواہ ہیں اور اب بھی اس بات کی شہادت دے سکتے ہیں کہ اِس ملاقات کا مقصد حکومت کی طرف سے یہ پیشکش تھی کہ دو مربع زمین مع ٹیوب ویل شاہ جی کی خدمت میں پیش کی جائے۔ لیکن ملتان کے یہ ڈپٹی کمشنر صاحب شاہ جی کے جواب سے شرمندہ ہوئے اور اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔ شاہ جی کا جواب تھا کہ

"میں نے تو آپکو شریف انسان سمجھ کر ملاقات کی تھی"۔

اب اگر اس عبارت پر غور کیا جائے۔ تو اس کی صورت یہ ہے کہ جناب مختار مسعود صاحب جب ملتان میں تعینات ہوئے تو ان کے سامنے کچھ افراد کی فہرست پیش ہوئی۔ جس میں سرکردہ۔ سرکش۔ بڑے بڑے ٹوڈیوں اور چھوٹے چھوٹے باغیوں کے نام شامل تھے اور اِس فہرست میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نام بھی شامل تھا۔ جسے دیکھ کر مختار مسعود صاحب "ٹھٹھک" گئے۔ اس لئے کہ شاہ جی کا نام سرکشوں۔ ٹوڈیوں اور باغیوں کی فہرست میں ہوگا۔ قطع نظر اس سے کہ حکومت شاہ جی کو کیا سمجھتی تھی۔ مختار مسعود صاحب نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ شاہ جی کا نام خلاف توقع واقع تھا۔ اسی لئے وہ ٹھٹھک گئے۔ حالانکہ انھوں نے یہ لفظ صرف چونکانے کیلئے استعمال کیا ہے۔ کہ شاہ جی جیسا انسان بھی ایسا ہو سکتا ہے اور اس کے بعد ایک پرانا اور بہت ہی بودا سوال اٹھایا ہے۔ جس کا جواب شاہ جی نے پاکستان بننے کے بعد لاکھوں کے مجمعوں میں بھی دیا تھا۔ اور عام زندگی میں بھی کہ تقسیم کے سلسلے میں احرار کو شکست ہوئی ہے۔ لیکن جہاں تک چالیس سال پیچھے جانے کا سوال ہے۔ تو یقیناً چالیس سال پہلے کے حالات بھی وہی ہونگے۔ جن کے مطابق سید عطاء اللہ شاہ بخاری وہی فیصلہ کرتے جو انہوں نے کیا تھا۔ باقی رہی ناکام تحریکوں کی بات۔ تو یہ ایک واضح تعصب کے علاوہ کچھ نہیں۔ کیا ہندوستان میں چلنے والی آزادی کی مختلف تحریکیں

۱؎ یہ جلسہ ۱۵۔ ستمبر ۱۹۸۵ء کو ڈسٹرکٹ کونسل ہال فیصل آباد میں منعقد ہوا۔

جن میں مسلم لیگ کے بھی تقریباً سبھی رہنما شامل تھے۔ ناکام تھیں؟ کیا اِن تحریکوں نے ہندوستان کو آزادی دلانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا؟ کیا مسلم لیگ کے سرمایہ داروں، سرمروں، لوڈیروں اور کاسہ لیسوں نے فوراً توجہ کر کے آزادی حاصل کرلی؟ کیا اس لئے انہوں نے اپنا رویہ بدلا اور آزادی کیلئے جدوجہد کی کہ احرار کی ساری تحریکیں جنہیں ناکام کہا جاتا ہے۔ آزادی کیلئے نہ تھیں اور اگر آزادی کیلئے تھیں تو کیا آزادی نہیں ملی۔ اگر ملی ہے تو یہ تحریکیں ناکام کیسے ہوگئیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مختار مسعود صاحب بطور ایک سرکاری آفیسر کے انگریزی ماحول کے پروردہ ہیں اور احرار انگریز دشمن جماعت اس لئے وہ اپنے علم و فضل کے باوجود اُس تعصب کی زد میں آگئے ہیں جو انگریز پرستوں کا ہمیشہ شعار رہا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر کوئی تحریک چلائی جائے تو اس کے اثرات مختلف صورتوں میں ہوتے ہیں۔ وہ تحریک اگر کامیاب نہ بھی ہو مگر کامیابی کے راستے ضرور ہموار ہوجاتے ہیں۔ جس پر آنے والے سفر کر کے منزل کو پالیتے ہیں۔ احرار نے ہندوستان میں مختلف تحریکیں چلائیں۔ وہ کامیاب نہیں ہوئیں۔ مگر ان تحریکوں نے آزادی کی تڑپ ضرور پیدا کی۔ انگریز اور اس کے حواریوں کو قوم کی نظر میں بے وقعت اور رسوا کر دیا۔ کہ آزادی کے راستے کا سب سے بڑا پتھر تھے۔ لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کیا۔ غریبوں کو ابھارا کہ جدوجہد آزادی کی اصل روح تھے۔

احرار نے مرزائیت کے محاسبے کی تحریک شروع کی۔ مرزائی اقلیت قرار نہ پاتے کیا یہ تحریک ناکام ہوگئی یقیناً اس وقت یہ تحریک دبادی گئی یا ناکام ہوگئی مگر وہ راستہ جو منزل کی طرف جاتا تھا۔ معیّن ہوچکا تھا لہٰذا بعد کو چلنے والوں نے منزل کو پالیا۔ جناب مختار مسعود شاید مسلم لیگ کی کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کامیابی کے پیچھے بھی بہت سی ناکامیاں مل سکتی ہیں۔ اور پھر آزادی کی تاریخ ایک زنجیر ہے۔ جس طرح کسی ایک کڑی کو نکال دینے سے خلا پیدا ہوگا اور ربط ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح آزادی کی تحریک میں سبھی تحریکیں شامل ہیں۔ خواہ وہ ناکام تھیں یا کامیاب۔ آغا صاحب نے "سید عطاء اللہ شاہ بخاری" میں اس بات کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ وہ جناب مختار مسعود کی طرح کسی تعصب کا شکار نہیں ہوتے۔ انہوں نے احرار کی قربانیوں اور احرار کی خامیوں کا برملا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے جہاں احرار کی تحریکوں کا ذکر کیا ہے وہاں مسلم لیگ کی کوششوں کو بھی سراہا ہے۔ اُن کے نزدیک

وہ (مسلم) لیگ کے دولت مند اکابر ان کی (احرار) غریبی پر طعن توڑتے اور انہیں ہندوؤں

کا زرخرید غلام کہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک سچا دل گالیوں کی اجتماعی یلغار سے بگڑے گا پھر برانگیختہ اس صورت میں اور بھی مضبوط ہوتا ہے جب گالی دینے والا خود گالی ہو اور الزام لگانے والا فی نفسہٖ الزام ہو۔ احرار نے کس مپرسی۔ غصّے۔ جھنجھلاہٹ اور ضد میں پاکستان کے ملّی موقف کی اہمیت کو نظرانداز کر کے نہ صرف لیگ کے رہنماؤں سے محاذ جنگ قائم کیا بلکہ اِس وقت انتخابات میں کود پڑے جب قومی مستقبل کے سوال پر محض انتخاب ہی نہیں استصواب ہو رہا تھا۔ [1]

اِس کے بعد آغا صاحب نے مجلس احرار کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اِس میں "تحریکوں کی ناکامی" کا جواب بھی آجاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں

"تاہم ایک مورخ واقعات کی چھان پھٹک کے بعد اس نتیجہ پر ضرور پہنچتا ہے کہ احرار نے جس ذہن کی آبیاری کی اس کی بہت سی شاخیں ثمرآور ہوئیں مثلاً"

۱۔ مسلمان نوجوانوں کی ایک بڑی جماعت میں خلاف سامراج ذہن پیدا کیا جو پختہ ہو کر ان کی فطرت ہو گیا اس سے متاثر ہونے والے زیادہ تر درمیانے درجے کے مفلوک الحال لوگ تھے

۲۔ غریبوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کی جس کا ذہن مسلمان امراء کے استحصالات سے برافروختہ ہو کر طبقاتی شعور کی راہ پر آگیا اس جماعت کا وجود بازار سیاست میں خرید و فروخت سے ہمیشہ ماوریٰ رہا۔

۳۔ مسلمانوں میں فعال سیاسی کارکنوں کی ایک کھیپ پیدا ہو گئی جس کا عام حالات میں قحط تھا۔

۴۔ مسلمانوں میں اچھے مقرروں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جس نے ذہنی انقلاب کی آبیاری میں قابل قدر حصہ لیا۔

۵۔ عام لوگوں کی چھٹی میں سے استحصالی لوگوں کا خوف جاتا رہا غربا میں احساس خودی توانا ہونے لگا۔

---

[1] سید عطاء اللہ شاہ بخاری　　شورش کاشمیری　　ص نمبر ۱۱۶

۶۔ مسلمانوں میں پہلے کی بہ نسبت کئی سو گنا بدعات کا خاتمہ ہو گیا۔ اور وہ بعض معاشرتی گمراہیوں سے بچ نکلے۔

بعض تھڑدلے سیاستدان اس طبقاتی ذہن کو احرار کا پیدا کیا ہوا ذہن تسلیم کرنے سے شاید ہچکچائیں۔ یوں بھی تاریخ شکست خوردہ لوگوں سے کبھی انصاف نہیں کرتی لیکن یہ ذہن (بغیر نام) بہرحال پاکستان کے مستقبل کا ذہن ہے اور دنیا کے ضمیر میں یہ ہیجان برپا ہو چکا ہے کہ سرمایہ داری کا نظام ختم ہونا چاہیے، دولت کی غلط تقسیم نے کروڑوں انسانوں کو ایک طرف مفلوج دوسری طرف مشتعل کر رکھا ہے۔[۱]

غرض آغا صاحب نے سید عطاءاللہ شاہ کی زندگی اور ماحول کے حوالے سے ایک غیر جانبدار حیثیت سے مورخ کی طرح وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جس سے شاہ جی کی زندگی عبارت تھی۔ اس لحاظ سے یہ ایک مکمل اور کامیاب سوانح عمری ہے۔

اسی طرح انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی سوانح عمری میں فنی باریکیوں کا خیال رکھا ہے۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور مولانا ظفر علی خان دونوں کی جدوجہد کا میدان ایک ہی تھا لہٰذا حالات و واقعات کا پس منظر وہی ہے لیکن شخصیت کے بدل جانے سے خود ماحول میں بھی تبدیلی محسوس ہوتی ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے تحریک آزادی میں اپنی صحافت سے بڑا جوش و جذبہ پیدا کیا تھا جس میں مولانا کی سیاسی شاعری کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اس کتاب میں آغا شورش کاشمیری نے مولانا کی صحافت اور مولانا کی سیاسی شاعری پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ صرف شورش صاحب ہی کا حصہ ہے۔ آغا صاحب ادیب اور شاعر ضرور تھے مگر باقاعدہ نقاد نہ تھے۔ لیکن انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی شاعری۔ اُن کی بدیہہ گوئی اور ہجوگوئی پر جس فنکارانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے اس سے جہاں مولانا ظفر علی خان کی شاعری کی نئی جہتیں، نئے زاویے اور نئے پہلو سامنے آتے ہیں وہاں آغا صاحب کے تنقیدی شعور کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہاں پر بھی آغا صاحب نے مولانا ظفر علی خان کی رفاقت اور "زمیندار" کے مطالعے سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی مختلف نظموں کا جو پس منظر

۱؎ سید عطاءاللہ شاہ بخاری — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۲۱ / ۱۲۲

بتایا ہے اور اشعار کہنے کی وجہ اور موقع و محل کی نشان دہی کی ہے ایک عام مصنف یا نقاد کے بس کی بات نہ تھی۔ آغا صاحب چونکہ اس سارے ماحول اور واقعات کے خود ایک جزو تھے۔ اور پھر ایک قوی حافظہ بھی رکھتے تھے۔ لہذا انہوں نے ان واقعات کی جزئیات تک قلم بند کر دی ہیں اور مولانا کی شاعرانہ معرکہ آرائی اور ادبی ہنگاموں میں گھن گرج پیدا کر دی ہے۔ جو مولانا ظفر علی خان سے مخصوص ہے۔

آغا شورش کاشمیری کا شمار مولانا ظفر علی خان کے مداحوں میں ہوتا ہے۔ اس بات کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے کہ آغا صاحب اس بات پر بھی حکومتوں سے الجھتے تھے کہ حکومتیں ادنیٰ افراد تک کے یوم مناتی ہیں اور انہیں قومی رہنماؤں کی صف میں شامل کرتی ہیں۔ مگر مولانا ظفر علی خان جیسے حریت پسند کے لئے ان کے ہاں کوئی جگہ نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مولانا ظفر علی خان اکادمی بنائی۔ غرض "چٹان" میں اکثر مولانا ظفر علی خان کا ذکر بڑی عقیدت اور احترام سے کیا کرتے تھے۔ مگر جب انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی زندگی پر قلم اٹھایا تو انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی محبت اور عقیدت کے باوجود مولانا کی بشری غلطیوں کو بھی قلمبند کیا۔ مولانا کا تلون۔ مولانا کی اختر علی خان سے محبت۔ اور اختر علی خان کا مولانا کو ڈھب پر لے آنا۔ اتحاد ملت کے زمانے میں رہنماؤں کا طرز عمل اور مولانا کی جذباتیت کے نقصانات۔ شہید گنج کی تحریک میں مولانا کے طرز عمل کا تجزیہ اور تنقید ایسی باتیں ہیں جو ایک غیر جانبدار مصنف ہی تحریر کر سکتا تھا۔ آغا صاحب نے مولانا ظفر علی خان کی محبت کو فن کی عظمت پر غالب نہیں آنے دیا۔ اس طرح اُن کی مقصدیت نے ان کے فن کو مجروح نہیں کیا

مُرقع نگاری

آغا صاحب نے ان سوانح عمریوں کے علاوہ بہت سی شخصیات کے خاکے بھی تحریر کئے ہیں۔ اور مختلف لوگوں کے چہرے بھی لکھے ہیں۔ اُن کی آپ بیتی میں بھی ہمیں بعض شخصیات کے خاکے ملتے ہیں۔ جہاں تک مرقع نگاری یا خاکہ نویسی کا تعلق ہے۔ یہ بھی سوانح نگاری کی ایک شاخ ہے۔ اس میں بھی سوانح نگاری کے فن کے تمام لوازمات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ آغا صاحب نے جن شخصیات پر قلم اٹھایا ہے۔ وہ سب کی سب کسی نہ کسی طرح آغا صاحب کے دوست۔ ساتھی یا آشنا تھے۔ انہوں نے ان تمام شخصیات پر اپنے ذاتی تعلق کی بنا پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ نہ صرف فنی نقطہ نظر سے بلکہ اُن شخصیات کے سیرت و کردار کے حوالے سے بھی اہمیت کی حامل ہیں۔

جناب حمید نظامی۔ حسین شہید سہروردی۔ میاں افتخار الدین۔ جناب عبدالمجید سالک۔ چراغ حسن حسرت مہاتما کرشن۔ سید حبیب۔ مرتضیٰ احمد میکش۔ اظہر امرتسری۔ ابو صالح اصلاحی۔ مجیبہ لاہوری اور حاجی لق لق کے ساتھ آغا صاحب کا کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا۔ انہوں نے ان تمام احباب کی تصویر کاری میں اس تعلق اور دوستی ہی کو بنیاد بنایا ہے۔ فن مرقع نگاری کے سلسلے میں آغا صاحب لکھتے ہیں کہ

> "آشنا ہستیوں کے بارے میں قلم اٹھانا آسان نہیں پھر مرحومین کے بارے میں یہ کام اور بھی کٹھن ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ مذاق عام ہو گیا ہے۔ کہ بیشتر لوگ مرنے والوں کے حسن و قبح پر بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ مدح پر آتے آئیں تو ان کے محاسن کا رشتہ پیغمبروں سے جا ملاتے ہیں۔ قدح مقصود ہو تو گور و کفن کی چیر پھاڑ بھی اپنے اوپر فرض کر لیتے ہیں۔ میں نے اب تک جو کچھ لکھا مدح و قدح کے اس عام شیوہ سے ہٹ کر لکھا۔ محاسن کو معجزہ قرار نہیں دیا حالانکہ بعض محاسن پر معجزہ ہونے کا گمان بھی ہوتا ہے۔ قبائح کو نشتر نہیں کیا۔ لیکن ناگزیر حقیقتوں کو چھپایا بھی نہیں۔ انسان کی سیرت بہر حال حسن و قبح کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر انسان کی زندگی گنہگار ہو۔ تاہم انسان خطا کار ضرور ہے۔ اس میں کوتاہیاں بھی ہیں اور کمزوریاں

بھی ٹیں نے متاعِ حسن کو اجالنے کیلئے عشق کی آوارگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ نتیجتاً بعض خاکوں میں حسن یار
شہابی سے شرابی ہو گیا ہے۔[۱]

خاکہ نگاری میں مندرجہ بالا باتوں ہی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اور یہ تمام خاکے آغا صاحب کے مقرر کردہ معیار کے ساتھ
ساتھ فنی معیار پر بھی پورے اترتے ہیں۔ خاکہ نگاری میں آغا صاحب نے ان تمام شخصیتوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے۔
اس میں انہوں نے زیادہ ایسی خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے تھا۔ یعنی قومی نقطہ نظر سے ان
شخصیات میں کیا خوبیاں تھیں۔ انہوں نے اگرچہ شخصیات کی ذاتی خوبیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن آغا صاحب
ہمیں اجتماعیت کو انفرادیت پر ترجیح دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جہاں تک افراد کی کمزوریاں دکھانے کا تعلق
ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ

> میں عقیدوں کے معاملہ میں سمجھوتا نہیں کرتا اور نہ ہی اپنے معتقدات ہی کو ترک
> کرتا ہوں۔ لیکن جہاں تک افراد کی ذاتیات کا تعلق ہے۔ جب تک ان میں اجتماعی
> شر نہ ہو مجھے ان سے کوئی تعرض نہیں ہوتا۔"[۲]

اس طرح آغا صاحب صرف اجتماعی شر کے ترجمان ہیں۔ انہوں نے ان خاکوں میں افراد کی ذاتیات سے زیادہ علاقہ نہیں
رکھا۔ اور خاکہ نگاری میں یہ ممکن بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ سوانح کے مقابلے میں اجمالی چیز ہے۔ تاہم آغا صاحب نے ان
خاکوں میں اپنے جاندار قلم سے جان ڈال دی ہے۔ حمید نظامی۔ حسین شہید سہروردی اور میاں افتخار الدین۔ آغا صاحب کی
خاکہ نگاری کے نمائندہ خاکے ہیں۔

اس کے علاوہ آغا صاحب نے چہرہ نویسی اور حلیہ نگاری میں بھی کمال دکھایا ہے۔ اس سلسلے کی کتاب "چہرے" کے نام سے
چھپی ہے۔ جس میں بہت سی شخصیات کے چہرے لکھے گئے ہیں۔ جس طرح فطرت نے چہروں کی شناخت کے لئے امتیازنہ

۱۔ نورتن | شورش کاشمیری | دیباچہ | ص نمبر ۱۵/۱۱

۲۔ ایضاً | | | ص نمبر ۱۲/۱۳

رکھا ہے۔ اِسی طرح آغا صاحب نے بھی ان قلمی تصویروں کے لئے الگ الگ رنگ و روغن استعمال کئے ہیں۔ کیونکہ افراد کے چہرے ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ لہٰذا آغا صاحب بھی ہر فرد کیلئے نئی تشبیہیں۔ نئے الفاظ۔ نئی تراکیب اور نئی جزئیات سے کام لے کر چہرے بناتے ہیں۔ جو اُن لوگوں کیلئے ہرگز اجنبی نہیں ہوتے۔ جنہوں نے اُن لوگوں کو دیکھا ہے جن کے چہرے آغا صاحب نے لکھے ہیں۔ آغا صاحب نے چہرہ نویسی کیلئے صرف روشن چہروں کا انتخاب کیا ہے۔ جو عوام میں رہنماؤں کی صورت میں پہچانے جاتے ہیں۔

تاریخ نویسی

آغا صاحب مورخ نہ تھے لیکن انہوں نے جو کچھ لکھا اُن کا پس منظر ایک تاریخ ہے۔ بیشتر موضوعات تحریک آزادی سے متعلق ہیں۔ اس طرح انہوں نے آپ بیتی۔ سوانح عمریاں۔ خاکے۔ خطوط۔ روزنامچے اور چہرے لکھتے ہوئے اُس زمانے کی تاریخ بھی لکھ دی ہے۔ جس زمانے میں وہ واقعات پیش آئے اور آغا صاحب کا تحریر کا موضوع بنے۔ آغا صاحب کی تصانیف سے ہم تحریک آزادی کی ایک مستند تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ مولانا شبلی تاریخ نویسی کے متعلق لکھتے ہیں کہ

"مورخ کا اصل فرض یہ ہے کہ وہ سادہ واقعہ نگاری سے تجاوز نہ کرنے پائے[۱]"

آغا صاحب نے واقعات کی صحت کا خاص خیال رکھا ہے۔ بلکہ وہ باتیں بھی تحریر میں آگئی ہیں جو ہمیں عام تاریخ کی کتابوں میں نہیں ملتیں۔ آغا صاحب کا اصل موضوع تو شخصیات تھا۔ لیکن انہوں نے شخصیات پر لکھتے ہوئے جن واقعات کا ذکر کیا ہے وہ اگرچہ ضمنی طور پر آئے ہیں مگر سادہ اور حقیقی ہیں۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ جن شخصیات پر لکھا جا رہا تھا۔ وہ خود تاریخ ساز ہستیاں تھیں۔ لہٰذا وہ کارنامے جو انہوں نے انجام دیئے آج تاریخ کا حصہ ہیں۔ اس طرح آغا صاحب نے تاریخ نویسی کا کام بھی کیا۔ لیکن یہ تاریخ جو ہمیں آغا صاحب کی تحریر کردہ کتابوں میں ملتی ہے۔ ایک عہد۔ یا ایک زمانے سے متعلق ہے۔ تاریخ چونکہ ایک ارتقائی عمل ہے اور

۱؎ الفاروق شبلی دیباچہ ص نمبر ۱۵

وحشت سے تہذیب تک انسان کی ترقی کی داستان تاریخ کہلاتی ہے۔"[1]

اس لئے ان معنوں میں آغا صاحب کو تاریخ نویس نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ انہوں نے تاریخ کے ایک دور کو اپنی ادبی تخلیقات میں بند کر دیا ہے۔ جس کے حقیقی اور مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں بلکہ آغا صاحب کی کتابیں دراصل تاریخ کا ایک مستند ماخذ ہیں۔ اس سے تاریخ نویس استفادہ کر سکتے ہیں۔ واقعات کی صحت اور حالات کی انتاد اور افراد کے سیرت و کردار کا حقیقی جائزہ ان کتابوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ صرف ایک عہد کی سیاسی تاریخ جو انسانی تاریخ کا ایک اہم شعبہ ہے اور تاریخ کی باقی تمام شاخیں "سیاسی تاریخ" کے ہم پلّہ نہیں ہو سکتی کیونکہ

"سیاسی تاریخ کے وسیع اسٹیج پر قومیں اپنی تقدیر بناتی نظر آتی ہیں اس لئے آج بھی سیاسی تاریخ سب سے زیادہ دلچسپ اور سب سے زیادہ اہم سمجھی جاتی ہے۔ تاریخ کے دوسرے پہلو سیاسی تاریخ کے پس منظر میں جلوہ دکھاتے نظر آتے ہیں۔ جب تک کسی دور کے سیاسی نظام کو نہیں سمجھا جائے گا۔ اس وقت تک اس دور کے معاشی۔ سماجی۔ فنی اور دستوری تاریخ کو بھی نہیں سمجھا جائے گا۔"[2]

اس طرح آغا صاحب کی تصانیف ایک اہم تاریخی دستاویز بن جاتی ہیں۔ جن میں ہمیں جہاں بہادری کے کارنامے شان و شوکت کے مظاہر۔ خون ریزیاں۔ بلوے اور قید و بند کے ہنگامے برپا ہوتے نظر آتے ہیں۔ وہاں قوم کی تقدیر بنتی اور سنورتی ہوئی بھی نظر آتی ہے

---

[1] جگ بیتی پنڈت نہرو حصہ اوّل ترجمہ محمود علی خاں جامی ص نمبر ۱۲/۱۳ مکتبہ جامعہ دہلی

[2] تاریخ کے نظریات ڈاکٹر مبارک علی ص نمبر ۱۰/۱۱

اور اگر دیکھا جائے تو آغا صاحب کا ان موضوعات پر قلم اُٹھانے کا مقصد بھی یہی تھا۔ کہ وہ تحریک آزادی کی عظمت۔ آزادی کی قدر و قیمت۔ آزادی کے لئے کی جانے والی جد و جہد۔ حریت پسندوں کی شان و شوکت۔ سچائی اور انصاف کے لئے قربانی و ایثار کی دعوت۔ باطل قوتوں سے ٹکرانے کی جرأت و قوت اور اُن سنہری کارناموں کو نئی نسل تک پہنچانا چاہتے تھے۔ جو اسلاف کا شرف اور قوم و ملت کا افتخار ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح عمری کے فنی اصولوں کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ سب اصول اپنی جگہ درست ہیں مگر میں خود نوشت (بلکہ ہر قسم کی سوانح عمری) کے لئے اس بات پر اصرار کرتا ہوں کہ اس قسم کی تصانیف میں اپنی سوسائٹی بلکہ پوری نسل انسانی کے لئے کوئی معنی ہونا چاہئے۔ اور معنی سے میرا مطلب یہ ہے کہ شخصی خود نوشت (یا سوانح عمری) کسی ایسی جد و جہد ہنگامہ کسب کمال یا معرکہ تسخیر عظمت کا تذکرہ ہو جس میں نوع انسانی کی خدمت کیلئے کسی غیر معمولی کارنامے یا قربانی یا مثال کا پہلو نکلتا ہو"[1]

شورش کاشمیری کے سلسلے میں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اُن کی خود نوشت سوانح عمریوں اور شخصی خاکوں تک میں ان اوصاف کی مثالیں عام ملتی ہیں۔ اس لحاظ سے آغا صاحب اردو ادب کے ایک منفرد آپ بیتی نگار۔ سوانح نویس اور خاکہ لکھنے والے ادیب ہیں۔

---

[1] ہفت روزہ چٹان ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۷۳ء مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۷

شورش کی نثر

عام طور پر نثر کو چار قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یعنی بیانیہ انانیتی۔ تاثراتی اور توضیحی۔ آغا صاحب کی نثر کا تعلق ان تمام قسموں سے ہے۔ جناب منظر عباس نقوی صاحب نے ان چاروں اقسام کی تعریف اس طرح کی ہے۔

"توضیحی نثر کے ذیل میں وہ تمام تحریر آجاتی ہیں۔ جس میں کسی خیال کی وضاحت کی جائے یہ تحریر خالص بھی ہو سکتی ہے اور کاروباری بھی...... بیانیہ نثر وہ جس میں کسی واقعہ۔ شے یا شخص کا بیان ہو۔ واقعات اشیاء یا اشخاص کا یہ بیان حقیقی بھی ہو سکتا ہے اور فرضی بھی اسی لئے اس قسم کی نثر کے ذیل میں ایک طرف تاریخ سوانح اور سفرنامے آتے ہیں تو دوسری جانب داستان۔ ناول اور افسانے بھی بیانیہ نثر ہی کا حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ واقعہ نگاری۔ منظر نگاری اور کردار نگاری سب بیانیہ ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔ انانیتی نثر سے مراد وہ نثر ہے جس میں مصنف نے اپنی ذات کا اظہار کیا ہو۔ خود نوشت اور روزنامچے اسی قسم کی نثر کے مظاہر ہیں۔ تاثراتی نثر اس نثر کو کہا جاتا ہے۔ جس کے وسیلے سے کسی مصنف نے اپنے گرد و پیش کے بارے میں اپنے محسوسات اور تاثرات قلمبند کئے ہوں۔"[1]

آغا صاحب کا نثری سرمایہ چونکہ آپ بیتی۔ سوانح عمری۔ سفرنامے۔ روزنامچہ، تاریخ، مرزائیوں کے محاسبہ اور افکار اقبال کی تشریح وغیرہ پر مشتمل ہے۔ لہذا آغا صاحب کی نثر کو نثر کی ان ہی اقسام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

لیکن ان تمام اقسام نثر کو لکھنے کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا بلکہ ہر مصنف اپنی مرضی و منشا کے مطابق جس طرح بھی ممکن ہو اس سے عہدہ برا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ دراصل اسلوب کا مسئلہ ہے۔ جس کا تعلق لکھنے والے کی ذات سے ہوتا ہے۔

آغا صاحب کی یہ تمام نثر اُن کے ذاتی اسلوب کی آئینہ دار ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب کی زندگی اور فن پر مختلف رجحانات کا اثر ہے جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ

"آغا شورش کی ذات میں چار روایتیں جمع ہو گئی تھیں یہ روایتیں برطانوی دور کے آخری ایک

۱۔ نثر نظم اور شعر منظر عباس نقوی ص نمبر ۲۸/ ۲۹ ایجوکیشنل بک ہاؤس علیگڑھ

سو سال میں پختہ ہوئیں اور ہمارے ملک کے ادبی۔ معاشی اور سیاسی کلچر کی علامت بن گئیں یہ روایتیں تھیں۔

۱۔ مصلحت سوز سیاست کی روایت

۲۔ قیادت کے ساتھ علم و ادب کے لزوم کی روایت

۳۔ شعلہ نوائی کی روایت

۴۔ ایک خاص قسم کے جذباتی۔ رومانی اسلوب تحریر کی روایت جسے اُشفتہ بیانی کی روایت بھی کہا جاسکتا ہے۔"[۱]

پہلی تین روایتوں سے قطع نظر جہاں تک چوتھی روایت کا تعلق ہے۔ اس روایت کے سب سے بڑے علمبردار مولانا ابوالکلام آزاد ہیں۔ جن سے آغا صاحب کی عقیدت کسی ثبوت کی محتاج نہیں۔ آغا صاحب نے اس چوتھی روایت کے متعلق کہا ہے کہ

ابوالکلام کی انشا کا فیض ہے شورش

قلم میں تیغ کے آثار پائے جاتے ہیں

اسی بات کو انہوں نے نثر میں اس طرح لکھا ہے

"قومی شخصیتوں میں علم و نظر کے اعتبار سے مجھ پر سب سے زیادہ اثر مولانا ابوالکلام کا ہے۔ جن کی تحریروں نے میرے قلم۔ میرے فکر اور میرے بیان کو غایت متاثر کیا ہے۔"[۲]

مولانا کے علم و نظر کا اثر واقعی شورش پر تھا اور اسے دیکھا بھی جاسکتا ہے آغا صاحب کی کتاب " اُس بازار میں" پر تبصرہ کے ضمن میں بہت سی مثالیں پیش کی جاچکی ہیں۔ کہ کس طرح موسیقی کی تاریخ لکھتے ہوئے آغا صاحب " غبارِ خاطر" کے ایک خط سے متاثر ہیں اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک مشہور عدالتی بیان ہے۔ جو " قولِ فیصل" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ آغا صاحب نے بھی ایک

۱۔ ہفت روزہ چٹان　شورش نمبر　مضمون ڈاکٹر سید عبداللہ　ص نمبر ۱۰۵

۲۔ شورش کاشمیری　مرتبہ انور عارف　ص نمبر ۶۴

عدالت میں ایک بیان دیا تھا۔ اُس میں بھی مولانا ابوالکلام کے افکار کہیں کہیں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً مولانا اپنے بیان میں کہتے ہیں

"مسٹر مجسٹریٹ اب میں زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے۔ جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں ہمارے حصے میں یہ مجرموں کا کٹہرا ہے۔ تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کیلئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے۔ جس قدر یہ کٹہرا۔

مولانا مجسٹریٹ سے کہتے ہیں

"آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کردیں مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔"[1]

آغا صاحب نے لکھا ہے کہ

"مجھے احساس ہے کہ عدالت ٹوکنے پر مجبور ہے وہ اسی غرض سے اس کرسی پر بیٹھی ہے۔ میں اس سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے وہ سب کچھ کہہ لینے دے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ ریکارڈ ہو جائے۔ ممکن ہے مقدمہ کا یہ فائل آئندہ کسی تاریخ کا حصہ ہو۔ استغاثہ نے جو کچھ کہا ہے اگر ریکارڈ پر وہی رہا تو اس سے تاریخ ادھوری رہے گی۔"[2]

مولانا ابوالکلام آزاد "غبار خاطر" میں لکھتے ہیں۔

"حسن آواز میں ہو یا چہرے میں، تاج محل میں ہو یا نشاط باغ میں حسن ہے اور حسن اپنا فطری مطالبہ رکھتا ہے۔ افسوس اس محروم ازلی پر جس کے بے حس دل نے اس مطالبہ کا جواب دینا نہ سیکھا ہو۔"[3]

---

[1] قولِ فیصل — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۱۳۱

[2] پسِ دیوارِ زنداں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۷۹ / ۱۸۵

[3] غبار خاطر — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۲۰۷

آغا صاحب لکھتے ہیں

"آواز کا جادو چہرے کا حسن شاعری کا سحر میرے لئے بڑے صبر آزما ہیں۔ البتہ سنگ تراشی سے مجھے کوئی ربط نہیں میں بت گری پر بت شکنی کو ترجیح دیتا ہوں۔"[1]

مولانا ابوالکلام آزاد سرکاری وکیل، پولیس اور سی آئی ڈی والوں کے متعلق لکھتے ہیں۔

"میرا یقین ہے کہ انہوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے وہ مزدور معصیت ہے لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی معذوری بھی معلوم ہے۔ وہ محض چند روپوں کی نوکری کی وجہ سے ایسا کر رہے اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں۔ پس میرے دل میں ان کے لئے رنج اور ملامت نہیں میں اس کام کیلئے انہیں معاف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی معاف کر دے۔ پبلک پراسیکیوٹر بھی جو ان مقدمات میں کام کر رہا ہے۔ میرا ایک ہم وطن بھائی ہے اس کا ضمیر یا رائے میرے سامنے نہیں محض مزدوری ہے جو اس کام کیلئے وہ گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے۔ پس اس کی طرف سے میرے دل میں کوئی رنج نہیں۔"[2]

آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"جناب مجھے ان زہرہ گداز واقعات کے باوجود کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہر شخص اپنا فرض پورا کر رہا ہے کوئی ضمیر کے تقاضے پر کوئی پیٹ کے تقاضے پر

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا"[3]

مولانا ابوالکلام آزاد تاج محل کی فضا کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

---

1. شورش کاشمیری — مرتبہ انور عارف — ص نمبر ۹۱
2. قولِ فیصل — مولانا ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۱۳۰
3. پسِ دیوارِ زنداں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۸۲

"وہ کچھ دیر تک منتظر رہتی۔ گویا کان لگا کر خاموشی سے سن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ ہر تماشائی حرکت میں آنے لگتا۔ چاند بڑھنے لگتا یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے درختوں کی ٹہنیاں کیفیت میں آ آ کر جھومنے لگتیں۔ رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی برجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنے ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کو جنبش سے نہ روک سکے۔ آپ باور کریں یا نہ کریں مگر یہ واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے برجیوں سے باتیں کی ہیں۔"[1]

آغا صاحب نے لارنس باغ کی تصویر کشی اس طرح کی ہے۔

"لارنس باغ ہماری آوارہ گردیوں کا دوسرا مرکز تھا۔ بہت سی چاندنی راتیں اس کی آغوش میں گزریں ہمیشہ اس کی شاخیں پکارتی رہیں اس کی مصنوعی پہاڑیوں کے پیچ و خم اشارے کرتے رہے۔ اس کی پگڈنڈیاں اُن گئے دنوں کی یاد دلاتی تھیں جب عنبریں گیسوؤں کے سائے ان پر مہربان تھے جب زلفوں کے خم کھول کر ہم غزل کو ساز دیا کرتے تھے۔ انہی شاخوں کے سائے میں مطلعے اور مقطعے موزوں ہوتے تھے۔"[2]

اسی طرح کی اور مثالیں بھی آغا صاحب کی کتابوں میں مل جاتی ہیں۔ شاید اسی کی بنا پر جناب انور عارف صاحب نے لکھا ہے کہ

"جہاں تک مولانا کی تحریر کے بانکپن کا تعلق ہے وہ شورش کاشمیری میں اسی شکوہ کے ساتھ موجود ہے۔ وہ الفاظ کو عربی آیات کے سنگھار سے دو بالا نہیں بناتے بلکہ اردو کی دلفریبی سے دولہا بناتے ہیں۔ ان کے فقرے برجستہ اور پھیرے شگفتہ ہوتے ہیں انکی تحریر و تقریر پر مولانا کا بے پناہ اثر ہے۔"[3]

ے [1] غبار خاطر — ابوالکلام آزاد — ص نمبر ۳۵۹

ے [2] پسِ دیوارِ زنداں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۳۵۱ / ۳۵۲

ے [3] شورش کاشمیری — مرتبہ انور عارف — ص نمبر ۱۶ / ۱۷

لیکن اسی کتاب میں جناب انور عارف صاحب یہ بھی کہتے ہیں ۔

"بعض لوگ ان (شورش) کے اندازِ تحریر کو مولانا ابوالکلام آزاد کے اندازِ تحریر سے ملاتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے خوانِ نگارش سے انھوں نے بڑا فیض پایا ہے ان کے قلم میں تذکرہ کا شکوہ بھی ہے' الہلال کی بلاغت بھی' ترجمان کی دلکشی بھی ہے اور غبار خاطر کی رنگینی بھی لیکن شورش صاحب کا طرزِ تحریر ان سب کا جادو ہے" [1]

جہاں تک جناب انور عارف کے پہلے بیان کا تعلق ہے وہ واضح نہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی تحریر کا بانکپن ان کے نزدیک عربی الفاظ کا سنگھار ان کے برجستہ فقرے اور شگفتہ پیرے ہیں اور یہ خصوصیات آغا صاحب میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ سوائے اس کے کہ وہ عربی الفاظ کی بجائے اردو الفاظ استعمال کرتے ہیں ۔ لیکن یہ تمام صفات تو ابوالکلام کی تحریر کا بانکپن نہیں ہیں ۔

اسی طرح جناب انور عارف صاحب کا دوسرا بیان بھی محلِ نظر ہے کہ اگر آغا صاحب کی "تحریر کا جادو" مولانا ابوالکلام آزاد کے "تذکرہ کا شکوہ" "الہلال" کی بلاغت" "ترجمان القرآن" کی دلکشی اور "غبار خاطر" کی رنگینی ہے تو پھر آغا صاحب کی تحریر میں اُن کا اپنا کیا ہے ؟ یہ تو صرف انتخابیت ہوئی ۔ حالانکہ آغا صاحب کی تحریروں میں انتخابیت کی بجائے انفرادیت پائی جاتی ہے ۔ ڈاکٹر مظفر عباس نے اپنے پی ۔ ایچ ۔ ڈی کے مقالے میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ

"الہلال ، تذکرہ ، ترجمان القرآن اور غبار خاطر جہاں آزاد کی نثر کے ارتقاء کے اہم سنگ میل ہیں ۔ وہاں ان کی نثر کے مختلف ادوار کی نشاندہی بھی کرتے ہیں ۔ آزاد کی نثر کے ان مختلف ادوار میں متنوع رنگ جھلکتے ہیں لیکن عالمانہ شان ان کی ہر دور کی نثر کی بنیادی خصوصیت ہے" [2]

لیکن آغا صاحب کی نثر میں وہ عالمانہ شان نہیں ہے جو مولانا ابوالکلام کی تحریر کا بانکپن اور نثر کی بنیادی خصوصیت ہے ۔ لہذا جناب انور عارف صاحب کی بات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات کا اثر آغا صاحب

---

1. شورش کاشمیری ، مرتبہ انور عارف ، ص نمبر ۱۹/۲۰

2. ڈاکٹر مظفر عباس ، مقالہ برائے پی ایچ ۔ ڈی ، ص نمبر ۸۲۵

کی تمام اثر میں ملتا ہے۔ یہ حوالہ پہلے بھی آچکا ہے کہ آغا صاحب پر سب سے زیادہ اثر مولانا کے عدالتی بیان "قول فیصل" کا ہے۔ جس کا اقرار خود آغا صاحب نے بھی کیا ہے۔ لیکن یہ اثر بھی افکار و خیالات تک ہے "قول فیصل" کی نثر کے اسلوب سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد "قول فیصل" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "قول فیصل" میں

"ادبی شان کے علاوہ اس کا پرجوش۔ غیر متزلزل اور غیر استثنا طلب لب و لہجہ نہ صرف مولانا کی بے خوفی۔ جرات و ہمت کا شاہد ہے بلکہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کے دلوں میں بھی مصائب اور خطرات کے درمیان اعلان حق کا حوصلہ پیدا کرتا ہے اور دار و رسن کی منزلوں کو رقصاں اور غزل خواں طے کرنے کا عزم سکھلاتا ہے۔ بظاہر تو اس کا مخاطب ایک مجسٹریٹ ہے مگر حقیقتاً یہ تمام قوم کے نام ایک خطبہ ہے یہ وہی سبق ہے جو تذکرہ کے مختلف کردار اپنے ماحول اور زمانے میں دہراتے رہے ہے"[1]

اب اگر یہ کہا جائے کہ شورش کاشمیری نے بے خوفی۔ جرات۔ ہمت۔ مصائب اور خطرات میں اعلان حق اور دار و رسن کی منزلوں کو رقصاں و غزل خواں طے کرنے کا سبق مولانا ابوالکلام آزاد سے سیکھا یا "تذکرہ"۔ "الہلال"۔ "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" سے یاد کیا تو یہ غلط نہیں ہوگا۔ آغا صاحب خود لکھتے ہیں۔

"افکار پر جد و جہد کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام کی تحریروں کا جادو چھا رہا تھا"[2]

جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب کا تعلق ہے۔ آغا صاحب نے اپنی ابتدائی تحریروں میں اس اسلوب کی پیروی کرنے کی کوشش ضرور کی۔ جس کا نمونہ عبداللہ ملک کی کتاب "سرمایہ داری" کا دیباچہ ہے۔ جس کا ایک اقتباس پہلے دیا جا چکا ہے یہ ۱۹۳۹ء کی تحریر ہے۔ لیکن آغا صاحب کے موجودہ ادبی سرمایہ میں ایسی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کے طرز نگارش کی پیروی کی گئی ہو۔ جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر کا تعلق ہے۔ وہ تو بہ گیر انفرادیت کے مالک تھے۔ بقول ناظر کاکوروی

---

[1] غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد ص نمبر ۳۴/۳۵ مکتبہ دین و ادب لکھنو

[2] پس دیوار زنداں شورش کاشمیری ص نمبر ۱۵۳

"مولانا ابوالکلام کی شخصیت اور ان کے علم و فضل کی انفرادیت قومی ادب پر اس حد تک چھا گئی ہے کہ ان خصوصیات کو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی پُر اسرار ہمہ گیر شخصیت ادب سے اس درجہ وابستہ ہے کہ انفرادیت کو جدا کرنا آسان نہیں اور اس عہد کا مطالعہ بغیر امام الہند کے اثرات پر غور کئے ہوئے مشکل ہے۔ فکر و نظر کا انداز، تحریر کی بلاغت اور فصاحت میں ان کی انفرادیت کو ان کی نگارشاتِ ادبی میں اس قدر نمایاں کیا ہے کہ کوئی لفظ اور کوئی فقرہ ایسا نہیں ہے جس میں اُن کے معاصرین یا پیش رو ادیبوں کے طرزِ نگارش سے کوئی اشتراک پایا جاتا ہو۔ مولانا آزاد نے ورثہ میں جو کچھ چھوڑا اس کو اپنی بے مثال شخصیت کے قدرتی ڈھانچے میں اس طرح ڈھال دیا کہ ان کے معاصر اس طرزِ شعور کو اپنا نہ سکے۔"[1]

لہذا یہ ممکن ہی نہیں کہ مولانا کی تحریروں کی پیروی کی جا سکے۔ البتہ افکار کے اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن جہاں تک مولانا کے اسلوب کا تعلق ہے۔ وہ کسی کے بھی بس کی بات نہیں کیونکہ یہ مولانا کی بے مثال شخصیت کا عکس ہے۔ لہذا جب آغا صاحب خود یہ کہتے ہیں کہ ان کے قلم میں تیغ کے آثار مولانا ابوالکلام کی انشا کا فیض ہے تو اس سے مراد مولانا کا اسلوب نہیں ہوتا بلکہ مولانا کے افکار میں طنز اور جذبات ہوتی ہے جس نے بلاشبہ آغا صاحب کے قلم میں تیغ کی سی کاٹ پیدا کر دی ہے لیکن طنز اور جذبات کو آغا صاحب نے خود اپنے اسلوب میں استعمال کیا ہے۔ مولانا ابوالکلام کے اسلوب کی پیروی ہرگز نہیں کی۔ آغا صاحب کی انشا پردازی میں جو تیغ کے آثار ملتے ہیں ان میں خود آغا صاحب کی جذباتی اور سیماب وار طبیعت کا بھی حصہ ہے۔ وہ ایک صاحب طرز ادیب تھے اور

"صاحب طرز بننے کے معنی ہیں تقلید کو چھوڑ کر موجد بننا۔ موجودہ روش سے بغاوت کرنا اور اپنی راہ الگ نکالنا۔ یہ اس وقت ہوتا جب کسی ادیب و مصنف کے اندر فطری اپج ہو اور اس کے لئے ایک دھن، شوق، جوش ہو۔"[2]

یہ ساری باتیں آغا صاحب میں موجود ہیں۔ انہوں نے اپنا اسلوب خود بنایا ہے اور ایک نئی طرز ایجاد کی ہے۔ اردو ادب کے کسی ادیب نے

۱ـ تنقید و تنقیدی شعور — ناظر کاکوروی — ص نمبر ۹۴ — ادارہ انیس اردو الہ آباد ۱۹۶۵ء

۲ـ داستان تاریخ اردو مولفہ حامد حسن قادری — ص نمبر ۶۲۸ — اردو اکیڈمی سندھ کراچی

بھی آغا صاحب کی سی نثر نہیں لکھی اور یہ سب کچھ ان کی ریاضت محنت ادب سے فطری لگاؤ اور اُن فطری صلاحیتوں کا رہین منت ہے جو آغا صاحب میں قدرتی طور پر موجود تھیں آغا صاحب کے سامنے اردو کے مختلف اسالیب موجود تھے جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ وہ خود ایک سو سالہ رومانی۔ جذباتی اسلوب تحریر کی روایت کے آخری وارث تھے۔ لیکن آغا صاحب نے اس روایت سے تعلق توڑے بغیر جدت و اختراع سے کام لیا اور ایک ایسا اسلوب ایجاد کیا جو منفرد بھی اور خوبصورت بھی جس پر ان کی اپنی شخصیت کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔

آغا صاحب کا یہ اسلوب سہل ممتنع نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پیروی بہت ہی آسان ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر آغا صاحب کے اسلوب کا تتبع کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ ممکن نہیں کہ ویسی ہی نثر لکھی جا سکے۔ آغا صاحب کی یہ خصوصیت بالکل ویسی ہی ہے جیسی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی۔ جس طرح مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب نگارش کی آج تک تقلید نہ کی جا سکی۔ اسی طرح یہ بھی مشکل ہے کہ آغا صاحب کے اسلوب جیسی نثر لکھی جا سکے۔

شورش کا اسلوب نگارش

شورش کاشمیری ایک جذباتی انسان تھے۔ مولانا تاجور نے انہیں ایک خط میں " بے تابو نوجوان "[ا] کے نام سے یاد کیا ہے جس پر بے تابو حالات اور انقلابی تحریکوں نے اور بھی قیامت ڈھائی اور آغا صاحب کی شخصیت وہ طوفان بن گئی جس میں ہیبت اور دبدبہ بھی ہے تو تندی و تیزی بھی۔ جس میں روانی بھی ہے تو تکراؤ بھی۔ جس میں جوش و خروش بھی ہے تو شان و شوکت بھی۔ جو اُن کے اسلوب میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

شاعرانہ نثر

شاعری کا پیرائیہ اظہار جذباتی خیالات و تجربات اور جذباتی احساسات و محسوسات کیلئے اختیار کیا جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ان جذباتی خیالات و تجربات کو شعر ہی کا جامہ پہنایا جائے بلکہ بعض اوقات ان جذبات کے اظہار کو نثر کے پیرہن میں بھی ظاہر کیا جاتا ہے

ا۔ ماہنامہ کلچر لاہور تاجور نمبر جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۵ اپریل ۱۹۶۵ء
ص نمبر ۲۹۰

اور بیرہن کی دیدہ زیبی اور خوبصورتی میں فرق نہیں آتا۔ لہذا اسے شاعرانہ نثر کا نام دے دیا جاتا ہے۔ شاعرانہ نثر ایک لحاظ سے علمی نثر کی ضد ہے۔ علمی نثر میں عام طور پر منطق و استدلال کی بنا پر قطعی اور حتمی نتائج کو ابلاغ کی صورت دی جاتی ہے اس کے مقابلے میں اگر خیالات کے اظہار میں جذبے سے کام لیا جائے اور اس میں تخیل کی کارفرمائی ہو۔ تو اسے شاعرانہ یا ادبی نثر کا نام دیا جاتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادبی اور شاعرانہ نثر میں عقل و استدلال بالکل نہیں ہوتا بلکہ اس میں عقل و استدلال کو جذبے کے تابع کر دیا جاتا ہے۔

شورش کاشمیری چونکہ شاعر تھے اور ادیب بھی اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی جذباتی پائی تھی۔ اسی لئے اُن کی نثر میں جذبات کی فراوانی ملتی ہے۔ شاعری میں عام طور پر تشبیہ۔ استعارہ اور پرشکوہ تراکیب وغیرہ کا استعمال زیادہ ہوتا ہے لیکن آغا صاحب نے اپنی نثر میں بھی شاعری کے سارے لوازمات برتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کی نثر میں بھی شاعرانہ کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

تشبیہ اور استعارہ یا تراکیب کے علاوہ انہوں نے نثر میں قافیہ پیمائی سے بھی کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک خاص قسم کا آہنگ اور موسیقی پیدا ہو گئی ہے۔ مثلاً

"نوجوانی کے زینے پر قدم رکھا تو غموں نے تانا بانا بن رکھا تھا چھالے اور کانٹے یکجا ہو گئے تھے۔" [1]

"گھر میں وہی بجھا ہوا چولہا تھا پندرہ برس ہو گئے تھے لیکن سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہ تھی۔" [2]

"گھر وہی گورِ غریباں تھا" نے چراغ نے گلے" [3]

اب اگر "تانا بانا بُن رکھا تھا"۔ "سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہ تھی"۔ "گھر وہی گورِ غریباں" اور "نے چراغ نے گلے" پر غور کیا جائے تو ہر جملہ در حقیقت ایک مصرع ہے۔ جس نے نثر میں بھی شعر کا رنگ پیدا کر دیا ہے۔

اشعار کا استعمال

آغا صاحب نثر میں شاعرانہ رنگ پیدا کرنے کیلئے بعض برجستہ اشعار اور برجستہ مصرعوں کو اپنی نثر میں بڑی خوبصورتی اور مہارت سے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اشعار کے استعمال کا موقع پیدا نہیں کرتے اور نہ مصرعوں کو کھپانے کیلئے جگہ پیدا کرتے ہیں بلکہ ایسے معلوم ہوتا ہے

[1،2،3] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل — شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۲۸/۲۲۹

کہ لکھتے لکھتے کوئی شعر یا مصرع خود بخود آگیا اور انہوں نے بلا تکلف استعمال کر دیا۔ نثر نگاری میں یہ صورت اُس وقت پیش آتی ہے جہاں مصنف کا مطالعۂ شعر بہت زیادہ ہو اور اکثر اساتذہ کے تیر و نشتر ازبر ہوں تاکہ جب نثر لکھ رہا ہو تو ذہن بات کی مناسبت سے حافظہ سے شاعرانہ مواد حاصل کر سکے۔ یہ عمل بات سے بات پیدا ہونے کا عمل ہوتا ہے جس کے لئے ضروری ہے کہ مصنف کے ذہن میں معلومات کا وسیع ذخیرہ موجود ہو جہاں تک شعر کا تعلق ہے آغا صاحب کا حافظہ بڑا قوی تھا نئے اور پرانے شعراء کا بہترین انتخاب اُن کی نظر میں تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی شعراء کا کلام بھی زبانی یاد تھا۔ جس کی بنا پر وہ نثر لکھتے ہوئے اشعار کے برجستہ استعمال پر قدرت رکھتے تھے۔ مثلاً

"آغا رشید احمد نام کے ایک صاحب ان دنوں سی۔ آئی۔ ڈی میں سب انسپکٹر تھے۔ تقریباً سبھی مسلمان اڈیٹروں اور لیڈروں سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ میکش صاحب کو رام کرنے کیلئے انہیں مامور کیا گیا۔ دونوں ایک ہی گاؤں کے تھے۔ جالندھر میں اکٹھے پڑھے اور اکٹھے ہی زندگی کے سفر کو نکلے تھے ــــــ؟

اُو بجوارِ رفت و مادر کوچہ ہا رسوا شدیم"[۱]

اسی طرح ذیل کے مصرع کا استعمال بھی بڑا بلیغ اور برجستہ ہے۔

" عورتیں نہیں ــــــ قبریں

عورتیں نہیں ــــــ چِتائیں

عورتیں نہیں ــــــ ہچکیاں

عورتیں نہیں ــــــ آنسو

فطرت کے آنسو۔ انسان کے آنسو۔ عورت کے آنسو۔ خون کے آنسو۔ آنسو ہی آنسو۔ ع

آدمی محسوس کرتا ہے خدا خاموش ہے"[۲]

---

۱ نوبزتن شورش کاشمیری ص نمبر ۱۴۴۔

۲ اس بازار میں شورش کاشمیری ص نمبر ۹۶

اسی طرح سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق لکھتے ہیں۔

" ان کے گنجلک بالوں کی سپیدی۔ کھلے ماتھے کی سلوٹوں اور متحرک آنکھوں کی عقبی لہروں پر اچٹتی ہوئی نظریں ڈالتے ہی قید و بند کی ایک ایسی تاریخ سامنے آجاتی جس کا سرنوشت تھا۔

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود"[1]

اسی طرح اردو کا یہ شعر جس خوبی سے استعمال ہوا وہ اپنی مثال آپ ہے۔

" اس خیال ہی سے طبیعت مفتخر اور بشاش ہوتی ہے کہ رسول اللہ ؐ اور ان کے صحابہ انہی راستوں سے اپنی شاہراہوں پر اپنی منزلوں کو گئے تھے وہ اونٹ رہے نہ حدی خواں۔ ناقہ رہی نہ جرس۔ محمل رہی نہ کجاوے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن محسوس ہوتا ہے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی"[2]

قافیہ پیمائی

قافیہ پیمائی دراصل شاعری کے لوازمات میں سے ہے مگر آغا صاحب نے نثر میں بھی قافیہ پیمائی کا التزام کیا ہے۔ عام طور پر قافیہ پیمائی نثر میں روانی کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہے اور آمد کی بجائے آورد کا سماں پیدا کر دیتی ہے لیکن آغا صاحب نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے۔ اُن کی نثر میں قوافی روانی اور سلاست کے راستے کا پتھر نہیں بنتے بلکہ نثر کے بہاؤ کے ساتھ بہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ جیل خانے کا ایک منظر ہے کہ

" ہم نے اندر چلتے چلتے کوئی ایک میل لمبا فاصلہ طے کیا تالے کھلتے بند ہوتے۔ دیواریں آتیں کھل جاتیں احاطوں

۱ھ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۹۱
۲ھ شب جائے کہ من بودم ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۱۰۲

سے احاطے پیوست، دیواروں سے دیواریں بغل گیر۔ تالوں کا زنجیروں سے معانقہ دروازوں سے دیواروں کا مصافحہ معلوم ہوتا۔ کہ اس دیوار کے پیچھے اب کچھ نہ ہوگا لیکن آہنی دروازہ کھلتے ہی دیواروں کا ایک اور سلسلہ موجود ہوتا۔ لاتعداد کوٹھڑیاں دو منزلہ علاوہ بریں پانی کے گھاٹ۔ سپاٹ میدان۔ سلاخوں کے آغوش میں بیرکیں۔ بیرکوں کے پہلو میں بان بٹائی۔ منج کٹائی۔ سوت کتائی اور گندم پسائی کے احاطے بڑ اور پیپل کے درخت ان کے سایہ میں خراس اور کولھواُن میں جتے ہوئے نوعمر قیدی۔ وارڈروں کا دھول دھپا پسینہ میں بُو کی سڑاند۔ غرض یہ سارا منظر ایکا ایکی نگاہوں سے نکل گیا۔"[1]

مندرجہ بالا عبارت میں "کھلتے اور بند ہوتے"۔ "آتیں اور جاتیں" "معانقہ اور مصافحہ" "گھاٹ اور سپاٹ" "بٹائی اور کٹائی" "کتائی اور پسائی" کے قوافی بڑے سلیقے سے استعمال ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات اور بھی اس عبارت میں دیکھی جا سکتی ہے کہ آغا صاحب نے مختلف الفاظ کی تکرار سے نثر کو ایک آہنگ عطا کیا ہے۔ جو شعر کی خصوصیت ہے۔ مثلاً مندرجہ بالا عبارت میں ہی "چلتے چلتے"۔ "احاطوں سے احاطے"۔ "دیواروں سے دیواریں" "دروازوں سے دیواریں" اور "آغوش میں بیرکیں، بیرکوں کے پہلو میں" کے الفاظ اپنی تکرار سے ایک خاص آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ جو کہ نثر کو صوتی اعتبار سے شعر کے قریب کر دیتے ہیں۔

تشبیہ و استعارہ

ملک حسن اختر صاحب نے آغا صاحب کی نثر کے متعلق تحریر کیا ہے۔

"شورش کی نثر میں وہ شوخی۔ بانکپن اور حسن ہے جو ایک حسین اور جوان عورت میں پایا جاتا ہے۔ وہ نثر میں غزل کہتے ہیں۔"[2]

اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب کی نثر بڑی خوبصورت ہوتی ہے اور وہ نثر میں تشبیہ و استعارہ وغیرہ سے کام لیتے ہیں جو کہ شاعری کا زیور ہیں مگر ملک صاحب کی بات "عورت کے ظاہری" حسن تک تو درست ہے لیکن آغا صاحب کی نثر میں نسائیت

---

[1] پس دیوار زنداں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۸

[2] ہفت روزہ چٹان ۔ ۲۶ مئی ۱۹۶۹ء — شورش کی نثر ملک حسن اختر ص نمبر ۱۵

ہرگز نہیں پائی جاتی۔ آغا صاحب کی نثر کا خطیبانہ آہنگ اِس کی نفی کے لئے کافی ہے۔ آغا صاحب کی نثر کا تو یہ عالم ہے کہ اگر کسی عورت کو یہ نثر پڑھنے کیلئے کہا جائے تو وہ اپنی آواز کی ملائمت اور نزاکت کی وجہ سے وہ اثر پیدا نہیں کرسکتی جو ایک پاٹ دار آواز اور خطیبانہ آہنگ میں پڑھ کر پیدا کیا جاسکتا ہے البتہ نثر میں غزل والی بات درست ہے کیونکہ غزل بھی شاعری کی ایک صنف ہے اور آغا صاحب کی نثر کو شاعری سے خاص علاقہ ہے آغا صاحب کی نثر میں جس شوخی۔ بانکپن اور حسن کا ذکر کیا گیا ہے وہ حسن۔ بانکپن اور شوخی آغا صاحب کی نثر میں تشبیہہ۔ استعارہ۔ برجستہ جملوں اور خوبصورت فقروں کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ مثلاً

"عربوں کا یہ خطہ تیزی سے یورپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ زمانہ تھا جب قیس بادیہ نورد تھا۔ اب لیلیٰ تہذیب بیما ہے"[1]

"ہولی کے رنگوں کی طرح روشنیوں کے رنگ ایک دوسرے سے بوس و کنار کرتے ہوئے ڈوبتے اور ابھرتے چلے جاتے ہیں۔"[2]

"ان کا جذبہ اور حوصلہ ققنس کی طرح اپنی خاکستر سے ابھر چکا ہے"[3]

"کناروں پر قمقموں کی قطاریں اور ادھر ادھر بجلی کے حروف کی جھالریں افق پر ستاروں کے جھومر کی طرح دلکش معلوم ہوتی ہیں۔"[4]

یہ مثالیں آغا صاحب کی کتاب "یورپ میں چار ہفتے" سے لی گئی ہیں جبکہ دوسری کتابوں میں بھی آغا صاحب کی نثر کا یہی عالم ہے مثلاً "آتش بازار میں" میں ایک طوائف کی زبان سے یہ اشارے اور استعارے اردو ادب میں ایجاد کا درجہ رکھتے ہیں۔

"وہ چکلہ کی ٹکیائی کو رات کا دیپک۔ طوائف کو رات کی رانی۔ میراثی کو شرافت کی ہچکی۔ نائکہ کو

۱۔ یورپ میں چار ہفتے — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۴۴

۲۔ ایضاً — ص نمبر ۲۷

۳۔ ایضاً — ص نمبر ۳۵

۴۔ ایضاً — ص نمبر ۵۱

معذرت کا بھول عشق کو تندرستی کی اُبکائی۔ حسن کو مرد کی میراث۔ مناکحت کو قید با مشقت۔

برات کو جنازے کی تمہید۔ اولاد کو گناہ کی دستاویز۔ مرد کو عیاشی کا مرقع اور عورت کو انفعالیت کی تصویر سمجھتی ہے۔"[1]

غرض آغا صاحب نے ان ہی مختلف عناصر سے اپنا یہ شاعرانہ اسلوبِ نگارش اختراع کیا ہے۔ جو منفرد اور ممتاز ہے

خطیبانہ آہنگ

شورش کاشمیری ایک پیدائشی خطیب تھے۔ وہ ہمیں اوّل و آخر خطیب نظر آتے ہیں ان کی شاعری۔ اُن کی صحافت اور اُن کی نثر میں خطیبانہ لہجہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ خطابت میں عام طور پر

"استفہامیہ جملے۔ مترادفات۔ فقرات کی دروبست میں توازن یا تضاد وغیرہ کا اہتمام"[2]

خاص طور پر کیا جاتا ہے آغا صاحب کی نثر نگاری میں خطابت کا عنصر ایک طرف تو شان و شوکت کا باعث ہوتا ہے دوسری طرف نثر کو موثر بنانے کا وسیلہ ہوتا ہے آغا صاحب کی نثر خطابت کے اعلیٰ ترین نمونوں سے معمور ہے۔ مثلاً

"تصور کیجئے حضرت ہاجرہ اپنے جگر گوشہ ذبیح اللہ کیلئے کیسے دوڑتی ہونگی۔"[3]

"غیب کا علم خدائے علیم و خبیر کو ہے ہاجرہ نہیں جانتی تھی کہ جہاں وہ مسافر ہے۔ مہاجر ہے۔ جلاوطن ہے اور اس کی آواز کے سوا دوسرے انسان کی آواز نہیں ہے"[4]

اسی طرح یہ عبارت استفہامیہ ہے جو فن خطابت کے اعتبار سے بڑا موثر پیرایۂ خطاب ہوتا ہے۔

"کیا خبر حضور نے کہاں قدم رکھا ہو۔ کہاں نگاہ ڈالی ہو۔ کہاں ان کی آواز کا حسن ٹھہرا ہو۔ کہاں ان کے

۱؎ اس بازار میں	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۴۰
۲؎ نثر نظم اور شعر	منظر عباس نقوی	ص نمبر ۱۲
۳؎ شب جائے کہ من بودم	شورش کاشمیری	ص نمبر ۵۵
۴؎ ایضاً		ص نمبر ۵۵/۵۶

تبسم نے ضیا بخشی ہو۔ کہاں آرام فرمایا ہو۔ ہائے وہ لوگ کہاں چلے گئے وہ میراث کیا ہوگئی۔ وہ خزانہ کہاں لٹ گیا۔ وہ کارواں کہاں بچھڑ گیا اس کے علاوہ قیامت اور کیا ہوگی کہ ـــــ نگاہیں ڈھونڈھتی ہیں اور انہیں ہرگز نہیں پاتیں ہے[۱]

یہ عبارت یہاں ختم نہیں ہوجاتی بلکہ بتدریج جذبات کے زیروبم کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی ہے آخر جذبات کے زیروبم میں ایک طوفانی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور یہی خطیب کا مقصد اور خطابت کی معراج ہوتا ہے۔ خطابت کی بہت سی مثالیں آغا صاحب کی کتابوں پر تبصرے کے دوران میں آچکی ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ آغا صاحب کی نثر میں خطابت کا آہنگ نمایاں ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کی ساری نثر خطیبانہ ہے بلکہ بات یہ ہے کہ آغا صاحب عام طور پر چھوٹے چھوٹے فقروں میں اظہار خیال کرتے ہیں لیکن جہاں پر خیال کو موثر بنانا اور اپنی بات کو منوانا مقصود ہوتا ہے وہاں وہ خطابت کا پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔

سوز و گداز

آغا شورش کی نثر بڑی اثر آفریں ہے جس میں ہمیں خطابت اور جوش و خروش کے علاوہ ایک شدید جذباتی کیفیت ملتی ہے جس نے ان کی نثر میں سوز و گداز پیدا کردیا ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ پرجوش اور جوش انگیز خیالات کو ادا کرنے میں ـ اپنی نثر کے صوتی آہنگ کا خیال رکھتے ہیں۔ جو نثر کی اثر آفرینی میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔ سوز و گداز دراصل جذبے کی چیز ہے اور جذبات کو ادا کرنے میں تخیل سے مدد لینی پڑتی ہے اور واقعات میں رنگ آمیزی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن آغا صاحب نے جذبات کے اظہار میں جو رنگ شامل کیا ہے وہ حقیقت کو مسخ نہیں کرتا اور نہ ہی واقعات کی صحت مجروح ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

"جذبے سے بھری ہوئی عام تحریر کے مقابلے میں زیادہ برجستہ اور پرجوش ہونی چاہیے ایسے موقعوں پر مصنف خیال انگیزی سے کام لیتا ہے۔ سادہ حقیقت نگاری کی بجائے خیال کی مدد سے مماثلتوں کا احساس دلاکر اپنے مضمون کو بے آمیز حقیقت یا امر واقعہ کے طور پر بیان کرنے کی بجائے۔ ان

۱؎ شب جائے کہ من بودم ۔ شورش کاشمیری ۔ ص نمبر ۱۰۸

میں اور بھی رنگ بھرتا ہے۔ اس کا طریقِ کار فوٹوگرافی کی بجائے نقاش کی مصوری کا طریقِ کار ہو جاتا ہے۔ اس کے بیان میں جزئیاتِ واقعی کے ساتھ کچھ زائد شے بھی موجود ہوتی ہے۔ جو اگر نہ بھی ہوتی تب بھی بیان بلحاظ بیان مکمل ہوتا گو کہ موثر یا تو جبر انگیز نہیں ہوتا۔"[1]

گویا اثر انگیز نثر کے لئے ضروری ہے کہ مصنف امرِ واقعہ میں رنگ آمیزی کرے۔ آغا صاحب نے جن حالات و واقعات کو بیان کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ان حالات و واقعات کو جذبے کا رنگ عطا کر دیا ہے۔ جو ان کی نثر میں سوز و گداز پیدا کرتا ہے لیکن یہ جذبات جن کا اظہار آغا صاحب کی تحریروں میں ملتا ہے حقیقی ہیں۔ کیونکہ آغا صاحب کے زیادہ تر حالات و واقعات ان کے اپنے ہیں اس لئے حقیقی ہیں اور اسی وجہ سے اُن میں جذبات کی شدت بھی پائی جاتی ہے لیکن آغا صاحب کی وہ نثر جس میں بیان ہونے والے بعض تاریخی اور تحقیقی، فکری اور تنقیدی موضوعات ہیں ان میں بھی یہ جذباتی کیفیت نہیں ملتی۔ مثلاً افکارِ اقبال کی تشریح و تشہیر اور عقیدۂ ختمِ نبوت سے متعلق تحریروں میں منطق و استدلال اور تحقیق و تنقید سے کام لیا گیا ہے تاہم مجموعی طور پر آغا صاحب کے اسلوبِ نگارش پر جذبات ہی کی حکمرانی ہے۔ جس نے اُن کی نثر کو پُر تاثیر بنا دیا۔ مثلاً اس عبارت میں جذبات کی شدت نے جو اثر پیدا کیا ہے وہ آغا صاحب کے حقیقی جذبات ہیں۔ آغا صاحب کا بھائی اقبال یورشؔ قریب المرگ ہے۔ پیسہ پاس نہیں افلاس عروج پر ہے۔ احرار کانفرنسوں میں شورش کاشمیری زندہ آباد کے نعرے گونجتے ہیں۔[2] جس کوٹھڑی میں اقبال یورشؔ بیمار تھا وہیں شورش کاشمیری کو وہ لوگ بھی ملنے آتے تھے۔

"جن کے کتوں کو بھی آبِ حیات مل سکتا تھا۔"[3]

مگر آغا صاحب کے پاس بیمار بھائی کیلئے ایک سیب خریدنے کیلئے بھی پیسہ نہ تھا۔[4] وہ لکھتے ہیں

"ایک دن اس قدر تڑپا کہ ہم سب مایوس ہو گئے۔ والدہ اور میں نے بہنوں کو اس کے پاس چھوڑا اور خود بے سوچے سمجھے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میرے پاس صرف تین روپے بارہ آنے تھے والد کے پاس ایک روپیہ اور دو آنے۔ ایک سنگین کشمکش نے گھیر رکھا تھا کوئی چار گھنٹے تک میں اور

---

[1] سرسید اور اس کے نامور رفقاء — ڈاکٹر سید عبداللہ — ص نمبر ۱۱۴/۱۱۵

[2،3،4] بحوالہ پسِ دیوارِ زنداں — ص نمبر ۲۰۴ — شورش کاشمیری

والد موری دروازہ کے باہر گنپت روڈ کے چوک میں ہی کھڑے رہے والد مجھ سے بھی زیادہ خود دار تھے انہوں نے سوال کرنا سیکھا تھا غور کیجئے ایک جوان بیٹا دوسرے کا جوان بھائی مر رہا ہے اور معاملہ صرف اس پر اٹکا ہے کہ گرہ میں مال نہیں اور علاج روپیہ چاہتا ہے یہاں کھڑا رہنا بھی علاج نہ تھا لیکن ہم دونوں باپ بیٹا، یہاں اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی اجنبی طاقت ہمارے لئے دوائی لا رہی ہے یا کوئی غیبی ہاتھ مدد کو آرہا ہے گویا ہم نے اپنے نفس کو دھوکا دے لیا تھا کہ اس طرح کھڑا رہنے سے مریض اچھا ہو جائے گا۔ کوئی سی چیز بھی نہ تھی لیکن ہم کھڑے تھے کبھی چپ رہتے کبھی ایک آدھا لفظ بول لیتے والد کے منہ سے عاجزی میں نکل گیا ——

"کہاں جائیں۔ قرض مانگیں تو ملتا نہیں مل جائے تو چکانے کی طاقت نہیں۔ بھیک مانگیں تو عزت جاتی ہے اللہ بے نیاز ہے امیروں کی بیماری غریبوں کو لگ گئی ہے"

ان کا یہ آخری فقرہ میرے دل میں ترازو ہو گیا میں یوں ہو گیا جیسے کوئی لاش ہو؟[1]

رومانیت

آغا صاحب کے اسلوب میں جو جذبات کی حدت اور رومانیت کا اثر پایا جاتا ہے وہ دراصل اس روایت کا حصہ ہے جو انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان سے ورثے میں پائی تھی۔ سید عابد علی عابد کے مطابق رومانیت کی بڑی بڑی خصوصیات یہ ہیں۔

۱۔ جذباتیت

۲۔ مناظر فطرت سے دلچسپی

۳۔ ماضی سے دلچسپی

۴۔ تصوف

---

[1] پس دیوار زنداں۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۲۲۳

انفرادیت پسندی

- ہر طرح کے قانون سے بغاوت
- دیہاتی زندگی سے دلچسپی
- عجیب و غریب اور وحشی عناصر سے دلچسپی
- تخیل کی مکمل آزادی
- انسانی حقوق کے حصول کیلئے جدوجہد کا جذبہ وغیرہ[۱۵]

آغا صاحب کی نثر میں " انسانی حقوق کے حصول کیلئے جدوجہد کا جذبہ " باقی تمام خصوصیات پر حاوی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب کی نثر میں جذباتیت ۔ ماضی سے محبت ۔ انفرادیت اور بغاوت کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ لیکن یہ ساری خصوصیات وہ انسانی حقوق کے حصول کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ اردو ادب میں رومانیت کے بڑے نام یہ ہیں مولانا ابوالکلام آزاد علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خان جو احیائے اسلام کی تحریک کے داعی تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا مستقبل ان کے شاندار ماضی کی طرح درخشندہ ہو۔ لہٰذا وہ ماضی کی کہانی کہہ کر مستقبل کو شاندار بنانے کیلئے دعوت عمل دیتے تھے ۔ اس طرح وہ ماضی پرست نہ تھے بلکہ مستقبل کے معمار تھے ۔ آغا صاحب بھی انہیں کے نقشِ قدم پر چلے ۔ اُن کی نثر میں جذباتیت تخیل کی آزادی ۔ ماضی سے محبت اور مستقبل کو سنوارنے کی تمنا ۔ بغاوت اور انفرادیت پسندی کے عناصر پائے جاتے ہیں ۔ آغا صاحب کے اسلوب نگارش کی بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے جذبات کے اظہار میں تخیل کی رنگ آمیزی ضرور کی ہے لیکن تخیل کو بے راہ نہیں ہونے دیا ۔ آغا صاحب کی نثر میں ہمیں جو تخیل کی آمیزش ملتی ہے وہ دراصل شاعری کا حُسن ہے جو نثر میں استعمال کیا گیا ہے شاعری میں مبالغہ حُسن پیدا کرتا ہے لیکن نثر میں حقائق کو مسخ کرنے کا حربہ بھی ہو سکتا ہے لیکن آغا صاحب نے سادہ واقعات کی صحت برقرار رکھتے ہوئے اپنی نثر میں مبالغے سے حُسن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جو کامیاب ہے ۔ آغا صاحب اپنے جذباتی اور خطیبانہ اسلوب میں بعض اوقات مبالغے سے کام لیتے ہیں لیکن حقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے ۔ مثلاً آغا صاحب پولیس کی گاڑی میں بیٹھے یہ

---

۵ بحوالہ اصول انتقادِ ادبیات سید عابد علی عابد ص نمبر ۱۷۵

منظر دیکھ رہے ہیں کہ شہید گنج کی تحریک میں ایک نوجوان کس طرح شہید ہوا تو کہتے ہیں۔

"جب اس پھول سے چہرے کی نعش دان کے قریب سے گزری تو ہم انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ ہماری زبانوں میں بادلوں کی گھن گرج آگئی ہے"[۱]

اس عبارت میں آغا صاحب اپنے جذبات کی شدت کا اظہار کرنے کیلئے "انگاروں کی طرح دہک رہے تھے" "زبانوں میں بادلوں کی گھن گرج آگئی" کہہ کر اگرچہ مبالغے سے کام لے رہے ہیں لیکن شہید گنج کی تحریک میں ایک نوجوان کی شہادت کے واقعہ کی صحت اپنی جگہ مسلم ہے۔

اسی طرح آغا صاحب نے بے شمار واقعات پر لکھا ہے اور اسلوب کی خوبصورتی کو برقرار رکھتے ہوئے لکھا ہے مگر واقعات کی صحت کہیں بھی مشکوک نہیں ہونے پاتی۔ آغا صاحب بعض اوقات رومانیت کے زیر اثر عالم خیال میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں ماضی کی داستان کہتے ہیں، لیکن جب واپس آتے ہیں تو انہیں حال پر منطبق اور مستقبل کیلئے نشانِ راہ بنا دیتے ہیں۔ اس کی مثالیں اُن کی کتاب "شب جائے کہ من بودم" میں موجود ہیں۔ جو انسان میں احساسِ عظمت کو اجاگر کرتی ہیں اور جسے رومانیت بھی کہا جا سکتا ہے۔

آغا صاحب کو دہلی کا لال قلعہ دیکھ کر مغلوں کی جوانمردی یاد آتی ہے۔ اور جامع مسجد کی اذان سے ذہن قرنِ اوّل کی طرف پلٹ جاتا ہے اور آگرہ میں نقشِ پا کی شوخیاں گمشدہ کاروانوں کا پتہ دیتی ہیں۔ گویا وہ ہر چیز میں احساسِ عظمت کے جویا ہیں۔ وہ کہتے ہیں

"فتح پور سیکری سنگ و خشت کے اوراق میں مغلئی عہد کا تذکرہ تھا۔ لیکن آگرہ میں نقشِ پا کی شوخیاں گمشدہ کاروانوں کا پتہ دے رہی تھیں، جامع مسجد دیکھی، قلعہ دیکھا، تاج محل دیکھا، معتمد الدولہ کا مقبرہ دیکھا، غرض ایک پورا عہد عمارتوں میں ملفوف تھا۔ اب ان پر کیا بیت رہی ہے، واللہ اعلم! لیکن تاج محل نے موت کو بھی حسین کر دیا تھا، قلعے سے مغلوں کی جوانمردی کا بانکپن ٹپک رہا تھا۔ جامع مسجد میں اذان سُنی جیسے قرنِ اوّل کی کوئی صبح گہری نیند سے جاگ اٹھی ہو ——— ان عمارتوں

---

[۱] بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل   شورش کاشمیری   ص نمبر ۹۵

کو ٹکر ٹکر دیکھتا رہا، کیا زمانے تھے جو ختم ہو گئے، کیا لوگ تھے، جنہیں موت چاٹ گئی۔ اور کیا رنگ تھا کہ پھیکا پڑ گیا، فی الجملہ صبحِ تمنا کے ماتھے پر شامِ تمنا کا جھومر لٹک رہا تھا۔" [1]

غرض آغا صاحب کے اسلوب میں ہمیں ایک عظمت کا احساس ملتا ہے۔ اُن کے ہاں مریضانہ رومانیت نہیں ہے اور نہ ہی حقائق سے دامن بچانے کی کوشش یا زندگی سے فرار حاصل کرنے کی سعی بلکہ ایک صحت مند رومانیت نے اُن کی نثر کے حُسن کو اور بھی نکھار دیا ہے۔

طنز

آغا صاحب نے جس بات کو "تیغ کے آثار" اور پروفیسر محمد سرور صاحب نے جس بات کو آغا صاحب کی نثر میں "کٹاؤ" کا نام دیا ہے جس کے حوالے پہلے آ چکے ہیں۔ وہ دراصل نثر میں آغا صاحب کا طنزیہ لہجہ ہے۔ آغا صاحب کا طنز عام طور پر بلیغ ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں کھُلا طنز بھی ملتا ہے اور بعض جگہ زہرناک بھی ہو جاتا ہے۔ سیاست اور صحافت میں آغا صاحب کا لہجہ تُند اور تیز ہے لیکن ادبی نثر میں اُن کے طنز نے نثر کو پُر لطف بنا دیا ہے۔ مثلاً

> "جلسہ ختم ہوا تو لوگوں نے آنکھوں پر بٹھایا، سادہ دل مسلمان ہاتھ چومنے لگے، بوڑھوں نے دعائیں دیں، نوجوانوں نے حلقہ باندھا، اُن سے کہیں زیادہ دلچسپ بار لیش اور بے ریش سی۔ آئی ڈی کے مسلمانوں کا "اخلاص" تھا۔ جو میرے گرد حلقہ باندھ کر پیچھے جا رہے تھے اور "شورش کاشمیری زندہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے دروازہ کی طرف بڑھے جا رہے تھے مجھے بھی یقین ہو چکا تھا کہ اب فرار مشکل ہے، جونہی باہر نکلے تو سامنے ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ پولیس کچھ ہم نسلوں اور ان کی دیسی اولاد سمیت پولیس کی بھاری جمعیت لئے کھڑا تھا، سپرنٹنڈنٹ آگے بڑھا اور کہا "رک جاؤ" نعرہ ہائے تکبیر تیز ہو گئے سی آئی ڈی کے "عقیدت مندوں" نے اپنا ہالہ اور مضبوط کر لیا۔" [2]

۱۔ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — شورش کاشمیری — ص نمبر ۲۲۵

۲۔ بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل — شورش کاشمیری — ص نمبر ۸۹

آغا صاحب کے متعلق جناب ملک حسن اختر صاحب نے لکھا ہے ۔

" اس کا ایک پہلو جلال ہے تو دوسرا جمال اور یہ دونوں مل کر ہی شورش کی تکمیل کرتے ہیں وہ ایک دریا کی مانند جب پہاڑوں سے گزرتا ہے تو ان کا سینہ چیرتا اور چٹانوں کو ریزہ ریزہ کرتا آگے بڑھتا ہے اور جب میدان میں آتا ہے تو جوئے خوش خرام کی طرح نغمہ بن جاتا ہے "[1]

ملک صاحب نے یہ بات اگرچہ آغا صاحب کی شخصیت کے حوالے سے کہی ہے لیکن یہ بات اُن کے نثری اسلوب پر بھی صادق آتی ہے کیونکہ کسی مصنف کا اسلوب ہی اس کی شخصیت ہوتی ہے ۔ جہاں تک آغا صاحب کی جلالی کیفیت کا تعلق ہے ۔ وہ ہمیں اُن کے خطیبانہ اندازِ نگارش میں نظر آتا ہے ۔ اور جمالی کیفیت نثر میں ان کا شاعرانہ رنگ ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے ۔

آغا صاحب کی نثر میں ہمیں مختلف اسالیب ملتے ہیں ۔ جس کا ذکر انہوں نے " پسِ دیوارِ زنداں " کے دیباچہ میں بھی کیا ہے

" کئی سال صرف اس کشمکش میں نکل گئے کہ اسلوب کیا ہو ؟ کئی اسلوب ذہن میں آکر نکل گئے "[2]

گویا آغا صاحب کا اسلوب دراصل اُن کے موضوع کے مطابق ہوتا ہے لیکن اسلوب خواہ وہ کوئی بھی اختیار کریں ، شاعری اور خطابت سے دامن نہیں بچا سکتے یہ اُن کے اسلوب کے بنیادی عنصر ہیں ۔ ملک حسن صاحب نے بجا طور پر آغا صاحب کو ایسے دریا سے تشبیہ دی ہے جو چٹانوں سے ٹکراتا اور میدانوں میں جوئے نغمہ خواں ہو جاتا ہے ۔ یہی بات ہمیں آغا صاحب کے نثری اسلوب میں بھی نظر آتی ہے ۔ بعض جگہ آغا صاحب ہمیں گرجتے اور برستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور پر شکوہ الفاظ آگ کے شراروں کی طرح اڑتے اور بکھرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن بعض اوقات نرم و نازک الفاظ برف کے گالوں کی طرح اترتے اور جمتے اور ایک دوسرے میں پیوست ہوتے نظر آتے ہیں مثلاً

" ہم دونوں الیس پی الیس کے عقبی باغیچہ میں چلے گئے اور درختوں کے تخلیہ میں ہو گئے ۔ اوم نے میرے زانو پر سر رکھ دیا ۔ دل اس کا نڈھال تھا کہنے لگا معلوم نہ تھا کہ پولیس اتنی ذلیل ہوتی ہے ۔

۱۔ ہفت روزہ چٹان ۲۶ ۔ مئی ۱۹۶۹ء شورش کاشمیری ملک حسن اختر ص نمبر ۷

۲۔ پسِ دیوارِ زنداں ۔ شورش کاشمیری دیباچہ ص نمبر ۱۲

اپنی لرزہ خیز سرگذشت شروع کی تو اس کی غزالی آنکھوں سے آنسوؤں کی پھوار بہہ گئی ۔ سولہ برس کا ایک خوبصورت کھلونا جس کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا ۔ کرشن کی بانسری کے سُروں سے اس کا پیکر بنا تھا ۔ لیکن آج یہ سُر ٹوٹ گئے تھے ۔"[1]

اسی طرح یہ عبارت ہے ۔ جس میں چھوٹے چھوٹے فقروں میں ہر بات کو خوبصورتی کے ساتھ ادا کیا گیا ہے ۔ یہ چھوٹے چھوٹے فقرے نہ صرف خود خوبصورت ہیں بلکہ الفاظ کی نرمی اور نزاکت میں بھی ایک حُسن ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے فقرے خیالات کو بہتر طور پر ادا کرنے کی صلاحیت لئے ہوئے ہیں ۔ عبارت میں کوئی ابہام یا جھول نہیں ہے بلکہ واقعی جوئے نغمہ خواں کی مانند یہ فقرے ایک دوسرے سے مل کر ایک ایسا آہنگ پیدا کرتے ہیں جنہیں نغمہ کہا جا سکتا ہے ۔

"اس رات یہ تمام تصویریں میری آنکھوں میں پھرتی رہیں ۔ میں کسی طرح بھی سو نہ سکا ۔ سوچتا رہا شبِ عروسی نہ تھی شبِ اسیری تھی نیند نے جیسے قسم کھالی ہو ۔ نمبردار نے تالا کھٹکھٹایا تو میں نے وقت پوچھا ۔"[2]

آغا صاحب کی نثر محض حسین و دلآویز ہی نہیں بلکہ انھوں نے خیال کے ابلاغ کو بھی مدِ نظر رکھا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ آغا صاحب اپنے خیال کے اظہار کو عملی جامہ پہناتے وقت حسن کاری کرتے ہیں ۔ یعنی فقروں کے صوتی آہنگ اور الفاظ کے دروبست نرمی و نزاکت ، سختی و کرختگی اتار چڑھاؤ اور تال میل کا خاص خیال رکھتے ہیں ۔

ایجاز و اختصار

آغا صاحب اپنی نثر میں جب خطابت کا جادو جگا رہے ہوتے ہیں تو تفصیل و تکرار سے کام لیتے ہیں اور حالات و واقعات کی جزئیات تک تصویر کے مختلف رنگوں کی طرح نمایاں ہوتی ہیں لیکن جب خطابت سے ہٹ کر لکھتے ہیں تو ایجاز و اختصار کو ملحوظ رکھتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ حالات و واقعات کی وسعت و تفصیل کو کوزے میں بند کر دیا ہے ۔ ایجاز و اختصار کسی بھی مصنف کے لئے ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے اس بات کا خطرہ ہمیشہ رہتا ہے کہ واقعات کا کوئی پہلو رہ نہ جائے کہ ابلاغ میں رکاوٹ پیدا ہو جائے ۔ بلکہ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ

۱-۲ پسِ دیوارِ زنداں ۔ شورش کاشمیری ص نمبر ۳۳ — ۳۷

واقعات اور خیال کی مختلف کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح مربوط اور پیوست ہوں کہ واقعات اور خیال کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے۔ یہ کم از کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات ادا کرنے کا فن ہے ظاہر ہے کہ الفاظ کی بلاغت ہی اس مشکل کا حل ہو سکتی ہے۔ آغا صاحب نے اپنی نثر میں ایجاز و اختصار جہاں بھی اختیار کیا ہے کامیابی سے ادا کیا ہے۔ مثلاً آغا صاحب اپنی قید کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ زمانہ کیسے بسر ہوا۔ اس سے پہلے آغا صاحب اپنی غربت اور بے بسی کی داستان لکھ چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ اس قید میں ان کے ساتھ کیسا سلوک ہوا۔ لیکن ان چند جملوں میں انہوں نے ساری باتوں کا خلاصہ تحریر کر دیا۔

"قید کا یہ زمانہ میں نے بغیر کسی آشنائی کے بسر کیا۔ والدہ کی بے سرو سامانی ہی سرو سامان رہی وہ دوسرے تیسرے مہینے ملاقات کیلئے آجاتے ہیں" [1]

اسی طرح ان چھوٹے چھوٹے فقروں میں معنی کی ایک دنیا آباد نظر آتی ہے

"عورت شادی سے پہلے روتی ہے اور مرد شادی کے بعد ہیں" [2]

"جو عورتیں پیشہ کماتی ہیں ان کے بچے نک سک میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں" [3]

اسی طرح اس عبارت میں اجمال و تفصیل دونوں موجود ہیں۔

"پنجابی خانہ بدوش قسم کے عیاش ہیں، ان کا متوسط کاروباری طبقہ جسم و آواز کی عارضی عیاشی کرتا ہے سندھ کے بڑے بڑے زمینداروں کی عیاشی ساون بھادوں کی ہے لیکن سرحد کے بعض خوانین سدا بہار عشق کے قائل ہیں۔ ان کے ہاں دولت پھٹی پڑتی ہے۔ یہ لوگ نہ صرف کئی کئی بیویاں کرتے ہیں بلکہ ایک آدھ رنڈی کو گھر میں ڈالنا بھی جزو زندگی سمجھتے ہیں۔ ان کا کاٹا ہوا پانی نہیں مانگتا۔ پچھلے ایک برس میں کوئی بتیس رنڈیاں ان کے ہاں گئیں نکاح پڑھوایا مگر ایک ہی برس کے اندر اندر

---

[1] پسِ دیوارِ زنداں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۵۳

[2] اُس بازار میں — " — ص نمبر ۱۶

[3] ایضاً — ص نمبر ۱۴۵

لوٹ آئی ہیں۔ ان میں سے ایک تنہائی کو دِق ہو گئی ہے۔"

ممتاز نے بات کو سمیٹتے ہوئے کہا ــــ کہ

" پنجابی کا عشق بھنورے کا عشق ہے، سندھی کا عشق مکھی کا عشق ہے اور پٹھان کا عشق چمگادڑ کا عشق ہے۔"[۱]

لفظی تصویر کشی

آغا صاحب کو یہ خاص ملکہ حاصل ہے کہ وہ حالات و واقعات اور افراد و شخصیات کی تصویر کشی اس خوبصورتی سے کرتے ہیں کہ یہ افراد و شخصیات چلتی پھرتی نظر آتی ہیں۔ تو حالات و واقعات کا نقشہ آنکھوں میں پھرنے لگتا ہے۔ لیکن اس کے لئے وہ کوئی لمبی چوڑی تمہید نہیں اٹھاتے۔ تفصیل میں نہیں جاتے بلکہ چند لفظوں کو مصور کے قلم کی طرح لکیروں کی صورت دیتے ہوئے تصویر بنا دیتے ہیں۔ جانی پہچانی شخصیتوں کی یہ تصویریں ان کی کتاب "چہرے" میں موجود ہیں یہاں ہم ایک اجنبی چہرے کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ جس سے شاید کوئی بھی واقف نہیں لیکن یہ لفظی تصویر صاحب تصویر کے خوبصورت ہونے کی دلیل ہے۔ یہ تصویر "اُس بازار میں" کی کسی خورشید نامی طوائف کی ہے۔

" خورشید کا رنگ ملیح ہے آنکھیں گول۔ پلکیں لانبی۔ قد میانہ ناک نقشہ تیکھا آواز کی اصل پنجابی لیکن لہجہ میں دہلی کا پیوند لگا ہوا ہے۔ عموماً لٹھے کی شلوار اور بھولدار قمیض پہنتی ہے۔ کانوں میں سونے کی بالیاں جھلمل جھلمل کرتی ہیں۔ نظر بظاہر کسی اچھے گھرانے کی آبرو معلوم ہوتی ہے۔"[۲]

آغا صاحب نے صرف چہروں ہی کی تصویریں نہیں بنائیں بلکہ ان کی نثر میں ہمیں جگہ۔ مقام اور واقعات کی منظر نگاری بھی ملتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ واقعات۔ جگہ یا مقام کہیں حقیقی ہیں اور کہیں تصوراتی۔ ذیل میں ایک تخیلاتی منظر دکھایا گیا ہے لیکن جگہ۔ مقام کردار اور واقعات حقیقی ہیں۔ آغا صاحب درحقیقت گزرے ہوئے واقعات کی باز آفرینی کرتے ہیں۔

۱؎ اُس بازار میں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۴۸/۱۴۹

۲؎ اُس بازار میں — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۰۲/۱۰۳

"رات کا اندھیرا ہوتے ہی احساسات کی شمعیں روشن ہو جاتیں خیالات کا بازار جگمگا اٹھتا شاعر جاگ اٹھتا اور کچھ دیر کے لئے چناب کے کناروں پر چلا جاتا موجوں کو گنگناتا ہوا پاتا کھیتوں کی ہریالی سے گمشدہ محبتوں کا پتہ پوچھتا اِدھر اُدھر کے کھنڈروں سے مرحوم دلوں کی دھڑکنیں سنتا ـــــــ کبھی یہ محسوس ہوتا کہ مہینوال چناب کے اس پار کھڑا عشق کا ساز اٹھا رہا ہے کبھی آنکھیں ملنے لگتا کہ سوہنی دریا کی خشمگیں موجوں میں گھری ہوئی ہے گھڑا "گھر" (گھل) رہا ہے طوفانی لہریں سوہنی کے ہونٹوں کو بوسہ دیتی اور ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ کبھی کسی موج سے گھرج کی لَے بلند ہوتی ہے کبھی موج پیچ و خم بن جاتی ہے ـــــــ سوہنی کہتی ہے میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی مہینوال میرا انتظار کر رہا ہے"[۱]

خاص الفاظ

جس طرح ہر مصنف یا ادیب کے کچھ خاص الفاظ ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنی تحریروں میں بار بار استعمال کرتا ہے اسی طرح آغا صاحب کے بھی کچھ خاص الفاظ ہیں۔ جنہیں انہوں نے بہ تکرار استعمال کیا ہے وہ اگر چاہتے تو اُردو زبان میں اُس سے بہتر الفاظ بھی موجود ہیں اور پھر آغا صاحب کا ذخیرہ الفاظ بھی بہت زیادہ ہے۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ تحریر کرتے ہوئے وہ مترادفات کے انبار لگا دیتے تھے لیکن نثر میں ہر جگہ وہی الفاظ استعمال کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آغا صاحب کے محبوب الفاظ ہیں اور یہی الفاظ دراصل آغا صاحب کی نثر کی انفرادیت بھی ہیں کیونکہ کسی مصنف کا ذخیرۂ الفاظ سے بھی اس کے اسلوب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اب اگر آغا صاحب کی نثر کو دوسروں سے الگ کرنا مقصود ہو تو ہم فوراً اُن کے محبوب الفاظ کو پہچان کر اُن کی دروبست کو دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ آغا صاحب کی نثر ہے ان الفاظ کو بھی ہم مختلف قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ مثلاً بعض الفاظ تو ایسے ہیں جنہیں آغا صاحب استعمال کرنے کے عادی ہیں۔ بعض الفاظ نثر میں حُسن پیدا کرنے کیلئے استعمال کرتے ہیں جو نرم اور شیریں ہوتے ہیں اور بعض پر شکوہ الفاظ ہیں جو دبدبہ اور طنز کیلئے استعمال کرتے ہیں مثلاً آغا صاحب کے کچھ پسندیدہ الفاظ یہ ہیں۔ جہاں تہاں۔ نک سک۔ ڈار۔ اُوتارو۔ ٹکر ٹکر۔ کر کرے۔ گھڑی چوڑیں۔ ٹاواں ٹاواں۔ گاہے ماہے۔ قافیہ ردیف۔ اناپ شناپ۔ تانا بانا۔ جلی خفی۔ طوفان۔ موجیں۔ طغیانی۔ سناونی۔ شناور۔ رند۔ رنگینی۔

اسی طرح یہ الفاظ بھی آغا صاحب کے پسندیدہ الفاظ ہیں جو عام طور پر طنزیہ پیرایہ کیلئے استعمال ہوتے ہیں۔ بے پالک۔ برات کا دولہا۔ ٹھینی کا پتہ۔ گماشتہ

---

[۱] پسِ دیوارِ زنداں   شورش کاشمیری   ص نمبر 115

یاران سرِ پل۔ بزرجمہر۔ کاسہ لیس۔ دوشیزہ کی کہہ مکرنی۔ لونڈی بسیوا۔ افراسیابی گنبد وغیرہ۔ مجموعی طور پر آغا صاحب کی نثر اور اسلوب دونوں منفرد ہیں۔ جو شاعرانہ رنگ۔ خطیبانہ لہجہ۔ رومانیت۔ طنز۔ جذبات کی شدت اور جوش و خروش کا حسین امتزاج ہے۔ پروفیسر محمد سرور صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے ۔

" اب رہی شورش صاحب کی نثر نگاری۔ اس میں جس چیز نے انہیں اپنی ایک خاص طرز کا مالک بنایا ہے وہ اُن کا خطیبانہ اسلوب بیان ہے۔ ان کی تحریریں ان کی خطابت کی سی روانی، تیزی اور زور ہے اسے پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو لکھتے وقت الفاظ کے لئے مطلق کاوش نہیں کرنی پڑتی۔ بس قلم سے اس طرح حروف نکلتے ہیں جیسے زبان سے الفاظ ـــــ ان کی تحریر میں بلا کی آمد ہے اور اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لئے جب وہ قلم ہاتھ میں لیتے ہیں تو گویا بہتر سے بہتر الفاظ از خود صف بستہ ہوتے جاتے ہیں ـــــ شورش صاحب جس طرح بے تکان بولتے ہیں اسی طرح وہ بے تکان لکھتے ہیں۔ اُن کی خطابت کی طرح ان کی تحریر میں بھی کہیں جھول یا آورد نہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ بے شک ایک ادیب کے لئے یہ ایک بڑی خوبی ہے لیکن شورش صاحب میں اس کے علاوہ ایک اور خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ہر موقع و محل کے لئے مناسب اور موزوں الفاظ انتخاب کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں یعنی اُن کے ہاں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی اور وہ دونوں سے کام لینا جانتے ہیں "[1]

---

[1] چہرے شورش کاشمیری پیش لفظ از پروفیسر محمد سرور ص نمبر ۱۶/۱۷

باب ٦

صحافت

صحافت

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے مطابق

"صحافت کا لفظ صحیفہ سے نکلا ہے۔ صحیفہ کے لغوی معنی ہیں کتاب یا رسالہ بہر حال عملاً ایک عرصہ دراز سے صحیفہ سے مراد ایسا مطبوعہ مواد ہے جو مقررہ وقفوں کے بعد شائع ہوتا ہے۔ چنانچہ تمام اخبار اور رسائل صحیفے ہیں اور جو لوگ ان کی ترتیب و تحسین اور تحریر سے وابستہ ہیں انہیں صحافی کہا جاتا ہے اور ان کے پیشے کو صحافت کا نام دیا گیا ہے۔[۱]"

مطبوعہ صحافت کے آغاز کا سہرا چین کے سر ہے۔[۲] لیکن اس صحافت نے جدید ترقی یورپ میں کی۔[۳] ہندوستان کا پہلا مطبوعہ انگریزی اخبار ایک شخص JAMES AUGUST جیمز آگسٹس ہکی نے جاری کیا۔[۴] اس اخبار کو HICKY'S GAZETTE ہکی گزٹ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔[۵] اور یہ ہفت روزہ اخبار تھا۔[۶] اس کے بعد کئی اور اخبار جاری ہوئے۔ لیکن ان اخبارات کا تعلق زیادہ تر ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی زندگی سے تھا۔ جن میں کلکتہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ کیونکہ یہ شہر انگریزی آبادی کا مرکز تھا۔ جناب محمد عتیق صدیقی نے اس دور کی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"اس میں شک نہیں کہ یہ اخبارات کلکتے۔ بمبئی اور مدراس میں چھپتے تھے۔ لیکن اس کے علاوہ ان اخباروں میں اور کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو ان میں کوئی ہندوستانی خصوصیت پیدا کرتی۔ اس دور میں صرف یہی نہیں ہوا کہ دیسی زبان کا کوئی اخبار شائع نہ ہوا۔ بلکہ ہندوستان کے یہ انگریزی اخبارات رنگ ڈھنگ۔ مزاج و قماش اور انداز و بیان کے اعتبار سے بھی ولایتی اخباروں کے خالص چربے ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے مالک اور ایڈیٹر بھی انگریز ہی ہوتے۔

---

۱ — صحافت کیا ہے؟ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — ص نمبر ۱۳۵

۲ تا ۵ — بحوالہ صحافت پاک و ہند میں " " " — ص نمبر ۲۰

۶ تا ۷ — ایضاً — ص نمبر ۲۵/۲۶

چنانچہ اٹھارویں صدی کی اخبار نویسی کو اگر ہم ہندوستان کی بدیسی اخبار نویسی کہیں تو یہ بات غلط نہ ہوگی۔[1]

اس کے بعد دیسی زبانوں میں بھی اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے۔ اردو صحافت کا پہلا اخبار ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو شائع ہوا۔[2] علاوہ ازیں اردو میں کچھ اور اخبار بھی جاری ہوئے۔ لیکن ملکی صحافت میں ترقی ۱۸۳۵ء کے بعد شروع ہوئی۔ جب سر چارلس مٹکاف کی وجہ سے صحافت آزاد ہوگئی۔[3] اس کے بعد کبھی کبھی ملکی اخبار بھی آزادی کے ساتھ رائے عامہ کی ترجمانی کرنے لگے[4] اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے چند ماہ پہلے تو اردو اخباروں کا لہجہ بڑا سخت ہوگیا تھا۔[5] لیکن جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حکومت نے اخبارات پر سختی کی۔ اس لئے ان کا لہجہ پھر سے نرم ہوگیا۔ انگریزی اخبارات نے مسلمانوں کے خلاف بہت زہر اگلا اور مسلمانوں کے بہت سے اخبارات بند ہوگئے۔ بقول ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اس انقلاب نے مسلمانوں کو عملاً صحافت سے بے دخل کر دیا۔[6]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہندوستان کمپنی کی بجائے حکومت برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ جب حالات بہتر ہوئے تو اخبارات نے بھی ایک نئے انداز اور قدرے محتاط لہجے میں بات کرنا شروع کی۔ جنگ آزادی کے بعد مسلمانوں کی صحافت میں سب سے نامور اخبار سر سید کا "سائنٹیفک سوسائٹی" اور "تہذیب الاخلاق" تھا۔ جناب منظور عباس نے اپنی پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالے میں سر سید کی صحافتی خدمات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

۱	ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)	محمد عتیق صدیقی	ص نمبر ۹۷
۲	بحوالہ اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ	ایس ایم ناز	ص نمبر ۱۰۴
۳	بحوالہ صحافت پاک و ہند میں	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	ص نمبر ۱۵۶
۴	بحوالہ صحافت پاک و ہند میں	″	ص نمبر ۱۵۴
۵	بحوالہ صحافت پاکستان و ہند میں	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	ص نمبر ۱۵۵
۶	صحافت پاکستان و ہند میں	″ ″	ص نمبر ۱۷۸

" اُردو صحافت کی تاریخ میں سرسید کی حیثیت اوّلین معمار کی ہے ۔ سرسید نے جہاں اُردو ادب کی
تاریخ میں نئے عہد کا تعین کیا، وہاں جدید اردو صحافت کی بنیاد مستحکم کی [1] "

تہذیب الاخلاق ایسا اخبار تھا ۔ جس میں خبروں کی بجائے مضامین چھپتے تھے [2] ۔ اس اخبار میں مسلمانوں کی تعلیمی ۔ مذہبی اور سیاسی حالت کی بہتری کیلئے مضامین لکھے جاتے تھے ۔ سرسید کی اصلاحی تحریک کا مقصد بھی یہی تھا ۔ کہ مسلمانوں کی تعلیمی ۔ مذہبی اور سیاسی حالت کو بہتر بنایا جا سکے ۔ سرسید نے یہ مضامین رچرڈ سٹیل اور جوزف ایڈیسن کی طرز پر لکھے [3] ۔ اور صحافت میں تہذیب الاخلاق "دی ٹیٹلر" اور "دی سپیکٹیٹر" کا مقلد تھا [4] ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے سرسید کو اُردو میں مضمون نگاری کا بانی "تہذیب الاخلاق" کے مضامین ہی کی وجہ سے قرار دیا ہے [5] ۔ ادبی حیثیت سے قطع نظر اردو صحافت میں بھی ان مضامین کو بلند مقام حاصل ہے ۔ تہذیب الاخلاق کے بعد مسلمانوں نے صحافت کی طرف خاص طور پر توجہ دی ۔ تاکہ اپنی قوم کی فلاح و بہبود کا کام کیا جا سکے ۔ لیکن

متحدہ ہندوستان میں جب مسلمانوں نے اخبارات نکالے تو ہندوؤں اور سکھوں کے
اخبارات پوری طرح اپنے قدم جما چکے تھے [6] ۔

ان حالات کے باوجود مسلم صحافت نے بھی اپنی کوششیں جاری رکھیں ۔ ان کی یہ کوششیں بار آور ہوئیں اور آخر کار ہندوستان کا کوئی اخبار بھی مسلمانوں کی صحافت کا مقابلہ نہ کر سکا ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبار "الہلال" مولانا محمد علی جوہر کے اخبار "ہمدرد" اور مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "زمیندار" نے صحافت کی دنیا میں ایک ایسا انقلاب پیدا

---

1. ابوالکلام آزاد (شخصیت اور فن) مقالہ نگار مظفر عباس — ص نمبر ۲۶۹/۲۶۸
2. بحوالہ صحافت پاکستان و ہند میں — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — ص نمبر ۲۲۰
3. بحوالہ صحافت پاک و ہند میں — عبدالسلام خورشید — ص نمبر ۲۴۳
5. بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کا جائزہ — ص نمبر ۲۴
6. اردو دائرہ معارف اسلامیہ — جلد نمبر ۵ — ص نمبر ۵۴۶

کیا جس کی پہلے کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اور اس طرح مسلمانوں کے یہ اخبار پورے ہندوستان کی اردو صحافت پر چھاگئے بقول آغا صاحب

"مسلمانوں میں اخبار نویسی ذرا دیر سے آئی لیکن جس سیاسی عہد کا ہم ذکر کر رہے ہیں "الہلال" "ہمدرد" اور "زمیندار" کو مسلمانوں کے سیاسی شعور کا نقیب کہا جاتا ہے۔ ان اخباروں نے گویا آگ ہی لگا دی۔ ان تینوں کے مالک و مدیر نہ صرف مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے محرک و معلم تھے بلکہ اس پائے کے اہل قلم اور سیاسی رہنما تھے۔ کہ انہیں ان خصائص سے الگ الگ کر کے تجزیہ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کے ایک عظیم دور کی بیداری یقیناً انہی کے قلم کی مرہون ہے[۱]۔"

اس دور کے تینوں اخبار نویس قومی رہنما بھی تھے اور ادیب و شاعر بھی چنانچہ ان رہنماؤں کی صحافت بھی ادب کا درجہ رکھتی ہے۔

صحافت اور ادب

صحافت ادب نہیں ہوتی یہ ایک جدید نظریہ ہے۔ حالانکہ اردو زبان کے بڑے بڑے صحافی ادیب اور شاعر پہلے تھے یا صحافی بعد کو۔ مگر موجودہ دور میں صحافت کیلئے ادیب اور شاعر ہونا ضروری نہیں۔ صحافت اب ایک پیشہ بن چکی ہے۔ اس کی حیثیت اب ایک کاروبار کی ہے۔ جس میں گاہک کی مانگ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اور اخبار نویس تزئین و آرائش۔ نقادوں اور مختلف رنگوں کے استعمال سے اخبارات کو خریداروں کیلئے جاذب نظر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقول آغا صاحب

روزمرہ چند تصویر بتاں
ہو گیا گہنا ہر اک اخبار کا[۲]

حقیقت یہ ہے کہ صحافت کی دلہن نے بڑے ہی قیمتی گہنے پہننے شروع کر دیئے ہیں۔ سامانِ آرائش و زیبائش کی فراوانی نے اس کے ظاہری حسن کو چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کے عشاق کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔

۱۔ ہفت روزہ چٹان شورش کاشمیری ۲۲ جولائی ۱۹۶۳ء
۲۔ ہفت روزہ چٹان شورش کاشمیری ۲۲ اگست ۱۹۶۴ء

لیکن یہ اپنے عشاق کیلئے تسکین روح نہیں بلکہ صرف ذوقِ نظر کی تسکین کا باعث ہے ۔ غازہ کی ملمع کاری نے اُس کے چہرہ سے وہ کشش چھین لی ہے ۔ جو عشاق کیلئے تسکین قلب و جان کے سامان پیدا کر دیا کرتی ہے ۔ اسی لئے کہ اب صحافت کاروبار ہے ۔ پہلے عبادت ہوا کرتی تھی ۔ صحافی اپنے علم و فضل ۔ سیرت و کردار اور اپنی شخصیت کے جذبہ سے لوگوں کے خیالات میں انقلاب برپا کیا کرتے تھے ۔ وہ انہی خیالات کا پرچار کرتے تھے ۔ جن پر وہ خود بھی عمل پیرا ہوتے تھے ۔ حق گوئی اور دیانت داری اُس زمانے کی صحافت کے بنیادی اوصاف تھے ۔ وہ صحافی انسانیت کی اعلیٰ اقدار اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے معمار تھے ۔ وہ لوگوں کو آزادی ۔ حق گوئی ۔ عزت نفس ۔ قربانی و ایثار کی دعوت دیتے تھے اور اپنے معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتے تھے ۔ وہ ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھاتے تھے ۔ اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار یعنی انصاف و حریت کی دعوت دیتے تھے ۔ جن کا فقدان انسانیت کی تذلیل کا باعث ہوتا ہے اور یہی وہ مقام ہے ۔ جہاں صحافت بھی ادب بن جاتی ہے ۔ بقول جناب مسکین حجازی

"معیاری صحافت انسانی مسائل کے حل کا راستہ بتاتی ہے ۔ عوام کی رہنمائی کرتی ہے ۔ اعلیٰ پایہ کے ادیب کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے ۔ ادیب ذرا مختلف انداز میں معاشرے اور حالات کو تبدیل کر کے اپنے تصور کے مطابق بنانے کے آرزومند ہوتے ہیں ۔ معیاری صحافت ۔ ظلم ۔ ناانصافی اور استحصال کے خاتمے اور بلند انسانی اقدار کے فروغ کو اپنا مشن بناتی ہے [1] ۔"

لیکن اس کے باوجود ادب و صحافت کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ مثلاً خبر کیلئے صداقت کا ہونا ضروری ہے [2] ۔ جب کہ ادیب اپنے تخیل سے بھی کام لے سکتا ہے ۔ اسی طرح صحافت میں معروضیت ہوتی ہے ۔ اور ادب میں داخلیت [3] ۔ اس کے علاوہ صحافت کی حیثیت وقتی یا ہنگامی ہوتی ہے [4] ۔ جب کہ ادب میں زیادہ دیر تک زندہ رہنے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ غرض ادب اور صحافت میں کچھ اقدار مشترک ہیں اور کچھ متضاد ۔ لیکن ایک بلند پایہ صحافی اپنے زورِ قلم سے صحافت کو ادب بنا

---

[1]	صحافتی زبان	مسکین حجازی	ص نمبر ۲۰
[2-3]	بحوالہ صحافتی زبان	"	ص نمبر ۲۲
[4]	صحافتی زبان	مسکین علی حجازی	ص نمبر ۲۲

لیتا ہے ۔ جس کی مثالیں ہمیں پرانی صحافت میں عام ملتی ہیں ۔ صحافت کا یہ دور درحقیقت ادبی صحافت کا دور تھا ۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ

"اس صحافت کا قاری ادب کے قاری سے مختلف نہ تھا اس لئے ابتدائی اخبار نویسی ادبی معیاروں اور ادبی نثر نویسی کے جملہ لوازم سے روشناس تھی ۔ اس وقت صحافت پیشے کے طور پر جداگانہ طور پر متشخص نہ ہوئی تھی اور اس اعتبار سے صحافت ادب ہی کی ترجمانی اور ترسیل کا فریضہ ادا کرتی رہی ہے[1]"

یوں تو اردو صحافت کی تاریخ میں "الہلال" کے اجراء سے بلکہ قیام پاکستان کا دور بڑا ہی ہنگامہ خیز ہے ۔ لیکن تحریک خلافت کے بعد ملکی سیاست نے جو رخ اختیار کیا ۔ اس میں پنجاب اور خاص طور پر لاہور کے اخبارات کا بڑا حصہ ہے ۔ ویسے بھی لاہور کو آزادی کی تحریک میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے ۔ اس زمانے کے اخبارات کا جائزہ ہمیں آغا شورش کاشمیری کی صحافت کو سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتا ہے ۔ کیونکہ آغا صاحب کی صحافتی زندگی کی نشوونما لاہور کی صحافت کے اسی ہنگامی دور میں ہوئی ۔ جب آغا صاحب نے شعور کی آنکھ کھولی اور صحافت کی طرف متوجہ ہوئے تو اس وقت لاہور میں "زمیندار" کا طوطی بولتا تھا ۔ "پرتاپ" ۔ "ویر بھارت" اور "ملاپ" ہندوؤں کے اخبار تھے جن سے مسلم اخبارات کی چشمک رہتی تھیں ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لاہور کے تمام اخبارات شام کو شائع ہوا کرتے تھے[2] ۔ سب سے پہلا اخبار جو صبح کے وقت شائع ہوا "پرتاپ تھا"[3] ۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ سبھی اخبار صبح کے وقت شائع ہونے لگے[4] ۔ یہ وہ دور ہے جس میں بھگت سنگھ کے بم ۔ علم الدین کے خنجر ۔ شدھی اور سنگھٹن کے رگڑے اور تبلیغ و تنظیم کے ڈنڈے برستے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ مولانا ظفر علی خان اپنی طبیعت کے اعتبار سے ایسے ہی ہنگاموں کے آدمی تھے ۔ لہٰذا انہوں نے تمام ہندو پریس کا تن تنہا مقابلہ کیا ۔ ہندو مسلم اخبارات کی اس چشمک کے متعلق جناب وقار انبالوی تحریر کرتے ہیں کہ

"ہندو اور مسلمان اخباروں میں باہمی آویزش کے دو عنصر تھے مسلمانوں کی سادگی اور برہمن

---

[1] صحافتی زبان مسکین علی حجازی دیباچہ ڈاکٹر وحید قریشی ص نمبر ۸

[2 تا 4] بحوالہ چٹان ۲۹ ۔ مئی ۱۹۶۷ء مضمون اردو صحافت آج سے چالیس سال پہلے
از ۔ ساگر چند مہاجن معروف بہ گورکھا ص نمبر ۹

کا تختۂ زناری ہندو پریس مسلمانوں کو پردے کی پابندی - چار نکاحوں کی اجازت اور انگریز پسندی کے طعنے بڑھ چڑھ کر دیتا تھا - لیکن چونکہ فکری طور پر خود اُس کا ذہن پراگندہ اور ادبی حیثیت سے ہندو اخبار فرومایہ تھے - اِس لئے ان کی بات اتنی موثر نہ تھی -[1]

جناب وقار انبالوی نے اِس مضمون میں مولانا ظفر علی خان کے بہت سے معرکوں کا ذکر کیا ہے - جن میں ہندو پریس اپنے پورے سازو سامان کے باوجود بے بس نظر آتا ہے - تاہم اِن واقعات سے یہ حقیقت ضرور سامنے آجاتی ہے کہ اِس زمانے کی صحافت میں ہندو مسلم کی تخصیص اور قوم پرستی اُسی طرح موجود ہے جس طرح کہ سیاست میں ہندو مسلم کی آویزش نظر آتی ہے - مولانا ظفر علی خاں کے لہجے کی تندی - تیزی اور قلم کی کاٹ ایسے ہی معرکوں میں ایک خاص رنگ اور ایک خاص کیفیت پیدا کر دیا کرتی تھی - چونکہ مولانا ظفر علی خان کا اخبار اس زمانے کی صحافت کا نمائندہ اخبار ہے - لہٰذا اِس کی دیکھا دیکھی دوسرے اخبارات نے بھی وہی رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی ہے - لیکن مولانا ظفر علی خان کی زبان دانی اور علم وفضل کی فراوانی کے سامنے وہ یا تو درجۂ ادب سے گر گئے یا ابتذال اور رکاکت کا شکار ہو گئے - مولانا ظفر علی خان کے علاوہ مسلمان اخبار نویسوں میں مولانا عبدالمجید سالک - مولانا غلام رسول مہر - سید حبیب - چراغ حسن حسرت اور مولانا مرتضیٰ احمد میکش نمایاں حیثیت رکھتے تھے - مولانا ظفر علی خان صرف ہندوؤں کا محاسبہ ہی نہیں کرتے تھے - بلکہ انہوں نے انگریز کے متکبر اور مغرور حاکم صوبہ تک کو رگید ڈالا - مولانا ظفر علی خان حق گوئی اور بے باکی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے - انہیں کسی قسم کا خوف یا لالچ حق بات کہنے سے نہیں روک سکتا تھا - یہی وجہ ہے کہ انگریز حکام مولانا ظفر علی خان کے قلم سے خوف کھاتے تھے - غرض اِس مخاصمت - اختلاف - فرقہ پرستی - انگریز دشمنی - ہندو کی چالبازی کی فضا میں آغا شورش کاشمیری نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو مولانا ظفر علی خان کو اپنا رہنما اور اُن کی صحافت کو اپنا نصب العین بنایا - آغا صاحب کی صحافت میں ہمیں اس زمانے کی صحافت کی ساری خصوصیتیں اور مولانا ظفر علی خان کی صحافت کے سارے انداز و اشارات نظر آتے ہیں - بلکہ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آغا شورش کاشمیری اس زمانے میں مولانا ظفر علی خان کی صحافت کے تنہا وارث

---

[1] چٹان ۳ - اپریل ۱۹۶۷ء ص نمبر ۱۲ مضمون ہندو مسلم اخبارات کی چشمکیں تحریر وقار انبالوی

بقول ڈاکٹر عبد السلام خورشید

"شورش کاشمیری کے اٹھ جانے سے اُردو صحافت کی تاریخ کا وہ دور ختم ہو گیا۔ جس کا آغاز مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔[1]"

شورش بحیثیت صحافی

آغا صاحب کے دل میں اخبار نویسی کا شوق "زمیندار" سے پیدا ہوا۔ اور اخبار نویسی کی راہ پر لانے والے روزنامہ "سیاست"، کے مقبول انور داؤدی تھے۔ مگر اخباری نویسی میں آغا صاحب پر سب سے زیادہ اثر مولانا ظفر علی خان کا ہے۔[2]

آغا صاحب نے سب سے پہلے "سیاست" میں لکھنا شروع کیا لیکن صحافت کا باقاعدہ آغاز "زمیندار" سے ہوتا ہے۔ علامہ تاجور نجیب آبادی کے اخبار "شاہکار" کے بھی ایڈیٹر رہے۔[3]

حافظ علی بہادر اپنے اخبار الہلال کا ایڈیٹر آغا صاحب کو بنانا چاہتے تھے مگر آغا صاحب آمادہ نہ ہوئے بلکہ لاہور سے افتتاحیہ لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے۔[4] مجلس احرار نے اپنا اخبار "آزاد" نکالا تو شیخ حسام الدین مدیر مسئول بن گئے۔ اور آغا صاحب کو نصر اللہ خاں کے ساتھ ادارۂ تحریر میں شامل کیا گیا۔[5] تقسیم ہند کے بعد جب اس اخبار کی تجدید ہوئی تو آغا صاحب مدیر ہو گئے۔[6] "آزاد" میں آغا صاحب نے ہندو نیشنلزم کے خلاف سخت اداریے لکھے۔ جس کی وجہ سے "آزاد" کو پہلے پندرہ دن کے لئے اس کے بعد ایک ماہ کیلئے بند کر دیا گیا۔ اور آغا صاحب پر سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ قائم ہوا کہ انہوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف سخت تنقید کی ہے۔ یہ مقدمہ تقسیم کے بعد خارج ہوا۔[7]

۱	وے صورتیں الٰہی	ڈاکٹر عبد السلام	ص نمبر ۲۰۷
۲-۳	بحوالہ شورش کاشمیری	از انور عارف	ص نمبر ۱۱۳
۴	بحوالہ بوئے گل	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۷۳
۵	بحوالہ صحافت پاک و ہند	ڈاکٹر عبد السلام خورشید	ص نمبر ۴۶۵
۶	بحوالہ بوئے گل	شورش کاشمیری	ص نمبر ۱۸۴

یکم جنوری ۱۹۴۹ء کو آغا صاحب نے "چٹان" کا ڈیکلریشن حاصل کیا اور ستمبر ۱۹۴۹ء میں "آزاد" سے الگ ہو گئے اور پوری ذہنی سے چٹان کی اشاعت میں لگ گئے[1]۔ آغا صاحب کے نزدیک

"صحافت ایک عبادت ہے جس طرح عبادت میں شرک کا تصور مسلمان کے نزدیک حرام ہے۔ اسی طرح صحافت میں جو خیال، نظریہ یا چیز طمع و حرص یا فریب و ہوس کی بدولت راہ پاتی ہے سب سے بڑی معصیت ہے[2]۔"

آغا صاحب نے اپنی پوری صحافتی زندگی میں اس نظریئے سے انحراف نہیں کیا۔ آغا صاحب نے جب میدان صحافت میں قدم رکھا تو اس وقت ہندوستان کی مسلم صحافت کے نامور ترین نام مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ظفر علی خاں تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد سے آغا صاحب کو ابتدا ہی سے گہری عقیدت تھی جو ہمیشہ بڑھتی رہی۔ آغا صاحب نے اپنی ابتدائی زندگی یعنی ۱۹۲۲ء میں میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا کے گھر پر مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت امامت کی تھی[3]۔ آغا صاحب ابتدائی عمر میں جس کتاب سے بہت زیادہ متاثر ہوئے وہ ابوالکلام آزاد کا عدالتی بیان تھا اور "الہلال" کے مطالعہ نے ہی آغا صاحب کو جوان کیا[4]۔ غرض وہ ابوالکلام کو ہندوستان میں امام ابن تیمیہ اور ہندوستان کے دوسرے بقراط قرار دیتے ہیں۔ جنہیں قوم کے ہاتھوں زہر کا پیالہ پینا پڑا[5]۔ اسی طرح ظفر علی خاں سے بھی اُن کی عقیدت کا یہی عالم تھا۔ آغا صاحب "زمیندار" ابتدائی عمر ہی سے پڑھتے تھے۔ مولانا کا بیشتر کلام زبانی یاد تھا۔ مولانا کی رفاقت میسر تھی۔ آغا صاحب کو سیاسی جنم دینے والا زمیندار ہی تھا[6]۔ اس پس منظر میں جب آغا صاحب نے "چٹان" کا اجرا کیا تو "چٹان" کا صحافتی عقیدہ

---

۱ چٹان شورش نمبر سوانحی خاکہ ص نمبر ۵

۲ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۱۱/۱۱۲

۳ چٹان جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۱۸ یکم مئی ۱۹۴۷ء ص نمبر ۱۸

۴ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۴

۵ ایضاً ص نمبر ۱۱

۶ بحوالہ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۴

وہی تھا جو "الہلال" کا تھا۔ مگر صحافتی روش "زمیندار" کی اپنائی۔

مولانا ابوالکلام اِس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہے وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کیلئے ایک دھبہ اور سر تا سر عار ہے۔ ہم اخبار نویسی کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں (امر بالمعروف و نہی عن المنکر) کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیئے اور چاندی اور سونے کا تو سایہ بھی اُس کیلئے سم قاتل ہے[1]۔"

آغا صاحب بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ

"قلم کی عصمت ماں بہن کی عصمت ہے، قدرت جن لوگوں کو فکر و نظر کا جوہر بخشتی ہے اس لئے نہیں کہ اس کو فروخت کیا جائے اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جائیں[2]۔"

مولانا ابوالکلام آزاد کو کسی ریاست کے ایک بزرگ نے کچھ رقم کا چیک ارسال کیا تاکہ "الہلال" کی ذمہ داریوں میں معاون ہو۔ مولانا نے "الہلال" میں اس بزرگ کا شکریہ ادا کیا اور لکھا

پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ کا یہ عطیہ کس مقصد سے ہے؟ اگر آپ مجھ کو خریدنا چاہتے ہیں تو یہ رقم ایک گرانقدر قیمت ہے۔ میں تو اپنی قیمت میں گھاس کی ایک ٹوکری کو بھی گراں سمجھتا ہوں۔ شاید چاندی اور سونے میں پلے ہوئے رؤسا کو خریدنے کیلئے اتنا روپیہ مطلوب ہو ورنہ ہم ایسے خاک نشین درویشوں کی ایک پوری جماعت مفت میں مل جائے۔ لیکن ہاں اگر اس سے میری (رائے) اور میرا (ضمیر) خریدنا مقصود ہو تو باادب واجب عرض ہے کہ ان

---

[1] ہفتہ وار "الہلال" ابوالکلام آزاد شمارہ نمبر ۳ جلد نمبر ۲ (عکسی فائل) ۲۲ جولائی ۱۹۱۲ء ص نمبر ۷۰
[2] شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۱۰/۱۱۱

خزف ریزہ ہائے طلائی کی تو کیا حقیقت ہے (کوہ نور) اور (تخت طاؤس) کی دولت بھی جمع
کر لیجئے۔ جب بھی وہ مع آپ کی پوری ریاست کے اُس کی قیمت کے آگے ہیچ ہیں۔ یقین کیجئے
کہ اس کو تو سوائے شہنشاہ حقیقی کے اور کوئی نہیں خرید سکتا وہ ایک بار خرید چکا ہے۔

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں [1]"

آغا صاحب نے بھی صدر ایوب کو دسمبر ۱۹۶۷ء میں ایک رجسٹرڈ خط لکھا جو انہوں نے اپنی کتاب "موت سے واپسی" میں نقل کیا اُس میں بھی یہی نظریہ کارفرما ہے۔ آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"ہم تہی دست ضرور ہیں لیکن ہمارا فقر غیور ہے۔ پیسہ لے کر سیاسی کام کرنا یا خطابت کا معاوضہ چاہنا ایمان کی جانکنی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انسان ماں بہن کو چکلے میں بٹھا کر روزی پیدا کرے [2]"

غرض آغا صاحب نے "چٹان" کا جو منشا و مقصد تحریر کیا ہے اُس میں بھی کم و بیش یہی نظریہ کارفرما ہے آغا صاحب "چٹان کا منشا و مقصد" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں۔

"پہلے دن بھی اس کا طغرائے امتیاز یہی تھا کہ جس بات کو حق سمجھو اس کو بے کم و کاست کہہ ڈالو آج بھی اس کا طبوۂ امتیاز یہ ہے کہ حق کا ساتھ دو خواہ وہ مسجد کے فرش پہ ہو یا میکدہ کی چوکھٹ پر۔ ہم اجتماعی طور پر ذاتی حیثیت سے جو محسوس کرتے ہیں وہ حوالۂ قلم کرتے ہیں۔ کوشش یہی ہے کہ کلمۃ الحق کی پشتیبانی ہو۔ اس کیلئے ہم نے ماضی مرحوم سے لے کر اب تک بے شمار صعوبتیں اٹھائی ہیں۔ اور جو کچھ حاصل کیا وہ قوتِ بازو سے حاصل کیا۔ اس پر کسی دوسرے کے انعام و

---

[1] ہفتہ وار "الہلال" ابوالکلام آزاد۔ شمارہ نمبر ۳ جلد نمبر ۱ (عکسی فائل) ۲۴ جولائی ۱۹۱۲ء ص نمبر ۶

[2] موت سے واپسی شورش کاشمیری ص نمبر ۵۱

احسان کی مہر نہیں لگی ہوئی۔[1]"

آغا صاحب موجودہ دور کے اخبار نویسوں کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ ذاتی خیالات اور ادارتی خیالات میں فرق ہوتا ہے[2]۔ یا یہ کہ قلم روزی پیدا کرنے کا وسیلہ ہے اور عقیدے کا تعلق ذات سے ہے۔ آغا صاحب کے نزدیک یہ ضمیر کی جانکنی ہے۔ یا پھر آبرو فروشی[3]۔ جسے آغا صاحب گناہ سمجھتے ہیں۔ مولانا غلام غوث ہزاروی نے ایک دفعہ لکھا تھا کہ چٹان شورش نہیں۔ شورش کا کاروبار ہے۔ اس پر آغا صاحب برہم ہوئے اور جواب دیا کہ

"چٹان ایڈیٹر کا پارہ دل ہے اور ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو دل صد پارہ کی نمائش فروخت کر کے ناموری حاصل کرتے ہیں[4]۔"

آغا صاحب نے ہمیشہ جو محسوس کیا وہ لکھا۔ سیاسی قائدین کے پیچھے نہیں چلے۔ بلکہ ہمیشہ سیاست دانوں کی سمت متعین کی اور نوجوانوں کو ذہنی قیادت فراہم کی۔ جو اعلیٰ صحافت کے مقاصد میں شامل ہے۔

جہاں تک "چٹان" کی صحافتی روش کا تعلق ہے۔ اس میں "زمیندار" کی تیزی اور ترشی کا عکس نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید "زمیندار" کے متعلق لکھتے ہیں۔

چونکہ اس کی پالیسی تیز اور ترش اور بے باک تھی۔ اس لئے لوگ زیادہ تر اسی کو خریدتے تھے[5]۔

آغا صاحب نے بھی اس بیباکانہ روش کو آگے بڑھایا۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

---

[1] چٹان جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۲، ۳ ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۶۷ء

[2] بحوالہ چٹان ۱۳ فروری سنہ ۱۹۶۷ء جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۷

[3] بحوالہ چٹان ۲۳ جنوری سنہ ۱۹۶۳ء جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۴

[4] چٹان ۲ دسمبر سنہ ۱۹۶۳ء جلد نمبر ۱۶ شمارہ نمبر ۴۸ ص نمبر ۳

[5] صحافت پاک و ہند میں عبدالسلام خورشید ص نمبر ۳۹۵

"جون ۱۹۵۳ء میں "چٹان" (ایک سالہ بندش کے بعد) دوبارہ نکلا اور فدیسٹ لابزل کا لاکھ شکر ہے کہ اپنی بے باکی روش کے ساتھ جوں کا توں چل رہا ہے[1]۔"

اس روش کے علاوہ

"مولانا ظفر علی خاں کے زمیندار کے مقاصد تھے۔ اسلام اور وطن کی آزادی[2]۔"

قیام پاکستان کے بعد آغا شورش کاشمیری نے چٹان کے ذریعے سے "اسلام اور آزادی کی حفاظت" کا فریضہ ادا کیا اور اسی کیلئے ساری عمر بر سر پیکار رہے۔

شورش کی شخصی صحافت

آغا شورش کاشمیری صحافت کی پرانی روایت کے علمبردار ہیں۔ صحافت کی اس قسم کو شخصی صحافت[3] یا تنہا نگار صحافت یا مونو جرنلزم[4] کا نام دیا جاتا ہے بقول جناب مسکین حجازی

"پہلے نامور اہل علم اور اہل قلم اہم مقاصد کی تکمیل کیلئے اخبار جاری کرتے تھے اور اخباروں میں ان کی اپنی تحریروں ہی کو غالب حیثیت حاصل ہوتی تھی۔ اگر کسی صحافی کی شخصیت کو اخبار سے علیحدہ کر دیا جاتا تو اخبار بے روح اور بے اثر ہو جاتا کم و بیش ہر ملک میں شخصی صحافت کا دور دورہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں محمد علی جوہر۔ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی صحافت شخصی صحافت کا نمونہ ہے۔ اس قسم کی صحافت میں ایسی انفرادیت ہوتی تھی جو ادب کے لئے مخصوص ہے[5]۔"

۱۔ چٹان ۳ جنوری ۱۹۵۵ء جلد نمبر ۸

۲۔ ظفر علی خاں اور اُس کا عہد عنایت اللہ نسیم ص نمبر ۷۲

۳۔ جناب مسکین حجازی نے اس صحافت کیلئے "شخصی صحافت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صحافتی زبان ص نمبر ۲۴

۴۔ جبکہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مونو جرنلزم کا ترجمہ "تنہا نگار صحافت" کیا ہے۔ وے صورتیں الٰہی ص نمبر ۱۰۷

۵۔ صحافتی زبان مسکین حجازی ص نمبر ۲۴

اب اگر شورش کاشمیری کی صحافت کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب کی صحافت کو بھی شخصی صحافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ آغا صاحب کے اخبار ہفت روزہ چٹان پر ہمیں آغا صاحب کی شخصیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ انہوں نے یہ اخبار کسی تجارتی مقصد کیلئے نہیں نکالا تھا اور نہ اُن کا مقصد روپیہ پیسہ ہی کمانا تھا بلکہ وہ چٹان کو احیائے اسلام کی تحریک کی آبیاری کیلئے استعمال کرتے تھے۔ اور چٹان میں زیادہ تر تحریریں خود آغا صاحب کی ہوا کرتی تھیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے تنہا نگار صحافت کی جو مثالیں دی ہیں۔ انہوں نے اس میں مندرجہ ذیل رسائل و اخبارات کا ذکر کیا ہے۔ گاندھی جی کا ہفت روزہ "ہری جن"، خواجہ حسن نظامی کا ہفت روزہ "منادی"۔ کمیونسٹ رہنما ایم۔ ایس رائے کا اخبار "انڈی پنڈنٹ انڈیا"۔ علامہ عنایت اللہ المشرقی کا ہفت روزہ "الاصلاح" اور آغا شورش کاشمیری کا ہفت روزہ "چٹان"[1]۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے اسی جگہ آغا صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ

> "مرحوم اداریے بھی لکھتے۔ شذرات بھی قلمبند کرتے۔ نظمیں بھی دیتے۔ مختلف قلمی ناموں سے کالم نویسی بھی فرماتے۔ ماضی کی یادوں پر مضامین بھی لکھتے اور گہرے مطالعہ کے دوران میں جو اقتباسات دلچسپ نظر آتے وہ بھی درج کر دیتے۔[2]"

گویا ہفت روزہ چٹان میں زیادہ تر مواد آغا صاحب کے اپنے قلم سے ہوتا تھا۔ چٹان کا کوئی ایک شمارہ ہی اس کی تصدیق کے لئے کافی ہے۔ ہفت روزہ چٹان کے ہر شمارے میں واقعی زیادہ تر حصہ آغا صاحب کے قلم کا ہوتا تھا بلکہ جن دنوں آغا صاحب جیل میں ہوتے تھے ان دنوں بھی چٹان میں آغا صاحب کے قلم سے کوئی نہ کوئی تحریر موجود ہوتی تھی۔ بلکہ اب بھی اگر ہفت روزہ چٹان کو دیکھا جائے تو مسعود شورش صاحب، آغا صاحب کی کوئی نہ کوئی تحریر ضرور چھاپ دیتے ہیں۔ آغا صاحب کی زندگی میں چٹان میں اچھے اچھے لکھنے والوں کی تحریریں بھی شائع ہوا کرتی تھیں۔ تاہم زیادہ حصہ آغا صاحب کا اپنا لکھا ہوا ہوتا تھا۔ اسی لئے بعض اوقات آدمی حیران رہ جاتا کہ ایک تنہا شخص یہ سارا کام کیسے کر لیتا تھا۔

۱۔ بحوالہ وے صورتیں الٰہی — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — ص نمبر ۲۰۸

۲۔ وے صورتیں الٰہی — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — ص نمبر ۲۰۸

آغا صاحب کی صحافت "مجلاتی صحافت" کے زمرے میں آتی ہے۔ کیونکہ ہفت روزہ اخبار صحافت کی اسی قسم سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے "ریڈرز ڈائجسٹ" کے فرانسیسی ایڈیشن کے مدیر پیئر ڈینوPIERRE DENOYER کے حوالے سے مجلاتی ایڈیٹر کیلئے ان اوصاف کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔[1]

" اعلیٰ ذہنی تہذیب و تحسین۔ اعلیٰ فنی تربیت اور اخلاقی تعلیم

اعلیٰ ذہنی تہذیب و تحسین سے مراد یہ ہے کہ علم ادب اور عمرانی علوم میں گہرا مطالعہ ہو اور ایک آدھ غیر ملکی زبان میں بھی دسترس حاصل ہو۔

اعلیٰ فنی تربیت میں یہ چیزیں شامل ہیں۔ کسی مواد کو نئے قالب میں ڈھالنے اور اختصار سے پیش کرنے کا فن طباعت کے مختلف طریقوں سے آگہی۔ فوٹو گرافی میں دسترس۔ طباعت کے فن سے واقفیت۔

اخلاقی تعلیم میں عوامی بہبود اور صحافتی اخلاقیات سے واقفیت کے عناصر شامل ہیں۔[2]"

اِس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کچھ عمومی اور خصوصی اوصاف کا ذکر کیا ہے۔ جن میں قارئین کی نبض شناسی۔ قوت فیصلہ۔ تفوق کی صلاحیت۔ مقررہ وقت پر کام کرنے کی قابلیت۔ لکھنے والوں سے رابطہ۔ ابلاغ کا فن۔ زبان پر عبور۔ ڈیزائن کے اصول سے آگہی اور پروڈکشن کے عمل سے واقفیت وغیرہ شامل ہیں۔[3] ان تمام اوصاف کو ایک نظر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے کچھ اوصاف کا تعلق تو فنِ صحافت سے ہے۔ یعنی ڈیزائن یا پروڈکشن اور طباعت کے فن وغیرہ سے متعلق آگاہ ہونا۔ اور کچھ کا تعلق ایڈیٹر کی اُن صلاحیتوں سے ہے جن کی بنیاد پر وہ درحقیقت ایڈیٹر بنتا ہے۔ مثلاً اعلیٰ ذہنی تہذیب، علم و ادب اور دیگر عمرانی علوم سے آگاہی۔ زبان پر عبور اور ابلاغ کا فن وغیرہ۔

---

[1] بحوالہ فنِ صحافت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۰۵

[2] فنِ صحافت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۰۶/۲۰۵

[3] بحوالہ فنِ صحافت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۰۷/۲۰۶

جہاں تک آغا صاحب کی فنی تربیت کا تعلق ہے وہ بابائے صحافت مولانا ظفر علی خان کے زیر نگرانی ہوئی۔ "زمیندار" کا دفتر ایک اخبار کا دفتر نہ تھا بلکہ صحافت کا دبستان تھا۔ جس سے اردو کے بہت سے بڑے بڑے صحافیوں نے فیضان حاصل کیا۔ آغا صاحب نے اگرچہ کسی اسکول یا یونیورسٹی سے صحافت کی ڈگری حاصل نہیں کی تھی اور نہ ہندوستان ہی میں اس تعلیم کا کوئی انتظام تھا۔ بلکہ اخباروں کے دفاتر ہی فنِ صحافت کے اسکول اور یونیورسٹی ہوا کرتے تھے۔ جن میں آغا صاحب نے بچپن ہی سے اس فن کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی تھی۔ اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ آغا شورش کاشمیری فنِ صحافت کے جملہ فنی امور سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ اپنے طویل تجربے کے باعث اِس کی ایک ایک رمز سے واقف تھے۔ ثبوت کے طور پر "چٹان" کا کوئی بھی شمارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں تک دوسری خوبیوں کا تعلق ہے۔ وہ بھی آغا صاحب میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ علم و ادب شورش کاشمیری کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ علم کے قدیم و جدید پہلوؤں پر دسترس رکھتے تھے۔ عوامی نفسیات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ وہ عوام کے نبض شناس ہونے کے ساتھ ساتھ اِس فن سے بھی واقف تھے کہ عوام کے خیالات کو بلند تر مقاصد کیلئے کیونکر بدلا جا سکتا ہے۔

لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب میں مثالی ایڈیٹر کے تمام اوصاف موجود تھے۔ لیکن آغا صاحب کے اپنے نزدیک بھی مدیر کے کچھ اوصاف ہوتے ہیں۔ جن کی پابندی انہوں نے ساری صحافتی زندگی میں کی بلکہ دوسرے صحافیوں کو بھی اِن کے اپنانے کی ترغیب دی۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید نے جن اوصاف کا ذکر کیا ہے وہ اگرچہ جدید اور ہمہ گیر ہیں تاہم آغا شورش کاشمیری جن اوصاف کا ذکر کرتے وہ جدید نہ بھی ہوں تو عظیم ضرور ہیں۔ آغا صاحب کے نزدیک ایک مدیر میں ان صفات کا ہونا ضروری ہے۔

> ایک ایڈیٹر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کو ایماندار، بے لوث اور نڈر ہونا چاہئے جو تحریکیں پیدا کرتا، تنظیمیں بناتا۔ خیالات اگاتا اور جد و جہد کے میدانوں میں ایک سپہ سالار کے طور پر دشمن کی طاقت سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ ایڈیٹر خلوت میں جلوت پیدا کرتا ہے اور تخلیہ میں بیٹھ کر انجمن بناتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جس سے محلوں کے کنگرے ہلتے اور افراسیاب کے گنبد گرتے ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور صحافت نام ہے روزمرہ کی سچائی کا۔[1]

---

[1] شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۱۲ / ۱۱۳

آغا صاحب نے ایڈیٹر میں جن صفات کا ہونا ضروری قرار دیا ہے ۔ وہ صفات ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی بیان کردہ خصوصیات سے مختلف ہیں ۔ مگر صحافت کے مسلمات میں سے ہیں ۔ اِس لیئے ہم آغا صاحب کو بطور ایڈیٹر کے جناب عبدالسلام صاحب کی بیان کردہ خصوصیات پر نہیں پرکھ سکتے بلکہ اِس کیلئے ایک الگ پیمانے کی ضرورت ہے ۔ اور یہ پیمانہ ہمیں جدید صحافت کی بجائے پرانی صحافت سے لینا ہوگا ۔ کیونکہ اگر ہم موجودہ صحافت کا مقابلہ آغا صاحب کی صحافت سے کریں تو ہمیں آغا صاحب کی صحافت موجودہ دور کی صحافت سے مختلف نظر آتی ہے ۔ آغا صاحب نے اِس کے متعلق بعض جگہوں پر اشارے بھی کئے ہیں ۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ موجودہ دور کے اڈیٹر اچھے اڈیٹر نہیں ہیں ۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ صحافت کی ترقی کے ساتھ صحافت کی اقدار میں بھی تبدیلی آئی ہے ۔ جو خوشگوار نہیں اور یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پرانے صحافی جن کے آخری وارث شورش کاشمیری تھے موجودہ دور کی صحافتی اقدار کے مقابلہ میں اعلیٰ درجے کی صحافتی قدروں کے امین تھے ۔ موجودہ صحافت کی فضا کو مسموم کرنے میں پروپیگنڈے (PRO - Paganda) کا بڑا حصہ ہے ۔ اِس سلسلے میں اِس بات کو ملحوظ رکھنا بڑا ضروری ہے کہ

> پروپگنڈا (PRO - Paganda) اصل میں ایک موافق نشر یا نشرِ خیر کا عمل تھا اس کے برعکس (Con - Paganda) مخالف نشر یا نشرِ شر کی اصطلاح مستعمل تھی پروپگنڈے کے استعمال نے آج یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب یہ مثبت کی بجائے ایک منفی عمل بن چکا ہے یہی وجہ ہے ـــــ جب بھی ہم لفظ پروپگنڈا سنتے ہیں تو ہمارے ذہن میں فوراً ہی اس کے بارے میں جھوٹ اور شک کے احساسات ابھرتے ہیں [1] ۔

اور اِس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آج کی صحافت پروپیگنڈا کے منفی مفہوم سے متعلق ہے ۔ جب کہ پرانی صحافت میں ہمیں پروپگنڈا مثبت صورت میں نظر آتا ہے ۔ موجودہ صحافت میں پروپیگنڈا کا یہ عنصر مختلف صورتوں میں موجود ہے مثلاً اِس دور میں صحافت ایک صنعت ہے ۔ جس کیلئے بھاری سرمائے کی ضرورت ہے ۔ جس کا مقصد بھی یہی ہے کہ منافع کمایا جائے ۔ اس میں سرمایہ کار کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ ملک و قوم کی تعمیر اور فلاح و بہبود کے لئے کام

---

1 ۔ پروپگنڈا ۔ محمد علی چراغ ۔ ایتراڈیہ ۔ ص نمبر ۹ ۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

کرے بلکہ اصل مقصد روپیہ کمانا ہی ہوتا ہے ۔ باقی تمام چیزیں جن میں عوام کی بہتری بھی شامل ہو سکتی ہے ۔ ثانوی چیزیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ کاروبار میں ہمیشہ مانگ کا خیال رکھا جاتا ہے کہ گاہک کیا چاہتا ہے ۔ گاہک کی خواہش کے احترام میں ضروری نہیں کہ گاہک کی بہتری بھی مضمر ہو۔ اسی طرح اخباری صنعت سے تعلق رکھنے والے لوگ اس صنعتی ادارے کے ملازم ہوتے ہیں اور ان کا فرض اولین گاہک کی مانگ پورا کرنا۔ زیادہ سے زیادہ فروخت کو ممکن بنانے کے طریقے سوچنا اور لوگوں کو اپنے مال کی طرف متوجہ کرنا ہوتا ہے تاکہ زیادہ فروخت سے زیادہ منافع کمایا جا سکے ۔ مدیر سے لیکر اخبار بیچنے والے کارکن تک سبھی کو اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ اخبار کی اشاعت بڑھائی جائے۔ مدیر کا اس بات سے بہت ہی کم تعلق ہوتا ہے کہ رائے عامہ کی تعمیر کن خطوط پر ہو رہی ہے یا کن خطوط پر کرنی چاہیئے۔ وہ ایک پس پردہ گلوکار کی طرح نغمہ ریزیاں کرتا رہتا ہے ۔ لیکن لوگ اُس کی صورت ۔ سیرت ۔ کردار شخصیت ۔ اعمال اور افعال سے واقف نہیں ہوتے ۔ جس کی وجہ سے اخبار کی رائے میں اثر پذیری کا عنصر کم ہو جاتا ہے ۔

اِس کے علاوہ موجودہ صحافت کو اور بھی کئی قسم کے دباؤ برداشت کرنے پڑتے ہیں ۔ بقول محمد علی چراغ

> " اخبارات اپنی اپنی ذاتی پالیسیوں اور پارٹی کی پابندیوں کے علاوہ بھی دوسرے کئی افراد و اشخاص اور انجمنوں کے زیر اثر آجاتے ہیں ۔ صاحب ثروت اور با اختیار لوگ اپنے نظریات چھپوا کر انفرادی یا اجتماعی سطح پر لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اخبارات کی اپنی مالی مصلحتیں ہوتی ہیں ۔ کہ وہ غیر جانب داری اور صاف گوئی کا نعرہ لگاتے ہوئے بھی بعض حالات میں پروپگنڈے کا موجب اور ذریعہ بنتے ہیں[۱] "

اسی طرح اخبارات کیلئے اشتہارات چونکہ آمدنی کا ذریعہ ہیں لہٰذا اشتہارات دینے والی ایجنسیوں اور افراد کی مرضی اور منشا کا خیال بھی رکھا جاتا ہے[۲] ۔ حکومت کے زیر اثر چلنے والے اخبارات عوام سے زیادہ حکام کے دوست ہوتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں پرانی صحافت خاص طور پر شخصی صحافت جس سے آغا صاحب بھی متعلق ہیں ۔ مندرجہ بالا پابندیوں سے آزاد ہوتی تھی ۔

---

[۱] پروپگنڈا ۔ محمد علی چراغ ۔ ص نمبر ۵۸

[۲] پروپگنڈا ۔ محمد علی چراغ ۔ ص نمبر ۵۵

اِس میں کوئی شک نہیں کہ پرانے صحافی بھی اپنے مقصد کو فروغ دینے کیلئے پروپیگنڈا کیا کرتے تھے۔ لیکن وہ پروپیگنڈا مثبت اثرات کا حامل ہوتا تھا۔ اور جس میں ملک وقوم کی بہتری اور تعمیر وترقی کے سوا کوئی دوسری چیز مشکل ہی سے راہ پا سکتی تھی۔ کیونکہ شخصی صحافت کے علمبردار صحافی سیاسی رہنما بھی ہوتے تھے اور سیاست میں اُن کا ایک تعمیری مقصد ہوتا تھا۔ جس کا اعلان وہ ہمیشہ اپنے اخبار کے علاوہ عملی طور پر سیاست میں حصہ لے کر بھی کیا کرتے تھے۔ پیسہ کمانا اُن کا مقصد نہیں ہوتا تھا۔ اِسی لئے وہ کسی فرد یا ادارے کے زیر اثر نہ ہوتے تھے اور وہ ہر بات آزادی سے لکھنے کا حوصلہ رکھتے تھے جو اُن کے مقصد یا نظریے کا حصہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ہمیشہ فائدے کی بجائے نقصان اٹھانا پڑتا تھا لیکن وہ اپنے مقصد اور نظریے کی سچائی کو کسی مصلحت، لالچ یا فائدے پر قربان نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کے اخبار پر اُن کی شخصیت کی چھاپ بھی ہوتی تھی۔ قارئین جانتے تھے کہ کونسی بات کس مقصد کیلئے کہی جا رہی ہے۔ یہی وہ سچائی تھی جس کی وجہ سے قارئین اُن کے فدائین بھی تھے۔ اسی حق گوئی کی بدولت وہ تحریکیں پیدا کیا کرتے تھے اور رائے عامہ کی تربیت کے ادارے تسلیم کئے جاتے تھے۔ مقصد کی لگن۔ حق گوئی۔ جرأت۔ بے غرضی اور اخلاق کا اظہار انہیں قبولِ عام کی سند عطا کر دیتا تھا۔ اِس طرح صحافی اپنے قارئین کی قوت کے بل پر بڑے بڑے فرعون صفت حکمرانوں سے ٹکرا جاتے تھے۔ آغا شورش کاشمیری نے صحافت کی یہ روش اور عقیدہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد سے حاصل کیا تھا۔ وہ ساری زندگی اخبار نویسوں سے شاکی رہے۔ آغا صاحب آزادیٔ گفتار میں کسی عذر کو قبول نہیں کرتے وہ اپنے ہم عصر مدیروں سے سوال کرتے ہیں کہ

"کیا قلم کا پیشہ بھی عام پیشوں کی طرح ہے؟ کیا ایک جج سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ سرکاری خزانے سے تنخواہ پانے کے باعث اِس کا ہر فیصلہ حکومت کی منشا کے مطابق ہو اور قانون و انصاف کو سرکار کی منشا کے تابع کر دے۔ ظاہر ہے کہ بالکل نہیں! اگر ایک جج انصاف کو اغراض ومفادات کے ہاتھ ہبہ کر دیتا ہے تو نہ صرف وہ خدا و ضمیر کے نزدیک مجرم ہے بلکہ عاقبت میں بھی اِس کیلئے سخت گرفت ہے وہ انسانی سوسائٹی کو اپنے فیصلوں سے ان لوگوں کے حوالے کرتا ہے۔ جن کا وجود جرم و معصیت کا سرچشمہ ہے۔ خدا نے انسانوں کو بعض خصائص ارمغان کے طور پر دیئے ہیں۔ کفرانِ نعمت کا لفظ تو آپ نے سنا ہوگا۔ افسوس کہ قلمکاروں کی

جدید پود اِس سے نا آشنا ہے۔[۱]"

مندرجہ بالا اقتباس سے ہمیں جہاں نئے اخبار نویسوں کے طرزِ عمل کا پتہ چلتا ہے۔ وہاں یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ آغا صاحب کے نزدیک مدیر کی حیثیت ایک جج کی سی ہے۔ جسے ہر حال میں انصاف کرنا چاہیئے۔ خواہ وہ مدیر حکومت کے کسی ادارے سے وابستہ ہی کیوں نہ ہو۔ اُن کے نزدیک صحافت کا فن قدرت کا ایک تحفہ ہے۔ جس کی وجہ سے آخرت میں گرفت بھی ہوگی لہٰذا مدیر کو یہ نیکی ضائع نہیں کرنی چاہیئے کہ یہ گناہ کے مترادف ہے۔ لیکن صحافت کا موجودہ دور اِس نیکی کو ضائع کرنے کا گناہگار ہے۔ آغا صاحب موجودہ دور کے صحافیوں سے ناراض ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ

ع صحافی جور و استبداد کے ہیں پردہ دار اب تک[۲]

آغا صاحب کے نزدیک صحافی جور و استبداد کے اِس لئے پردہ دار ہیں کہ پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں خوشامد اور اقتدار پرستی راہ پا گئی ہے۔ آغا صاحب پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں ان عناصر کی نشان دہی اِس طرح کرتے ہیں۔

"ہمارے ہاں قومی زندگی میں ایک چیز بڑی تیزی سے داخل ہو کر ایک قسم کا آرٹ ہو گئی ہے کہ اِس تیزی سے انسان جوتے نہیں اتارتا جس پھرتی سے ہمارے ہاں کے بعض بلکہ بیشتر اخبار کانٹا بدل لیتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو طاقت کے اُفق پر طلوع ہوتا ہے اُن کے لئے مرجع ارادت ہو جاتا۔ اور ہر وہ شخص جو ڈوب جائے ان کے ہاں معتوب و مغضوب ہونے میں دیر نہیں لگتی، توازن اُن کے ہاں بالکل نہیں، یہی وجہ ہے کہ ملک و قوم کے بعض سانحوں میں ملک کے بیشتر بلکہ ۸۰ فیصد اخباروں کا بھی حصہ ہے اور وہ ان حادثوں کے ظہور میں برابر کے شریک ہیں۔ اس ذہنیت کے قلیل الاشاعت و کثیر الاشاعت روزناموں نے کس دور میں اپنے علاقوں میں خوشامد کے چراغ نہیں جلائے؟

---

۱ ہفت روزہ چٹان ایڈیٹر اور اخبار شورش کاشمیری ۱۳ فروری ۱۹۶۷ء ص نمبر ۵

۲ گفتنی و ناگفتنی شورش کاشمیری ص نمبر ۱۳۵

کس دور کی حکومت کے سربراہ سے ان کا ناطہ نہیں رہا۔[1]"

مندرجہ بالا اقتباس میں جو کچھ کہا گیا ہے۔ یہ صرف آغا شورش کاشمیری ہی کہہ سکتے ہیں اور شاید وہ ایسا کہنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ کیونکہ اُن کے اپنے دامن پر خوشامد یا اقتدار پرستی کا کوئی دھبہ نہیں۔ انہوں نے ہر دور میں حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی ہے۔ وہ اُن کی نگاہ عتاب کا شکار بھی ہوئے مگر انہوں نے کبھی حق گوئی اور بے باکی سے ہاتھ نہیں اٹھایا اور یہ بہت بڑی بات ہے کیونکہ پاکستان میں آج تک جمہوریت اپنی پوری خصوصیات کے ساتھ نہیں آئی۔ جو حکومتیں اپنے اپنے دورِ اقتدار میں جمہوری ہونے کی دعویدار تھیں وہ بھی حقیقت میں منتخب آمریت کا کھلونا تھیں۔ پاکستان میں بننے والے دساتیر اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں۔ کہ ہر دور کے دستور میں اختیارات کی قوت کسی فرد واحد ہی کے گرد چکر لگاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ فرد عوام کا منتخب نمائندہ ہی کیوں نہ ہو مگر طاقت کا ایک ہی مرکز پر ارتکاز اُسے آمریت کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔ ایسی حکومتیں اپنے نام سے جمہوری اور اپنے عمل سے آمریت کی مثالیں ہی ہوا کرتی ہیں۔ آغا شورش کاشمیری نے فوجی اور جمہوری آمریت کے ہر دور میں قلم کی آبرو کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ انہوں نے مارشل لاء کے خلاف لکھا اور جمہوری آمریت کو بھی معاف نہیں کیا۔ اخبار نویسی میں اُن کا نظریہ وہی تھا جو وہ سیاست میں رکھتے تھے اور اس پر عمل پیرا بھی تھے۔ یعنی "اسلام کا احیاء اور عوام کی فلاح"۔ آغا صاحب نے اپنے نظریے سے ٹکرانے والی قوتوں کا مقابلہ بڑی بہادری سے کیا ہے۔ اپنے نظریے کا حامی ایک حلقہ پیدا کیا۔ تحریکیں چلائیں۔ حکومتوں کے خلاف جدوجہد کی مگر یہ سب کچھ دعوت اور تبلیغ اسلام ہی کا حصہ تھا۔ آغا صاحب نے بطور صحافی ملک و قوم کو درپیش ہر قسم کے مسائل پر لکھا ہے جس میں غیر ملکی اور ملکی۔ سیاسی۔ سماجی۔ تعلیمی۔ تہذیبی۔ مذہبی۔ ثقافتی۔ صحافتی اور ادبی ہر قسم کے مسائل شامل ہیں۔

---

[1] چٹان ۳ جنوری ۱۹۷۲ء ص نمبر ۴

شورش کی صحافت کا فنی جائزہ

جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ فنی نقطہ نظر سے آغا صاحب کی صحافت "ہفتہ وار اور تنہا نگار" صحافت ہے۔ کیونکہ آغا صاحب جس اخبار کے مالک و مدیر تھے وہ ہفت روزہ تھا۔ آغا صاحب کے اِس اخبار پر اُن کی شخصیت کی چھاپ ہوا کرتی تھی۔ اور اس اخبار میں زیادہ تر مواد خود آغا صاحب کے قلم سے ہوتا تھا۔ لہٰذا فنی طور پر یہ صحافت شخصی یا تنہا نگار صحافت ہی ہے۔ ہفت روزہ صحافت اور خاص طور پر شخصی صحافت میں اخبار کا اداریہ سب سے اہم چیز ہوتا ہے۔ جس میں ایک شخص حالات و واقعات اور مسائل پر جو ملکی اور عوامی فلاح کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا سکے۔ وہ حالات و واقعات پر اس طرح اظہارِ خیال کرتا ہے کہ لوگ متاثر ہونے کے علاوہ ایک فعال قوت کے طور پر اُس کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔ چونکہ وہ لوگوں کے تعاون کا خواہاں ہوتا ہے لہٰذا قدرتی طور پر وہ عوام کے جذبات و احساسات کا ترجمان بن جاتا ہے۔ وہ حکومتوں اداروں اور مقتدر افراد کو لوگوں کے حقوق و مفاد کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ وہ حکومتوں کی بداعمالیوں کو طشت ازبام کرتا ہے۔ اُن کے نقائص اور خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ملک و قوم پر اُن کے نقصان دہ اثرات کا جائزہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تاکہ لوگ اپنے حقوق اور فائدے کیلئے متحد اور منظم ہوں۔ وہ حکومتوں۔ اداروں۔ جماعتوں اور افراد سے اس لئے لڑتا ہے کہ ان کے طرزِ عمل سے ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہوتا ہے۔ یا امکان ہوتا ہے کہ اُن کے طرزِ عمل سے بُرے اثرات مرتب ہوں گے۔ لیکن وہ یہ سب کچھ اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لئے نہیں کرتا بلکہ اس کے پس منظر میں اس کا وہ نظریہ۔ عقیدہ یا خیال ہوتا ہے جو بہرحال ملک و قوم کی فلاح کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ غرض وہ قوم کی اصلاح۔ بیداری۔ تنظیم۔ رہنمائی اور بھلائی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ اور ان تمام باتوں کو رائے عامہ کی تشکیل کے لئے اپنے اخبار میں مختلف طریقوں سے استعمال کرتا ہے جس میں سب سے اہم اداریہ ہوتا ہے۔ جناب مسکین علی حجازی نے بعض اداریہ نویسوں کے حوالے سے اداریہ کی تعریف کی ہے۔

"اداریہ اخبار کے رجحانات کو شعوری اور مربوط شکل میں پیش کرنے کا نام ہے" بعض مدیر تو حالات حاضرہ پر اخبار کی رائے قرار دیتے ہیں۔ اور کچھ اسے حالات حاضرہ پر مدیر کی رائے تصور کرتے ہیں۔[1]

---

[1] اداریہ نویسی کا فن۔ مسکین حجازی ص نمبر ۳

حجازی صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ اداریہ کی مندرجہ بالا تعریف ماضی کی صحافت کے بارے میں درست ہو سکتی ہے لیکن جدید دور پر یہ تعریف منطبق نہیں ہوتی۔[1] جدید اداریہ نویسی کے متعلق حجازی صاحب لکھتے ہیں کہ

"آج کل اداریہ صرف مدیر کے نقطۂ نظر، رائے یا اخبار کے رجحانات سے عبارت نہیں ہوتا۔ جدید اداریے میں بعض اوقات مسئلے کی توضیح یا تجزیے کو کافی سمجھا جاتا ہے۔ یعنی اس میں کسی رائے کا اظہار لازمی نہیں ہوتا بلکہ مسئلے کی تشریح اور اس کے دونوں رخ پیش کرنے کے بعد فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔"[2]

حجازی صاحب نے اداریہ نویسی کی جو قدیم و جدید تعریف کی ہے اُس کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو قدیم صحافت، جدید صحافت سے زیادہ مشکل، کٹھن اور آزمائش کا فن ہے۔ قومی اور بین الاقوامی حالات و واقعات پر اپنی ذاتی رائے لکھ کر لوگوں کے حوالے کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ جب لوگ اس دستاویز کو قدر و وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں اس قسم کے حالات میں الجھے ہوئے سیاسی قومی اور ملکی بلکہ دیگر ہر قسم کے مسائل پر ایک نپی تلی۔ قطعی اور موثر رائے دینا کسی بڑے ذہین، بڑی شخصیت اور بڑے رہنما کا کام ہی ہوتا ہے۔ شائد اسی مشکل سے نجات حاصل کرنے کے لئے جدید صحافت نے اپنی روش بدلی ہے کہ اس قسم کی رائے دینا اُس کے بس کی بات نہیں پھر ایک شخص کی جگہ انھوں نے اس کام کیلئے ادارے بنا لئے ہیں۔ اداریہ نویسی کیلئے خاص افراد کی خدمات حاصل کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے۔

"اب اخباروں میں جو اداریے درج ہوتے ہیں اُن میں شائد ہی کوئی اداریہ اڈیٹر کا لکھا ہوتا ہے اب اداریہ نگاری جن کارکنوں کے سپرد ہے وہ یا تو مدیر معاون کہلاتے ہیں یا انھیں اداریہ نگار کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جب صحافت ابتدائی مراحل میں تھی تو اداریہ نگاری کے موضوع سیاست اور بعض شہری مسائل تک محدود تھے۔ اس لئے اداریہ نگاری ایک ہی شخص کے سپرد ہوتی تھی۔ اب اداریوں کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع اور متنوع ہے اور بعض موضوعات پر قلم اٹھانے

---

[1] بحوالہ اداریہ نویسی کا فن مسکین حجازی ص نمبر ۱۵

[2] اداریہ نویسی کا فن . مسکین حجازی ص نمبر ۱۶

کیلئے تخصیص کا درجہ رکھتا ہے۔ اس لئے بڑے اخباروں میں اداریہ نگاروں کی تعداد زیادہ ہوگئی ہے"[1]

ڈاکٹر صاحب کے اس بیان سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور میں اداریہ نگاری ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ موضوعات میں زبردست اضافہ ہوگیا ہے۔ اخباروں میں ہر موضوع کے ماہر کی ضرورت ہوتی ہے لہٰذا اداریہ نگاری کیلئے ایک سے زیادہ آدمی مقرر ہوتے ہیں۔ اب اگر آغا صاحب کی اداریہ نگاری کو فنی طور پر دیکھا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ آغا شورش کاشمیری ہر قسم کے موضوع پر قلم اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن کے اداریوں کے موضوعات سیاسی اور بعض شہری مسائل تک محدود نہ تھے جو صحافت کے ابتدائی دور کی خصوصیت تھی اور جس کی طرف ڈاکٹر عبدالسلام صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس میں اشارہ کیا ہے۔ آغا صاحب کے اداریے ہر اس موضوع پر ملتے ہیں کہ جن کا تعلق ملک و قوم سے ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ پاکستان کا تعلق پوری دنیا سے ہے اور پاکستان بھی دوسری دنیا کی طرح ملکی اور بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہے اور دوچار رہا ہے۔ اور آغا صاحب نے ہر مسئلے اور ہر موضوع پر اداریے لکھے اور ہر اداریہ ایک ماہر کی طرح لکھا ہے۔ گویا موجودہ صحافت میں جس کام کیلئے بہت سے اشخاص کی ضرورت ہے وہ کام آغا صاحب تن تنہا کر دیا کرتے تھے۔ پھر آغا صاحب اپنے اخبار میں صرف اداریہ نگاری ہی نہیں کیا کرتے تھے بلکہ چٹان کے پرانے پرچے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی پرچے میں مختلف موضوعات پر آغا صاحب کی بہت سی تحریریں شامل ہوتی تھیں چٹان کے شماروں میں آغا صاحب کی تحریریں دیکھ کر بظاہر یہ بات ناممکن نظر آتی ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہفتے کی قلیل مدت میں اخبار کیلئے اتنا زیادہ موثر۔ وقیع سیاسی اور ادبی مواد فراہم کر سکے۔ لیکن آغا صاحب اکیلے ہی یہ کام ہر ہفتے انجام دیا کرتے تھے۔ جس سے اُنکی صحافتی مہارت کے علاوہ ان کی علمی۔ ادبی اور سیاسی بصیرت کا پتہ چلتا ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ شورش کاشمیری اکیلے ہی ایک ادارے کی حیثیت رکھتے تھے۔ جہاں تک جدید صحافت کی مشکلات کا تعلق ہے اس فن کی وسعت نے اس طریقہ کار بدل دیا اور افراد کی بجائے تجارتی ادارے صحافت سے منسلک ہو گئے ہیں۔ جدید صحافت اپنی وسعت کی وجہ سے ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہے لیکن جہاں علم و ادب یا البصیرت اور ذہانت کا تعلق ہے۔ موجودہ صحافت شخصی صحافت سے میلوں پیچھے ہے آغا شورش کاشمیری کی صحافت کا تعلق قدیم شخصی صحافت سے ہے لیکن زمانی اعتبار سے وہ موجودہ دور ہی کے صحافی تھے۔ جہاں تک

---

[1] فن صحافت ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۱۵۰

اُن کی صحافت کے فنی پہلو کا تعلق ہے۔ آغا صاحب ایک کامیاب صحافی تھے۔ انھوں نے ہر موضوع پر اداریے لکھے ہیں۔ مقالہ افتتاحیہ کے علاوہ آغا صاحب نے تقریباً ہر شمارے میں شذرات یا ادارتی نوٹ بھی لکھے ہیں۔[1]

"پہلے زمانے کے اخبارات و جرائد میں اکثر و بیشتر ایک ہی اداریہ چھپتا تھا یعنی مدیر رسالے یا اخبار کی ہر اشاعت میں صرف ایک مسئلے پر اظہار خیال کرتا تھا۔"[2]

لیکن آغا صاحب اپنے اخبار میں "صرف ایک مسئلے" پر اظہار خیال نہیں کیا کرتے تھے۔ بلکہ اُن کا موضوع مختلف قسم کے بہت سے مسئلے ہوا کرتے تھے۔ ملک کے چار پانچ مسئلے تو ضرور ہر ہفتے موضوع بنتے تھے۔ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ شذرات لکھ دیتے تھے۔ طنز و مزاح کے کالم میں بھی بعض اوقات کوئی نہ کوئی ملکی اور قومی مسئلہ ہی موضوع ہوتا تھا۔

---

[1] " ادارتی صفحے پر اخبار یا رسالے کے نام کی تختی کے نیچے شائع ہونے والا پہلا اداریہ " افتتاحیہ " یا مقالہ افتتاحیہ کہلاتا ہے ....
مقالۂ افتتاحیہ کے بعد چھپنے والے اداریے شذرات یا ادارتی نوٹ یا مختصر اداریے کہلاتے ہیں۔"
(اداریہ نویسی — مسکین حجازی ص نمبر ۹)

[2] اداریہ نویسی — مسکین حجازی — ص نمبر ۹

جہاں تک آغا صاحب کی اداریہ نگاری کا تعلق ہے اسکی چند مثالیں درج ذیل ہیں یہ ایک طویل مگر منفرد اداریہ ہے کیونکہ آغا صاحب نے اس میں پاکستان کی سیاسی تاریخ اجمالی طور پر لکھ دی ہے۔ انھوں نے اس اداریے میں خان لیاقت علی خان کے عہد حکومت سے یحییٰ خان کے دورِ حکومت تک سیاست دانوں کی کارگزاریوں اور کارکردگیوں کا جائزہ لیا ہے اور اُن سیاسی کوتاہیوں اور غلطیوں کی واضح نشاندہی کی ہے جن سے ملک میں جمہوریت نہ چل سکی۔ آخر میں سیاسی رہنماؤں اور سیاسی جماعتوں کو اس بات پر غور کرنے کی دعوت دی ہے کہ ملک کیلئے کوئی ایسا نظام حکومت تلاش کریں جس سے ماضی کی کوتاہیوں کا ازالہ ہو سکے۔ اس اداریے کا عنوان ہے۔

" کیا ہم انتخابی جمہوریت کے اہل ہیں؟ "

" ایوب خان کا زمانہ لد گیا۔ یحییٰ خان مارشل لاء کا اِستعارہ اُٹھا کر سامنے آئے انھوں نے بین الاقوامی طاقتوں کے ایماء پر اس فرض کو بکمال و تمام پورا کیا جو اُن کے سپرد کیا گیا۔ نتیجتہً ملک دو ٹکڑے ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تصویر کا ایک ہی رخ جانتے ہیں دوسرا رخ ہمیں معلوم ہی نہیں آخر یہ بات تو معلوم ہونی چاہیے کہ وہ کونسے لوگ تھے جنھوں نے مغربی پاکستان میں بیٹھ کر شیخ مجیب الرحمٰن کو حوصلہ دلایا یا اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ اگر ملک میں کوئی آئین ہوتا۔ آزادی ہوتی۔ عوامی نمائندے برسرِ اقتدار ہوتے اور عوام الناس کھل کے گفتگو کر سکتے تو پاکستان یہ بد نصیب دن کبھی نہ دیکھتا۔ ہماری آزادی کے عالم نزع کا ہی کرشمہ ہے کہ ہمارے سامنے یہ سب کچھ ہوتا رہا اور ہم جان بلب مریض کی طرح سبھی کچھ دیکھتے رہے۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے یہ خیال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ ہم پارلیمانی نظام اور انتخابی جمہوریت کے اہل ہیں یا نہیں؟ اس قدر عرض کرنا شاید بے جا نہ ہو گا کہ ہمارے جمہوری نمائندے اپنے اندر کوئی سکت نہیں رکھتے وہ پارلیمانی نظام کے حادثوں کی یادگار ہیں۔ اُن کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح منتخب ہو گئے ہیں اور انھیں نمائندگی کا اعزاز حاصل ہو گیا ہے۔ یہ چیز ہر مکتب خیال کے راہنما کے سوچنے کی ہے اور ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو اس پر غور کرنا چاہیے کہ ہم جس اَن پڑھ اور بے شعور ملک میں زندگی

بسر کر رہے ہیں کیا وہ پارلیمانی نظام اور انتخابی جمہوریت کے لائق ہے؟ اگر عوام کا ذہنی شعور پتھروں کی کی طرح منجمد ہو اور قومی حس کسی رعایت سے متحرک نہ ہو سکے تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے کہ ہم نہ تو اپنے ساتھ انصاف کر رہے ہیں نہ اپنی قوم کے ساتھ اور نہ ہی اپنے ملک ہی سے مخلص ہیں۔"[1]

ایک اور اداریہ ملاحظہ ہو یہ اداریہ اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ یہ اداریہ آغا صاحب کے اُس نصب العین کا ترجمان ہے جس کا قرآن کی پوری صحافت پر ہے وہ "عید یا دسہرہ" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"ہم ان حضرات سے کہنا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ جنت الحمقا میں بستے ہیں انھیں سوشلزم کا راگ الاپنے کا حوصلہ صرف اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ صوبائی یا مرکزی کابینہ میں ہیں اور وزیراعظم بھٹو کے مصاحب ہیں وگرنہ ع

شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے۔

وزیراعظم بھٹو انھیں دھتکار دیں یا وہ پیپلز پارٹی سے نکل جائیں تو ان کی حیثیت ہی نہیں رہتی پاکستان اس لئے نہیں بنا تھا کہ یہاں سوشلزم نافذ کیا جائے اور لادین اشتراکی ملت اسلامیہ کے سرخیل ہو جائیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اور اسلام کے بغیر پاکستان کا وجود معطل ہو جاتا ہے اس قسم کے لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ وہ اشتراکیت کی ڈونڈی پیٹ کر کسی تاریخی سفر کا فرض انجام دے رہے ہیں وہ پاکستانی عوام کی اکثریت کے مزاج و سرشت اور نہاد و خمیر سے نابلد ہیں یا اپنی ذہنی حماقتوں کے باعث اپنے ذہن کو پاکستانی عوام کا ذہن سمجھتے ہیں۔ وزیراعظم بھٹو پاکستانی عوام کی نفسیات سے کما حقہ واقف ہیں ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کو سوشلزم کی راگنی الاپنے سے روکیں جو پاکستان کی عید کو امانوں کی پیروی میں دسہرہ کی شکل دینا چاہتے ہیں۔"[2]

---

[1] چٹان ۴-اگست ۱۹۷۵ ص نمبر ۳/۴

[2] چٹان ۱۷ دسمبر ۱۹۷۴ء

فیلڈ مارشل محمد ایوب کا دورِ حکومت صحافت کیلئے کسی طور پر بھی خوشگوار نہ تھا۔ حکومت کے کارندے خوشامدی تھے اور یہی رویہ ذرائع ابلاغ نے بھی اختیار کر رکھا تھا۔ آغا صاحب نے اِس دور میں بڑے ہی طرح دار اداریے لکھے۔ درج ذیل اداریہ اُن میں سے ایک ہے جو نہ صرف فنی نقطہ نظر سے ایک نئی چیز ہے بلکہ اپنے اسلوب اور زبان کے اعتبار سے بھی منفرد ہے اور آغا صاحب کی جدت طرازی کی بہترین مثال ہے۔ یہ شذرہ "سپاسنامہ" کی صورت میں لکھا گیا ہے۔

" فیض مستطاب عالی جناب عزت مآب قبلہ و کعبہ محترم المقام **بزرجمہر خان** وزیر تشریفات صدر انجمن ستائش باہمی خجالت نگر۔ خیالستان۔

عالیجاہ! ہم اہالی خجالت نگر کاذب آباد کے اس علاقہ میں آپ کی تشریف آوری، اپنے لئے عزت و افتخار کا سرمایہ سمجھتے ہیں اور اپنے درمیان آپکو موجود پاکر محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے اپنے **قدوم میمنت لزوم** سے تملق پیشہ ارکان کی اس مجلس کو سرفراز فرمایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہم ہر آنے والے کا خیر مقدم کرتے اور ہر جانے والے سے کنی کترا جاتے ہیں لیکن اس میں ہمارا قصور نہیں اور نہ ہمارے خون میں کوئی نقص ہے یہ خجالت نگر کی آب و ہوا کا اثر ہے ہماری تربیت ہی اس نہج پر ہوئی ہے کہ چڑھتے ہوئے سورج کی پوجا کریں اور جو ستارہ ٹوٹ رہا ہو اُس کو اتنی اہمیت بھی نہ دیں جتنی مکھی یا مچھر کے خون کو دی جاتی ہے ہم صرف کرسیوں کی پوجا کے لئے پیدا کئے گئے ہیں یہی ہمارا شرف اور یہی ہمارا وقار ہے۔

جناب والا، ہم نے جو مخلوق آپکی خاطر یہاں جمع کی ہے وہ نوادراتِ روزگار میں سے ہے یہ سب ہیرے کی ڈلک ہیں۔ یہ سچا سونا ہیں، یہ گئے وقتوں کی خالص چاندی ہیں۔ یہ شاہجہانی عہد کی اشرفیاں ہیں۔ یہ اکبری دور کے نورتن ہیں۔ یہ اموی خلیفہ کے درہم و دینار ہیں۔ یہ نور جہاں کے حمام کا عطر ہیں۔ یہ تاج محل کے تعویذ کا پتھر ہیں۔ یہ فتح پور سیکری کے کھنڈروں کی آب ہیں۔ یہ لال قلعہ کی موتی مسجد کے حوض کا پانی ہیں۔ یہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بکنے والا لال کٹورہ ہیں۔ یہ بہادر شاہ ظفر کے گھمی کبابی کا پراٹھا ہیں۔ یہ واجد علی شاہ کا مقبوضہ ہیں۔ یہ زاہدہ پروین کے گلے کی گراری ہیں۔ یہ نور جہاں کی آواز کا رس ہیں۔ یہ آصف الدولہ کا تبرک ہیں۔ یہ جہانگیر کے نشہ شب کا خمار ہیں۔ یہ پرانے اور سیانے

کن رسیا ہیں یہ بھپیا کے باجا ہیں۔ یہ بندے علی خان کے سانڈ ہیں۔ یہ ظلم کی پکار ہیں یہ بھیڑ چال کی یادگار ہیں یہ خلیل خان کی فاختہ ہیں۔ یہ گھٹر مُنہا ہیں۔ یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہیں۔ یہ آنٹھوں گانٹھ مکید ہیں۔ یہ اقبال کے کرگس ہیں۔ یہ زاغ و زغن ہیں۔ یہ ٹیڑھی کھیر ہیں۔ یہ لوبر کے لٹو ہیں۔ یہ اچھور کی چھنی ہیں۔ یہ محنت کی میت ہیں۔ یہ اچھوت کی ارتھی ہیں۔ یہ درزی کی سوئی ہیں۔ یہ حجام کا حقہ ہیں یہ استاد کا ساز ہیں۔ یہ ستار کے بول ہیں۔ یہ جماعت نہیں ریوڑ ہیں۔ یہ حلقہ نہیں گلہ ہیں۔ یہ مجلس نہیں جوہا ہیں یہ محفل نہیں جھلڑ ہیں۔ یہ طاقت نہیں بھیڑ ہیں۔ یہ ڈار نہیں ٹکڑی ہیں یہ دستہ نہیں ٹولی ہیں۔ یہ کیلوں کے گہل اور پانوں کی ڈھولی ہیں۔

بگیر ایں ہمہ سرمایۂ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

گرامی قدر! آپ انھیں قرآن سناتے ہیں۔ انہیں دیوان سنائیے۔ آپ انھیں اسلام سکھاتے ہیں انھیں دشنام پڑھائیے۔ غالب ان کے فہم کی چیز نہیں انھیں امراؤ جان ادا پڑھائیے۔ اقبال ان کے بس کا روگ نہیں وہ پاکستان میں رہ گیا اور دانشوروں کی ایک کھیپ نے اس کی تکا بوٹی کرلی آپ اقبال کو طاقِ نسیاں پر رکھیے اور داغ کی طرف لے جائیے۔ وہ غزلیں گوائیے جو منی جان گایا کرتی تھی۔

جنابعالی! ہمیں آویزۂ گوش بنالیجئے لیکن اس وقت تک جب تک عروسِ اقتدار آپ کے حبالہ عقد میں ہے۔ ہمیں پان کی گلوری سمجھ کر کلے میں رکھ لیجئے اور تھو کیے نہیں لیکن جونہی اقتدار ڈھلا، وزارت لُٹی، صدارت اڑنچھو ہوئی ہم بارود کی طرح بھک سے اڑجائیں گے۔ ہم بوسہ کا چٹخارہ ہیں۔

والا مرتبت! بالآخر ہم ایک دفعہ پھر خبالت نگر میں آپ کی تشریف آوری پر ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اور بصمیم قلب شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہمیں مفتخر فرمایا ہمیں عزت بخشی، ہمارے اس خرابہ آباد کو چار چاند لگائے۔ ہمارے لئے حصولِ منفعت کی راہیں کھولیں۔ ہمیں، تاکہ فن خوشامد سے لیں ان

دروازوں کے قفل کھلتے ہیں، انشاء اللہ ہم اس صدری نسخہ کو ابدالآباد تک استعمال کریں گے اور اس وقت تک استعمال کریں گے جب تک آپ کا اقبال بلند ہے۔ وزارت آپ کی لونڈی ہے۔ صدارت آپ کی خانہ زاد ہے اور چاپلوسی کے دریا کا پانی خشک نہیں ہوتا ہے۔

زندہ باد نمبر دار جمیر خان

پائندہ باد انجمن ستائش باہمی

ہم ہیں آپ کے نیاز مند

ارکان انجمن ستائش باہمی

کاذب آباد خیالت نگر (خیالستان)[1]

آغا شورش کاشمیری کے اداریے اور شذرے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ مندرجہ بالا اداریے کسی حد تک تو اُن کی اداریہ نگاری کی نمائندگی کرتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر یہ چند اداریے آغا صاحب کی اداریہ نگاری کی نمائندگی نہیں کر سکتے اس کے لئے بڑی تفصیل کی ضرورت ہے تاہم اگر یہاں آغا صاحب کی صحافتی تحریروں کی نمایاں خصوصیات کا ذکر کر دیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے کہ آغا صاحب نے اپنی صحافت میں جو اداریے۔ شذرے۔ کالم۔ طنز و مزاح تنقید و تبصرہ اور مضامین لکھے یا کسی طرح بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس کا عام طور پر کیا رنگ ہوتا تھا۔ اس نقطہ نظر سے آغا شورش کاشمیری کی صحافت کا جائزہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت لیا جا سکتا ہے

شورش کا صحافتی رنگ

آغا صاحب کی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب لکھتے ہیں کہ

" صحافت میں ادبی رنگ کو برقرار رکھا۔ اداریہ نگاری میں خطیبانہ انداز سے ایک ایسی جذباتیت کو جنم دیا جس نے قدروں اور روائتوں کو زندہ رکھنے میں مدد دی اور سیاسی و صحافتی شاعری کے ذریعے سے

---

[1] چٹان ۸۔ اگست ۱۹۶۶ء

قارئین کے قلوب کو گرمایا اور تڑپایا اور طنز کے تیروں سے اصولی و نظریاتی مخالفین کو کھدیڑ ڈالا ہے[1]

ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آغا صاحب کی صحافت کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں

۱۔ ادبی رنگ

۲۔ خطیبانہ انداز

۳۔ جذباتیت

۴۔ طنز و تبصرہ

بلکہ ہم ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی بیان کردہ خصوصیات میں اِن خوبیوں کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں جو آغا صاحب کی صحافت میں موجود ہیں۔ مثلاً

جوش و خروش

اظہارِ خیال میں بیباکی

سچائی

اب ہم مندرجہ بالا عنوانات کے تحت آغا صاحب کی صحافت کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اردو صحافت کی تاریخ میں آغا صاحب کا مقام متعین کیا جا سکے۔

ادبی رنگ

آغا صاحب کی صحافت میں چونکہ سیاسی اور صحافتی شاعری کے علاوہ طنز و تبصرہ کا بھی حصہ ہے لہذا ہم اُن کی صحافت کو ادبی صحافت کہہ سکتے ہیں اس کے علاوہ اگر آغا صاحب کی صحافتی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں بھی ہمیں ادبی رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ انھوں نے صحافت کیلئے ادبی زبان کا انتخاب کیا ہے بلکہ ادائے خیال کا حُسن بھی ان کی صحافت میں ایک ادبی شان پیدا کر دیتا ہے مثلاً آغا صاحب کے ایک اداریہ کی یہ تمہید ملاحظہ ہو جس میں خیال اور زبان کی خوبی نے عبارت میں ادبی رنگ پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک خالصتاً سیاسی اداریہ ہے جس کا عنوان ہے "اس ملک میں کوئی رجل رشید ہے؟" اس اداریے میں آغا صاحب نے حزب اختلاف

۱۔ ہفت روزہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر مضمون ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۱۱۳

اور حزب اقتدار دونوں پر تنقید کی ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ پاکستان اور اسلام کو آج ایک رجل رشید کی ضرورت ہے آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"سوال یہ نہیں کیوں؟ اور کس کی بدولت؟ بہر حال ملک کے حالات سخت ناگفتہ بہ ہیں۔ چمنستان امید کی تمام کلیاں ٹوٹ چکی ہیں شاخیں صرصر کی زد میں آکر خشک ہو چکی ہیں۔ روشوں پر اداسی ہے۔ پاکستان بنا تھا تو مسلمان دل و دماغ کی معراج پر تھے آج حسرتوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ لوگ گویا اپنے ہی آشیانے سے مایوس ہیں۔ جگر نے جانے کس عالم میں کہا تھا ؎

دل تھا ترے خیال میں پہلے چمن چمن

اب بھی روش روش ہے مگر پائمال ہے

لیکن آج اس شعر کا اطلاق پاکستان کے احوال پر ہوتا ہے خیبر سے لاہور اور لاہور سے کراچی تک تو سے فی صد لوگ لازماً مایوسیوں کا شکار ہیں ان کے جذبات ایک دکھتے ہوئے پھوڑے کی طرح ہیں وہ مثبت سے زیادہ منفی خیالات پر سوچنے اور ایک ہزیمت خوردہ انسان کی طرح گردوپیش پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر چہرہ دھوپ چھاؤں کی طرح ہے۔ بات تلخ ہے لیکن قلم کی نوک پر آہی جاتی ہے کہ حزبِ اقتدار سے عوام کو شکایتیں ہیں تو وہ حزبِ اختلاف سے بھی دل برداشتہ ہیں گویا سیاستدانوں کا طلوع و غروب ہوتا رہتا ہے لیکن اس ملک کے سیاستدان طلوع و غروب سے مختلف قسم کی چیز واقع ہوئے ہیں وہ من حیث المجموع نادرۂ روزگار مخلوق ہیں۔ اقتدار کے مسند نشیں انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ہچکچاتے نہیں اور اپوزیشن کے تبرز جمہر اپوزیشن سے دستبردار ہوتے ہیں۔ نہ بسم اللہ کے گنبد سے نکلتے ہیں۔"[۱]

ادب کیا ہے؟ کا جواب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ یہ زندگی کا ہی ترجمان ہے اور اچھا ادب وہی ہے جو زندگی کا اعتبار

۱۔ ہفت روزہ چٹان۔ اداریہ ۱۳ مئی ۱۹۷۷ء

پیدا کرے اور زندگی بخش ہو۔ آغا صاحب کے نزدیک صحافت کا بھی یہی فریضہ ہے وہ اپنے دور کی صحافت پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

" اخبارات نے اپنا رجحان ہی بدل لیا ہے اب وہ سیاسی خبروں سے بڑی حد تک اجتناب کرتے اور اس قسم کی خبروں کے تعاقب میں رہتے ہیں جس سے نفس انسانی کو لذت حاصل ہو چنانچہ بڑے بڑے روزناموں کا یہ حال ہے کہ

۱۔ ان میں دو رنگی سہ رنگی طباعت و تصاویر کے ساتھ جرائم کی کہانیاں آنے لگی ہیں۔

۲۔ اخبارات میں جنسی لذتیت کے پہلو نمایاں ہو رہے ہیں۔

۳۔ اسلامی تاریخ کے ایسے پہلو بیان کئے جاتے ہیں جو اصلاً بھی ہیں اور قوم کے دلوں میں حوصلہ کی بجائے جمود پیدا کرتے ہیں۔

۴۔ ان غیر ملکی خبروں کو ترجیح دی جا رہی ہے جن کا ہماری قومی زندگی یا ملکی مفاد سے دور کا رشتہ بھی نہیں ہے"[1]

گویا آغا صاحب کے نزدیک مندرجہ بالا باتیں صحافت کی خرابیاں ہیں انھیں اگر خوبیوں میں بدلا جائے تو ہم اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ

۱۔ صحافت میں جرائم کی کہانیاں نہیں ہونی چاہئیں۔

۲۔ صحافت میں جنسی لذتیت بری بات ہے۔

۳۔ وہ صحافت اچھی صحافت ہے جو قوم کے دلوں میں حوصلہ پیدا کرے۔

۴۔ صحافت کا فرض قومی اور ملکی مفاد کی ترجمانی ہے۔

اب اگر ہم مندرجہ بالا عبارت میں صحافت کی بجائے ادب کا لفظ استعمال کر دیں تو یہ غلط نہیں ہوگا بلکہ یہ ساری خوبیاں ایک صحت مند اور زندگی بخش ادب میں موجود ہوتی ہیں۔ آغا صاحب کی صحافت انھیں خوبیوں سے مزین ہوتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے یہ درست کہا ہے کہ آغا صاحب کی صحافت میں ادبی رنگ نمایاں ہے۔

۱؎ چٹان ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

خطیبانہ انداز

خطابت آغا شورش کاشمیری کے رگ وپے میں سرایت کرگئی تھی۔ یہاں تک کہ ان کے قہقہوں اور ان کی آہوں تک میں خطابت کا آہنگ موجود ہوتا تھا جس کی تفصیل پہلے آچکی ہے یہاں صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ آغا صاحب کی صحافتی تحریروں میں بھی خطابت کا رنگ پایا جاتا ہے مثلاً ایک اداریہ آغا صاحب نے سقوط ڈھاکہ پر لکھا تھا جس کا عنوان ہے "مجھے رونے دو" اس عنوان کے نیچے یہ مصرع درج ہے

ے گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

اداریہ یہ ہے۔

"مشرقی پاکستان پر جو بیت گئی کیا میں اُس کی توجیہہ کروں، میں ایں و آں سے قلم لگاؤں، میں اپنی شکست کو الفاظ کے گورکھ دھندے میں چھپاؤں، میں کروں غلطیاں اور نام رکھوں تجربہ، میں پرجوش الفاظ کی آڑ لوں، میں معانی میں اُلٹ پھیر کروں، اپنی ہزیمت چھپانے کے لئے اسلام کی لغت سے مقدس الفاظ ڈھونڈوں، اس کی تاریخ سے اس قسم کے سانحوں کو اپنے لئے نظیر بناؤں، مجھے بتائیے میں کیا کروں۔ میں کچھ نہیں کہتا میں ایک دکھی انسان ہوں۔ اتنا دکھی کہ میرا دل ڈوب رہا ہے، میرا دماغ شل ہو گیا ہے، میری زبان کی آوازیں کپکپا گئی ہیں، میرے بدن کے اعضا یکایک ٹوٹ جانے والے شیشے کی طرح ہیں۔ سوچتا ہوں اور مجھے سوچنے سوچتے ۷۲ گھنٹے ہو گئے ہیں میں رونا چاہتا ہوں رو نہیں سکتا۔ میں لکھنا چاہتا ہوں لکھ نہیں سکتا کیا بیت گئی؟ اس دن کے لئے زندہ تھے ہم! میں اس دن کے لئے کیوں زندہ رہا مجھے قدرت نے اسی دن کیلئے زندہ رکھا تھا؟ ٹھیک ہے میدان جنگ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے، جنگ جاری ہے لیکن مجھے اس دن کیلئے زندہ نہیں رہنا چاہیے تھا میں کسی پر الزام نہیں لگاتا، میں تاریخ کی پکار ہوں اور تاریخ کے کٹہرے میں بہت سے ملزم کھڑے ہیں ـــــ مجھے رونے دو خوب رونے دو۔ میری آنکھوں میں قلزم جمع ہو گئے ہیں دل لہو ہو گیا ہے لہو مژگان سے ٹپک رہا ہے، میں خون کے ان قطروں کو گن نہیں سکتا ـــــ کیسے گنوں ع

مرا اے کاش کہ مادر نہ زادے

اے پاکستان اور اسلام سے محبت کرنے والو تم بھی میرے ساتھ رو دو تاکہ اللہ تعالیٰ ہمارے عرق انفعال کو قبول کرلیں۔ تم محسوس نہیں کرتے کہ تاریخ پر ایک سیاہ حاشیہ آگیا؟ قائداعظمؒ ____ قبر سے باہر آگئے ہیں، میں نے پاکستان اس لئے نہیں چھوڑا تھا؟

رونے دو ____ مجھے رونے دو

میں رو رہا ہوں۔

ایڈیٹر ۱؎

سقوطِ مشرقی پاکستان ایک بہت بڑا سانحہ تھا جس پر آغا صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے مندرجہ بالا الفاظ آغا صاحب کی اس حقیقی کیفیت کے ترجمان ہیں جو اس سانحہ کے بعد اُن پر طاری تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر سچے پاکستانی کا یہی حال تھا لیکن آغا صاحب نے اپنے جذبات و احساسات کیلئے جو انداز اختیار کیا وہ خطیبانہ ہے۔ اس ایک خاص واقعہ سے قطع نظر عام واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی آغا صاحب کا لہجہ خطیبانہ ہی ہوتا تھا۔ گجرات کی مسرت جاوید نامی طالبہ گھر سے فلمی ہیروئن بننے کے شوق میں بھاگ نکلی تو اخبارات کا موضوع خاص بن گئی۔ آغا صاحب نے بھی اس واقعہ پر ایک شذرہ تحریر کیا ہے لیکن انھوں نے اس خبر سے قارئین کیلئے تفریح کا سامان مہیا نہیں کیا بلکہ عبرت کے تازیانے برسائے ہیں اور ان حقائق کی نشاندہی کی ہے جو اس قسم کے واقعات کی بنیاد بنتے ہیں یہ بڑا ہی طرح دار شذرہ ہے جس میں خطیبانہ انداز کے علاوہ تحریر کا حسن بھی ایک خاص چیز ہے۔ شذرہ یہ ہے۔

" مسرت جاوید ____ تازیانۂ عبرت

گجرات کی طالبہ ____ مسرت جاوید

۱۔ آزاد خیال والدین کے رخساروں پر طمانچہ

۲۔ نئی تعلیم کے برگ و بار کے مدفن کا کتبہ

۳۔ اخباروں کی ثقافتی مہم کا نالۂ جانکنی

۱؎ چٹان ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء جلد نمبر ۲۴ شمارہ نمبر ۵۱ ص نمبر ۳

۴۔ فلم اور اس کے مظاہر کی سیہ باطنی کا مجسم اظہار

۵۔ روزنامہ کے شوخ طبیعت رپورٹروں کا چٹخارہ

۶۔ جرم کی توانائی کے بالمقابل عزت کی عاجزی

۷۔ چشم غیرت کیلئے عبرت نامہ

خود بھاگ نکلی؟ تو اس کا ذمہ دار بھی معاشرہ ہے جہاں بھاگی، اس کے بزرجمہر اس کے ذمہ دار ہیں۔ انھوں نے پرائی غیرت کو اس کی نادانی کے باعث لوٹنا چاہا۔ قانون کا غلط سہارا لیتے رہے۔ روپے کی ریل پیل لگا دی۔ وکلاء کی خدمات حاصل کیں۔ بے عنوان اور باعنوان جشن ہو رہے ہیں۔ مقدمہ کا فیصلہ عدالت کرے گی ہم واقعات کو زیر بحث لانا نہیں چاہتے تاہم یہ بات تو ثابت ہوتی ہے کہ

۱۔ سینما بینی اور فلمسازی نے گھروں اور عزتوں کو نقب لگا رکھی ہے

۲۔ جو لوگ اپنی خواتین کو ساتھ لے کر جاتے یا اُن کی خواتین خود ہی سنیماؤں میں چلی جاتی ہیں وہ خود معصیت کے اس میلان کی تحریک کرتے ہیں۔

افسوس ابھی تک فلم انڈسٹری کے دیوتاؤں نے اس واقعہ کی مذمت نہیں کی۔ حالانکہ ان میں الحاج بھی ہیں۔ پابند صوم و صلوٰۃ بھی۔ پیروں کے آستانوں پر حاضری بھرنے والے بھی، محافل میلاد کے مہتمم بھی، ختم خواجگان کے شیدائی بھی، میاں میر صاحب جانے والے بھی اور داتا کے آستانے پر حاضری دینے والے بھی۔ بسا اوقات شبہ ہوتا ہے کہ جس کثرت سے فلم انڈسٹری کے اعضاو جوارح داتا صاحب کے مزار پر حاضری بھرتے ہیں مبادا داتا صاحب لاہور سے چلے جائیں؟[۱]

اسی طرح ذیل کی عبارت میں الفاظ کی بارش سے جو سماں پیدا ہوا ہے وہ فن خطابت کا ایسا مقام ہے جہاں سے سامعین کے ذہن خطیب کی خطابت کے ساتھ دریا کی طرح رواں ہو جاتے ہیں اور خطیب سامعین کو جس سمت چاہتا ہے لے جاتا ہے عبارت یہ ہے ۔

"وہ جو کہتے ہیں کہ اللہ جب دینے پر آتا ہے تو چھپڑ پھاڑ کر دیتا ہے ۔ کوثر صاحب نے اس عمر میں بمصداق حج کر لیا تو یہ ان کے مقدر کی رسائی ہے ۔ اس کے بعد تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ انکے احترام کو ملحوظ رکھیں وہ عالم ہم عامی ، وہ خطیب ہم سامع ، وہ مدیر ہم قاری ، وہ شاعر ہم مبتدی ، وہ حاجی ہم عاصی ، وہ عابد شب زندہ دار ، ہم سرتاپا گنہگار ، وہ زاہد ہم رند ان کی زبان میں کوثر ہمارا بیان میں کھوٹا ، وہ خطیب اسلام ہم رسوا و بدنام ، وہ دست آموز شاہ ، ہم راندۂ درگاہ ، وہ خوبرو ہم زشت خو ، وہ مجموعہ کمالات ہم رند خرابات ، وہ تصویر ہم تقصیر ، وہ محاسن و محامد کا مرقع ہم عبرتوں کا سرورق ، ادب ان کی لونڈی ، انشا انکی ہمجولی ۔ شعر ان کی سہیلی ، سلاست انکی جاریہ ، سیاست ان کا گھوڑا ، خطابت ان کا توڑا ، کوندیں تو برق برسیں تو بادل ، طبیعت میں روانی ، ماضی سے حال تک ایک کہانی ، خیال میں جولانی ہو بہو جوانی چنانکہ انتدرانی ، نام محمد حیات ، تخلص کوثر ، قبیلہ نیازی ، ضلع میانوالی گویا آفتاب آمد دلیل آفتاب" [۱]

جذباتیت ۔

جذباتیت شورش صاحب کی تحریروں کا ایک خاص وصف ہے جس کا ذکر اُن کی نثر اور شاعری وغیرہ کے ضمن میں بھی ہو چکا ہے یہاں ہم صرف اُن کی صحافت سے چند سطور نقل کرتے ہیں تاکہ صحافت میں جذباتیت کی نشاندہی ہو سکے یہ سطور شاہ فیصل کی شہادت پر لکھے گئے ایک اداریے سے لی گئی ہیں جس شہزادے نے سعودی عرب کے فرمانروا شاہ فیصل کو قتل کیا تھا اُس کا نام شہزادہ فیصل بن مساعد تھا اور وہ شاہ فیصل کا بھتیجا تھا آغا صاحب لکھتے ہیں ۔

---

۱ ۔ چٹان ۹ مئی ۱۹۶۶ء جلد نمبر ۱۹ شمارہ نمبر ۱۹ ص نمبر ۶

"بہر حال اُس کا جرم اتنا گھناؤنا ہے کہ وہ زندہ جلا دینے کے قابل ہے اس کی نعش کو حجاز و نجد کی زمین بھی نہ ملنی چاہیے۔ اسلام کی سرزمین میں ایسے قبر کی جگہ نہ دی جائے۔ کم از کم اس زمین کے تقدس کا احترام ہوگا اس شہزادے نے اپنے وحشیانہ فعل سے نہ صرف یہ کہ دنیائے اسلام کو شدید سے شدید اور عظیم سے عظیم نقصان پہنچایا اور اس اندھیری رات میں اسلام کے ایک روشن وجود کو ہلاک کیا بلکہ خود شاہی خاندان کو سوچنا چاہیئے کہ اُس کے ایک فرد نے کیا طرح ڈالی اور کس بہیمانہ جسارت سے اپنے خاندان کی صولت کو ضعف پہنچایا۔ آج تک شاہی خاندانوں کی اندرونی فضا میں اسی قسم کی وارداتوں کے نتائج پر تاریخ نے ماتم کیا ہے۔ ہم شاہی خاندان کے اجلال و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی ادب کے ساتھ یہ عرض کرینگے کہ شہزادہ فیصل بن مساعد اپنے چچا ہی کا قاتل نہیں، اُس نے شاہ فیصل ہی کو شہید نہیں کیا اُس کا فعل تمام دنیائے اسلام کیلئے ناقابلِ فراموش المیہ ہے۔ اس نے اسلام کے دل میں گولیاں چلائی ہیں۔ اور دنیائے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے احیاء کو ہلاک کیا ہے۔"[1]

اس اقتباس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ آغا صاحب کی صحافتی تحریروں میں منطق و استدلال نہیں ہوتا۔ بلکہ آغا صاحب کی تحریر میں استدلال بھی اپنی پوری قوت اور توانائی کے ساتھ موجود ہوتا ہے لیکن یہ استدلال اُن کی جذباتیت کے تابع ہے۔ آغا صاحب کی ادارتی نگاری میں قدیم و جدید کا موازنہ و مقابلہ ایک پسندیدہ چیز ہے وہ اس دور کا مقابلہ کبھی انگریزی دور سے کرتے ہیں تو کبھی قرونِ اولیٰ میں پلٹ جاتے ہیں لیکن اس مقابلے اور موازنے میں ایک منطقی ربط اور استدلال کی شان ہمیشہ برقرار رہتی ہے لہذا جب آغا صاحب اپنے مقصد کی طرف پلٹتے ہیں تو مقصد میں جذبے کی شدت جذباتیت کا رنگ اختیار کرلیتی ہے۔ یہ دراصل آغا صاحب کے جذبے کی شدت اور صداقت کی وقعت ہے جسے ہم جذباتیت سے موسوم کرتے ہیں جو مندرجہ بالا مثال میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ شاہ فیصل کا قتل چونکہ اسلام کے اتحاد و اتفاق کیلئے نقصان کا باعث بنا ہے لہذا آغا صاحب اُس نقصان کو شدت سے محسوس کرتے ہیں

---

[1] چٹان ۷۔ اپریل ۱۹۷۵ء جلد نمبر ۲۸ شمارہ نمبر ۱۴ ص نمبر ۳/۱۴

جس کا اظہار انھوں نے مندرجہ بالا اقتباس میں کیا ہے۔

طنز و تبصرہ

آغا شورش کاشمیری نے جس زمانے میں صحافت کے میدان میں قدم رکھا اس زمانے میں اخبارات میں مزاح نگاری اپنے عروج پر تھی ان مزاح نگاروں میں چراغ حسن حسرت۔ عبدالمجید سالک خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہندو اخباروں میں "ملاپ" کے امر چند منیس "ویر بھارت" کے دینا ناتھ آتش "پرجات" کے چونی لال نیپالی اور "پرتاپ" کے گورکھا وغیرہ ہم مزاحیہ کالم لکھا کرتے تھے[1]۔ لیکن مولانا ظفر علی خان کی کاٹ کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس زمانے میں ہندو مسلم اخبارات کی ادویرشن میں طنز نگاری کو بڑا دخل تھا اور اس معرکہ آرائی میں طنز و تبصرہ کی برتری ہی کامیابی اور فتح کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ آغا شورش کاشمیری نے طنز و تبصرہ میں مولانا ظفر علی خان کا رنگ اختیار کیا آغا صاحب ہفت روزہ چٹان میں مختلف مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے طنز اور تبصرہ سے کام لیا کرتے تھے لیکن جب کبھی کوئی قلمی معرکہ ہوتا تو اس وقت طنز اور تبصرہ پر شباب آجایا کرتا تھا شورش صاحب کے مخالفین آغا صاحب کی اس روش ہی سے لرزاں و ترساں رہتے تھے۔ اور ایسے موقعوں پر اگرچہ طنز میں تلخی کا رنگ بھی پیدا ہو جاتا تھا مگر یہ رنگ بھی عامیانہ یا سوقیانہ نہیں ہوتا تھا۔ طنز و تبصرہ کے ہلکے پھلکے رویہ میں بھی وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا کرتے تھے۔ آغا صاحب کے ہلکے پھلکے طنزیہ انداز کی مثال یہ ہے۔

"اب کے اسمبلی کیلئے برخورداروں نے پر تولنے شروع کئے ہیں سیاستدانوں کے عہد میں گلا تھا ۔

کچھ بھتیجے ہیں چند سالے ہیں

عہدے تقسیم ہونے والے ہیں

اب اس معیار انتخاب میں کسی حد تک ترمیم ہو گئی ہے یعنی یہ کہنا تو مشکل ہے کہ بھتیجے نہیں رہے یا سالے ختم ہو گئے ہیں لیکن ———

"اگر پدر نتواند پسر تمام کند"

کے تحت ایک لالہ زار کھل گیا ہے۔ اخباروں کا یہ حال

---

[1] بحوالہ چٹان ۲۹ مئی ۱۹۶۷ء مضمون:۔ اردو صحافت آج سے تیس چالیس سال پہلے ۔ ساگر چند مہاجن معروف بہ گورکھا

ہے کہ ــــــ

ملک ملک دیدم دم نہ کشیدم!

اڈیٹر پہلے، اداریوں میں تبصرہ کرتے تھے اب مقلوں میں کتھا بگھارتے ہیں۔

بعض دوست گِلا گزار ہیں کہ "منزل اسے ملی جو شریک سفر نہ تھے" مسلم لیگ کا شاہی خاندان ہمایوں کی طرح شیر شاہ سوری کے ہاتھوں پٹ پٹا کر "خانہ بدوش" ہو گیا ہے ــــــ "اُڑتی سی ایک خبر ہے زبانی طیور کی" کہ پچھلے دنوں میاں ممتاز دولتانہ کے ہاں محفل غنا منعقد ہوئی مرحوم لیگ کے بڑے بڑے گنی اور گوّیے موجود تھے ــــــ

غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا

کا سماں تھا۔ یار لوگوں نے "ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا" کے زیر عنوان بڑے ہی جتن کئے لیکن "گیا وقت پھر ہاتھ **آتا نہیں**" کا سنگی کتبہ آویزاں تھا۔ آخر مغنّیہ کے اس بول پر یار لوگوں نے سسکیاں بھرتے ہوئے محفل برخاست کر دی ــ

زرنج و راحت گیتی مشو خنداں مرنجاں دل!

کہ آئین جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

اپوزیشن کی پانچ دلہنوں نے عائلی قوانین کے باوجود سیاسیات سے جو عقد باندھا تھا اب معاملہ طلاق پر آگیا ہے سوت کا جلاپا سب جانتے ہیں۔ ایک شوہر، دلہنیں پانچ اسلاماً تو چار بیویاں ایک وقت رہ سکتی ہیں۔ لیکن پانچویں دلہن باقاعدہ دلہن نہ تھیں ممتوعہ تھیں۔ ملکہ (کونسل مسلم لیگ) نے آنکھیں چار کیں اور ممتوعہ نے رخت سفر باندھا۔ جماعت اسلامی کا نباہ ویسے ہی مشکل تھا۔ دوسری صدارتی جنگ میں گرفتار ہو کر یہاں تک پہنچی، اس کا اپنا ناک نقشہ معمولی نہ تھا

خانم بھی نہیں بیگم تھی۔ امتدادِ زمانہ نے پچھے حالوں کر دیا اور جاریہ ہو کر رہ گئی۔ باقی چار میں سے کونسل لیگ بڑی بیگم تھی عوامی لیگ چھوٹی بیگم، اس چھوٹی بیگم کو حسنِ بنگالہ کی رعایت سے راج دربار میں اقتدار حاصل رہا لیکن مغربی پاکستان میں (خصوصیت سے پنجاب کے اندر) اس کا جادو نہ چل سکا۔ نواب زادہ نصراللہ خاں مظفر گڑھ سے عروس انتخاب بیاہنے کی فکر میں ہیں لیکن ان کے مقابلہ میں انہی کا ایک برخوردار سلمہ اللہ تعالیٰ کھڑا ہو گیا ہے۔ ہمیں یاد ہے یہ برخوردار تقسیم ملک سے پہلے جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھتا تھا۔ نواب صاحب دہلی جاتے تو اس سے ضرور ملتے اور التزاماً ملتے بلکہ پھل پھول لے جاتے کیونکہ یہ ان کے مخلص کا خاصہ تھا۔ دوست کا فرزند، اس رعایت سے بھتیجا! اور یہ عزیز بھی انہیں چچا کہتا نہ تھکتا تھا، بُرا ہو سیاسیات کا پہلے بھائی لڑا یعنی موجودہ امیدوار کے والدِ مکرم! اب بھتیجا مقابلہ میں آگیا ہے لیکن یہ ایک تاریخی روایت ہے چچا اور بھتیجا ہمیشہ آمنے سامنے رہے ہیں۔

نظامِ اسلام پارٹی چوہدری محمد علی کی مدخولہ ہے۔ نیشنل عوامی پارٹی مشرقی پاکستان میں مولانا عبدالحمید بھاشانی کے عقد میں ہے۔ پنجاب۔ سندھ۔ سرحد اور بلوچستان میں اس کے دیور خود مختار ہیں۔ پنجاب مرحوم میں نیشنل عوامی پارٹی میاں محمود علی قصوری کے ڈرائنگ روم کی دوستانہ صحبتوں اور اخباروں کے بعض رفیقوں کی ملی بھگت کا نام ہے

مرکز کی بعض نشستوں پر حق شفع تو ان اکابر کا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انتخاب کی حیثیت ڈیرہ داری کی ہو گئی ہے۔ مولانا مودودی نے تو ہرجائی سمجھ کر ہنڈ چھوڑ دیا، میاں طفیل محمد نے بھی اس شرعی حکم کا ساتھ دیا۔ میاں محمود علی قصوری نے اس چھنال سے ناطہ استوار کرنا جنجال سمجھا۔ غرض جن کا نام صدارتی انتخاب کے دنوں میں گونج گرج رہا تھا وہ شادی سے پہلے ہی رنڈوا ہو گئے۔ چوہدری محمد علی نے تو اس بیٹو کو چھونا ہی گوارا نہ کیا، مبادا اسے غش آجاتے

اور افسانوں پر افسانہ پھیل جائے۔ حزب اختلاف گویا "برات عاشقاں برشاخ آہو" ہو کر رہ گئی ہے[۱]
لیکن قلمی معرکے میں ان کا یہ انداز بدل جاتا تھا مثلاً اس عبارت میں پہلے کا سا رنگ نہیں ہے۔

" قصور ان کا نہیں، ان کی فطرت کا ہے، طبیعت چھچھاتی پائی ہے۔ بچپن لکھنؤ کے بانکوں میں گزرا، جوانی کھلنڈروں میں، ادھیڑ ہوتے پھر کھوسٹ ہو گئے، مجال ہے جو مزاج بدلا ہو۔ جب گھمی کبابی کے ساتھ نخاسہ میں کبڈی کھیلا کرتے تھے، تب بھی ہتھیلی پر سرسوں جماتے، اور ہوا میں گرہ لگاتے تھے علم النفسیات کے شناساؤں کا بیان ہے کہ انسان اپنی داخلی کمزوریوں کا انتقام عموماً ان لوگوں سے لیتا ہے جو بالا بلند ہوتے ہیں۔ جب سے مولانا ابوالکلام آزاد اللہ کو پیارے ہوئے ہیں انھوں نے "صدق جدید" کے جھروکے میں بیٹھ کر ان کی تربت پر "پھول چڑھانے" کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ مٹھو بھٹیارا کے متعلق روایت ہے کہ بے خمیر روٹی پکاتے تھے، بس یہ اُن کا لے پالک ہیں"[۲]

اسی طرح آغا صاحب کی صحافتی تحریر اُس وقت اور بھی غضب ناک ہو جاتی ہے جب کوئی اسلام کے خلاف بات کرے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آغا صاحب اپنی صحافت سے اپنے نصب العین کا فروغ چاہتے ہیں اور وہ نصب العین ہے اسلام لہذا جب کوئی بات ان کے نصب العین کے خلاف جاتی ہے تو آغا صاحب کی تحریریں مخالفین کے خلاف انگارے بن جاتی ہیں۔

مرزائیوں کے خلاف لکھے ہوئے شذرے اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں ذیل میں جو عبارت نقل کی جا رہی ہے اس کا پس منظر یہ ہے کہ ادارہ تحقیقات اسلامی راولپنڈی کے ماہنامہ "فکر و نظر" میں کسی الطاف جاوید نامی شخص نے ایک خط لکھا جس میں صدر مملکت کو پاکستان میں حقیقی اسلام نافذ کرنے کیلئے مشورہ دیا گیا تھا کہ ملک سے "مُلائی نظام" ختم کر دیا جائے[۳] اور تمام نجی مذہبی مدرسوں اور دار العلوموں کو بند کر دیا جائے[۴] وغیرہ وغیرہ آغا صاحب کے مطابق یہ خط کسی "پرویزی" کا تھا لہذا انھوں نے ہفت روزہ چٹان میں لکھا

ﮯ۱ چٹان ۲۴ فروری ۱۹۶۵ء

ﮯ۲ چٹان ۹ مارچ ۱۹۶۴

ﮯ۳ بحوالہ چٹان ۲۴ جولائی ۱۹۶۷ء ص نمبر

"معاف کیجئے، پاکستان بن رہا تھا تو پرویز یا فضل الرحمٰن کے اسلام نے لوگوں کے جذبہ کو زندہ نہیں کیا تھا اُس وقت اس مُلّا ہی کا اسلام کام آیا تھا، جس کی سیرت سے سیکڑوں پر کپکپی طاری ہے قائد اعظم اور قائد ملت کے زمانے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ اسلام کے نمائندے تھے، غلام احمد پرویز یا فضل الرحمٰن نہیں، پرویز صاحب کا اسلام دماغ کی اُدھیڑ بن سے نکلا ہے اور یورپ سے مرعوب ہے۔ فضل الرحمٰن کا اسلام نفس اور شکم کی احتیاج پر ہے۔ سترہ روزہ جنگ میں بھی مُلّا ہی کا اسلام کام آیا، یہی مسجدیں کام آئیں، یہی مصلّے، یہی قرآن، یہی دعائیں ——— پرویز کا اسلام سوختنی ہے نہ فروختنی، فضل الرحمٰن کا اسلام شراب کے پیالے سے شروع ہو کر معشوق چہاردہ سالہ کی حنائی انگلیوں پر ختم ہو جاتا ہے۔

یہ مُلّا ہی تھے جنہوں نے قائد اعظم کا جنازہ پڑھوایا۔ قائد ملت کا جنازہ پڑھوایا۔ اب مادر ملت کا جنازہ پڑھوایا، ہمارے اور آپ کے متوفین کا جنازہ بھی مُلّا ہی پڑھتے اور ہم سب پڑھواتے ہیں۔ اس وقت پرویز اور فضل الرحمٰن نہیں ہوتے۔ لیکن اس مُلّا کو گالی دینے اور دار پر کھینچنے کا مشورہ دیتے وقت آپکی زبان پر فالج نہیں گرتا، آپ کے قلم پر برق نہیں ٹوٹتی ——— شرم کی بات ہے کہ جو مُلّا صدیوں سے قرآن و سنت اور حدیث و فقہ کا سپاہی ہے۔ اس کو بدزبان لوگ صرف اس لئے گالی دیتے ہیں کہ اس طرح اس ملک سے وہ اسلام کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اصل بغض انہیں اسلام سے ہے، سیدھا اسلام کو گالی نہیں دے سکتے۔ علماء حق کی سیرت و کردار کا نمونہ ان کے ہاں نہیں انھیں گالی دیں تو خیر نہیں۔ لہٰذا مُلّا کی معتوب اصطلاح کو لے کر علماء اسلام کے دل میں خنجر بھونک رہے ہیں انہیں ٹوکو تو ارشاد ہوتا ہے ہم نے جمود و انحطاط اور بے علمی و بے بصری کی شرعی ممیّوں کا نام مُلّا رکھا ہے، حالانکہ یہ قسم تمام و کمال ارباب حل و عقد کے جیب و داماں میں ہے۔"

مولہ بالا خط میں چونکہ بدنیتی شامل تھی لہٰذا آغا صاحب اسے برداشت نہیں کر سکے۔ حالانکہ جہاں تک ملّا کا تعلق ہے آغا صاحب خود اس کے خلاف تھے لیکن وہ اس اصطلاح کی آڑ میں کسی کو یہ اجازت نہیں دیتے کہ ملّا پر تنقید کے بہانے خود اسلام کا مذاق اڑایا جائے کیونکہ اسلام کا ملّا سے کوئی تعلق نہیں اور اگر ملّا نے اسلام سے اپنے کو منسوب کر لیا ہے تو اس میں بھی اسلام کا کوئی قصور نہیں۔ نام نہاد مذہبی و دینی حلقوں کی کارگزاریوں کو اسلام کی کارگزاریاں قرار دینا نہ صرف بدمذاقی ہے بلکہ اخلاق و شرافت کے بھی منافی ہے۔ آغا شورش کاشمیری ہر اس شخص کے خلاف ہو جایا کرتے تھے جو اسلام یا اکابرین اسلام کے خلاف تنقید کرتا اُن کی دینی اور اسلامی حمیت نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اسلام کے معاملے میں کسی مصلحت سے کام لیں۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبد السلام صاحب کو لکھنا پڑا کہ آغا صاحب اپنے اصولی اور نظریاتی مخالفوں کو کھدیڑ ڈالتے تھے۔

بہر حال آغا صاحب کی اس قسم کی تحریروں سے چٹان کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ اب تک آغا صاحب کی جن تحریروں کے اقتباسات دیئے گئے اُن کے علاوہ بھی چٹان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ جس کا تفصیل سے ذکر کرنا ممکن نہیں کیونکہ یہ تحریریں اتنی زیادہ ہیں اور موضوعات اتنے رنگا رنگ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا تاہم اس تمام مواد پر جو ہفت روزہ چٹان میں آغا صاحب کی صحافتی تحریروں کی صورت میں موجود ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ مواد ایک تاریخی دستاویز ہے۔

۱۔ ہفت روزہ چٹان میں اہم خبروں اور بیانات پر بھرپور سیاسی تبصرہ کیا جاتا تھا۔ نیز ان خبروں اور بیانات کا مکمل متن بھی درج کیا جاتا تھا تاکہ واقعات کی صحت مجروح نہ ہو۔ اس طرح چٹان کی اہمیت تاریخی ہو جاتی تھی کوئی بھی مورخ اس تاریخی ماخذ سے پاکستان کی سیاسی تاریخ مرتب کر سکتا ہے۔

۲۔ ہفت روزہ چٹان کے مواد سے ہم اپنی سیاسی غلطیوں کی تفصیل معلوم کر سکتے ہیں اور آئندہ ان غلطیوں سے بچنے کیلئے تدابیر بھی مندرج ہیں جس سے سیاسیات کے طالب علم اور خود سیاستدان بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

۳۔ ہفت روزہ چٹان میں پاکستان کی حکومتوں کے عروج و زوال کی داستانیں موجود ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کے طرز عمل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کے سیرت و کردار سے لے کر ان کے افعال و اعمال، علم و فضل، عوام و خواص کے ساتھ ان کے رویہ، حکومت میں رہتے ہوئے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں تک کی سرگزشت چٹان کے صفحات میں بکھری پڑی ہیں جس سے ارباب حکومت اور اہل سیاست کے عہد کی سوانح عمریاں مرتب کی جا سکتی ہیں۔ حکومت کسی ایک شخص یا عہدیدار کا نام نہیں ملک کے سربراہ کے علاوہ بھی حکومت کے بہت سے کل پرزے ہوتے ہیں۔ ہفت روزہ چٹان میں حکومت کی پالیسیوں کے علاوہ حکومت

کے کارندوں اور نوکر شاہی کے طرزِ عمل پر خاص نظر رکھی جاتی تھی آغا صاحب نوکر شاہی سے متعلق اچھا تاثر نہ رکھتے تھے وہ حکومت کے اِن کل پرزوں کی قابلیت اور علم و فضل سے شاید ہی کبھی متاثر ہوئے ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ چند لفظوں اصطلاحوں اور اپنے محکمانہ قواعد و ضوابط کی ایسی مشین ہیں کہ جب چلتی ہے تو ایک ہی سا کام کرتی ہے چٹان میں پاکستان کے اس مقتدر عملے کی تصویر بھی موجود ہے جو اگرچہ خوش رنگ نہیں لیکن عبرت آموز ضرور ہے کہ یہ بڑے بڑے افسر اور عہدیداران حکومت کس طرح خوشامد سے ہوتے ہوتے ذلت کی حدوں کو چھونے لگتے ہیں۔

۴۔ ملک میں امن و امان قائم رکھنا انتظامیہ اور پولیس کا فرض ہے۔ انتظامیہ اور پولیس اگر مستعد اور دیانت دار ہوں تو بہت سے جرائم پیدا نہیں ہوتے لیکن پاکستان کی تاریخ میں انتظامیہ اور خاص طور پر پولیس کا کردار کسی طرح صائب قرار نہیں دیا جا سکتا آغا صاحب نے جرائم کے محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے جن عوامل کو موردِ الزام ٹھہرایا ہے اس میں پولیس اور انتظامیہ کا دامن بھی داغدار نظر آتا ہے۔ پاکستان میں انتظامیہ اور پولیس ایک دوسرے کے آلہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں پاکستان کے بڑے سے بڑے سیاسی رہنما پر تنقید کرنا اتنا خطرناک اور مہلک نہیں جتنا انتظامیہ اور پولیس پر تنقید کرنا خطرناک ہے لیکن آغا شورش کاشمیری انہیں دو اداروں پر سب سے زیادہ تنقید کرتے تھے اور جس کا خمیازہ بھی بھگتتے تھے لاہور میں معروف سیاست دان خواجہ رفیق کو قتل کر دیا گیا آغا صاحب نے اس پر بڑا زوردار اداریہ لکھا جس کا عنوان تھا۔

”کیا یہ غنڈے آسمان سے اُترے ہیں؟ انہیں ایک معمولی سب انسپکٹر کیفرِ کردار تک پہنچا سکتا ہے۔“[1]

یہ ایک طویل اداریہ ہے۔ جس کی لپیٹ میں حکمران پارٹی سے لیکر انسپکٹر جنرل پولیس تک سبھی آگئے اور غنڈوں کے خلاف تو نہایت ہی سخت زبان استعمال کی ہے۔ اس اداریے کے صرف چند الفاظ ہی سیاسی قتل، پاکستان کی سیاست اور انتظامیہ اور پولیس کے کردار کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اور اس سیاسی قتل کے پس منظر سے پردہ اٹھتا ہوا نظر آتا ہے۔

۱؎ ہفت روزہ چٹان یکم جنوری ۱۹۷۳ء اداریہ

آغا صاحب نے لکھا

"پولیس نے اخباری رپورٹ کے مطابق اس سلسلہ میں تین افراد کو پکڑ لیا ہے جہاں تک اخباری رپورٹ ہے ہم علی وجہ البصیرت کہہ سکتے ہیں کہ ان گرفتاریوں کے فوراً بعد پولیس نے ان کو ذاتی مچلکہ پر چھوڑ دیا" [۱]

یہ ایک مثال ہے۔ چٹان میں پولیس اور انتظامیہ پر تنقید کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے۔ جس سے ہمیں پاکستان کی تاریخ میں امن وامان اور نظم ونسق کی صورت حال کے خدوخال مل سکتے ہیں۔ جرائم اور ان کے محرکات کی تفصیل بھی مل جاتی ہے جو مختلف ادوار میں ہوئے۔

۵ چٹان میں اغوا۔ سرقہ۔ قتل۔ ڈکیتی۔ زنا یا فریب دہی کی خبریں نہیں چھپتی تھیں بلکہ ان جرائم کے محرکات۔ اسباب اور وجوہات کو موضوع بنایا جاتا تھا۔ ان برائیوں سے معاشرے کو پاک کرنے۔ جرائم کی روک تھام اور خرابیوں کے انسداد کے طریقے اور تجاویز مندرج ہوتی تھیں

۶۔ پاکستان کس طرح معرض وجود میں آیا؟ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے آزادی کی جدوجہد میں قربانی وایثار کیا؟ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے انگریزی حکومت سے وفاداری کے صلے میں انعامات حاصل کئے؟ کون سے لوگ مجاہدین آزادی تھے جو قیام پاکستان کے بعد غدار کہلائے؟ وہ کون سے حکمران تھے جنہوں نے پاکستان کو موروثی جاگیر بنایا؟ وہ کون سے لوگ تھے جنہوں نے پاکستان کا ایک حصہ گنوایا؟ غرض اس قسم کے دیگر بہت سے سوالوں کا جواب چٹان کے صفحات پر اپنی جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔

۷۔ علمی وادبی حلقوں کی روداد چٹان کے شماروں میں عام ملتی ہیں شعروشاعری نقدونظر کے معرکوں کا دلچسپ مواد بھی چٹان میں موجود ہے ادبی مشاہیر اور بلند پایہ علمی شخصیتوں کی نگارشات بھی چٹان کا حصہ ہوتی تھیں۔

۸۔ "چٹان" مشرقی اقدار کا علمبردار تھا۔ برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں تحریک خلافت وہ سنگ میل ہے جہاں سے مغربی تہذیب وتمدن کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھے جانے کا آغاز ہوا۔ انگریز دشمنی کی اس فضا میں ہندوستان اور مشرقی نقطہ نظر کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ انگریز اور انگریزی تہذیب کی برتری و بالادستی ذلت اور کاسہ لیسی کی نشانی سمجھی جانے لگی۔ تحریک خلافت کے بعد آزادی کی جتنی بھی جدوجہد تاریخ کا حصہ ہے اس میں مغرب دشمنی نے بنیاد کا کام دیا ہے قیام پاکستان کے بعد اقتدار جس انتظامیہ کے سپرد ہوا وہ کسی نہ کسی طرح انگریز اور انگریزی تہذیب ہی کے کل پرزہ تھی اور مغربی پارلیمانی جمہوریت سے آشنا اور اس کی ہی خواہ تھی۔

لہ چٹان یکم جنوری ۱۹۶۳ء

لہٰذا اِن ملازمین نے اقتدار کا حصّہ بن کر اپنے پرانے آقاؤں کے طرزِ عمل کی تقلید کی جس کی بنا پر مشرق پرستی کو زوال اور مغرب پرستی کو پھر عروج حاصل ہوا۔

۹۔ "چٹان" وُہ اخبار ہے جس نے حکمرانوں کے اِس طرزِ عمل کی ہمیشہ مخالفت کی اور پاکستانی معاشرے میں مشرقی اقدار کے فروغ کیلئے کوشش کرتا رہا۔ اِس سلسلے میں آغا صاحب کا موقف یہ تھا کہ پاکستان میں جب تک اُردو زبان کی حکمرانی نہیں ہوگی ہم ایک پاکستانی قوم نہیں بن سکتے اور مشرقی اقدار کی آبیاری نہیں ہو سکتی۔

آغا صاحب کے نزدیک مغرب پرستی اور انگریزی زبان صرف ایک مخصوص طبقے کی اپنی ضرورت ہے اور اِس مخصوص طبقے کو یہ حق دے دیا گیا ہے کہ وہ پوری قوم کے مفاد کا مذاق اڑائے۔ آغا صاحب کے نزدیک پاکستان کی وزارتوں میں افسروں کا ایک گروہ ایسا تھا جس کی تربیت "بالا مدرسوں"[1] میں ہوئی وہ اردو بولنے سے قاصر تھے لہٰذا اُردو کی "بے بضاعتی"[2] اور اس کے افلاس[3] کا چرچا کرتے رہے۔ بقول آغا صاحب

" دعویٰ ان کا یہ ہے کہ اردو دفتری امور پر قادر نہیں۔ اس کا ذخیرۂ الفاظ تنگ ہے یہاں تک کہ بعض پاکستانی ملٹن اردو میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے اپنے عجز کا اقرار نہیں کرتے بلکہ اردو کی خانہ ویرانی کا مذاق اڑاتے ہیں ان کے نزدیک پڑھا لکھا وہی شخص ہے جو انگریزی میں باتیں کر سکتا ہو اور وہ بیوی بیگم ہے جو ڈارلنگ کہہ کر پکارتی ہو وہ بچہ ہوشیار ہے جو ڈیڈی اور ممی کہتا ہو۔ باقی سب جہلا ہیں۔"[4]

ے ۱،۲،۳ بحوالہ ہفت روزہ چٹان اداریہ شورش کاشمیری ۲۹ فروری ۱۹۶۰ء

ے ۴ ہفت روزہ چٹان قلم قتلے اسرار البصری (ہائے اُردو وائے اردو۔ کہاں اُردو، پاکستانی انگریز)

"چٹان" کا یہ شمارہ چونکہ پھٹا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ شمارہ کونسی تاریخ اور کس سن کا ہے۔ لیکن اس پر جلد نمبر ۱۴ اور شمارہ نمبر ۴۰۔ (اس لئے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سنہ ۱۹۶۱ء کا شمارہ ہوگا) کیونکہ آغا صاحب نے اس "قلم قتلے" میں ایک خط بھی نقل کیا ہے جس کے متعلق آغا صاحب نے لکھا ہے کہ " یہ خط کل ہی لندن سے نوائے وقت کے ایڈیٹر کو ملا ہے" اور اس خط پر ۶ اکتوبر ۱۹۶۱ء کی تاریخ درج ہے۔

چونکہ اِن لوگوں کی اپنی تربیت انگریزی تہذیب نے کی تھی لہٰذا وہ انگریزی تہذیب کے جملہ لوازمات کو مباح سمجھتے تھے اور یہی روش جب اس اونچے طبقے سے نچلے طبقے میں آئی تو اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو گئی۔ اور انگریزی تہذیب کی وہ برائیاں جس سے انگریز بھی نفرت کرتے ہیں خوبیاں اور فیشن کے طور پر اس طبقے نے اپنالیں جو چھوٹے سے بڑا بننا چاہتا تھا آغا صاحب نے چٹان میں جہاں مغربی تہذیب کی مخالفت کی ہے وہاں اِن " پاکستانی انگریزوں" کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے اِس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنایا جائے تاکہ لوگوں میں قومی تشخص اور نظم و یگانگت پیدا ہو سکے۔

ایک زمانے میں یہ منصوبہ بھی بنایا گیا تھا کہ اُردو اور بنگالی کو ملا کر ایک نئی زبان بنائی جائے آغا صاحب نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اُن کا مؤقف یہ تھا کہ پاکستان کی قومی زبان موجود ہے اسے نافذ کیا جائے وہ لکھتے ہیں۔

"ہم ایمانداری سے سمجھتے ہیں کہ ہمارے ملک میں زبان کا کوئی سوال ہی نہ تھا یہ سوال برصغیر میں بھی سیاستدانوں کی ذہنیت کے باعث پیدا ہوا۔ پاکستان میں بھی قضیہ زبان کے محرک و موید سیاستدان رہے۔ جن لوگوں کو اقتدار کی بساط پر اپنے اغراض عزیز و مطلوب تھے انہوں نے زبان کا مناقشہ کھڑا کیا۔"[۱]

۱۹۶۷ء میں جب حکومت نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان یگانگت کے نام پر اُردو کا حلیہ بگاڑنا شروع کیا تو آغا صاحب نے حکومت کی اِن کوششوں کا مذاق اڑایا اور پاکستان کے ادیبوں کو اس طرف متوجہ کیا اور حکومت کے شریک سفر ادیبوں، شاعروں قلم کاروں اور صحافیوں پر برس پڑے۔ اس سلسلے میں یہ عبارت اردو کی حمایت میں طنز و تبصرے کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آغا صاحب "قلم برداشتہ" کے عنوان سے لکھتے ہیں۔

"کیا ہو گیا اس ریڈیو کو، ۳۱ جولائی تک تندرست تھا صحت ہر لحاظ سے اچھی تھی، دماغ خلل سے محفوظ تھا، دل اختلاج سے مصئون تھا، زبان کترنی کی طرح چلتی ہوئی، بدن گستری، چہرہ گلابی، حسن شرابی، قد بوٹا، آواز ـــــ شعلہ۔ اُردو خبریں کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئیں۔ میرؔ و غالبؔ سے بگڑ

۱۔ چٹان اداریہ "زبانیں کیسے بنتی ہیں" شورش کاشمیری ۲۹ فروری ۱۹۶۰ء

عبدالحق اور ظفر علی خاں تک کی روحیں شاداں و فرحاں، کہ جس پودے کو خون سے سینچا تھا اُس کی بیل منڈھے چڑھ گئی ہے۔ شاخوں پر پھول کھلے ہیں، روشیں جواں، ٹہنیاں سرسبز، لالہ و گل پُرشباب سرو و سمن شاداب، سبزہ دل فریب۔

یکم اگست کو ایکا ایکی دورہ پڑا، چہرہ متغیّر ہو گیا۔ دل کو اختلاج ہوا یا دماغ کی رگوں میں سے کوئی رگ ٹوٹ گئی۔ کہ زبان میں لکنت آگئی، نہ جانے سنرطان ہو گیا۔ اس دن سے آج تک مشرق کو پورب اور مغرب کو پچھم بروزن لچھمی بول رہا ہے۔ اناؤنسر مُنہ کو کرکھا جائیں تو انہیں مغرب کی جگہ (معاف کیجئے کہہ کر) پچھمی اور مشرق کی جگہ پوربو کہنا پڑتا ہے۔

ہمارے ایک عزیز دوست نے مغرب و مشرق کو پلٹتے دیکھا تو گھبرا گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ بھارت نے ہواؤں میں نقب لگادی ہے یا آکاش وانی نے چال لی ہے۔ اِن صاحب نے بیسیوں دوستوں کو فون کئے، پریشان رہے، رات بھر سو نہ سکے۔

اُن کا خیال تھا۔ اردو کے اہل علم اس کایا کلپ پر بے چین ہونگے روزنامہ مشرق کی پیشانی شاید پورب ہو گئی ہو۔ بحمداللہ مشرق ابھی تک شدھ نہیں ہوا۔ مشرق پورب ہو گیا تو لازماً اس کے مینجنگ ڈائریکٹر عنایت اللہ صاحب کو بھی شدھ کر کے ان کا نام کرپا رام رکھا جائے گا لیکن اس صدمہ کو سہنے کا ہم میں حوصلہ نہیں۔ سانحہ کیوں کر ہوا، عوام کا ذکر ہی رہنے دیجئے۔ پورے پاکستان کے لوگ بنتاؤں کی جیب میں ہیں، اُس پنچھی کی طرح جس کی اڑان ٹوٹ جاتی اور پر کترے جاتے ہیں ـــــــ جرأت پرواز ایک طرف رہی حسرتِ پرواز بھی ختم ہو جاتی ہے اور بال و پر قفس کی متاع ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مشرق و مغرب گویا سیاسی کھلنڈروں کی نذر ہو گئے، خواجہ شہاب الدین اعلی اللہ مقامہٗ

سے پوچھیے۔ ادب اور احترام کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے

قبلہ! فرمائیے۔ آپ نے کبھی پورب اور پچھم بولا۔ گھر میں، بازار میں، مسجد میں، کابینہ و صدرِ مملکت کے سامنے، پبلک جلسوں میں، سیرت کانفرنس میں، قائداعظم کے روبرو، اخبار نویسوں کی منڈلی میں، سرکاری اخباروں کی محفل میں ——————

خواجہ صاحب تک اذنِ باریابی نہ ہو تو اردو کے نامور ادیب الطاف گوہر سے رجوع کیجیے۔

حضرت! آپ تو عمر بھر اردو کے علمبردار رہے ہیں آپ نے انگریزی میں مہارتِ تامہ رکھنے کے باوجود اُردو کی حمایت کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ یہ آپ کے عہدِ ہمایونی میں اُردو پر کیا بیتی؟ علم وسیلۂ اتحاد ہے، ٹھیک، لیکن۔ زبان توڑ دینے سے تو دل جوڑ دینے کا راستہ نہیں کھلتا۔

بنگال کے کملنڈروں کو عوام کے نام پر اردو سے نفرت سہی (معاف کیجیے ہم اس کا پس منظر، پیش منظر، بلکہ تہ منظر بھی جانتے ہیں) لیکن مشرق و مغرب اردو کے الفاظ نہیں بلکہ قرآن کے الفاظ ہیں عربی کے الفاظ ہیں —— بنگال کے شرفاء و علماء کے گھرانوں میں یہی بولے جاتے ہیں۔

یاد ہے آپکو! پاکستان کن بنیادوں پر قائم ہوا تھا۔ معلوم ہے آپکو قائداعظم نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں کھڑے ہو کر کس ضیغمانہ انداز میں للکارا تھا "اردو اور صرف اردو!" خواجہ صاحب قبلہ! لیاقت علی خاں کی کابینہ میں بھی وزیرِ نشریات و اطلاعات رہے۔ اُس وقت آج کی بہ نسبت واقعی بااختیار تھے لیکن تب مشرق کو پورب اور مغرب کو پچھم کرنے کی نہ سوجھی، اُن کے بھائی کا زمانہ آیا تو اس وقت بھی یہ حادثہ نہ ہوا۔ محمد علی بوگرہ کا زمانہ آیا۔ انہوں نے ٹریفک کو دائیں سے بائیں یا بائیں سے دائیں کیا لیکن ان کے نہاں خانۂ دماغ میں یہ بات نہ آئی۔ ۱۹۵۶ء کا آئین بنا، اس وقت بھی اس کی نیو نہ رکھی گئی حالانکہ اس آئین کی قبائے جمہوریت میں سپر اندازی کے بے شمار پیوند لگے ہوئے تھے۔

سچ کہا ہے ایک عرب فلسفی نے کہ سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا انسان جب خود سپردگی کا انداز اختیار کرلے تو اُس کا اشہبِ ضمیر کہیں رکتا ہی نہیں، بگٹٹ ہوجاتا ہے۔ تین حرف بھیجئے اِن سیاستدانوں پر اور یہ سیاست دان کہاں کے ہیں؟

ادیب کہاں اٹھ گئے۔ اردو کے شاعر کدھر چلے گئے۔ اہلِ قلم کو ہوا کیا؟ اردو اخباروں کی اکثریت کو سانپ نے سونگھ لیا اور ریڈیو کی زبان کو لونی لگ گئی ہے تو اِن کی زبانوں پر تالا کس نے لگا دیا ہے؟

پاکستان سے پہلے تو مسلمان اُردو کے ایک ایک لفظ پر جان دیتے تھے ریڈیو کے منہ سے ہندی کا لفظ نکلا نہیں کہ یار لوگوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ تحریکِ پاکستان کی بنیاد میں جو اینٹیں اور گارا استعمال ہوتا رہا وہ یہی تھا لیکن غضب ہے کہ اُردو سے نان نفقہ حاصل کرنے والے اِس المیہ پر منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔

دہلی کو پنجاب کے تلفظ پر زندگی بھر اعتراض رہا لیکن اس سانحہ پر دہلی اِس طرح خاموش ہے گویا اس کی زبان کسی نے گُدّی سے کھینچ لی ہو۔ اور لکھنؤ کا تو رشتہ خطی ہوگیا ہے —— پنجاب میں بڑے بڑے اردو وقیے ہیں۔ جو مولانا ابوالکلام آزاد کی زبان پر قینچی رکھتے رہے۔ کہ رام گڑھ کے خطبہ میں انہوں نے کھڑی بولی کے دو چار پیوند لگا دیئے تھے لیکن اس سانحہ پر اُن کے گلے کی گراریاں —— معلوم ہوتا ہے ٹوٹ گئی ہیں۔ نہ گلڈ بولتا ہے۔ خیر! اس کے بولنے کا تو سوال ہی نہیں، نہ گلڈ کے کسی عمزاد کی صدا آتی ہے، نہ حلقۂ اربابِ ذوق سے آواز اٹھی ہے۔ جتنے ادبی ادارے تھے قبریں ہو گئے ہیں اور غالباً اسی کا نام ہے —— حکمران کی ساحری۔

خلیل جبران نے ایک انشائیہ لکھا ہے

"شکاری خالی ہاتھ پر خالی پنجرہ لئے جا رہا تھا۔ پیچھے پیچھے عقاب تھا

کسی نے شکاری سے پوچھا

"پنجرہ خالی ہے عقاب عقب میں چل رہا ہے یہ اڑ کیوں نہیں جاتا۔"

شکاری نے کہا "یہ بدنصیب پنجرہ سے اتنا مانوس ہو گیا ہے کہ اس کے ذہن سے کھلی فضا کا تصور ہی اڑ گیا ہے اب چاہے بھی تو اڑ نہیں سکتا۔"

سیٹھوں نے ادیبوں، شاعروں، قلم کاروں اور صحافیوں کیلئے انعامات اتنے عام کر دیئے ہیں کہ انہیں زبان سے زیادہ پیٹ کی فکر ہے، نتیجۃً یہ لوگ پہلے تخلیق کرتے تھے اب تخلیق ہوتے ہیں۔ گراں قدر مشاعرے، عظیم معاوضے، ریڈیو کی نیابتیاں، ٹیلی وژن کی سخاوتیں۔

پورر کو کھلوا لیجئے یا پچھی ـــــ سر کے بل حاضر ہیں۔ اور ہاں ہم بھول گئے، صدر، مستقل و مانوس لفظ ہے۔ اس کی جگہ پریذیڈنٹ بولا جا رہا ہے۔ بنگالی بھاشا کی دلجوئی مقصود ہے تو راشٹر پتی کہیئے۔ یہ اتی روچک بھاشا ہے۔"[1]

ہفت روزہ چٹان کی پالیسی

آغا صاحب کے اپنے الفاظ میں ہفت روزہ چٹان نے

"حتی الامکان اسلام۔ پاکستان اور جمہوریت کی عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ وہ حلقہ بندیوں کے زغوں میں پھنسا نہیں اُس نے ہر مکتبہ فکر کے راستباز انسانوں کی خدمت گذاری اپنے اوپر فرض کی اور ان لوگوں کی ڈھال بنا رہا جنہیں حاطب اللیل سیاستیوں نے اپنی زبان درازیوں کا ہدف بنا رکھا تھا یا جنہیں کفن دوزیوں کی بر ٹولی گالی دیتے وقت خوف خدا محسوس نہیں کرتی ہے۔"[2]

مندرجہ بالا اقتباس میں آغا صاحب نے مندرجہ ذیل عناصر کو ہفت روزہ چٹان کا طرز عمل کہا ہے

۱؎ ہفت روزہ چٹان ۱۴ اگست ۱۹۶۷ء ص نمبر ۴

۲؎ ہفت روزہ چٹان سشذرہ از شورش کاشمیری ۳۰ ستمبر ۱۹۶۳ء

۱۔ اسلام۔ پاکستان اور جمہوریت کی خدمت

۲۔ حلقہ بندیوں سے گریز

۳۔ راست باز انسانوں کا دفاع

جہاں تک اسلام۔ پاکستان اور جمہوریت کی خدمت کا تعلق ہے آغا صاحب ہمیشہ اس حقیقت کا اعلان کرتے رہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اس میں اسلامی نظام ہی رائج ہونا چاہیے۔ جمہوریت آغا صاحب کے نزدیک مغربی جمہوریت نہیں بلکہ اسلام کی جمہوریت ہے۔ وہ اسلامی سوشلزم کو ایک مہمل اصطلاح سمجھتے تھے[1] لیکن سرمایہ داری کے بھی زبردست مخالف تھے وہ لکھتے ہیں کہ

"جدید معاشی نظریوں اور سیاسی انقلابوں میں مسلمانوں کی نئی نسل کو اسلام کے قابو میں رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ مسلمانوں کے حکماء و فضلا۔ مدبر و مفکر۔ راہنما و علماء اور اہل قلم و اہل علم سرمایہ داری نظام کی عالمگیر خرابیوں کے خلاف تحریک پیدا کریں اور مسلمان مملکتوں کو سرمایہ داری نظام کے ان گماشتوں سے نجات دلائیں جو اسلام کے نام پر اسلامی سوسائٹی پر قابض ہو کے بیٹھے ہیں۔"[2]

ایک دوسری جگہ وہ وضاحت کرتے ہیں کہ

"اسلام کمیونزم ہے نہ کیپٹلزم۔ لیکن اسلام کو اب تک جتنا نقصان پہنچا سرمایہ داری کے ہاتھوں پہنچا ہے"[3]

آغا شورش کاشمیری کے نزدیک اسلام ایک فعال عصری قوت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ پورے عالم اسلام میں اسلام کا بول بالا ہو اس کے لئے انہوں نے اپنے ہفت روزہ چٹان سے بہت کام لیا۔ وہ اپنے اس نظریہ کو اسلام کی دعوت کے طور پر

---

[1] بحوالہ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۴۷

[2] شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۴۶

[3] ایضاً ص نمبر ۴۷

پیش کرتے ہیں۔ جس طرح علامہ اقبال نے تحریک احیائے اسلام کیلئے کام کیا اُسی طرح آغا صاحب بھی علامہ کی تقلید میں اس تحریک کو اپنے ہفت روزہ اخبار کے ذریعے آگے بڑھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال کے افکار کی تشہیر اور مولانا ابوالکلام کے افکار کی ترویج میں بھی یہی مقصد کارفرما ہے۔ شورش کاشمیری پاکستان میں افکار اقبال کے انتھک مفسر تھے۔ اُنہوں نے علامہ اقبال ہی کی پیروی کرتے ہوئے مرزائیت کا محاسبہ کیا۔ محاسبۂ قادیانیت چٹان کیلئے ہمیشہ باعث افتخار رہا۔ مرزائیت کے سلسلے میں چٹان کی خدمات تاریخِ محاسبۂ قادیانیت میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

ہفت روزہ چٹان کا یہ امتیاز بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی خالق جماعت جب طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر لوٹ کھسوٹ میں معروف تھی تو چٹان ہی نے اُن سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تھی دولتانہ وزارت میں چٹان پر جو عتاب آیا وہ اسی وجہ سے تھا کہ چٹان نے ایک ایسی حکومت کو ٹوکا تھا جو پاکستان کی خالق اور اپنے کو پاکستان کی تنہا وارث سمجھتی تھی۔ اُسی وقت چٹان کی بندش پر کہا تھا کہ

"وزارتیں تو کھلونے ہیں لُوٹ جائیں گے
چٹان آئے گا آخر ضرور آئے گا"[1]

پھر اس کے بعد وزارتیں واقعی کھلونوں کی طرح ٹوٹتی رہیں بلکہ مسلم لیگ خود ایک کھلونا بن گئی۔ مگر چٹان اپنی جگہ قائم رہا۔ اور اس کے پائے استقلال میں کبھی جنبش نہیں آئی اور اس کا ہمیشہ یہ تقاضا رہا کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ کیا جائے۔

جہاں تک گروہ بندیوں کا تعلق ہے چٹان کسی ادارے۔ سیاسی پارٹی۔ کسی خاص گروہ کا نمائندہ اخبار نہیں تھا بلکہ یہ ایک آزاد پرچہ تھا۔ لیکن آغا صاحب چونکہ اس کے مالک و مدیر تھے لہٰذا چٹان اُن کی مرضی اور رائے کا پابند ضرور تھا لیکن خود شورش کاشمیری کسی کی رائے کا پابند نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب نے چٹان کی پالیسی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ چٹان کا تعلق گروہ بندیوں سے نہیں۔ لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ "چٹان" خود ایک گروہ تھا اس کے قارئین کا ایک خاص حلقہ تھا جو دوسروں سے بلاشبہ اختلاف بھی رکھتا تھا لیکن آغا صاحب نے کبھی کسی گروہ کو کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر چٹان میں ہدف تنقید نہیں بنایا بعض اوقات کچھ حلقوں سے ان کے اختلافات

---

[1] گفتنی و ناگفتنی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۵۶

بھی ہوئے اور انہوں نے چٹان میں اُن کے خلاف لکھا بھی مگر اس کی وجہ ذاتی نہ تھی بلکہ نظریاتی تھی۔ چٹان اور شورش کاشمیری اگر کسی گروہ یا حلقہ کے ذاتی دشمن تھے تو وہ گروہ مرزائیوں کا تھا۔ اگرچہ اس کے پس منظر میں بھی مرزائیوں کی اسلام دشمنی کا ہاتھ ہے لیکن اس گروہ کاذب کے بارے میں آغا صاحب واقعی متشدد تھے۔ جہاں تک سیاسی نوک جھونک اور طنز کا تعلق ہے بقول جناب انور عارف

”میں ذاتی تجربے، ذاتی مشاہدے اور ذاتی مطالعے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ چٹان نے جس کو آڑے ہاتھوں لیا اس کو اختلاج ہو گیا۔ خود چٹان کے صید اس کے طنز کا مزہ لیتے ہیں۔ جس طرح شراب کا چسکا ایک شرابی کو بے چین رکھتا اسی طرح چٹان کے ہدف اس کے بغیر بے تاب ہوتے اور انتظار کرتے کہ اب کے چٹان نے کس شکار کو منتخب کیا ہے۔ شورش صاحب کسی کے ذاتی حریف نہیں وہ خصومت و عداوت کے دشمن ہیں ان کے اصل حریف حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہوئے بزرجمہر ہیں جن کی عقلیں کوتاہ اور فریب آور ہیں۔“ [۱]

آغا صاحب کے مخالفین میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے راستباز انسانوں کی مخالفت کی ان لوگوں میں زیادہ افراد کا تعلق جدوجہد آزادی کے رہنماؤں سے ہے۔ خاص طور پر ان میں آغا صاحب کی ممدوح شخصیتیں شامل ہیں چٹان کا واقعی یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے جدوجہد آزادی کے رہنماؤں پر نکتہ چینی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔ آغا صاحب کے نزدیک اچھائی کا معیار تقویٰ اور ایثار ہے۔ جن لوگوں نے جدوجہد آزادی میں ایثار و قربانی کو اپنا شعار بنایا چٹان نے اس کا ہمیشہ اعتراف کیا اور اس سلسلے میں کسی قسم کی **تخصیص** روا نہیں رکھی چٹان میں بھی جہاں بھگت سنگھ اور دت کا تذکرہ ملتا ہے۔ وہاں مبارک ساغر اور منشی احمد دین جیسے بہادر حریت پسندوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ نظریاتی طور پر یہ لوگ آغا صاحب کے قریب نہ تھے۔ غرض چٹان ایک آزادانہ پالیسی کا حامل ہفت روزہ اخبار تھا جس نے پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں سب سے زیادہ بیباک روش کو اپنایا اور آزادیٔ اظہار کو کبھی پابہ زنجیر نہیں ہونے دیا۔

۱؎ شورش کاشمیری مرتبہ انور عارف ص نمبر ۱۸

چٹان اور اس کی مقبولیت

"چٹان" آغا صاحب کا اپنا ہفت روزہ تھا۔ کبھی کسی مالی امداد کا محتاج نہیں ہُوا۔ اِس سلسلے میں آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"چٹان فخر سے کہہ سکتا ہے۔ کہ وہ کسی گروہ۔ دھڑے یا جماعت کا اخبار نہیں۔ حتیٰ کہ شورش کاشمیری کا بھی اخبار نہیں وہ عوام کا اخبار ہے، عوام کے لئے اور ملک و قوم کی اجتماعی خدمت اِس کا نصب العین ہے[۱]۔"

ادب اور سیاست اِس کی نمایاں خصوصیت ہے اور ہفت روزہ صحافت میں اعلیٰ مقام کا حامل ہے[۲]۔

"چٹان" کا سائز پہلے ۲۰×۳۰/۴ تھا۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں ۲۰×۳۰/۲ کے کاغذ کی نایابی کی وجہ سے چٹان کا ایک شمارہ اپنے اصل سائز سے ۱/۲ چھوٹے سائز پر شائع ہُوا مگر اگلا شمارہ پھر معمول کے مطابق کر دیا گیا[۳]۔ ۴ سال بعد اِس کا سائز بالکل چھوٹا کرنا پڑا[۴]۔ لیکن جلد ہی چٹان پھر اپنے پرانے سائز پر آگیا۔ آخر سنہ ۱۹۷۳ء میں چٹان کیلئے ۲۰×۳۰ کی بجائے ۲۲×۲۶ سائز کا کاغذ استعمال ہونے لگا اور بڑے سائز کی بجائے موجود سائز کی شکل اختیار کر گیا[۵]۔

سنہ ۱۹۶۳ء میں آغا صاحب "چٹان" کو روزنامہ کر دینے کی سوچ میں تھے مگر یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا[۶]۔ چٹان ہفت روزہ رسالوں میں کثیر الاشاعت رسالہ تھا۔ سنہ ۱۹۵۶ء کے "سالنامہ چٹان" کی اشاعت ۲۷ ہزار تھی[۷]۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں چٹان کی اشاعت

۱۔ ۳ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء جلد نمبر ۸ "چٹان"

۲۔ بحوالہ صحافت پاک و ہند میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۵۲۴

۳۔ بحوالہ چٹان ۲۶ مارچ سنہ ۱۹۶۲ء جلد نمبر ۱۵ شمارہ نمبر ۱۳

۴۔ بحوالہ چٹان ۴ جولائی سنہ ۱۹۶۷ء جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۳

۵۔ بحوالہ چٹان ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۷۴ء جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۲۵

۶۔ بحوالہ چٹان ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۷۴ء جلد نمبر ۲۷ شمارہ نمبر ۲۵

۷۔ بحوالہ چٹان فروری سنہ ۱۹۵۶ء جلد نمبر ۹ شمارہ نمبر ۸

ایک لاکھ دس ہزار تھی۔ اِس سلسلے میں آغا صاحب لکھتے ہیں۔

"الحمدللہ چٹان کا یہ تیسرا شمارہ ایک لاکھ دس ہزار چھپ رہا ہے۔ پہلا پرچہ ایک لاکھ سات ہزار چھپا تھا۔ دوسرا بھی اِسی تعداد میں شائع ہوا[1]۔"

بعض اوقات ادبی اور سیاسی معرکوں کی وجہ سے اشاعت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا تھا۔ خاص طور پر جب حکومت کا کوئی وزیر یا گورنر تنقید کا ہدف ہوتا۔ یا پھر جب وہ مرزائیوں کے خلاف شدت سے ساتھ برسرِ پیکار ہوتے تھے۔ اِس طرح چٹان کے قارئین کا حلقہ کافی وسیع تھا۔ جس میں زیادہ تر ایسے افراد شامل تھے۔ جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا یا پھر قیامِ پاکستان کے عینی شاہد تھے جو آغا صاحب کی سیاسی زندگی کے پس منظر سے آشنا تھے اور اسے تحریکِ آزادی کا ایک ہیرو تصور کرتے تھے۔ آغا صاحب ساری زندگی حکومتوں سے لڑتے رہے۔ جس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ

"ہر حکومت ایک منظم استبداد کا نام ہے۔ اسی نظریہ نے مجھے ہر حکومت پر تنقید کی عادت ڈالی اور پختہ ہو گئی[2]"

حکومتوں پر تنقید کی اِس عادت نے آغا صاحب کے فدائین اور "چٹان" کے قارئین پیدا کئے۔ چنانچہ سیاسی پارٹی اور سیاسی کارکن "چٹان" کے باقاعدہ قاری تھے۔ "چٹان" مرزائیوں کی مخالفت اور افکارِ اقبال کی تشہیر میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ جس کی وجہ سے مذہبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مذہبی حلقے آپس کی مخالفت کے باوجود ردِ مرزائیت کے مسئلہ پر متفق تھے لہٰذا "چٹان" کو قارئین کا ایک وسیع حلقہ میسر تھا۔ خاص طور پر علماءِ دیوبند آغا صاحب کی رائے کو صائب سمجھتے تھے۔ آغا صاحب اپنی خطابت کی وجہ سے نوجوانوں خاص طور پر طلباء میں بڑا اثر رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے "چٹان" نوجوان نسل کا بھی مقبول رسالہ تھا۔ اِس کے علاوہ مخالفین بھی "چٹان" کے باقاعدہ قاری تھے۔

1۔ چٹان ۱۰ تا ۱۷ مارچ ۱۹۶۹ء جلد نمبر ۲۲ شمارہ نمبر ۱۰

2۔ موت سے واپسی شورش کاشمیری ص نمبر ۲۱

چٹان کی بندش

"چٹان" کا اجراء یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو ہوا تھا۔ مگر باقاعدگی سے جنوری ۱۹۴۹ء سے چھپنا شروع ہوا[1]۔ جون ۱۹۵۲ء میں ایک سال کیلئے جبراً بند کر دیا گیا[2]۔ "چٹان" پر فحاشی پھیلانے کا الزام لگایا گیا تھا لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ دولتانہ وزارت "چٹان" کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ "چٹان" کو بند کر دیا جائے۔ اِس مقصد کے لئے سید نور احمد ڈائرکٹر تعلقات عامہ نے باقاعدہ ایک سازش تیار کی۔ جس کی نقاب کشائی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اس طرح کرتے ہیں

"حکومت شورش کاشمیری اور چٹان کو ناپسند کرتی تھی لیکن اِسے بند کرنے میں گوناگوں مشکلات حائل تھیں۔ اس لئے ایک چھوٹے سے ہفت روزہ کو چٹان کے خلاف اکسایا گیا اور وہ اس انداز میں کہ اُس اخبار نے فحش بیانی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ آغا شورش کاشمیری نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ سید نور احمد نے فحاشی کے الزام میں دونوں اخباروں کو چھ، چھ مہینے کے لئے بند کر دیا اور یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش فرمائی کہ انصاف سے کام لیا گیا ہے۔ بہرحال اخبار نویس جانتے تھے کہ اصل مقصد چٹان کو بند کرانا تھا[3]۔"

ا۔ موت سے واپسی ص نمبر ۲۵

۲۔ وسے صورتیں الٰہی ص نمبر ۲۵ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے لکھا ہے کہ "چٹان" کو چھ ماہ کیلئے بند کیا گیا۔ لیکن آغا صاحب نے "چٹان" کے بند ہونے کی مدت ایک سال تحریر کی ہے۔ ہفت روزہ چٹان (شورش نمبر ص نمبر ۶) اس کے علاوہ آغا صاحب نے اپنی کتاب "موت سے واپسی" کے صفحہ نمبر ۸۵ پر اُس وقت کے وزیر احمد سعید کرمانی کی تقریر تحریر کی ہے جو اُس وقت اسمبلی میں ہوئی۔ اس میں درج ہے کہ "میاں ممتاز دولتانہ نے ۱۹۵۲ء میں جون کے مہینے میں اس رسالہ یا ہفتہ وار کو بھی ایک سال کیلئے بند کر دیا"۔

۳۔ وسے صورتیں الٰہی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۷۴/۲۷۵

اس سلسلے میں ظہور الحسن ڈار کی خدمات حاصل کی گئیں۔ انھوں نے "ایشیا" نامی اخبار میں اس مہم کا آغاز کیا[1]۔ اور دو تھانہ وزارت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی مگر آغا صاحب نے بھی پہلے "انجم" اور اس کے بعد "عادل" نامی جریدے کے ذریعے سے اپنی صحافت کا سفر جاری رکھا[2]۔ نظر بندی کی مدت ختم ہوئی۔ اور آغا صاحب نے نئے سرے سے چٹان نکالا مگر ۱۵ اپریل ۱۹۶۸ء کو چٹان کا ڈکلریشن پھر سے منسوخ کر دیا گیا اور پریس ضبط ہو گیا[3]۔ اس دفعہ چٹان کے ۲۲ اپریل ۱۹۶۸ء کے شمارے کا ایک شذرہ بعنوان "الحمد للہ" عتاب کا باعث بنا[4]۔ جس کا متن یہ تھا۔

"مشرق وسطیٰ کا مکتوب بہ قلم اقبال سہیل مطبوعہ نوائے وقت ۱۱ اپریل پاکستان کے ایک خاص فرقے نے ربوہ سے نکل کر اپنی ریشہ دوانیاں سعودی عرب میں پھیلانا شروع کر دی ہیں۔ حکومت سعودی عرب نے اس کا جائزہ لیا ہے[5]۔"

یہ شذرہ تو ایک بہانہ تھا۔ اصل وجہ گورنر موسیٰ اور ایوب خاں کی ناراضی اور صوبائی وزیر اطلاعات احمد سعید کرمانی کی انگیخت تھی۔ حکومت آغا صاحب کو خریدنے اور رام کرنے میں ناکام ہوئی تو یہ حربہ استعمال کیا گیا کہ چٹان کو بند اور آغا صاحب کو نظر بند کر دیا۔ آخر ۴ فروری ۱۹۶۹ء کو یہ پابندی ختم ہوئی اور چٹان پھر سے شائع ہونے لگا[6]۔ ۱۹۷۴ء میں جب مرزائیوں کے خلاف تحریک چلی (جس کے بارے میں مختصر طور پر پہلے ذکر کیا جا چکا ہے) اور جس کے نتیجے میں وہ اقلیت قرار پائے۔ "چٹان" نے اس تحریک میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ نتیجتہً ۷ جولائی ۱۹۷۴ء کو "چٹان" کا ڈکلریشن پھر منسوخ کر دیا گیا۔ چٹان پریس کے علاوہ مسعود پرنٹرز

---

[1] بحوالہ وے صورتیں الٰہی ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۰۵

[2] بحوالہ شورش نمبر ص نمبر ۶

[3] موت سے واپسی ص نمبر ۵۷

[4] بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۱۷

[5] بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۱۸

[6] بحوالہ چٹان یکم نومبر ۱۹۷۶ء شورش نمبر ص نمبر ۶

جو کہ آغا صاحب کے بچوں کے نام پر تھا بھی ضبط کر لئے گئے[۱] ۔ مگر ۷ جولائی کو چٹان اور پریس کی ضبطی کے احکام واپس ہوئے[۲] ۔ اور چٹان پھر سے شائع ہونے لگا ۔ اخبارات کا تعلق وزارت اطلاعات سے ہوتا ہے ۔ اور اخبارات ہمیشہ اِس محکمہ کے طرزِ عمل سے چشم پوشی کرتے ہیں ۔ مگر آغا صاحب نے کبھی اِس قسم کی رعایت نہیں کی ۔ بلکہ اِسی محکمہ پر سب سے زیادہ برستے تھے کہ وہ آزادیٔ تقریر و تحریر میں ہمیشہ رکاوٹ کا باعث بنا ۔ جو آغا صاحب کو کسی طرح گوارا نہ تھا لہٰذا آغا صاحب کے دو عظیم معرکے وزرائے اطلاعات سے ہوئے ۔ پہلا معرکہ احمد سعید کرمانی سے ایوب خاں کے دور میں اور دوسرا مولانا کوثر نیازی کے ساتھ بھٹو دور میں جس کی بنیاد پر آغا صاحب کو سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ اگرچہ "چٹان" کی بیباک روش کی وجہ سے اُس پر ہمیشہ سے کڑی نظر رکھی جاتی تھی چنانچہ ایک اندازے کے مطابق چٹان کو ۱۲ سال کے عرصہ میں مختلف حکومتوں نے ڈیڑھ سو مرتبہ وارننگ دی[۳] ۔

شورش اور ہفت روزہ صحافت

جناب مسکین حجازی صاحب نے ہفت روزہ صحافت کی اداریہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> "اِس دور کے ہفت روزہ اخبارات میں سے دیوان سنگھ مفتون کا "ریاست" ، مولانا چراغ حسن کا "شیرازہ" اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا "سچ" (جو بعد ازاں "صدق" اور پھر "صدقِ جدید" بن گیا) بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں ۔ ان اخبارات کے اڈیٹر صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھے ۔ اِس لئے ان کے اداریوں میں واقعات کی تشریح و توجیہ اور تفصیل بہتر طریقے سے کی جاتی تھی ۔ بعض اداریہ نویس اِس دور کی طوفانی سیاست کے جوش و جذبہ سے بھی کام لیتے تھے مثال کے طور پر آغا شورش کاشمیری نے "آزاد" اور پاکستان بننے کے بعد ہفت روزہ "چٹان" اور بعض مراحل میں "زمیندار" میں جو اداریہ نگاری کی اس پر مولانا ظفر علی خان اور ابوالکلام آزاد

۱-۲ بحوالہ موت سے واپسی ص نمبر ۲۷۱ / ۲۷۲ / ۲۷۶

۳ بحوالہ چٹان ۲۵ دسمبر ۱۹۷۲ء مضمون مصنفین نکری جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۵۲

کا گہرا اثر ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اردو اداریوں میں جذباتیت کم ہوتی گئی
اور منطق و دلیل کے استعمال میں اضافہ ہوتا گیا۔[1]"

جناب مسکین حجازی صاحب کی مندرجہ بالا رائے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ

۱۔ دیوان سنگھ مفتون۔ مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھے۔

۲۔ لہٰذا ادیب اور شاعر ہونے کی وجہ سے ان کے اداریوں میں واقعات کی تشریح و توجیہ اور تفصیل بہتر طریقے سے کی جاتی تھی۔

۳۔ بعض اداریہ نویس اس دور کی طوفانی سیاست کے زیر اثر جوش و جذبہ سے کام لیتے تھے۔

۴۔ جس کی مثال آغا شورش کاشمیری ہیں۔ جن پر مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام کا گہرا اثر ہے۔

۵۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اداریہ نویسی میں منطق اور استدلال کے رنگ کا اضافہ ہو گیا۔

جہاں تک حجازی صاحب کی پہلی اور دوسری بات کا تعلق ہے یہ کسی لحاظ سے بھی درست نہیں کیونکہ یہ ضروری نہیں کہ اگر کوئی صحافی ادیب اور شاعر ہو تو وہ لازمی طور پر واقعات کی تشریح و توجیہ اور تفصیل بہتر طریقے سے کرے گا۔ کیونکہ صحافت میں ہمیں حمید نظامی صاحب بھی نظر آتے ہیں جو ادیب اور شاعر نہ ہونے ہوئے بھی واقعات کی تشریح توجیہ اور تفصیل بہتر طریقے سے کیا کرتے تھے۔ پھر کیا شورش کاشمیری ادیب اور شاعر نہ تھے۔ اگر ادیب اور شاعر تھے تو انہیں بھی دوسرے ادیب اور شاعر صحافیوں کی طرح واقعات کی تشریح و توجیہ اور تفصیل بہتر طریقے سے کرنی چاہئے تھی۔ مگر شورش کاشمیری۔ حجازی صاحب کی تیسری بات کے تحت اس دور کی طوفانی سیاست کے زیر اثر جوش و جذبہ سے کام لینے لگے۔ حجازی صاحب کی اس بات کا مطلب یہ بھی ہے کہ دوسرے صحافی جو ادیب اور شاعر تھے اور واقعات کی تشریح و توجیہ بہتر طور پر کیا کرتے تھے۔ وہ اس دور کی طوفانی سیاست کے زیر اثر جوش و جذبہ سے کام نہیں لیتے تھے۔ جہاں تک صحافت کا تعلق ہے اس کو سیاست سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اگر دوسرے صحافی طوفانی سیاست کے بھی زیر اثر نہ آسکے تو وہ کن واقعات کی تشریح و توجیہ بہتر طریقے سے کیا

---

[1] اداریہ نویسی — مسکین حجازی — ص نمبر ۲۵۰

کرتے تھے؟ ظاہر ہے کسی ملک میں رونما ہونے والے واقعات کو اس ملک کی سیاست سے الگ تو نہیں کیا جا سکتا۔ اگر صحافی حقیقی معنوں میں صحافی ہے تو اُس کے قلم کو طوفانی سیاست میں "طوفانی قلم" ہونا چاہیے کیونکہ صحافت میں سچائی ہی کی قدر ہے۔ اگر کوئی صحافی سیاست کے طوفانی دور میں غیر طوفانی باتیں کرتا ہے تو وہ صحافت کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ حجازی صاحب دراصل جوش وجذبہ سے دھوکا کھا گئے ہیں۔ جو بلاشبہ آغا صاحب کی صحافتی تحریروں میں موجود ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا جوش اور جذبہ کے ساتھ واقعات کی تشریح و توجیہ بہتر طور پر کی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد واقعات کی بہتر تشریح و توجیہ کیا کرتے تھے! جن کا آغا صاحب پر گہرا اثر ہے تو اس بات کے لئے کسی بھی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ مولانا ظفر علی خان اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ دیوان سنگھ مفتون۔ مولانا چراغ حسن حسرت اور مولانا عبدالماجد دریا آبادی سے بہتر۔ بڑے اور اچھے صحافی و اداریہ نگار تھے اور ان میں جوش وجذبہ کی بھی کمی نہ تھی۔

مولانا ظفر علی خان کے متعلق تو خود حجازی صاحب نے "جذبہ اور عقل" کے عنوان سے لکھا ہے کہ

> ان کے اداریوں میں جذبات بھی ہیں اور استدلال بھی البتہ کسی اداریتی تحریر میں جذبات غالب ہیں۔ کسی میں استدلال کا پلہ بھاری ہے اور کسی میں دونوں کا خوشگوار امتزاج ملتا ہے۔ لیکن ہر تحریر کا بنیادی محرک جذبہ ہی ہے[1]۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہر ایک تحریر کا محرک جذبہ ہی ہوتا ہے۔ خواہ عقلی ہو یا جذباتی لہٰذا مولانا ظفر علی خان کی تحریروں میں عقل اور جذبہ کی موجودگی بھی یہ بات ثابت کرتی ہے کہ جس صحافی پر مولانا ظفر علی خان کا گہرا اثر ہوگا۔ وہ صرف جوش وجذبہ سے کام نہیں لے گا بلکہ اس کی تحریروں میں عقل اور استدلال بھی ہوگا۔ لہٰذا حجازی صاحب کا آغا شورش کاشمیری کے سلسلے میں یہ فرمانا کسی طرح بھی درست نہیں کہ آغا صاحب اِس دور کی طوفانی سیاست کے زیر اثر جوش وجذبہ سے کام لیتے تھے۔ منطق و استدلال سے کام لینا ایک حد تک واقعی اچھی اور قابل قدر بات ہے لیکن منطق و استدلال۔ اعتدال پسندی۔ میکہ جوئی۔ غیر جانبداری اور تعمیری نقطہ نظر کے الفاظ استعمال کرکے اِس حقیقت کو نہیں چھپایا جا سکتا کہ صحافت میں یہ سب چیزیں

---

[1] اداریہ نویسی مسکین حجازی ص نمبر ۱۴۱

جرأت۔ بیباکی اور سچائی وحق گوئی کے فقدان کے نتیجہ میں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ اور اس بات کا اقرار حجازی صاحب کو بھی ہے وہ لکھتے ہیں

"اس سے پہلے جو اداریہ نویس مولانا ظفر علی خان، مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح بے خوفی اور جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے تھے وہ اعتدال پسندی کا سہارا لیتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے اداریوں میں جذبات کی بجائے عقل و استدلال کا عنصر زیادہ ہوتا تھا۔ مگر یہ انداز اس دور کے تقاضوں کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے یہ اداریہ نویس شہرت حاصل نہ کر سکے۔[۱]"

حجازی صاحب کے مندرجہ بالا بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ صحافت میں بے خوفی اور جرأت کا مظاہرہ کرنا اصل بات ہے۔ اور وہی صحافی حالات کی سچی تفسیریں۔ واقعات کی بہتر تشکیلیں اور مسائل کی بہتر توجیہیں پیش کر سکتا ہے جو بے خوفی اور جرأت کا مالک ہو۔ یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ظفر علی خان کے بعد بے خوف اور جرأت مند صحافی صرف شورش کاشمیری تھے۔ جن کی صحافت میں جوش و جذبہ کے علاوہ عقل و استدلال کی بھی کمی نہ تھی۔ لیکن انہوں نے عقل و استدلال اور دلائل و منطق کو بھی سچائی کے اخفا کا ذریعہ نہیں بنایا۔ بلکہ عقل و ہوش میں رہتے ہوئے جذبہ و جوش سے کام لیا اور حق گوئی۔ بیباکی اور ایثار کی وہ ساری سنتیں تازہ کر دیں۔ جن پر مولانا ظفر علی خان۔ مولانا محمد علی جوہر۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد چلا کرتے تھے۔ اب رہی حجازی صاحب کی آخری بات کہ وقت کے ساتھ ساتھ اردو اداریوں میں جذباتیت کم ہوتی گئی اور منطق و استدلال میں اضافہ ہوتا گیا۔ تو یہ بات بلاشبہ درست ہے۔ لیکن ان معنوں میں کہ موجودہ دور کے صحافیوں میں منطق و استدلال۔ بے باکی اور جرأت کی قائم مقام ہے۔

اس سلسلے میں اس بات کا خیال بھی رکھنا چاہیے کہ جب بھی کوئی اداریہ یا تحریر لکھی جاتی ہے۔ اُس میں لکھنے والے کے جذبات ضرور شامل ہوتے ہیں مثلاً سرسید احمد خان کی تحریروں میں عقل اور منطق کی بھرمار ہے۔ لیکن قوم کی اصلاح کا جذبہ ان کی تحریروں کا محرک تھا۔ بعض موضوعات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عقل و منطق کی بجائے جوش و جذبہ کا تقاضا کرتے ہیں لہٰذا بڑے سے بڑا

۱؎ اداریہ نویسی سکین حجازی ص نمبر ۲۱۹/۲۱۸

عقل و منطق کا پرستار اداریہ نویس بھی جوش و جذبہ میں بہہ جاتا ہے۔ اداریہ ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ جسے کوشش سے بھی نہیں روکا جا سکتا۔ مثلاً ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ مولانا غلام رسول مہرؔ کی افتتاحیہ نگاری کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"مہرؔ منطق اور دلیل کے قائل تھے اور کسی مؤقف کے حق میں دلائل و براہین کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیتے تھے کہ اس کا جواب دینا آسان نہیں ہوتا تھا۔[1]"

اسی طرح جناب مسکین حجازی صاحب نے بھی مولانا غلام رسول مہرؔ کی اداریہ نویسی پر اسی قسم کی رائے کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

"انقلاب میں ان کی اداریہ نگاری کے دور کو مباحث کا دور کہا جا سکتا ہے چنانچہ ان مباحث میں معلومات پر مبنی اعداد و شمار اور حقائق و استدلال کا عنصر غالب ہوتا تھا۔[2]"

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید اور جناب مسکین حجازی کی آراء بے شبہ صائب ہیں لیکن اس کے باوجود مولانا غلام رسول مہرؔ کی اداریہ نگاری میں بھی جوش اور جذبہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جناب مسکین حجازی صاحب ہی نے اپنی کتاب "اداریہ نویسی" میں مولانا غلام رسول مہرؔ صاحب کے چند اداریے بطور مثال درج کئے ہیں۔ جن میں جوش و جذبہ پوری طرح جلوہ گر ہے مثلاً یہ عبارت جس کا عنوان حجازی صاحب نے "حکومت کو انتباہ" قائم کیا ملاحظہ ہو

"ہم حکومتِ ہند، وائسرائے کمیشن اور برطانوی پارلیمنٹ سے کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ایک بھی اسلامی جماعت نہرو رپورٹ کی حامی نہیں اور گنتی کے چند مسلمان ہیں جو انفرادی حیثیت سے نہرو رپورٹ پر دستخط کر چکے ہیں۔ سات کروڑ کی وسیع ملت اسلامیہ میں سے ایک فرد بھی اس دستور اساسی کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔ اگر حکومت نے اس رپورٹ کو منظور کر لیا تو یہ سات کروڑ مسلمانوں کے حقوق کو تباہ کرنے کی خواہش کا اظہار ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ۔

(انقلاب۔ ۷ فروری ۱۹۲۹ء)[3]"

---

[1]	صحافت پاک و ہند میں	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	ص نمبر ۴۵۳
[2]	اداریہ نویسی	مسکین حجازی	ص نمبر ۲۶۹
[3]	اداریہ نویسی	" "	ص نمبر ۲۷۵

مندرجہ بالا عبارت کو اگر غور سے دیکھا جائے تو مولانا غلام رسول مہر نے پہلے یہ لکھا ہے کہ

۱۔ ایک بھی اسلامی جماعت نہرو رپورٹ کی حامی نہیں۔

۲۔ چند مسلمان ہیں جو انفرادی حیثیت سے نہرو رپورٹ پر دستخط کر چکے ہیں۔

۳۔ سات کروڑ کی وسیع ملت اسلامیہ میں سے ایک فرد بھی اس دستور اساسی کو ماننے کیلئے تیار نہیں۔

مولانا مہر صاحب کا یہ فرمانا منطقی اساس پر قائم ہے کہ ایک بھی اسلامی جماعت، نہرو رپورٹ کی حامی نہیں کیونکہ گنتی کے چند مسلمانوں نے انفرادی حیثیت میں نہرو رپورٹ پر دستخط کئے ہیں۔ منطقی طور پر یہ بات مسلم ہے کہ جماعت اور فرد میں فرق ہے۔ لیکن جب مولانا یہ کہتے ہیں کہ سات کروڑ کی وسیع ملتِ اسلامیہ میں سے ایک فرد بھی اس دستور اساسی کو ماننے کیلئے تیار نہیں تو یہاں منطقی سقم پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ گنتی کے وہ چند مسلمان بھی سات کروڑ کی ملتِ اسلامیہ میں شامل ہیں۔ جنہوں نے نہرو رپورٹ پر انفرادی حیثیت میں دستخط کئے تھے۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر چونکہ مسلمان ہیں۔ اور اداریہ ہندوؤں کے خلاف لکھا جا رہا ہے۔ لہٰذا وہ حکومت کو واضح اور واشگاف الفاظ میں بتاتے ہیں کہ نہرو رپورٹ کی منظوری سات کروڑ مسلمانوں کے حقوق کی تباہی ہوگی۔ اسی کا نام جوش و جذبہ ہے کہ جو کچھ دل کی گہرائیوں سے اٹھے اسے اپنے یقین کی بنا پر عام کر دیا جائے۔

حجازی صاحب نے مہر صاحب کے اداریوں کی اور بھی مثالیں دی ہیں۔ جو صرف منطق و استدلال کی مثالیں نہیں ہیں بلکہ ان میں جوش و جذبہ کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا حقیقت یہ ہے کہ مولانا غلام رسول مہر کی تحریروں میں بھی جوش و جذبہ پایا جاتا ہے۔ جس طرح آغا شورش کاشمیری کی تحریروں میں منطق و استدلال پایا جاتا ہے۔

شورش کا جوش و جذبہ

عام طور پر جوش و جذبہ سے مراد دل کا ابال ہوتا ہے۔ کسی شخص کے فوراً بھڑک اٹھنے پر اسے جذباتی کہہ دیا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنے دل کا ابال نکال رہا ہوتا ہے۔ جوش و جذبہ کو عام طور پر خامکاری خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن شورش کاشمیری کے یہاں جوش اور جذبہ قوتِ ایمانی۔ مذہبی و قومی عصبیت کا نام ہے۔ ایک غیور آدمی کبھی یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے مذہبی۔ قومی یا ملی اقدار کو نقصان پہنچے لیکن جب کبھی وہ ان اقدار کو پامال ہوتا دیکھتا ہے تو وہ ایک

بہادر انسان کی طرح مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اب اُسے دنیا کی کوئی منطق اور استدلال اِس سے باز نہیں رکھ سکتا کیونکہ اِس نبرد آزمائی میں اُس کے پاس اپنی منطق اور استدلال ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انگریز ایک متمدن اور تہذیب یافتہ قوم ہے۔ وہ جذباتی قوم نہیں ہمیشہ فہم و فراست سے کام لیتی ہے۔ اب اگر آپ کسی انگریز کو یہ کہہ دیں کہ انگریز قوم دنیا کی گندی اور نجس قوم ہے اور دلیل یہ دیں کہ اِس قوم کے افراد ٹب میں نہاتے ہیں اُن کے جسم کے کسی حصے پر جو گندگی اور نجاست لگی ہوتی ہے پانی میں مل کر پورے جسم کو گندہ اور ناپاک کر دیتی ہے۔ کیا وہ یہ تسلیم کرے گا۔ کہ انگریز قوم دنیا کی گندی قوم ہے۔ یا وہ قوم سے وفاداری کی بنا پر یا اس عصبیت کے زیر اثر جو اُس قوم کا فرد ہونے کی حیثیت سے اُس میں پیدا ہوگئی ہے۔ پوری قوت کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرے گا۔ اور اس کے پاس اِس کے لئے اپنی منطق اور استدلال بھی ہوگا۔ اِسی طرح آغا شورش کاشمیری کا جوش وجذبہ درحقیقت قومی غیرت۔ حمیتِ دینی اور اُن اصولوں کا نام ہے۔ جس سے انحراف آغا صاحب کے نزدیک گناہ عظیم ہے۔ اس بات کا ثبوت یہ ہے کہ وہ دین کے مخالفین کو برداشت نہیں کرتے وہ اُن کے خلاف بڑے ہی پر جوش ہیں۔ وہ اپنی قوم کی تذلیل برداشت نہیں کرتے۔ دشمنوں کے خلاف بڑے ہی جوش وجذبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ حکمرانوں سے نہیں دبتے۔ وہ ظالم کو ظالم کہتے ہیں منطق اور استدلال کی تلاش نہیں کرتے۔ اُن کے پاس اپنی یہ منطق موجود ہے۔ کہ ظلم ایک برائی ہے اُسے ختم ہونا چاہیئے وہ ظالم کے خلاف بڑے جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیگر مسائل میں وہ معاشرے کی تعمیر۔ برائیوں کے خاتمے اور ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی پر منطق وعقلی تبصرے کرتے ہیں جس میں جوش وجذبہ کم ہوتا اس لئے کہ یہ موضوعات اُن کی عصبیت سے نہیں ٹکراتے۔ لہٰذا وہ لوگوں اور حکمرانوں سے لڑائی کی بجائے ہمدردی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غرض شورش کاشمیری کی صحافت میں ہمیں بے شبہ جوش وجذبہ کا اظہار عام ملتا ہے۔ لیکن یہ جوش وجذبہ کا اخلاص ہوتا ہے جس سے اُن کی تحریروں میں اثر اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے۔ آغا شورش کاشمیری کا جوش وجذبہ چونکہ اُن کی حمیت اسلامی قوتِ ایمانی اور محبت ملی کے تابع تھا۔ لہٰذا یہ وقتی اور ہنگامی نہیں اور نہ ہی اسے دل کا اُبال یا عامیانہ جذباتیت کہا جا سکتا ہے بلکہ یہ جوش وجذبہ آغا صاحب کی ایک مستقل قدر ہے۔ آپ اگر شورش کاشمیری کی حمیت اسلامی۔ قوتِ ایمانی اور محبت ملی سے سو دفعہ ٹکرائیں گے تو ردعمل ہر دفعہ زیادہ ہوگا۔ یہ نہیں کہ ایک دو دفعہ دل کا اُبال نکل گیا تو پھر

کوئی ردِعمل ہما نہ ہو۔ اِس بات کا ثبوت مرزائیوں سے اُن کی معرکہ آرائی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خان۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور علامہ اقبال کے مخالفین اس بات کی تصدیق کریں گے کہ آغا صاحب کا جوش و جذبہ کتنا قوی۔ مستقل اور جاندار ہوتا تھا وہ ہر دفعہ نئے جوش و خروش سے مقابلہ کرتے تھے۔ لیکن آغا صاحب کا قلم اُسی وقت جوش میں آتا تھا جب وہ حق پر ہوتے تھے۔ سچائی کا اعلان کرتے تھے۔ مظلوموں کی مدد کرتے تھے۔ اور اپنے اصولوں کا دفاع کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ شورش کاشمیری اور چٹان دونوں حق گوئی کا مظہر تھے۔ حق گوئی کیلئے وہ حکومت و اقتدار کو پرکاہ جتنی اہمیت بھی نہ دیتے تھے۔ ذیل میں ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ صحافت میں شورش کاشمیری کیا تھے۔ اِس تحریر کا عنوان ہے "کس لئے جھکیں اور کس کے سامنے جھکیں" اس تحریر میں آغا صاحب کے مخاطب صدر بھٹو اور اُن کی حکومت کے وزیر اطلاعات ہیں۔

"ہم کسی سے اتفاق کریں یا اختلاف صرف ضمیر کی راہنمائی کو ملحوظ رکھتے ہیں دوسری کوئی ہدایت یا راہنمائی ہمارا مطمح نظر نہیں رہا۔ اپنے قلم پر ہم کسی دوسرے شخص کا حق تسلیم نہیں کرتے۔ ہم اس وقت تک لکھتے رہیں گے جب تک قلم کی آزادی میسر ہے۔ ہم حق سے انحراف نہیں کریں گے۔ قلم کو پابہ زنجیر کرنے کی حماقت کی گئی تو ہم ایسی جماعت کو تسلیم کرنے کے عادی نہیں خواہ کوئی سی قیمت ادا کرنی پڑے۔ قدرت نے ہمیں قلم اور زبان کا جوہر دیا ہے۔ اور وہ صرف کلمۃ الحق کی پشتیبانی کے لئے ہے۔ ہمارے دوست ہی نہیں دشمن بھی جانتے اور پہچانتے ہیں ہم کیا ہیں اور کیا نہیں ؎

ٹوٹ تو سکتے ہیں لیکن ہم لچک سکتے نہیں

خبردار ہم سے جہالت کی بات نہ کرنا ایسے موقعوں پر ہم اجہل ہو کر بے پناہ ہو جاتے ہیں۔

الالا یجھلن احد علینا

فنجھل فوق جھل الجاھلینا

(امراالقیس)[1]

---

[1] چٹان ۱۷/اپریل ۱۹۷۲ء جلد نمبر ۲۵ شمارہ نمبر ۱۶

آغا صاحب اپنی حق گوئی کی اس بیباکانہ روش میں پاکستانی عوام کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کیا کرتے تھے بقول چوہدری غلام حیدر خاں[1]۔

"جو اخبار عوام کے جذبات و محسوسات کی ترجمانی میں بیباکانہ حق گوئی سے کام نہیں لیتا وہ کسی صورت صحیح معنوں میں عوام کا ترجمان قرار نہیں دیا جا سکتا۔[2]"

شورش کی صحافتی زبان

آغا شورش کاشمیری کی صحافت میں اُن کی زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شورش صاحب کا تعلق بنیادی طور پر ادب سے ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے ادیب، شاعر اور خطیب تھے۔ جہاں تک اُن کے ادیب اور شاعر ہونے کا تعلق ہے یہ زبان پر عبور حاصل کئے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی سا ادب پارہ تخلیق کیا جا سکے۔ بلاشبہ ادب و شاعری کیلئے دیگر لوازمات بھی بڑے ضروری ہیں لیکن جب تک زبان کے اسرار و رموز میں مہارت حاصل نہیں ہو جاتی اُس وقت تک خیالات کا موثر اظہار ممکن نہیں ہوتا۔ خیالات خواہ کتنے ہی اعلیٰ و ارفع ہوں جب تک اُن کیلئے موزوں و مناسب زبان کا فنکارانہ استعمال نہ ہوگا۔ خیالات ادب کا درجہ اختیار نہیں کر سکتے۔ جہاں تک خطابت کا تعلق ہے آغا صاحب خود اسے الفاظ کی مینا کاری کہا کرتے تھے۔ خطابت میں الفاظ کا استعمال ادب سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ ادب میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ کسی خیال کو جب الفاظ کا جامہ پہنایا جائے تو الفاظ و معنی کا حسن نہ صرف برقرار رہے بلکہ الفاظ و معنی فنکارانہ چابکدستی سے اور بھی حسین اور خوبصورت بن جائیں لیکن خطابت میں حاضرین کی نفسیات پیشِ نظر ہوتی ہے۔ خطیب کو اگر یہ معلوم نہ ہو کہ کون سا لفظ سامعین پر کیا تاثر پیدا کرے گا تو وہ اپنے سامعین کو مطمئن کرنے میں ناکام رہے گا۔ خطیب کے لئے اس فن میں خاص مہارت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے کہ وہ الفاظ سے اس حد تک واقف ہو کہ ہجوم و حاضرین کے رجحان و میلان اور پسند و ناپسند کے لئے فوری ایسے الفاظ کا انتخاب کر سکے۔ جن سے حاضرین متاثر ہو

---

[1] مولانا ظفر علی خاں کے برادر اصغر

[2] چٹان ۲۱ نومبر ۱۹۶۶ء مضمون "بے گناہ قیدی" از چوہدری غلام حیدر خان ص نمبر ۲

مغلوب ہوں۔ اور پھر اس عمل کو بتدریج بڑھتے رہنا چاہیے تاکہ وہ حاضرین و سامعین کو اُس منزل تک لے جا سکے جہاں پورا مجمع ایک اکائی میں بدل کر خطیب کی تائید اور حمایت میں عمل کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ اس طرح خطیب۔ ادیب و شاعر سے زیادہ کٹھن مراحل سے گزرتا ہے۔ آغا صاحب ہر دو مقام سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بلکہ زبان کے معاملے میں دوسرے ادیبوں اور شاعروں سے منزلوں آگے تھے۔ اس لئے کہ وہ الفاظ و معنی کے نبض شناس تھے اور جانتے تھے کہ کس قسم کے سامعین پر کس قسم کے الفاظ اپنا جادو جگا سکتے ہیں۔

جہاں تک صحافتی زبان کا تعلق ہے اسے سہل۔ سادہ اور آسان ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس کا تعلق کم پڑھے لکھے لوگوں سے بھی ہوتا ہے[1]۔ حجازی صاحب نے صحافتی زبان میں جن نقائص کا ذکر کیا ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ حشو و زوائد

۲۔ طول کلام

۳۔ پیچیدہ اور طویل جملے

۴۔ ادق اور غیر مانوس الفاظ

۵۔ مترادفات

۶۔ تعقید

۷۔ تکرار و اعادہ

۸۔ مشکل اور پیچیدہ تراکیب[2]

آغا صاحب کی صحافتی زبان کا اگر جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان نقائص میں سے کوئی نقص بھی اُن کی تحریر میں نظر نہیں آتا البتہ مترادفات اور تکرار کی بعض صورتیں آغا صاحب کی تحریروں میں ضرور ملتی ہیں لیکن یہ اُن کی خطابت کا حصہ ہے۔

---

[1] بحوالہ صحافتی زبان سکین حجازی ص نمبر ۴۲

[2] ایضاً ص نمبر ۴۳ تا ۴۵

حجازی صاحب نے لکھا ہے کہ ان نقائص کی موجودگی

"ابلاغ کو موثر بنانے کی بجائے غیر موثر بناتی ہے[1]۔"

لیکن آغا صاحب کی تحریروں میں مترادفات اور تکرار تحریر کو موثر بناتے ہیں۔ ایک ہی مطلب کو مختلف طرح سے ہم معنی الفاظ کے ذریعے سے ادا کرنا ابلاغ کو موثر بناتا ہے۔ کم از کم فن خطابت کی رو سے تو یہ ایک موثر ذریعہ ابلاغ ہے۔ جس سے آغا صاحب نے اپنی صحافتی تحریروں میں بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ آغا شورش کاشمیری کی زبان کے سلسلے میں یہ بات بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ کہ آغا صاحب کی زبان اِس دور کی صحافتی زبان نہ تھی بلکہ یہ زبان ہر لحاظ سے ادبی زبان تھی جو صحافت کیلئے استعمال کی گئی۔ حجازی صاحب نے اپنی کتاب "صحافتی زبان" میں اِس بات کا اظہار بڑے دکھ سے کیا ہے کہ موجودہ دور کی صحافتی زبان ہر قسم کے لسانی قواعد وضوابط سے بے نیاز ہے اور کسی کیلئے قاعدے کی پابندی نہیں کی جاتی۔ لیکن آغا صاحب نے جو زبان صحافت کیلئے استعمال کی ہے وہ ہر قسم کے لسانی قواعد وضوابط کی پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحافتی موضوعات میں بھی آغا صاحب نے ادبی شان پیدا کردی ہے۔ جناب مسکین حجازی نے صحافی کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

"ہر روز مختلف اور متضاد موضوعات پر لکھنے والا شخص اپنی تمام تحریروں میں کوئی ایک الگ رنگ یا طرز پیدا نہیں کر سکتا[2]۔"

جناب حجازی صاحب کی یہ بات آغا صاحب کے بارے میں درست معلوم نہیں ہوتی کیونکہ آغا صاحب ایک صاحب طرز صحافی تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی صاحب نے اسی کتاب کے دیباچے میں اِس بات کی طرف یہ اشارہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

"صحافتی اُردو میں بھی وہ توانائی اور برنائی موجود ہے جو اچھے تخلیقی ادب پارہ کا سرمایۂ نازش ہے۔ یہاں بھی صاحب طرز صحافی ہوئے ہیں[3]۔"

---

[1] صحافتی زبان — مسکین حجازی — ص نمبر ۲۷

[2] صحافتی زبان — مسکین حجازی — ص نمبر ۲۵

[3] صحافتی زبان — مسکین حجازی — دیباچہ از ڈاکٹر وحید قریشی ص نمبر ۹

موجودہ دور میں صحافی چونکہ صحافت میں اپنا کوئی نصب العین نہیں رکھتے بلکہ وہ صرف مستعار خیالات کے صورت گر ہیں۔ وہ اخبار کے ملازم ہیں۔ اور ملازمت کی حد تک وہ اچھا بُرا کام کرنے کے پابند ہیں۔ ایک معمولی خبر سے لے کر اداریہ تک میں آج تک کے تنخواہ دار صحافی کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ چونکہ خیالات ذاتی نہیں ہوتے اور نہ ہی کسی ذاتی نصب العین کے ترجمان ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی خاص رنگ یا طرز سے ادا نہیں کئے جاتے اس کے برعکس شورش کاشمیری کی تحریروں میں ان کے نصب العین اور عقیدے کی جھلک ملتی ہے۔ خیالات اُن کے ذاتی ہوتے ہیں۔ جنہیں وہ اپنے عقیدے کے اخلاص میں رنگ دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اُن کی تحریروں میں ایک خاص رنگ طرز یا اسلوب پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صاحب طرز صحافی ہیں۔

زبان کے سلسلے میں آغا صاحب نے لسانی قواعد وضوابط کی پابندی اسی طرح کی ہے جس طرح ادیب اور شاعر کرتے ہیں۔ اور اُن قواعد سے انحراف نہیں کیا جو ادبی تحریروں میں مدنظر رکھے جاتے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست سے لے کر الفاظ و معنی کی باریکیوں تک کو نظر میں رکھا ہے۔ روزمرہ اور محاورہ زبان کی بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ آغا صاحب نے اپنی صحافتی تحریروں میں اس سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ خاص طور پر طنز و تبصرہ کے لئے انہوں نے روزمرہ اور محاورہ کا استعمال بڑی خوبی سے کیا ہے۔ جن سے زبان و بیان کا رنگ نکھر گیا ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت ان ہی خوبیوں سے مزین ہے جس میں معاشرے کے مختلف طبقوں پر طنز و تبصرہ کیا گیا۔ جس میں خیالات کے ساتھ ساتھ زبان کی چاشنی پوری طرح موجود ہے۔

"صاحب! زبان ہمارے گھر کی لونڈی ہے، رہنے والے ہم میرٹھ کے ہیں، ہمارے ہاں کے دھنیے بھی لاہور کے شرفا سے اچھی زبان بولتے تھے، اور محاوروں کی تو بات ہی کیا، زبان کے سونے پر سہاگہ، اُردو چلتے پھرتے نہیں آجاتی بڑی ریاضت کے بعد آتی ہے۔ ہمارے خون میں اردو ہے۔ مدتوں دلی میں رہے سلطان جی کی چوکھٹ کو سلام کیا۔ مولوی سمیع اللہ کی دکان پر بیٹھے اور بلیماراں کے محاوروں سے دامن بھرا، جامع مسجد کی سیڑھیوں پر موتی رولے۔ چاوڑی بازار کے پھیرے پھاڑے۔ نواب خواجہ محمد شفیع کی حویلی میں آتے جاتے رہے۔ سائل دہلوی سے تلمذ تو نہیں تھا، لیکن ان کے لب و لہجہ سے فیض حاصل کیا، بیخود دہلوی کے نوالے توڑتے رہے۔ گھمی کبابی کے ہاں صرف بوٹی بھوٹی کی خوشہ چینی کیلئے جایا کرتے تھے۔ یہاں سے نکلے

تو علی گڑھ کے چکر کاٹے۔ لکھنؤ کے نخاسہ میں بالا خانوں کی سیر کی، ایم اے کیا ہزاروں کتابیں کھنگال ڈالیں، تب کہیں اردو کے چار بول اٹھانے کا ڈھب آیا ہے۔ حیرت ہے کہ زبان ہماری ہو اور ادیب کہلائیں صلاح الدین احمد۔ غلام رسول مہر۔ شورش کاشمیری۔ احمد ندیم قاسمی۔

انتظار حسین نے ایک سرد آہ کھینچی، پاک ٹی ہاؤس کے برخوردار ادیبوں کو ساتھ لیا، اور نکل کھڑے ہوئے۔"

مولانا ابوالمکارم بدایونی نے صاحبزادہ فضل اللہ، سجادہ نشین چوکی ملیاں کو دستار باندھتے وقت مریدانِ باصفا کے حلقہ میں ارشاد فرمایا۔

"اجی! نواب ابن نواب ابن نواب ہم" سات پشتوں سے دولت میں کھیل رہے ہیں، مغلوں کا دور تھا تو راج دربار میں ہمارا ہی ٹھاٹھ تھا۔ ہمارے بڑوں ہی کی گود میں اورنگ زیب عالمگیر جوان ہوئے۔ پھر مغلوں کے ہر دور میں ہمارا ستارہ چمکتا رہا۔ ان پر ساڑھ ستی آئی۔ تو انگریزوں کے دور میں بھی ہمیں سرفراز ہوئے۔ دادا مرحوم اور ابا جان کو کیسے کیسے خطابات نہیں ملے۔ انگریز گورنر ان سے شطرنج کھیلا کرتے تھے، وائسرائے نے ایک دفعہ دہلی بلا کر انہیں فرغل دیا تھا۔ ملکہ وکٹوریہ نے ہمارے خاندان کو یارِ وفادار کہہ کر نوازا، ہم نے ہندو کانگرس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، مسلمانوں کو قریب نہیں پھٹکنے دیا، پھر جب پاکستان بنا، تو ہم مہ پارہ میں لاکھوں روپے کی زمین چھوڑ کر چلے آئے۔ اللہ کا فضل ہے، سرکار نے بھی ہماری قدر کی۔ مگر صدمہ یہ ہے کہ یہاں کنگلے بھی صاحب جائداد ہو گئے ہیں۔ نو دولتوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ پاکستان کیا بنا، ہر ایرے غیرے کے ہاتھ دولت آگئی پہلے جو لوگ کورنش بجا لاتے تھے، اب سرکش ہو گئے ہیں۔ ان ہوٹلوں اور ریستورانوں نے چھوٹے بڑے کی تمیز اڑا دی ہے۔ جو لوگ کبھی پاؤں میں بیٹھا کرتے تھے اب برابر کی کرسی پر آبراجتے ہیں۔ کلجگ ہے۔ یہ صدمہ بھی ہماری قسمت ہی میں تھا۔ کہ جنہیں ہم کلوا

کہہ کے بلایا کرتے تھے، وہ اب کالے خاں کہلاتے، اور پچاس ہزار کی موٹر میں اڑتے پھرتے ہیں ـــــــ میاں! عزتوں کو دیمک چاٹ گئی ہے۔ اس سے پہلے ہم مرجاتے، تو روح سکھی رہتی، اب جان پہ یہ روگ لے کر بیٹھے ہیں، مرنا مشکل ہو گیا ہے ـــــــ

نواب چھٹن خاں ـــــــ حقّہ کی نے منہ میں لئے ترش روئی سے فرماتے رہے

پرانے ادیبوں کے پاس کیا رکھا ہے، بیمار محاورے ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ زبان کو لونی لگ گئی ہے۔ اس زمانے میں بھی رگِ گل سے بلبل کے پر باندھتے اور ہتھیلی پر سرسوں جماتے ہیں۔ زمانہ بدلتا رہتا ہے۔ وقت سدا کسی کا نہیں رہا، ان بوڑھوں سے پوچھو، کہ اب پرانے راگ چھیڑ کر کسے خوش کر رہے ہیں۔ لوگ بہت آگے نکل گئے ہیں، تم ابھی تک الفاظ کے بالا خانوں میں محاورہ بیگم اور روزمرہ خانم کی ٹھمریاں سننے میں لگے ہوئے ہو، چہرہ جھرایا گیا، ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں، بوٹی اور ہڈی ایک ہو گئے ہیں، لیکن زبان کا نخرہ ساتھ لئے پھرتے ہیں۔

حمزہ شنواری نے حلقہ اربابِ ذوق کی ایک گمشدہ محفل میں کہا اور پھلجھڑی چھوڑ کر اتنا غفیل ہو گئے[۱]"

۱؎ چٹان ۔ ۱۳جنوری ۱۹۶۲ء ص نمبر ۷

شورش کی حقیقت پسندی

صحافتی تحریروں میں آغا صاحب کے متعلق عام طور پر یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ جسے چاہتے عرش پر بٹھا دیتے اور جسے چاہتے تحت الثریٰ میں پھینک دیتے۔ مثلاً مشہور صحافی جناب م۔ش ایک خط میں آغا صاحب کو چٹان کے بہتر بنانے کیلئے تجاویز دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"الغرض "چٹان" کی ایک جامع شخصیت بنی چاہیے ایک سیاسی اور معاشی حیثیت یہ نہیں کہ آپ کے قلم کے زوردار غزلیں ہو جائیں یا ایک آدھ مضمون کسی کی حمایت میں قلم زن ہوئے تو اسے گزرے سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا۔ کسی سے برہم ہوئے تو اس کا تعاقب شروع کر دیا۔"[1]

اسی طرح جناب ڈاکٹر عبدالسلام خورشید صاحب نے بھی آغا صاحب کو "لڑاکا اخبار نویس"[2] کہا ہے اور لکھا ہے کہ

"کسی کو اچھالنے پر آئیں تو ثریا تک پہنچا دیں گے اور گرانے پر آئیں تو تحت الثریٰ تک پہنچا کر دم لیں گے۔"[3]

جناب م۔ش اور جناب عبدالسلام خورشید کی یہ آراء تشریح طلب ہیں جس سے ایک عام غلط فہمی کے پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ ان اقوال سے جو نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آغا صاحب اپنے قلم کے زور پر جس شخص کو چاہتے اچھالتے اور جس شخص کو چاہتے گرا دیتے تھے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اچھالے جانے والے لوگ اس قابل ہوتے تھے کہ انہیں اچھالا جائے یا اُن میں وہ خوبیاں نہیں ہوتی تھیں جن کی تشہیر آغا صاحب اپنے زورِ قلم سے کیا کرتے تھے؟ اور کیا گرائے جانے والے لوگوں میں وہ برائیاں یا خامیاں نہیں ہوا کرتی تھیں جن کی تشہیر کر کے آغا صاحب اُن لوگوں کو گرا دیا کرتے تھے؟ کیا ایک ہی شخص میں خوبیاں اور خامیاں نہیں ہوتیں؟ اگر جناب م۔ش اور جناب عبدالسلام خورشید صاحب اس کی وضاحت فرما دیتے تو کسی غلط فہمی کا احتمال نہیں تھا۔ لیکن موجودہ صورت میں مندرجہ بالا آراء سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ شاید آغا صاحب اپنی پسند کے چھوٹے لوگوں کو بڑا اور ناپسند کے بڑے لوگوں کو

---

1. چٹان ۲۱ مارچ ۱۹۶۶ء م۔ش مدیر اقدام کا گرامی نامہ "چٹان کو ایک مشورہ"
2. بحوالہ وے صورتیں الٰہی عبدالسلام خورشید ص نمبر ۲۰۵
3. وے صورتیں الٰہی " ص نمبر ۲۰۴ / ۲۰۵

چھوٹا بنا کر پیش کرتے تھے یا اُن کے قلم سے لوگوں کے خلاف ایسی باتیں منسوب کی جاتی تھیں جن کی بنا پر مختلف لوگوں کے متعلق اچھا یا بُرا تاثر قائم ہو جاتا تھا حالانکہ یہ بات بڑی ہی گمراہ کن اور آغا صاحب پر بہتان کے مترادف ہے

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ آغا شورش کاشمیری نے کن لوگوں کو اچھالا ہے اور کن لوگوں کو گرایا ہے یا کن لوگوں کے ساتھ اچھالنے یا گرانے کا سلوک کیا ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے آغا صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ

"انہوں نے جن شخصیتوں پر لکھا، محبت سے لکھا، کھُل کر لکھا، بھرپور لکھا اور یہ بھی یاد رہے کہ آغا شورش معمولی شخصیتوں کے سوانح نگار اور معمولی اوصاف کے ستائش گر کبھی نہیں بنے وہ معمولیات سے متاثر ہی نہیں ہوتے وہ صرف غیر معمولی اور عظیم اشخاص کے غیر معمولی اور عظیم اوصاف پر قلم اٹھاتے تھے وہ بونے جاپانی درختوں کی تعریف کرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں وہ تو قوی ہیکل، عظیم اشجار سایہ دار کے وصاف ہیں۔ اور پھر یہ بھی یاد رہے کہ شورش کے نزدیک عظیم شخص وہ نہیں جسے محض اتفاق یا قوم کی نااہلیت نے بڑا بنا دیا ہو۔ بلکہ بڑا وہ ہے جس نے پیکار حیات میں مقاصد عظیمہ کیلئے تیغ آزمائی کر کے اپنا سکہ بٹھا لیا ہو ــــ ع

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

یہی وجہ ہے کہ شورش کا قلم اس پوری صدی کے رجال میں سے دو چار ہی کیلئے اٹھا ہے۔ شورش کے نگار خانہ ذہن میں عظمت کی صرف چند تصویریں ہیں۔ درجہ بدرجہ اقبال۔ ابوالکلام۔ ظفر علی خاں۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری اور ایک دو اور۔"[1]

لہٰذا جو شخص "معمولیات" سے متاثر ہی نہ ہوتا ہو۔ اتفاق یا محض قوم کی نااہلیت کی بنا پر بڑا بننے والوں کی بڑائی کا منکر ہو وہ کیونکر لوگوں کو اچھالنے اور گرانے کا کام کرنے لگا۔ اصل بات یہ ہے کہ جس شخص کی عظمت کا معیار ایسے لوگ ہوں جنہوں نے پیکار حیات میں مقاصدِ عظیمہ کیلئے تیغ آزمائی کر کے اپنا لوہا منوایا ہو وہ دوسرے لوگوں کو چونکہ عظیم نہیں سمجھتا لہٰذا ان کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی

---

[1] فیضانِ اقبال ۔ شورش کاشمیری دیباچہ ڈاکٹر سید عبداللہ ص نمبر ۱۳/۱۴

کرتا ہے کہ لوگ اُس کی اخباری شہرت اور عوامی مقبولیت سے دھوکا نہ کھا جائیں۔ یہ بھی درحقیقت رہنمائی کا ہی ایک انداز ہے کہ صاحبِ بصیرت لوگ چونکہ عام روش سے ہٹ کر سوچتے ہیں لہٰذا وہ حقیقت تک پہنچنے میں بہت کم ہی غلطی کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو اس روش پر ٹوکتے اور خطرات سے آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ آغا صاحب کا بھی یہی انداز ہوتا تھا۔ اب اگر مندرجہ بالا اٹھائے گئے سوالات کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ جن لوگوں کو آغا صاحب نے گرایا وہ لوگ سرے سے عظیم تھے ہی نہیں لہٰذا گرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور جو لوگ آغا صاحب کے عظمت کے معیار پر پورے اترتے تھے انھوں نے ہمیشہ ان کی نہ صرف تعریف و ستائش کی بلکہ خود ان کی خوشہ چینی کے اعتراف میں فخر محسوس کیا۔

پھر کیا وہ لوگ جو آغا صاحب کی تنقید کا ہدف بنے اُن خامیوں اور کمزوریوں کے حامل نہ تھے۔ جن کی بنا پر آغا صاحب نے ان کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ اگر واقعی یہ درست ہے تو دنیا کی ہر زبان میں اس کا نام حقیقت نگاری ہے۔ کسی کو گرانا نہیں اور کیا وہ تمام لوگ جن کی آغا صاحب نے تعریف کی ہے اس قابل تھے کہ ان کی تعریف کی جائے یا ان میں وہ خوبیاں موجود تھیں جن کی وجہ سے ان کی تعریف کی گئی۔ اگر واقعی ایسا ہی ہے تو اس کو اچھالنا نہیں بلکہ حقیقت پسندی کہنا چاہیے اور اگر کسی شخص میں کمزوریوں کے ساتھ خوبیاں بھی ہیں تو اگر آغا صاحب نے کبھی کمزوریوں کی بات کی ہے اور کبھی خوبیوں کی تو اس میں آغا صاحب حقیقت نگار ہی رہتے ہیں کچھ اور نہیں ہو جاتے۔

جہاں تک کسی شخص کی ذاتی پسند، ناپسند کا تعلق ہے بلاشبہ آغا صاحب بھی اس سے **مستثنیٰ** نہ تھے۔ دوستوں کیلئے اچھے اور مخالفین کیلئے اچھے جذبات نہ رکھنا بھی ایک فطری بات ہے آغا صاحب بھی اس سے بلند تر نہ تھے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا آغا صاحب اپنے دوستوں کو اس بنا پر اچھا کہتے تھے کہ وہ آغا صاحب کے دوست ہیں یا اس بنا پر کہ وہ واقعی اچھے تھے اور اسی لئے آغا صاحب کے دوست تھے اسی طرح کیا مخالفین کی مخالفت صرف اس وجہ سے کرتے تھے کہ وہ لوگ آغا صاحب کے مخالف تھے۔ ہم اگر آغا صاحب کی زندگی کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے بہت کم باتیں ایسی ہونگی جن کا لوگوں کو علم نہ ہو۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں سے آغا صاحب کی دوستی تھی یا جن لوگوں پر آغا صاحب نے کچھ لکھا ہے وہ واقعی عظیم تھے اور تعریف کے مستحق مثلاً علامہ اقبال۔ مولانا ابوالکلام آزاد مولانا ظفر علی خان۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری۔ چوہدری افضل حق اور بہت سے اکابرینِ جدوجہد آزادی۔ دوسرے درجے میں وہ لوگ شامل ہیں جو کہ آغا صاحب کے ساتھ مراسم تھے۔ سیاسی امور میں آغا صاحب سے اختلاف بھی کرتے تھے۔ مثلاً اکابرین دیوبند، جن کی آغا صاحب وکالت بھی کرتے رہے مگر جو اختلاف بھی کیا وہ اصولوں اور نظریات تک محدود تھا۔ اس میں کسی قسم کی ذاتی دشمنی یا دوستی کو دخل نہیں تھا۔ اسی طرح

حمید نظامی صاحب۔ گورنر ملک امیر محمد۔ حسین شہید سہروردی، سردار عبدالرب نشتر وغیرہ، آغا صاحب کے دوست تھے۔ انہوں نے ان کو ہمیشہ اچھے الفاظ میں یاد کیا ہے لیکن کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آغا صاحب نے اُن کے ساتھ کوئی ایسی خوبی منسوب کر دی ہو جو اُن میں موجود نہ تھی۔ باقی رہے سیاسی مخالفین تو اس سلسلے میں آغا صاحب اصولوں اور نظریات تک اختلاف کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے حریف پر کبھی الزام تراشی نہیں کی بلکہ اگر مخالفین کی دشنام طرازی کے جواب میں کوئی تلخ بات کہی بھی تو اُس میں ثبوت اور گواہ بھی مہیا کیے کہ الزام تراشی کرنے والا لاجواب ہو جاتے۔ جناب م۔ش اور ڈاکٹر عبدالسلام کے ساتھ بھی آغا صاحب کے اختلافات ہوئے۔ مگر انہوں نے جوابات میں بھی الزام تراشی نہ تھی بلکہ ان اختلافات کی وجہ بھی موجود ہیں۔ جناب م۔ش صاحب مسلم لیگ کے طرف دار تھے مولانا ابوالکلام پر اکثر اعتراض کرتے۔ آغا صاحب مولانا ابوالکلام کے شیدائی تھے برداشت نہ کرتے بحث کا سلسلہ چل نکلتا دونوں طرف سے دلائل دیئے جاتے لیکن آغا صاحب نے م۔ش صاحب پر کبھی کوئی بہتان نہیں باندھا اور نہ کبھی ان کو گرانے کی کوشش کی۔ یہی حال ڈاکٹر صاحب کا بھی ہے۔ اخباری اصطلاح میں اچھالنا اور گرانا اچھے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ اچھالنا سے مراد ہے کسی شخص کو خواہ مخواہ تشہیر دینا اور گرانا سے مراد ہے کسی شخص کی خواہ مخواہ مذمت کرنا۔ آغا صاحب نے ساری زندگی اس بات کو برا سمجھا وہ بعض اخباروں۔ ادیبوں۔ شاعروں۔ سرکاری افسروں اور وزیروں کو اسی بنا پر ہدف تنقید بناتے تھے کہ وہ حق گوئی سے کام نہیں لیتے تھے۔ بلکہ بعض شخصیتوں کو عہدہ و اقتدار کی بنا پر خدا سمجھتے تھے خوشامد سے کام لیتے تھے وہ انہیں اس بنا پر اچھالتے تھے کہ اقتدار ان کے پاس ہے۔ وہ اختیارات کے مالک ہیں۔ شورش کاشمیری اس سلسلے میں واحد صحافی ہے جس کا دامن ہمیں خوشامد، تملق۔ بناوٹ اور ریاکاری سے پاک نظر آتا ہے۔ انہوں نے اگر اپنے سیاسی حریفوں کو گرایا ہے تو اس کی وجہ ذاتی دشمنی نہ تھی۔ سیاسی اختلاف تھا۔ اور یہ صحافت کے مسلّمہ اصولوں کے عین مطابق ہے۔ بقول مولانا محمد علی جوہر

"کسی شخص یا اخبار کی رائے کے خلاف کچھ لکھنا ہو تو وہ مخالفت محض رائے تک رہے ذات کا حصّہ شامل نہ ہو۔"[1]

اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان شخصیتوں میں خود گراوٹ موجود تھی۔ لہٰذا انہیں گرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن لوگوں کو آغا صاحب نے اچھالا ہے وہ ایسے لوگ تھے جن میں وہ باتیں موجود تھیں جنہیں اچھالا جا سکتا تھا لہٰذا آغا صاحب کی ادبی و سیاسی معرکہ آرائی کو صاف گوئی

---

[1] سیرت محمد علی حصّہ اوّل و دوم رئیس احمد جعفری ص نمبر ۲۷۰ کتاب منزل لاہور

حقیقت نگاری۔ بیباکی اور جرات کا نام دینا چاہیے نہ کہ اچھالنے اور گرانے کا۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں کہ ملک کے ذرائع ابلاغ جن شخصیتوں کو انسان سے فرشتہ بنانے کا فرض انجام دے رہے ہوں وہاں اکیلا شورش کاشمیری ان کو انسان بننے پر مجبور کر رہا ہو تو یہ اس کی عظمت اور انصاف پسندی کی دلیل ہے۔ کسی کی بیجا توقیر یا تحقیر نہیں۔

صحافت کی آزادی اور شورش

شورش کاشمیری کی صحافت کی یہ ایک امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے خوف ہو کر لکھا۔ واشگاف اور نام لے کر لکھا وہ خواہ وزیر تھا یا امیر۔ گورنر تھا یا وزیر اعظم۔ اخبارات یا سیاست دان سب سے لڑائی مول لی سب سے آنکھیں چار کیں اور ان کا کیا دھرا اپنے اخبار میں اس طرح بے نقاب کیا کہ سب چہرے عوام کے سامنے اصل روپ میں آگئے۔ پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں اس بات کیلئے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں کہ اخبارات کبھی آزاد نہ تھے۔ بقول آغا صاحب قیام پاکستان کے بعد

> "خواجہ شہاب الدین نے اخبارات کو عبادت کی بلندی سے گرا کر صنعت کے غار میں پھینک دیا۔ جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان اقتدار کی مسند پر فروکش ہوئے تو انہوں نے صحافت کی روایتوں کو اپنے اقتدار کے بل پر تہس نہس کر دیا۔ سب سے پہلے "پاکستان ٹائمز" اور "امروز" کی مالکانہ حیثیت ختم کی ان پر سرکاری قبضہ ہو گیا پھر پروگریسو پیپرز لمیٹڈ سے وہ سلوک ہوا جو بردہ فروش مغویہ لڑکیوں سے کرتے ہیں۔ کئی چہرے خریدار بن کر دستبردار ہو گئے۔ بالآخر اس ملک کے صنعت کاروں کی ملی بھگت سے نیشنل پریس ٹرسٹ بنایا گیا جو سرکار دولت مدار کی داشتہ تھا۔"[1]

نیشنل پریس ٹرسٹ اور اس کے اخبار حکومت کی مرضی سے انحراف کرنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان میں یہ جرأت نہ تھی کہ سچائی کیلئے بھی بیباکی و بے خوفی کا راستہ اختیار کر سکیں۔ انہوں نے سرکاری پالیسیوں کے جھوٹ کو سچ بنانے کیلئے ہر وہ کام کیا جو حکمرانوں کی خواہش تھی۔ اور یہ ہر دور میں ہوتا رہا۔ بقول آغا صاحب

> " اس کی بدولت اخبارات بساطی کی دوکان۔ پنساری کی ہٹی، چاوڑی کا ریستوران، ٹورنگ سینما

---

[1] چٹان ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء

اندر سبھا کا تھیٹر۔ فائٹ کلب یا پھر اس دوکاندار کا عقیدہ ہو گئے جو گرنتھ سے لے کر تمباکو تک۔ مصحف سے لیکر خنزیر تک، رامائن سے لیکر گائے کا گوشت تک فروخت کرتا اور اس کو کاروبار کا نام دیتا ہے۔"[۱]

آغا شورش کاشمیری اس ادارے کے سب سے بڑے مخالف تھے۔ انہوں نے حکومت نواز اور خاص طور پر نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے خلاف بہت کچھ لکھا[۲]۔ جسکی وجہ یہ تھی کہ وہ آزادیٔ صحافت کے علمبردار تھے وہ اس سلسلے میں کوئی پابندی قبول کرنے کے خلاف تھے۔ انہوں نے اخبارات کے خلاف جو کچھ بھی لکھا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ کتنے بیباک اور بے خوف صحافی تھے۔ اخبار نویس، معاشرے پر، اداروں پر افراد پر اور حکومتوں پر تنقید کرتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اخبارات کیلئے جواب دینا بڑا آسان کام ہوتا ہے۔ وہ معترض کی اپنے اخبار کے ذریعے بھی خبر لے سکتے ہیں۔ لیکن شورش کاشمیری کیلئے یہ سارے خطرات عبث تھے اُن کے لئے حرف حق پر بولنا ضروری تھا۔

آغا صاحب، صدر محمد ایوب خان کے دور کی صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جب ایوب خان سبکدوشی کے مرحلے میں تھے۔ اخبارات کا یہ حال تھا کہ وہ حقائق کے اظہار سے کنی

۱؎ چٹان ۲۴ جنوری ۱۹۶۷ء

۲؎ اس کی تفصیل چٹان کے مندرجہ شماروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

چٹان	۱۷ مارچ ۱۹۶۹ء	"اخبارات اور عوام"	ص نمبر ۴
"	۳ جنوری ۱۹۶۲ء	"اخباروں کا سرطان"	ص نمبر ۴
"	۱۰ فروری ۱۹۶۴ء	"قلم قتلے"	ص نمبر ۴
"	یکم مئی ۱۹۶۷ء	"پورس کے ہاتھی"	ص نمبر ۴
"	۲۲ جولائی ۱۹۶۳ء	"اخبارات پر قبضہ و تصرف کی داستان"	ص نمبر ۷/۸
"	۱۴ فروری ۱۹۶۶ء	"غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد"	ص نمبر ۴

کتراتے سچائیوں سے آنکھیں بند رکھتے، عوام سے منحرف ہوتے اور جھوٹ سے اپنے صفحات کا پیٹ بھرتے تھے اس زمانے میں اخباروں نے کتنے ہی لیڈر پیدا کئے لیکن ایوب خان کا سنگھاسن ڈول گیا تو تمام لیڈر پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئے۔ ان کی مثال ہوائی غباروں کی تھی۔ ہوا نکل گئی تو ختم ہو گئے ایوب خان کے اس دور میں اخباروں نے اپنے رنگ و روغن میں خوب اضافہ کیا پیسہ بھی خوب کمایا لیکن قوم کو قبروں کی کہانیاں سنائیں۔ عیاشیوں کے افسانے لکھے اور جمود و انحطاط کی روداد یں قلمبند کیں اس دور کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ سچائی کو چھپاتے اور دروغ کو اجالتے تھے۔ . . . .

نیشنل پریس . . . .

ٹرسٹ کا شعار اب بھی وہی ہے۔ وہ سب کچھ لکھتے ہیں لیکن جو مسائل ملک کو درپیش ہیں اور جن واقعات میں سے عوام گزر رہے ہیں۔ اُن کے بارے میں مہر بلب ہیں اور یہ وہی چیز جس سے ہم ایوب خاں اور یحییٰ خان کے ادوار میں دوچار تھے۔ وزیر اعظم بھٹو کی خدمت یہ نہیں کہ اخبارات تصویر کا ایک ہی رخ پیش کریں اور خود احتسابی کا شکار ہوں۔ اخبارات کا فرض ہے کہ وہ مسٹر بھٹو کے سامنے تصویر کا دوسرا رخ بھی لائیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ واقعات کا دھارا کیا ہے؟[۱]

آغا صاحب نے نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخباروں کو خاص طور پر اور دوسرے اخباروں کو عام طور پر اس قسم کی برائیوں میں ملوث دکھایا ہے جو یقیناً صحافت کیلئے کسی عزت کا باعث نہیں ہو سکتیں لیکن آغا صاحب بھی ان صحافیوں کے ہم عصر اور ان کا اخبار بھی اسی دور صحافت کا ترجمان تھا لہٰذا یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ خود آغا صاحب کی صحافت کا جائزہ اس پس منظر میں لیا جائے کہ انہوں نے پاکستان کے مختلف سیاسی ادوار میں کون سا طرزِ عمل اختیار کئے رکھا جو اُن کے ہم عصر صحافی اور اخبار نہ اپنا سکے۔

آغا شورش کاشمیری اپنی ہم عصر صحافیوں سے اس لئے مختلف ہیں کہ وہ صرف صحافی نہ تھے بلکہ سیاستدان صحافی تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ صحافت اور سیاست کا آپس میں گہرا تعلق ہے اور ہر صحافی کے لئے کچھ نہ کچھ سیاسی ہونا بھی ضروری ہوتا ہے

۱ے چٹان ۳۱ مارچ ۱۹۷۵ء

مگر شورش کاشمیری کی سیاست ہی صحافت تھی اور صحافت ہی سیاست تھی ان دونوں میں امتیاز کرنا بہت مشکل ہے اخبارات کے اداریوں میں جب ہم کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اخباروں کے ان اداریوں میں لفظ "ہم" کسی اخبار کا نمائندہ ہوتا ہے۔ یعنی ذہن فوراً مشرق۔ امروز۔ پاکستان ٹائمز اخبار کی طرف رجوع کرتا ہے اگرچہ ان کے اداریہ نویس کتنے بڑے سیاستدان ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن جب شورش کاشمیری اپنے اداریہ میں "ہم" کا لفظ لکھتے تھے تو ذہن چٹان کی طرف نہیں بلکہ شورش کاشمیری کی طرف رجوع کرتا تھا کہ یہ بات کہنے والا وہ شورش کاشمیری ہے جس نے ملک کی سیاست کے ہر دور میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے اگر چٹان کا نام لیا جاتا تھا تب بھی ذہن میں شورش کاشمیری کی شخصیت جلوہ گر ہوتی تھی۔ جہاں تک صحافت میں اثر و تاثیر کا تعلق ہے۔ یہ آغا صاحب کی شخصیت کا سحر تھا جس کا مقابلہ اُن کے ہم عصر صحافیوں کے بس کی بات نہ تھا۔

جہاں تک صحافت کے اصولوں کا تعلق ہے آغا شورش کاشمیری نے ان اصولوں کا ہمیشہ پاس کیا ہے۔ مشہور صحافی جناب وقار انبالوی نے پرانی صحافت کی آٹھ خصوصیات گنوائی ہیں۔ اور ان کا کہنا ہے کہ پرانے دور کے اخبار ان ہی آٹھ خصوصیات کا آئینہ ہوا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں

"ان آٹھ عناصر سے مرکب تھا صحافی: ان آٹھ عناصر ہی کا آئینہ تھا اخبار"[1]

اور یہ آٹھ عناصر مندرجہ ذیل ہیں۔

"حق گوئی و بیباکی و بے خوفی و جرأت
دلسوزی و دلداری و قربانی و ایثار"[2]

آغا شورش کاشمیری کی صحافت کو اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو ہمیں یہ مندرجہ بالا سات عناصر، آٹھویں عنصر یعنی جرأت کے تابع نظر آتے ہیں علامہ اقبال نے اسی جرأت رندانہ کے متعلق لکھا تھا کہ اس کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ جرات ہی شورش کاشمیری کی شخصیت کا بنیادی عنصر ہے۔ یہی جرأت ان میں بے خوفی۔ بیباکی حق گوئی۔ دلسوزی۔ دلداری اور قربانی و ایثار پیدا کرتی ہے اسی جرأت کا نام شورش کاشمیری ہے اور اسی جرأت کی مثالیں نہ صرف ان کی صحافت میں عام ہیں بلکہ ان کی خطابت اور نظم و نثر

۱-۲ چٹان ۲۰ فروری ۱۹۶۷ء نظم وقار انبالوی ص نمبر ۵

کو بھی اس جرات نے ایک جوش و ولولہ اور قوت عطا کی ہے یہ اسی وجہ سے ہے کہ شورش کسی طاقت کے سامنے جھکتا ہوا نظر نہیں آتا

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے دور میں اخبارات پر پابندیاں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ بقول آغا صاحب

" پریس ٹرسٹ کے اخباروں کی مجبوری واضح تھی لیکن کئی اخبار جو انفرادی ملکیت میں تھے حکومت کی منشا کے خلاف اپوزیشن کی معمولی سے خبر دیتے ہوئے بھی اختلاج قلب کا خطرہ محسوس کرتے تھے"[۱]

لیکن آغا صاحب نے اپوزیشن کا ساتھ جس جرأت۔ بیباکی سے دیا اس دور میں اُس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

مثلاً جب ایوب حکومت نے مسٹر بھٹو کو حکومت سے الگ کر دیا تو انھوں نے اپنی عوامی زندگی کا آغاز کیا۔ لاہور میں آغا صاحب نے یوم حمید نظامی پر بھٹو صاحب کو ایک بہت بڑے جلسے سے خطاب کرنے کا موقع فراہم کیا[۲]۔ آغا صاحب نے بھٹو صاحب کو چٹان کے صفحات میں جگہ دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جناب بھٹو صاحب کا اخبارات میں چھپنا قہر سلطانی کو دعوت دینا تھا۔ لیکن آغا صاحب نے بھٹو صاحب کے اپنے قلم سے سیاسی حالات پر لکھے ہوئے دو کتابچے بھی اپنے پریس میں چھاپے۔ جنھیں کوئی سا ملکی پریس بھی چھاپنے کیلئے تیار نہ تھا۔[۳] اور یہ کام انھوں نے بغیر کسی معاوضے کے کیا۔[۴] اس بیان کی تصدیق مولانا کوثر نیازی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ

" چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی لاکھوں کے مجمع میں تقریر اس قدر بھی اخبارات میں جگہ پانے کی حقدار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح ایک بی۔ ڈی ممبر کا بیان چھپتا تھا"[۵]

آغا صاحب نے مسٹر بھٹو کا ساتھ اقتدار کی دشمنی مول لے کر دیا۔ جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ آغا صاحب صدر محمد ایوب خان کی قائم کردہ جمہوریت کو ملک و قوم کیلئے مہلک سمجھتے تھے۔ انھوں نے جناب بھٹو کا ساتھ دیا حکومت کے زیر عتاب آگئے۔ حکومت

۱؎ موت سے واپسی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۱۴۱

۲، ۳، ۴؎ بحوالہ موت سے واپسی — شورش کاشمیری — ص نمبر ۳۵

۵؎ اندازِ بیان — مولانا کوثر نیازی — ص نمبر ۳۵

نے مختلف حربوں سے زیر کرنا چاہا مگر آغا صاحب جھکے نہیں بلکہ حکومت کو جھکنا پڑا کیونکہ آغا صاحب حق پر تھے لیکن جونہی بھٹو صاحب نے سوشلزم کا نعرہ لگایا۔ آغا صاحب ان کے خلاف ہو گئے کیونکہ وہ سوشلزم کو اپنے نظریے کے مطابق نہیں پاتے تھے، لہٰذا انھوں نے بھٹو صاحب کے اسلامی سوشلزم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اور پھر اُن کے قہر و غضب کا بھی نشانہ بنے لیکن انھوں نے کسی مصلحت یا لالچ کے تحت وہی کچھ کہا جو ان کے نظریے اور ضمیر کے مطابق تھا۔ آغا شورش کاشمیری اپنی ہم عصر صحافت سے اس لئے بھی منفرد تھے کہ ملک میں اپنا ایک خاص حلقہ رکھتے تھے جس کے ذریعے سے ان کے خیالات کی ترویج اور بھی زیادہ ہو جاتی تھی اور اس پر مستزاد یہ کہ خطابت کے ذریعہ بھی وہ اپنے خیالات کو عام کرتے رہتے تھے۔ لیکن ہم عصر صحافیوں میں چونکہ اس قسم کی خوبیوں کی مالک اور کوئی شخصیت موجود نہ تھی۔ جسکی وجہ سے وُہ دوسروں سے بہتر اور نمایاں اور منفرد صحافی مانے جاتے تھے۔

آغا شورش کاشمیری کی صحافت کے پس منظر میں صحافت کا زریں دور نظر آتا ہے۔ وُہ اس دور کے عظیم صحافیوں کے تربیت یافتہ تھے۔ انگریزی حکومت ایک بدیسی حکومت تھی۔ جس کے خلاف جدوجہد عظمت اور وقار کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ صحافی خاص طور پر لوگوں کو آزادی اور بیباکی کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ آغا صاحب چونکہ آزادی کی اِس جدوجہد کے سپاہی تھے اور ہندوستان کی سیاسی شخصیتوں کے کردار اور طریقِ کار سے آگاہ تھے۔ جب کہ ہم عصر صحافیوں میں آغا صاحب ایسا تجربہ کار حریت پسند اور جرأت مند صحافی کوئی دوسرا نہ تھا۔ قیام پاکستان کے بعد گو حکومت اپنی تھی مگر سیاست دان پرانے تھے۔ جن کے ماضی سے آغا صاحب کے سوا دوسرے صحافی اتنے زیادہ واقف نہ تھے۔ جتنے آغا صاحب تھے لہٰذا ان سیاست دانوں نے اقتدار میں اگر آسمانی مخلوق ہونے کا دعویٰ کیا تو آغا شورش ہی وہ صحافی تھے جو اُن کے ماضی کے کارناموں اور کارکردگی کا پردہ چاک کیا کرتے تھے چونکہ وہ سیاستدانوں کے کردار اور طرزِ عمل کے پرانے شناسا تھے اس لئے وہ ان کی اصل قوت اور طاقت سے بھی واقف تھے لہٰذا ان سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے تھے۔ قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد جب بڑے سیاستدانوں کی موت نے قیادت کا ایک خلا پیدا کر دیا تو چھوٹے اور نئے سیاست دان بڑے اور پرانے سیاستدان بننے کی کوشش کرنے لگے آغا صاحب ان کو سلمہ تعالیٰ لکھتے اور ان کی سیاسی کوتاہیوں کا مذاق اڑاتے اور پھر ان سیاستدانوں کا مقابلہ پرانے سیاست دانوں کی سیرت و کردار سے کرتے جو واقعی ملک و قوم کے رہنما اور قائد تھے۔ اس طرح اقتدار کی وجہ سے بڑے بننے والے سیاستدانوں کو آغا صاحب کی صحافت ہونا خریتی تھی۔ لیکن دوسرے صحافی چونکہ عملی سیاست کا تجربہ آغا صاحب سے کم رکھتے تھے لہٰذا کم موثر تھے۔ اعتدال اور میانہ روی یقیناً قابلِ تعریف اور بہترین طرزِ عمل ہے۔ اِس میں تھوڑی سی افراط و تفریط

کمی بیشی یا کمزوری اور لغزش اس توازن کو بگاڑ سکتی ہے پاکستان کی صحافت میں اسی اعتدال اور میانہ روی کے ڈانڈے ہمیں بزدلی اور کم ہمتی سے ملے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حکمرانوں نے اعتدال اور میانہ روی کا پرچار کیا۔ ملک و قوم کی بہتری کیلئے اسے اکسیر بنایا اور ملک کے صحافیوں نے اس اعتدال اور میانہ روی کی حدیں خوشامد اور خود سپردگی سے ملادیں اور برائے سنجیدہ۔ متین اور لکھے پڑھے لوگوں کی پسندیدہ صحافت کا نام دیکر اقتدار و حکومت کی ہم نوائی کی۔ لیکن آغا شورش کاشمیری چونکہ مصلحت سوز دور کے نمائندہ صحافی تھے لہذا انہوں نے اس قسم کی میانہ روی اور اعتدال سے اپنی صحافت کا دامن داغدار نہیں ہونے دیا۔ بلکہ انھوں نے جو کچھ لکھا گھن گرج کے ساتھ لکھا جس بات کا اظہار ضروری تھا اس کا اظہار برملا کیا۔ جو طرز عمل ملک و قوم کیلئے مناسب تھا اسے اختیار کیا اور لوگوں کو اس کی اعلانیہ دعوت دی۔ حکمرانوں کی غلطیوں پر انھیں ٹوکا اُن کے ناروا رویئے کے خلاف احتجاج کیا۔ اور اُن کی ریشہ دوانیوں کے خلاف عوام میں نفرت پیدا کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ صحافت کے میدان میں جہاں بہت سے اخبار اور مدیر تھے صرف چٹان اور شورش کاشمیری ہی زیادہ تر موجب عتاب ٹھہرے۔ آغا شورش کاشمیری کی یہی ادا انہیں دوسرے ہم عصر صحافیوں کے مقابلے میں ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جاچکا ہے کہ شورش کاشمیری کا تعلق پرانی صحافت سے ہے لیکن شورش صاحب اور ان کی ہم عصر صحافت کو صرف قدیم اور جدید کا فرق نہیں سمجھ لینا چاہیے بلکہ یہ فرق اصل اصول کا ہے۔ یعنی آغا صاحب نے اپنی صحافتی زندگی میں صحافت کی اعلیٰ اقدار کی آبیاری کی ہے۔ جبکہ دوسروں کے ہاں ہمیں ان قدروں کی تباہی اور بربادی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے بجا طور پر لکھا ہے کہ

"شورش کاشمیری کے اٹھ جانے سے اردو صحافت کی تاریخ کا وہ دور ختم ہوگیا۔ جس کا آغاز مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔"[1]

گویا آغا شورش کاشمیری پاکستان کی صحافت کی تاریخ میں مولانا ظفر علی خان کے نمائندے تھے۔ لہذا یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ آغا شورش کاشمیری اپنے عہد کے سب سے بڑے صحافی تھے۔

---

[1] چٹان شورش نمبر مضمون ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص نمبر ۱۱۳

حرفِ آخر

سیاست

آغا صاحب نے "گفتنی و ناگفتنی" کے دیباچے میں لکھا تھا کہ

"اگر میری زندگی میں سے سیاسی جدوجہد کا عنصر خارج ہو جائے تو پھر جو باقی رہتا ہے وہ کسی توجہ کے قابل نہیں "

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر آغا صاحب کی سیاسی جدوجہد میں سے ان کے کردار و مزاج کی صلابت اور شخصیت کی آتش پائی منہا کر دی جائے تو باقی زندان افرنگ میں ایک جوان رعنا کی قید رہ جاتی ہے۔ افرنگی استبداد کے خاتمے اور آزادی کے حصول کی خاطر جدوجہد کے خون آشام عرصے میں ہزاروں نوجوان قید ہوئے ہونگے۔ لیکن غلامی کی زنجیروں کی سختیوں اور قید خانوں کی کوٹھڑیوں کی تاریکیوں نے کسی غریب گھرانے کے نیم خواندہ نوجوان کو شورش نہیں بننے دیا۔ یہ زبان کی وہ تیزی اور شخصیت کی وہ گرمی تھی۔ جس نے ایک قلب صمیم رکھنے والے آتش زبان آزادی پسند نوجوان کو عبدالکریم سے شورش کاشمیری بنا کر اپنے عہد کے نامور سیاست دانوں شعلہ بیاں خطیبوں اور قلم گہربار رکھنے والے صحافیوں کی نگاہ جوہر شناس میں عزیز و محترم کر دیا۔ آغا جی شورش اپنی عمر اور مزاج کے اعتبار سے عقدہ ہائے سیاست کشا کرنے والے دماغوں کی فتنہ طرازیوں کو نہ سمجھتے تھے۔ محض وطن اور اس کی آزادی کی محبت نے انہیں برطانوی حکومت کے دیسی قید خانوں کا "مستقل مہمان" بنائے رکھا۔ لیکن سیاسی شعور کے پختہ ہونے کے بعد جس چیز نے انہیں برطانوی استبداد کے آگے جھکنے، دبنے اور مرعوب ہونے نہ دیا وہ ان کی جرأت کردار اور صلابت فکر تھی۔ اس فکر کو مزید پختہ کرنے اور جرأت و حوصلہ بڑھانے میں اُن ہم قفس ساتھیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ جو آزادی وطن کیلئے کوشاں قید خانوں کی تاریکیوں کو اپنے علم و فکر سے روشن کر رہے تھے۔ قید کی تنہائیوں نے اُسے مطالعہ کا موقع فراہم کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی عمر تجربے اور علم میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لیکن اس ارتقا کے باوجود اس کی طبیعت کا بنیادی خاصہ جدت کردار اور شدت گفتار قائم بالذات رہا۔

نتیجتاً اس کی سیاست اس کی خطابت کا حاصل بن گئی۔ اور وہ اس قافلہ سیاست کے حدی خوانوں میں شامل ہو گیا۔ جو اپنے شریک سفر لوگوں کے مقابلے میں منزل نصیب نہ ہوئے لیکن آزادی کی فضا اور انگریز کے انخلا میں

اُن کا حافظ رہا۔ آزادی کے بعد مسافرانِ منزلِ حریت جو بوڑھے تھے تھک ہار کر سستانے لگے جو بے دماغ تھے اُن کا نئے چمن کی موج بوئے گل سے ناک میں دم آنے لگا۔ لیکن جنہیں قدرت نے متحرک اور زندہ دماغ عطا کئے تھے وہ آزادی کے بعد ملکی انصرام و استحکام کیلئے اپنی صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔ شورش بھی انہی پائندہ دماغوں میں سے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد انہوں نے اپنی تمام توانائیاں اور اپنے قلم کی ساری رعنائیاں اور بیان کی شعلہ آرائیاں تعمیر و استحکام وطن اور آبروئے دین کے تحفظ کیلئے صرف کر دیں۔ وہ اپنے زورِ قلم سے سیاست کی چنگیزی قوت ختم کرنا فرض سمجھتے

قیام پاکستان کے کچھ عرصہ بعد سے آغا صاحب کا کسی سیاسی جماعت سے عملاً کوئی تعلق نہ رہا وہ کسی سیاسی تنظیم کے رکن نہ رہے۔ احرار سے اُن کا ذہنی رشتہ تھا جو اب یادوں کے رشتے تک موقوف تھا۔ صرف تحریک تحفظ ختم نبوت ایسی تحریک اور ایسا مشن تھا۔ جس سے ان کی وابستگی ہمیشہ ہمیشہ کیلئے تھی۔ ورنہ نہ ان کی کوئی سیاسی جماعت تھی نہ وہ کسی سیاسی جماعت کے تابع تھے۔ وہ فکر اور عمر کے اس دور میں داخل ہو چکے تھے۔ جہاں وہ سیاسی رہنماؤں سے متاثر ہونے کی بجائے خود بے شمار انسانوں کو رہنماؤں کی طرح متاثر کر رہے تھے۔ ان کے قارئین و سامعین کے دلوں میں ان کی حیثیت خود ایک رہنما کی تھی۔ بلکہ یہ لوگ دوسرے رہنماؤں کے متعلق شورش کی رائے سے اپنی رائے بناتے۔ دوسرے رہنماؤں کے متعلق اور آغا صاحب کے سیاسی خیالات کا اظہار منہ سے کر کے زبان کے چٹخارے لیتے۔ آغا صاحب کی صرف ایک ہی سیاسی جماعت تھی اور وہ تھا پاکستان اور ایک ہی سیاسی نظریہ تھا وہ اسلام۔ وہ کسی نوزائیدہ سیاسی جماعت کی نکیل ہاتھ میں کرنے کی بجائے یا کسی سن رسیدہ تنظیم کا حدی خواں بننے سے بڑھ کر ایک کہنہ مشق سیاستدان کی طرح ملک و ملت کی آزادانہ اور غیر محدود خدمت کرنا چاہتے تھے اور یہ خدمت انہوں نے دل و دماغ اور زبان و قلم کی پوری قوتوں کے ساتھ انجام دی بقول شخصے اپنی سیاسی جماعت کی بہترین خدمت وہ کرتا ہے جو اپنے ملک کی بہترین خدمت کرتا ہے۔

ملک میں شخصی آمریت کے آثار ہویدا ہونے لگتے یا لادین عناصر کی جلی و خفی ریشہ دوانیاں محبانِ وطن کیلئے اندیشہ جان بننا شروع ہوتیں اور ملکی سیاست جھنور میں آتی تو وہ صاف دماغ اور مصلحت سوز سیاستدانوں کی طرح تمام اندیشوں سے بے نیاز اور بے خوف و خطر آمروں کو للکارتے آمریت نوازوں کو تاڑتے اور لادین عناصر کی بیخ کنی کا سامان صد ہزار اندیشہ

پائے مضامین جگر خراش سے کرتے - وہ ایک ایسے سیاستدان تھے جن کے پاس ذہن رسا کے علاوہ زبان کی شعلہ فشانی اور قلم کی روانی بدرجہ کمال پائی جاتی تھی اور ان کی بے پناہ شخصیت انتخابی قیود اور عوامی خوشامد کی سیاسی رسموں میں سرگشتہ خمار نہ ہو سکتی تھی ورنہ وہ اگر اپنی سیاسی تقاریر کیلئے وسیع میدانوں میں انسانوں کی فصلوں کا انتخاب کرنے کی بجائے انتخابی کشمکش سے دوچار ہو کر پارلیمانی ایوانوں میں خطاب کرتے تو گلیڈسٹون اور برک کی یادگار تقاریر کی طرح اردو زبان میں بھی سیاسی تقاریر کے شہ پارے موجود ہوتے - شورش کے انجام سیاست میں شورش کے آغاز سیاست کا بڑا ہاتھ ہے - شورش کی سیاسی زندگی کا آغاز اُس وقت ہوا تھا جب سیاست آگ اور خون کا کھیل تھی اور شورش کی عمر کے آخری سالوں میں سیاست کو آگ اور خون کا کھیل بنایا جا رہا تھا - لیکن جو سمندر کی آگ میں تیر کر آیا ہو اُس کے لئے دریا میں آگ لگنے سے پانی گرم نہیں ہو جاتا - سیاست میں گھبرانا شورش کا شیوہ ہی نہ تھا - حالات بگڑتے تو قوم کی طبیعت سنورنے لگتی اور سیاست کی راہیں بند ہوتیں تو ان کی خطابت کے نالے چڑھ جاتے اور پھر ان کا تیز بہاؤ اکثر تحریک کی صورت اختیار کر لیتا اور اس طرح ان کی سیاست، سیاست سے صحافت، صحافت سے خطابت اور خطابت سے سلاسل تک پہنچ کر عوام کے پاؤں کی زنجیر کو آمروں کی تقدیر بنا دیتی -

المختصر شورش وہ روشن دماغ اور شعلہ بیان سیاستدان تھا - جو قیام وطن کے بعد ایوان سیاست کے سرد طاقوں میں زبان کے شعلے قلم کے فتیلے اور لہو کے تیل سے جمہوریت کے چراغ جلاتا اور آمروں کی پھونکوں کا تمسخر اڑاتا رہا -

شاعری

شورش صاحب محبت میں سیاست کی زبان استعمال کر کے اسے شوخ اور دلچسپ اور سیاست میں اپنا رنگ اپنا کر اُسے گوارا بنا دیتے ہیں - شورش کی شاعری کا میدان اُن کی اپنی زندگی کا میدان ہے - جس میں متروکہ محبت - اختیاری سیاست کی مرتفع سطحیں اور ان کو سیراب کرنے والا خطابت کا دریا پایا جاتا ہے - آغا صاحب کی طبیعت کا بہاؤ ان کی شاعری پر غالب رہا ہے - ان کی شخصیت فن شاعری کی نازک مزاجیوں اور ناز نخروں سے مرعوب نہیں ہوتی بلکہ ان کے پسندیدہ الفاظ کی وجاہتوں کے جلو میں غزل بھی کسی زخمی ہرن کی صدائے دردناک لگنے کی بجائے طبل جنگ کی آواز معلوم ہوتی ہے -

اب ذرہ ہائے خاک ہیں گردوں سے ہم کلام
اب کونپلوں کو نغمہ سرا کر رہا ہوں مَیں
اے ربِ ذوالجلال تری برتری کی خیر
کن ظالموں کی مدح و ثنا کر رہا ہوں مَیں
شورش مری نوا سے خفا ہے فقیہہ شہر
لیکن جو کر رہا ہوں بجا کر رہا ہوں مَیں

آغا شورش کاشمیری اُردو کے وہ آتش نفس شاعر ہیں۔ جن کی شاعری بلاکشانِ محبت کا واویلا نہیں ہے۔ بلکہ مجاہدانِ لشکر شکار کا ترانہ رستاخیز اور صید قفس شکن کا نغمہ آزادی ہے۔ اُن کے اشعار پڑھنے کے بعد دل پھوڑے کی طرح پکنے نہیں لگتا بلکہ آتش فشاں کی طرح دہکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ قلب قاری کے اندر جذبات کی یہ حرارت خود شاعر کی گرم ترم حرارت ہے۔ آغا صاحب کی شخصیت اُن کی تمام شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔ انہوں نے جس انداز کی شاعری کی وہ کسی اور شاعر کے بس کی بات نہ تھی۔ ایسی شاعری سایہ صنوبر کے نیچے یا لحاف میں بیٹھ کر نہیں ہوتی وہ محبوبہ سے بھی شعر کی زبان میں بات کر رہے ہوں تو ایسے لگتا ہے کہ اُسے زندگی سے دلیرانہ نبرد آزما ہونے کا درس دے رہے ہیں۔

تیرا دل تلخئ دوراں کی گزرگاہ سہی!
تیرے جذبات میں احساس ہزیمت کیا ہے
قضا کے رخ کو بدل دیں بعزم عشق جواں
حیات تلخ سہی اس پہ مسکرا کے چلیں

شورش صاحب کی سیاسی شاعری اور شاعری میں ان کا طنز و استہزا ظفر علی خاں کے بعد ان کا حصہ ہے۔ لیکن اُن کی رومانوی نظموں اور غزلوں پر جو بقول ان کے اختر شیرانی کے رنگ میں کہی گئیں ان میں ان کا اپنا منفرد سوچ کا انداز شامل ہے۔ عقیدہ و سیاست اس جاندار شاعر کا جس نے اپنی عمر کا بہترین حصہ سجن فرنگ کی سلاخوں کے پیچھے گزار دیا۔ عقیدہ اسلام کی عظمت اور سیاست انگریز سے نفرت ہے۔ ایام جوانی کی وہ محکم سوچیں وطن کی آزادی کے

کے بغیر انسان نہ اپنے سر کی حفاظت کر سکتا ہے نہ سرزمین کی اور شورش صاحب ایسے جری انسان تھے جو ہمیشہ اپنے سر کو بلند اور سرزمین کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

بہ پیش دبدبہ خسروان تیغ بدست
زباں پر آہی گیا لاالٰہ الا اللہ

صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا   مرے وطن تری عظمت کے گیت گاؤں گا
اگر تصرف گل چیں رہا بہاروں پر   تو پھر میں اُن کا لہو تک نچوڑ لاؤں گا

یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب کے اس بیس سالہ پرانے کلام کو اگر آج بھی پڑھیں تو نہ صرف کلام تازہ محسوس ہوتا ہے بلکہ دل کے اندر وہ جذبے بھی جاگ اُٹھتے اور تازہ ہو جاتے ہیں کہ جنہیں ہنگامی سمجھ کر مستقلاً نظر انداز کر دیا جائے تو افراد و اقوام کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

حاصل مطالعہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب بحیثیت شاعر وہ شعلہ فشاں۔عشق پاپیشہ مرد جری ہیں جو میدان وغا میں رجز خوانی کرتے اور اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتے ہوئے تلوار ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔

زبان ذوالفقار میں ڈھلی ہوئی ہے شاعری
غزل کی آب و تاب میں نوائے کار زار ہے

نثر نگاری

آغا صاحب کی ہمہ رنگ نثری تصنیفات کے سائز مطالعہ کے بعد یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے نوک قلم پہ ہیرے کی کنی جڑی ہے۔جس سے متنوع موضوعات پر بوقلموں اسالیب کی جھلا جھلی ہوتی ہے۔موضوعات کی گوناگونی اور اسالیب تحریر کی بوقلمونی نے اُن کی نثر کو قوس قزح کی طرح سات رنگ بنا دیتا ہے جس کے باعث ان کے نثری موضوعات کی آویزش کے باوجود ان میں قارئین کی دلچسپی کی آمیزش میں فرق نہیں پڑتا۔کہاں اُس بازار کا رستا ہوا سماجی ناسور کہاں شب جائے کہ من بودم میں خامہ پر نور۔کہاں پس دیوار زنداں میں ایک پا بجولاں صاحب قلم کا عزم و استقلال اور کہاں پر اقبالی حرم میں دنیائے اقبال۔کہاں موت سے واپسی میں قلم کی قوت اور زندگی کا ثبات اور کہاں بوئے گل میں لہجہ قند و نبات

بعد بھی ان کے لہو میں شامل رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں قصد و ارادہ کی بجائے برجستہ و بدیہہ گوئی کا عنصر شامل ہے۔

اوّل اوّل حالات نے آغا صاحب کی صلاحیتوں کے مطابق ان سے کام لیا اور بعد میں انہوں نے خود اپنی صلاحیتوں کے مطابق زندگی اختیار کر لی۔ شورش کاشمیری برصغیر کی آزادی کے بعد رسن و دار کے مرحلوں سے نکل کر مقام صحافت کی طرف نہ آتے تو اُن کی شاعری کا چراغ شعلہ مستعجل ہو کر رہ جاتا۔ اس چراغ کی لو زندہ رکھنے کیلئے انہوں نے قلم و قرطاس سے اپنا رشتہ منقطع نہیں کیا۔ چٹان کے صفحات اور پھر ان کے چار مطبوعہ مجموعوں میں موجود اُن کی نظمیں اور غزلیں اردو شاعری میں اُن کی انفرادیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آغا صاحب کی تمام شاعری میں مضمر ان کا انفرادی وصف جو پرسکون مطالعے سے نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ جرأت ہے بلکہ ذرا غور کرنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ کلام شورش کے مختلف اسالیب کے عنوانات خواہ کچھ کیوں نہ ہوں، ان سب کا موضوع ایک ہے وہ ہے بے ریائی و بے باکی اور اس بے ریائی و بیباکی کا اظہار نظم و غزل کے پیرائے میں کبھی لفظوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی آہنگ میں اور یہ آہنگ اُن کے ارتجالاً کہے گئے کلام میں اور زیادہ شدید ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہاں تکلف لہجے کو نرم نہیں کرتا۔ برجستہ نظموں میں اُن کے شاعرانہ لہجے کی کاٹ تیغ اصیل کا کام کرتی ہے اور ان کے ایجاد کردہ چبھتے استعارے فسان بن جاتے ہیں۔ استعارے باندھنے اور ترکیبیں گھڑنے میں انہیں کمال حاصل ہے۔ لیکن ان استعاروں اور ترکیبوں کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہ آغا صاحب کی زندگی کے تجربات کا عکس ہیں۔ شورش صاحب کی شاعری میں مستعمل استعاروں اور ترکیبوں کو جب قاری اُن کی زندگی کے تجربات کے حوالے سے دیکھتا ہے تو یہ اس کے ذہن پر ایک خاص مفہوم پیدا کر سکتے ہیں۔ جو محدود و مختصر الفاظ کی گرفت میں نہیں آتا بلکہ شاعر کی شعلہ نشاں زندگی کے واقعات کا تسلسل، ان میں معنی کا تنوع پیدا کر دیتا ہے۔ آغا شورش کی شاعری کے دو قوی محرکات غیرت دینی اور شخصی انا تھے اور خارج سے جب بھی کوئی ضرب ان دو عناصر پر پڑتی۔ ان کا اشہب قلم سرپٹ دوڑنے لگتا اور پھر ان کا بے پناہ ذخیرہ الفاظ اس کی رفتار میں کمی نہ آنے دیتا۔ "چہ قلندرانہ گفتم" کی نظمیں اشہب قلم کی برق رفتاری کا بین ثبوت ہیں اگرچہ یہ نظمیں اور "الجہاد والجہاد" کی نظمیں دونو ہنگامی تخلیقات ہیں۔ لیکن یہ تخلیقات ہنگامی ہونے کے باوجود ایسے جذبوں سے متعلق ہیں جن کی انسانی زندگی میں عارضی اور ہنگامی نہیں پائیدار اور مستقل حیثیت ہے۔ حفظ دین اور دفاع وطن کے جذبات تہذیبی زندگی کے وہ اعلیٰ ترین جذبات ہیں۔ جن

کے بغیر انسان نہ اپنے سر کی حفاظت کر سکتا ہے نہ سرزمین کی اور شورش صاحب ایسے جری انسان تھے جو ہمیشہ اپنے سر کو بلند اور سرزمین کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔

بہ پیش دبدبہ خسروان تیغ بدست
زباں پر آہی گیا لاالٰہ الا اللہ

صبا کے روپ میں ہر سمت پھیل جاؤں گا   مرے وطن تری عظمت کے گیت گاؤں گا
اگر تصرف گل چیں رہا بہاروں پر   تو پھر میں اُن کا لہو تک نچوڑ لاؤں گا

یہی وجہ ہے کہ آغا صاحب کے اس بیس سالہ پرانے کلام کو اگر آج بھی پڑھیں تو نہ صرف کلام تازہ محسوس ہوتا ہے بلکہ دل کے اندر وہ جذبے بھی جاگ اُٹھتے اور تازہ ہو جاتے ہیں کہ جنہیں ہنگامی سمجھ کر مستقلاً نظر انداز کر دیا جائے تو افراد و اقوام کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

حاصل مطالعہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آغا صاحب بحیثیت شاعر وہ شعلہ فشاں۔عشق پیشہ مرد جری ہیں جو میدان وغا میں رجز خوانی کرتے اور اپنے ساتھیوں کے حوصلے بڑھاتے ہوئے تلوار ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔

زبان ذوالفقار میں ڈھلی ہوئی ہے شاعری
غزل کی آب و تاب میں نوائے کارزار ہے

نثر نگاری

آغا صاحب کی ہمہ رنگ نثری تصنیفات کے جائزہ مطالعہ کے بعد یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے نوک قلم پہ ہیرے کی کنی جڑی ہے۔جس سے متنوع موضوعات پر بوقلموں اسالیب کی جھلاجھلی ہوتی ہے۔موضوعات کی گوناگونی اور اسالیب تحریر کی بوقلمونی نے اُن کی نثر کو قوس قزح کی طرح سات رنگ بنا دیتا ہے جس کے باعث ان کے نثری موضوعات کی آویزش کے باوجود ان میں قارئین کی دلچسپی کی آمیزش میں فرق نہیں پڑتا۔کہاں اُس بازار کا رستا ہوا سماجی ناسور کہاں شب جائے کہ من بودم میں خامہ پر نور۔کہاں پس دیوار زنداں میں ایک پا بجولاں صاحب قلم کا عزم و استقلال اور کہاں پرافشانی حرم میں دفاع اقبال۔کہاں موت سے واپسی میں قلم کی قوت اور زندگی کا ثبات اور کہاں بوئے گل میں لہجہ قند و نبات

کہاں فنِ خطابت میں الفاظ کا بہتا دریا اور کہاں علمی اسرائیل کی داستان صبر آزما۔ موضوعات کا یہ بُعد اور اُن پر بے محابا قلم کا بوقلمون اختیار۔ اسے قلم کی برجستگی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یہ شخصیت کی رنگا رنگی مطالعہ کی وسعت طبیعت کی محنت کوشی اور دماغ کی عرق ریزی کا نتیجہ ہے۔

اگرچہ قارئین کیلئے آغا صاحب کی تمام نثری تصانیف میں اسلوب کی روانی اور تحریر کی برجستگی پائی جاتی ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اپنے انداز میں برجستہ نظر آنے والا ایک ایک جملہ اور ایک ایک فقرہ کتنی کتنی بار سنوارا گیا ہے اور کتنی کتنی محنت و ریاضت کا نتیجہ ہے اور یہ گمان اس حقیقت سے صحیح معلوم ہوتا ہے۔ کہ اسلوب تحریر میں حسن و کمال کا جتنا ارتقا آغا صاحب کی عہد بہ عہد تصنیفات میں ملتا ہے کسی اور صاحب طرز ادیب میں کم نظر آتا ہے۔ اپنے متنوع اسالیب نگارش کی ریاضت و محنت سے تہذیب و آرائش میں وہ بتدریج اپنے چہیتے اور عزیز الفاظ کو شرارے پھر شراروں سے ستارے اور ستاروں سے آفتاب بناتے رہے ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ محض الفاظ نہیں کہ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہوں بلکہ استعارے ہیں جو موضوع تحریر کے حوالے سے خاص مفہوم میں استعمال ہوتے ہیں اور استعارے بنانے میں وہ اپنے انداز میں فرد ہیں۔ اکثر اوقات وہ مردہ و متروک الفاظ کو استعاروں کی صورت میں بطن تحریر سے اس طرح پیدا کرتے ہیں کہ وہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ اور اُن کی رونق حیات اور آب و تاب متعلقہ عبارت کے ٹکڑے کو چار چاند لگا دیتی ہے وہ مفہوم کا تقدس برقرار رکھنے کیلئے تو شستہ و شگفتہ الفاظ استعمال کرتے ہی ہیں لیکن ان کا کمال تہذیب اور خوبی تحریر یہ ہے کہ وہ معنوی تعفن کے اظہار کیلئے بھی الفاظ کی ظاہری طہارت کو آلودہ نہیں ہونے دیتے۔ "اُس بازار میں" بظاہر تین بے ضرر صاف ستھرے پاکیزہ الفاظ ہیں لیکن جب یہ کتاب کے موضوع کے حوالے سے تین استعارے بنتے ہیں تو یہ اُس زہرناک ترکیب کو جنم دیتے ہیں جو اس کتاب کی اشاعت کے بعد سے لیکر "آج تک" اردو معاشرے میں ایک محاورہ بن چکی ہے۔

"اُس بازار میں" کا اسلوب نگارش ایسا ہے کہ الفاظ پھولوں کی طرح کھلتے اور رقص کرتے محسوس ہوتے ہیں ان کے دامن کی خوشبو اور قدموں کی چاپ مطالعہ شب کے بعد قاری کو سونے نہیں دیتی وہ اگر کسی خوش کن تصور میں محو ہو کر آنکھیں جھپکتا بھی ہے تو کسی نہ کسی تیز جملے کا کوئی نہ کوئی کانٹا اُسے جگا دیتا ہے۔ اس لئے کہ اس اسلوب نگارش کا مدعا لذتِ انگیزی نہیں بلکہ اس تصویر سے پردہ ہٹانا ہے جسے معاشرے کی دیوار سے اتارنے کیلئے نکوکاروں کی آنکھیں اُٹھتی ہیں یا ہاتھ نہیں۔

اور ایک اسلوب وہ ہے جو شب جائے کہ من بودم میں اختیار کیا گیا ہے - جہاں دُھلے آنسوؤں سے وضو کر کے موضوع کی محرابوں میں سجدہ ریز ہیں - جہاں الفاظ احترام عشق میں کانپتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور جہاں عبارت طہارت کے بعد مصروف عبادت نظر آتی ہے - موضوع کی عظمت اور اسلوب کی عمدگی کا یہ کرشمہ ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک مسلمان اس کتاب کا مطالعہ کرے تو اُس کا دل فگار اور آنکھیں اشکبار نہ ہوں - اور ایک اسلوب وہ ہے جس کے حتمی انتخاب کیلئے کئی بار کتاب کا مسودہ مکمل کر کے پھاڑ دیا گیا - جس کی تکمیل میں انیس سال صرف ہوئے اور میرے خیال میں جو آغا صاحب کی بہترین تصنیف ہے پس دیوار زنداں - اس میں اسلوب جتنا سادہ ہے اتنا ہی مشکل اور جامع ہے - اسلوب کی اس سادگی کیلئے جتنی ہوشیاری و پرکاری درکار ہوتی ہے - وہ آغا صاحب جیسے کہنہ مشق صاحب طرز ادیب کا حصہ ہے - یہاں الفاظ پاؤں کی زنجیروں کی طرح آواز دیتے اور بلند حوصلہ انسانوں کی سانسوں کی طرح چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں -

اسالیب شورش کی اس آویزش و ندرت کے باوجود ان کے تمام اسالیب میں جن عناصر کی مشترکہ آمیزش نظر آتی ہے وہ ہے رجائی مقصدیت پامردی و بے خوفی - آغا صاحب کی صحافتی تحریریں اور نظمیں جتنی ارتجالاً ہوتی ہیں - نثری تصنیفات اتنی ہی اہتماماً معرض تحریر میں آتی ہیں - یہی وجہ ہے کہ ان کے جملوں کے ایجاز میں بلاغتوں کا اعجاز موجود ہے - آغا صاحب کی نگارشات نے اپنے قارئین میں ایک مستقل شعور پیدا کیا ہے کہ خوبصورت پیرائے میں حسین و موزوں الفاظ چن کر جرأت و بیباکی سے بات کہنے اور لکھنے کا فن شکوہ خسروی سے زیادہ مستی و سرخوشی پیدا کرتا ہے -

صحافت

اردو صحافت کی تاریخ میں جن مسلمان صحافیوں کے نام ہمیشہ احترام سے لئے جاتے رہیں گے - ان میں ایک نمایاں نام شورش کاشمیری کا ہے - شورش نے صحافت کو تجارت کے طور پر نہیں - پیشہ کے طور پر اختیار کیا اور پھر زندگی بھر اُس کے تقدس کو برقرار رکھا - صحافت محض اخبار نویسی کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے الفاظ میں صحافت نام ہے روز مرہ کی سچائی کا صحافت کی معاشرتی اصلاح و تعمیر اور اجتماعی تربیت کے نصب العین کے حوالے سے اس سے بہتر اور جامع تعریف نہیں ہو سکتی - اس تعریف میں خود تعریف کرنے والے کی صحافتی زندگی کا تعارف چھپا ہوا ہے - انہوں نے صحافت میں صداقت اور دیانت کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیا - وہ محیطِ صحافت کی تند و تیز موجوں میں چٹان بن کر قائم رہے - ان کا صحافتی ماٹو تھا اپنے لہو سے

لکھنا سیکھو اور چٹان کی صحافتی تاریخ شاہد ہے کہ وہ زندگی بھر اپنے قلم کو اپنے لہو میں ڈبو کر لکھتے رہے ۔ ماحول کی آستینوں میں چھپے ہوئے بت انہیں نظر آتے تو اپنی اذان لا الہ الا اللہ کو اور بلند کر دیتے ۔ انہوں نے صحافت میں قلم کی عصمت کے تحفظ کے تصور کا نعرہ دیا ۔ اور صحافی کے قلم کو ہمیشہ ناقابل بیع و شرار جنس سمجھا ۔ انہیں ناز تھا کہ ان کی صحافت کی اتنی طویل عمر میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے ان کے قلم کا ایک شوشہ بھی خرید کیا ہو ۔ قیام پاکستان کے بعد اردو صحافت میں شورش صاحب واحد صحافی تھے جنہیں "ایک فردی صحافت" کا پاسبان کہا جا سکتا ہے ۔ چٹان کے اجرا کے بعد انہوں نے شب و روز محنت کر کے اسے اردو زبان کا ایک موقر جریدہ بنا دیا وہ تنہا شخص ادارئیے ۔ شذرے ۔ وقائع ، مضامین نظمیں اور غزلیں لکھتے اور یہ سب مواد اتنا وافر ہوتا کہ قارئین آئندہ شمارے کے آنے تک منتظر رہتے اُن کا نکتہ رس دماغ اور تیز رفتار قلم اتنی حکمت اور عجلت کے ساتھ سیاسی تجزیئے اور معاشرتی جائزے لیتا کہ معاصر قلم کاروں کیلئے حیرت کا سماں پیدا کر دیتا ۔ اُن کے سیاسی و سماجی معاملات پر لکھے ہوئے اداریوں نظموں اور مقالات خصوصی کی مذہبی و دینی حلقوں میں اتنی اہمیت ہوتی کہ خاص مکتبِ فکر کے علما و خطبا کی گفتگو و تقاریر میں ان کی بازگشت سنائی دیتی ۔

وہ صحافت کی نگارشات میں ادب کی زبان اور دین و سیاست کی فکر شامل کر کے اسے پائیدار اور جاندار بنا دیتے اور مسائل حاضرہ کا تجزیہ کرتے ہوئے نامور سیاسی و سماجی افراد کے اپنی نگاہ مردم شناس میں پسندیدہ / ناپسندیدہ ہونے کا اظہار بیساختہ طرفہ القابات میں کر جاتے ۔ اس سلسلے میں ان کے لاشعوری محرکات اتنے شدید ہوتے کہ متعلقہ شخص ان کے محتسب قلم پر خود بخود ایک استعارہ بن کر آجاتا ۔ صحافت میں اپنے غصے ۔ ناراضگی اور ناپسندیدگی کا رعشہ انداز مگر پارلیمانی الفاظ میں اظہار کرنے کا فن اول و آخر انہیں کے پاس رہا ۔ وہ اپنی بات لکھتے وقت خوف الٰہی کے سوا اور کسی شخصیت اور مرتبہ کی پروا نہ کرتے اور اپنے ضمیر کے مطابق جس چیز کو صحیح سمجھتے اس کا برملا اظہار کر دیتے ۔ وہ لکھتے وقت نہ حکمرانوں سے مرعوب ہوئے اور نہ اُن کے حاشیہ نشینوں اور غاشیہ برداروں سے یہی وجہ ہے کہ وزیر و کبیر ان کے قلم کے اسیر ہو کر رہ جاتے ملکی سیاست پر یک فردی صحافت میں ان کے جریدہ چٹان سے زیادہ کوئی اور ہفت روزہ اثر انداز نہیں ہوا ۔ اُن کی زندگی تک چٹان ایک ایسا ہفت روزہ تھا کہ قارئین جس کے آئندہ اداریئے اور نظم کیلئے ہفتہ بھر منتظر رہتے اور پھر ان کے اداریئے کے کسی آتش بار جملے کی زد میں آئے ہوئے کسی سوختہ سامان بالا دست کی ناگفتہ بہ حالت سے

لطف اندوز ہوتے۔ ان کے جسور و غیور قلم کی خوبی یہ تھی کہ اس نے ہمیشہ زندہ و مقتدر سرکشوں کی دستارِ فضیلت کے پیچ کھولے ہیں لیکن کبھی کسی مرحوم و معزول شخص کے خلاف کچھ نہیں لکھا بلکہ ہمیشہ دعائے مغفرت لکھی ہے۔

آغا صاحب کی اس حق نویسی اور آتش نویسی کی فنِ صحافت میں کیا حیثیت ہے۔ کیا اسے صحافت میں جذبات کی آمیزش سے تعبیر کریں گے یا صحافی کی جانبداری سے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اپنے دینی و تہذیبی انداز کو پیشِ نظر رکھ کر حالات و واقعات کا تجزیہ کرنا جانبداری اور تعصب میں شامل ہے تو پھر کرسی انصاف پر بیٹھا ہوا وہ شخص سب سے زیادہ جانبدار ہوتا ہے۔ جو واقعات پر فیصلہ لکھتے وقت اپنے ملک کے ضابطہ قانون کو مدنظر رکھتا ہے۔ وقس علیٰ ھذا اس جانبداری اور قومی جذبات کی موجودگی کے بغیر کوئی صحافی نہ صحافت سے انصاف کرسکتا ہے اور نہ قارئین سے۔ پھر اداریے کی نوعیت خبر سے مختلف ہوتی ہے۔ اداریہ مو قلم سے بنی تصویر ہے اور خبر کیمرے کی تصویر۔ اگرچہ پاکباز کیمرہ میں برہنہ تصویر نہیں اتارتے اور بڑے مصور تصویر بناتے وقت اپنے نظریہ فن کو نظر انداز نہیں کرتے۔

آغا صاحب نے اپنی صحافتی زندگی میں کبھی اپنے نظریہ صحافت کو فراموش نہیں کیا۔ وہ قلم کی عصمت کو عصمت نسواں کی طرح محترم و مقدس گردانتے اور بے باکانہ اداریے اور بے لاگ تبصرے صرف ملک و ملت کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر لکھتے۔ اُن کی تحریریں حالاتِ حاضرہ کی منہ بولتی تصویریں ہوتیں۔ انہوں نے اپنے جریدے میں تصویروں کا بت کدہ سجا کر اسے نظر بازِ قارئین میں مقبول بنانے کی کبھی سعی نہ کی۔ انہوں نے حسینوں کی تصویروں اور کمینوں کی تحریروں سے اپنے مجلہ کو ہمیشہ پاک رکھا۔ اس لئے کہ صحافت آنکھوں کی نہیں دماغ کی چیز ہے۔ خبر میں نظر شامل نہ ہو تو اذانِ سحر بھی دعوتِ صلوٰۃ کی بجائے ایک آواز بن کر رہ جاتی ہے۔ واقعات عالم کی قومی فکر و نظر کے حوالے سے خبر نہ رکھی جائے تو وہ مظاہر میں تبدیلی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے اور اگر انہیں قومی نفع و نقصان کے نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو ایک دوربین مدیر کا قلم آنے والے حالات کی نشان دہی کرسکتا ہے۔ اُس کا آئینہ ادراک اپنے

قارئین کو اُن واقعات کا عکس دکھا دیتا ہے - جو مستقبل کی کوکھ میں پل رہے ہوتے ہیں -
اور ان کی اجتماعی زندگی میں اثر انداز ہو سکتے ہیں - موجودہ حالات میں اگر چٹان کے پرانے
اداریوں پر نگاہ ڈالی جائے تو آغا صاحب کی پیش بینی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا -
پیش بینی کی صلاحیت کی نشوونما وسعت مطالعہ عمیق مشاہدے - دردمندانہ تجزیے اور
قومی جذبے کے فروغ کے بغیر نہیں ہوتی اور یہی وہ صلاحیت ہے جو کسی مدیر کو قومی رہنما
بنا دیتی اور اس کی تحریر قارئین کے قلوب واذہان کے لئے زنجیر کا کام کرتی اور انہیں اپنے
حلقوں میں لے لیتی ہے - اُردو صحافت کی تاریخ میں ایسے مدیر ہمیشہ اُس وقت پیدا
ہوئے جب قوم کو صحیح معنوں میں ان کی ضرورت لاحق ہوتی - مستقبل کے دامن میں
نہ جانے کتنے لوگوں کے لالا پوشیدہ ہیں لیکن ہم ماضی کے ان گنجہائے گراں مایہ کو فراموش
نہیں کر سکیں گے - جن کے نام مولانا محمد علی جوہر - ظفر علی خان اور آغا شورش کاشمیری
ہیں - ظفر علی خان کے بعد شورش کاشمیری نے صحافت کو ادب کی وہ زبان عطا کی
جو ان کے بعد کسی اور کے حصے میں نہیں آئی -

ضمیمہ

سوشلزم اور اسلام

اب اس کا فیصلہ ضرور ہو جانا چاہئے

سوشلزم اور اسلام کے موضوع پر پہلے اس بحث میں کئی دفعہ [illegible] الفاظ [illegible] استعمال
[illegible] سوشلزم ہی ہر [illegible] ذہنی تکرار اور ملک میں سیاسی انتشار
[illegible] کا خاتمہ [illegible] ملک میں [illegible]
[illegible] فضا پیدا نہ ہو [illegible] ورنہ ہم ملک میں [illegible] کا ٹھیکہ [illegible]
کی [illegible] اس وقت [illegible] کی [illegible]
کا [illegible] ہے کہ [illegible] کی [illegible]
مسلمانوں کی [illegible] حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں
ہم ایک [illegible] حقیقت [illegible]
کہ [illegible] اور [illegible] کا سبب [illegible]
کہ [illegible] کے [illegible] ہیں جنکی [illegible]
[illegible] کے [illegible] ہذا [illegible] ہوئے ہیں
سرمایہ داری اور جاگیرداری کے [illegible] کے وقت [illegible]
[illegible] اور [illegible] ایک بڑا پیچیدہ سوال ہے اگر ہم اسلام کو
اسلام کہاں ہے؟ یہ ایک [illegible] کی [illegible] ہوتی
[illegible] ہوتے اور [illegible] ہوتے اور
کا [illegible] نہ ہوتے [illegible] حالات ہوتے
[illegible] ہم [illegible] نہ ہوتا [illegible]
[illegible] اپنے [illegible]
[illegible] ہوئے [illegible] اپنے [illegible]
کی [illegible] اسلام کو [illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] کی [illegible] اسلام [illegible]
[illegible] کے [illegible]
[illegible] کی [illegible] حالات
[illegible] کے تحت [illegible] تقاضیات
[illegible] تقاضیات کے تحت [illegible]
سے تحت [illegible] اسلام [illegible]

پسماندگی کے دور کے بعد قوموں کی نشاۃ [illegible] شاہ شتر ہیں لیکن ایک حد تک
[illegible] یورپی افکار کے نتیجہ ہیں [illegible] انکی سیاسی ومعاشی اور علمی و تہذیبی
تحریکوں [illegible] سے [illegible] ہے تو اسکے اسباب ہیں:

پہلا سبب: یورپ کا مادی غلبہ ہے [illegible] جب حملہ قوموں یا
قوموں پر [illegible] [illegible] اور انکی سیاسی اقتدار اور
[illegible] اور [illegible] ایک طویل مدت حاصل ہو گئی تو ان
قوموں اور [illegible] قوموں کا [illegible] مرعوب ومتاثر [illegible] اور مغلوب ومحکوم
[illegible] ان یورپی اقوام نے اپنے مقبوضہ ممالک [illegible]
[illegible] اپنے [illegible] کی چھاپ [illegible] ان کے معاشرہ کو جب تعلیمی ساخت
[illegible]

ان محکوم قوموں نے [illegible] اپنے ملک وقوم [illegible] کے بعد
[illegible] سے آزادی حاصل کی تو [illegible] سیاسی [illegible] اور [illegible] کی
[illegible] ایک آزادی کے [illegible] ان قوموں اور
محکوم قوموں کی ذہنی [illegible] قائم رہی اور [illegible] آزادی
کے [illegible] جو یورپی افکار
اور یورپی تعلیم میں ڈھلے ہوئے ہیں

دوسرا سبب: ان مقبوضات کے [illegible] قوم [illegible] جدوجہد
کا [illegible] ان کا فکری و ذہنی [illegible] شاہ شتر
یورپی تھا مذہب بیزاری [illegible] مذہب کا [illegible] یورپ
[illegible] اور [illegible]
[illegible] کے سبب سے [illegible] ایشیا اور افریقہ
کے مقبوضات [illegible] یورپی [illegible] اور یورپی تعلیمات کے
[illegible] اور [illegible] مختلف [illegible]
کی [illegible] ہو گئیں

تیسرا سبب: [illegible] اور [illegible]
یورپی ملکوں کی سیاسی آزادیاں تہذیبی آرائش
اور علمی [illegible] ہیں جو معاصر [illegible]
[illegible] ہیں

حضور کی حیات میں بھی قوم تھی) اور انکے بعد بھی سوسائٹی پر [illegible]
عمل ہوتا رہا۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے جب یہ پوچھا گیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیسے تھے تو آپ نے فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ جو کچھ قرآن میں ہے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق تھے ... یعنی آپ کی ساری زندگی قرآن کی

عملی تفسیر تھی حضور کے [illegible] اور روز [illegible] کلام اللہ کی شرح تھی۔ چنانچہ اسی کلام کو آخر [illegible] کہا جاتا ہے۔ ایک قرآن وہ ہے جو مصحف کی صورت میں ہے، اور ایک قرآن وہ تھا جو جسم و جان کی صورت میں مدینہ میں چلتا پھرتا نظر آتا تھا، اور وہ تھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہی وجہ ہے کہ حضور نے اپنے کردار و عمل سے آیات قرآنی کی شرح کی اور جو کچھ کلام ربانی میں تھا اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالا۔ قرآن میں سرمایہ داری کا جواز نہیں تھا اور [illegible] کو نہیں [illegible] تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کی تائید کی اور انسان کا استحصال کا خاتمہ ہوتا [illegible] قرآن کی شرح [illegible] نظر آتی ہے۔

وہ لوگ جو قرآن سے محنت کش سرمایہ کا جواز پیدا کرتے اور انفرادی ملکیت [illegible] کو [illegible] ملکیت کی شرح و تفسیر انسان کو انسان کا رازق بنا دیتے [illegible] قرآن و سیرت سے نابلد ہیں یا قرآن و سنت کو دو مختلف خانوں میں دیکھتے ہیں۔ ایسا کرنے سے [illegible] مذہب سے بیگانہ کیا [illegible] اسلام کا [illegible] رسول کو وہ [illegible] جو [illegible] آئندہ استحصال کے رائج [illegible] کرتے ہیں۔

فیضانِ اقبال (زیرِ نظر کتاب ۳) حضرت علامہ کے [illegible] ملفوظات و کلمات کا
مجموعہ ہے۔ یہ ایک نثری بیاض ہے جو علامہ اقبال نے [illegible] نثر میں
[illegible] فلسفہ، ملفوظات، [illegible]، [illegible] [illegible]
کی فہرست [illegible] ہے۔ یہ [illegible] [illegible]
[illegible] ۱۹۳۳ [illegible] کلمات و اقوال کو جمع کر [illegible] یہ مجموعہ [illegible]
[illegible] ۱۹۲۵ [illegible]
[illegible] ان ملفوظات کا ایک [illegible] شائع ہوا تھا۔
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] نثر میں [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
ایک [illegible] [illegible]
میں [illegible] ان کلمات کو [illegible]
[illegible] طبیعت میں [illegible]
[illegible] [illegible] طبیعت [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] [illegible]
[illegible] فیضانِ اقبال [illegible]
[illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] اقبال [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

Respected Sir,

ہندو پاک تعلقات کی ایک کہانی ہے کہ گورنمنٹ

سے سرکاری شام کے ایک عزیز نے ٹیلیفون کر

کے علامہ کی وفات کی اور انہوں نے کیسی شفقت سے سنا

ہے۔ آپ تو علمی اور عزیز دونوں کا احساس ہے

سکتی میں آپکی عالمگیر ذہانت کو اپنے کبھی کبھار بھی ملنے

کرنے کا حوصلہ کیا تھا کہ آپ ہر معاملہ میں ایک بہت بڑے

درجہ کیطرح ہیں۔ جب میں وہ عزیز بھی فیضیاب ہے۔ میں

اور میں بھی اپنا عزیز کو آپ کے کئی دن قریب پاتا رہا

ہوں۔

میں نے آپکو پہلے بھی لکھا تھا کہ میں پہلے انگریزی میں

رنگ نگری میں ہوتا تھا ابھی سپیشلسٹ ترجمہ [illegible] پھر

پہلے [illegible] پڑھ رہا ہوں۔

آپ زبان میں کچھ باتیں ہیں جو طالبات کے

مطالعہ سے کچھ زیادہ کا جواز ہیں آپ کے علم و تجربہ

کو جو کی سزا [illegible] بڑا ہے کہ اپنی سوچ

کو اپنے سامنے پیش کرتا ہوں کہ شاید ہم سے بہتر

طالبوں سے ملتی ہے

یارانِ وطن

سرخیاں / [illegible]

زنداں [illegible] ایسے [illegible] آزادی [illegible] جیل میں قید ہیں [illegible]

نوٹ: (اختر شیرانی مرحوم کی موجودہ شعار مکرر زندانِ وطن [illegible] اشعار ذیل قلم کی نذر صفحہ کی نذر مستقل کر دیئے ہیں)

ہر کوچہ میں ہے درِ دشمن + سنتے ہیں کہ ہیں ارباب چمن
زنجیر و سلاسل دار و رسن؟ + کس حال میں ہو یارانِ وطن

گونجی ہے گلستاں زنجیروں سے + [illegible] کی فضا بھی تکبیروں سے
چھیدا ہے قلم شمشیروں سے + کس حال میں ہو یارانِ وطن

ہر موج غلط شداد غلط + صیاد غلط جلاد غلط
تعزیر غلط بیداد غلط + کس حال میں ہو یارانِ وطن

یادش کی [illegible] چھوڑ آ گئے + یارانِ سرپل چھوڑ آ گئے
جی چھوڑ آ گئے دل توڑ آ گئے + کس حال میں ہو

تعزیر کا [illegible] وقت غلط + [illegible] کی آب غلط
[illegible] غلط [illegible] غلط + کس حال میں ہو

رب جانے فضا کا زور ہی + رب جانے دعا کا [illegible]
رب جانے [illegible] + کس حال میں

— ۱۱ — اشاعت [illegible]


یکم
جنوری
۱۹۴۹

عبدالمجید سالک

آغا شورش کے نام ایک خط

حضرت شورش! تسلیم۔ آپ نے اپنے ہفت روزہ کا نام "چٹان" خوب چن لیا۔ گویا شعر میں رومان، ہمالہ اور ہفتہ وار "جنگ" [illegible] بنا جاتے۔ یہ نام آزادی پسندی کے گر تے ہیں جو ہم روایت پسندوں کی سمجھ میں بھی آتے نہ تھے۔

شورش تخلص کی رعایت سے اس ہفت روزہ کا نام "طوفان" یا "آندھی" ہونا چاہیے تھا۔ "چٹان" میں جو خاموشی، وقار اور استحکام ہے۔ وہ شورش کی بیتابی اور طوفان آفرینی سے کچھ میل نہیں کھاتا، لیکن تمام مناسبات کی رعایت بھی قدامت پسندی کی ایک ترکیب ہے۔ ترقی پسندی کا تقاضا تو یہ ہے کہ کوئی ایک بات کسی دوسری بات سے جوڑ نہ کھائے۔

خیر اب کیا ہو سکتا ہے۔ تیر کمان سے نکل چکا۔ اخبار کا نام رکھا جا چکا۔ اشتہارات بعنوان "چٹان" ہو چکے۔ یہاں تک کہ بنیاد پر پہلا شمارہ بھی نکل چکا۔ جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اب دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شورش کو سنگینی اور چٹان کی استحکام عطا فرمائے۔

ممکن میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ حالات موجودہ [illegible] ادب و انشا [illegible] مسلم ہے بے پرواہ ادب کے خلاف [illegible] واقع ہوئے ہیں کیا کسی زندہ اور پائندہ ادب کے نشوونما کی کوئی صورت بھی ہے؟ آپ نے اپنے اشتہار میں "چٹان" کی جو خصوصیات شمار کرائی ہیں ان کو پڑھ کر تو مجھے آپ کے اور "چٹان" کے مستقبل کے متعلق اندیشہ پیدا ہو گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر ہے اور "چٹان" کو زیادہ مدت تک مرغوب نہ بنے گی جہالت بالکل ہی دی جائے گی۔ بھلا جس ملک میں "ادبِ لطیف"، "نقوش" اور "سویرا" جیسے خالص ادبی رسالوں کو بھی چھ مہینے کی پھانسی "دے دی جائے" اس میں شورش جیسے بدنام ترقی پسند سیاسی کارکن کے اخبار کو جس کے نام میں بھی ایک "چٹان" مضمر ہے کب تک زندہ رہنے دیا جائے گا۔

آپ میری ان باتوں کو پڑھ کر دل میں بہت چیں بہ جبیں ہوں گے کہ اخبار کے پہلے نمبروں میں تو خیر مقدم کئے جاتے ہیں، سلامتی اور کامیابی کی دعائیں مانگی جاتی ہیں، بڑی بڑی امیدیں ظاہر کی جاتی ہیں لیکن سالک دیرینہ دوست ہونے کے باوجود ایسی بدشگونی کی باتیں زبانِ قلم سے نکال رہا ہے۔ یہ کہاں کی دوستی ہے کہ [illegible] دوست ناصح بنے [illegible] افسانہ بڑا دلکش ہے۔ جب تک ہو سکے اس کو تمام رکھنے کی ضرورت ہے۔ مرزا غالب میں مبارک نہ باشد! آپ شوق سے "چٹان" کو ایک عزت پورا کو ہمالیہ جاری کیجئے لیکن اس امر حقیقت کو کبھی نہ بھولئے کہ یہ مجرم کا فقدان ہے۔ اسی قدر ہے چٹانوں اور پہاڑوں کا اتحاد کا استحکام بھی نہ کروگے حالانکہ یہ کی حقیقت اختیار کر چکا ہے۔ جس کی بہت کر کے روز اول ہی سے "جس" [illegible] عالیا طور عمل کیا جائے۔ بیکار سیاسی گیت کا نام ہم پہلے ہی سے اخباروں اور رسالوں کو سپرد شہادت اور اس کی بنیاد رکھا ہے۔ اور اب تو اس ہاتھ کی طاقت میں سامنے باتوں کی مزید کوششوں کی وجہ سے بہت اضافہ ہو گیا ہے اور معاملہ جو پہلے سے ٹھیک اس کے دوست اخفا کر چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کر شرف ثمر کی

اور لے پڑنے لگیں۔

پچھلے دنوں ہمارے اخبار نویس بھائیوں کی ایک کانفرنس کراچی میں منعقد ہوئی جس میں بعض صوبوں کی حکومتوں کو اخبارات پر تشدد کی وجہ سے ڈانٹ ڈپٹ کی گئی اور اس کے ساتھ ہی اخبار نویسوں کو بھی توجہ دلائی گئی کہ وہ کوئی ایسی [illegible] نہ لکھیں جس سے پاکستان سٹیٹ کی بنیادوں کو نقصان پہنچنے [illegible] احتمال ہو۔ کاش ہمارے بھائی ایسی قابلِ [illegible] اعتراض باتوں کی چند مثالیں بھی بتا دیتے جن سے سٹیٹ کی بنیادیں ہل جانے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

میرا احساس تو یہ ہے کہ ہمارے حکمران گورنمنٹ اور سٹیٹ کے فرق کو نہیں سمجھتے [illegible] ہیں۔ مثلاً

"اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ پاکستان میں جمہوریت کے تقاضے پورے ہونے چاہئیں۔ اور یہ حکومت دستاویزی نہیں بلکہ جمہوری ہونی چاہیے تو سٹیٹ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔"

"اگر یہ کہا جائے کہ زمینوں اور کارخانوں کو قومی ملکیت بنا لیا جائے سرمائے کو توڑ دیا جائے اور مزدوروں اور کسانوں کو ابھارا جائے تو سٹیٹ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔"

"اگر مہاجرین کی سرکشی کو دبانے کے لئے ان پر گولی چلائی جائے۔ اور کوئی شخص اس کے خلاف ذرا شدت سے آواز بلند کرے تو اس کی آواز سے پاکستان سٹیٹ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔"

غرض سٹیٹ کو ان لوگوں نے [illegible] چھوئی موئی بنا رکھا ہے کہ ذرا کسی نے چھوا، اور یہ مرجھا گئی۔ حالانکہ [illegible] پاکستان سٹیٹ ایک چٹان ہے جس کو کوئی شورش متزلزل نہیں کر سکتی۔ البتہ اس کے کارکنوں کی غفلت، خود غرضی اور بد دیانتی سے اس کی بنیادوں کو نقصان پہنچنے کا احتمال ضرور ہے۔

یہ باتیں میں نے اس لئے لکھی ہیں کہ "چٹان" پہلے دن ہی سے تمام مصلحتوں کو مد نظر رکھے۔ انگریز کا زمانہ اور تھا۔ وہ غیر تھا، ہم اس کو گالیاں دے لیتے تھے۔ اس پر سخت سے سخت نکتہ چینی کرتے تھے۔ ہائیکورٹ میں اپیل کر کے ضمانتوں کے احکام منسوخ کرا لیتے تھے۔ اگر ایسی ہی کوئی آفت برپا ہو جاتی تھی۔ تو ایک اخبار بند کر کے دوسرا جاری کر دیا کرتے تھے۔ لیکن بھیا! اب اپنوں کی حکومت ہے نہ گالی دے سکتے ہیں۔ نہ [illegible] سکتے ہیں۔ نہ دلیل، نہ وکیل، نہ اپیل۔ اس لئے "چٹان" بن جائیے۔ یعنی خاموش، باوقار، متحمل، مدافع! "چٹان" کبھی کسی پر حملہ نہیں کرتی۔ شور نہیں مچاتی۔ چوٹیں کھاتی ہے۔ صدمے سہتی ہے۔ لیکن اپنی جگہ پر ڈٹی رہتی ہے یہی اس کی عظمت اور سربلندی کا [illegible] ہے!

عبدالمجید سالک

دفتر انقلاب لاہور
۵ دسمبر ۴۹ء

"چٹان"
(ندائے غیب)

(۱)

لایا ہے وہ انقلاب، شورش امروز
دنیائے صحافت پہ ہے جس کا احسان
دل شاد نہ کیوں ہوں اس کو پڑھنے والے
پڑھنے کو ملا ہے "خاص اخبار چٹان"

۱۹۴۹ء

(۲)

کاغذ کی یہ کشتیاں چلانے والو!
منجدھار میں ہیں نہنگ سر بر طوفان
ٹکرائے جو اس سے پھر نہ سنبھلو گے کبھی
اخبار یا ہے "مہیب مضبوط چٹان"

۱۳۶۸ھ

(۳)

بزمِ احباب پھر ہوئی روشن
پھر کھلی آج اہلِ دل کی زبان
شورش آباد خود پرستی ہیں
"حق پرستی کا ترجمان چٹان"

۱۹۴۹ء

(۴)

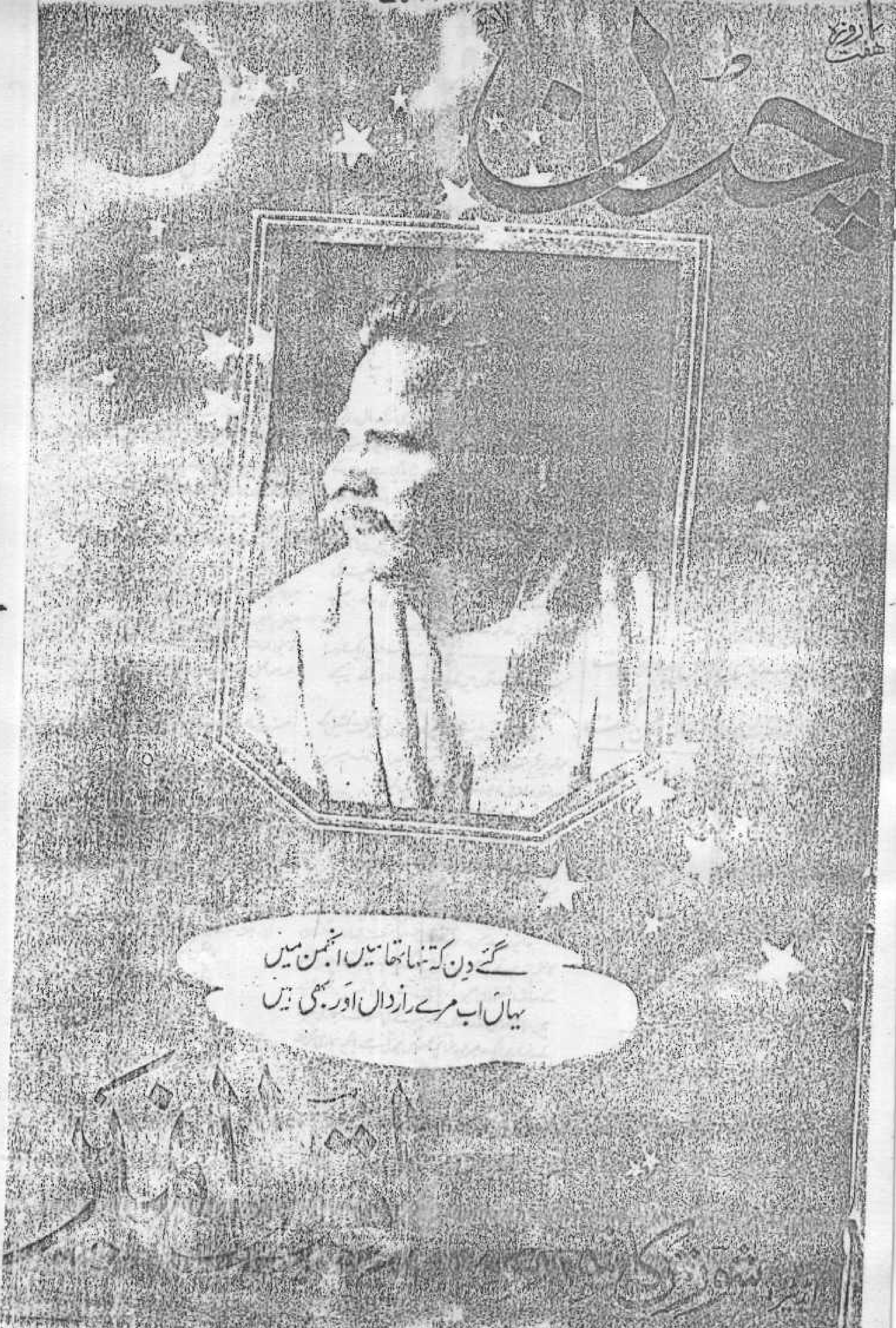
دعوتِ انقلابِ عالم ہے
چارۂ دردِ زیست کا سامان
یہی تاریخ ہے یہی تعریف
نکلا ہے "اردو ہفت روزہ چٹان"

۱۳۶۸ھ

(۵)

سخت بے باک بسکہ ہے شورش
روز اٹھاتا ہے اک نہ اک طوفان
اب نکالا ہے اک نیا اخبار
"نادر الوقت ہفت روزہ چٹان"

۱۹۴۹ء


ہفت روزہ
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

جنوری ۱۹۵۳
شمارہ نمبر ۱۰



اس کو نا قدری عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

چند جھلکیاں

بدل اشتراک

نہ	-	دس روپے
ماہی	-	چھ روپے
ماہی	-	تین روپے
پرچہ	-	چار آنے

قیمت چار آنے

ایک از مطبوعات چٹان

ایل نمبر ۵۳۸۰ | ٹیلیفون نمبر ۴۲۱۵

ہفت روزہ
اسٹیڈیشن
لاہور

چٹان

روزنامہ
ایڈیٹر
شورش کاشمیری

امرتسر چھپنے
محمد سرور
شیخ عبدالرحیم ملک ایڈووکیٹ
اسد الخیری
مطالبہ اقبال شیفتہ
شیخ عقیل
ابن الاقبال ملک
اور دوسرے

بدل اشتراک
پاکستان: سالانہ دس روپے، ششماہی پانچ روپے، فی پرچہ ۴ آنے
ہندوستان: سالانہ [illegible] روپے، ششماہی [illegible] روپے، فی پرچہ ۵ آنے

جلد ۶ | مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۹۵۳ء | شمارہ ۱۰

مناسب اقدام

بہرحال حکومت پاکستان نے عوام کا مطالبہ قبول کر لیا، اور دستوری سفارشات پر غور و خوض کے لئے مزید تین ہفتے کی مہلت دیدی گئی ہے۔

بنیادی حقوق کی دستاویز کے دو حصے ہیں، اول فرائض کا حصہ ہے۔ ثانیاً حقوق کا فرائض کو دو حصوں میں حکومت کے نقش و نگار کی توضیح کی گئی ہے، اور وہ لوگ جن سے ہیئت حاکمہ مرتب ہوتی ہے، ان کے اختیارات کا تعین کیا گیا ہے، دوسرے حصے میں حکومت کی ہیئت ترکیبی کا نقشہ دیا گیا ہے اور عوام کی نمائندگی کے تناسب کا تعین کیا گیا ہے، اس حصے پر اب تک نہ صرف اعتراض ہی بلکہ احتجاج بھی ہو چکا ہے۔

واضح امر یہ ہے کہ وفاق کا جو تصور اب تک دیا و شنید میں ہے، ہمارے دستور سے اس کی نفی ہوتی ہے، ایوان زیریں اور ایوان بالا کو نمائندگی کے اعتبار سے یکساں درجہ دینا نہ صرف مہمل شے ہے بلکہ ان تصورات ہی کے خلاف ہے جن سے ایک ملت کا وجود استوار ہوتا اور پاکستان کی وحدت پختہ ہوتی ہے۔

کسی ملک کا دستور ہی اس کی اصل اساس ہوتا ہے اس کا تعین جماعتوں کی ایجی ٹیشنوں یا تنظیموں کے سیاسی مطمح ہائے نظر سے نہیں بلکہ پوری قوم اور پورے ملک کے مفاد سے ہوتا ہے ہم اس رجحان کو خطرناک سمجھتے ہیں کہ ارکان دستور ساز کو کسی سیاسی جماعت کے مخصوص مقاصد کا پابند کیا جائے، ہر ممبر دستور کے معاملے میں جماعت کے نہیں قوم کے سامنے جوابدہ ہے اور پھر قائد اعظم بھی یہ کہہ چکے ہیں کہ دستور ساز اسمبلی میں کوئی پارٹی نہیں ہر ممبر کو اپنے ضمیر کی آواز پر چلنا چاہیئے، اور اس معاملے میں وہ کاملاً خود مختار ہے۔

امید ہے تین ہفتوں کی اس مہلت میں ہر شخص دستور کے حسن و قبح پر سوچ لے گا۔ اس سے ملک کا مستقبل اور قوم کی تقدیر وابستہ ہے، اور اسی پر اس مملکت خداداد کے قیام و ثبات کا انحصار ہے۔

مرحلہ آزمائش

مصر کے علمائے دستوری سفارشات کے اسلامی حصہ پر صاد بھی کر دیا ہے۔ گو ہمارے ہاں کے علمائے ابھی خاموش ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ان مسند نشینان شریعت کی نالہ کیا ہوتی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ علماء کے لئے دستوری سفارشات کا مرحلہ آزمائش ایک عجیب و غریب مرحلہ ہے،

مغز کی بات تو خود علماء ہی پرکھ سکتے ہیں لیکن بظاہر اس میں بڑی کشش ہے، البتہ علما کو یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ ان کی ذمہ داریاں دوھری ہیں وہ صرف عوام ہی کے سامنے جوابدہ نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے سامنے بھی جوابدہ ہیں اگر فی الحقیقت وہ ان کے قبول سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی میزان کے پلڑوں کا توازن قائم دیکھ سکتے ہیں تو پھر انہیں سیاسی مصلحتوں کی دلدل کا انتظار کئے بغیر صداقت کا ثبوت دینا چاہئے اور اگر وہ یہ محسوس کرتے ہوں کہ اس میں کوئی قباحت ہے تو پھر دو ٹوک بات کہنے میں کوئی عیب محسوس نہ کرنا چاہئے، ان کی ایک چھوٹی سی غلطی یا ہچکچاہٹ نہ صرف ملک و ملت کے لئے ہی مضرت رساں نہ ہوگی بلکہ اسطرح خود اسلام کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے،

اب رہا علمائے مصر کی توثیق یا تحسین کا قصہ تو ہم نہایت ادب سے ان کی خدمت میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنرل نجیب سے پہلے ان کا زور بیان اس پر صرف ہوتا رہا، کہ فاروق سادات میں سے ہیں اور ان کا تازہ فتویٰ یہ صادر ہوا ہے کہ فاروق چونکہ اپنی بچیوں کی تربیت کے معاملہ میں ناجائز تھے کہ ان سے ... لینا ہی شرعاً درست ہے۔ فرمایئے ان کو ایسے علماء کی دنیا کا کیا مطمئن کر سکتا ہے؟

سلہری کی گرفتاری

مسٹر زیڈ اے سلہری ایڈیٹر ٹائمز کی گرفتاری پر بھی اخبارات نے احتجاج کیا ہے اس احتجاج میں عادل بھی اپنے بھائیوں کا ہم نوا ہے۔

جہاں تک ہمارا خیال ہے پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا کیس ہے کہ خبر نویسی یا شہری قوانین پر ان کی خبر کے باعث ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ الف کے تحت مقدمہ چلایا گیا ہو ورنہ یہ کہ قابل اعتراض مضامین نظم و نثر کی پاداش میں اخبارات ضبط کرتے گئے، ضمانتیں طلب کی گئیں، پریس قرق کئے گئے لیکن اس قسم کی مثال شاذ ہی مل سکتی ہے کہ ارباب اختیار نے کسی مضمون کو قابل اعتراض سمجھا اور ایڈیٹر کو گرفتار کر کے ۱۲۴ الف میں جیل خانے بھیج دیا!

قیام پاکستان کے بعد تو ہماری دانست میں کسی پاکستانی شہری پر یہ جانگداز دفعہ کسی اخبار کا مالک ہو مدیر ہو اور پھر زیڈ اے سلہری جیسا معتمد جو تحریک پاکستان کا مخلص نقیب کہا جا سکتا ہو، یا ان سے کوئی پاکستان کے خلاف بغاوت کا قصد بھی کر سکتا ہے، ایک عجیب سا اقدام ہے، ہم کیا ہماری رائے میں کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی،

ہم حکومت پاکستان کو مشورہ دیں گے کہ وہ مسٹر سلہری کی گرفتاری کے معاملہ میں اپنے اقدام پر نظرثانی کرے،

آج لوگوں کے دل مٹھی میں لینے کی ضرورت ہے۔

۱۲۴ الف ایسی دفعات انگریزی عہد زوال کی تخلیق ہیں، آج کوئی بدقسمت سے بدقسمت انسان بھی یہ جسارت نہیں کر سکتا کہ وہ ملک خداداد سے غداری کرے یا اس کے امن و ثبات کو بگاڑنے کے لئے قول و فعل سے ایسی حرکت کرے، جس کا بدیہی نتیجہ مملکت کی تباہی پر ختم ہو۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ گردن زدنی ہے۔

اس کا علاج ۱۲۴ الف نہیں تعزیر دار ہے ۔

یکے از مطبوعات چٹان

ہفت روزہ

چٹان

لاہور

ایڈیٹر شورش کاشمیری

جلد ۱ یکم جون ۱۹۵۳ء شمارہ ۱۶۵

بڑی بڑی زمینداریاں

پچھلے دنوں، ملک فیروز خاں نون، کا ایک بیان اخبارات میں چھپا تھا، جس کا مفہوم یہ تھا کہ

> ملک صاحب دولتانہ وزارت کی زرعی اصلاحات پر خط تنسیخ کھینچنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اور انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی تجاویز بھی مرتب کر لی ہیں۔

آج اخبارات میں یہ خبر نظر سے گذری ہے کہ،

> "ملک صاحب نے ان زمینداروں کو، جو مشرقی پنجاب میں اپنی زمینیں چھوڑ کر آئے ہیں، اتنی ہی زمینیں دینے کا فیصلہ کر لیا ہے"

ممکن ہے یہ خبر بعض لوگوں کے نزدیک بڑی ہی خوش آئند ہو، لیکن عام خیال یہ ہے کہ، ملک صاحب ۱۹۵۳ء میں بھی ۱۹۱۹ء کی باتیں کر رہے ہیں، حالانکہ اب زمانہ کہیں سے کہیں آگیا ہے۔ اور زمیندارانہ نظام کے بے فائدہ ہونے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو ہے کہ بعض ملکوں میں ان کی سیاسی پس ماندگی کے باعث جاگیرداری نظام بدستور چل رہا ہے، لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے کوئی ملک بھی زمینداریوں کو بحال نہیں کر رہا، اور کہیں بھی ان کی بحالی کے لیے کوئی ذہنی یا سیاسی فضا نہیں ہے۔

۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں، ہمارے صوبے کے اخباروں میں سرکاری رپورٹوں کی بنا پر متروکہ زمین کے اعداد و شمار پر جو تبصرے چھپتے رہے ہیں، ان میں سارا زور اس پر صرف ہوتا رہا ہے کہ، جو متروکہ زمین مغربی پنجاب کے حصے میں آئی ہے، وہ اس متروکہ زمین سے زیادہ ہے جو مشرقی پنجاب میں رہ گئی ہے، اور اگر یہی تناسب زمین بانٹ دی جاتی تو، پھر بھی متروکہ زمین کا ایک معتدبہ بچ رہتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں، چونکہ مہاجروں کی بے ترتیب آمد و رفت اور بعض دوسری ضروریات کے نقصان کی وجہ سے ہر مسئلہ بحران میں تھا، اس لیے وقت سے حصر نہ کئے، اور مسئلہ جوں کا توں رہا۔ ان حالات میں اگر صرف اسی پہلو کو ملحوظ رکھا جائے، اور جب تک [illegible]

زمینداری نظام، کی حیثیت بجائے خود ہی [illegible] جاگیردار کو، محض "مہاجرت" کی سزا دینا، بظاہر نادرست ہوگا —— مگر جو خیالات ملک صاحب کے ہیں، اور، زرعی اصلاحات کے بارے میں جو کچھ ان کا ذہنی پس منظر پیش نظر ہے، اس کے وجوہ بڑے ہی عجیب و غریب ہیں، یعنی وہ حسبِ نظام جاگیرداری کے حامی ہیں، اور اسی نقطۂ نگاہ سے اس کی بحالی چاہتے ہیں۔

ایک اور مصیبت یہ ہے کہ، نظامِ جاگیرداری کے متعلق ہماری قومی قیادت کا کبھی کوئی نقطۂ نظری نہیں رہا —— جو بھی آیا اس نے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا، اور اسی کے مطابق باتیں کہہ دیں۔ خان ممدوٹ وزیراعظم تھے، تو ان کا اس بارے میں، جو نقطۂ نظر تھا، وہ زمینداروں کے حق میں تھا اور وہ شاید اب بھی اسی نقطۂ خیال کے مؤید ہیں۔

مشیروں کا دور آیا، تو وہ بھی، کوئی حتمی فیصلہ اور حتمی اقدام نہ کر سکے، وہ گئے تو ڈسٹر صاحب نے بحیثیت گورنر، زمینداروں کو درخور اعتنا نہ سمجھا، البتہ ان کے بعض جزوی اقدام زمینداریوں کی تنگی کے عشر عشیر کو کم کرنے میں خاصے ممد ثابت ہوئے۔ دولتانہ صاحب تشریف لائے، تو انھوں نے زرعی اصلاحات کو چھیڑا۔ مزارعین کے ہاتھ میں تھما دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ، نہ مزارعین خوش، نہ زمیندار خوش، لیکن دولتانہ صاحب دونوں طرف کے لیڈر بننا چاہتے تھے۔ اب، ملک فیروز خان نون تشریف لائے ہیں، تو انھوں نے الٹی زقند لگائی ہے، ان کے نزدیک زرعی اصلاحات اس لیے قابل استرداد نہیں کہ غیر منطقی ہیں، بلکہ اس لئے تنسیخ کی مستحق ہیں کہ، ان میں زمینداریوں کے لیے ناراضی کی روح موجود ہے۔

آج کے زمانہ میں زمینداریوں کی بحالی یا ان کی معاونت عوامی رہنمائی سے گریز کی ایک نامناسب کوشش ہے، اور کسی ملک کے عوام بڑی زمینداریوں کی موجودگی میں قومی آزادی کو محسوس نہیں کر سکتے اور نہ وہ ایک جمہوری ملک میں خوش حکومت کے تصور کو، اس بنیاد پر پسندیدہ خیال کرتے ہیں —— یہی ہماری گذارش ہے، اور یہی حاصل کلام۔ ان حالات میں ملک فیروز خاں نون، بڑی بڑی زمینداریوں پر خط تنسیخ کھینچ دیں تو وہ نہ صرف یہ کہ

> ممتاز ترین عوامی قائد کہلا سکتے ہیں بلکہ، وہ ایک ایسا کارنامہ سر انجام دیں گے جو ان کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

خواجہ ناظم الدین کیخلاف

خواجہ ناظم الدین، سہگل اس کی ڈولا، سمجھئے کہ وزارت کے ساتھ اب ان کی صدارت کا چہرہ بھی جتنا نظر آتا ہے، بلکہ تیغ تمرید کر چل چکا ہے!

ہم مسلم لیگ کی اس "خانہ جنگی" پر کچھ نہیں کہنا چاہتے، لیکن جن لوگوں نے، قبل ازیں خواجہ صاحب کے خلاف [illegible] ملامت پیش کی ہے [illegible] خواجہ صاحب کو، جیلوں تک چت کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ان مسلم لیگی کو نسلروں سے ہم یہ ضرور گذارش کرنا چاہتے ہیں کہ،

[illegible]

وہ ایک جدوجہد ہی کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ تم سیاسیات میں جو طرح دے رہے ہو، اس پر یاران سرپل نے اگر غزل در غزل اور سہ غزلہ کہنا شروع کیا تو، کوئی دستارِ صدارت بھی وقت کے اس میکدے میں محفوظ نہیں رہ سکتی ہے...

•

مدیرانِ جرائد کی انجمن

آج سے چند ہفتے پہلے، ملک میں، اخبار نویسوں کی دو انجمنیں تھیں، دونوں انجمنوں کے صحافی ارکان کے ناموں کی فہرست خاصی طویل ہے، اور اس روشن فہرست ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہر اخبار نویس بزعم خویش ایک انجمن ہے، یا چند افراد کی ٹولی۔ وقتاً فوقتاً کی اقتدا کے لیے محض قرار دادیں پاس کر لینے کا ایک گھٹھ بندھن ہے۔

تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ، کراچی کے مختلف الخیال اخبار نویسوں نے مل جل کر، تنظیمی اتحاد کے لیے ایک نئی انجمن بنائی ہے، لاہور ابھی چپ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر اخبار نویس کے بمقاصد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ درود و صلوٰۃ کے مستحق ہیں، اور جو مر گئے ہیں، ان میں سے بعض قم باذن اللہ کے منتظر اور بعض دعائے مغفرت کے مستحق ہیں ——

ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے دولتانہ وزارت کی موت کے بعد اخبارات کا ہر مسئلہ حل ہو گیا ہے، اور وہ تمام ہی دن کے لیے نکلتے ہیں۔

•

پاکستان بنام برطانیہ

مسٹر محمد علی وزیراعظم پاکستان کے اس بیان پر کہ برطانیہ سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کریں گے، آج کے اخباروں میں کراچی کے سیاسی حلقوں پر شائع ہوا ہے، جس میں مسرت کا اظہار کیا گیا ہے —— مسٹر محمد علی کے الفاظ ذیل گہرے غور و خوض کے مستحق ہیں:-

> "جب کشمیر کا تنازعہ شروع ہوا، تو برطانیہ ہمارا موقف سننے تک کا روادار نہ تھا —— انگریز پاکستانیوں سے معانقہ کرتے ہیں، ان کی خیر و عافیت چاہتے ہیں، لیکن پھر وہ بڑے ضرب شورش کی حالت میں دیتے ہیں کہ کہیں کوئی ہندوستانی دیکھ تو نہیں رہا ہے"

ہم —— ان الفاظ پر کوئی تبصرہ کرنا نہیں چاہتے —— صرف، اپنے ہی ملک کے کابرے [illegible] نے، بنا ہوا [illegible]

[illegible]

رفتِ گذشت

شورش کاشمیری

خوب جی بھر کے عزیزانِ چمن دیکھ چکے　نکہتِ سنبل و ریحاں کا پریشاں ہونا

شوخیٔ زہرہ جبیناں کا لہو میں ڈھلنا　سُرخیٔ خونِ شہیداں کا نُمایاں ہونا

سنگ ٹھنیوں کا رعونت سے اکڑ کے چلنا

بے نواؤں کا سراسیمہ و حیراں ہونا

وقت پڑتے پہ عماموں کا بھرم کُھل جانا　رہنماؤں کے خط و خال کا عریاں ہونا

برقِ "تثلیث" کا توحید کے سر پہ گرنا　خانہ ویرانیٔ اسلام کا ساماں ہونا

چار دیواریٔ زنداں سے صدائیں اٹھنا　کُفر کے ہاتھ میں ایماں کا گریباں ہونا

خاک کا منبر و محراب کے سر پہ اڑنا　خُون میں جبہ و دستار کا غلطاں ہونا

روز و شب "خنجرِ قاتل" کی ستائش لکھنا　روز و شب "عصمتِ خامہ" کا ہراساں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

(غالب)

ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۲۵ مئی ۱۹۵۳ء

1-6-53

چٹان لاہور

کتابیات

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۱۔	آزاد، ابوالکلام، مولانا	آزاد کی تقریریں (مرتب انور عارف)	مکتبہ ماحول کراچی
۲۔	"	تحریک آزادی (مرتب انور عارف)	"
۳۔	"	قولِ فیصل	ادبستان لاہور ۱۹۵۵ء
۴۔	"	ترجمان القرآن	مشتاق پبلشرز لاہور
۵۔	"	درسِ وفا	میری لائبریری لاہور
۶۔	"	تذکرہ	"
۷۔	"	غبارِ خاطر	آزاد ہند پبلشرز لاہور
۸۔	"	شہادت حسین	ادبستان لاہور ۱۹۵۷ء
۹۔	ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر	آج کا اردو ادب	فیروز سنز لمیٹڈ ۱۹۷۰ء
۱۰۔	ابو سلیمان شاہجہاں پوری	مکتوباتِ رئیس الاحرار (سیاسی)	ماڈرن پبلشرز کراچی ستمبر ۱۹۷۸ء
۱۱۔	احسان دانش	جہانِ دانش	القائم آرٹ پریس ۱۹۷۵ء
۱۲۔	احمد خان، سرسید	اسبابِ بغاوت ہند	اردو اکیڈمی سندھ
۱۳۔	اختر جعفری	بہترین مقالات جلد اول	مکتبہ اردو لاہور
۱۴۔	ادیب مرزا	تنقیدی مقالات حصہ نثر	لاہور اکیڈمی ۱۹۶۵ء
۱۵۔	"	۱۹۴۸ء کا بہترین ادب	مکتبہ اردو لاہور
۱۶۔	اشرف عطا	مولانا ظفر علی خاں	مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور
۱۷۔	افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر	کلیاتِ نظمِ حالی	مجلس ترقی ادب لاہور
۱۸۔	افضل حق چوہدری	تاریخ احرار	مکتبہ احرار لاہور
۱۹۔	"	میرا فسانہ جلد دوم	"

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۲۰۔	الطاف حسین حالی، مولانا	حیاتِ سعدی	مجلسِ ترقیٔ ادب لاہور
۲۱۔	" "	مقدمہ شعر و شاعری	
۲۲۔	انور عارف	شورش کاشمیری	مسعود پرنٹرز لاہور۔ جنوری ۱۹۷۳ء
۲۳۔	انیس قدوائی	اب جن کے دیکھنے کو	مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی
۲۴۔	ایڈورڈ ٹامسن	انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ (ترجمہ شیخ حسام الدین)	اردو اکیڈمی لاہور
۲۵۔	ایس۔ اے۔ آئر	آزاد ہند فوج کی کہانی (ترجمہ قمر رئیس)	نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا
۲۶۔	اے۔ سی۔ ایوننگ	فلسفہ کے بنیادی مسائل (ترجمہ میر ولی الدین)	"
۲۷۔	ایس۔ ایم۔ ناتر	اخبار نویسی کی مختصر ترین تاریخ	سنگِ میل پبلی کیشنز۔ جولائی ۱۹۸۰ء
۲۸۔	بیورلی نیکلس	ورڈکٹ آن انڈیا (فیصلہ ہندوستان) (ترجمہ عبد القدوس ہاشمی)	حیدر آباد دکن
۲۹۔	پرکاش دیو	سوانح مہاراجہ اشلوک	حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ ۱۹۱۷ء
۳۰۔	پریم ناتھ بزاز	شاعرِ انسانیت	"
۳۱۔	جانباز مرزا	کاروانِ احرار	مکتبہ تبصرہ لاہور۔ نومبر ۱۹۷۹ء
۳۲۔	جگر مراد آبادی	آتشِ گل	فیروز پرنٹنگ پریس لاہور۔
۳۳۔	جمال الدین افغانی	ردِ نیچریت	مکتبہ شعر و ادب لاہور
۳۴۔	جواہر لال نہرو، پنڈت	میری کہانی جلد دوم	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی انڈیا۔ جولائی ۱۹۵۰ء
۳۵۔	"	تلاشِ ہند	"
۳۶۔	"	جگ بیتی حصہ اول (ترجمہ محمود علی خاں جامعی)	"

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۳۷۔	حافظ لدھیانوی	ثنائے خواجہ (بار دوم)	فیصل آباد ۱۹۷۸ء
۳۸۔	حسن ریاض، سید	پاکستان ناگزیر تھا	کراچی یونیورسٹی کراچی
۳۹۔	خالد شبیر احمد	تاریخ محاسبۂ قادیانیت	قرطاس فیصل آباد۔ دسمبر ۱۹۸۱ء
۴۰۔	ڈیل کارنیگی	گفتگو اور تقریر کا فن	میری لائبریری لاہور ۱۹۶۰ء
۴۱۔	رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو	لال کشور پریس۔ لکھنؤ
۴۲۔	رشید احمد صدیقی	نقوش ہائے رنگ رنگ	مکتبہ کاروانِ ادب ملتان
۴۳۔	رئیس احمد جعفری، سید	قائد اعظم اور اُن کا عہد	مقبول اکیڈمی لاہور
۴۴۔	" "	سیرت محمد علی	کتاب منزل لاہور
۴۵۔	سرور، آل احمد	تنقیدی اشارے	سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۵۵ء
۴۶۔	سلام سندیلوی، ڈاکٹر	ادبی اشارے	نسیم بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۶۱ء
۴۷۔	شبلی نعمانی، مولانا	المامون	شیخ مبارک علی تاجران کتب لاہور ۱۹۲[illegible]
۴۸۔	" "	الفاروق	" "
۴۹۔	شمیم حنفی، ڈاکٹر	جدیدیت کی فلسفیانہ اساس	مکتبہ جامعہ نئی دہلی انڈیا
۵۰۔	شورش کاشمیری، آغا	گفتنی و ناگفتنی	اردو پریس لاہور۔ فروری ۱۹۵۶ء
۵۱۔	" "	الجہاد والجہاد	" " فروری ۱۹۶۶
۵۲۔	" "	چہ قلندرانہ گفتم	" " جنوری ۱۹۶۶ء
۵۳۔	" "	بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل	چٹان پرنٹنگ پریس لاہور۔ جولائی ۱۹۷۲
۵۴۔	" "	پسِ دیوارِ زنداں	" " فروری ۱۹۷۱
۵۵۔	" "	تمغۂ خدمت	" " اپریل ۱۹۷۲
۵۶۔	" "	موت سے واپسی	" " اگست ۱۹۷۲

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۵۷۔	شورش کاشمیری، آغا	سید عطاء اللہ شاہ بخاری	چٹان پرنٹنگ پریس لاہور مئی ۱۹۷۹ء
۵۸۔	" "	ظفر علی خان	اردو پریس لاہور ۱۹۵۸ء
۵۹۔	" "	قیدِ فرنگ	چٹان پریس لاہور۔ جون ۱۹۶۷
۶۰۔	" "	نور تن	" " "
۶۱۔	" "	حمید نظامی	" " فروری ۱۹۶۷ء
۶۲۔	" "	حسین شہید سہروردی	" " نومبر ۱۹۶۷ء
۶۳۔	" "	میاں افتخار الدین	" " فروری ۱۹۶۷ء
۶۴۔	" "	چہرے	مکتبہ ماحول کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء
۶۵۔	" "	تحریک ختم نبوت	چٹان پریس لاہور۔ جنوری ۱۹۸۰ء
۶۶۔	" "	اسلام کے غدار	ظفر علی خاں اکیڈمی لاہور
۶۷۔	" "	مرزائیل	چنیوٹ
۶۸۔	" "	عجمی اسرائیل	چٹان پریس لاہور
۶۹۔	" "	اقبال اور قادیانیت	" " اپریل ۱۹۷۴ء
۷۰۔	" "	اُس بازار میں	" "
۷۱۔	" "	دہلی چلو	اُردو اکیڈمی لاہور۔ ستمبر ۱۹۳۶ء
۷۲۔	" "	فن خطابت	چٹان پریس لاہور۔ اکتوبر ۱۹۸۲ء
۷۳۔	" "	فیضانِ اقبال	" " ۔ اپریل ۱۹۶۸ء
۷۴۔	" "	اقبالی مجرم	" " ۔ اپریل ۱۹۷۴ء
۷۵۔	" "	شب جائے کہ من بودم	" " ستمبر ۱۹۷۱ء
۷۶۔	" "	یورپ میں چار ہفتے	" " مارچ ۱۹۶۰ء

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۷۷۔	شورش کاشمیری، آغا	شورش بنام عبداللہ ملک (مرتبہ عبداللہ ملک)	کوثر پبلشرز لاہور۔ ستمبر ۱۹۷۸ء
۷۸۔	" "	جذباتِ شورش	مسلم پرنٹنگ پریس لاہور۔ فروری ۱۹۴۱ء
۷۹۔	" "	اقبال۔ پیامبرِ انقلاب	اردو پریس لاہور۔
۸۰۔	" "	خطباتِ احرار	مکتبہ احرار لاہور۔
۸۱۔	" "	خطباتِ ابوالکلام آزاد	لاہور
۸۲۔	شوکت سبزواری، ڈاکٹر	نئی پرانی قدریں	مکتبہ اسلوب کراچی
۸۳۔	صفی حیدر دانش	تصوف اور شاعری	سندھ ساگر اکیڈمی لاہور
۸۴۔	طفیل منگلوری	مسلمانوں کا روشن مستقبل	حماد الکتبی شیش محل روڈ لاہور
۸۵۔	عابد حسین خان، ڈاکٹر	قومی تہذیب کا مسئلہ	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
۸۶۔	عابد علی عابد	اصولِ انتقادِ ادبیات	مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۰ء
۸۷۔	عاشق حسین بٹالوی	اقبال کے آخری دو سال	اقبال اکیڈمی لاہور
۸۸۔	عبدالرحمن بن ابن خلدون	مقدمہ ابن خلدون (ترجمہ مولانا راغب رحمانی دہلوی)	نفیس اکیڈمی
۸۹۔	عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر	صحافت پاک و ہند میں	مجلس ترقی ادب لاہور
۹۰۔	" "	فن صحافت	مکتبہ کاروان لاہور
۹۱۔	" "	وے صورتیں الٰہی	قومی کتب خانہ لاہور۔ دسمبر ۱۹۷۶ء
۹۲۔	عبدالقادر سروری	جدید اردو شاعری	کتب خانہ عزیزیہ حیدر آباد۔ دکن
۹۳۔	عبدالقیوم، ڈاکٹر	تنقیدی نقوش	مشتاق بک ڈپو کراچی
۹۴۔	عبداللطیف اعظمی	مولانا شبلی کا درجہ اردو ادب میں	شبلی اکادمی نئی دہلی
۹۵۔	" "	مولانا محمد علی۔ ایک مطالعہ	علمی ادارہ نئی دہلی

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۹۶۔	عبداللہ بٹ (مرتب)	اسماعیل شہید	لاہور - اکتوبر ۱۹۴۳ء
۹۷۔	عبداللہ سید، ڈاکٹر	سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقائے کار کی اردو نثر کا فنی جائزہ	مکتبہ کارواں لاہور
۹۸۔	" "	مباحث	مجلس ترقی ادب لاہور
۹۹۔	" "	اردو ادب جنگ عظیم کے بعد	اردو اکیڈمی لاہور
۱۰۰۔	" "	لطیف نثر (مرتب ممتاز منگلوری)	لاہور اکیڈمی - ستمبر ۱۹۶۵ء
۱۰۱۔	عبداللہ قدسی	پاکستان میں ذہنی رجحانات	انٹرنیشنل پریس کراچی
۱۰۲۔	عبدالماجد دریا آبادی	آپ بیتی	
۱۰۳۔	عبدالمجید سالک	سرگزشت	قومی کتب خانہ لاہور۔ ۱۹۶۶ء
۱۰۴۔	" "	یارانِ کہن	چٹان پریس لاہور۔ دسمبر ۱۹۵۵ء
۱۰۵۔	عبداللہ ملک	پنجاب کی سیاسی تحریکیں	کوثر پبلشرز لاہور۔ ۱۹۷۳ء
۱۰۶۔	عبدالوحید خان	تقسیم ہند	مکتبہ کارواں لاہور
۱۰۷۔	عتیق صدیقی	ہندوستانی اخبار نویسی (کمپنی کے عہد میں)	مجلس ترقی ادب لاہور
۱۰۸۔	عتیق احمد صدیقی	آئینہ ابوالکلام	انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ
۱۰۹۔	عنایت اللہ نسیم سوہدروی	ظفر علی خان اور اُن کا عہد	اسلامک پبلی کیشن ہاؤس لاہور۔ نومبر ۱۹۸۲
۱۱۰۔	غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر	ظفر علی خاں ادیب و شاعر	مکتبہ خیابان ادب لاہور ۱۹۶۷ء
۱۱۱۔	غلام رسول مہر	۱۸۵۷	کتاب منزل لاہور
۱۱۲۔	فضل حق خیرآبادی، مولانا	باغی ہندوستان (ترجمہ عبدالشاہد خاں شیروانی)	مکتبہ قادریہ لاہور ۱۹۷۸ء
۱۱۳۔	کوثر نیازی	اندازِ بیاں	شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز لاہور۔ ستمبر ۱۹۷۵ء

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۱۱۴۔	مبارک علی، ڈاکٹر	تاریخ کے نظریات	انچ وائی پرنٹرز لاہور۔
۱۱۵۔	محمد اجمل خاں	مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ادبی خطوط و جوابات آزاد	سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی
۱۱۶۔	محمد اقبال علامہ، ڈاکٹر	خطباتِ اقبال (مرتبہ رضیہ بانو)	
۱۱۷۔	″ ″	تشکیل جدید الہیات اسلامیہ (ترجمہ سید نذیر نیازی)	بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء
۱۱۸۔	محمد اکرام، شیخ	موجِ کوثر	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۳ء
۱۱۹۔	محمد باقر آغا	مقالاتِ آزاد	مجلس ترقی ادب لاہور
۱۲۰۔	محمد علی چراغ	پراپیگنڈا	سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔
۱۲۱۔	محمد علی چوہدری	ظہور پاکستان	فیروز سنز لاہور۔
۱۲۲۔	محمد مرزا دہلوی	مسلمانانِ ہند کی حیات سیاسی	کتب خانہ علم و ادب دہلی، مارچ ۱۹۴۰ء
۱۲۳۔	محمد ہادی حسین	مغربی شعریات	مجلس ترقی ادب لاہور۔ مارچ ۱۹۶۸ء
۱۲۴۔	محی الدین قادری، ڈاکٹر	شخصیتیں۔ چند تاثرات	اردو اکیڈمی سندھ کراچی۔ جولائی ۱۹۶۲ء
۱۲۵۔	مختار مسعود	آوازِ دوست	مکتبہ جدید پریس لاہور۔
۱۲۶۔	مسکین علی حجازی	صحافتی زبان	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور۔ جون ۱۹۷۵ء
۱۲۷۔	″ ″	فن ادارت	مرکزی اردو بورڈ لاہور۔
۱۲۸۔	″ ″	اداریہ نویسی	″ ″
۱۲۹۔	مشتاق احمد قریشی	کربلائے پنجاب	راحت پبلی کیشنز لاہور
۱۳۰۔	مظہر علی اظہر، مولانا	مسئلہ شہید گنج	بخاری اکیڈمی لاہور
۱۳۱۔	معین الدین عقیل، ڈاکٹر	تحریک آزادی میں اردو کا حصہ	انجمن ترقی اردو کراچی
۱۳۲۔	منظر عباس نقوی	نثر۔ نظم اور شعر	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ

نمبر شمار	مصنف	تصنیف	ادارہ
۱۳۳۔	منظور احمد ملک زادہ، ڈاکٹر	غبار خاطر کا تنقیدی مطالعہ	مکتبہ دین و ادب لکھنؤ
۱۳۴۔	منورن جین جھا	جدوجہد آزادی میں مجلس قانون ساز کا رول	نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا
۱۳۵۔	منیر جسٹس	تحقیقاتی رپورٹ عدالت فسادات پنجاب ۱۹۵۳ء	
۱۳۶۔	ناظر کاکوروی	تنقید و تنقیدی شعور	ادارہ انیس اردو الہ آباد
۱۳۷۔	نجیب حسن سید، ڈاکٹر	امیر خسرو و موسیقی	نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات امیر خسرو اسلام آباد
۱۳۸۔	نعیم آسی	مکاتیب امیر شریعت	مسلم اکیڈمی سیالکوٹ
۱۳۹۔	نور احمد، سید	مارشل لا سے مارشل لا تک	
۱۴۰۔	نور الحسن سید، ڈاکٹر	ادب کا مقصد	ہندوستانی کتاب گھر لکھنؤ ۱۹۵۶ء
۱۴۱۔	وحید الحسن ہاشمی	مباحثے	مکتبہ مصنفین لاہور ۱۹۶۳ء
۱۴۲۔	وقار عظیم سید، ڈاکٹر	فن افسانہ نگاری	اردو مرکز لاہور۔
۱۴۳۔	" "	اقبال	مجلہ بزم اقبال لاہور۔
۱۴۴۔	ہاشمی فرید آبادی	تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت جلد دوم	انجمن ترقی اردو ۱۹۵۳ء
۱۴۵۔	یوسف حسین خاں، ڈاکٹر	روح اقبال	آئینہ ادب لاہور۔
۱۴۶۔	" "	اردو غزل	حیدر آباد دکن
۱۴۷۔	" "	تاریخ دستور ہند	انجمن ترقی پسند، دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ء
۱۴۸۔	یوسف زاہد	کلاسیکیت اور رومانیت	مکتبہ علم بھوانہ بازار لائل پور (فیصل آباد) ۱۹۶۷ء

149- By. George Jaub. Public Speeking and Debate.

150- Jawahrlal Nehru.

(2nd, January, 1936. London).

151- Disorder Enquiry Committee Report.

(14th, October, 1919. Simla.)

مقالات

(پی۔ایچ۔ڈی)

۱۵۲۔ ابوالکلام آزاد شخصیت اور فن — ڈاکٹر منظور عباس

۱۵۳۔ اردو ادب کی تحریکیں — ڈاکٹر انوارالدین سدید

کتب حوالہ

۱۵۴۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ — پنجاب یونیورسٹی لاہور

۱۵۵۔ اردو انسائیکلوپیڈیا — میسرز فیروز سنز۔ لاہور.

۱۵۶۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا

۱۵۷۔ انسائیکلوپیڈیا امریکانا

۱۵۸۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند — پنجاب یونیورسٹی

رسائل واخبارات

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت	
۱-	آزاد، روزنامہ (آزادی نمبر)	۲۶- جنوری	۱۹۴۷ء
۲-	" " (تنیدی نمبر)	۲- اگست	"
۳-	الہلال	۲۰- جولائی	۱۹۱۲ء
۴-	"	۲۷- جولائی	"
۵-	"	۸- ستمبر	"
۶-	"	۶- نومبر	"
۷-	"	۲۸- جولائی	۱۹۱۳ء
۸-	"	۲- جنوری	۱۹۱۴ء
۹-	"	۲۸- فروری	"
۱۰-	اعلان، روزنامہ	۲۸- اکتوبر	۱۹۷۵ء
۱۱-	امروز، روزنامہ	۲۷- اکتوبر	"
۱۲-	"	۲۴- اکتوبر	۱۹۷۹ء
۱۳-	بچپر (تاجر نمبر)		
۱۴-	جنگ، روزنامہ (کراچی)	۲۷- اکتوبر	۱۹۷۵ء
۱۵-	" " (لاہور)	۳۰- اکتوبر	۱۹۸۲ء
۱۶-	" " " (جمعہ میگزین)	۵ تا ۱۱- اگست	۱۹۸۳ء

نمبر شمار	مجلہ		تاریخ اشاعت
۱۷-	جنگ، روزنامہ (لاہور)		۲-نومبر ۱۹۸۲ء
۱۸-	چٹان (ہفت روزہ)		۳-جنوری ۱۹۵۵ء
۱۹-	"	"	فروری ۱۹۵۶ء شمارہ نمبر ۸، جلد نمبر ۹
۲۰-	"	"	۱۹-ستمبر ۱۹۵۷ء
۲۱-	"	"	اکتوبر ۱۹۵۸ء شمارہ نمبر ۴۳ جلد نمبر ۱۱
۲۲-	"	"	۳-دسمبر "
۲۳-	"	"	مارچ ۱۹۵۹ء شمارہ نمبر ۱۲، جلد نمبر ۱۲
۲۴-	"	"	۲۹-فروری ۱۹۶۰ء
۲۵-	"	"	۲۴-اکتوبر "
۲۶-	"	"	۲۰-اپریل ۱۹۶۱ء
۲۷-	"	" سالنامہ	۱۵-جنوری ۱۹۶۲ء
۲۸-	"	"	۲۳-فروری "
۲۹-	"	"	۲۶-مارچ "
۳۰-	"	"	۲۳-جولائی "
۳۱-	"	"	۶-اگست "
۳۲-	"	"	یکم اکتوبر "
۳۳-	"	"	۱۲-اکتوبر "
۳۴-	"	"	۲۹-اکتوبر "
۳۵-	"	"	۱۲-نومبر "

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت
۳۶-	چٹان (ہفت روزہ)	۱۹ نومبر ۱۹۶۲ء
۳۷-	〃 〃	۳ دسمبر 〃
۳۸-	〃 〃	۱۰ دسمبر 〃
۳۹-	〃 〃	۲۴ دسمبر 〃
۴۰-	〃 〃	۳۱ دسمبر 〃
۴۱-	〃 〃	۲۳ جنوری ۱۹۶۳ء
۴۲-	〃 〃	۴ فروری 〃
۴۳-	〃 〃	۴ مارچ 〃
۴۴-	〃 〃	یکم اپریل 〃
۴۵-	〃 〃	۸ - اپریل 〃
۴۶-	〃 〃	۶ - مئی 〃
۴۷-	〃 〃	۱۳ - مئی 〃
۴۸-	〃 〃	۲۰ مئی 〃
۴۹-	〃 〃	۲۷ مئی 〃
۵۰-	〃 〃	۱۷ جون 〃
۵۱-	〃 〃	۲۴ جون 〃
۵۲-	〃 〃	۲۲ جولائی 〃
۵۳-	〃 〃	۵ - اگست 〃
۵۴-	〃 〃	۱۹ - اگست 〃
۵۵-	〃 〃	۲ ستمبر 〃

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت	
۵۶-	چٹان (ہفت روزہ)	۳۰ ستمبر	۱۹۶۳ء
۵۷-	" "	۲۶ر اکتوبر	"
۵۸-	" "	۲ دسمبر	"
۵۹-	" "	۲۳ دسمبر	"
۶۰-	" "	۱۳ جنوری	۱۹۶۴ء
۶۱-	" "	۳ فروری	"
۶۲-	" "	۱۰ فروری	"
۶۳-	" "	۹ مارچ	"
۶۴-	" "	۳۰ ستمبر	"
۶۵-	" "	۱۲- اکتوبر	"
۶۶-	" "	۳۰ نومبر	"
۶۷-	" "	۲۸ دسمبر	"
۶۸-	" "	۲۵ جنوری	۱۹۶۵ء
۶۹-	" "	۱۵ فروری	"
۷۰-	" "	۲۲ فروری	"
۷۱-	" "	۲۲ مارچ	"
۷۲-	" "	۱۲ر اپریل	"
۷۳-	" "	۱۹ر اپریل	"
۷۴-	" " "	۲۷ نومبر	"
۷۵-	" "	۳۱ دسمبر	"

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت
۷۶۔	چٹان ہفت روزہ	۷ فروری ۱۹۶۶ء
۷۷۔	" "	۱۴ فروری "
۷۸۔	" "	۲۱ مارچ "
۷۹۔	" "	۱۳/ اپریل "
۸۰۔	" "	۱۸/ اپریل "
۸۱۔	" "	۲۵/ اپریل "
۸۲۔	" "	۲ مئی "
۸۳۔	" "	۹ مئی "
۸۴۔	" "	۴ جولائی "
۸۵۔	" "	یکم اگست "
۸۶۔	" "	۱۵/ اگست "
۸۷۔	چٹان ہفت روزہ	۲۲/ اگست "
۸۸۔	" "	۲۹/ اگست "
۸۹۔	" "	۲۱ نومبر "
۹۰۔	" "	۱۴ جنوری ۱۹۶۷ء
۹۱۔	" "	۲۳ جنوری "
۹۲۔	" "	۱۳ فروری "
۹۳۔	" "	۲۰ فروری "
۹۴۔	" "	۳- اپریل "
۹۵۔	" "	یکم مئی "

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت
۹۶۔	چٹان (ہفت روزہ)	۲۲ مئی ۱۹۶۷ء
۹۷۔	〃 〃	۲۹ مئی 〃
۹۸۔	〃 〃	۱۲ جون 〃
۹۹۔	〃 〃	۲۴ جولائی 〃
۱۰۰۔	〃 〃	۳۱ جولائی 〃
۱۰۱۔	〃 〃	۷۔ اگست 〃
۱۰۲۔	〃 〃	۱۴۔ اگست 〃
۱۰۳۔	〃 〃	۴ ستمبر 〃
۱۰۴۔	〃 〃	۲۵ ستمبر 〃
۱۰۵۔	〃 〃	۱۸ دسمبر 〃
۱۰۶۔	〃 〃	یکم جنوری ۱۹۶۸ء
۱۰۷۔	〃 〃	۳ مارچ 〃
۱۰۸۔	〃 〃	یکم مئی 〃
۱۰۹۔	〃 〃	۱۰ مارچ ۱۹۶۹ء
۱۱۰۔	〃 〃	۱۷ مارچ 〃
۱۱۱۔	〃 〃	۲۴ مارچ 〃
۱۱۲۔	〃 〃	۲۶ مئی 〃
۱۱۳۔	〃 〃	۶۔ اکتوبر 〃
۱۱۴۔	〃 〃	۲۲۔ دسمبر 〃
۱۱۵۔	〃 〃	۱۵ نومبر ۱۹۷۱ء

نمبر شمار	مجلہ		تاریخ اشاعت	
۱۱۶-	چٹان (ہفت روزہ)		۶-دسمبر	۱۹۷۱ء
۱۱۷-	"	"	۲۰-دسمبر	"
۱۱۸-	"	"	۳-جنوری	۱۹۷۲ء
۱۱۹-	"	"	۱۰-اپریل	"
۱۲۰-	"	"	۱۷-اپریل	"
۱۲۱-	"	"	۱۰-جولائی	"
۱۲۲-	"	"	۲۴-جولائی	"
۱۲۳-	"	"	۱۴-اگست	"
۱۲۴-	"	"	۲۱-اگست	"
۱۲۵-	"	"	۴-ستمبر	"
۱۲۶-	"	"	۱۱-ستمبر	"
۱۲۷-	"	"	۱۸-ستمبر	"
۱۲۸-	"	"	۲۵-ستمبر	"
۱۲۹-	"	"	۱۲-اکتوبر	"
۱۳۰-	"	"	۲۷-نومبر	"
۱۳۱-	"	"	۱۱-دسمبر	"
۱۳۲-	"	"	۲۵-دسمبر	"
۱۳۳-	"	"	یکم جنوری	۱۹۷۳ء
۱۳۴-	"	"	۲۲-فروری	"
۱۳۵-	"	"	۵-مارچ	"

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت	
۱۳۶ـ	چٹان (ہفت روزہ)	۱۹ـ مارچ	۱۹۷۳ء
۱۳۷ـ	〃 〃	۷ـ مئی	〃
۱۳۸ـ	〃 〃	۲ـ جون	〃
۱۳۹ـ	〃 〃	۱۱ـ جون	〃
۱۴۰ـ	〃 〃	۲۲ـ اکتوبر	〃
۱۴۱ـ	〃 〃	۲۹ـ اکتوبر	〃
۱۴۲ـ	〃 〃	۲۶ـ نومبر	〃
۱۴۳ـ	〃 〃	۲۴ـ دسمبر	〃
۱۴۴ـ	〃 〃	۷ـ جنوری	۱۹۷۴ء
۱۴۵ـ	〃 〃	۲۱ـ جنوری	〃
۱۴۶ـ	〃 〃	۱۱ـ فروری	〃
۱۴۷ـ	〃 〃	۲ـ مارچ	〃
۱۴۸ـ	〃 〃	۱۵ـ مارچ	〃
۱۴۹ـ	〃 〃	۲۵ـ مارچ	〃
۱۵۰ـ	〃 〃	یکم اپریل	〃
۱۵۱ـ	〃 〃	۱۵ـ اپریل	〃
۱۵۲ـ	〃 〃	۱۳ـ مئی	〃
۱۵۳ـ	〃 〃	۳ـ جون	〃
۱۵۴ـ	〃 〃	۱۷ـ جون	〃
۱۵۵	〃 〃	۲۴ـ جون	〃

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت	
۱۵۶۔	چٹان (ہفت روزہ)	۲-جولائی	۱۹۷۴ء
۱۵۷۔	″ ″	۳۰-جولائی	″
۱۵۸۔	″ ″	۶-اگست	″
۱۵۹۔	″ ″	۱۳-اگست	″
۱۶۰۔	″ ″	۲۰-اگست	″
۱۶۱۔	″ ″	۲۷-اگست	″
۱۶۲۔	″ ″	۱۲ تا ۱۸ اکتوبر	″
۱۶۳۔	″ ″	۲۶-نومبر	″
۱۶۴۔	″ ″	۲-دسمبر	″
۱۶۵۔	″ ″	۱۰ تا ۱۲ دسمبر	″
۱۶۶۔	″ ″	۲۴ تا ۳۰ دسمبر	″
۱۶۷۔	″ ″	۷ تا ۱۳ جنوری	۱۹۷۵ء
۱۶۸۔	″ ″	۱۴ تا ۲۰ جنوری	″
۱۶۹۔	″ ″	۲۷ جنوری	″
۱۷۰۔	″ ″	۴ تا ۱۰ فروری	″
۱۷۱۔	″ ″	۲۴-فروری	″
۱۷۲۔	″ ″	۳-مارچ	″
۱۷۳۔	″ ″	۲۱-مارچ	″
۱۷۴۔	″ ″	۳۱-مارچ	″
۱۷۵۔	″ ″	۷-اپریل	″

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت
۱۷۶۔	چٹان (ہفت روزہ)	۱۷۔اپریل ۱۹۷۵ء
۱۷۷۔	" "	۱۷۔ مئی "
۱۷۸۔	" "	۲ ۔ جون "
۱۷۹۔	" "	۹ ۔جون "
۱۸۰۔	" "	۱۶۔جون "
۱۸۱۔	" "	۲۳۔جون "
۱۸۲۔	" "	۳۰۔جون "
۱۸۳۔	" "	۷۔جولائی "
۱۸۴۔	" "	۶۔ اگست "
۱۸۵۔	" "	۱۸۔اگست "
۱۸۶۔	" "	۲۷۔اکتوبر "
۱۸۷۔	" "	یکم دسمبر "
۱۸۸۔	" "	۱۳۔دسمبر "
۱۸۹۔	" "	۲۱۔فروری ۱۹۷۶ء
۱۹۰۔	" "	۵۔اپریل "
۱۹۱۔	" "	۱۹۔جولائی "
۱۹۲۔	" "	۲۔اگست "
۱۹۳۔	" "	۲۳۔اگست "
۱۹۴۔	" " (شورش نمبر)	یکم نومبر "
۱۹۵	چٹان ہفت روزہ	۲۷۔دسمبر "

۸۹۲

نمبر شمار	مجلہ	تاریخ اشاعت
۱۹۶ـ	چٹان (ہفت روزہ)	۱۱ـ دسمبر ۱۹۷۸ء
۱۹۷ـ	" "	۱۳ ـ مئی ۱۹۸۵ء
۱۹۸ـ	" "	۲۴ـ اکتوبر "
۱۹۹ـ	فنون	اپریل ۱۹۶۳ء
۲۰۰ـ	نقوش (آپ بیتی نمبر)	جون ۱۹۶۴ء
۲۰۱ـ	نگار (سالنامہ)	۱۹۶۵ء
۲۰۲ـ	نوائے وقت روزنامہ	۲۶ـ اکتوبر ۱۹۷۵ء
۲۰۳ـ	" "	۲۷ـ اکتوبر "
۲۰۴ـ	" "	۳۰ـ اکتوبر "
۲۰۵ـ	" " (میگزین)	۹ مارچ ۱۹۸۵ء